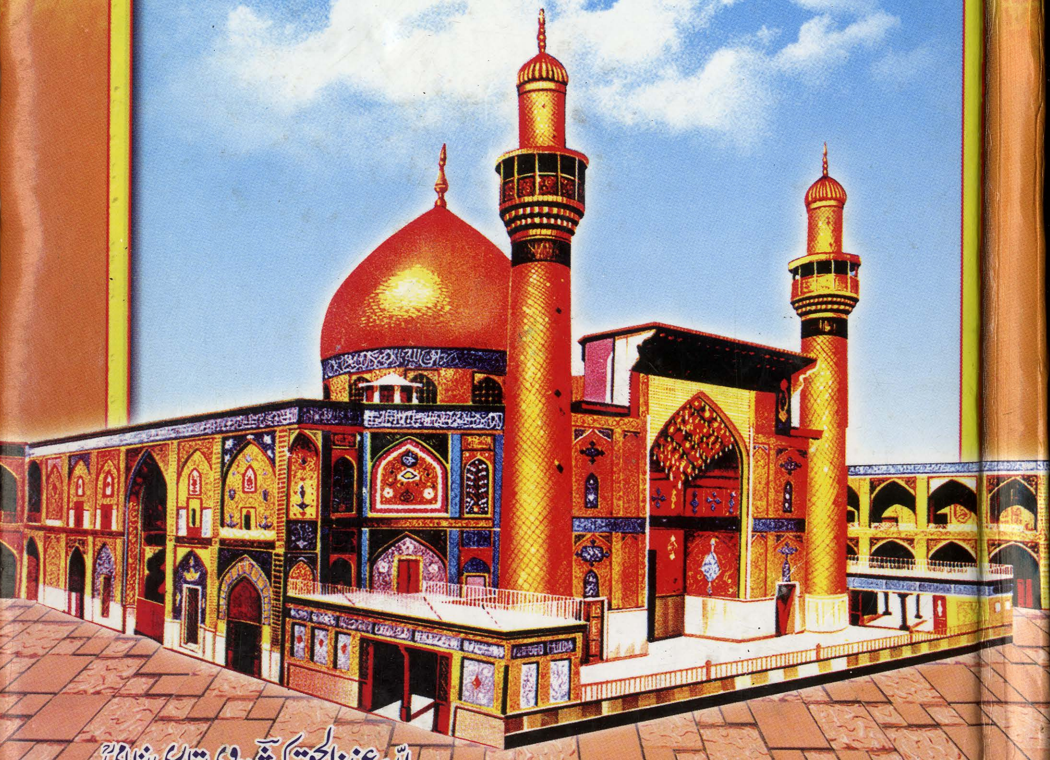
مناقبِ اہلِ بیت



علامہ عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی

مناقبِ اہلِ بیتؑ

علامہ عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامیؒ

اِدارہ پاکستان شناسی لاہور
۴۴/۲ سوڈھیوال کالونی ملتان روڈ لاہور۔ ۵۴۵۰۰ فون: ۰۳۲۲-۴۰۰۵۹۵۲

کتاب	:	**مناقبِ اہل بیت**
تالیف	:	علامہ عزیز الحق کوثر ندوی
باراوّل پاکستان	:	جنوری ۲۰۱۸ء
تقدیم	:	ظہور الدین امرتسری
کمپوزنگ	:	محمد نعیم اصغر ۰۳۳۳-۴۴۷۴۹۵۹
ضخامت	:	۷۲۴ صفحات
تعداد	:	گیارہ سو
مطبع	:	ایوب پرنٹنگ پریس، لاہور
ناشر	:	ادارۂ پاکستان شناسی، ملتان روڈ، لاہور ۵۴۵۰۰
ہدیہ	:	۹۲۰ (نوصد بیس روپئے)

تقسیم کار

بیکن بکس: گلگشت، ملتان فون: ۰۶۱-۶۵۲۰۷۹۰-۹۱

دار العلوم نعیمیہ: فیڈرل بی ایریا، دستگیر بلاک نمبر ۱۵، کراچی فون: ۲۱-۳۶۳۲۴۲۳۶

جامعہ عربیہ ضیاء العلوم: اسٹریٹ ۱۳، سیکٹر ۸/ایل، اورنگی ٹاؤن، کراچی

فون: ۰۳۲۱-۳۴۱۸۵۶۸

مندرجات

عکسی خزانۂ نوادر

تصاویر

تاریخی حقائق سے
"شترمرغانہ" چشم پوشی

اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ اسلامی تاریخ نویسی کبھی دربارِ خلافت کے تابع نہیں رہی، یہ آزاد مورّخین تھے، جنھوں نے حتی المقدور دیانت داری سے آزادانہ تاریخ نگاری کی، اگر ایسا نہ ہوتا تو عباسی عہد میں لکھی جانے والی تاریخی کتب میں اُمویوں کے کارناموں اور عباسیوں کے عیوب کا تذکرہ نہ ہوتا۔ ان مورّخین کو اس بنا پر مسترد نہیں کیا جاسکتا کہ ان میں سے کچھ سُنی مورّخ ہیں اور کچھ شیعہ، یا یہ تاریخیں بیش تر اُموی یا عباسی ادوار میں لکھی گئیں۔ ہمیں متقدمین مسلمان مورّخین پر بھروسا کرنا ہوگا، اپنی تاریخ کے لیے ان پر بھروسا نہ کرنے کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

(ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، مقدمہ: "مسلمانوں میں انتہاپسندی کا آغاز خوارج......ایک مطالعہ"، قرطاس، کراچی۔۲۰۱۲ء، ص۱۶ و۱۷)

سانحۂ کربلا اور مابعد اہل بیت پر مظالم کو "اللہ کی مرضی" قرار دینے پر علامہ اقبال کی اُموی حکمرانوں پر گرفت

کہا گیا کہ علت و معلول کا سلسلہ چوں کہ بالآخر ذات خداوندی پر ختم ہو جاتا ہے، اندریں صورت جو کچھ بھی ہو رہا ہے خدا ہی کے حکم سے ہو رہا ہے۔ دوسری جانب دمشق کے موقع شناس اُموی (Umayyads) فرماں رواؤں کو بھی جو عملاً مادہ پرستی اختیار کر چکے تھے، کسی ایسے عذر کی ضرورت تھی جس سے وہ کربلا کے مظالم پر پردہ ڈال سکیں تاکہ اس طرح عوام کو موقع نہ ملے کہ ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوں اور انھیں امیر معاویہ کی بغاوت کے ثمرات سے محروم کر دیں۔ چناں چہ کہا جاتا ہے جب معبد (Ma'bad) نے حسن بصری سے کہا اُموی مسلمانوں کو قتل کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کی مرضی یوں ہی تھی تو حسن بصری نے کہا 'یہ اللہ کے دشمن جھوٹ کہتے ہیں۔' (اسلامی الٰہیات کی جدید تشکیل)

پیش لفظ

مقدمہ ابن خلدون میں لکھا ہے کہ خلافت کا حقیقی مقصد ناموسِ اسلام کا تحفظ اور شرعی زاویۂ نگاہ سے حکومت کے نظم و نسق کی تنظیم اور اس کا قیام تھا۔ خلیفہ کی شخصیت شرعی نقطۂ نظر سے دینی اور دنیاوی معاملات میں فرماں روائی کی حامل تھی۔ یہ فرماں روائی شریعت کے دستور اور قوانین کی پابند تھی۔ خلیفہ کے فرائض کی بنیاد شریعت اور اُمت کی رضامندی پر قائم تھی وہ ان حدود سے تجاوز نہیں کرتا تھا، لیکن خلافت راشدہ کے خاتمہ کے بعد یہ صورت حال قائم نہ رہ سکی۔ دین کا کامل نمونہ خلافت راشدہ تک باقی رہا۔

صحابہ[1] کا اعتقاد تھا کہ اسلامی حکومت کا محور ''وحی خداوندی'' ہے، اس حکومت کی بنیاد خاندانی عصبیت اور نسلی شعور کی جگہ دینی وحدت پر قائم ہے۔ عربوں کی شیرازہ بندی میں اس کا بہت بڑا دخل تھا۔ اسلام سے پہلے ہر قبیلہ کا بُت الگ الگ ہوتا تھا۔ اسلام نے قبائلی عصبیتوں کو مٹا کر وحدتِ اُمت کا نصب العین عطا کیا تھا۔ نسب پرستی[2] کا بت توڑ دیا گیا، اور ہر ایک کو وحدتِ

---

[1] یہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور تابعین کرام وہی ہیں جن کے اخلاص، ایفاء عہد، صبر اور استقامت کا ذکر قرآن نے یوں کیا ہے: مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ ...... الخ۔ ''اہل ایمان میں ایسے لوگ موجود ہیں جنھوں نے اللہ سے کیے ہوئے عہد کو سچا کر دکھایا۔ ان میں سے کوئی اپنی نذر پوری کر چکا اور کوئی وقت آنے کا منتظر ہے۔ انھوں نے اپنے رویّے میں کوئی تبدیلی نہیں کی۔'' (الاحزاب، ۲۳)

[2] ''حجۃ الوداع کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نسل و نسب کے تفاخر کا مسلمانوں میں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جب کہ آپ نے فرمایا لَيس للعربی فضل علی العجمی ...... الخ (عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر کوئی فضیلت نہیں۔ تم سب آدم کی اولاد ہو اور آدم خاک سے بنے تھے)۔ حدیث شریف میں

(باقی برصفحہ آیندہ)

اسلامی کے گھاٹ پر بلا امتیازِ نسب وقوم کھڑا کردیا گیا:۔

حسنؓ ز بصرہ، بلالؓ ز حبش، صہیبؓ از روم
ز خاکِ مکہ ابوجہل، ایں چہ بوالعجبی ست

اور امیر المؤمنین فاروقِ اعظمؓ کے جنازے پر جب نماز کی صفیں کھڑی ہوگئیں، تو ہزاروں قریشی اور ہاشمی مقتدی تھے، اور صہیبِؓ رومی امام۔[1]

لیکن خلافتِ راشدہ کے بعد قبائلی عصبیتیں زندہ ہوئیں......[2] بنوامیہ کے دور میں جب خلافت ملوکیت میں تبدیل ہوئی تو جن قباحتوں نے معاشرے میں سر اٹھایا، ان میں یہ عصبیت بھی شامل تھی۔[3] اولین مسلمانوں کو یکجا رکھنے والے دین کے رشتے اب قبائلی رشتوں سے بدلنے لگے۔[4]

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

ہے۔ لاتا تونی بانسابکم وائتونی باعمالکم (میرے سامنے نسب نہ لاؤ، عمل لاؤ) اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرف یہ شعری قول منسوب ہے:

انا بن نفسی و کنیتی ادبی — من عجم کنت او من العرب
ان الفتٰی من یقول ھا انا اذا — لیس الفتٰی من یقول ابی

(میں اپنے نفس کا بیٹا ہوں اور کنیت میرا ادب ہے۔ نسب عجمی ہو یا عربی مردود ہے۔ جوان وہ ہے جو اپنی ذات کو پیش کرے، نہ کہ وہ جو باپ کا نام پیش کرے)۔

(یوسف حسین خاں، ڈاکٹر۔ 'روحِ اقبال'، ادارۂ اشاعتِ اردو، حیدرآباد دکن، طبع ثانی، ۱۹۴۴ء، ص ۲۱۸)۔

۱۔ تمدنِ عرب از احسان الحق ایم، اے، ص ۹۸

۲۔ دین کا متوازن تصور۔ عبادت اور خلافت کی جامعیت: ڈاکٹر مولانا محسن عثمانی ندوی، ص ۶۶۔

۳۔ مجلہ فقہ اسلامی، کراچی، مئی ۲۰۰۳ء، ص ۶۷، مشمولہ مضمون: شعوبیت اور امام ابوحنیفہ از محمد صدیق خان شبلی۔

۴۔ باوجودے کہ رنگ، نسل، قبیلہ، قوم، وطن کے تعصبات سے اسلام نے انسان کو نجات دلا دی تھی اور تمام عصبیتوں کا قلع قمع کر دیا تھا، لیکن پھر بھی عصبیتوں پر بڑھاوا دینے والوں کے لیے بہ طور تنبیہہ یا وعید آپ نے فرمایا۔

لیس منا من دعا الٰی عصبیۃ و لیس منا من قاتل علٰی عصبیۃ و لیس منا من مات علٰی عصبیۃ۔
(سنن ابی داؤد)

''جس کسی نے بھی (اپنے کسی تعلق والوں کی بے جا طرف داری کے لیے) عصبیت کی طرف بلایا تو وہ ہم میں سے نہیں، اور جس کسی نے عصبیت کی بنا پر جنگ کی وہ ہم میں سے نہیں اور جو کوئی بہ حالت عصبیت مر گیا وہ بھی ہم میں سے نہیں۔''

تاہم امت کا یہ ہراول دستہ اوّل تا آخر اس بات کا متمنی رہا کہ اسلامی جماعت (مومنین) کے مابین خواہ وہ عرب ہوں، یا غیر عرب میں ایک حقیقی اخوت پیدا ہو۔[1]

احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کی من پسند توجیہہ

آئندہ سطور میں ہم ڈاکٹر حسن ابراہیم حسن (ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی۔ ڈی،لٹ (لندن)، پروفیسر تاریخ اسلام فواد اوّل یونی ورسٹی (قاہرہ) کی محققانہ تصنیف **النَظمُ الاسلامیّہ** کے اردو ترجمہ (مسلمانوں کا نظم مملکت)، باب خلافتِ بنی اُمیّہ سے چند اقتباس پیش کرتے ہیں، ملاحظہ ہوں:

> 'خلافتِ راشدہ کے خاتمہ کے بعد زمام خلافت بنی اُمیہ کے ہاتھ آ گئی اور اس وقت سے خلافت حکومت کی شکل میں تبدیل ہوگئی، امویوں کے ہیبت وجلال سے جزیرۂ عرب لرز اُٹھا۔ اس سیاسی ماحول میں مسلمانوں کا ایک مذہبی طبقہ بنی اُمیہ کا آلۂ کار بن گیا اور وہ احادیث (سیاق وسباق سے ہٹ کر) کی بنیاد پر یہ ذہنیت پیدا کرتا تھا کہ حکومتِ وقت کی اطاعت فرض ہے۔ خواہ اس کا نظم ونسق اور دستور حکومت کچھ بھی ہو۔
>
> خلافت بنی اُمیہ میں مذہب سے زیادہ سیاست کا پاس کیا جاتا تھا۔ سیاست کے مقابلہ میں مذہب کی ثانوی حیثیت تھی۔ اس کا لازمی نتیجہ تھا کہ خلافت کی جگہ ملوکیت نے لے لی تھی۔ امیر معاویہؓ نے قیصر وکسریٰ کے دربار کے کروفر قائم کر رکھے تھے...... امیر معاویہؓ کا دربار ساسانیوں کے دربار کی جیتی جاگتی تصویر تھا۔
>
> امیر معاویہؓ نے اس نظامِ شوریٰ کو ختم کر دیا، جس کی بنیاد پر خلفاءِ راشدین کا انتخاب ہوا تھا۔ آپ نے خلافت کی جگہ ملوکیت کی بنیاد رکھی جسے تلوار کے بل بوتے سیاسی تدبیروں اور حریفوں کے خلاف ریشہ دوانیوں کے ذریعہ حاصل کیا جاتا تھا۔ امیر معاویہؓ نے جب یزید کو ولی عہد بنایا اس وقت سے وراثت کی ابتدا ہوئی، یہی نظام عہدِ عباسیہ میں بھی قائم رہا اس کی وجہ سے مسلمان اپنے طبعی حق یعنی شوریٰ سے محروم ہوگئے۔ یہ وہ حق تھا جس کے عرب خوگر تھے۔ قرآن نے بھی اس کی حمایت کی تھی، احادیث بھی اس کی تحسین کرتی تھیں۔ ولی عہدی کے سلسلہ میں اُمویوں

---

[1] فلسفۂ اسلام: ڈی، اولیری، ص ۵۰

نے ایک قدم اور آگے بڑھایا تھا اور اپنی زندگی میں ایک چھوڑ دو دو تین تین ولی عہد مقرر کرنے کی رسم جاری کی۔

خلافتِ راشدہ میں مدینہ مسلمانوں کا دارالسلطنت رہا۔ اس وقت عربوں کا عنصر حکومت کی مشینری پر غالب تھا اور خلافت کا نظام عربوں کی خصوصی ذہنیت اور فطرت کے مطابق قائم رہا۔ جب دمشق عربوں کی راجدھانی مقرر[1] ہوئی تو عرب وہاں کے فطری ماحول سے متاثر ہوئے اور نظام خلافت بڑی حد تک قیصر و کسریٰ کے نظام حکومت کے سانچہ میں ڈھل گیا اور خلیفہ نے زمانہ اور ماحول کے مطابق اپنے اندر بہت سی تبدیلیاں پیدا کرلیں۔

بنی اُمیہ کے عہد میں یہ معمول رہا کہ خلیفہ اپنی زندگی میں ولی عہد مقرر کر دیتا تھا۔ اور ممتاز افراد اور بڑے بڑے جنرلوں سے اس کی بیعت اپنے سامنے لیتا تھا۔ عالمِ اسلامی میں گورنر قائم مقام کی حیثیت سے ولی عہد کے لیے بیعت لیا کرتے...... بیعت کی تکمیل ہر طرح سے کی جاتی تھی۔ خوف و دہشت، وعدے وعید اور ترغیب و تحریص[2] غرض ساری تدبیریں عمل میں لائی جاتیں اور کوئی صورت اُٹھا نہیں رکھی جاتی تھی اور پھر اس انتخاب کو ہر سال میں شرعی قرار دیا جاتا'۔[3]

---

[1] ''دمشق تیرہویں سال ہجری میں عین اس روز فتح ہوا جس روز حضرت ابوبکرؓ خلیفہ اسلام نے وفات پائی (۶۳۴ء) عربوں (خلفاءِ بنواُمیّہ) نے بجائے مدینہ منورہ کے اس کو اسلام کا دارالسلطنت قرار دیا۔'' (گستاوَلی بان، ڈاکٹر۔ ''تمدّن عرب'' مترجم، بلگرامی، علی سید۔ الفیصل، لاہور، س ن، ص ۸۳ اور ۹۳)۔

[2] مذکورہ مقاصد کے لیے بقول انیس زکریا (مصنف امیر معاویہؓ)، انھوں نے عطیات سے زکوٰۃ وصول کی، بادشاہوں کے اموال و جائداد کو اپنے لیے مخصوص کیا اور یہ جائدادیں اپنے عزیزوں، یمنی، شامی، جزائری، عراقی اور ایرانی دوستوں کو بہ طور جاگیر دیں''۔ ''دراصل داد و دہش ہی سے تو امیر معاویہ نے کام چلایا اور حکومت قائم کردی۔'' (صارم، عبدالصمد۔ ایضاً، حاشیہ، ص ۵۴)۔ پروفیسر ڈاکٹر محمد سرور حجازی نے بھی لکھا ہے کہ ''بنواُمیہ کے دور میں بیت المال کی آمدنی کا کثیر حصہ خلفا اور لوگوں کے وظائف، انعامات اور جاگیروں کی صورت میں صرف ہوتا۔ طرح طرح کے نئے ٹیکس لگائے گئے جن کی شرعی اور عوامی بہبود کے نقطۂ نظر سے کوئی حیثیت نہ تھی۔ نومسلموں سے جزیہ تک وصول کیا جاتا۔'' (ارفع اسلامیات، طبع اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص ۲۷۲)۔

[3] مسلمانوں کا نظم مملکت مترجمہ مولوی علیم اللہ صدیقی، فاضل دیوبند۔ بی اے جامعہ، مطبوعہ دارالاشاعت کراچی۔ اشاعت دوم، ۱۹۵۸ء، ص ۴۹، ۵۰، ۵۲، ۵۳

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی، پروفیسر شعبہ عربی دہلی یونی ورسٹی اپنی تصنیف 'دین کا متوازن تصور عبادت و خلافت کی جامعیت' میں نظریۂ خلافت و مقاومت کی کوششوں پر تنقید کے تناظر میں لکھتے ہیں:

'حکمران اجتماعی مشورے کے ذریعہ نہیں بل کہ ہتھیاروں کی طاقت سے برسرِ اقتدار آتے تھے اور لوگوں پر حکومت کرتے تھے۔ بیعت سے اقتدار نہیں حاصل ہوتا تھا، بل کہ اقتدار سے بیعت حاصل ہوتی تھی اور جو بیعت نہیں کرتا اس کی گردن اڑا دی جاتی۔

حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز[1] (۱۰رصفر ۹۹ھ تا رجب ۱۰۱ھ) کے عہدِ خلافت میں۔ ان کو یہ احساس تھا کہ یہ نظام جس کے ذریعہ بنو اُمیہ کے دور سے لوگ مسندِ اقتدار پر بیٹھے ہیں قیصر و کسریٰ کی سنت ہے اس میں مسلمانوں کے اربابِ حل وعقد کے انتخاب کو دخل نہیں اس لیے یہ اسلامی مزاج کے مطابق نہیں۔ چناں چہ انھوں نے اس سے انحراف کی جس کی ابتدا یزید کی ولی عہدی سے ہوئی تھی۔'[2]

صلیبیوں سے راہ و رسم اور نوازشات

حضرت معاویہ نے تختِ حکومت حاصل کرنے اور اپنی حکومت کی سرحدات کو وسیع تر کرنے کے لیے شامیوں پر انحصار کیا، جو ابھی تک عیسائی تھے۔ شامیوں کے علاوہ ان کے پشت پناہ شامی عرب تھے، جو یمنی الاصل تھے۔ یہ بھی عیسائی تھے۔ دوسرے علاقوں کے عیسائی بھی مسلمانوں سے مراسم قائم کیے ہوئے تھے۔ بہرکیف امویوں کے گہرے تعلقات شامی صحرائے عیسائیوں سے تھے۔
انھوں نے حجاز سے ہجرت کر کے شام آ بسنے والے مسلمانوں پر قطعاً اعتماد نہ کیا۔ بقول رئیس احمد ندوی، عراق کے علوی اور حجاز کے راسخ العقیدہ لوگ معاویہؓ کے سخت مخالف[3] تھے۔ اس

---

[1] ''بنی اُمیہ کی ستم کاریوں کو جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے روکنا شروع کیا اور ان کے غصب کردہ اموال کی واپسی کرانے لگے تو بنی اُمیہ نے ان کو زہر دے کر شہید کرا دیا۔'' (دائرہ معارف عربی انسائیکلوپیڈیا، جلد دوم، ص ۹۳)۔

[2] دین کا متوازن تصور، مطبوعہ مجلس نشریاتِ اسلام، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۶۲

[3] کیوں کہ ''حجازی لوگ ایسی بادشاہت کو قبول کرنے کے لیے تیار نہ تھے، جس میں خلافت کو ہرقل کی بادشاہی بنا

(باقی برصفحہ آیندہ)

لیے شامی عیسائی اور شامی عرب عیسائی وسیع پیمانے پر فوج میں بھرتی کیے گئے۔ اپنے تخت حکومت کی حفاظت کے لیے مسیحی رعایا پر بھروسا کیے بغیر چارہ نہ تھا۔ اسی لیے انھوں نے ایک یعقوبی مسیحی خاتون میسون سے عقد کیا۔[1] جس کا تعلق قبیلۂ بنی کلب[2] سے تھا۔

اُدھر بنو کلب کے عیسائی، حکمران کے ساتھ رشتہ داری قائم کر کے اپنی لڑکی کے لیے خاوند نہیں چاہتے تھے بل کہ اپنے مفاد کی حفاظت چاہتے تھے۔ یہ مفاد فوج، شہری ملازمتوں اور حکومت کے اعلیٰ عہدوں کے علاوہ اپنی ثقافت، تہذیب، تمدن، مذہب کا تحفظ تھا۔

ڈاکٹر سید محمد یوسف (م: ۱۹۷۸ء) سابق ریڈر۔ صدر شعبۂ عربی، جامعہ کراچی لکھتے ہیں:

''حضرت معاویہؓ نے بنی کلب کے سردار بحدل کی بیٹی میسون (Maysun) سے شادی کی، اس کا شجرۂ نسب یہ تھا۔ میسون[3] بنت بحدل بن انیف بن ولجہ بن قناعہ بن

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

دیا جائے، اور ایک ہرقل کے بعد دوسرا ہرقل مسند آرائے سلطنت ہو۔ شام اور کوفہ کے لوگوں نے تو اِس طرحِ نَو (یزید کی ولی عہدی) کو قبول کر لیا۔'' (محمد احسان الحق سلیمانی۔ ''تمدنِ عرب'' (زیرِ عنوان ملوکیت کی ابتدا)، ص ۲۷۲)۔

[1] ''تاریخ دولت فاطمیہ''، ص ۳۷۷

[2] ''قبیلۂ کلب عرصہ سے شام میں آباد تھا۔ چوں کہ اس قبیلے کے لوگ ممتاز، بااثر اور باحیثیت مرتبہ کے مالک تھے۔ اس لیے ان لوگوں کا اموی حکومت سے سابقہ ہونا ایک ضروری امر تھا۔ عہد اموی کی ابتدائی سرگرمیوں کا مرکز چوں کہ شام تھا جہاں امیر معاویہ برسوں گورنر رہ چکے تھے، اس لیے اس علاقے کی اکثر سیاسی و فوجی سرگرمیاں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں۔ قبیلۂ کلب نے بنو اُمیہ سے اپنے تعلقات استوار کیے جس کی بنیاد باہمی مفاہمت اور تعاون پر تھی۔ اس طرح بنو کلب اموی خاندان کے حلیف بن گئے اور اس قبیلہ کے بعض افراد ممتاز فوجی وغیر فوجی عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس قریبی تعلق کی بنا پر اس خاندان کے لوگوں کو بنی اُمیہ کے حالات اور معاملات جاننے کا موقع ملا بل کہ بعض اوقات وہ ان کے اندرونی اور مخفی حالات تک سے آگاہ ہو جاتے تھے۔'' (دیکھیے: مقالہ محمود الحسن، ڈاکٹر۔ ''عربوں میں تاریخ نگاری کا آغاز وارتقاء'' نئی دہلی (بھارت) مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، باراوّل، ۲۰۱۱ء، ص ۱۲۳)۔

[3] پنجاب یونی ورسٹی، لاہور سے شائع ہونے والے 'اُردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ' میں جلد ۲۱ طبع اوّل ۱۴۰۷ھ/ ۱۹۸۷ء صفحہ ۹۷۳ پر اس خاتون اور اس کے خاندان کا احوال درج ہے۔ ''میسون: بنت حسان بن مالک بن بحدل بن اُنیف۔ اس کا والد حسان بن مالک بنو کلب کا سردار تھا۔ بعض لوگوں نے اسے میسون بنت بحدل لکھا ہے، لیکن بحدل دراصل اس کا پردادا تھا۔ میسون کے ساتھ حضرت معاویہؓ نے نکاح کیا تھا اور اس نکاح کی سیاسی غرض وغایت

(باقی برصفحہ آیندہ)

عدی بن رہیر بن حارثہ بن کلبی۔[1] یہ عورت کوئی معمولی کنیز نہیں تھی۔ وہ ایک بڑے گھرانہ سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کا قبیلہ قدیم (Palmyra) کے قرب و جوار کے ریگستان میں اقامت رکھتا تھا۔ یہ قبیلہ عہد اسلام کے بعد بھی نصرانی رہا۔ عقیدے کے اعتبار سے اس قبیلہ کے افراد یعقوبی (یعقوبائی۔Jacobite) عیسائی تھے۔[2]

میسون یزید کی ماں تھی۔ اس کا باپ بحدل (درحقیقت پردادا) اپنے قبیلہ کا سردار تھا۔ بنی کلب شامی عرب تھے، جو اصلاً یمن سے تعلق رکھتے تھے اور ہجرت نبویؐ سے پہلے بادیۂ شام میں آ گئے تھے۔ یہاں آ کر وہ عیسائی مذہب اختیار کر چکے تھے۔ زمانۂ اسلام میں بنو کلب کی سرداری بنی بحدل کے لیے مخصوص تھی۔ (اس قبیلہ میں سے صرف حضرت وجیہ کلبیؓ مسلمان ہوئے تھے۔ انھی کی صورت پر جبرئیل علیہ السلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتے رہے)۔[3]

ڈاکٹر موصوف آگے چل کر لکھتے ہیں:

قبیلہ بھی عیسائی تھا، خاندان بھی عیسائی۔ ماحول بھی عیسائیوں کا تھا۔ خاتون

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

بھی تھی اور وہ یہ کہ بنو کلب اُمویوں کے حلیف و معاون تھے اور بنو اُمیہ کا اقتدار قائم کرنے میں ان کا بڑا ہاتھ تھا۔ اُموی دربار میں حسان بن مالک کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ جنگ صفین کے بعد امیر معاویہؓ نے اسے دمشق میں ایک مکان عطا کیا تھا جو قصر البحادلہ کے نام سے موسوم ہوا۔ اس نکاح سے امیر معاویہؓ کو بنو کلب کی دائمی اعانت کی ضمانت حاصل ہو گئی۔ یزید میسون ہی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔

میسون جلد ہی قصر خلافت سے اکتا گئی اور صحرائی زندگی کے لیے بے قرار رہنے لگی۔ اس نے چند اشعار کہے جن میں ہمیں "قصر خضراء" کی زندگی کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ اپنے اشعار میں وہ "قصر منیف" (بلند بام محل)، "لبس شفوف" (باریک اور قیمتی لباس پہننا)، ھر الدّفوف (طبلے کی تھاپ) اور "البغل الذفوف" (تیز رو خچروں کی سواری) کا ذکر کرتی ہے۔ پھر ان کے مقابلہ میں وہ "لبس العباءۃ" (عبا پہننے) کو ترجیح دیتی ہے اور اس خیمہ کو زیادہ پسند کرتی ہے، جسے تیز و تند ہوائیں تھپیڑیں مارتی ہیں۔ غرض کہ اپنے اشعار میں وہ بدوی زندگی کے لوازم کے لیے تڑپتی نظر آتی ہے۔ اِن ہی اشعار کے باعث امیر معاویہؓ نے میسون اور اس کے ساتھ اس کے فرزند یزید کو صحرا کی طرف روانہ کر دیا۔"

1. یزیدی الیسوں کا پس منظر، ص ۱۸، بحوالہ تاریخ طبری، جلد دوم، حصہ اوّل، ص ۱۴۹ و تاریخ اعراب ہٹی، ص ۱۹۵۔
2. ایضاً، ص ۱۹، بحوالہ تاریخ شام ہٹی، ص ۴۲۵
3. ایضاً، ص ۲۱، بحوالہ تاریخ ابن خلدون، جلد دوم، ص ۱۹۹

بھی معمولی خاندان کی نہ تھی۔ بڑے گھرانہ کی عورت تھی جس وقت شادی ہوئی حضرت معاویہؓ کی عمر پچاس سال سے متجاوز تھی اور اس نصرانیہ کی عمر بیس سال تھی۔ یہ شادی حضرت معاویہؓ کی حکومت کے ابتدائی سالوں میں ہوئی۔ یہ عورت اپنے مذہب پر اس قدر پختہ تھی کہ مسلمانوں کے حرم، تہذیب، تمدن، علوم دینیہ، وعظ و نصیحت، علمائے کرام کے ارشادات اور صحابہؓ اور صحابیاتؓ کے کردار نے اس پر کچھ اثر نہ کیا اور وہ آخر دم تک عیسائی رہی[1] اور تثلیثی عقیدہ پر قائم رہی۔ یہ شادی سیاسی تھی۔ میسون کی شرط اوّل یہ تھی کہ عیسائی مذہب نہ چھوڑوں گی۔ میسون کے لیے حضرت معاویہؓ کے گھر میں دل چسپی کی کوئی چیز نہ تھی۔ حضرت معاویہؓ کی مصلحت تو واضح ہے۔ وہ شام کی عیسائی اکثریت سے دلی تعلق پیدا کرنا چاہتے تھے اور اپنی حکومت کے لیے ان کی ہمدردی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ جیسا کہ عام حکومتوں میں دستور ہے۔ فوج وفادار باشندوں سے تیار کی جاتی ہے۔ حکمران گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگ اگر حکومت کے خلاف بغاوت کریں تو انھیں اپنے ہی لوگوں سے قطعاً قابو میں نہیں کیا جا سکتا۔ مسلمان حکمرانوں نے غلاموں کے دستے اپنی حفاظت اور سلطنت کے استحکام کے لیے بنائے۔''[2]

نیز بقول ہٹی عرب تواریخ میں شامیوں کی اس گہری وفاداری کا ذکر ملتا ہے جو وہ حضرت معاویہؓ کے ساتھ رکھتے تھے۔ حضرت معاویہؓ نے اپنی عیسائیوں پر مشتمل شامی فوج کو عالم اسلام کی پہلی منضبط اور منظم فوج بنا ڈالا۔ یعقوبی اور مارونی عیسائی اپنے اپنے جھگڑے حضرت معاویہؓ کے پاس لاتے اور وہ ان کو طے کرتے۔ عیسائی مورّخ تھیوفینز نے لکھا ہے، کہ حضرت معاویہؓ نے اڈیسہ میں ایک عیسائی گرجے کو جو زلزلے سے گر گیا تھا، دوبارہ بنوا دیا تھا[3]۔ شام میں عیسائیوں کے علاوہ یہودی بھی کثرت سے آباد تھے۔

علمائے تاریخ نقل کرتے ہیں کہ امیر معاویہؓ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے عیسائیوں

---

[1] ایضاً ص ۲۲ بحوالہ تاریخ طبری، جلد دوم، حصہ اوّل ص ۱۴۹، تاریخ شام ہٹی، ص ۴۲۵ بنات الصلیب، قمر الدین احمد، مطبوعہ کراچی، ص ۶۳

[2] یزیدی الیسوں کا پس منظر، طبع نظریہ فاؤنڈیشن پبلشر، فیصل آباد، ص ۲۲۔

[3] ایضاً ص ۳۶ بحوالہ تاریخ عرب از فلپ کے ہٹی ص ۱۹۶

کو اپنا دبیر (چیف سکرٹری) بنایا۔ چناں چہ حضرت معاویہؓ نے اپنے دربار کے اہم عہدے عیسائیوں کو بخش دیے تھے ملک الشعرا الاخطل تھا۔ طبیب شاہی الاثال[1] ہوا۔ محکمہ مال (یعنی بیت المال یا خزانہ) سرجون[2] بن منصور کے سپرد ہوا۔ یہ کلیدی عہدے[3] تھے۔ ذیلی شعبوں پر بھی عیسائی چھا گئے۔ فوج عیسائیوں کی تھی۔ ان کے سپاہی بھی عیسائی اور افسر بھی عیسائی تھے☆۔ یہ لوگ ایک نئے دین کے پیروؤں کے لیے کس طرح ہمدردی اور محبت کے جذبات رکھ سکتے تھے جو انھیں کافر سمجھتے تھے۔ موقع پا کر انھوں نے اپنی تحقیر کا بدلہ لینا تھا سو لیا۔[4]

حضرت مغیرہ بن شعبہ کی وفات کے بعد جب زیاد بن سُمیہ کو، جو زیاد بن اُبیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا (ابن ابوسفیان قرار دیے جانے پر)، پہلے بصرہ بعد ازاں کوفہ کا بھی گورنر بنا دیا گیا اور یوں وہ صرف حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں سلطنت کے مشرقی حصے کا بلاشرکت غیرے حاکم بن گیا۔ اس کے زیر نگین عرب اور ایران بھی تھے۔ اس کا باڈی گارڈ دستہ، تربیت یافتہ چار ہزار

☆ ''کعب الاحبار ایک یمنی یہودی، جو حضرت معاویہؓ کی گورنری کے زمانہ میں مشیر بھی رہا تھا، کئی ایک روایات کا حامل ہے۔ لیکن ان روایات سے حدیث میں اتنا ضعیف مواد پیدا کر دیا گیا کہ علماءِ حقہ کو صحیح احادیث کے چھانٹنے میں عرق ریزی سے کام لینا پڑا''۔ (احسان الحق۔ ''تمدنِ عرب'': ۳۲۷)

---

[1] شہر حمص کے خراج کی وصولی کے لیے اثال کا بیٹا متعین تھا۔ (مبارکپوری، قاضی اطہر۔ 'سیّدنا علی و سیّدنا حسین رضی اللہ عنہما'، ص ۱۷۶)

[2] سیرت حضرت امیر معاویہ میں مولانا محمد نافع نے حضرت معاویہ کے تقرر کردہ منشی (کاتب الرسائل) عبیداللہ بن اوس غسانی کا بھی ذکر کیا ہے، جس کے دیوان پر نگران اعلیٰ سرجون بن منصور رومی تھا۔ (خیال رہے کہ دمشق کے جنوب مغربی حصے میں آباد بنوغسان عیسائیت قبول کیے ہوئے تھے)۔

[3] اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، طبع دانش گاہ پنجاب۔ لاہور میں بھی لکھا ہے کہ ''حکومت کے ذمہ دار عہدوں پر عیسائی فائز ہوتے رہے۔ مالیات کے تمام عہدوں پر عیسائیوں کا قبضہ تھا۔ شاہی طبیب بھی عیسائی ہوتے تھے۔'' (۲۹۴:۲۱)۔ ڈاکٹر نگار سجاد صاحبہ نے اپنے مقالہ 'عرب اور موالی' (طبع کراچی، قرطاس، ۲۰۰۶ء) میں لکھا ہے کہ حُجّاب کے بعد کتابت (مالیات) کا عہدہ اُموی عہد میں دوسرا بڑا انتظامی عہدہ تھا۔ کاتب کو اسٹیٹ سیکریٹری (State Secretary) کہا جا سکتا ہے۔ اسی اعتبار سے اس کی اہمیت کا اندازہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ یزید کے دور میں سرجون بن منصور اس منصب پر فائز رہا۔ ازاں بعد ابن سرجون مذکورہ عہدہ پر مروان بن حکم اور عبدالملک بن مروان کے دور تک متعین رہا۔ بنواُمیہ کے ساتویں حاکم اعلیٰ سلیمان بن عبدالملک (م:۹۶ھ) کا کاتب (چیف سیکریٹری) ابن الطریق نصرانی تھا (عرب اور موالی، ص ۲۸۱)۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ سرجون بن منصور، دمشق کے سینٹ جان (یوحنا) کا دادا تھا۔ (تاریخ دولتِ فاطمیہ از رئیس احمد جعفری (ندوی)، لاہور، طبع دوم، ۲۰۰۴ء، ص ۳۷۸)

[4] یزیدی المیوں کا پس منظر، ص ۲۸

فوجیوں پر مشتمل تھا۔ یہ فوج اس کی پولیس بھی تھے، جاسوسی بھی کرتے تھے اور بازوئے شمشیر زن بھی تھے۔ اس کی وفات پر اس کا بیٹا عبیداللہ عراق کا گورنر بنا[1] اواخر (۵۵ھ) اسی عبیداللہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص کے بیٹے عمرو کی زیر کمانڈ یزیدی فوجیوں کی مدد سے جس میں عجمی نومسلم، کفار[2] ومنافقین اور عیسائی وغیرہ شامل تھے کوفہ[3] سے ۲۵ میل شمال مغرب میں ۱۰/ اکتوبر ۶۸۰ء (۱۰ر محرم ۶۱ھ) کو رسولؐ کے خاندان کے افراد اور ان کے اصحاب کو بیعت نہ کرنے کی پاداش میں شہید کرایا۔

واقعۂ کربلا میں نسلی عصبیت اور خاندانی طاقت وشوکت کا عنصر غالب تھا، اس لیے تمام کاموں میں ہر طرف سے آنکھ بند کر کے صرف غلبہ و استیلا ہی مطمح نظر رہا، اور اس میں دین و اخلاق اور عقیدہ و عمل کی دھجیاں اڑا دی گئیں[4]۔ اس طور سے یہ سرگزشت واقعہ حرہ مدینہ منورہ اور محاصرہ مکہ مکرمہ میں بھی پیش آئی۔

اُموی جاہ وجلال کی پشت پر یزید کے بنوکلبی ننھیال

اسی ضمن میں ہم ان اشعار کا بھی ذکر کرنا چاہیں گے، جس میں شاعر جوّاسُ بنُ القعطل

---

1. علامہ جہشیاری کی مشہور و معتبر کتاب الوزراء والکتاب میں ہے:۔

"ولما اتصل بیزید مسیر الحسین رضی اللہ عنہ الی الکوفۃ شاور سر جون بن منصور فی من یولی العراق" (کتاب الوزراء و الکتّاب، طبع مصر، ص ۳۱)

(ترجمہ) "اور جب حسین رضی اللہ عنہ کے کوفہ پہنچ جانے کی خبر یزید کے پاس پہنچی تو اس نے سرجون بن منصور رومی سے مشورہ کیا کہ کس شخص کو عراق کا گورنر بنائے۔"

چناں چہ ابن سرجون رومی نے یزید کو امیر معاویہ کی ایک دست خطی دست آویز بھی دکھائی، جو انھوں نے اپنی وفات سے چند روز پہلے تحریر کروائی تھی اور اس میں عامل بصرہ عبیداللہ بن زیاد کو کوفہ کا بھی عامل مقرر کیا گیا تھا۔ (ابن اثیر (م: ۶۳۰ھ/۱۲۳۳ء)، الکامل فی التاریخ، جز ثالث، دارالکتاب العربی۔ بیروت، لبنان، ۲۰۱۰ء، ص ۱۳۵)۔

2. دیکھیے۔ احمد سعید، مولانا مولوی حاجی۔ "وعظ سعید کامل" (مشمولہ بعنوان: محرم الحرام، ص ۵۴۷)، ایچ۔ایم سعید کمپنی، کراچی۔ س ن

3. کوفہ بغداد سے کم وبیش ڈیڑھ سو کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ شہر ۱۷ہجری میں فاروق اعظمؓ کے زمانہ میں سعد بن ابی وقاصؓ نے فوجی چھاؤنی کے طور پر بسایا تھا۔

4. اطہر مبارکپوری، قاضی۔ "سیدنا علی وسیدنا حسین رضی اللہ عنہما"، ص ۱۷۱

الکلبی، عبدالملک بن مروان (۲۷ر رمضان ۶۵ھ۔۱۵ر شوال ۸۶ھ/ ۷ر مئی ۶۸۵ء۔۱۹ر اکتوبر ۷۰۵ء) کی ہجو کہتا ہے۔ شاعر اپنے ماحول کا ترجمان ہوتا ہے۔ وہ اپنے عہد کے جذبات کا موثر طریقہ سے اظہار کرتا ہے۔ دیکھیے وہ کس حسن و خوبی سے اپنی شاعری میں بنو کلب کی نصرت و حمایت برائے اُموی خلافت کو دکھاتا ہے کہ اُن کی شبیہ بے کم و کاست نظر آتی ہے۔ یہ شبیہ سیدھی بھی ہے اور حقیقی بھی۔ شاعر نے یہاں غلو اور مبالغہ سے اجتناب کیا ہے۔

اعبدَ الملیك ما شَكرتَ بلائنا فكُلْ فی رخاءِ الاَّ من ما انتَ أكِلُ

اے عبدالملک! تو نے ہمارے احسانات کا شکریہ ادا نہیں کیا۔ اب تو امن و آسائش میں جو چاہے کھائے۔

بجابیةِ الجَولانِ لولا ابْن بحدَلٍ هلكتَ ولم ینطِق لقومِك قائِلُ

اگر مقامِ جابیہ[1] میں جو کوہ جولان کے متصل واقع ہے، ابن بحدل (تمھاری مدد نہ کرتا) تو تم ہلاک ہو جاتے اور تیری قوم میں کوئی بھی بولنے والا نہ بول سکتا (یعنی قوم کا کوئی خلیفہ منبر پر چڑھ کر خطبہ نہ دیتا)۔

فلمّا عَلوتَ الشامَ فی رأسِ بَاذِخٍ من العِزِّ لا یَسْتطِیعُهُ المُتنَاوِلُ

---

[1] جابیہ، دمشق اور اردن کے شہر طبریہ کے درمیان واقع تھا، یہ شہر آج بھی اسی نام سے موجود ہے اور بہت بڑی فوجی چھاؤنی ہے۔ معاویہ ثانی بن یزید کی دست برداری (۶۴ھ) کے بعد بنو اُمیہ کے ارباب حل و عقد یہاں جمع ہوئے۔ چالیس دن تک ان کی مشاورت چلتی رہی بالآخر وہ مروان بن حکم (عہد خلافت ۶۴ھ تا ۶۵ھ) کی خلافت پر متفق ہو گئے۔ مروان کی بیعت جابیہ کے مقام پر ۳ر ذی قعدہ ۶۴ھ/ جون ۶۸۴ء میں ہوئی۔

یہاں اس امر کا اظہار ضروری ہے کہ جب مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ میں ابن زبیر (ربیع الاوّل ۶۴ھ تا جمادی الثانی ۷۳ھ/ نومبر ۶۸۳ء تا اکتوبر ۶۹۲) کی بیعت ہو چکی تھی تو بصرہ، کوفہ، جزیرہ، بابلستان، خراسان، مصر اور شام کے اکثر علاقوں میں بھی وہاں کے گورنروں نے آپ کی بیعت کر لی، صرف شام کا ایک علاقہ اردن، جہاں مالک بن بحدل کلبی گورنر تھے اور یہ یزید کے ماموں تھے، ابن زبیر کی بیعت سے باہر تھے، اہل شام، اقتدار کو شام ہی میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی لیے موتمر جابیہ میں انھوں نے مروان بن حکم کو اپنا خلیفہ چن لیا، جس نے اسی سال پورے شام اور مصر پر قبضہ مستحکم کر لیا اور ایک ہی سال میں یہ دونوں اہم ترین علاقے عبداللہ بن زبیر کی خلافت سے نکل گئے۔ سیوطی، امام ذھبی کے اس بیان کو درست سمجھتے ہیں کہ مروان کو خلیفہ نہ شمار کرنا چاہیے کیوں کہ اس نے عبداللہ بن زبیر سے بغاوت کی تھی اس لحاظ سے وہ باغی ہے۔ اس کا اپنے بیٹے عبدالملک کو اپنا ولی عہد مقرر کرنا بھی درست نہیں ہے۔ (نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر۔ 'خوارج ایک مطالعہ'، ص ۱۳۷ و حاشیہ ص ۱۶۳)

جب تو شام میں کامرانی کے ساتھ داخل ہوا، تو عزت کی وجہ سے تمھیں وہ بلند مقام نصیب ہوا تھا جو چھینا نہیں جا سکتا۔

نفحتَ لنا سَجلَ العَداوۃِ مُعرِضًا کانَّکَ ممّا یُحدِثُ الدَّھرُ جَاھِلُ

تو تو نے ہمارے لیے دشمنی کا ڈول اُس وقت ہلایا، جب تو ہم سے منھ موڑ چکا تھا۔ تم حوادثِ زمانہ سے بے خبر ہو (جو عزیز کو ذلیل اور ذلیل کو عزیز بنا دیتے ہیں)۔

و کنتَ اذا اَشرفتَ من رَاسِ ھَضبۃٍ تَضاألتَ اِنَّ الخائفَ المتضائِلُ

اِس جلیل منصب کے حصول سے قبل، تیرا یہ حال تھا کہ جب تو کسی بلند چوٹی پر چڑھتا، تو مارے ڈر کے تو سہم جاتا (تجھ پر ذلت طاری ہو جاتی تھی)۔ بے شک خوف زدہ شخص ہی ڈرا کرتا ہے۔

فلَو طلوَ عُونی یومَ بُطنانَ اسلمَتْ لقیس فُرُوجٌ مِنکم و مَقاتِلُ

اگر میرا قبیلہ (بنو کلاب)[1] اُس دن میری بات مان لیتا جب بطنان کے مقام پر جنگ ہوئی تھی تو بنی قیس[2] تم کو مار ڈالتے، اور تمھاری عورتوں کی عصمت اور تمھارے مردوں کے آلاتِ حرب اُن کے قبضے میں ہوتے۔[3]

یزید بن معاویہ

حضرت امیر معاویہؓ کا بڑا بیٹا اور جانشین (۶۰ھ/۶۸۰ء تا ۶۴ھ/۶۸۳ء)۔ وہ بنو کلب

---

۱ ہجرتِ نبوی سے قبل مدینۃ النبیؐ کا نام یثرب تھا۔ قبیلہ بنو کلاب پہلے یہیں آباد تھا، بعد میں ملکِ شام کی طرف کوچ کر گیا۔ (تمدن عرب، ص ۲۹)

۲ کلب اور قیس کے خاندان جن کی باہمی مفاہمت بنو اُمیہ کی تقویت اور استحکام کا باعث ہوئی تھی، ایک دوسرے کے ساتھ مرجِ راہط کے مقام پر ۶۴ھ/۶۸۴ء میں نبرد آزما ہوئے۔ معرکہ مرجِ راہط کے بعد پورے شام نے مروان کی اطاعت قبول کر لی۔ اوّل الذکر مروان کے لیے لڑا، تو موخر الذکر ابنِ زبیرؓ کے لیے۔ تاہم انھیں ایک سال سے زائد خلافت کا موقع نہ ملا۔ ۲۷ رمضان ۶۵ھ/۷ مئی ۶۸۵ء کو بہ عمر ستر سال وبائی مرض طاعون میں مبتلا ہو کر انتقال کیا اور دمشق میں تدفین ہوئی (ایضاً ص ۲۸۲ و خوارج۔ ایک مطالعہ، حاشیہ، ص ۱۶۴)۔

۳ تمدنِ عرب مولفہ محمد احسان الحق سلیمانی، ص ۳۱۱-۳۱۲، (قومی کتب خانہ، لاہور۔ اشاعت دوم، ۱۹۵۶ء)، دیوان الحماسۃ، مکتبۃ السلفیہ، لاہور، ۱۹۷۹ء، ص ۴۳۶، ۴۳۷

کے سردار حسان بن مالک بن بحدل کی بیٹی میسون کے بطن سے تھا، حضرت نائلہ بنت فراصفہ (جس کا تعلق بنوکلب کے عیسائی قبیلہ سے تھا) میسون کی خالہ زاد ہم شیر تھی۔

میسون کے باپ حسان بن مالک اور بنوکلب کی اموی دربار میں بڑی قدر و منزلت تھی، اس لیے اس نکاح کا ایک سیاسی پس منظر بھی تھا۔[1]

یزید کی ولادت ۲۲ھ/۶۴۲ء یا ۲۵-۲۶ھ/ ۶۴۵-۶۴۶ء) میں ہوئی (البدایہ، ۸:۲۲۶، ۲۲۷، نیز الطبری)۔ بقول حضرت خواجہ حسن نظامی، یزید اعلیٰ درجے کا ادیب و شاعر بھی تھا۔ اوصاف شراب میں اس کا کلام شہرۂ آفاق تھا۔

مولانا نعیم الدین مرادآبادی (م:۱۹۴۸ء) اپنی مشہور کتاب ''سوانح کربلا'' میں یزید کے مختصر تعارف کے تحت لکھتے ہیں:

> ''یزید بن معاویہ ابو خالد اُموی وہ بدنصیب شخص ہے جس کی پیشانی پر اہل بیت کرام کے بے گناہ قتل کا سیاہ داغ ہے جس پر ہر قرن میں دنیائے اسلام ملامت کرتی رہی ہے اور قیامت تک اس کا نام تحقیر کے ساتھ لیا جائے گا۔
>
> بد باطن، سیاہ دل، ننگ خاندان ۲۵ھ میں امیر معاویہ کے گھر میسون بنت بحدل کلبیہ (بحدل اس کے پردادا کا نام تھا، والد کا نام حسان ہے) کے پیٹ سے پیدا ہوا۔ نہایت موٹا، بدنما، کثیر الشعر، بدخلق، تندخو، فاسق، فاجر، شرابی، بدکار، ظالم، بے ادب، گستاخ تھا۔ اس کی شرارتیں اور بے ہودگیاں ایسی ہیں جن سے بدمعاش کو بھی شرم آئے۔''

یزید کی پرورش کہاں اور کس ماحول میں ہوئی۔ ذیل میں اس کا ذکر کیا جانا ضروری ہے۔ جیسا کہ یزید کی ماں میسون ایک بدوعورت تھی اور اس نے شام کے کھلے صحراؤں میں پرورش پائی تھی، اس لیے وہ جلد ہی دمشق کے شہری ماحول سے اُکتا گئی۔ احسان الحق اپنی تالیف تمدن عرب میں لکھتے ہیں۔ میسون ہمیشہ شہر کی تکلفانہ زندگی پر دیہات کی سادہ زندگی کو ترجیح دیتی تھی، جہاں کی ٹھنڈی ہوائیں، لہلہاتی کھیتیاں، کتوں کے بھونکنے کی آواز اور فطرت کی سادگی، شہر (دمشق) کی مکدر فضا، بے برگ و بار زمین اور پالتو جانوروں کی مختلف آوازوں سے کہیں بہتر تھی۔ میسون نے اس موقع پر جو اشعار کہے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں (اس کے اشعار کا انگریزی ترجمہ نکلسن اور

---

[1] اردو دائرہ معارف اسلامیہ، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۹ء، ۲۳:۲۹۱

رچرڈ برٹن نے کیا ہے)۔[1]

پروفیسر فلپ حتی تاریخ اعراب ص ۱۹۵ پر لکھتا ہے۔ میسون کو صحرا سے محبت تھی۔ اسے حضرت معاویہ یا ان کے دربار یا دمشق سے کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ صحرا کی بیٹی تھی صحرا سے محبت اس کی گھٹی میں پڑی تھی اس لیے وہ بار بار اپنے میکے آیا کرتی تھی۔ اور اپنے بیٹے یزید کو اپنے ہم راہ لے جایا کرتی تھی[2]۔ اس بارہ میں چند سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کیا وہ بار بار پامرینا، اپنے عیسائیوں راہبروں سے ہدایات لینے جاتی تھی؟ کیا وہ انھیں خفیہ معلومات بہم پہنچاتی تھی؟ یا ان کی سازشوں، تجویزوں اور منصوبوں کی تجویز و تکمیل میں شرکت کے لیے وہاں جایا کرتی تھی؟ اس ضمن میں ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک دن وہ ایک غزل گا رہی تھی (وہ غزل اس کی اپنی نہ تھی بل کہ پرانے زمانہ سے مشہور تھی اور کسی نامعلوم شاعر کی لکھی ہوئی تھی) جس کے ایک شعر کا مطلب یہ ہے ''اے کاش! ایک موٹے بڈھے کے بجائے میرے چچا کا دراز قامت بیٹا ہوتا جس سے میں منسوب ہوتی۔'' حضرت معاویہ نے یہ شعر سُن لیا اور میسون کو اپنے گھر سے نکال دیا اور وہ اپنے میکے چلی گئی۔

میسون جو غزل گنگنا رہی تھی، اسے خلیل احمد جمعہ نے بھی اپنی عربی تصنیف **نسَاءٌ مِّن عَصْرِ التَّابِعِیْن** (۱۴۱۲ھ) میں نقل کیا ہے۔ یہاں اشعار کی تعداد نو (۹) ہے۔ اس کتاب کا اردو ترجمہ: دورِ تابعین کی نامور خواتین (طبع دارالاشاعت) جامعہ دارالعلوم کراچی کے فاضل مولانا ثناء اللہ محمود، صدر مدرس جامعہ احسن العلوم نے کیا ہے۔ غزل کا وہ شعر بالخصوص جس نے حضرت امیر کو چونکا دیا اور نوبت علاحدگی تک آ گئی، یہ ہے:

وَ خِرقٌ مِن بنی عمّی نحیفٍ
اَحبُّ الیّ مِن عِلجٍ علیفٍ[3]

(اور میرے چچا کے خاندان کا ایک بکری کا بچہ مجھے ایک اچھے پرورش پائے ہوئے گدھے سے زیادہ عزیز ہے)۔[4]

۱۔ ص ۱۹۶، Aliterary History of the Arabs: Nicholson

۲۔ انسائیکلوپیڈیا اسلام، جلد سوم، ص ۱۵۶

۳۔ علیف: ''وہ چوپایہ جسے موٹا کرنے کے لیے چارہ کھلایا جائے اور چراگاہ نہ بھیجا جائے۔'' (القاموس الوحید، طبع لاہور، ۲۰۰۱ء، ص ۱۱۱۵)

۴۔ ''تمدن عرب''، ص ۲۷۳، ۲۷۴

المملكة العربية السعودية
وزارة المعارف
المديرية العامة للأبحاث والمناهج والمواد التعليمية

قررت وزارة المعارف تدريس هذا الكتاب وطبعه على نفقتها

القراءة العربية

للصف السادس الابتدائى

تأليف

صالح بن حمد المالك — أحمد فرج عقيلان
محمود شوقى غريب — إبراهيم حلمى سلام

الطبعة الثالثة
١٣٩٧ هـ - ١٩٧٧ م
يوزع مجانا ولا يباع

عکس سرورق: «القرأة العربيه» وزارت تعليم، مملكت سعودى عرب، اشاعت سوم ١٩٧٧ء

١٧ – « حنين إلى البادية »



قَدِمَ على معاويَة فى الشام سيّدٌ من سادَاتِ قحْطانَ يُقالُ لَه : بَحْدَلٌ الكَلْبِيُّ ، وكانَ مَعهُ للخليفةِ هديّةٌ من أكرمِ الإبِلِ فى بلادِ نَجْدٍ .

فتقبّلَ معاويةُ هديتَهُ وَأكْرمَ مَثواهُ وأعطاهُ مكافأَةً عظيمةً . ولما هَمَّ بَحْدَلٌ بالانصراف قَال له الخليفةُ : سمعتُ يا بَحْدَلُ أن لك ابنةً يقالُ لها مَيْسونُ . على جانبٍ كبيرٍ من الأَدبِ فهلْ تُزَوِّجُنى إيّاها ؟ فوافقَ بحدلٌ وزُفَّت ميسونُ إلى الخَليفةِ .

وبهذا استبدلتْ بمَضارِبِ قَوْمِها فى اليَمامةِ قَصْرَ الخليفةِ فى دمشْقَ .

نسخة مجانية

وبعد أن مكثت شهراً فى قصرِ الخليفةِ شعرتْ بشوقٍ عظيمٍ إلى حياةِ البداوةِ وحَنَّتْ إلى شَمْسِ الصحراءِ وهوائِها وبساطةِ الباديةِ وصفائِها .

وفى ذاتِ ليلة كانتْ جالسةً فى حُجْرتِها فَسَمِعَها الخَلِيفَةُ وهى تُنْشِدُ هذهِ الأَبياتَ :

لَبَيْتٌ تَخفِقُ الأَرياحُ فِيــهِ	أَحبُّ إلىَّ من قصرٍ مُنيــفِ
وَلُبْسُ عبــاءةٍ وتقــرُّ عَيْنِى	أَحبُّ إلىَّ من لُبسِ الشُّفُوفِ
وكلبٌ يَنبحُ الطُّــرَّاقَ دُونى	أَحبُّ إلى من قطٍّ أَليــفِ
وأَصواتُ الرياحِ بكلِّ فــجٍّ	أَحبُّ إلىَّ من نَقْرِ الدُّفُوفِ
خشونةُ عِيشتِى فى البدوِ أَشْهَى	إلى نَفْسِى من العيشِ الظَّرِيفِ
فما أَبْغِى سِوى وطنِى بديــلًا	وحسبى ذاكَ من وطنٍ شَرِيفِ

فتــأثرَ معاويةُ منْ حُزْنِها على وطنِها وحنينِها إلى عَيْشِهَا الأَوّلِ فطلقهَا وأَلحقَها بـأَهْلِها وعادتْ ميسُون إلى قومِها قريرةَ العينِ لتعيشَ فى الباديةِ وهُناكَ وَلَدَتْ ابنَها يزيدَ . وهو الابنُ الوحيدُ لمعــاويةَ .

شَرْحُ الْكَلِمَاتِ :

مَثْــواه : مُقامَه .

زُفَّتْ : زُوِّجتْ

مزید لکھا گیا ہے:

''پھر جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ تشریف لائے تو لونڈی نے ان کو وہ سب بتلایا جو میسون کہہ رہی تھیں۔ اور یہ بھی کہا گیا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے وہ سب کچھ سن لیا تھا جو وہ اشعار کہہ رہی تھیں تو انھوں نے کہا کہ بحدل کی بیٹی اس وقت تک خوش نہیں ہوگی حتیٰ کہ وہ مجھے پالتو گدھا بنا دے۔ وہ طلاق والی ہے (یعنی میں نے اسے طلاق دی) جو کچھ محل میں ہے اس کا ہے وہ سب لے جائے۔

پھر انھوں نے میسون کو ان کے گھر روانہ کر دیا وہ اپنے ساتھ اپنے بیٹے یزید کو لے گئیں اور پھر یزید نے دیہات میں[1] پرورش پائی اور فصیح بنے۔[2]

---

[1] ''میسون اپنے وطنِ مالوف کو لوٹ گئی۔ یزید کی پرورش بدویانہ ماحول میں ہوئی، جہاں اس نے پاکیزہ زبان سیکھی۔ لیکن ماحول کے اثر سے متاثر یزید اُنھی خصوصیات کا حامل نظر آتا ہے جو بدوؤں میں پائی جاتی ہیں۔ مثلاً لذتیت، تطہیرِ فکر سے بُعد، اور کُلّیاتِ مذہب سے انحراف۔ اُس کے عہد کا اہم ترین اور رُوح فرسا واقعہ سیّدنا حسینؓ کا قتل ہے، جو بہ مقامِ کربلا ۱۰/ اکتوبر ۶۸۰ء کو رونما ہوا۔

یزید نے عیش و آرام کی گود میں پرورش پائی۔ تمکنت اور عشرت کے ماحول میں پروان چڑھا۔ وہ حکومت کے بارِ گراں کا متحمل نہ ہو سکتا تھا۔ زندگی غیر اسلامی سانچے میں ڈھل گئی تھی۔'' (محمد احسان الحق ایم، اے۔ تمدنِ عرب، ص ۲۷۴)

[2] دور تابعین کی نامور خواتین، ص ۵۶، ۵۷ بحوالہ حیاۃ الحیوان (صفحہ ۲۱۲-۲) اور دیکھیے الحماسۃ الشجریہ (صفحہ ۵۷۳ و ۵۷۴-۲)، تاریخ دمشق (صفحہ ۴۰۰)، شاعرات العرب (صفحہ ۳۹۶)، الاعلام (صفحہ ۳۳۹-۷)۔

نوٹ: مترجم محترم نے یہاں جو حاشیہ آرائی کی ہے وہ دلچسپی سے خالی نہیں، وہ لکھتے ہیں: یہ قصیدہ (یعنی میسون کے کہے جانے والے اشعار۔ قصیدہ، وہ نظم جو کسی کے لیے مدح یا ذم کے ارادے سے کہی جائے اور پندرہ اشعار سے کم نہ ہو، اس کے مطلع کے دونوں مصرعے باقی شعروں سے ہم قافیہ ہوں۔ اس میں پہلے چند اشعار میں کسی موسم یا وقت وغیرہ کی تعریف میں شاعر اپنا زورِ کلام دکھاتا ہے) کتب تراجم میں موجود ہے اور یہی میسون کی شہرت کا سبب بنا۔ اس لیے کہ یہ کتب ادب و تاریخ میں بھی منقول ہے اور بعض شواہد نحو یہ نحوی کتابوں میں بھی ملتے ہیں، لیکن امانت کا حق ہم پر یہ ہے کہ ہم خاتون کی جو تابعی خواتین ہیں، قدر کریں اور یہ ایک صحابی کی زوجہ بھی ہیں اور حدیث کی راوی (راویہ) بھی...... اور یہ کہ ان کے کلام اور قوام کا کتب میں بہ حفاظت موجود ہونا ان کی رفعت مکانی کی اور ہم عصر خواتین اور خلفا کی ازواج پر فضیلت کی دلیل ہے۔

(باقی بر صفحہ آیندہ)

علامہ بغدادیؒ (ابی جعفر محمد بن حبیب البغدادی متوفی ۲۴۵ھ/۸۶۰ء) نے ''خزانۃ الادب'' میں نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے جب انھیں طلاق دی تو انھیں کہا، تو پیاری تھی اب آزاد ہے تو انھوں نے جواب دیا جب ہم اکٹھے تھے تو کوئی خوشی نہ تھی اور اب جب کہ جدا ہیں تب بھی کوئی غم نہیں۔''[1]

ڈاکٹر محمد یوسف لکھتے ہیں۔ میسون اپنے خاوند کی وفادار نہ تھی۔ خاوند کے مذہب سے اس کو کوئی لگاؤ نہ تھا۔ یہ سیاسی مصلحت کی ایک شادی تھی اور یہ عورت اپنے خاندان اور اپنے ہم مذہبوں کے لیے ہر ممکن مراعات حاصل کرنا اس شادی کا ماحصل سمجھتی تھی۔ جب وہ پامرینا گئی تو اپنے بیٹے یزید کو بھی ہم راہ لے گئی۔ یزید بنو کلب میں پلا اور بڑا ہوا۔ میسون نے بڑی کوشش اور احتیاط سے یزید کی تعلیم و تربیت کی۔ ریگ زاروں میں تعلیم ہی کیا تھی۔ لے دے کے عیسائیت کی تعلیم تھی۔ اسلام دشمنی کا جذبہ تھا جو یزید کے دل میں پیدا کیا گیا۔ جس طرح آج کل کے کونٹ اسکولوں سے یہ توقع رکھی جائے کہ وہ مسلمان بچوں کو اسلامی تعلیم دیں گے عبث ہے، اسی طرح کسی عیسائی گھرانہ میں، عیسائی ماحول میں اور عیسائی قبیلہ میں عیسائی ماں کے بچے کو اسلامی تعلیم دینے کا خیال ہی بے معنی ہے۔ پامرینا کے ریگ زار میں شاعری اور عیسائیت کی تعلیم ہی تمام تر تعلیم تھی، جس عورت کو خاوند کے گھر سے دھکے دے کر نکال دیا گیا ہو، وہ میکے میں رہنے پر مجبور ہو اور اس کا اپنا گھر اُجڑا ہوا ہو، تو اسے اپنے خاوند کی ہر چیز، عادت، عقیدہ اور خیال سے نفرت ہو جاتی ہے۔ انگریزی ضرب المثل ہے۔ ''جہنم بھی ایک عورت جتنا غضب ناک نہیں۔'' میسون غضب ناک تھی۔ اسے اپنا مذہب و عقیدہ عزیز تھا نہ کہ اپنے خاوند کا۔ وہ جس سوسائٹی میں واپس گئی تھی، اُسی میں وہ پلی اور بڑی ہوئی تھی۔ اسی میں اس کا بیٹا پلا اور بڑا ہوا اور وہیں کے فیشن، طرزِ زندگی، خیالات، جذبات، عزت و افتخار کے بارہ میں تاثرات اس کے بیٹے نے اختیار کیے۔ یزید پامرینا کی سوسائٹی، ماحول اور معاشرے میں وہیں کے جذبات کو اپنا سکتا تھا۔ وہاں کا ماحول سراسر عیسائیت

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

مترجم نے حاشیہ میں میسون کے حوالے سے جو حدیث بیان کی ہے وہ لغو اور غلط ہے (دیکھیے: میسون، اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، طبع دانش گاہ پنجاب۔ لاہور، ۲۱: ۹۷۳)۔

[1] دورِ تابعین کی نامور خواتین، ص ۵۷ بہ حوالہ خزانۃ الادب (صفحہ ۵۹۳-۳)

کا ماحول تھا۔ میسون کی ذہنی کیفیت اور گردوپیش کے حالات کے زیر اثر، یزید کو قبیلہ بنی کلب میں نیک نام، بلند مرتبت اور عالی مقام بنانے کے لیے جو کچھ پڑھایا لکھایا گیا وہ عیسائیت کی طرف لے جانے والا تھا نہ کہ اسلام کی طرف۔ آغوش اور بچپن کی تعلیم وتربیت اور جوانی کا ماحول عیسائیت کی طرف لے جانے والے تھے۔ ان سے اسلام کی جانب رغبت والفت اور التفات و محبت کی توقع ہی نہ کی جاسکتی تھی۔ یزید کے کام شعرگوئی، گھڑ سواری، شکار، شکار کے لیے کتے پالنا، تصویریں رکھنا (تصویریں تو عیسائیوں کے ہر گرجے میں ہوتی ہیں) شراب نوشی میں مشغول رہنا وغیرہ تھے۔ وہ لہو ولعب کا شیدائی تھا۔ خمریات اور عشق ومحبت کے بے شمار اشعار اسے یاد تھے۔ اسے ناچ گانے، راگ رنگ کا شوق تھا۔ وہ فسق وفجور میں مبتلا تھا، اس لیے اسے اسلامی قوانین، عقائد اور نظریات کو ٹھکرانے کی جرأت پیدا ہوئی۔ یہ سب کچھ وہ اپنے گہوارۂ اول میں یعنی اپنی ماں کی آغوش، اپنے عیسائی اُستادوں کی تعلیم وتربیت، اپنے عیسائی دوستوں، عیسائی قبیلہ اور عیسائی ماحول کے طفیل سیکھ چکا تھا۔ جس طرح واٹرلو، کے قول کے مطابق نپولین کے خلاف جنگ، ایٹن اور ہیرو کے کھیل کے میدانوں میں لڑی گئی تھی اسی طرح سانحہ کربلا، المیہ حرہ اور واقعہ سنگ باری بیت اللہ کا نقشہ آغوشِ مادرِ یزید میں تیار ہوا تھا، جس سے دین اسلام کی وحدت کو ہمیشہ کے لیے دو متصادم کیمپوں میں تقسیم کر دیا گیا اور جس کے ذریعے عیسائیوں نے نئے مذہب کے خلاف انتقام لیا، اس کے قابل عزت وحرمت مقامات کی بے حرمتی کی نیز اس کے نام لیواؤں کو تہ تیغ کر کے اُن کی عزت وعصمت کو لوٹا۔ مسلمانوں کے خلاف تخریب کاری میں شام اور عراق کے عیسائی قبیلوں کے افراد نے حصہ لیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو شہید کرنے والے، حضرت حسنؓ کو زہر دینے والے[1]۔ حضرت حسینؓ کو شہید کرنے والے تخریب کار، خود غرض اور اسلام دشمن لوگ ہی تو تھے۔ خوارج خود بخود پیدا نہیں ہوئے تھے، ان کے پیچھے وہی ہاتھ تھا جو مسجد ضرار بنوانے والا تھا۔ ان عیسائی قبائل، خوارج اور تخریب کاروں کی سرپرستی بازنطینی حکومت اپنے تحفظ وبقا کی خاطر، اپنے مذہب کی حمایت ومدافعت، اپنے دشمنوں کو تباہ وبرباد کرنے کے لیے کرتی تھی۔ جنگ صفین کے موقع پر قیصر روم نے حضرت علی اور حضرت معاویہ دونوں کے پاس ایک دوسرے کے خلاف مدد کی پیش کش کے یکساں پیغامات بھیجے۔ یہ پیغامات رومی سازش، فساد اور تخریب کا واضح ثبوت ہیں۔

---

[1] حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو ان کی بیوی کے ذریعہ زہر دلایا گیا۔ (عامہ کتب تاریخ)

یہ پیغام بھجوایا ہی اس لیے گیا تھا کہ دونوں گروہ آپس میں لڑ کر تباہ ہو جائیں۔ اس سے عیسائیوں کے ہی دشمن کم ہوں گے۔[1]

یزید کے دور میں بھی اہم عہدوں پر عیسائی تعینات تھے۔ اس نے اپنے والد کے بیشتر عمال اور گورنروں کو بحال رکھا۔ 'یزید نامہ' میں حضرت خواجہ حسن نظامی نے بحوالہ عقد الفرید لکھا ہے کہ ''یزید کا کوتوال حمید بن حریث بن بحدل[2] تھا اور کاتب و صاحب الامر (ہوم سیکریٹری و پرائیویٹ سیکریٹری) سرجون بن منصور تھا، وزیر العدالت کا منصب ابو ادریس الخولانی کے پاس تھا، اور وزارت مال سلمہ بن حدیدۃ الارزی کے پاس تھی۔'' چناں چہ مالیات کے شعبے میں نجران کے عیسائیوں سے محصولات کا بوجھ کم کیا گیا۔[3]

یزید کے دوست بھی عیسائی تھے۔ اس کے جوانی کے دوستوں میں ولی یوحنا (سینٹ جان) دمشقی بھی تھا۔ یہ شخص عیسائی مذہب میں ولی کے درجہ تک جا پہنچا۔ بت شکن Iconoclast نہ تھا بل کہ بت پرست (Iconodule) تھا[4]۔ اس کے ولی بننے کا سبب عیسائیت میں اس کا انتہائی غلو تھا۔ یہاں اس بات کا دھیان رہے کہ خوارج کے پیش رو قدریہ فرقہ کا بانی یزید کا جگری دوست سینٹ جان دمشقی تھا[5]۔ سینٹ جان دمشقی کو ایشیائی یونانی چرچ کا سب سے بڑا اور آخری مذہبی

---

[1] ان تفاصیل کے لیے محمد یوسف کا مقالہ یزیدی الیموں کا پس منظر۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، رسالہ اسلامی تعلیم ملاحظہ کیا جا سکتا ہے جلد ۲، شمارہ ۵۔ آل پاکستان اسلامک ایجوکیشن کانگرس لاہور، ایڈیٹر ڈائرکٹر چودھری مظفر حسین مشیر رسالہ ڈاکٹر سید عبداللہ۔

[2] غالباً یہ وہی بحدل کلبی ہیں، جو قحطان کے سرداروں میں سے تھے، قرابت میں یزید کی والدہ میسون کے پردادا تھے۔ حضرت معاویہ کی شام آمد پر قبیلہ کے سردار نے بلا دنجد کے بیش قیمت اونٹ پیش کیے، اور انھیں اپنے ہاں نہایت عزت و احترام سے ٹھہرایا۔ بہ حیثیت خلیفہ امیر معاویہ نے بھی بحدل کو عظیم تحائف عطا کیے۔ پھر بحدل جب خلیفہ سے ملنے کے لیے آئے تو انھوں نے میسون کے لیے (جو ایک ادیبہ اور جسے شعر و شاعری سے بھی شغف تھا) پیغام ڈالا۔ چناں چہ بحدل نے اسے شرف قبولیت بخشتے ہوئے میسون کا نکاح خلیفہ سے کر دیا، اور اسے اس کے خاندان سے جو یمامہ میں خیموں کے گھروں میں قیام پزیر تھے، دمشق میں خلیفہ کے محل میں منتقل کر دیا۔ نیز میسون کے والد حسان بن مالک بن بحدل کے لیے بھی قیام کا بندوبست کیا گیا۔ رئیسِ قبیلہ بحدل کی نسبت سے اس کا نام 'قصر البحاولہ' رکھا گیا۔

[3] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، جلد ۲۳، ص ۲۹۵

[4] یزیدی الیموں کا پس منظر، ص ۲۸ بحوالہ تاریخ شام، فلپ کے ہٹی، ص ۴۴۰

[5] ایضاً، بحوالہ History of the Arabs by P. K. Hitti, Page 246

علوم کا ماہر تسلیم کیا جاتا ہے۔اس کے تصنیف کردہ گانے اب بھی پراٹسٹنٹ مذہب کے گرجوں میں گائے جاتے ہیں۔ گیت ساز مذہبی علوم کے ماہر۔ خطیب اور مذہبی مصنف، نیز بزنطائی فن کے مدون کے طور پر وہ اُموی خلافت کے عہد میں چرچ کی ایک نہایت ممتاز شخصیت نظر آتی ہے۔ قدریہ فرقہ فلسفیانہ طرز فکر کا سب سے پہلا اسلامی مکتب فکر تھا۔ اس کا بانی یہی ولی یوحنا دمشقی (سینٹ جان) تھا۔ خوارج اسلام میں سب سے پہلا مذہبی اور سیاسی فرقہ تھا۔ انھوں نے عہد اسلام کی پہلی تین صدیوں میں مسلمانوں کے خون کے دریا بہادیے۔ وہ اولیا اور صوفیہ کے بھی خلاف تھے۔

یزید کا دوسرا دوست حیرہ کے نصرانی قبیلہ بنوتغلب کا الاخطل تھا۔ یہ حضرت معاویہ اور یزید دونوں کا ملک الشعرا بھی بنا۔ یہ یوحنا دمشقی کا بھی دوست تھا۔ یہ بھی عیسائی تھا اور بلا کا شراب نوش تھا۔ خمریات پر اس نے عمدہ اشعار کہے ہیں۔ یزید نے خاص طور پر اس کی عزت افزائی کی۔ یہ خلیفہ کے محل میں داخل ہوتا تو ایک صلیب اس کی گردن سے لٹکتی ہوتی تھی۔ محل میں آ کر وہ خلیفہ اور اس کے درباریوں کو اپنے اشعار سے محظوظ کرتا۔[1]

ایسے کرڈ عیسائی اور اوباش دوستوں کی صحبت میں یزید کے عقاید کی تشکیل ہوئی۔ اسلام اور شارع اسلام پر رکیک حملے کرنا۔ مسلمانوں کے خلاف کدورت رکھنا۔ اور دشمنی اور شرارت کرنے کا کوئی موقع نہ گنوانا۔ عیسائیوں کا شیوہ اور دستور تھا۔ ایسے ماحول میں یزید کا اسلام، پیغمبرؐ اسلام، صحابہؓ کرام، اور اولادِ رسولؐ کے ساتھ کیا تعلق رہ گیا تھا۔ اس طور سے فسق و فجور میں مبتلا ہو کر اپنی ماں، اپنے عیسائی دوستوں اور عیسائی قبیلہ کے افراد کو خوش کرنے کے لیے اسلام کے احکام وقوانین کو ٹھکرانے کی جرأت اور حوصلہ اس میں پیدا ہوا۔ ہٹی نے بھی لکھا ہے۔ 'یزید اپنے لہو ولعب اور عیاشی میں مشہور تھا۔'[2]

یزید نے گانے لکھے بھی اور گائے بھی۔ اسی نے دمشق کے دربار میں گانے کے آلات (مزامیر) کو رواج دیا۔ وہ محل میں شاندار ضیافتوں کا اہتمام کرتا جن کے شراب اور گانا لازمی حصے ہوتے تھے۔ شعرا اور موسیقاروں کا مربی اور قدر دان ہونے کے ناتے اس نے اپنے دور میں اس طبقے کی حوصلہ افزائی کی اور فائدہ پہنچایا۔[3]

---

1. ایضاً ص ۲۹ بحوالہ تاریخ اعراب، فلپ کے ہٹی، ص ۱۹۶
2. تاریخ اعراب، فلپ کے ہٹی، ص ۱۹۱
3. اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۲۳: ۲۹۵

یزید کی تخت نشینی (۶۸۰ء تا ۶۸۳ء)

حضرت امیر معاویہؓ کے دورِ امارت کا سب سے متنازع فیہ مسئلہ یزید کی ولی عہدی کے لیے نام زدگی ہے۔ حضرت حسنؓ سے جب معاہدۂ صلح ہوا تھا تو اس میں من جملہ دیگر امور کے یہ طے پایا تھا کہ حضرت حسنؓ امیر معاویہؓ کے جانشین ہوں گے، مگر ۵۰ھ/۶۷۰ء میں ان کی وفات نے یزید کی مشکلات کو کم کر دیا۔ اس بات پر قریب قریب تمام مآخذ متفق ہیں کہ ولی عہدی کے لیے نام زدگی کی خواہش پہلے پہل خود یزید نے کی تھی (البدایہ، ۴: ۲۲۷) اور غالباً یزید کے زیرِ اثر یہ تحریک ۵۵-۵۶ھ/۶۷۵-۶۷۶ء میں عمال و والیانِ حکومت تک جا پہنچی۔ الطبری اور ابن کثیر وغیرہ مورخین کے مطابق سب سے پہلے جانشینی کی تجویز والیِ کوفہ حضرت مغیرہؓ بن شعبہ نے پیش کی تھی۔

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ۲۳: ۲۹۲)

یزید بچپن ہی سے امارت پسند واقع ہوا تھا۔ اس کی امارت پسندی کے جذبے کو اس کے ننھیال بنو کلب نے مزید جلا بخشی، کیوں کہ شام کے طاقت ور قبیلے بنو کلب کی بھی اسے تائید و حمایت حاصل تھی۔ دوسرے حضرت معاویہ نے پدرانہ محبت کے جوش میں یزید کو ولی عہد بنانے کے لیے۔ سر توڑ کوشش کی، گو ان کے اس اقدام سے دنیائے اسلام کے مستقبل پر بہت برا اثر پڑا اور خلافت ہمیشہ کے لیے ملوکیت کی جانشین بن گئی اور خلافتِ راشدہ کا شورائی نظام قصۂ پارینہ ہو کر رہ گیا۔[1]

یزید کی تخت نشینی کے لیے کی جانی والی میسون کی دوڑ دھوپ اور مساعدت کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر محمد یوسف لکھتے ہیں:

''میسون نے اپنے بیٹے یزید کو مسندِ خلافت پر بٹھانے کے لیے جو جدوجہد کی اس کی پہلی کڑی تو یہ تھی کہ وہ پھر حضرت معاویہؓ کے پاس آ گئی[2]۔ حضرت معاویہؓ کی عمر اس وقت ستر سال سے متجاوز تھی۔ اب جذباتِ عشق و محبت سرد پڑ چکے تھے۔ میسون کو ایک بار نکال دینے کے بعد دوبارہ اسے اپنے پاس بلانے کی تحریک حضرت معاویہؓ کی طرف سے نہ ہوسکتی تھی۔ یہ شادی ابتداً بھی سیاسی مصلحت کے

---

1. ایضاً، ۲۳: ۲۹۱، ۲۹۲

2. انسائیکلوپیڈیا اسلام، ۳: ۱۵۵

تحت تھی اور ملکی مفاد کے لیے تھی۔ اپنی قیادت کو مستحکم کرنے کے لیے تھی۔ اسے آپ نیک نیتی پر مبنی کہہ سکتے ہیں، لیکن اس خاتون کی مصلحت کیا تھی؟ اور جب یزید پیدا ہو گیا۔ بڑا ہو گیا تو اس کی مصلحت اسی میں تھی کہ وہ حاکم و خلیفہ بن جائے۔ اس لیے نہایت کوشش کے ساتھ تعلیم و تربیت دینے کے بعد میسون اپنے صاحب زادے یزید کے ساتھ پھر آ گئی[1] یزید کے خلیفہ بن جانے کا مطلب خلافِ اسلام عیسائی تحریکات کی کام یابی تھا جن کا منبع سلطنتِ روم کی مشرقی بازنطینی شہنشاہیت تھی۔ یہ بازنطینی سلطنت مسلمانوں کی ہمسایہ تھی۔ صحرائے عرب اور شام کے عیسائی قبائل رومی حکومت کے ماتحت بھی رہے تھے اور مسلمانوں کے تحت آنے کے باوجود اپنے سابقہ عیسائی مذہب پر قائم تھے وہ عیسائی مذہب اور رومی حکومت سے جذباتی لگاؤ رکھتے تھے وہ مسلمانوں کے خلاف رومی حکومت کی مدد کیا کرتے تھے......شام کے صحرا میں بسنے والے عیسائی قبائل مسلمان نہ ہوئے تھے۔''[2]

ہٹی لکھتا ہے کہ ہماری نصرانی قوم پر اُموی دور میں مذہباً بہت احسانات کیے گئے[3]۔ آئندہ چل کر حضرت حسینؓ کی شہادت جیسا المیہ ظہور میں آیا جس پر یزید کی حکومت کی عمارت کو منہدم ہو کر خاک میں مل جانا چاہیے تھا لیکن یہ عیسائیوں کی اکثریت اور پشت پناہی تھی کہ وہ حکومت باقی رہی[4] ورنہ کون سا ایسا مسلمان تھا جو ظالمانہ حرکات پر یزید سے متنفر نہ ہو۔ یزید کے دور میں خانوادۂ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کو خاک و خون میں رُلایا گیا۔ صحابۂ کرامؓ اور حفاظِ قرآن کو شہید کیا گیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ، مسجد نبویؐ اور بیت اللہ کی وہ بے حرمتی کی گئی جس کی مثال تاریخ میں نہیں

---

[1] ''اور میسون کی زندگی یوں ہی گزرتی رہی، حتیٰ کہ ان کا انتقال ۸۰ھ میں ہوا'' (دورِ تابعین کی نامور خواتین، ص ۵۸) گویا وہ یزید کے حکم ران بننے کی خوشیوں میں شریک رہی۔ ''سیرت حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ'' (طبع دار الکتاب، لاہور، ۲۰۱۵ء) کے مرتب مولانا محمد نافع نے اپنی ضخیم کتاب جو ۷۹۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ہے، میں صفحہ ۴۱۵ پر میسون کا ذکر عمداً ایک سطر میں کیا ہے اور مصلحتاً یہی وتیرہ سرجون (اسے سرجس بھی کہتے ہیں) بن منصور رومی مسیحی وغیرہ کے لیے روا رکھا ہے۔

[2] یزیدی الیوں کا پس منظر، ص ۳۰، ۳۱

[3] تاریخ شام از فلپ کے ہٹی، ص ۴۲۵

[4] ایضاً، ۴۲۵، ۴۳۹

ملتی۔ مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو انتہائی شدید اور قابل نفرین مظالم کا شکار بنایا گیا، لیکن ان حرکات کے مرتکب کون تھے؟ یہ وہی لوگ تھے جنھوں نے نائلہ (زوجہ حضرت عثمان) کی کٹی ہوئی انگلیاں دیکھی تھیں، جو مسلمانوں کی فوج میں بھرتی تھے، جو سول انتظامیہ کے اعلیٰ عہدوں پر سرفراز تھے۔[1]

یزید نے کل تین سال ۹ مہینے حکومت کی۔ کم وبیش ۳۸ سال کی عمر میں (محاصرہ مکہ کے دوران) بہ عارضۂ نقرس (ایک شدید درد جو پاؤں کی انگلیوں سے اٹھتا ہے) حوارین کے مقام پر فوت ہوا (۱۴ر ربیع الاوّل ۶۴ھ/ ۱۱ر نومبر ۶۸۳ء)۔ اس نے چار شادیاں کیں اور ان سے اس کی کل انیس اولادیں (تیرہ بیٹے اور چھے بیٹیاں) ہوئیں[2]۔ اس کا بڑا بیٹا معاویہ ثانی اس کا جانشین بنا اور بیٹی عائشہ بنت یزید عبدالملک بن مروان کی بیوی بنی۔[3]

اُموی اُمرا کی حرم سراؤں میں نصرانی نقب زنی پر فاروق اعظمؓ کی گرفت

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں شام اور عراق کے عیسائیوں نے کثرت سے اپنی لڑکیوں کی شادیاں مسلمانوں سے کرنا شروع کر دیں۔ حضرت عمر نے بذریعہ فرمان مسلمانوں کی عیسائی عورتوں سے شادیاں کرنے سے باز رہنے کی تلقین فرمائی۔ لوگوں نے حضرت عمر کے فرمان پر اعتراض کیا کہ جب قرآن کریم ہمیں اجازت دیتا ہے کہ ایک کتابیہ سے شادی کرلیں تو آپ کیوں منع فرماتے ہیں، اس پر حضرت عمر نے فرمان واپس لے لیا، لیکن یہ فرمایا کہ یہ تو درست ہے کہ قرآن کریم کتابیہ سے مناکحت کی اجازت دیتا ہے، لیکن مصلحت وقت اس کی اجازت نہیں دیتی۔ حضرت

....

۱ یزیدی المیوں کا پس منظر، ص ۲۴ و ۲۵

۲ ''جنھوں نے کربلا میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاندان کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی کوشش کی، ان کی نسل کا بھی کوئی نام ونشان نہ رہا۔ نوے (۹۰) سال حکومت کرنے کے بعد بنوامیہ بھی گم نام ہوئے۔'' (عبداللہ دانش۔ 'شرح اربعین امام حسین رضی اللہ عنہ' طبع لاہور، العاصم اسلامک بکس، ۲۰۱۵ء، ص ۳۷۳)۔ ''قدرت الٰہی کا معجزہ ہے کہ آل رسول کو مٹانے کی بارہا کوششیں کی گئی ہیں، اور اس چشمۂ کوثر کو خشک کرنے کی بار بار جدوجہد عمل میں آئی ہے، لیکن مٹانے والے خود مٹ گئے، اور آل رسول آج بھی تمام عالم اسلامی میں چشمۂ فیوضات وبرکات بنے ہوئے ہیں جس سے ایمان و اسلام کی شادابی زندہ ہے۔'' (ندوی، عزیز الحق کوثر، علامہ۔ 'جواہر البیان فی تفسیر القرآن'، جلد دوم، کوثر اکیڈمی، بنارس۔ بھارت، ۲۰۰۹ء، ص ۳۷۱)

۳ اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، دانش گاہ پنجاب لاہور، ۲۳: ۲۹۴، ۲۹۵، طبع اوّل، ۱۹۸۹ء

عمر کی مومنانہ فراست نے یہ بھانپ لیا تھا کہ عراق اور شام میں عیسائی دھڑا دھڑ اپنی عورتوں کی شادیاں صاحب حیثیت مسلمانوں کے ساتھ کر رہے ہیں، لیکن حضرت عمر شرعی حد نہیں لگا سکتے تھے اس لیے نصیحت پر اکتفا کی، مگر مسلمانوں نے اسلامی مصالح پر مبنی اس نصیحت پر کچھ عمل نہ کیا۔

حضرت فاروق اعظم کی نظر میں عیسائی عہدے داروں کا تقرر

امام فخر الدین رازی (۵۴۴۔۶۰۶ھ) نے تفسیر کبیر میں حکومت کے کلیدی عہدوں پر عیسائیوں وغیرہ کے تقرر کے بارہ میں حضرت فاروق اعظم کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے، جسے مولانا سلیمان اشرف بہاری نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب 'النور' (۱۹۲۱ء) جو علی گڑھ سے شائع ہوئی، میں بالصراحت درج کیا ہے۔ وھو ھٰذا:

''بصرہ پر حکومت مسلمانوں کی قایم ہو چکی ہے، ابو موسیٰ اشعری وہاں کے عامل یعنی گورنر ہیں، وہ اپنا دیوان[1] جسے اُس وقت کاتب[2] کے لقب سے خطاب کرتے تھے ایک نصرانی کو مقرر کرتے ہیں۔ فاروق اعظم کو جب اس کی خبر ہوئی تو آپ نے ابو موسیٰ سے فرمایا کہ اُسے معزول کر کے کسی مسلمان کے سپرد یہ عہدہ کرو، مسلمانوں کے کام میں ایک نصرانی سے اعانت نہ لینا چاہیے۔ ابو موسیٰ نے کہا **لــــه دینه ولی کتابته** یعنی اُن کا مذہب اُسے مبارک ہو مجھے تو اُس کے فن سے مطلب وغرض ہے۔ امیر المومنین نے فرمایا **لا اکرّمھم اذا اھانھم اللہ ولا اعزھم اذا أذلھم اللہ ولا ادینھم اذا ابعد ھم اللہ** یعنی میں اُس کی توقیر نہیں کرتا جس کی خدا نے توہین کی ہو میں اُسے عزت نہیں دیتا جسے خدا نے ذلیل کیا ہو میں اُسے قریب نہیں کرتا جسے خدا نے دور کیا ہو۔ ابو موسیٰ کہتے ہیں۔ مجبوری یہ ہے کہ مسلمانوں میں کوئی اس کام سے واقف نہیں بہ غیر اُس نصرانی کے بصرہ کا کام چل نہیں سکتا۔ ابو موسیٰ کے خاص الفاظ یہ ہیں **لا یتم امر البصرة الا به** یعنی بصرہ کا کام نہیں پورا ہوگا مگر اُسی نصرانی سے۔ فاروق اعظم فرماتے ہیں: '**مات النصرانی والسلام**' یعنی فرض کرلو کہ وہ نصرانی مر گیا اُس کے مرنے کے بعد آخر گورنری کے

---

[1] کاتب دیوان۔ دفتر فوج کا میر منشی۔

[2] کاتب۔ چیف سکرٹری۔

دفتر کا کچھ انتظام ہوگا وہی انتظام جو اُس وقت کیا جاتا اب کرلیا جائے۔''

فاروق اعظم پر یہ امر تمام تھا کہ دفتر کے کام میں کوئی مسلمان ماہر نہیں نصرانی کی واقفیت و مہارت بھی معلوم تھی، لیکن ایک کافر کا تسلط اسلامی گورنری میں غیرت فاروقی کے برداشت میں نہ تھا۔

نصرانی محکوم تھا مطیع اسلام تھا ابو موسیٰ کا ماتحت تھا، لیکن دیوان ہو کر سارے دفتر پر حاوی ہوا جاتا تھا، کافر کا ایسا معتمد علیہ ہونا فاروق اعظم کو گوارا نہ تھا۔ احتمال تھا کہ جب قلم اس کے ہاتھ میں ہے تو اپنے فن کو اگر مضرت رسانی میں مسلمانوں کے استعمال کرے تو کچھ بعید نہیں۔

نصرانی کا کمال اور مسلمانوں کا اس فن سے نا آشنا ہونا ابو موسیٰ کو اس پر مائل کرتا تھا کہ نصرانی عہدۂ کتابت پر برقرار رہے۔ امیر المومنین کو اسی وجہ سے اُس کے معزول کرنے پر اصرار تھا کہ ایسا کام جس پر مسلمانوں کو دست رس کامل نہیں اور کافر میں اُس کی صلاحیت کامل موجود ہے، مسلمانوں کے ضرر و نقصان کا اندیشہ ہے۔''

مذکورۂ بالا واقعات و حقایق کو اگر نظر تعمق سے دیکھا جائے تو سورج کی روشنی سے بھی زیادہ واضح نظر آ جائے گا کہ حضرت فاروق اعظم کا اُسوہ اس ارشاد باری تعالیٰ کہ اے ایمان والو! یہود و نصاریٰ کو اپنا اولیا نہ بناؤ کی عملی تفسیر ہے۔ یعنی اُن کے مدد کرنے پر اعتماد اور بھروسا نہ کرو اور اُن سے دوستی پیدا نہ کرو۔

الغرض یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ 'اسلام وہ ہے جو حضورؐ اور حضورؐ کے خلفاءِ راشدین کے اُسوہ و مسلک سے عبارت ہے اور جس کی تشکیل حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت کے وقت تک ہو چکی تھی، مگر یہ اسلام وہ نہیں ہے جو بنو امیہ اور بنو عباس اور دوسرے بادشاہوں کے ذریعہ نئی نسلوں تک پہنچا ہے۔ یقیناً اس کے بعد ملّت نے بڑی بڑی شخصیتوں سے سرفرازی پائی مگر اسلام کے نظام عدل و انصاف کے تمام تر پہلو ۴۴ ہجری تک تکمیل کے مراحل سے گزر چکے تھے اور اسلام ایک منصفانہ اور عادلانہ تنظیم و تحریک کی جملہ خصوصیات سے متصف ہو چکا تھا...... اصول حضورؐ اور خلفائے راشدین کے عہد میں متعین ہو چکے تھے۔'[1]

---

[1] ندوی، رشید اختر۔ 'اسلام میں مرکزی حکومت کا تصور اور اس کی معاشی اور اقتصادی ذمہ داریاں'۔ بیاض گروپ آف پبلی کیشنز، لاہور۔ اشاعت ۲۰۰۴ء، ص ۱۴

نصرانیوں کے حوالے سے حضرت عمر بن عبدالعزیز کے احکام

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اُن کے تاریخی کردار کی وجہ سے خلیفۂ راشد اور عمر (فاروق اعظم) ثانی کہا جاتا ہے۔ ان کا عہد مسعود حیرت ناک حد تک فاروق اعظم کے مماثل نظر آتا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بصیرت اور ژرف نگاہی کی عین مطابقت میں حضرت عمر بن عبدالعزیز عمل پیرا نظر آتے ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ نے اپنے عُمّال (گورنروں) کو لکھا:

''امابعد۔ مشرکین ناپاک ہیں، جب کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو شیطان کا لشکر ٹھہرایا ہے اور انھیں ایسے لوگ قرار دیا ہے، جو اعمال کے لحاظ سے سراسر خسارے میں ہیں، جن کی ساری محنت دنیوی زندگی میں کھپ گئی اور وہ بہ زعمِ خود اچھا کام کر رہے ہیں۔ بخدا! یہ وہ لوگ ہیں، جن پر ان کی محنت کی وجہ سے اللہ کی اور لعنت کرنے والوں کی لعنت پڑتی ہے۔ گزشتہ دور میں مسلمان جب کسی بستی میں جاتے جہاں مشرک آباد ہوتے، تو ان سے بھی (کاروبارِ مملکت میں) مدد لیا کرتے تھے، کیوں کہ یہ لوگ تحصیل داری، کتابت اور نظم ونسق سے واقف ہوتے تھے اور اس سے مسلمانوں کو مدد ملتی تھی، مگر اب اللہ نے امیر المومنین کے ذریعہ یہ ضرورت پوری کر دی۔ اس لیے اگر تمہارے زیر سلطنت علاقے میں کوئی غیر مسلم کاتب (کلرک) یا کوئی اور منصب دار ہو تو اُسے معزول کر کے اس کی جگہ مسلمانوں کو مقرر کرو کیوں کہ ان کے عہدے اور منصب کو مٹانا درحقیقت ان کے ادیان کو مٹانا ہے۔ ذلت و رسوائی کا جو مقام اللہ نے ان کے لیے تجویز کیا ہے، انھیں اسی مقام پر رکھنا مناسب ہے اس لیے اس حکم کی تعمیل کرو اور اپنی کارگزاری کی اطلاع مجھے دو اور دیکھو کوئی نصرانی زین پر سوار نہ ہو، بل کہ وہ پالان پر سوار ہوا کریں۔ ان کی کوئی عورت اونٹ کے کجاوے میں سوار نہ ہو بل کہ پالان پر بیٹھیں اور یہ لوگ جو پاؤں پر ٹانگیں کشادہ کر کے نہ بیٹھیں، بل کہ دونوں پاؤں ایک طرف کر کے بیٹھیں اور اس سلسلہ میں اپنے تمام ماتحت افسران کو بھی پابند کرو، اور انھیں سختی سے گشتی فرمان جاری کرو۔ میرے لیے صرف

تمھیں لکھنا کافی ہونا چاہیے۔ ولا قوۃ الا باللہ۔''[1]

ظہور امام مہدی اور بنو کلب

سطور بالا میں میسون کے حوالہ سے بنو کلب[2] اور قحطان کا ذکر آپ پڑھ چکے۔ قرب قیامت جب حضرت امام مہدی کا ظہور ہوگا، تو ان کے خلاف قوتوں میں پیش پیش یہی بنی کلب ہوں گے۔ چناں چہ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی حدیث میں اس بات کا ذکر موجود

---

[1] سیرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ، ابومحمد عبداللہ بن عبدالحکیم (م: ۲۲۴ھ)، مترجم: مولانا محمد یوسف لدھیانوی، مکتبہ بینات کراچی، اشاعت سوم، ۱۹۹۴ء، ص ۱۷۴، ۱۷۵

[2] بنو کلب، قحطان ہی کا طاقت ور قبیلہ ہے۔ 'قحطان' اہل یمن کا جد اعلیٰ اور اُن کا پہلا بادشاہ تھا۔ قدیم روایات کی رُو سے عرب، عدنانی اور قحطانی، ۲ گروہوں میں منقسم ہیں۔ قحطانی یمن کے اور عدنانی حجاز کے باشندے تھے۔ قحطانی ''عربِ عاربہ'' یعنی ''اصل عرب'' ہیں اور عدنانی ''عربِ مستعربہ'' یعنی ''بنے ہوئے عرب'' ہیں جنھوں نے عربی زبان قحطانیوں سے سیکھی۔ (خورشید رضوی، ڈاکٹر۔ 'عربی ادب قبل از اسلام' ص ۶۰ و ۲۶۵)، اس طرح عہد اسلام کے عرب، قحطان کو ''سارے یمن کا باپ'' قرار دیتے ہیں۔ ایک قحطان قبیلہ اب بھی موجود ہے۔ یہ قبیلہ سراسر بدوی ہے اور شمالی یمن اور جنوبی حجاز (تقریباً ۱۸ اور ۲۲ درجے عرض البلد شمالی) کے درمیان کی مشرقی حدود پر اپنے خیمے نصب کرتا ہے، لیکن ان کے چھوٹے چھوٹے جتھے موسم گرما میں نجد کے اندر دور تک، یہاں تک کہ وشم اور قسیم کے اضلاع تک پہنچ جاتے ہیں۔ اس قبیلہ کے افراد تعداد میں بہت زیادہ ہیں اور ان کے پاس مویشی بہ کثرت ہیں۔ یہ قبیلہ خاصا طاقت ور ہے اور اسے ''جنوبی عرب کا شریف ترین خاندان'' ہونے پر ناز ہے۔ آج کل قبایل قحطان زیادہ تر نجد اور عسیر کے علاقوں میں آباد ہیں (اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، ۱۶/۱: ۲۸۷، ۲۹۰)۔ نیز یہ قول ڈاکٹر گستاؤلی بان، صحرائی زندگی جو ہمیں اس قدر سخت معلوم ہوتی ہے ان بدویوں کو اتنی مرغوب ہے کہ وہ اس کو شہروں کے رہنے پر ترجیح دیتے ہیں اور ان کی یہ ترجیح کچھ آج سے نہیں بل کہ ہزاروں برس سے ہے کیوں کہ جو بدوی اس وقت صحراؤں میں مقیم ہیں یہ اولاد ہیں اِن ہی بدویوں کی جن کا ذکر کتاب مقدس میں موجود ہے اور ان کی رسوم و رواج و لباس بلاتغیر کے اس وقت وہی ہیں جو قدیم الایام سے چلے آتے ہیں۔ اعراب بدوی میں خواہ وہ عربستان کے ہوں خواہ شام کے۔ یہ لوگ شہر اور قصبات کے باشندوں کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور انھیں غلام سمجھتے ہیں۔ (مزید تفصیل کے لیے دیکھیے مذکور مصنف، 'تمدنِ عرب': مترجم علی بلگرامی، سید، الفیصل۔ لاہور)

بات نامکمل رہے گی اگر یہ عرض نہ کیا جائے جیسا کہ دور جاہلیت میں قدیم عربوں میں مختلف بت مختلف قبایل سے منسوب تھے۔ قومِ نوح علیہ السلام کے حوالے سے وَد، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے اور ان کے علاوہ لات، منات اور عُزیٰ کے نام کلامِ پاک میں وارد ہوئے ہیں۔ ''وَد'' قبیلہ کلب کا بت تھا ('عربی ادب قبل از اسلام' ص ۱۴۰)

ہے۔ نیز دیگر احادیث جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، امیر المومنین سیدنا حضرت علی بن ابی طالب کرم اللہ وجہہ الکریم، حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، ان میں امام مہدی کے نسب، حلیہ مبارک، بیعتِ خلافت، عرصۂ حکومت، ان کے زمانۂ حکومت کی برکات کا بالصراحت ذکر ہے۔ مولانا محمد سردار احمد (۱۹۰۴ء۔ ۲۹ر دسمبر ۱۹۶۲ء، محدث اعظم)، سابق مدرس، مدرسہ جامعہ رضویہ منظر اسلام، بریلی اپنے ایک مضمون ظہورِ امام مہدی رضی اللہ عنہ کے تحت لکھتے ہیں:

''مخبر صادق حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک خلیفہ کی وفات کے وقت (نئے خلیفہ کے انتخاب کے بارے میں) اختلاف ہوگا، تو ایک شخص (امام مہدی) اہلِ مدینہ طیبہ سے مکہ معظّمہ کی طرف بھاگتے ہوئے نکلے گا (کہ کہیں لوگ مجھے خلیفہ نہ بنالیں)، تو مکہ معظّمہ والوں میں سے کچھ لوگ (جو انھیں بہ حیثیتِ مہدی پہچان لیں گے) ان کے پاس آئیں گے[1]، انھیں (بیعت کے لیے مکان سے) باہر لائیں گے، حالاں کہ وہ اسے ناپسند کرتے ہوں گے۔ یہ لوگ ان کی مقامِ ابراہیم اور حجر اسود کے درمیان بیعت کریں گے (جب امام مہدی کے خلیفہ بننے کی خبر پھیلے گی)، تو ان کی طرف شام سے ایک لشکر (جنگ کے لیے) بھیجا جائے گا، اسے (آپ تک پہنچنے سے پہلے ہی) مکہ و مدینہ کے درمیان ایک میدان میں دھنسا دیا جائے گا۔ جب لوگ یہ دیکھیں گے تو ان کے پاس شام کے ابدال اور عراق والوں کی جماعتیں آئیں گی اور بیعت کرلیں گی۔ پھر قریش کا ایک شخص نکلے گا، جس کے (کی) ننھیال بنوکلب ہوں گے، وہ ان (امام مہدی) کی طرف ایک لشکر بھیجے گا، یہ (خلیفہ کا لشکر) ان پر غالب آئیں گے۔ یہی (جنگ) کلب ہے، اور خسارہ ہے اس کے لیے جو کلب سے حاصل شدہ غنیمت میں شامل نہ ہو۔ (اس فتح

---

[1] ''تو (امام مہدی لوگوں سے) فرمائیں گے، تم پر افسوس! تم نے کتنے ہی عہد توڑے اور کتنی خوں ریزی کی؟ وہ ناپسندیدگی کے باوجود انھیں بیعت کرلیں گے۔ اگر تم انھیں پالو، تو تم بھی ان کی بیعت کرنا، کیوں کہ وہ زمین میں بھی مہدی ہوں گے اور آسمان میں بھی مہدی ہوں گے۔'' (قادری، محمد جلال الدین، مفتی۔ 'فتنۂ قادیانیت'، مشمولہ: محمد سردار احمد، مولانا۔ 'ظہورِ امام مہدی'، اشاعت ۲۰۱۳ء، جامعہ اسلامیہ، کھاریاں۔ حاشیہ ص ۱۴۶)۔

محولہ کتاب کے مرتب استاذ محترم مولانا محمد جلال الدین قادری علیہ الرحمہ کے صاحب زادہ محمد مسعود احمد غازی نے 'ظہورِ امام مہدی' کے حواشی میں کمال محنت سے احادیث کی تخریج کی ہے۔ (ظہور الدین)

کے بعد امام مہدی) مال تقسیم کریں گے، اور وہ لوگوں میں ان کے نبی کی سنت پر عمل کرائیں گے، اور اسلام مکمل طور پر زمین پر مستحکم ہو جائے گا۔ پھر وہ سات سال قیام کریں گے۔ پھر وہ وفات پائیں گے اور ان پر مسلمان نماز جنازہ پڑھیں گے۔''[1]

حضرت مولانا شاہ رفیع الدین رحمۃ اللہ علیہ (م: ۱۲۳۳ھ/ ۹ راگست ۱۸۱۸ء) بھی اپنی فارسی کتاب ''قیامت نامہ'' جو ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۳۹ء میں مولوی نور محمد کے ترجمہ سے شائع ہوئی، میں احادیث میں قیامت کی علامتیں بیان کرنے کے بعد یوں لکھتے ہیں:

'جب یہ (یعنی قیامت کی) تمام علامات وآثار نمایاں ہو جائیں تو عیسائی بہت سے ملکوں پر غلبہ کر کے قبضہ کر لیں گے۔ پھر ایک مدت کے بعد عرب اور شام کے ملک میں ابوسفیان کی اولاد میں ایک شخص پیدا ہوگا جو سادات کو قتل کرے گا، اس کا حکم ملک شام ومصر کے اطراف میں جاری ہو جائے گا۔'[2]

پھر آگے چل کر شاہ صاحب موصوف وہ تمام حالات بھی قلم بند کرتے ہیں کہ کس طرح عیسائی مسلمانوں سے نبرد آزما ہوں گے اور ان کے درمیان خوں ریز جنگ ہوگی جس کے نتیجہ میں بادشاہ اسلام شہید ہو جائے گا، اور عیسائی ملک شام پر بھی قبضہ کر لیں گے۔ احادیث کی روشنی میں حضرت امام مہدی کا حسب نسب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حضرت امام مہدی علیہ السلام سید اور اولاد فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا میں سے ہیں۔ آپ کا قد وقامت قدرے لانبا، بدن چست، رنگ کھلا ہوا، اور چہرہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے مشابہ ہوگا۔ نیز آپ کے اخلاق پیغمبر خدا صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) سے پوری مشابہت رکھتے ہوں گے، آپ کا اسم شریف محمد، والد کا اسم مبارک عبداللہ، والدہ صاحبہ کا نام آمنہ ہوگا...... آپ کا علم لدنی (خداداد) ہوگا۔ بیعت کے وقت عمر چالیس سال کی ہوگی۔ خلافت کے مشہور ہونے پر مدینہ کی فوجیں آپ کے پاس مکہ معظمہ چلی آئیں گی...... خراسان سے ایک شخص کہ جس کے لشکر کا مقدمۃ الجیش منصور نامی کے زیر کمان ہوگا ایک بہت بڑی فوج لے کر

1۔ ایضاً، ص ۱۴۵، ۱۴۶، ۱۴۷

2۔ دہلوی، رفیع الدین، مولانا الشاہ۔ 'قیامت نامہ'، مترجم، نور محمد، مولوی۔ 'علامات قیامت'، مطبوعہ دہلی ۱۳۳۸ھ/ ۱۹۱۹ء، ص ۴

آپ کی مدد کے لیے روانہ ہوگا جو رستہ میں ہی بہت سے عیسائی اور بد دینوں کا صفایا کر دے گا۔ وہ سفیانی (کہ جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے) جو اہل بیت کا دشمن ہوگا جس کی ننھیال قوم بنو کلب ہوگی، حضرت امام مہدی کے مقابلہ کے واسطے فوج بھیجے گا۔ جب یہ فوج مکہ و مدینہ کے درمیان ایک میدان میں آ کر پہاڑ کے دامن میں مقیم ہوگی تو اُسی جگہ اس فوج کے نیک و بد عقیدے والے سب کے سب دھنس جائیں گے اور قیامت کے دن ہر ایک کا حشر اس کے عقیدے و عمل کے موافق ہوگا۔''[1]

ورثۂ عصبیت اور مال و جاہ پرستی

ڈاکٹر ظہور احمد اظہر اپنی تالیف: رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت پیغمبر عدل و امن (طبع ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء) میں 'خلفاءِ اربعہ کے بعد کے حکمرانوں کا عالم گیر مساوات سے انحراف' کے زیرِ عنوان لکھتے ہیں:

''تیس بتیس سالہ عہد نبوی و خلافت راشدہ کے بعد بنو اُمیہ[2] کا جو شاہی خاندان وجود میں آیا اسے بنو ہاشم سے تو تاریخی بیر تھا ہی جو سیدنا حسین بن علی رضی اللہ عنہما کی شہادت عظمیٰ پر آخری حد کو پہنچ گیا مگر انھیں اشاعت اسلام یا اخوت و مساوات اور قرآن کریم کے تصور انسانی برادری اور برابری سے بھی کوئی غرض نہ تھی۔[3] چند

---

[1] ایضاً، ص ۵ اور ۶

[2] ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتساب و تعلق نے اگرچہ اہل بیت کو تمام مسلمانوں کے نزدیک عزیز تر بنا دیا تھا۔ لیکن بنو امیہ کا خاندان ابتدا ہی سے سیاسی مصالح کی بنا پر ان کا دشمن بن گیا تھا...... اس بغض و عداوت کا خمیر اس قدر پختہ ہو گیا تھا کہ خاندانِ بنو امیہ کے سامنے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا نام بھی نہیں لیا جا سکتا تھا۔'' (ندوی، عبدالسلام، مولانا۔ سیرتِ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ، اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن۔ اشاعت چہارم، ۲۰۱۶ء، ص ۹۰)

[3] ''ملوکیت کے اِس دور میں ہمیں اضطراب اور بے چینی دیکھنے میں آتی ہے۔ اُمرا اور رؤسا اپنی من مانی کارروائیاں کرنے میں کامیاب ہو چلے ہیں، غربا اور مساکین کا مال ناجائز طریقوں سے ہضم کیا جاتا ہے۔ امارت اور ظاہری ٹیپ ٹاپ مقدم ہے۔ تعیش پسندی اور جاہ طلبی کے علاوہ حصولِ سیم و زر مقصد ہے۔ وہ ذمہ داریاں جو مذہب نے ان نام نہاد خلیفوں پر ڈالی ہیں پس پُشت ڈال دی گئی ہیں۔ اکثر بادشاہ عنانیت اور فرعونیت کے ساتھ عوام کے جذبات کو پامال کرتے نظر آتے ہیں۔

(باقی بر صفحہ آیندہ) : ۴۰

اس کتاب کے آٹھ نسخے کے طالب کے لئے محصول ڈاک معاف

فَهَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ أَنْ تَأْتِيَهُمْ بَغْتَةً فَقَدْ جَاءَ أَشْرَاطُهَا

یعنی پس نہیں انتظار کرتے مگر قیامت کا کہ آجاوے ان پر ناگہاں پس تحقیق آچکی ہیں نشانیاں اس کی

علامات قیامت

جسکو

عمدۃ المفسرین۔ سند المحدثین مولانا شاہ رفیع الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ

نے آیات قرآنیہ واحادیث صحیحہ سے مع اسناد بزبان فارسی تحریر فرمایا تھا

جو قیامت نامہ کے نام سے مشہور ہے

اور جس کو

مولوی نور محمد صاحب (مولوی فاضل منشی فاضل) نے زمانہ کی

ضرورتوں پر لحاظ کر کے اپنے ملکی بھائیوں کے لئے بے کم وکاست

اردو زبان میں بامحاورہ ترجمہ کیا اور درحقیقت اس سے بڑھکر نہایت صحیح و

مستند آثار قیامت کسی رسالہ میں یکجائی ملبھی نہیں سکتے۔ + +

صفر المظفر ۱۳۳۸ھ مطابق نومبر ۱۹۱۹ء

ملنے کا پتہ نور محمد کٹرہ ریشیان دہلی۔

(تعداد ۶۰۰) ہمارے کارخانہ سے ہر قسم کی کتابیں ارزاں نرخ سے بذریعہ وی پی قیمت طلب ارسال ہوتی ہیں (قیمت ۴ر)

پتہ: مہتمم کارخانہ تجارت کتب کٹرہ ریشیان دہلی۔

عکس سرورق "علاماتِ قیامت" از مولانا شاہ رفیع الدین دہلوی، طبع دہلی، ۱۹۱۹ء

والے بیچے بعد دیگرے گرنے لگتے تھیں۔

دیگر احادیث میں آیا ہے کہ قیامت کی علامتوں میں سے لونڈیوں کی اولاد کی کثرت بے علم و بے ادب و نو دولت لوگوں کی حکومت۔ اغلام بازی۔ پتنگ بازی۔ مساجد میں کھیل کود ملاقات کے وقت بجائے سلام کے گالی گلوچ بکنا علوم (شرعیہ) کا کم ہونا۔ جھوٹ کو ہنر سمجھنا۔ دلوں سے امانت و دیانت کا اُٹھنا فاسقوں کا علم سیکھنا۔ شرم و حیا کا جاتا رہنا۔ مسلمانوں پر کفاروں کا چاروں طرف[1] سے ہجوم کرنا ظلم کا اس قدر پھیلنا کہ جس سے پناہ لینی مشکل ہو۔ باطل مذاہب جھوٹی حدیثوں اور بدعتوں کا فروغ پانا ہے۔ جب یہ تمام علامات و آثار نمایاں ہو جائیں تو عیسائی بہت سے ملکوں پر غلبہ کر کے قبضہ کرینگے۔ پھر ایک مدت کے بعد عرب اور شام کے ملک میں ابوسفیان کی اولاد میں ایک شخص پیدا ہوگا جو سادات کو قتل کریگا۔ اس کا حکم ملک شام و مصر کے اطراف میں جاری ہو جائیگا۔ اس اثناء میں بادشاہ روم کی عیسائیوں کے ایک فرقہ کیساتھ جنگ اور دوسرے فرقہ سے صلح ہوگی۔ لڑنیوالا فرقہ **قسطنطنیہ** پر قبضہ کریگا۔ بادشاہ روم دارالخلافہ کو چھوڑ کر ملک شام میں آجائیگا۔ اور عیسائیوں[2] کے مذکورہ فرقہ دوم کی اعانت سے اسلامی فوج ایک خونریز جنگ کے بعد فرقہ مخالف پر فتحمند ہوگی۔ دشمن کی شکست کے بعد فرقہ موافق میں سے ایک شخص بول اُٹھیگا کہ صلیب غالب ہوئی اور اسی کی برکت کی وجہ سے فتح کی شکل دکھائی دی یہ سنکر اسلامی لشکر میں سے ایک شخص اس سے مار پیٹ کریگا اور کہیگا کہ نہیں دین اسلام غالب ہوا اور اسیکی برکت سے فتح نصیب ہوئی یہ دونوں اپنی اپنی قوم کو مدد کے لیے پکارینگے کہ جسکی وجہ سے فوج میں خانہ جنگی شروع ہو جائیگی **بادشاہ اسلام شہید ہو جائیگا**۔ عیسائی ملک شام پر بھی قبضہ کرینگے اور آپس میں ان دونوں عیسائی قوموں کی صلح ہو جائیگی۔

---

[1] ثوبان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایک زمانہ ایسا آنیوالا ہے جس میں کفار ایک دوسرے کو ممالک اسلامیہ پر قابض ہونے کیلئے اس طرح مدعو کرینگے جیسے کہ دسترخوان پر کھانے کے لیے ایک دوسرے کو بلاتے ہیں کسی نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اسوقت ہماری تعداد قلیل ہوگی فرمایا نہیں بلکہ تم اسوقت کثرت سے ہوگے لیکن بالکل ایسے بے بنیاد جیسے رو کے سامنے خس و خاشاک اور تمہارا رعب و داب دشمنوں کے دل سے اُٹھ جائیگا اور تمہارے دلوں میں سستی پڑ جائیگی۔ ایک صحابی نے عرض کیا حضور سستی کیا چیز ہے آپ نے فرمایا کہ تم دنیا کو دوست رکھو گے اور موت سے خوف کرو گے اس حدیث کو ابوداؤد و امام احمد و بیہقی نے دلائل النبوۃ میں روایت کیا ہے[illegible] موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی دینی و دنیوی و اخلاقی ہر ہر قرون گذشتہ کے مسلمانوں کے قدم بقدم چلکر خدا اور رسول کے احکام سے نہایت ہی غلامیت کہتے اپنی ... [illegible] ... مسلمان تہلیت ہیں جو ان احادیث کے مصداق ہونگے ترجم[2] یہ حدیث ابوداؤد میں

رسالہ "علاماتِ قیامت" کے صفحہ ۴ کا عکس

بقیۃ السیف مسلمان مدینہ منورہ چلے آئینگے۔ عیسائیوں کی حکومت خیبر تک (جو مدینہ منورہ سے قریب ہے) پھیل جائیگی اسوقت مسلمان اس تجسس میں ہونگے کہ حضرت امام مہدی کو تلاش کرنا چاہیئے تاکہ ان مصائب کے دفعیہ کے موجب ہوں۔ اور دشمن کے پنجہ سے نجات دلائیں **حضرت امام مہدی** اسوقت مدینہ منورہ میں تشریف فرما ہونگے مگر اس بات کے ڈر سے کہ مبادا لوگ مجھ جیسے ضعیف کو اس عظیم الشان کام کے انجام دہی کی تکلیف دیں مکہ معظمہ[۱] چلے جائینگے۔ اُس زمانہ کے اولیاء کرام وابدال عظام آپ کی تلاش کریں گے۔ بعض آدمی مہدیت کے جھوٹے دعوے کرینگے اور اس اثناء میں کہ مہدی **رکن ومقام ابراہیم** کے درمیان خانہ کعبہ کا طواف کرتے ہونگے۔ آدمیوں کی ایک جماعت آپ کو پہچان لیگی۔ اور جبراً وکرہاً آپ سے بیعت کریگی اس واقعہ کی علامت یہ ہے کہ اس سے قبل گذشتہ ماہ رمضان میں چاند وسورج کو گرہن لگ چکیگا اور بیعت کے وقت آسمان سے یہ ندا آئے گی هٰذَا خَلِيْفَةُ اللهِ الْمَهْدِيُّ فَاسْتَمِعُوا لَهٗ وَاَطِيْعُوْا۔ اِس آواز کو اس جگہ کے تمام خاص وعام سُن لینگے۔ حضرت امام مہدی[۲] سید اور اولاد فاطمہ زہرا[۳] میں سے ہیں **آپ کا قدو قامت** قدرے لانبا۔ بدن چست۔ رنگ کھلا ہوا۔ اور چہرہ پیغمبر خدا صلے اللہ علیہ وسلم کے چہرے سے مشابہ ہوگا۔ نیز آپ کے اخلاق پیغمبر خدا صلعم سے پوری مشابہت رکھتے ہونگے آپ کا اسم شریف محمد والد کا اسم مبارک عبداللہ والدہ صاحبہ کا نام آمنہ ہوگا۔ زبان میں قدرے لکنت ہوگی جس کی وجہ سے تنگ دل ہوکر کبھی کبھی ران پر ہاتھ مارتے ہونگے۔ آپ کا علم لدنی (خداداد) ہوگا بیعت کیوقت عمر چالیس سال کی ہوگی خلافت کے مشہور ہونے پر مدینہ کی فوجیں آپ کے پاس مکہ معظمہ چلی آئینگی۔ شام۔ عراق اور یمن کے اولیاء کرام **وابدال عظام** آپ کی مصاحبت میں اور ملک عرب کے بے انتہا آدمی آپ کی افواج میں داخل ہو جائینگے اور اُس خزانہ کو جو کعبہ میں مدفون ہے جس کو تاج الکعبہ کہتے ہیں نکالکر مسلمانوں پر تقسیم فرمائینگے۔ جب یہ خبر اسلامی دنیا میں منتشر ہوگی تو خراسان[۴] سے ایک شخص کہ جسکے لشکر کا مقدمۃ الجیش منصور نامی کے زیر کمان ہوگا ایک بہت بڑی فوج لیکر آپ کی مدد کے لیئے روانہ ہوگا جو رستہ میں ہی بہت سے عیسائی اور بدمذہبوں کا صفایا کردیگا۔ وہ سفیانی (کہ جس کا ذکر اوپر گذر چکا ہے) جو اہل بیت کا دشمن ہوگا جسکی نہیال قوم بنو کلب

---

[۱] ابوداؤد یہ حدیث صحیح ہے [۲] ترجمہ یہ خدا کا خلیفہ مہدی ہے اس کا حکم سنو اور مانو [۳] یہ حدیث بروایت ابوداؤد مشکوٰۃ صفحہ ۴۰۱ مطبوعہ نظامی میں موجود ہے اور صحیح ہے ۱۲ [۴] ابوداؤد

رسالہ "علامات قیامت" کے صفحہ ۵ کا عکس

ایک مستثنیات کے سوا اُموی خلفا عرب قوم پرستی کے علمبردار تھے جس نے قیس و مضر کے جھگڑوں میں عربوں کو اُلجھا دیا[1]......جس سے اشاعت اسلام کی رفتار شدید طور پر متاثر ہوئی، غنائم اور وسعت ملک کے شوق میں فتوحات کا سیل تو کسی نہ کسی طرح رواں دواں رہا مگر اس سیل رواں کی اصل روح اللہ کی راہ میں شہادتِ حق اور سرفروشی کا وہ جذبہ مفقود ہو گیا جس کی بنیاد اسلامی عدل و انصاف اور اسلامی اخوت و مساوات پر تھی!! اس سیل رواں کے اچانک رکنے سے کاروان اسلام تتر بتر ہو گیا اور یوں اسلامی دنیا کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا'

ذیل کا تجزیہ بھی ملاحظہ ہو۔ ڈاکٹر محمد اجمل (استاد شعبہ تاریخ، گورنمنٹ پوسٹ گریجوایٹ کالج بہاول نگر) 'مسلم تاریخ کے نازک اور فیصلہ کن موڑ۔ ہجرت مدینہ سے سانحہ ۱۱/ ۹ تک' (طبع دارالنوادر، لاہور، ۲۰۱۱ء، صفحہ ۱۹۹، ۱۲۰) میں آغازِ ملوکیت کے تحت لکھتے ہیں:

'......خلافتِ راشدہ کا زمانہ ۶۳۲ء تا ۶۶۰ء تک تقریباً ۲۸ سال بنتا ہے جس میں چار خلفائے راشدین ہوئے جو سب مختلف خاندانوں سے تھے لیکن ملوکیت کے آغاز کے بعد ۶۶۰ء تا ۱۲۵۸ء تک کے ۵۹۸ سالوں میں صرف دو خاندان بنو اُمیّہ اور بنو عباس برسرِ اقتدار رہے۔ اس دورِ ملوکیت کے دوران زیادہ تر مسلم حکمرانوں نے جس عیاشی، آرام پرستی، احسان فراموشی، بغض و کینہ اور ظلم و ستم کی داستانیں رقم کیں انھیں پڑھتے ہوئے مُسلم تاریخ کا قاری انتہائی تکلیف اور کرب کے مراحل

(بقیہ صفحہ گزشتہ): ۳۶

مذہب تو صرف برائے نام ہے جس کا سہارا اب بھی بادشاہ لیتے ہیں۔ صرف ذاتی اغراض کو پورا کرنے کے لیے یا جلبِ منفعت کے لیے۔ یہ ایک ہتھکنڈہ ہے جسے وہ مشکل کے وقت استعمال کر لیتے ہیں۔

اسلامی رُوح مفقود ہے۔ خدا رسیدہ انسان ہمیں غاروں میں اور پہاڑوں کی کھوؤں میں چھپتے نظر آتے ہیں۔ انسانوں کی بستی اُنھیں بھیڑیوں کی کچھار کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ شاید وہ اِس دُنیا میں رہ کر طلبِ حق کر ہی نہیں سکتے۔ یہاں ہی سے تصوّف کی ابتدا ہوتی ہے۔'' (سلیمانی، محمد احسان الحق۔ ''تمدّنِ عرب''، قومی کتب خانہ لاہور، ۱۹۵۶ء، ص ۲۶۹ و ۲۷۰)

[1] اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، طبع لاہور (ج ۲۱، ص ۲۹۹) میں لکھا ہے کہ عرفانی اور قحطانی قبائل کا باہمی تفرقہ خانہ جنگی کی صورت اختیار کر گیا۔ اُموی خلفا کبھی یمنیوں کی سرپرستی کرتے اور کبھی مضریوں کو آگے بڑھا دیتے تھے۔

سے گزرتا ہے[1]۔ مشہور مسلم مورّخ ابن خلدون کے مطابق خلافت راشدہ تک کے چالیس سالوں کو چھوڑ کر، باقی تمام مسلم تاریخ میں ہمیں عصبیت کا عنصر دکھائی دیتا ہے، جس میں اسلام کے سرمدی اصولوں کا شائبہ تک نہیں ملتا۔'

حصول اقتدار کے لیے منتخب خلیفۂ راشد کے خلاف پروپیگنڈا

انیس زکریا کتاب امیر معاویہؓ[2] میں جنگِ صفین کے باب میں یوں رقمطراز ہیں:

'جب حضرت عثمان غنی شہید کر دیے گئے اور کچھ لوگ حضرت علی کی بیعت سے علاحدہ ہو گئے اور کچھ عثمانی[3] بن گئے تو امیر معاویہ نے اس موقع کو غنیمت سمجھا۔ وہ حالات کا جائزہ لیتے رہے تھے۔ انھوں نے حضرت علی سے بیعت نہیں کی تھی۔ کیوں کہ وہ اپنی سیادت وسلطنت کے خواب دیکھ رہے تھے اور پورے عرب پر غلبہ حاصل کرنا چاہتے تھے۔

ابُوسفیان کا خاندان قریش میں ہمیشہ برسر اقتدار رہا۔ انھیں ڈر تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ مَیں بیعت کرلوں تو وہ مجھے معزول کر دیں[4]۔ لہٰذا انھوں نے اس بارے میں حضرت عمرو بن العاص سے مشورہ کیا کہ کیا صورت کی جائے جس سے میری گورنری باقی رہے؟ انھوں نے کہا:

---

[1] ''مذہب کی تضحیک کا یہ حال ہے کہ ان ہی اُموی خلفاء میں سے ایک نے اپنی ایک ناپاک کنیز کو بہ حالت جنابت عبا اور عمامہ پہنا کر مسجد میں امامت کے لیے بھیجا، اور بے چارے ناواقف مسلمانوں کو اسی بدمست اور ناپاک عورت کے پیچھے نماز پڑھنی پڑی۔'' (حضرت امام ابوحنیفہ کی سیاسی زندگی: مناظر احسن گیلانی)

[2] ''امیر معاویہؓ'' انیس زکریا نصولی کی ۹۶ صفحات پر مشتمل تصنیف ہے۔ بقول مصنف، اس میں سلطنت بنواُمیہ کے بانی حضرت معاویہ کی سیاست اور حکومت کا منصفانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس کے مترجم عبدالصمد صارم ہیں۔ راقم کے پیش نظر مکتبہ میری لائبریری، لاہور سے ۱۹۷۳ء میں شائع ہونے والا پانچواں ایڈیشن ہے۔ (ظہور الدین)

[3] ''عثمانیہ کا لفظ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ یہ لوگ خلیفۂ ثالث حضرت عثمانؓ کے عزیز یا ساتھی ہیں، مگر اس کلمے کا اطلاق خانہ جنگی (حقیقت میں خلیفۂ چہارم کے خلاف بغاوت) میں اس گروہ پر ہوا جو کہ خلیفۂ مقتول کے خون کا قصاص طلب کرتے تھے اور ان لوگوں کا خون بہانا چاہتے تھے جنھوں نے خلیفۂ مظلوم کو مارا۔'' (انیس زکریا نصولی: 'امیر معاویہؓ'۔ ص۱۶)

[4] ایضاً، ص۲۰ بحوالہ کتاب الفخری، ص۸۰

''اہل شام کے دلوں میں یہ بات بٹھا دیجیے کہ علی نے حضرت عثمان کی شہادت پر فتنہ اٹھنے سے پیشتر باغیوں سے ساز باز کر رکھی تھی اور بڑے بڑے سرداروں کو اپنے ساتھ ملا یئے......''[1]

ڈاکٹر محمد سرور حجازی لکھتے ہیں:

'شام کے حکمران حضرت امیر معاویہؓ کو معزول کر کے ان کی جگہ سہیل بن حنیف کو بھیجا گیا لیکن امیر معاویہؓ نے معزول ہونے سے انکار کر دیا اور حضرت علیؓ کی بیعت کرنے سے بھی انکار کر دیا۔ حضرت امیر معاویہؓ نے شامیوں کو اُبھارا کہ حضرت عثمان کے خون کا قصاص لینا چاہیے'۔[2]

تاریخ میں اکثر ایسے واقعات ملتے ہیں جہاں لوگ حق پسندی کے مقابل دروغ گوئی کو مقصد بر آری کے لیے جائز سمجھتے ہیں...... تاریخ ایک بہت بڑا سبق سکھاتی ہے اور بتاتی ہے کہ خواہشاتِ نفسانی کی کشش اور مادی منفعت کے حصول کے لیے شرفِ انسانیت کی تمام اقدار کو کن کن طریقوں اور کیسے کیسے ہتھکنڈوں سے گدلا دیا جاتا ہے۔ تخویف اور ترہیب کے ساتھ حرص و طمع کی ترغیب بڑا کام کرتی ہے، طمع و تحریص سے لوگ وفاداریاں بدل لیتے ہیں۔ اگر احوال پر آپ نظر دوڑائیں تو دیکھیں گے کہ آج بھی مذہب کے نام پر کیا کچھ نہیں ہو رہا!!...... حال کو ماضی کے آئینہ میں دیکھنا ضروری ہے۔ مذکور پس منظر میں محمد احسان الحق سلیمانی ایم، اے کے تأثرات ملاحظہ ہوں، آپ فرماتے ہیں:

''اکثر لوگوں نے حصولِ مقاصد کی خاطر مذہب کی آڑ لی ہے، اور مذہب کے نام پر ناجائز انتفاع کیا ہے۔ بھولے بھالے عوام مذہب کے نام پر ہر چیز قربان کرنے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں، اور تاریخ شاہد ہے کہ قرونِ وسطیٰ میں مذہب ہمیشہ ہی ناجائز انتفاع (Exploitation) کا مفید آلہ بنا رہا۔

یہاں بھی امیر معاویہؓ نے لوگوں کے جذبات کے ساتھ کھیلنا چاہا۔ حضرتِ عثمانؓ کے قصاص کے مسئلہ کو اپنی غیر آئینی کوشش کا بہانہ بنایا۔ مدینہ شریف سے

---

1. ایضاً بحوالہ الدینوری، ص ۱۶۹

2. ''ارفع اسلامیات'' ص ۲۶۴

آپ کا خون آلود پیراہن اور حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیاں[1] منگوا کر دمشق کی جامع مسجد کے منبر پر لٹکا دیں[2]۔''

پھر عثمانؓ کے مصائب کا ذکر کر کے خود بھی روئے اور لوگوں کو بھی رلایا[3]۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے اہلِ شام نے لبیک کہنا شروع کیا اور عثمانؓ کے خون کا مطالبہ کرنے میں شریک ہو گئے۔[4]

بایں ہمہ تاریخ طبری اور نامور مصری مورّخ ڈاکٹر طٰہٰ حسین کے حوالہ سے پروفیسر محمد اجمل نقل کرتے ہیں:

'شامیوں میں قاتلینِ عثمان کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا کرنے کے لیے (اُموی) جامع مسجد دمشق میں حضرت عثمان غنیؓ کی خُون آلود قمیص اور زوجۂ عثمان حضرت نائلہؓ کی کٹی ہوئی انگلیوں کی نمائش کی جاتی۔ یہ قمیص روزانہ منبر پر رکھی جاتی، کبھی کبھی حضرت امیر معاویہؓ اس قمیص کو خود پہنتے اور اپنے گلے میں حضرت نائلہؓ کی انگلیاں ڈال لیتے۔'[5]

'امیر معاویہؓ اور اُن کے ساتھیوں نے عام شامیوں کے دل و دماغ میں یہ

....

[1] ''حضرت عثمان کی خون آلود قمیص اور ان کی بیوی نائلہ بنت الفرافصہ کی کٹی ہوئی انگلیاں اور ان کا خط☆ لے کر نعمان بن بشیر (م: ذی الحجہ ۶۴ھ/ جولائی ۶۸۴ء) مدینہ سے شام (حضرت عثمان کی بیوی اور نعمان بن بشیر کی بیوی نائلہ بنت عُمارہ ہم قبیلہ تھیں، دونوں کا تعلق بنو کلب سے تھا۔ ابن عبدالبر کے بقول، اس سے قبل یہ خاتون معاویہ بن ابی سفیان کے نکاح میں تھیں) گئے۔ یہ غیر معمولی جرأت کا کام تھا۔ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ مدینہ پر عملاً بلوائیوں کا قبضہ تھا۔ مدینہ منورہ سے نکل کر شام کے راستہ میں سفر کرنا موت کے منہ میں جانے کے مترادف تھا۔''

یہ خط☆ العقد الفرید (کتاب عسجدہ دوم، ص ۶۵) میں موجود ہے، اس کا اردو ترجمہ دیکھیے۔ نگار سجاد ظہیر، جولائی - دسمبر ۲۰۱۳ء، نائلہ بنت الفرافصہ، مشمولہ: ششماہی 'الایام'، جلد ۴، شمارہ ۲، مسلسل عدد ۸، ص ۳ اور ۱۵۱

[2] تمدّنِ عرب، مولفہ محمد احسان الحق، ناشر قومی کتب خانہ لاہور، طبع ثانی ۱۹۵۶ء، ص ۲۰۶

[3] بقول مولانا محمد جعفر شاہ پھلواروی، سیاسی مقاصد کے لیے مصائب بیان کرنے اور رونے کا آغاز یہیں سے ہوا جو بعد میں داخلِ مذہب ہو گیا۔ (حاشیہ: از مترجم الفخری، ص ۱۲۰)

[4] پھلواروی، محمد جعفر شاہ، مولانا۔ اردو ترجمہ: الفخری۔ اشاعت دوم، ۲۰۰۷ء، ص ۱۲۰

[5] 'مسلم تاریخ کے نازک اور فیصلہ کن موڑ'، ص ۱۰۵ بحوالہ تاریخ طبری، طبری، ابن جریر، مترجم محمد ابراہیم ندوی، نفیس اکیڈمی، کراچی، ۳/ ۲۳۰، طبع ۱۹۸۴ء

بات اُتار دی تھی کہ حضرت علیؓ دراصل، اللہ کے ایک زبردست قانونِ قصاص کی راہ میں رکاوٹ بنے ہوئے ہیں، چناں چہ بہت سے شامی معاویہؓ کے لیے نہیں بل کہ دین کی حرمت کے لیے لڑے۔[1]

متذکرہ بالا حقائق سے کسی مورّخ یا وقائع نگار نے انکار نہیں کیا۔ چناں چہ برسٹل یونی ورسٹی میں ارامی و سریانی زبان کے لکچرار ڈی، اولیری 'فلسفۂ اسلام' (اشاعت اوّل ۱۹۲۲ء) مترجم مولوی احسان احمد صاحب بی،اے (علیگ)، مطبوعہ (دار الطبع جامعہ عثمانیہ سرکار عالی حیدرآباد دکن) ۱۹۴۶ء کے صفحہ ۵۲ میں لکھتے ہیں:

'۳۵ھ میں حضرت عثمانؓ مقتول ہوئے اور ان کی جگہ پر حضرت علیؓ سریر آرائے خلافت ہوئے۔ یہ پُرانے مسلمان اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ لیکن حضرت علیؓ کے خلیفہ ہونے کے ساتھ ہی داخلی اختلاف ایک مسلمہ حقیقت بن جاتا ہے۔ خالص دنیادار عربوں[2] نے حضرت معاویہؓ کی قیادت میں جو شام کے گورنر تھے حضرت علیؓ کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کر دیا اور بہانہ یہ بنایا کہ حضرت عثمانؓ کے قتل میں حضرت علی کا ہاتھ تھا، یا کم از کم یہ قاتلوں کو پناہ دے رہے ہیں۔'

''حضرت عثمان کے قصاص کا مطالبہ کرنے والے اگر صحیح اور قریب ترین اور سہل راستہ اختیار کرتے تو وہ یہ تھا کہ ولی امر (خلیفہ) کی تائید کرتے تاکہ وہ حدود قائم کرنے پر قادر ہو، اس کے بعد حق کے ساتھ حکم شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرتے۔''[3]

قصاصِ عثمانؓ کے لیے حضرت امیر معاویہؓ نے جو غیر آئینی طریقہ اختیار کیا اس کے بڑے

---

1. ایضاً، ص ۱۰۷، بحوالہ عثمانؓ اور علیؓ سیاست کی روشنی میں۔ طٰہٰ حسین، ڈاکٹر، مترجم عبدالحمید نعمانی، نفیس اکیڈمی، کراچی، اشاعت ۱۹۶۱ء، ص ۳۷۹

2. ''پرانے مسلمان یعنی صحابہ۔ ان لوگوں نے پہلے مذہب اسلام قبول کیا تھا کے برعکس عربوں کی جماعت یہ ان لوگوں پر مشتمل تھی، جنھوں نے اسلام صرف اس وقت قبول کیا تھا، جب محمد صلعم (صلی اللہ علیہ وسلم) نے مکے (مکہ) کو فتح کر کے اپنی قوت ثابت کر دی تھی۔ انھوں نے مسلمانوں کی قیادت اس لیے تسلیم کر لی تھی، کہ محمد صلعم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور ان کے پہلے دو خلیفہ اس وقت برسرِ عروج تھے، لیکن انھیں مذہب اسلام سے محبت نہ تھی.....'' (دیکھیے۔ فلسفۂ اسلام، طبع حیدرآباد بھارت، ۱۳۶۵ھ/ ۱۹۴۶ء، ص ۵۰ وبعدہٗ)

3. عباس محمود العقاد، العبقریات اسلامیہ، ص ۹۲۴ (عسقلانی، ابن حجر، الاصابہ فی تمیز الصحابہ، ۵۰۸ میں اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں)۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: خوارج ایک مطالعہ، ص ۲۶

بھیانک نتائج سامنے آئے۔ خلافتِ علوی کے قیام کے ساتھ ہی امیر معاویہؓ نے مرکز سے انحراف کی پالیسی اختیار کی۔ قصاصِ عثمانؓ کے لیے انھوں نے جس راستے کا انتخاب کیا، اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ اُن کے پیشِ نظر قاتلینِ عثمان سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے خونِ عثمان کا بدلہ لینا تھا[1]۔ اگر وہ خلیفۂ وقت سیّدنا علیؓ کی بیعت کر لیتے اور اُن کے ساتھ مل کر جدوجہد کرتے تو یقیناً قاتلینِ عثمان کو باآسانی زیر کیا جاسکتا تھا۔[2]

قصاص کی حقیقت

معروف محقق محمد احمد جادی المولیٰ بک المصری، جو ایک غیر جانب دار مورّخ ہیں، لکھتے ہیں:

"اموی حضرت عثمان کے گرد بناءِ قرابت کے جمع ہو گئے تھے، آپ کی کم زوری، نرمی اور منصب سے فائدہ اٹھایا، تاکہ مادی و معنوی فوائد حاصل کریں۔ اور معاملات کو اپنے قبضہ میں رکھیں شاید وہ یہ چاہتے تھے کہ آپ کے بعد خلافت انھی میں سے کسی کو مل جائے۔ یہ بات مروان (بن الحکم ابن عم عثمان) کے قول سے بالکل واضح ہوتی ہے۔ جب کہ اُس نے (محاصرہ کے وقت) حضرت عثمان کے دروازے پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا تھا۔

"کیا تم اس لیے آئے ہو کہ ہم سے ہماری مملکت چھین لو؟ جاؤ دُور ہو جاؤ۔"

اسی لیے انھوں نے حضرت عثمان کے قتل کی تہمت علی، طلحہ، زبیر اور اصحابِ شوریٰ پر

---

1. مُسلم تاریخ کے نازک اور فیصلہ کن موڑ، ص ۱۱۳ بحوالہ خلافت وملوکیت، مودودی، سیّد ابوالاعلیٰ، اسلامک پبلی کیشنز لمیٹڈ، لاہور، ص ۱۳۳

2. حضرت علی کے خلاف جمل اور صفین کے میدان میں جو لڑائیاں ہوئیں ان کی بنیاد "قصاص عثمان" کی تحریک ہے۔ بالآخر اس تحریک نے اسی (۸۰) ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا خون کرایا، مگر طوفان کا خروش وجوش اپنی جگہ قائم ہے، اور بہ قول ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر، جب خون بہہ جائے تو عداوتیں پختہ ہو جاتی ہیں۔ لہٰذا جنگ جمل اور صفین کے بعد علوی۔ عثمانی تقسیم اتنی گہری ہو گئی جس کے اثرات پورے اُموی دور پر مرتب ہوتے رہے۔
زیرِ نظر کتاب میں مسئلہ و تحریک مطالبۂ قصاص پر علامہ عزیز الحق کوثر ندوی نے شرح و بسط کے ساتھ نہایت محققانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ یہ تفصیل مناقبِ اہل بیت کے صفحہ ۲۴۰ تا ۲۸۸ (۴۸ صفحات) پر پھیلی ہوئی ہے۔ (ظہور الدین)

لگائی۔ چناں چہ امیر معاویہ نے یہی کر دکھایا۔ اور جنگ کر کے ہی رہے، حتیٰ کہ حکومت حاصل کر لی۔ پھر حضرت عثمان کے قصاص لینے سے باز رہے۔ حال آنکہ قصاصِ عثمان کے مدعی تھے۔"[1]

فضائل شیرؓ خدا کا اِقرار......مگر ہائے ری آرزوئے اقتدار

حضرت علی بن ابی طالب کو مصر، یمن، حجاز اور خراسان خلیفہ تسلیم کرتا تھا، صرف شامی ہی تو رہ گئے تھے۔ علاوہ بریں یہ بات ہے کہ امیر معاویہ کے گرد جو لوگ جمع ہوئے وہ صرف بہ حیثیت قصاص خواہانِ عثمان کے جمع ہوئے تھے، مدعیِ خلافت کی حیثیت سے ان کے پاس جمع نہیں ہوئے تھے۔[2]

جناب عبدالماجد دریابادی، مولانا محمد علی کے نام اپنے ایک مکتوب میں تحریر فرماتے ہیں:

'علی مرتضیٰ کے فضائل و کمالات سے فرداً فرداً کسی صاحب کو بھی انکار نہ تھا امیر معاویہ اور عمرو بن عاص تک اپنے کو ان سے بہتر نہیں کہتے تھے۔ ان کے فضائل کا برابر اعتراف کرتے تھے۔ پھر بھی عملاً ان کی ہر رائے، ہر تحریک، ہر ارادہ کی مخالفت ہی ہوتی رہتی تھی۔'[3]

---

[1] سیرتِ عثمان غنی رضی اللہ عنہ، مترجم: عبدالصمد صارم الازہری، ص ۶-۱۳۵، طبع ایم۔ ثناء اللہ خان اینڈ سنز، لاہور، ۱۹۶۱ء

نوٹ: احمد جادی صاحب کی یہ کتاب ۱۹۴۴ء میں مصر سے شائع ہوئی۔ موصوف عرض مؤلف میں لکھتے ہیں۔

"مَیں نے حضرت عثمان کی تاریخ، ان کے عہد اور بغاوتِ عہدِ عثمان کا بہ غور مطالعہ کیا، جو ہر قسم کے شبہات اور جھوٹی روایتوں سے پاک ہے۔ میں نے صرف مورّخین کے لکھے پر بھروسا نہیں کیا، بل کہ اپنی نظر دور تک ڈالی ہے۔

[2] امیر معاویہؓ، از انیس زکریا، ص ۳۵

[3] افادات محمد علیؒ مرتبہ رئیس احمد جعفری، ادارۂ اشاعت اردو، حیدر آباد (دکن) طبع اوّل۔ ۱۹۴۵ء، ص ۱۱

آج ہم دیکھتے ہیں کہ ابن الوقتی، دھوکہ بازی اور دروغ گوئی سے کام چلانے والے (بظاہر) کام یاب اور فتح مند ہو جاتے ہیں، اور ایک جمِ غفیر کو بھی اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں، کیوں کہ لوگ تو جہاں اصول قربان کرتے ہیں وہیں بقول شاعر "متاعِ قلیل" کی خاطر دین و ایمان کو فروخت کر دیتے ہیں۔

رَأَیْتُ النَّاسَ مُذْ خُلِقُوْا وَكَانُوْا
يُحِبُّوْنَ الْغَنِیَّ مِنَ الرِّجَالِ

"جب سے لوگ پیدا کیے گئے ہیں مَیں نے دیکھا کہ وہ مال دار آدمیوں سے محبت کرتے آئے ہیں۔"

حضرت معاویہؓ نے تلوار سے حکومت حاصل کی تھی اور تلوار سے اس کی حفاظت کی انھیں حکومت بہت عزیز تھی۔ سرداری اور حکومت ویسے بھی انسان کے دل کو بہت عزیز ہوتی ہے، سرداری کی فکر مال اور آبرو سے بھی زیادہ ہوتی ہے اور اس میں دل چسپی دنیا کی ہر عظمت، راحت اور آرام سے بڑھ کر ہوتی ہے[1]۔

لہٰذا ایسے میں انھیں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم جو صرف اور صرف حق کا اقتدار چاہنے والے تھے (اور جو صرف اپنے خدا سے ڈرتے ہیں[2])، کی حق پسندی اور سادگی، حق گوئی اور حق پرستی کب گوارا تھی، اور انھیں امیر المومنین علی المرتضیٰ سے سروکار بھی کیا تھا۔ آپ کے مخالفین کا کردار شرمناک صورت اختیار کر گیا، جن کی وجہ سے امتِ مسلمہ کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا اور اس کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔

ملوکیت کے زہرناک دور میں علماءِ حق پر جور و ستم اُور صریح علم بے زاری

مولانا محمد سلیمان اشرف بہاری، سابق صدر شعبۂ دینیات، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ اپنی تالیف البلاغ میں مسلمانوں کا ملّی انحطاط کے زیر عنوان بنو اُمیّہ کے دور کا تجزیہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"خلفائے اربعہ کا زمانہ جس جامعیت کا زمانہ تھا، اُس کی نظیر تو کیا اس کے لگ بھگ بھی کوئی عہد تم کو نہ ملے گا۔[3]

---

[1] "یزیدی الیوں کا پس منظر" از پروفیسر ڈاکٹر محمد یوسف، مشمولہ مضمون دوماہی مجلّہ "اسلامی تعلیم" لاہور، بابت ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۳ء، ص ۷۶

[2] بالیقین یہ شان علماء ربانیین اور اللہ کے ولیوں کی ہے۔ خود باری تعالیٰ بھی ان کے حق میں ارشاد فرما رہا ہے۔
اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط

[3] جیسا کہ ملوکیت کے در آنے سے بادشاہوں نے قیصر و کسریٰ کے طرزِ عمل اپنا لیے۔ حضرت معاویہؓ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے صحابی تھے، لیکن ان کی سیرت و کردار اور ان کے طرزِ حکومت و سیاست کو خلفاءِ اربعہ کے معیار پر جانچنا فضول ہے، کیوں کہ ان میں کوئی ایسی بات نظر نہیں آتی جیسے حضرت صدیقؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے کردار کی خوبیوں سے کوئی دور کی بھی نسبت ہو (میکش، مرتضیٰ احمد خاں۔ "تاریخ اسلام" ۲:۳۵۴)۔ "امیر معاویہ سب سے پہلے شخص ہیں جنھوں نے نگہبان، پولیس، دربان اور بردوں کا اسلام میں رواج دیا۔ سب سے پہلے آپ ہی نے کوشک بنوایا اور ساتھ ساتھ نگہبان خنجر بہ دست لے کر چلے، خود تخت پر بیٹھے اور لوگوں

(باقی بر صفحہ آئندہ)

بنو اُمیہ کا دور شروع ہوتے ہی دربار خلافت علم باطن سے محروم ہو گیا۔ تزکیۂ نفس و تصفیہ روح جس کے انوار ائمہ اہل بیت میں پاؤ گے، خلفائے بنو اُمیہ میں اُس کا پتا ملنا دشوار۔ پھر آگے چل کر دولت علم سے بھی بارگاہِ خلافت مفلس ہو گئی۔ اب صرف جہاں گیری و جہاں داری رہی۔ اس لیے بنو اُمیہ[1] و بنو عباسیہ کے دور میں قصر اسلام کے بہت سے خوش نما کنگرے شہید ہوتے ہوئے پاؤ گے۔

سعید ابن المسیب، سعید ابن جبیر، امام اعظم ابو حنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام مالک (رحمھم اللہ) وغیرہ وغیرہ احقاقِ حق پر شمشیر سے شہید یا کوڑے سے گھائل کیے جاتے ہیں[2]۔ مگر آفریں اور ہزار آفریں ہے، ان مردان راہ[3] خدا پر جنھوں نے دمِ

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کو نیچے بٹھایا، اور بلند اور مضبوط محل بنوائے۔ لباسِ فاخرہ اور ممتاز گھوڑوں پر سوار ہوئے، کھانے پینے اور لباس میں تنعم اختیار کیا۔'' (انیس زکریا۔ ''امیر معاویہؓ''، ص ۴۹)۔ لیکن خلفاء راشدین کی زندگی سادگی کا مجسمہ تھی۔ دین کا کامل نمونہ خلافت راشدہ تک باقی رہا۔ خلیفہ کی حیثیت سے تمام اہم امورِ مملکت کا فیصلہ مسجد نبوی کے صحن میں بیٹھ کر کیا جاتا۔ وہ زمانہ جس میں جسم سیاست کی روح ملت تھی۔ مگر افسوس کہ یہ مبارک عہد بہت دنوں تک قائم نہ رہا۔

تمدن غرب کے مولف (احسان الحق صاحب) نے عقد الفرید جلد اوّل، ص ۳۹۶ کے حوالہ سے ایک متحیر کن واقعہ نقل کیا ہے کہ ''ہشام، عبد الملک کا بیٹا تھا، اور خلفاء بنی اُمیہ کا پانچواں خلیفہ (۷۲۳ء لغایت ۷۴۴ء) تھا، جب حج کے ارادہ سے نکلا تو چھے سو اونٹوں پر صرف اُس کے بدن کے کپڑے تھے۔ اس کے برعکس حضرت عمرؓ سے ایک مرتبہ تاخیر کا سبب دریافت کیا گیا، تو فرمایا:

''غسلت ثیابی فلمّا جفت خرجت الیکم'' ''میں اپنے کپڑے دھو رہا تھا، جب خشک ہوئے تو تمہارے پاس آیا ہوں۔''

یعنی دنیا کا عظیم المرتبت خلیفہ اپنے کپڑے اپنے ہاتھوں سے خود دھوتا ہے۔ (ازالۃ الخفاء)

[1] ''خلافت بنی اُمیہ اور خلافت عباسیہ دونوں پر غور کرنے سے اُن کے انداز میں کوئی نمایاں فرق نظر نہیں آتا۔ اموی خلافت کی جگہ عباسی خلافت کے قائم ہونے سے صرف اتنی تبدیلی ہوئی کہ حکومت ایک خاندان سے نکل کر دوسرے خاندان میں چلی گئی۔'' (حسرت، چراغ حسن۔ ''تاریخ اسلام''، طبع لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۱۰۵ و ۱۹۳)۔

[2] ''چن چن کر ایسے لوگ مارے گئے جو عالم اور فاضل تھے، جنھیں لوگ مانتے تھے ان کے قول اور فعل پر بھروسا کرتے تھے، جنھوں نے ضمیر فروشی سے انکار کر دیا تھا۔'' (عصمت چغتائی۔ 'ایک قطرہ خون'، ایمان بک کارنر، منڈی بہاء الدین، ۲۰۱۴ء، ص ۶۱)

[3] ''انھوں نے امت میں غلط اقتدار کے خلاف جدوجہد اور اعلانِ حق کی ایک نظیر قائم کر دی...... اسلامی تاریخ
(باقی برصفحہ آیندہ)

واپسیں تک بھی حق کا ساتھ نہ چھوڑا۔ جان شیریں نہایت مظلومیت و بے کسی سے راست بازی پر قربان کر کے ہمیشہ کے لیے حق کی عظمت و بڑائی ثابت کر گئے۔

اکثر ائمہ اہل بیت کو تیغ ستم یا زہر عداوت ہی سے شہید ہوتے ہوئے پاؤ گے۔[1]

اسی طرح علمائے ربانیین کو سلاطین کے دست تطاول میں گرفتار دیکھو گے۔ تھوڑے دنوں تک ایسی ایک برگزیدہ جماعت دنیا میں قائم رہی جس کا ظاہر و باطن دونوں علم و معرفت سے لبریز تھا، اور اس جماعت نے اسلام کی حمایت میں ہمیشہ سلاطین کے احکام جابرانہ کی مخالفت کی۔''[2]

اسلامی تاریخ میں شریعت کے رمز شناس ائمہ دین حنیف نے سیاست وحکومت کی سطح پر بھی اسلامی احکام و روایات سے انحراف گوارا نہیں کیا۔ وہ اس کے لیے سینہ سپر ہو گئے۔ موج خون ان کے سر پر سے گزر گئی لیکن مداہنت انھوں نے برداشت نہیں کی۔ اس جماعت نے اسلام کی حمایت میں ہمیشہ سلاطین کے احکام جابرانہ کی[3] مخالفت کی۔ ان کا قول تھا کہ۔

ترک جان و ترک مال و ترک سر
در طریقِ عشق اول منزل ست

انھوں نے مسلمانوں کا غیر اسلامی اقتدار برداشت کیا نہ غیر مسلموں کا غاصبانہ قبضہ۔ امام حسینؓ اور حضرت عبداللہ بن زبیرؓ سے لے کر حضرت علامہ فضل حق خیرآبادی تک جہاد و عزیمت کی مسلسل داستان ہے۔

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

کی آبرو انھی جواں مردوں سے قائم ہے، جنھوں نے غلط اقتدار اور مادی ترغیبات کے سامنے سپر نہیں ڈالی، اور صحیح مقصد کے لیے اپنے خون کا آخری قطرہ بہا دیا۔'' (ندوی، ابوالحسن علی، مولانا۔ 'تاریخ دعوت و عزیمت' (حصہ اوّل)۔ مجلس نشریات اسلامی، کراچی، ۲۰۰۹ء، ص ۶۸)

1. ''دشمنانِ رسولؐ کی اولاد اسلام کو کیسے کیسے نقصان پہنچا رہی تھی۔ بہر حال بنواُمیّہ نے تلوار اور زہر کی مدد سے ایک صدی تک حکومت کی۔'' (امیر علی، سیّد۔ 'روحِ اسلام'، ص ۴۶۰)

2. البلاغ، ادارہ پاکستان شناسی، لاہور، ۱۹۱۱ء، ص ۲۳ و ۲۴

3. ان نفوس قدسی کے پیش نگاہ ہر لحہ یہ حدیث مبارکہ رہی۔ **افضل الجهاد كلمةُ حقٍ سُلطانٍ جائر** ۔ یعنی افضل ترین جہاد سُلطانِ ظالم کے روبرو کلمۂ حق کہنا ہے۔ اور حق کا پرچم سربلند کرنے والوں کو ہمیشہ ایسی ہی تکلیفوں اور مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ (ظہورالدین)

صحابہ کی اہانت

اپنے عہد کے نامور صحافی اور شہرہ آفاق مورّخ پیامؔ شاہ جہان پوری کی تالیف ''علیؓ اور اُن کی خلافت'' میں بہت سے چشم کشا حقائق کھل کر بیان کیے گئے ہیں۔ چوں کہ یہ ایک انتہائی غیر جانب دار اور نیک نام شخص کی بے لاگ تحریر ہے۔ اس لیے ہم ایک مختصر اقتباس درج کر رہے ہیں۔

''حضرت معاویہؓ کو جب اقتدار حاصل ہو گیا اور حضرت علیؓ شہید کر دیئے گئے، تو انہوں نے بڑے نامی گرامی اور بزرگ صحابہ کی اہانت کی۔ جن لوگوں نے حضرت معاویہؓ کی غلط سیاست اور غیر اسلامی طرزِ عمل سے اختلاف یا اس کے خلاف احتجاج کیا اسے قید و بند کی تکلیفیں دیں، اور انتہا یہ ہے کہ بعض لوگوں کو دردناک طریقے سے ہلاک کروا دیا۔ انھوں نے حضرت علیؓ جیسے بزرگ پر سب و شتم کیا۔ ان علیؓ پر معاویہؓ جن کے پاسنگ کو بھی نہ پہنچ سکتے تھے، ان کے گورنروں نے خانۂ خدا میں اس منبر پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ کو گالیاں دیں، جو منبر رشد و ہدایت کے لیے مخصوص تھا اور جہاں سے امت کو اتحاد و اتفاق کا پیغام دیا جاتا تھا۔ ایسا کیوں کیا جاتا تھا؟ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ ذہین و فطین معاویہؓ کو اچھی طرح معلوم تھا کہ وہ خواہ کتنی ہی طاقت اور کتنا ہی اقتدار حاصل کر لیں، مگر مسلمانوں میں حضرت علیؓ کو جو دینی مرتبہ حاصل تھا، وہ اس تک نہیں پہنچ سکتے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ مسلمانوں میں ایسے لوگوں کی خاصی تعداد موجود ہے، جو حضرت علیؓ سے محبت کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ علیؓ سے محبت کریں گے، انھیں علیؓ کے دشمن (معاویہؓ) سے کبھی محبت نہیں ہو سکتی۔ پس حضرت معاویہؓ نے سوچا کہ جب تک مسلمانوں کے دلوں سے علیؓ کی محبت زائل نہیں کی جاتی، وہ اُموی حکومت کے سچے وفادار نہیں ہو سکتے۔ اس لیے انھوں نے اپنے گورنروں اور سلطنت کے دوسرے حکام کو ہدایت کی کہ جہاں تک ہو سکے علیؓ کو بدنام کرو اور ان کے کردار کی بھیانک تصویر پیش کرو تا کہ لوگ ان سے نفرت کرنے لگیں اور انھیں بھول جائیں۔ حضرت علیؓ پر سب و شتم اور ان کے خلاف

دشنام طرازی اسی سلسلے کی کڑی[1] تھی۔ یہ افسوس ناک طریق کار حضرت عمر بن عبدالعزیز کے مسند آرائے خلافت ہونے کے وقت تک جاری رہا۔ اللہ کی ہزار ہزار رحمتیں ہوں عمر بن عبدالعزیز کی روح پر جنھوں نے اس گناہ کبیرہ کو حکماً بند کروایا۔

تاریخ کا بیان ہے کہ حضرت معاویہؓ کے عہد حکومت میں حضرت علیؓ کے خلاف دشنام طرازی اس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی کہ بعض صحابۂ رسول کا پیمانہ صبر وضبط لبریز ہو گیا اور انھیں اس کے خلاف احتجاج کرنا پڑا۔ چناں چہ مشہور صحابی حضرت حُجرؓ بن عدی کا احتجاج اور اس کا انجام تاریخ کا ایک خوں چکاں باب بن چکا ہے۔ ایک مشہور مورّخ لکھتا ہے کہ کوفہ کا گورنر مسجد میں سرِ منبر حضرت علیؓ پر لعن طعن کرتا تھا۔ حضرت حجرؓ بن عدی نے اس کی مخالفت کی اور کھڑے ہو کر کہا کہ ''اے دشمنِ خدا تو رسولؐ کے دوست کو گالیاں دیتا ہے۔'' حضرت حُجرؓ حضرت علیؓ کے سچے رفیق اور عاشق صادق تھے۔ انھوں نے تمام جنگوں میں بڑی بہادری سے حضرت علیؓ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت معاویہؓ اور ان کے گورنروں کو یہ بات بہ خوبی معلوم تھی اور وہ جانتے تھے کہ حجرؓ کسی غیر اسلامی طریق کار سے اتفاق نہیں کریں گے اور نہ حضرت علیؓ کے خلاف سب وشتم گوارا کریں گے، مگر چوں کہ حضرت علیؓ پر سب وشتم اُموی تحریک کا جزوِ اعظم تھا، اس لیے اُموی اسے بند کرنے کے لیے تیار نہ ہو سکتے تھے۔ چناں چہ انھوں نے حُجرؓ بن عدی اور ان کے ساتھ چھے یا سات آدمیوں کو گرفتار کر لیا۔ یہ قافلہ پابہ زنجیر کر کے حضرت معاویہؓ کے سامنے لایا گیا، جہاں ان پر بغاوت کا الزام عائد کر کے ان کی گردنیں مارنے کا حکم دیا گیا۔ جب حضرت عائشہؓ

---

1. ''خلفائے بنواُمیّہ نے مذہب کے متعلق سب سے بڑی بدعت جو ایجاد کی تھی، وہ یہ تھی کہ حضرت علیؓ پر علانیہ خطبے میں لعن طعن کرتے تھے اور چوں کہ لوگ اس کا سننا گوارا نہیں کرتے تھے اور خطبہ سننے سے پہلے ہی اُٹھ جایا کرتے تھے۔ اس لیے امیر معاویہؓ نے نمازِ عیدین سے پہلے ہی خطبہ پڑھنا شروع کیا جو دوسری بدعت تھی لیکن حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے تمام گورنروں کے نام فرمان جاری کیا اور خطبے میں حضرت علیؓ کے متعلق جو ناملائم الفاظ شامل کر دیئے گئے تھے ان کو نکلوا دیا اور ان کی جگہ قرآن مجید کی یہ آیت اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ... الخ داخل کر دی جو آج تک پڑھائی جاتی ہے۔'' (ندوی، عبدالسّلام، مولانا۔ ''سیرتِ عمر بن عبدالعزیز رضی اللہ عنہ'' اسلام آباد، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اشاعت چہارم، ص ۹۸، ۹۹)

کو اس واقعہ کی خبر ہوئی، تو انھوں نے حضرت معاویہؓ کو اس اقدام سے باز رہنے کی ہدایت کی مگر پیشتر اس سے کہ حضرت عائشہؓ کا پیغام پہنچتا حضرت حجرؓ اور ان کے ساتھی خاک وخون میں لوٹ کر ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ (طبری کی تاریخ)

اس واقعہ نے مسلمانوں کے ایک بڑے طبقے کو حضرت معاویہؓ سے برگشتہ کر دیا۔ حضرت عائشہؓ کو بھی اس کا قلق ہوا اور وہ آخر تک حضرت معاویہؓ سے ناراض رہیں۔ یہ تو تھا حضرت معاویہؓ کا طریق کہ وہ اپنے مخالفین کو گالیاں دلواتے تھے اور جو اس کے خلاف احتجاج کرتا تھا، اسے نہایت بے دردی سے ذبح کروا دیا کرتے تھے، لیکن اس کے برعکس حضرت علیؓ کا طریق کار کیا تھا؟ ذیل کا واقعہ اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے۔"

حضرت علیؓ کا طریق کار

"حضرت معاویہؓ نے اپنی سیاسی دعوت کو کامیاب بنانے کے لیے حضرت علیؓ کو سرِ عام بُرا بھلا کہنے کا طریقہ نکالا تھا۔ لیکن حضرت علیؓ نے اپنے مددگاروں اور حامیوں کو سختی سے منع کر دیا تھا کہ معاویہؓ کو بُرا بھلا نہ کہا جائے۔ ایک مرتبہ جب آپ کو یہ خبر ملی کہ حُجرؓ بن عدی اور عمر بن الحمق حضرت معاویہؓ کو بُرا بھلا کہتے اور اہلِ شام پر لعن طعن کرتے ہیں تو آپ نے ان دونوں کو بلا بھیجا اور ان سے اس حرکت کا سبب پوچھا۔ تو انہوں نے کہا۔

"یا امیر المومنین! کیا ہم حق پر اور وہ باطل پر نہیں ہیں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا۔ "بے شک ہم حق پر ہیں۔ لیکن مجھے یہ بات سخت ناپسند ہے کہ تمہارا شمار گالیاں دینے والوں اور لعنت ملامت کرنے والوں میں کیا جائے۔ تم لعنت ملامت کرنے کے بجائے یہ دعا مانگا کرو کہ اے اللہ! ہمارے درمیان جو خوں ریزی ہو رہی ہے، اسے بند کر دے۔ ہمیں آپس میں صلح صفائی سے رہنے کی توفیق عطا فرما۔ انھیں ہدایت دے کہ وہ جہالت کو چھوڑ کر حق کی طرف متوجہ ہوں اور سرکشی کی راہ ترک کر کے صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائیں۔"

(الحسین مترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی)[1]

---

[1] پیام شاہجہانپوری، علیؓ اور اُن کی خلافت۔ لاہور، ملک دین محمد اینڈ سنز، اشاعت دوم، ۱۹۵۹ء، ص ۳۶۴-۳۶۸

خلیفۂ راشد سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اور امیر شام حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان خونی معرکے ہم عصر صاحبانِ قلم کی نظر میں

مورّخین کو طبقۂ اہل علم وفن سے الگ نہیں گردانا جاسکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ثابتہ ہے کہ عہد ملوکیت میں مطلق العنان حکمرانوں نے بالجبر یا براہِ سیم وزر من چاہی تاریخ مرتب کرائی، جس سے اس عہد کے تاجدار، اعلیٰ ترین انسانی اقدار کے علمبردار اور ان کے مخالفین انتہائی بدکردار، نابکار اور بدترین سزاؤں کے حق دار ٹھہرائے جاتے رہے۔

دُور کیوں جائیں اِس خطۂ زمین پر جن فرماں رواؤں کے نام کا سکہ چلتا رہا ہے، ان کی لکھوائی گئی تاریخ اور ان کی خودنوشت داستانوں کو پڑھیں تو لگتا ہے، ان ادوار میں عوام الناس کے لیے ہر دن عید اور ہر رات، شب برات کی مانند تھی، حالاں کہ غیر جانبدار مورّخ ''چین کی بنسری'' کے پہلو بہ پہلو، قہر وجبر میں دبی گردنوں کی بے نوا سسکیوں کا تذکرہ بھی کرہی جاتے ہیں۔

یہی سب کچھ امرائے بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانوں میں ہوتا رہا، اور ایسی ہی درباری تاریخ رقم ہوتی رہی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان روز وشب میں وقت کا شاعر اور ادیب...... ٹکرٹکر دیدم دم نہ کشیدم...... کی تصویر بنا رہا یا لمبی تان کر سوتا رہا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ جنگ وجدل کے اس عظیم سانحہ اور اس کے نتیجہ میں اپنوں کے ہاتھوں خون مسلم کی ارزانی پر اہل قلم نے کلمۂ حق بلند کرنے کا حق ادا کرنے میں کوئی دقیقہ فرد گزاشت نہیں کیا۔ آیئے ہم مشتے نمونہ از خروارے...... کے طور پر دیکھتے ہیں۔ درج ذیل اقتباسات ہم معروف ادیب، صحافی اور مصنف جناب ''پیام شاہ جہان پوری'' کی تالیف لطیف...... علیؑ اور اُن کی خلافت...... سے اُٹھا رہے ہیں۔

پیام صاحب نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حامی شعرا کے یہ نام گنوائے ہیں۔

ابوالاسود الدولی، الاشتر النخعی، الفضل بن العباس، نہشل بن حری، ابن مضرع الحمیری، نجاشی، نعمان بن بشیر الانصاری، قیس بن فہدان الکندی، شاعرہ ہند، انصاری اور عبداللہ بن خلیفہ۔

اُشتر محض شاعر نہ تھے، وہ انتہائی جری اور تجربہ کار جرنیل بھی تھے۔ میدان جنگ میں داد شجاعت دینے کے علاوہ اپنے رزمیہ کلام سے سپاہیوں کا لہو گرمانے میں اپنا ثانی نہ رکھتے تھے،

ملاحظہ فرمائیں۔

''اگر میں معاویہ بن حرب پر حملہ نہ کروں، اور ایسا حملہ جس میں سینکڑوں جانیں تباہ ہو جائیں تو بہتر ہے کہ میں دولت جمع کروں اور اسے خرچ نہ کروں۔ عزوشرف سے منھ پھیرلوں اور مہمان میرے گھر آئیں تو ان کا ترش روئی کے ساتھ استقبال کروں (چوں کہ یہ رذائل میرے بلند کردار کے خلاف ہیں، اس لیے میں اسے پسند کروں گا کہ ابن حرب پر حملہ کروں اور ان خصائل بد سے محفوظ رہوں) یہ حملہ غارت گر گھوڑوں کے ذریعہ سے ہوگا۔ یہ گھوڑے تیز گام اور پتلی کمر والے ہیں۔ یہ اپنی پشت پر مردان غازی کو لیے میدان جنگ میں دوڑتے ہیں۔ یہ مردانِ بلند نظر، دشمنوں پر حقارت کی نظر ڈالتے ہوئے بڑھتے ہیں۔ صیقل کی ہوئی زرہیں ان کے جسم پر جوش حرارت سے تپ رہی ہیں اور حرارت اور صیقل کی وجہ سے وہ بجلی کے کوندے اور سورج کی شعاع کی مانند چمک رہی ہیں۔'' (الحماسہ۔ ترجمہ افتخار اعظمی)[1]

معروف شاعر الفضل بن العباس، بنوامیہ کو چچازاد بھائی کہہ کر مخاطب کرتے ہیں[2] اور مفاہمت کی راہ اختیار کرتے نظر آتے ہیں، لیکن ایک رکھ رکھاؤ اور عزت نفس کو قائم رکھتے ہوئے۔ نمونۂ کلام دیکھیے۔

''چچازاد بھائیو! خدا کے لیے ذرا نرمی اختیار کرو، اور گڑے ہوئے مردے نہ اکھیڑو، ہماری ہتک کی آرزو دل میں نہ لاؤ۔ اور (پھر) اس بات کے بھی خواہش مند نہ رہو کہ تم ہماری توہین کروگے اور ہم تمھاری عزت کریں گے۔ یہ ممکن نہیں کہ تم تو ہمیں ستاؤ اور ہم تمھیں اذیت پہنچانے سے باز رہیں۔

چچازاد بھائیو! اب طعن و تشنیع سے پرہیز کرو اور وہی میانہ روی اختیار کرو، جو پہلے تمہارا اشعار رہی ہے۔'' (ترجمہ افتخار اعظمی)[3]

---

1. علیؓ اور اُن کی خلافت، ص ۲۷۷

2. ''صدرِ اسلام (علیہ السلام) کے زمانہ میں دونوں خاندانوں میں روابط اور رشتے قائم ہو چکے تھے، اور نسلی غرور لاشعور میں جا چکا تھا، لیکن حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے درمیان جو معرکہ آرائی ہوئی، اُس نے قوم کو عصبیت جاہلیہ کے قدیم بتوں کے پرستش پر مجبور کر دیا، اور گروہ بندیاں از سرِ نو شروع ہوئیں۔'' (احسان الحق۔ ''تمدن عرب''، ص ۲۷۰)

3. علیؓ اور اُن کی خلافت، ص ۲۷۸

افسوس ناک ردّعمل

بد قسمتی سے بنو امیہ کے کیمپ میں علوی شعرا کے توڑ کے لیے اخلاقی حدود پھلانگ دی گئیں۔ سب وشتم اور تبرا کا چلن عام ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ کی ہجو کے لیے اسلام دشمن شعرا کو انعام واکرام سے نواز کر مصاحبت کے مقام پر سرفراز کیا گیا۔ اخطل[1] نامی عیسائی شاعر کا نام ان دریدہ دہنوں میں نمایاں ترین ہے، جو حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے خلاف زہر افشانی کرتا اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے داد پاتا۔ یہ سلسلہ شہادت حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بعد رُکا نہیں۔

بل کہ حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد جب امیر معاویہؓ تمام عالم اسلام کے بلاشرکت غیرے فرماں روا بن گئے، تو اُموی سرداروں نے حامیانِ علی کو مرعوب کرنے کی کوشش کی، جس شخص پر ذرا سا بھی شبہ ہوا اسے پابند سلاسل کر دیا گیا۔ بعض لوگوں کو اذیت ناک تکلیفیں دے دے کر ہلاک کروادیا گیا۔ منبروں پر کھڑے ہو کر حضرت علیؓ کو سب وشتم کا نشانہ بنایا گیا۔ بعض جری دل لوگوں نے اس طریقِ کار کے خلاف احتجاج کیا تو انھیں جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ ایسے ہی لوگوں میں مشہور صحابیِ رسول حضرت حُجرؓ بن عدی بھی تھے۔ حضرت حُجرؓ نے اُموی سردار کی اس دل آزار روش پر اسے ٹوکا۔ نہ صرف ٹوکا بل کہ بعض دفعہ ملامت بھی کی۔ آخر انھیں مختلف الزامات لگا کر گرفتار کر لیا

---

[1] ''اخطل (م: ۹۵ھ/۷۱۴ء)، بنو امیہ کا شاعر تھا، نام غیاث بن غوث، کنیت ابو مالک اور لقب اخطل تھا۔ عرب قبیلہ بنو تغلب کے نصرانی خاندان سے تعلق تھا۔ وہ الجزیرہ میں اپنے قبیلہ میں پلا بڑھا۔ کم عمری میں اس کی ماں وفات پا گئی، سوتیلی ماں کی بدسلوکی کے نتیجہ میں وہ ایک زبان دراز، بدطینت اور شرابی بن کر بڑا ہوا۔ لڑکپن میں ہی شعر کہنے لگا۔ اموی دربار تک اس کی رسائی یزید بن معاویہ کی وجہ سے ہوئی۔ یزید کے بعد آنے والے اموی حکمرانوں نے بھی اس کی سرپرستی کی۔ خصوصاً عبدالملک بن مروان نے اخطل کو قبیلہ مضر اور اس کے شاعروں کے خلاف استعمال کیا کیوں کہ وہ آل زبیر کی طرف ہو گئے تھے۔ اخطل نے عبدالملک کی مدح میں بہترین قصائد کہے، جس کے نتیجہ میں عبدالملک کی طرف سے اسے ''شاعر الخلیفہ'' کا خطاب ملا، لیکن اپنے اشعار سے معاشرے کی کوئی خدمت نہ کر سکے۔ ان کی فحش گوئی اور ہجویہ شاعری نے لوگوں کو تقسیم کیا، فواحش اور منکرات کی اشاعت کی۔ شاعری ان کا ذریعہ معاش بھی تھا۔'' (نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر۔ مقالہ: ''حضرت نعمان بن بشیر: خاندان، سیاست، شاعری''، ص ۹۰، ۹۱ و حاشیہ ص ۹۵، ۹۶، شمولہ: جنوب مغربی ایشیا کا علمی تناظر: تاریخ، تہذیب اور ادب، مرتبین: ڈاکٹر جاوید احمد خورشید و ڈاکٹر خالد امین، ادارہ معارف اسلامی۔ کراچی، ۲۰۱۶ء

گیا اور بالآخر مع چھے یا سات رفقا کے نہایت بے دردی سے شہید کر دیا گیا۔ تاریخ ثابت کرتی ہے کہ یہ واقعہ حضرت معاویہؓ کے ایما سے ہوا۔

اس موقع پر حضرت علیؓ کے حامی شعرا نے بڑی جرأت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے اس واقعہ پر بڑی دل گداز نظمیں لکھیں، جو جذبات نگاری اور جوشِ بیان کے اعتبار سے اپنی مثال آپ ہیں۔ چناں چہ جب حضرت حُجرؓ بن عدی کو گرفتار کر کے حضرت معاویہؓ کے پاس لے جایا گیا تو اس واقعہ کو ایک شاعرہ ہند نے نظم کیا وہ کہتی ہیں کہ:

ہند کی نظم

''اے مہ شب تاب! ذرا بلند ہو، اور فراز آسمان سے دیکھ، کہیں حجرؓ تجھے سفر کرتا ہوا نظر آتا ہے یا نہیں؟ وہ معاویہؓ کے پاس جا رہا ہے۔ امیرؓ کا ارادہ ہے کہ اسے تہ تیغ کر دیا جائے۔ حُجرؓ کے بعد اربابِ ستم کے مظالم کچھ اور بڑھ گئے ''خورنق''[1] اور ''سَرِیر'' میں اب انھیں سکون و عیش مل گیا۔ اے حُجرؓ! تم جہاں بھی رہو، سلامتی اور شادمانی تمہارے قدم چومے۔ مجھے اس بوڑھے شخص سے اندیشہ ہے، جو دمشق میں بیٹھا غرا رہا ہے۔ نیک بندگانِ خدا کا خون اس کے لیے روا ہے۔ کاش! حُجرؓ طبعی موت مرتا اور کوئی اسے اونٹ کی طرح ذبح نہ کرتا۔ اگر وہ مردِ حق ہلاک ہو گیا تو سمجھنا چاہیے کہ قوم کا ہر لیڈر ایک نہ ایک دن ضرور ہلاک ہو گا۔'' (طبری جلد ہفتم۔ ترجمہ افتخار اعظمی)[2]

ملوکیت کا بدترین ثمر...... سانحۂ کربلا

فاضل محقق سید محمد فاروق القادری سانحۂ کربلا کی ماہیت بیان کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

'مسلمانوں کی بدقسمتی یا انسانیت کی بدنصیبی کہ خلافت راشدہ کا نظام اپنوں کی سازشوں کا شکار ہوا۔ حضرت علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ کی شہادت اور امام حسن کی خلافت سے دست برداری کے بعد ہمارا نظام حکومت و سیاست خاندان نبوت کے

---

[1] وہ محل جو عراق کے ایک بادشاہ بہرام گور کے لیے نعمان بن منذر نے بنوایا تھا۔ (ظہورالدین)

[2] علیؓ اور اُن کی خلافت، ص ۲۸۱ اور ۲۸۲

فقر و استغنا کی بجائے قیصر و کسریٰ کی ثروت[1] و حشمت اور ملوکانہ اداؤں کا مظہر بن گیا۔ بنو امیہ کے پورے دورِ حکومت میں (ماسوا۔ حضرت عمر بن عبد العزیزؓ کے دورِ سعید کے) سیاست میں جبر و تشدد اور ترغیب و تحریص کی روایت ڈالی گئی بل کہ معاشی میدان میں طبقاتی گروہ بندی کا آغاز[2] بھی اسی دور میں ہوا۔'

مزید لکھتے ہیں:

'جو لوگ معرکہ کرب و بلا کو محض دو قبیلوں یا مخصوص انداز کی نیکی بدی کی جنگ قرار دیتے ہیں انھیں یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ اس جنگ میں ایک طرف نبوی فقر و درویشی کے نمونے تھے تو دوسری طرف قیصری جاہ و جلال اور قبائلی عصبیتوں کے نمایندے۔ اور اس طرح سے یہ کہنا کچھ نامناسب نہیں کہ دوسرے اسباب کے علاوہ اس موقع پر یزید کے خلاف خاندانِ نبوت کی جدوجہد کا ایک بڑا سبب اُس جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ، مُستبدانہ، مُترفانہ، ظالمانہ اور آمرانہ ذہنیت کا مقابلہ کرنا تھا جو اسلام کے ماتھے پر کلنک کا ٹیکہ بن رہی تھی۔ اسی طرح حسین (علیہ السلام) کے خلاف یزید کے اقدامات کا مقصد دراصل اُس غریب پرست مزاج کا خاتمہ تھا، امام حسین علیہ السلام جس کے امین اور وارث تھے اور جس کی تلقین رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی تھی'۔[3]

---

[1] ''قوت و اقتدار کے غلط استعمال کا نام فرعونیت، مال و دولت کے استحصال اور غلط استعمال کا نام قارونیت، اور دین کے غلط استعمال کا نام تلبیس و منافقت ہے۔ یزیدیت ان تمام باطل نظریات کا مظہرِ اَتم ہے۔'' (نیازی، محمد عبد الستار خاں، مولانا۔ 'فلسفۂ شہادت حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ امت محمدیہ کے لیے پیغامِ حیات''، لاہور مکتبۂ رضویہ، طبع اوّل، ۱۹۸۸ء، ص ۷۴)

[2] ''رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی وفات سے ایک پشت بعد ہی دولت کی حکمرانی نے اللہ کی حکمرانی کی جڑیں کھوکھلی کرنی شروع کر دیں۔'' (حائری، فضل اللہ شیخ۔ ''فرزندِ کربلا'' مترجم سید نصرت اللہ شاہ، پیس پبلی کیشنز، لاہور۔ اشاعت اوّل، ۲۰۱۳ء، ص ۴۰)

[3] ''اصل مسئلہ معاشی ہے''، لاہور ادارہ پاکستان شناسی، طبع اوّل، ۲۰۰۷ء، مشمولہ زیرِ عنوان: 'معرکۂ کرب و بلا کا اصل پس منظر'۔ ص ۲۸، ۲۹

سانحۂ کربلا پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ابو الاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں، ''اسلام تو خیر بدر جہا بلند چیز ہے، یزید میں اگر

(باقی بر صفحۂ آیندہ)

چناں چہ بہ قول مولانا محمد علی جوہر، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یزید کو بہ حیثیت حضرت معاویہؓ کے وارث کے خلیفہ تسلیم نہ کرنا دراصل خلافتِ راشدہ کے اِحیا کی کوشش تھی، امام نے میدانِ کربلا میں ظالموں کی بے پناہ یورش اور بہیمانہ شورش میں گھر کر آمریت و ملوکیت کے خلاف نعرۂ حق و انقلاب بلند کرتے ہوئے جام شہادت نوش کیا۔

ع: سر دے دیا، جھکے نہ حکومت کے سامنے

اور امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وسلم کو جبر و استبداد سے نجات حاصل کرنے کی راہ دکھائی...... شہادتِ حسین ملوکیت کے خلاف پہلا جہاد تھا...... افسوس لکھوکھا مسلمانوں نے اب تک واقعۂ کربلا کی حقیقت کو نہیں سمجھا اور امام عالی مقام کے مذکورہ مقصد کو آج تک نہ جانا۔[1] درحالیکہ

ع: ابن زیاد و شمر و یزید آج بھی ہیں ایک

ملوکیت بنواُمیہ پر مولانا محمد علی جوہر کا مومنانہ تبصرہ

مولانا محمد علی فرماتے ہیں۔

''حکومت کا جو قانون اساسی، قرآن کریم اور سنتِ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجاز میں رائج کر دیا تھا افسوس کہ امیر معاویہؓ نے اسے بدل دیا۔ وہ قوم کہ جس

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

انسانی شرافت کی بھی کوئی رمق ہوتی تو وہ سوچتا کہ فتح مکہ کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے پورے خاندان پر کیا احسان کیا تھا اور اس کی حکومت نے اُن صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے کے ساتھ کیا سلوک کیا۔'' (خلافت و ملوکیت، ص ۱۸۱)۔ ''ڈوزی (Dozy) کا کہنا ہے کہ اس نے اسلام سے نہایت دہشت انگیز اور گھناؤنا انتقام لیا۔ اسلام نے اپنی فتح و نصرت کی گھڑی میں اہلِ مکہ اور بنی اُمیہ سے جو رحم و عفو کا سلوک کیا تھا اس کا معاوضہ انھوں نے یہ دیا۔'' (روحِ اسلام، ص ۳۶۱)

[1] فلسفۂ شہادت حسین تو یقیناً امت محمدیہ کے لیے پیغام حیات ہے۔ سطور بالا میں جس جانب مولانا جوہر مرحوم نے اشارہ کیا ہے اس میں شک کی جگہ نہیں، جیسا کہ اس کی تائید درج ذیل عبارت سے بھی روشن ہے۔

''حضرت امام حسینؓ کی اپنی بھی یہی خواہش تھی کہ وہ کسی طرح ملوکیت کے نظام کو، جس نے آبائی وراثت کا درجہ حاصل کر لیا تھا، دوبارہ خلافت سے تبدیل کر دیں اور واقعہ یہ ہے کہ اس وقت ان سے زیادہ کوئی اور شخص اس کا اہل بھی نہ تھا، اس لیے حضرت امام حسینؓ کے نقطۂ نگاہ سے یہ جنگ محض حصولِ اقتدار کی جنگ نہ تھی، بل کہ نظریے اور فکر کی جنگ تھی۔''

(اردو دائرۂ معارفِ اسلامیہ، پنجاب یونی ورسٹی لاہور، طبع اوّل، ۱۹۸۹ء، ۲۳:۲۹۳)۔

نے کسی بادشاہ کی اطاعت اپنی ساری تاریخ میں قبول نہ کی تھی۔ اور جس کے ملک پر کوئی فاتح قبضہ نہ کرسکا تھا نہ سکندر یونانی، نہ کوئی شہنشاہِ روما۔ اور جو غالباً اسی سبب سے اس نوازش ربانی اور امتیاز عظیم کے لیے منتخب کی گئی تھی کہ دنیا کے بت کدہ میں خدا کا پہلا گھر اس کے ملک میں بنایا جائے، اور خدا کا آخری نبی جو اگلے انبیا کی طرح فقط ایک قوم کا ہادی نہ ہو بل کہ رحمۃٌ للعالمین ہو، اور کافۃً للناس بھیجا گیا ہو، وہ اس قوم میں مبعوث ہو۔ وہی قوم سب سے پہلے بار خدا کے آگے گردن جھکانے کے بعد اب بادشاہوں کے آگے گردن جھکانے پر مجبور کی گئی۔ خدا کے گھر کا محاصرہ کیا گیا۔ اور اس پر پتھر برسائے گئے۔ اور اسے جلایا گیا۔ اور جیران اللہ کو طرح طرح سے ستایا گیا۔ نبی اکرمؐ نے جس شہر کی طرف ہجرت فرمائی تھی اور جہاں خدا کے حکم سے اپنا وطن چھوڑ کر پناہ پائی تھی، جو اس باعث یثرب سے مدینۃ النبیؐ بن گیا تھا جہاں نبی اکرمؐ آرام فرماتے تھے، اس پر علا حدہ حملہ ہوا[1]۔ اور جیران رسولؐ اللہ اور آپ کے انصار جن کے ساتھ آپ کی محبت و اتحاد کے کیسے کیسے عہد و پیمان تھے، ہزاروں کی تعداد میں تہ تیغ کیے گئے، اور ان کی مائیں، بیٹیاں، لڑکیاں خراب کی گئیں، اور جو عفت و عصمت کا سرچشمہ تھا وہاں اس حملہ کے بعد ایک ہزار سے زیادہ

---

[1] ''آخری ذوالحجہ ۶۳ھ میں پورے اہل مدینہ نے یزید کی بیعت کو توڑ کر اپنے لیے دوسرا حاکم منتخب کیا، جس کی پاداش میں مدینہ تین دنوں تک شامی فوجوں کے حوالہ رہا، اور انھوں نے اس حرم میں وہ سب کچھ کیا جسے کوئی وحشی سے وحشی تر فوج بھی اپنے مقبوضہ علاقہ میں نہیں کرسکتی، کئی ہزار صحابہ اور تابعین کو یزیدی سیاست کی تلوار کھا گئی، حرم رسول کی عزت و حرمت ختم کردی گئی، صحابہ اور تابعین کے گھروں کو لوٹا گیا، ان کی حرم سراؤں کی عفت و عصمت لوٹی گئی، اور مسجد نبوی شریف میں اذان و اقامت کی نوبت نہ آئی۔'' (مبارکپوری، قاضی اطہر۔ ''سیّدنا علی و سیّدنا حسین رضی اللہ عنہما''، مکتبہ سید احمد شہید، لاہور، اشاعت اوّل ۲۰۰۳ء، ص ۱۹۲، ۱۹۳)۔ ''جس شہر نے پیغمبرِ اسلامؐ کو بت پرستوں کے مظالم سے پناہ دی تھی، جس سے آپؐ کو محبت تھی، جس کی خاک کو آپؐ کی قدم بوسی کا شرف نصیب ہوا تھا، جس کے چپے چپے پر آپؐ کی دعوتِ حق نے مہر تصدیق ثبت کی تھی، اس کی ہر مذموم طریقہ سے بے حرمتی کی گئی۔ جن لوگوں نے پیغمبر اسلامؐ کے شانہ بہ شانہ کھڑے ہو کر مصائب کا مقابلہ کیا تھا اور آپؐ کو دین کی عمارت کھڑی کرنے میں مدد دی تھی ان پر دہشت ناک اور انسانیت سوز مظالم توڑے گئے۔ انھوں نے مدینہ کو تاخت و تاراج کر دیا اور انصار کی اولاد کو شہر بدر کر کے دور دراز ملکوں میں بھیج دیا۔'' (امیر علی، سیّد۔ ''روحِ اسلام'' (The Spirit of Islam) مترجم، محمد ہادی حسن، ادارۂ ثقافتِ اسلامیہ، لاہور، طبع اوّل ۱۹۷۲ء، ص ۴۶۰)

حرام کی اولاد پیدا ہوئی۔

خلافت راشدہ کا زمانہ ختم ہو چکا تھا۔ اب بھی خلافت کا نام لیا جاتا تھا۔ مگر حقیقتاً دور دورہ بادشاہت کا تھا۔ اور جو دماغی، قلبی اور جسمانی نشو ونما رسول اکرمؐ اور خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنھم اجمعین کی بہ دولت اس قوم کو نصف صدی میں نصیب ہو گیا تھا جسے خدا کی نظر انتخاب نے اسلام کی علم بردار بنایا تھا، وہ رفتہ رفتہ بند ہوتا گیا۔'' (افادات محمد علی، مرتبہ: رئیس احمد جعفری، حیدر آباد (دکن)، ادارۂ اشاعتِ اردو، مارچ ۱۹۴۵ء، ص ۱۱، بحوالہ اخبار ہمدرد، دہلی، ۱۱-۱۴/ مارچ ۱۹۲۷ء)

یہ امر مخفی نہیں اور بقول محمد احسان الحق سلیمانی، جنگ صفین اور جمل نے اسلامی صفوں میں ایسا انتشار پیدا کیا کہ اسلامی اتحاد اور اخوت، محبت اور مودّت کے الفاظ صوری (ظاہری) حیثیت میں نظر آنے لگے، لیکن اُن کی معنوی حقیقت کبھی بھی شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکی۔ مزید برآں جہاں ابن سبا اور عجمی نو مسلموں کی چیرہ دستیوں نے حضرت علی کے عہد کو خوں چکاں بنا دیا[1]، وہیں صورت حال کا فائدہ اٹھاتے ہوئے امیر معاویہؓ نے حضرت علیؓ کے مقبوضات پر پیش قدمی شروع کر دی۔ ۳۸ھ میں مصر پر قبضہ کر لیا اور ۳۹ھ میں دوسرے مقامات پر قبضہ کرنے کی کوشش کی گئی۔[2]

مذہب کے نام پر شدت پسندی

ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ (صدر شعبۂ تاریخ اسلام، جامعہ کراچی) کا خیال ہے کہ دنیا کے تقریباً تمام ہی مذاہب کو اپنے متبعین میں سے شدت پسند گروہوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اسلام بھی اس سے مستثنٰی نہیں۔ چناں چہ مسلمانوں میں شدت پسند گروہ (خوارج) کا ظہور جنگ صفین ۳۷ھ/ جولائی ۶۵۷ء کے دوران تحکیم کے نتیجہ میں ہوا، یہی گروہ آگے چل کر اسلامی ریاست کا سب سے زیادہ انتہا پسند اور متشدد گروہ ثابت ہوا۔ بد قسمتی سے آج انتہا پسندی کو بلاواسطہ یا بالواسطہ دین رحمت (اسلام) سے جوڑا جا رہا ہے[3]۔ موصوفہ اپنے مقالہ: 'مسلمانوں میں انتہا پسندی کا

---

[1] تمدن عرب، ص ۲۰۶

[2] اردو دائرۂ معارف اسلامیہ، ۲۱: ۲۹۲

[3] ہندوستان میں انگریز جب قبضہ جما چکے ایسے وقت میں غیر ملکی طاقت سے نبرد آزما ہونے کے بجائے سکھوں کے خلاف جہاد کے نام پر اس گروہ کا افغان مسلمانوں کے خلاف خروج، قتل و غارت اور پھر کلمہ گو مسلمانوں کے

(باقی بر صفحہ آیندہ)

آغاز، خوارج۔ ایک مطالعہ' کے مقدمہ میں لکھتی ہیں:

''فرقۂ خوارج[1] پہلی صدی ہجری کے نصف اوّل کی پیدائش ہے۔ اس گروہ

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

ہاتھوں ہی کیفر کردار تک پہنچنا، تاریخ کا الم ناک باب ہے۔ مزید برآں بالاکوٹ کے 'بچے کھچے مجاہدین' کا سن ستاون کی جنگ آزادی میں حصہ نہ لینا بل کہ اس میں ''شریک ہونے والوں کو سخت گنہگار اور مفسد و باغی بدکردار قرار دینا''، انگریزوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کے مترادف تھا۔ ان حضرات کا انگریز سے عہد وفاداری کے لیے ملاحظہ ہو۔ بٹالوی، محمد حسین لاہوری، ابوسعید۔ 'الاقتصاد فی مسائل الجہاد'، طبع وکٹوریہ پریس، ص ۴۹-۵۰۔

پھر اسی خارجیت کا تازہ ترین روپ کبھی طالبان کے نام سے ظاہر ہوتا ہے تو کبھی داعش جیسی قاتل و وحشی جماعت کے وجود سے جوامت مسلمہ کے خلاف ایک عظیم فتنہ ہے۔ دہشت گردی اور خودکش حملوں کا شکار دنیا بھر کے کلمہ گو اب کھل کر ان سے نجات کے لیے ہم زبان نظر آتے ہیں۔

نوٹ: مذکور جہاد کی حقیقت سمجھنے کے لیے ''سید احمد شہید کی صحیح تصویر'' از وحید احمد مسعود اور ''امتیاز حق'' از راجا غلام محمد کا مطالعہ ضروری ہے۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ لوگ خوارج سے لے کر اب تک مختلف ادوار میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے۔ بقول پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد، تکفیر مسلم میں نہ صرف جوش و جذبہ دکھایا، بل کہ ہزاروں لاکھوں کو تہ تیغ کرایا۔ عرب و عجم میں اب بھی ایسے حادثات نظر آتے ہیں جن کی ہم کو خبر تک نہیں۔

یہ حقیقت بھی مسلمہ ہے کہ اقلیتی فرقے ہمیشہ مرکز گریز رہے، انھوں نے قطعاً اس بات کی پروا نہ کی جس طرح ''قیام جماعت اور استحکام مرکز کی تاکید حدیثوں میں آئی ہے جیسے ید اللہ علی الجماعة (اللہ کا ہاتھ جماعت پر ہے) من شذ شذ فی النار (جو جماعت سے علاحدہ ہوا اور علاحدہ ہو کر جہنم میں جائے گا) حضرت علی کرم اللہ وجہہ کا قول ہے، ایاکم و التفرقة فان من الناس للشیطان کما ان الشاذ من الغنم للذئب۔ (تفرقہ سے بچو کہ بچھڑا ہوا آدمی شیطان کا حصہ ہے، جس طرح بچھڑی ہوئی بکری بھیڑیے کا حصہ ہوتی ہے۔'' (یوسف حسین خاں، ڈاکٹر۔ ''رُوحِ اقبال''، ادارۂ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن، طبع ثانی، ۱۹۴۴ء، حاشیہ ص ۱۶۰)

[1] خوارج اپنے سوا تمام اہل اسلام کو کافر و مشرک سمجھتے تھے اور مسلمانوں کا جان و مال مباح گردانتے۔ جنگ نہروان (۹ رصفر ۳۸ھ) میں شکست فاش کے بعد دیار و امصار میں ان کے حامیوں نے وحدتِ ملی کے خلاف تحریک خفیہ طور پر جاری رکھی۔ (نیازی، عبدالستار خاں، مولانا محمد۔ ''اتحاد بین المسلمین۔ وقت کی اہم ضرورت'' (حصہ دوم)، طبع لاہور۔ بار دوم، ۲۰۱۲ء، ص ۸۴ اور حواشی)۔ ''یہ بات معنی خیز ہے کہ ان خوارج کے تعلقات مسلمانوں سے کشیدہ اور مسیحیوں سے اچھے تھے۔ خوارج نے غیر مسلموں کے ہاتھ مضبوط کیے۔ خوارج کے نزدیک مسلمان کا خون حلال تھا، لیکن غیر مسلموں کو بچانے کے لیے وہ جان کی بازی لگا دیتے تھے۔ جب خوارج نے زور

(باقی بر صفحہ آیندہ)

کی اپنی سیاسی اور مذہبی تاریخ ہے۔ سیاسی اعتبار سے ان کی حکومتِ وقت کے ساتھ، جو ان کے نزدیک غیر عادل حکومت تھی، سے طویل جنگیں ہیں جنھوں نے اسلامی ریاست کی بنیادوں کو کمزور کیا، یہی نہیں بل کہ ان کی سیاسی سرگرمیوں نے پہلے حضرت امیر معاویہ کو حضرت علی پر برتری دلائی، پھر عباسیوں کو امویوں پر۔ دوسری طرف اعتقادی اعتبار سے انھوں نے سیاسی، معاشی اور معاشرتی معاملات میں جو اعتقادات وضع کیے اس نے پراگندہ خیالی کو فروغ دیا۔ عقل کے بے محابانہ استعمال نے نت نئے فتنوں کو جنم[1] دیا۔"

مزید لکھا گیا ہے:

"پہلی صدی ہجری مسلمانوں میں فتنہ کے آغاز، فرقوں کے ظہور اور خانہ[2] جنگی

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

پکڑا تو اپنے ساتھ ان کو بھی ملا لیا، جنھوں نے اسلام قبول نہیں کیا تھا اور اپنے مسیحی مذہب پر قائم تھے۔ یہ مسیحی عنصر ہر طرح سے خارجیوں کی مدد کرتا۔ حضرت علی کے زمانہ خلافت میں پانچ مہینوں میں ان کی پانچ بغاوتیں سامنے آئیں۔" (نگار سجاد ظہیر، ڈاکٹر۔ "خوارج۔ ایک مطالعہ"، ص ۷۷، ۳۵۰ و ۳۵۱)۔ "یہ لوگ حضرت عثمانؓ اور حضرت علی کرم کی خلافت سے انکار کرتے ہیں۔ اس لیے کہ اُنھوں نے مذہب کو خراب کیا، اور مؤخر الذکر کرنے تحکیم کو تسلیم کر لیا۔ وہ حضرت علی کرم کے قتل میں اپنے آپ کو راہِ راستی پر سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ ہر آزاد عرب خلیفہ بننے کا حقدار ہے اور ہر وہ خلیفہ جس کے کردار سے قوم کو نقصان اُٹھانا پڑے معزول کر دیا جائے یا قتل کر دیا جائے۔" (سلیمانی، محمد احسان الحق۔ "تمدّنِ عرب"، ص ۲۰۹)۔

۱ اس کی ذمہ داری ان گم راہ و گم گشتہ قائدین پر عاید ہوتی ہے جنھوں نے مختلف اوقات میں عقائد باطلہ کو پروان چڑھایا...... تاریخ شاہد ہے امتوں کے بننے اور بگڑنے کا مدار ہمیشہ ان کے عقائد کے بننے، بگڑنے پر رہا ہے۔ اسی لیے مسلمان مفکرین نے مسلمانوں کے اندر (بد اعتقادی) غلط مذہبی خیالات کے پیدا ہونے کو مسلمانوں کے انحطاط اور زوال کا سب سے بڑا سبب بیان کیا ہے، اور مسلمانوں کو مختلف فرقوں میں تقسیم کرنے کا ذمہ دار، باطل عقائد و نظریات کے حامل قائدین کو ٹھہرایا ہے۔ (دیکھیے۔ نواب محسن الملک (۱۸۳۷ء-۱۹۰۷ء) کی کتاب: مسلمانوں کی ترقی اور اُن کے تنزل کے اسباب، صفحات ۴۷ تا ۸۲)۔ افسوس کہ اُمتِ محمدیہ اب تک ان صدمات سے نجات حاصل نہ کر سکی۔ (ظہور الدین)

۲ حضرت علی کے خلاف جمل اور صفین کے میدان میں جو لڑائیاں ہوئیں ان کی بنیاد "قصاصِ عثمان" کی تحریک ہے، انھوں نے اہل بغاوت سے جو قتال کیا اسے خانہ جنگی کہنا بہت بڑی غلطی ہے (دیکھیے۔ مناقب اہل بیت، ص ۲۴۷ و ۲۴۹)۔

کی صدی ہے۔ اسی صدی نے عہد رسالت میں ایک عادل اسلامی معاشرے اور اسلامی فلاحی ریاست کے قیام کا منظر بھی دیکھا، خلافت راشدہ کا عروج واستحکام بھی دیکھا، لیکن ساتھ ہی ساتھ تین خلفاء راشد کا قتل، تین خطرناک جنگیں اور آسمان سے برستی بارش کے مانند فتنوں کی یلغار بھی دیکھی۔ پہلی صدی ہجری کی تاریخ کا مطالعہ آسان معاملہ نہیں ہے ایک تو اس وجہ سے کہ اس دور میں متعدد خارجی اور داخلی عناصر برسرکار تھے، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ صحابۂ کرام کا دور تھا، جن کے بارے میں لکھنا عام اشخاص پر لکھنے کی طرح آسان نہیں ہے۔ مورخ کے لیے یہ انتہائی دشوار ہے کہ وہ فریضہ انتقاد انجام دے سکے کیوں کہ صحابۂ کرام سے جو تقدیس اور ادب وابستہ کیا جاتا ہے وہ زیادہ بحث اور تمحیص کی اجازت نہیں دیتا۔ لوگوں میں یہ خیال عام ہے بل کہ اس نے عقیدہ راسخ کی صورت اختیار کرلی ہے کہ اس موضوع پر وہی قلم اٹھا سکتا ہے جو گم راہ اور گناہ گار ہو۔ حالاں کہ حقیقت یہ ہے کہ صحابۂ کرام معصوم عن الخطا نہیں تھے، انھوں نے اپنے موقف کے لیے شمشیر برہنہ کی، ان کی آپس میں ایسی جنگیں ہوئیں کہ ہزارہا مسلمان شہید ہوگئے۔ ان کا ادب اور تقدیس اپنی جگہ، تحقیق کی ذمہ داریاں اپنی جگہ[1]۔''

محترمہ ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر صاحبہ نے درست فرمایا کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیھم کے متعلق تاریخی واقعات پر کچھ بھی کہنے کو اس درجہ خلاف ادب سمجھا جاتا ہے کہ گویا یہ کوئی گناہ میں داخل فعل ہے۔ سوا حضرات انبیا علیھم السلام کوئی بھی معصوم عن الخطا نہیں ہے۔ بزرگ ترین شخصیات سے بھی سوچ سمجھ اور قوتِ فیصلہ میں خطا کا احتمال ہوسکتا ہے۔ اس میں بھی کلام نہیں کہ تمام افعال و اقدام پر اجر وثواب کا انحصار نیت پر ہے۔ لیکن تاریخ کے اوراق سے وہ دردناک باب کیوں کر نوچے جاسکتے ہیں، جو جماعت اصحاب کے قیمتی خون سے رنگین ہیں۔

بعض علما مصنفین نے اوّل تو امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہٗ اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے درمیان برپا ہونے والی جنگوں پر خاموشی اختیار کی ہے، یا پھر سرسری ذکر کرکے جان چھڑائی ہے۔

---

[1] خوارج۔ ایک مطالعہ، قرطاس، کراچی: بار اوّل، ۲۰۱۲ء، ص ۱۴

بصیر پور شریف کی خانقاہ اور مدرسہ ہمارا قیمتی اثاثہ ہے۔ اس کے روح رواں جناب محمد محب اللہ نوری حضرت محمد نور اللہ نعیمی بصیر پوری کے خلف الرشید اور پایہ کے عالم ہیں۔ اُن کی ایک کتاب باب مدینۃ العلم۔ مرتضٰی، مشکل کشا، مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ کافی معروف اور مقبول ہے، اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ عقل دنگ رہ جاتی ہے یہ دیکھ کر کہ ۴۶۴ صفحات پر مشتمل اس ضخیم کتاب میں جنگ جمل اور جنگ صفین کا نام تک کہیں ڈھونڈے سے نظر نہیں آتا۔ یقیناً صاحبزادہ صاحب نے سوچ سمجھ کر اس اخفا کو اختیار کیا، لیکن آنکھیں بند کر لینے سے حقائق تو نہیں چھپتے نہ ہی ان کی تلخی میں کوئی کمی آتی ہے۔ کاش! تاریخ کے ساتھ یہ سلوک روا رکھنا ہمارے علما کے حصہ میں نہ آتا۔

ع : رکھیو غالب! مجھے اس تلخ نوائی میں معاف

قصاصِ عثمان کے نام پر خونِ مسلم کی ارزانی

جنگ جمل میں حضرتِ زبیرؓ اور حضرت طلحہؓ جیسے مقتدر صحابیوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ اوّل الذکر ابن جرموز کے ہاتھوں قتل ہوئے تو موخر الذکر مروان[1] بن حکم کے ہاتھوں۔ حضرت عائشہؓ کے لشکر میں سے نو ہزار اور حضرت علیؓ کی فوج میں سے ایک ہزار ستر افراد نے جامِ شہادت نوش کیا۔[2]

جنگ صفین[3] ۳۷ھ/ ۶۵۷ء میں لڑی گئی۔ حضرت امیر معاویہؓ اور حضرت علیؓ کی فوجیں

---

[1] ''مروان بنو اُمیہ کی دوسری شاخ بنی العاص سے تعلق رکھتا تھا۔ اُس کا باپ حکم بن العاص حضرتِ عثمانؓ کا حقیقی چچا تھا۔ وہ فتحِ مکہ کے دن مشرف بہ اسلام ہوا، لیکن ایمان اُس کے دل میں داخل نہ ہوا تھا۔ چناں چہ منافقت کی بنا پر سرورِ عالمؐ نے حکم کو طائف جلاوطن کر دیا تھا۔ حضرت عثمانؓ نے حکم اور مروان دونوں کو بہ اجازت نبی اکرمؐ واپس بلا لیا۔ مروان، عہد عثمانیؓ میں جلیل القدر عہدوں سے نوازا گیا۔ مہر خلافت اُسی کے ہاتھ میں دے دی گئی۔ جب مصر کے لوگ خلیفۃ المسلمین کے پاس حکام کی شکایت لے کر آئے تو مروان نے حضرت عثمانؓ کی طرف سے گورنرِ مصر کو تحریر کیا کہ وہ شکایت کنندگان کے سرغنوں کو پکڑ کر قتل کر ڈالے۔ لیکن یہ راز افشا ہو گیا۔ اور بلوائیوں نے قاصد کو راستے میں ہی پکڑ لیا۔ اس پر اُنھوں نے احتجاج کیا، لیکن حضرت عثمانؓ کے ہاں شنوائی نہ ہوئی۔ بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا احاطہ کر لیا۔ اور آپ کو شہید کر دیا۔'' (سلیمانی، محمد احسان الحق۔ ''تمدن عرب''۔ حاشیہ ص ۲۷۶)

[2] تاریخ اسلام۔ نجیب آبادی، اکبر شاہ، زید بک ڈپو، دہلی، ج اوّل، ص ۴۶۰

[3] صفین کا مقام ملک شام میں دریائے فرات کے دائیں کنارے پر رقہ کے مقابل واقع ہے۔

دریائے فرات کے کنارے صف آرا ہوئیں۔ صفر کے مہینے میں خون ریز جنگ ہوئی۔ کوئی ۴۵۰۰۰ شامی اور ۲۵۰۰۰ عراقی میدانِ جنگ میں کام آئے۔ ہزاروں عورتیں بیوہ ہوگئیں اور لاکھوں بچے سایۂ پدری سے محروم کردیئے گئے۔ ۷۰۰۰۰ مسلمانوں کی ہلاکت کے باوجود اس کشمکش کا کوئی ٹھوس نتیجہ برآمد نہ ہوا اور حالات پہلے سے زیادہ ابتر ہوگئے۔

یہ اصل میں نکبت وفلاکت کے بادل تھے، انتشار اور افتراق کے بادل تھے، جن کے برسنے سے، پہلے کسے خبر تھی کہ اسلامی مودّت کا عقدِ لُو لُو جسے رحمۃٌ لِّلعٰلمین نے دستِ شفقت سے پرویا تھا، بکھر جائے گا، جیسے تسبیح کے دانے۔ (تمدنِ عرب: ۲۰۷)

حرفِ آخر

زیرِ نظر ''مناقب اہل بیت'' میں فاضل مولف نے حد درجہ احتیاط کا التزام روا رکھا ہے۔ وہ کہیں بھی افراط وتفریط کا شکار نہیں ہوئے۔ قدم قدم پر انھوں نے قرآن وحدیث سے استفادہ کیا ہے اور ذاتی قیاس آرائیوں کو دخل اندازی کی اجازت نہیں دی۔

حضرت علامہ کی یہ کتاب مکتبہ سراجیہ، بنارس (بھارت) کے زیرِ اہتمام پہلی بار اگست ۱۹۷۱ء میں منصۂ شہود پر آئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ اس کی طبع ثانی اکتوبر ۱۹۸۰ء میں پھر مکتبہ سراجیہ نے ہی کی، اور اس کا تیسرا ایڈیشن مارچ ۲۰۰۶ء میں کوثر اکیڈمی، بنارس سے شائع ہوا۔

مناقب اہل بیت کے مطالعہ کے بعد ہمیں یہ ماننا پڑتا ہے کہ حضرت علامہ کوثر ندوی کا مطالعہ بہت وسیع، علم عمیق اور بے پایاں ہے۔ حضرت سراج العارفین کا تمام اہل علم بالخصوص مسلمانوں پر بڑا احسان ہے کہ انھوں نے شہادت شہزادۂ مظلوم حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ عنہ پر قلم اُٹھایا۔

بھارت کے علمی ودینی حلقوں میں بے پناہ پزیرائی، کتاب کے مندرجات کی ثقاہت اور حضرت کے پراثر اندازِ بیان کے پیشِ نظر، ہم پاکستان میں اس کی اشاعت کی سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس سعیِ مسعود کو قبول فرمائے اور حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ کے درجات بلند فرمائے۔ آمین!

ظہور الدین امرتسری

بنواُمیّہ کی خاندانی سرشت

فاروق اعظم اور حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی نظر میں

ابن مردویہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے حضرت عمر سے پوچھا: امیر المومنین اس آیت اَلَمْ تَرَاِلَی الَّذِیْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ كُفْرًا (۱۴:۲۸) میں کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت عمر نے فرمایا۔ قریش کے دو فاجر خاندان مراد ہیں۔ یہ ہیں بنومغیرہ اور بنوامیہ۔ بنومغیرہ کی کافی سرکوبی تم لوگ غزوۂ بدر میں کر چکے۔ البتہ بنواُمیہ ایک زمانہ تک مال ومتاع پاتے رہیں گے۔

ابن جریر، ابن منذر، ابن ابی حاتم (اپنی تصانیف میں) طبرانی معجم اوسط میں حاکم مستدرک اور ابن مردویہ (اپنی کتاب میں) متعدد سندوں سے اسی طرح کا قول حضرت علی سے بھی روایت کرتے ہیں۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کر کے فرماتے ہیں:

بنو امیہ کفر و ناشکری کے باوجود مال و متاع پاتے رہے، حتیٰ کہ ابوسفیان، معاویہ اور عمرو بن عاص نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی دی ہوئی نعمت پا کر شکر کے بدلے کفر و ناشکری کی اور آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کو لے کھڑے ہوئے اور حسین رضی اللہ عنہ کو بڑے ظلم کے ساتھ شہید کیا۔ (مناقب اہل بیت: ۴۸۶، ۴۸۷)

حیات و جہاتِ رجلِ عظیم

بنارس صوبجات متحدہ کا قدیم مشہور تجارتی و صنعتی شہر ہے، جو بڑا مردم خیز ہے۔ یہ ایسا تاریخی شہر ہے۔ جسے علم وعرفان، سیاست واقتدار، ادب وتمدن میں قوم مسلم سے فیض یاب ہونے میں ہمیشہ امتیازی درجہ کی حیثیت حاصل رہی ہے۔ تقسیم ہند سے قبل برطانوی اعلان واصطلاح میں مدعیانِ اسلام کم وبیش ایک لاکھ نفوس پر مشتمل تھے۔اس کی آبادی نہایت گھنی اور گنجان ہے۔ اگر آپ ہندوستان کا نقشہ دیکھیں تو معلوم ہوگا کہ بنارس برعظیم پاک و ہند کا سنٹر واقع ہوا ہے۔اس کے مغرب میں متصل شہر جونپور ہے جو سلاطین شرقیہ کا دارالسلطنت رہا ہے۔ راستے میں پڑنے والے دوسرے اسٹیشنوں کے اسلامی نام اکبر پور، شاہ گنج، ظفر آباد، جلال گنج، خالص پور وغیرہ ہیں۔ مشرق کی جانب سے داخل ہونے والے بنارس سے پہلے مغل سرائے پائیں گے۔ بنارس کے جنوب میں تاج پور، یوسف پور، غازی پور کے اسلامی شہر آباد ہیں۔

کہا گیا ہے کہ بنارس ہندوؤں کا تیرتھ ہے، لیکن مسلمانوں کی قائم کردہ مذکورہ آبادیاں بتاتی ہیں کہ بنارس مسلمانانِ ہند کی نگاہوں میں[1] ہمیشہ مرکز توجہ رہا ہے۔ نیز یہاں مغل دور میں تعمیر

---

[1] بنارس کی سرزمین کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ امت مسلمہ کے سواد اعظم نے ۲۷ تا ۳۰ر اپریل ۱۹۴۶ء کی تاریخوں میں آل انڈیا سنی کانفرس کا عدیم المثال اجلاس منعقد کر کے یہ اعلان کیا تھا کہ ''یہ اجلاس مطالبۂ پاکستان کی پُر زور حمایت کرتا ہے، اور اعلان کرتا ہے کہ علماء ومشائخ اہلسنت اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کے واسطے تیار ہیں، اور یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی حکومت قایم کریں جو قرآنِ کریم اور حدیث نبویہ کی روشنی میں فقہی اسلام کے مطابق ہو۔''

(خطبۂ صدارت جمہوریۂ اسلامیہ از سید محمد کچھوچھوی، مطبوعہ مراد آباد، ص ۲۹)

کردہ مسجد بنارس کی زینت اور حضرت عالمگیر کی بلند نظری کی گواہ ہے۔ بقول سید محمد محدث کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ، بنارس کا ایک محلہ بھی ایسا نہیں جس میں گنج شہیداں نہ ہو، شہر سے جس طرف نکل جایئے کوئی نہ کوئی مسلم الثبوت عارف باللہ آسودۂ زمین ہے۔ ایک ایک محلہ میں مشائخ کرام کی دو دو چار چار خانقاہیں ہیں سلاسل اربعہ قادریہ چشتیہ ونقشبندیہ وسہروردیہ کا فیض عام ہر طرف جاری ہے اسی شہر کے محلہ جلالی پورہ میں وہ خانقاہ سراجیہ بھی ہے، جہاں حضرت ''سراج العارفین'' علامہ عزیز الحق کوثر ندوی کا مزار پرانوار مرجع خلائق ہے۔ بلاشبہ یہ شہر ہمیشہ سے ہی علم و ادب کا گہوارہ اور ایسے نابغۂ روزگار ہستیوں، صوفیوں، عارفوں اور عالموں کا مسکن رہا ہے۔

خاندانی پس منظر

سراج العارفین حضرت علامہ عزیز الحق کوثر ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بنارس شہر کے محلہ کچی باغ کے جس بے مثال گھرانہ میں آنکھ کھولی وہ دینی، مذہبی اور تصوف کے گہرے رنگ میں رنگا ہوا تھا۔ ان کے شجرۂ نسب پر نظر کریں تو بے اختیار کہہ اٹھیں۔ ع

این همه خانه آفتاب است

سلسلۂ نسب یوں ہے۔

حضرت علامہ عزیز الحق کوثر ندوی بن محمد اسحٰق بن شیخ الٰہی بخش بن غلام علی بن شیخ منور بن شیخ محمد بن احمد بن شیخ پھول محمد۔

آپ کے جدامجد حضرت شیخ الٰہی بخش رحمۃ اللہ علیہ ایک خدارسیدہ بزرگ اور شب زندہ دار ولی کامل تھے۔ کیوں نہ ہوتا کہ آپ اپنے عم مکرم حضرت احمد شاہ[1] رحمۃ اللہ علیہ کے فیض یافتہ اور ان کے خلیفۂ وحید ہونے کا شرف رکھتے تھے۔ حضرت احمد شاہ بہت بڑے عالم دین اور تصوف کے بحر بے کنار کے معتبر غواص تھے۔ ان سے کئی کرامات منسوب اور زبان زد عام ہیں۔ ہمارے نزدیک ان کی زندہ کرامت اُن کے فیض علمی و روحانی سے حضرت شیخ الٰہی بخش رحمۃ اللہ علیہ کی سیرابی اور پھر ان کی وساطت و دست گیری سے حضرت ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثل شخصیت کی ہمہ جہت رفعت وسرفرازی کافی ہے۔

---

[1] حضرت احمد شاہ ۱۰۱ سال کی عمر پاکر وصال بحق ہوئے۔ تاریخ وصال ۹ ر رجب سنہ ۱۳۳۲ھ مطابق ۵ر جولائی ۱۹۱۴ء ہے۔ مادۂ تاریخ یہ ہے:

''فروغ علم دیں قطب بنارس''

ایسی روایات بھی ملتی ہیں کہ کم عمری میں ہی انھیں حضرت احمد شاہ رحمۃ اللہ علیہ کی خصوصی توجہ اور روحانی انعامات کی نعمت حاصل رہی۔

تعلیم دین اور فیوضِ مرشد

صوفی کے لیے علم شریعت سے کما حقہٗ آگاہی اور پھر خود کو پورے طور سے اس کا پابند بنا کر اپنے عمل سے ایک کامل مومن بننا لازم ہے۔ محض دعویٰ کوئی معنی نہیں رکھتے۔ پیمانہ ہی یہ ہے کہ اللہ کا ولی وہی ہوسکتا ہے جو قرآن وسنت پر پوری طرح عمل پیرا ہو۔

آپ کا داخلہ بہ عمر چھے سال جامعہ مظہر العلوم بنارس میں ہوا۔ اولین کتب آپ نے اپنے جد امجد سے پڑھیں، پھر بحر العلوم حضرت علامہ عبدالحی فرنگی محلی کے شاگرد رشید مولانا امان اللہ اعظمی رحمۃ اللہ علیہ اور دیگر جید علما سے عربی کی کتب عالیہ کی تعلیم حاصل کی۔ فارسی کی تکمیل مولانا سید اکبر علی کی خدمت میں رہ کر کی۔ روحانی فیوض وبرکات آپ نے عارف ربانی حضرت اللہ یار[1] خاں قدس سرہ العزیز کے در اقدس سے حاصل کیں۔ شیخ کامل آپ سے حد درجہ محبت فرماتے اور قدر ومنزلت کا خاص مقام عطا کرتے۔

رشحاتِ عقیدت بدرگاہ شیخ

حضرت علامہ کوثر ندوی رحمۃ اللہ علیہ ایک قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ حمد ونعت کے بیش بہا خزانہ کے علاوہ اپنے مرشد کامل کے حضور اُن کے گل ہائے عقیدت خاصے کی چیز ہیں۔ ہم چند کلیاں چن رہے ہیں، جو مشتے نمونہ از خروارے کے مصداق، اپنی مہک سے آپ کے گلستانِ ذوق

---

[1] ”حافظ اللہ یار خاں صاحب نسبت ولی مرتاض، زاہد بے نفس اور اولیائے سلف کی مکمل تصویر تھے۔ خانوادۂ غوث اعظم کے چشم و چراغ، حافظ الحدیث، قیوم زماں حضرت سید محمد صفی عبید اللہ محدث بغدادی (متوفی ۲۳ رصفر ۱۳۴۰ھ) سے خلافت و اجازت حاصل تھی۔ ۲۹ ررجب ۱۳۵۶ھ تاریخ وصال ہے۔ مزارِ اقدس حضرت مخدوم تاج الدین رحمۃ اللہ علیہ بنارسی کی درگاہ (متصل مسجد لاٹ جلالی پورہ) کے احاطہ میں واقع ہے اور زیارت گاہِ خلائق ہے۔“ آپ کا عرس تمام تکلفات اور محذورات سے پاک ہے۔ تاریخ وصال یہ ہے۔

وصال پاک کی تاریخ سن لو　　　گئے فردوس میں مخدوم صوفی

۱۳۵۶ھ

(ماہنامہ تعلیمات جدید، بنارس۔ فروری ۱۹۹۶ء، حاشیہ ص ۳۸ و مارچ ۱۹۹۷ء، ص ۷)

کو جلا بخشنے کا سبب بن جائیں گی۔

جس دل کو جاں نواز بتوں سے گریز تھا
آخر وہ ایک شیخِ حرم کا اسیر ہے

☆☆☆☆☆

کوثر میں جو ڈھلتی رہتی ہے وہ آج پلائے جاتے ہیں
مدہوش بنانا کیا کہیے، اِک ہوش میں لائے جاتے ہیں

☆☆☆☆☆

گرچہ خردیم، نسبتے ست بزرگ
ذرۂ آفتاب تا بانیم

ندوۃ العلماء لکھنؤ میں قیام

جامعہ مظہر العلوم بنارس میں نصابِ عالمیت کی تکمیل کے بعد علمی تشنگی آپ کو دار العلوم ندوۃ العلماء کھینچ لے گئی۔ وہاں آپ کو امام العلوم علامہ سید سلیمان ندوی، محدث جلیل علامہ حیدر حسن خاں، امامِ عربیت علامہ تقی الدین[1] الہلالی مراکشی، مبصر معقول ومنقول علامہ حفیظ اللہ صاحب (پرنسپل ندوۃ العلماء)، فقیہ عصر علامہ شبلی فقیہ، اور فلسفی دہر علامہ عبد الودود رحمھم اللہ جیسے اساطینِ علم و فن کی علمی صحبتیں میسر ہوئیں۔ آپ کی طبعِ اخاذ نے ان اکابر علما کے علوم وفنون کے چشمۂ رواں کو اپنے سینہ میں جذب کر لیا، حتیٰ کہ آپ خود علوم وفنون کے بحرِ زخار بن گئے۔ آپ نے ان علمائے عظام سے تفسیر، اصولِ تفسیر، حدیث، اصولِ حدیث، تاریخ حدیث، فقہ، اصولِ فقہ، تاریخِ فقہ، علم کلام وعقائد، علم اسرار شریعت، علم اخلاق وفلسفۂ اخلاق، علم منطق وفلسفہ، علم مناظرہ، علم تاریخ و اصول تاریخ وفلسفۂ تاریخ، علم ہیئت، علم ادب، علم تنقید شعر واصول شعر وشاعری اور علوم بلاغت وغیرہ کی تحصیل کی۔ نیز عربی، اردو، فارسی میں تقریر وتحریر کی مہارت حاصل کی۔

ندوہ کے تعلیمی دور میں سید ابو الحسن علی ندوی (مہتمم ندوۃ العلماء)، مولانا مسعود عالم ندوی،

---

[1] علامہ الہلالی کے عربی مضامین کے اردو تراجم پاکستان میں بعض رسائل وجرائد مثلاً ہفت روزہ 'ایشیا' وغیرہ میں بھی ڈاکٹر شیخ تقی الدین مراکشی کے نام سے شائع ہوتے رہے ہیں۔ (دیکھیے: فاروقی، شفیق الاسلام۔ 'عظمت کے مینار'، ص ۹۵، مشمولہ: کیا آپ نے قرآن عربی میں پڑھا ہے؟ حرا پبلی کیشنز، لاہور۔ اشاعت دوم، ۱۹۹۸ء)۔ (ظہور الدین)

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی (سابق ناظم دارالمصنفین و مدیر ماہنامہ معارف، اعظم گڈھ)، مولانا ابواللیث اصلاحی ندوی (سابق امیر جماعتِ اسلامی ہند)، مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی ازہری (سابق مہتمم ندوۃ العلماء و بانی دارالعلوم تاج المدارس، بھوپال)، رئیس احمد جعفری ندوی وغیرہ آپ کے خاص رفقا میں تھے۔ شاعری میں مولانا محمد عمران خاں ندوی کو آپ سے تلمذ بھی حاصل تھا۔

مولانا کو اپنے مادر علمی ندوۃ العلماء سے تعلق پر بہت فخر تھا۔ انہوں نے اس عظیم درس گاہ سے کسب فیض ہی نہیں کیا، اس کے ساتھ وابستہ یادوں کو بڑی چاہت اور عقیدت سے بیان بھی کرتے رہے ہیں۔ ادارہ سے ملحق مسجد کے سنگ بنیاد کی تقریب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

> ۲۴/اپریل ۱۹۳۳ء یوم جمعہ کو مسجد دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سنگ بنیاد رکھنے کے لیے عالی جناب نواب حافظ سر احمد سعید صاحب خان بہادر کے، سی، ایس، آئی، اے، سی، آئی، ایم، بی، گورنر صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ کو مدعو کیا گیا تھا۔ حسب دستور سپاس نامہ پیش کیا گیا اور فارسی قصیدہ پیش کرنے کی ضرورت بھی سمجھی گئی۔ اس کے لیے ناچیز کا انتخاب ہوا۔ ناچیز نے ایک مختصر قصیدہ پیش کیا جو بہت پسند کیا گیا۔ اس کے چند اشعار ذیل میں درج ہیں۔

بہار عید آمد ہمچوں رعنائے غزل خوانے
چمن زیبے، گل آرائے، گل اندامے، گل افشانے
زہے روزے زہے وقتے زہے صبحے زہے شامے
زمیں یک سر گلستانے، جہاں یک سر خیابانے
شبانے نوبہاراں بیں بہار حسن پنہاں بیں
بہر صحرا خیابانے، بہر دشتے گلستانے

مولانا عزیز الحق کوثر ندوی نے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی علمی فضاؤں میں زندگی کے بیش قیمت سات (۷) سال گزارے اور ۱۹۳۳ء میں چوبیس (۲۴) سال کی عمر میں سندِ فضیلت حاصل کی۔ محدثِ جلیل حضرت علامہ حیدر حسن خاں (خلیفۂ مجاز حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ) نے اپنی خصوصی سند حدیث عطا کی جو وہ اپنے کسی محبوب ترین شاگرد ہی کو دیا کرتے تھے۔ روایتِ کتبِ حدیث کی یہ سند کوثر ندوی صاحب کے منتخب مجموعۂ احادیث "معالم السنۃ" میں شائع ہو چکی ہے۔

تدریسی دور

فراغت کے بعد مولانا محمد یوسف عباسی صدر مدرس مدرسہ مطلع العلوم بنارس کی خواہش پر آپ نے ان کے مدرسہ میں بلا تنخواہ واجرت خالصتاً للہ سات مہینے اعزازی طور پر خدمتِ تدریس کی۔

آپ کے تبحرِ علمی سے متاثر ہو کر امام شہر بنارس حضرت مولانا خلیل الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ ناظم جامعہ مظہر العلوم نے اپنے جامعہ میں درس دینے کی پیش کش کی۔ آپ نے حضرت مولانا موصوف کی پیش کش کو شرفِ قبولیت عطا کرتے ہوئے ۱۹۳۵ء میں جامعہ مظہر العلوم کی مسند تدریس کو زینت بخشی۔ اس وقت صدر الشریعہ حضرت مولانا امجد علی صاحب مصنف بہارِ شریعت بھی جامعہ مظہر العلوم کو اپنی علمی صلاحیتوں سے فیض یاب کر رہے تھے۔ علامہ کوثر ندوی جامعہ مظہر العلوم میں پہلے شیخ الادب ہوئے پھر ۱۹۴۷ء میں صدر المدرسین کے منصب پر فائز ہوئے۔ آپ کے عہدِ صدارت میں جامعہ کو بڑی ترقی حاصل ہوئی۔

آپ کے درس کی شہرت جامعہ کی فضاؤں سے نکل کر بڑے بڑے دار العلوم تک پہنچ چکی تھی اور ہر طرف سے طلبہ کھنچ کر جامعہ مظہر العلوم کی جانب آنے لگے۔ آپ کے تربیت یافتگاں نے بڑا نام پایا ان میں مولانا ابو العرفان خاں ندوی (سابق مدرس دار العلوم ندوۃ العلماء)، پروفیسر مشیر الحق[1] بحری آبادی مرحوم (سابق وائس چانسلر کشمیر یونی ورسٹی)، مولانا عبد التواب

---

[1] افسوس کہ پروفیسر مشیر الحق مرحوم مغفور ۱۱/ اپریل ۱۹۹۰ء/ رمضان المبارک ....ھ میں مظلومیت اور بے کسی کے عالم میں دہشت گرد اغوا کاروں کے ہاتھوں قتل ہو گئے، جنہوں نے پہلے انھیں اس لیے یرغمال بنائے رکھا کہ وہ حکومت کشمیر سے اپنے کچھ مطالبات منوانا چاہتے تھے۔ ایک قیمتی جان کو بچانے کے لیے جس ذمہ داری کی ضرورت تھی اس کو خاطر خواہ پورا نہیں کیا گیا۔ حکومت کا رویہ بھی بعض حلقوں میں مستحسن نہیں سمجھا گیا۔ بقول مولانا مجیب اللہ ندوی، اس وقت کشمیر میں جو حالات پیدا ہو گئے ہیں وہ ایک دن میں نہیں بل کہ یہ ہندوستان کی چالیس سالہ (اور اب ۶۷ سالہ) حکومت کی مکر و فریب کی پالیسی کا نتیجہ ہے، جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ظلم و جبر کی پالیسی سے کشمیر کے مسئلہ کو حل کر لیں گے وہ تاریخ کو الٹے سمت لے جانا چاہ رہے ہیں..... آسام اور پنجاب جو غیر متنازعہ ہندوستان کا حصہ ہے وہاں سات برس سے خون بہ رہا ہے اور علاحدگی پسندگی کا پرچار ہو رہا ہے وہاں وہ پالیسی نہیں اپنائی جا رہی ہے جو کشمیر میں اختیار کی گئی ہے، جبکہ وہ متنازعہ مسئلہ ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکومت کا طرزِ عمل دوسری اقلیتوں کے ساتھ اور ہے اور مسلمانوں کے ساتھ اور ہے۔ غرض کہ کشمیر میں مسلسل سیاسی بے چینی بڑھتی

(باقی بر صفحہ آئندہ)

بنگالی، مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی (بانی و ناظم جامعۃ الرشاد اعظم گڑھ)، مولانا قدیر اختر ندوی (پروفیسر شعبۂ اسلامک اسٹڈیز، ہمدرد یونی ورسٹی کراچی)، مولانا حافظ ثناء اللہ سراجی مرحوم (خلیفۂ مجاز علامہ کوثر ندوی)، مولانا کریم الدین اکرم سراجی (ناظم مرکزی بیت المال وصدر دبستان انگلش اسکول)، مولانا عبدالرشید سراجی (سابق ناظم جامعہ عربیہ ضیاء العلوم)، مفتی عبدالسلام نعمانی (امام شاہی مسجد گیان واپی)، مولانا ابوالمحمود محمد مظہری (پرنسپل و مفتی جامعہ حمیدیہ رضویہ بنارس)، مولانا عبدالحلیم قریشی سراجی مرحوم (سابق پرنسپل جامعہ مدینۃ العلم بھدوہی)، مولانا عبدالقیوم بنارسی مرحوم (سابق ناظم اعلیٰ جامعہ مظہر العلوم بنارس)، مولانا عبدالغنی (پرنسپل جامعہ مظہر العلوم) کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا محمد عمر قادری سراجی (مفتی وصدر مدرس جامعہ عربیہ ضیاء العلوم) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ یہ تمام حضرات مختلف المشرب ہونے کے باوجود اپنے اپنے فن میں شہرت و کمال کی بلندی پر پہنچے۔

آپ جامعہ مظہر العلوم کو سترہ (۱۷) سال اپنے علمی فیضان سے مستفیض کر کے ۱۹۵۲ء میں مستعفی ہو گئے۔ اکابر ندوہ کی خواہش تھی کہ آپ اس مرکز علمی میں تشریف لائیں اور اس کے نونہالوں کو اپنے بادۂ علمی سے سیراب کریں، لیکن آپ محسوس کرتے تھے کہ ندوہ سے زیادہ شہر بنارس کو میری ضرورت ہے۔[1]

جامعہ عربیہ ضیاء العلوم کا قیام

آپ کا ایک بہت بڑا کارنامہ جامعہ عربیہ ضیاء العلوم کا قیام ہے اگر چہ شہر بنارس میں متعدد اسلامی مدارس موجود تھے مگر شدید ضرورت تھی ایسی درس گاہ کی جس کے فارغ التحصیل دینی علوم کے ساتھ عصری تقاضوں سے بھی آشنا ہوں۔ بقول ڈاکٹر اقبال: ''جہاں طلبہ کی فطری صلاحیتوں کا گلا نہ گھونٹا جائے بل کہ ان میں بالیدگی، پاکیزگی اور جلا پیدا کی جائے۔'' اسی نظریہ کے پیشِ نظر

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

جا رہی ہے، کشمیریوں کے ایک طبقہ کا عرصہ سے یہ احساس ہے کہ:

آج وہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہل نظر کہتے تھے ایران صغیر

(ماہنامہ 'الرشاد' اور 'معارف'، اعظم گڑھ، بھارت۔ اپریل ۱۹۹۰ء)

[1] ماہنامہ تعلیمات جدید، بنارس۔ فروری ۱۹۹۶ء، صفحات ۳۰-۳۱

علامہ کوثر ندوی نے ۱۱ر جولائی ۱۹۵۵ء کو علمی درس گاہ جامعہ عربیہ ضیاء العلوم کی بنیاد ڈالی۔

قیامِ ضیاء العلوم[1] کے اول یوم ہی سے آپ کا یہ مطمحِ نظر تھا کہ یہ جامعہ گورنمنٹ کی امداد اور ایڈ کے بغیر ترقیات کی راہیں طے کرے اور مسلمانوں کے حلال اور طیب و طاہر رزق سے اس نخلِ علم کی آبیاری کی جائے۔ اس سلسلہ میں آپ کو ہزارہا پریشانیوں سے گزرنا پڑا، زہرہ گداز مراحل سے نبردآزما ہونا پڑا، خارزاروں کو طے کرنا پڑا اور سینۂ کوہ سے جوئے شیر نکالنے کی سعیِ بلیغ کرنی پڑی لیکن کسی بھی پرخطر اور مہیب طوفان میں آپ کا سفینۂ عزم لنگر انداز نہیں ہوا، بل کہ ہر مصیبت آپ کے سامنے امنگوں، حوصلوں اور جوشِ عمل کی نئی راہیں کھول دیتی تھی۔ گورنمنٹ کے تعاون کے بغیر کوئی مدرسہ چلانا بڑا مشکل کام ہے لیکن آپ کی عالی نظری، عمیق نگاہی، اور مجتہدانہ فکر و بصیرت نے اسلامی مدارس کی آمدنی کا بہترین حل تلاش کیا اور آپ نے رسالہ ''اسلامی مدارس کا مالی نظام'' تحریر فرما کر ہندوستان اور پاکستان کے کتنے ہی مدارس کے تنِ مردہ میں زندگی کی نئی روح پھونک دی۔ مختلف مکاتبِ فکر کے اکابر علما نے اس رسالہ کے مندرجات کی تائید کی۔ حافظ ملت مولانا عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ صاحب (بانی الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور) نے اس فاضلانہ تصنیف کے لیے حضرت علامہ ندوی قدس سرہ کو مبارک باد پیش کی اور حضرت اقدس کی خدمت میں توصیفی مکتوب ارسال کیا۔

یہ گراں قدر رسالہ ہندوستان اور پاکستان سے شائع ہو چکا ہے۔

قیامِ ضیاء العلوم کے بعد آپ ہی نے پہلا سبق پڑھایا اور مسلسل ۱۹۸۵ء تک بلا تنخواہ جامعہ کے درجاتِ عالیہ کے طلبہ کو امہاتِ کتب کا درس دیتے رہے اور خالصتاً للہ طالبانِ علم کو فیض یاب فرماتے رہے۔ اگر چہ یہ زمانہ آپ کے لیے اقتصادی لحاظ سے انتہائی کس مپرسی کا زمانہ تھا مگر خدمتِ دین کا جو ایمانی جذبہ اور فروغِ علم کا جو اسلامی ذوق آپ کی رگ رگ میں لہو بن کر رواں دواں تھا اس نے ہر کارِ خیر کی جزا رازقِ حقیقی کے ذمۂ کرم پر ڈال دی۔

---

[1] ''ضیاء العلوم کا قیام آپ کا اتنا عظیم کارنامہ اور آپ کی فعال شخصیت کی اتنی درخشاں نشانی ہے کہ حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ (محدث اعظم ہند) نے ضیاء العلوم کے پہلے سالانہ جلسہ میں کہا تھا کہ اس مدرسہ کا نام تو ''کوثر العلوم'' ہونا چاہیے اگر مجھ سے نام رکھنے کو کہا جاتا تو میں یہی نام رکھتا۔ درحقیقت محدث صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہمارے حضرت کو جانتے تھے اور ہمارے حضرت، محدث صاحب کو پہچانتے تھے۔'' (محمد عمر قادری سراجی، مفتی۔ مضمون بعنوان 'میرے آقا میرے مرشد'، ماہنامہ تعلیمات جدید، بنارس۔ فروری ۱۹۹۷ء، ص ۱۸)



جامعہ عربیہ ضیاء العلوم، بنارس

جامعہ ضیاء العلوم کے لیے آپ نے ایسا جامع نصاب تعلیم بھی مرتب کیا جو قلیل مدت میں طلبہ کے اندر ٹھوس علمی استعداد بھی پیدا کرتا ہے اور انھیں عصر حاضر کے تقاضوں سے آشنا کر کے اسلامی ڈھانچے میں ڈھالنے کی صلاحیت بھی ودیعت کرتا ہے۔

مولانا عزیز یعقوب ندوی سراجی لکھتے ہیں:

''جامعہ عربیہ ضیاء العلوم کی ۴۷ سالہ زندگی میں بنارس اور اطراف و اکناف کے ہزاروں تشنگان علم آپ کی جوئے خوشاب سے سیراب ہوئے۔ آپ کی آغوشِ علم کے پروردہ طلبہ پورے ہندوستان میں علم و تعلیم، درس و تدریس، ارشاد و تلقین اور دعوت و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ آپ کے شاگردوں میں بہترین انشا پرداز بھی ہیں، فصیح و بلیغ خطبا بھی، باصلاحیت معلم بھی ہیں، دین دار مربی بھی، مخلص خادمینِ دین بھی ہیں، تجربہ کار منتظم بھی، اچھے تاجر اور بزنس مین بھی۔ آپ کے شاگردوں کی فہرست طویل ہے، جو اپنے اپنے نہج سے علم دین کی خدمت انجام دے رہے اور چراغ سے چراغ جلتے چلے جا رہے ہیں۔''

تصنیفی کارنامے

حضرت علامہ کا شمار دورِ حاضر کے ممتاز علما و مشائخ میں تھا۔ انھوں نے ایسی یادگاریں چھوڑی ہیں جو ارباب فکر و نظر کو ہمیشہ اپنی طرف متوجہ کرتی رہیں گی۔ جو لوگ لکھنے پڑھنے کا سلجھا ہوا ذوق رکھتے ہیں وہ حضرت علامہ کی مطبوعہ و غیر مطبوعہ تصانیف سے صرف نظر نہیں کر سکتے۔ ۲۳ مختلف علوم و فنون پر اسی (۸۰) سے زائد کتابیں علامہ موصوف نے تصنیف فرمائی ہیں۔ بقول ڈاکٹر نجم الدین اعظمی اتنا بڑا ذخیرۂ علمی کوئی معمولی علم و صلاحیت کا انسان اکٹھا نہیں کر سکتا۔

آپ کے مختلف النوع علمی و عملی کارناموں اور آثار میں سب سے گراں مایہ اور عظیم کارنامہ ان کی تفسیر ''جواہر البیان فی تفسیر القرآن'' ہے۔ حدیث میں ''معلم السنہ'' آپ کی محدثانہ عظمت کی گواہ ہے۔ سیرت و سوانح پر آپ کی وقیع، محققانہ اور بے نظیر شہرۂ آفاق تصنیف ''مناقب اہلِ بیت'' آپ کے تبحر علمی اور قوتِ استدلال کو خراج تحسین پیش کرتی ہے۔ فقہ میں آپ کی محققانہ تالیف ''اصول فقہ'' آپ کی بالغ نظری، زبردست قوت استنباط اور اعلیٰ درجہ کی فقہی بصیرت اور ذہانت و ذکاوت کی غماز ہے۔

حضرت علامہ ایک عظیم مفکر اور فلسفی بھی تھے ان کی فکری کاوش ''معیار حکمت'' اربابِ دانش سے بارہا خراج تحسین حاصل کر چکی۔ اس کتاب کو سراہنے والوں میں ابوالکلام آزاد، سید ابوالاعلیٰ مودودی، پروفیسر عزیز الرحمٰن ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، علامہ شبیر احمد خاں غوری جیسے بلند پایہ ماہرین معقول ومنقول ہیں۔ یہ سارے حضرات اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ:

''مولانا نے منطق کے جملہ مباحث کو نئے قالب میں ڈھال کر اس فن میں ادب اور افسانے کی رعنائی پیدا کر دی ہے۔''

یہ کتاب الہ آباد بورڈ کے نصاب میں درجہ عالم کے لیے منظور شدہ ہے۔

وسعتِ مطالعہ

علامہ کوثر ندوی کا مطالعہ وسیع، فکر عمیق اور علم بے کنار تھا۔ آپ کی وسعت مطالعہ کا یہ حال تھا کہ گویا اسلامی کتب کی لائبریری ذہن میں محفوظ ہے۔ آپ ایک بار الجامعۃ الاشرفیہ مبارک پور تشریف لے گئے۔ حضرت مولانا سید محمد کچھوچھوی رحمۃ اللہ علیہ (محدث اعظم ہند) کے صاحبزادے مولانا سید محمد مدنی میاں کو جامعہ اشرفیہ کا کتب خانہ دکھانے کی ذمہ داری سپرد ہوئی۔ خود مولانا مدنی میاں کا بیان ہے کہ ''میں نے یکے بعد دیگرے لائبریری کی اکثر منتخب کتابیں نکال کر حضرت کے سامنے پیش کر دیں۔ حضرت نے انھیں دیکھ کر فرمایا: ''میں ان ساری کتابوں کا مطالعہ کر چکا ہوں۔'' میں حضرت کی وسعت مطالعہ پر حیران اور ششدر، باقی اہم اور منتخب کتابیں نکال کر پیش کرتا رہا اور یہی جواب ملتا رہا۔ بالآخر ایک ایسی کتاب ملی جس کے بارہ میں حضرت نے فرمایا: ''میں نے یہ کتاب نہیں پڑھی ہے۔'' مولانا مدنی میاں فرماتے ہیں کہ: ''اس کتاب نے اس دن کتب خانۂ اشرفیہ کی لاج رکھ لی۔''

قوت حافظہ

رحمتِ الٰہی نے آپ کو زبردست قوت حافظہ سے بھی نوازا تھا۔ قرآن حکیم کی بہ کثرت آیتیں اور ہزاروں حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ امہات کتب کے بہت سے متون لفظ بہ لفظ ازبر تھے اور صفحہ نمبر بھی ذہن میں محفوظ تھا۔ پھر بھی احتیاط کا یہ عالم تھا کہ حوالہ کے وقت ہمیشہ اصل مآخذ دیکھ لیا کرتے تھے۔ آپ کی تصانیف اور مضامین میں مختلف فنون کی تقریباً تین سو اہم کتابوں کے

حوالے ملتے ہیں۔

سخن وری

علامہ کوثر صاحب نے اگر ایک طرف اپنی تصانیف و تالیفات کے ذریعہ اردو ادب میں گراں قدر اضافہ کیا ہے تو اپنے گوہر پاروں سے شعر و سخن کا دامن بھی بھر دیا ہے۔ مثنوی صحیفۂ زندگی، ساغر کوثر، احکام، چند منتخب حدیثیں، صرف منظوم، نحو[1] منظوم وغیرہ آپ کی شعری تصانیف ہیں۔ مثنوی صحیفۂ زندگی زندگانی گزارنے کا نہایت بیش قیمت لائحۂ عمل ہے۔ پہلے حمد و نعت سے ذیل اشعار ملاحظہ ہوں جس میں علامہ کوثر صاحب نے اپنے عجز و درماندگی کا اظہار و اقرار بڑے حسین و جمیل اسلوب اور بہت ایجاز و اختصار کے ساتھ کیا ہے، اور بقول مولانا ریاض احمد قادری سراجی بنارسی، اردو ادب میں شاید ہی کوئی اس کی مثال ہو۔

حمد تیری اور محدودِ رقم　　　اے خدا سجدے میں ہے اب تک قلم
ایک انساں اور نعتِ شاہ دیں　　　میں بشر ہوں، بلبلِ سدرہ نہیں

ذیل کے اشعار میں حسن بیان اور سلاست و روانی دیکھیے:

یہ چمکتا چاند، روشن آفتاب　　　یہ ستارے، ان کا حسنِ بے حجاب
ساری دنیا، سب جمادات و نبات　　　ساری مخلوقات، ساری کائنات
سب ہیں تیرے واسطے، تیرے لیے　　　اور تو خلاقِ عالم کے لیے
منصبِ آدم ہے نظمِ کائنات　　　منصب آدم ہے تعمیر حیات
اس کو سمجھے گی فرشتوں کی جبیں　　　جانتا ہے سجدۂ روح الامیں

'ساغر کوثر' سے بھی ایک نعت بہ عنوان شان رسالت سے ملاحظہ ہوں اشعار ذیل:

سرکار ہیں وہ حسنِ نبوت لیے ہوئے　　　ہر ہر ادا سے شانِ رسالت لیے ہوئے
عاشق کا دل ہے شوقِ زیارت لیے ہوئے　　　کعبہ ہے اپنی گود میں جنت لیے ہوئے

---

[1] ''علم نحو و صرف میں آپ کے منظوم کارنامے...... آپ کی صرفی و نحوی عظمت کے شاہد ہیں۔ فن نعت گوئی اور مثنوی نگاری میں آپ کی شستہ اور شگفتہ تخلیق ''ساغر کوثر'' اور ''صحیفۂ زندگی'' آپ کی شاعرانہ قادر الکلامی کا ثبوت ہیں۔ موخر الذکر کتاب اعلیٰ حیات انسانی کا صحیفہ ہے۔'' (ندوی سراجی، عزیز یعقوب، مولانا۔ مضمون بعنوان ''وہ بے مثال حیف کہ اِمسال اٹھ گیا۔'' مشمولہ: ماہنامہ تعلیمات جدید۔ بابت جون ۱۹۹۷ء، ص ۳۴ اور ۳۵)

جنت کا جن کو شوق ہے آنکھوں سے دیکھ لیں
طیبہ کا ذرّہ ذرّہ ہے جنت لیے ہوئے

پیہم پڑھیں درود دیارِ حبیب میں
فیضِ درودِ پاک کی نسبت لیے ہوئے

جب لطفِ زندگی ہے کہ دنیا سے جائیے
محبوبِ کبریا کی محبت لیے ہوئے

حضرت علامہ کوثر ندوی کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ آپ کی جولانیِ فکر، اور زود گوئی کا یہ عالم تھا گویا نوک قلم سے اشعار کی بارش ہو رہی ہے، فارسی و عربی میں بھی برابر ملکہ حاصل تھا۔ نیز بدیہہ گوئی میں آپ اپنی مثال تھے۔

بدیہہ گوئی

مصر کے مشہور عالم، مورّخ اور ادیب علامہ عبدالعزیز ثعلبی عربی زبان میں عالمی تاریخ مرتب کر رہے تھے۔ اس سلسلہ میں بھارت بھی تشریف لائے۔ بنارس میں ان کا قیام مولانا عبدالمجید حریری سلفی (سابق سفیر ہند برائے سعودی عرب) کے دولت کدہ پر تھا۔ ایک دن علامہ ثعلبی نے علمائے بنارس سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ بنارس میں اس وقت بھی ہر مسلک کے علما موجود تھے۔ خود مولانا حریری کے ہم مسلک سلفی عالم سے بھی یہ شہر خالی نہیں تھا لیکن ان کی نگاہِ مردم شناس نے ایک سنی حنفی عالم دین کا انتخاب کیا وہ ذاتِ گرامی تھی حضور سراج العارفین کی۔ مولانا حریری کی دعوت پر آپ ان کے دولت کدہ پر تشریف لے گئے۔ علامہ ثعلبی سے ملاقات ہوئی اور اسلامیات وادبیات کے مختلف گوشوں پر علمی مبادلۂ خیالات ہوا۔ اثنائے گفت گو علامہ ندوی نے علامہ ثعلبی سے پوچھا: مَنْ اشعر کم؟ (آپ کے یہاں سب سے بڑا شاعر کون ہے؟) علامہ ثعلبی نے کہا: "الحافظ وَالشوقی۔" اور ان دونوں کے کچھ چیدہ اور منتخب اشعار سنائے۔ اب علامہ ثعلبی نے علامۂ ندوی سے یہی سوال کیا۔ آپ نے ڈاکٹر اقبال کا نام لیا۔ علامہ ثعلبی نے اقبال کے کچھ اشعار سنانے کی فرمائش کی۔ علامہ ندوی نے ڈاکٹر اقبال مرحوم کا یہ فارسی قطعہ پڑھا:

چوں ذوق نغمہ ام در جلوت آرد
قیامت افگنم در محفلِ خویش

چوں می خواہم دمے خلوت بگیرم
جہاں را گم کنم اندر دل خویش

فارسی اشعار سن کر علامہ ثعلبی نے کہا: " لا اعلم الفارسیہ۔ (میں فارسی نہیں جانتا)

علامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے فوراً فارسی کے اس قطعہ کا ترجمہ عربی کے دو اشعار میں کیا اور فرمایا:

اِذَا اِنِّی نَشِطّت اِلٰی غناءٍ......
رَنَنْتُ الْبُوْقَ فِی طَلَلٍ وَّوَادِ

وَلٰکِنّیْ اِذَا مَا شِئْتُ صَمْتًا   فَاَخْفَیْتُ الْعَوَالِمَ فِی فُؤَادِیْ

اشعار سن کر علامہ ثعلبی پھڑک اٹھے اور کہا: ''انّ شاعر کم لعظیم، انّ شاعر کم لعظیم'' یعنی آپ کا شاعر واقعی بہت عظیم ہے۔

ہمہ جہت مقبولیت

اگر چہ آپ سے مسلمانوں کے ہر مکتبِ فکر کے علما کے روابط[1] تھے۔ لیکن ان روابط کے باوجود آپ کے ایمانی استقلال کا یہ عالم تھا کہ کبھی آپ نے اپنے نظریات کا سودا نہیں کیا۔ تصوف کے ساتھ ساتھ مسلکاً بھی آپ ''باہمہ و بے ہمہ'' کے نظریہ پر عامل تھے۔ آپ کے متعلقین کی درج ذیل فہرست دیکھیے اور اندازہ لگائیے کہ آپ کی شخصیت مسلمانوں کے ہر طبقہ میں کس درجہ مقبول و محبوب تھی:

صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب مصنف بہارِ شریعت، مولانا سید ابو الحسن علی حسنی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا شاہ عز الدین پھلواروی ندوی، مولانا شاہ امان اللہ مجیبی پھلواری شریف، محدث اعظم ہند مولانا سید محمد کچھوچھوی، مولانا سید عبد الحی سجادہ نشین آستانہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی، مولانا مسعود عالم ندوی، مولانا حافظ عمران خاں ندوی ازہری،

---

[1] ہمارے دور میں ضرورت اس امر کی ہے کہ علامہ عزیز الحق کوثر ندوی ایسی شخصیات کے افکار و نظریات پر زیادہ سے زیادہ کام کیا جائے۔ جیسے حال ہی میں علی گڑھ بھارت سے ایک کتاب سیّد سلیمان اشرف: احوال و آثار شائع ہوئی ہے، اس کے مرتب سید قمر الاسلام نے ''روداد جنوں'' کے عنوان سے لکھا ہے:

> ''انیسویں اور بیسویں صدی میں جب کہ مذہبی عصبیت اور مسلکی انتہا پسندی ملّت کے وجود کو کھوکھلا کر رہی تھی۔ اس نازک دور میں سیّد سلیمان اشرف نے عملی طور پر اعتدال و توازن کی روش اختیار کی...... علی گڑھ تحریک سے ان کا والہانہ لگاؤ تھا۔ ان کے احباب کا دائرہ صرف اپنے ہم مسلک افراد تک محدود نہیں تھا بل کہ اس میں تمام مسالک اور مکاتب فکر کے علما اور دانش ور شامل تھے۔
>
> بیسویں صدی کی تاریخ مسلمانوں کے داخلی اختلافات سے پُر ہے۔ بسا اوقات یہ اختلافات کفر و ایمان تک پہنچ جاتے تھے۔ دیگر اہل علم کی مانند اُن مختلف فیہ مسائل پر سیّد سلیمان اشرف بھی اپنا موقف رکھتے تھے، لیکن ایک اہم نقطہ جو انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے وہ یہ کہ شدید اختلاف کے باوجود اپنے مخالفین کے لیے وہ غیر مہذب اور ہتک آمیز کلمات کا استعمال نہیں کرتے۔''

سید رئیس احمد جعفری ندوی، مولانا سید شاہ محمد قائم قتیل داناپوری، مولانا عبدالمصطفیٰ اعظمی، مولانا شاہ عون احمد قادری، مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی، مولانا ابو الوفا فصیحی، مولانا شاہ عزیز احمد ابو العلائی، مولانا سید شاہ صبغۃ اللہ بختیاری، مولانا پروفیسر عبدالقیوم علی گڈھ، مولانا محمد ہاشم فرنگی محل، مولانا قاری محمد یحییٰ، مولانا مشتاق احمد نظامی، مولانا خلیل احمد سیوانی (بابا خلیل داس)، مولانا حافظ ابو محمد امام الدین رام نگری، مولانا عبدالمجید حریری سلفی، مولانا خلیل الرحمٰن بنارسی، مولانا عبدالحمید مکی وغیرہ۔

حق پسندی وحق گوئی

علامہ کوثر ندوی حقیقی اہل علم کی بڑی قدر کرتے، مصنوعی اور خود ساختہ بڑوں کو منہ نہ لگاتے، علم کی توہین کسی حال میں نہ ہونے دیتے، اصحاب علم کو دولت مندوں اور امرا کی خوشامد کرتے دیکھتے تو سخت ناراضگی کا اظہار کرتے[1]، ناگوار باتوں اور غلط کاموں کو دیکھ کر چپ رہنے یا چشم پوشی

....

[1] ''حضرت علامہ کوثر ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی بلند قامت شخصیت، ان کی ہمہ جہت خوبیاں اور خصوصیات اور ان کے علم وعرفان کے نادرۂ روزگار آثار اور نمونے اس حقیقت کا جیتا جاگتا ثبوت ہیں۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ اپنے ذوق، مزاج، معیار اور طبعی افتاد کے لحاظ سے چمنستانِ علم ومعرفت، شعور وآگہی اور خلوص وللّٰہیت کے طائر زیر یام نہیں بل کہ طائر لبِ بام تھے اس خاص پہلو کی رعایت انھیں اس قدر مرغوب اور ملحوظِ خاطر تھی کہ اس میں ادنیٰ درجہ کی لچک بھی گوارا نہ تھی۔ محرر سطور (یعنی ڈاکٹر نجم الدین صاحب اعظمی، صدر شعبۂ اردو، بنارس ہندو یونی ورسٹی) کو انھوں نے از راہِ لطف وکرم متعدد بار مشورہ دیا کہ صاحبانِ دولت واقتدار کے دانتوں تلے آنے سے خود کو بچائے رکھنا۔ ایک مرتبہ دورانِ گفت گو اپنی خداداد بصیرت سے حضرت علامہ نے تاڑ لیا کہ میں ایک خاص معاملہ میں ان کے پسندیدہ اس معیار پر کھرا اترنے میں ناکام ثابت ہوا ہوں، سخت ناراض ہوئے اور فرمایا: ''مجھے تم سے ایسی امید نہ تھی۔'' میں نے معافی مانگنے میں تامل نہیں کیا، خوش ہو گئے اور کبیدہ خاطرہ کی توجیہ میں فارسی کا ایک شعر برجستہ پڑھا۔ شاعر کا نام بھی بتایا۔ شعر یاد رہ گیا۔ شاعر کا نام حافظہ میں محفوظ نہ رہ سکا۔ شعر یہ ہے:

رفتم کہ خار از پا کشم محمل نہاں شد از نظر — یک لحظہ غافل گشتم و صد سالہ راہم دور شد

ساتھ ہی علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے بھی دو اشعار سنائے جس میں فارسی کے اس شعر کے مضمون کو اپنے مخصوص انداز واسلوب میں پیش کیا تھا۔ وہ اشعار یہ ہیں:

زندگی کا کارواں ہے تیز گام — ایک پل بھی اس جگہ غفلت حرام
خارِ پا کھینچیں رکے تھے اس قدر — اب نہاں محمل ہے حیراں ہے نظر''

(باقی بر صفحہ آیندہ)

کر لینے کو پسند نہ کرتے اور صحیح بات بے جھجک برملا کہہ دیتے، مصلحت پسندی انھیں نہیں آتی تھی۔ حق گوئی وحق پرستی عمر بھر ان کا شعار رہا۔[1]

آپ کی زندگی کا مرکزی نقطۂ نظر حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی حیات طیبہ تھی۔ آپ کے تمام افکار ونظریات اسی محور کے گرد گردش کرتے تھے۔ اسی لیے آپ خود ارشاد فرماتے ہیں۔

عاشقِ جاں نثار کو اور کسی سے کیا غرض
عشق نبی سے کام ہے، یادِ نبی سے کام ہے

....

(بقیہ صفحہ گزشتہ)

(اعظمی، نجم الدین، پروفیسر ڈاکٹر۔ ''مقالہ جواہر البیان فی تفسیر القرآن۔ ایک مطالعہ''، مشمولہ: ماہنامہ تعلیمات جدید، بنارس۔ فروری ۱۹۹۷ء، ص ۱۹ و ۲۰)

[1] آج وطن عزیز میں جہالت و بے خبری کی کہر چھائی ہے۔ بے عملی ہماری فطرت ٹھہر گئی ہے۔ مسجدیں ویران اور امام بیش تر کم علم ہیں۔ تمیز حرام وحلال کی کسے پروا۔ سید محمد کچھوچھوی (محدث اعظم ہند) فرما گئے، خانقاہوں کا صحیح استعمال چلا جا رہا ہے۔ حکیم ملت حکیم محمد موسیٰ امرت سری نوحہ خواں رہے کہ بندگانِ سیم وزر کی بن آئی ہے۔ اس لیے ان لوگوں کو مسلمانوں کے اجتماعی مفاد سے بھی کوئی سروکار نہیں، اس انبوہ کے سرگردہان (خود ساختہ لیڈران اور نیم مذہبی سیاسین) اپنی اپنی انا کی خاطر اپنی اپنی ٹولی کا پھریرا اٹھائے بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ نتیجتاً سواد اعظم آج منتشر ہے، یہ ملت ٹکڑیوں میں بانٹ کر فرحاں وشاداں ہیں۔ اناللہ...... ''کشتی کسی پار ہو یا درمیاں رہے'' کے مصداق انھیں اس کی بھی کوئی پروا نہیں۔ غالباً یہ لوگ حبل اللہ، جماعت، جمیعۃ، ملّت اور اجتماعیت وغیرہ کو متروک سمجھتے ہیں۔ کس کس بات کا رونا روئیں۔

مرے درد دل کے ترانے بہت ہیں
شب وصل کم ہے فسانے بہت ہیں

کاش! ہم حبل اللہ کی ہدایت کو سمجھ پاتے، اور بہ فحوائے حدیث **ید اللہ علی الجماعۃ** کی برکات سے بہرہ ور ہوتے تو بات بن جاتی۔ **الحکمۃ ضالۃ المؤمن** حکمت مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ بقول مولانا سلیمان اشرف، اپنی چیز جہاں تمھیں مل جائے اُسے فوراً اٹھالو۔ حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کا پیغام سنیے:

اہلِ حق را زندگی از قوت است — قوتِ ہر ملت از جمعیت است
رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں — قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

مذکورہ صورت حال میں حضرت علامہ کوثر ندوی کی ذات ستودہ صفات ایک منارنور ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ علامہ موصوف کی سیر وسوانح پر شایاں شان کام کیا جائے، اور یہ بات خوش آئند ہے کہ حضرت کوثر ندوی کے احوال وآثار پر گجرات یونی ورسٹی سے ایک طالبہ ایم فل کر رہی ہیں۔

آپ کے یہ دو شعر بھی آپ کی حیات طیبہ کے محور ہیں اور آپ کی زندگی کے آئینہ دار بھی۔ بس یہی ان کی زندگی کا اصول تھا، عمر بھر اس پر وہ عمل پیرا رہے۔

مرد آہن، پاک دل، شیریں سخن اہلِ ایماں خود نواز و خود شکن
عظمت باری کے آگے خود شکن قوتِ باطل کے آگے شیر بن

آپ کی شخصیت ہر مسلک و ملت اور قوم و مذہب کے افراد کے لیے باعث کشش تھی۔ ہر ایک سے بشاشت اور گرم جوشی سے ملتے ان کا آئینہ دل بغض اور کینہ و کدورت سے پاک تھا، تعصب، تنگ نظری اور جماعتی عصبیت کو سخت ناپسند کرتے۔ آپ کے در دولت پر اگر مسلمانوں کی بھیڑ ہوتی تھی تو غیر مسلموں کا مجمع بھی۔ آپ سب کے لاینحل مسائل حل کرتے۔ یہاں ہر آنے والا سکون کی دولت سے مالا مال لوٹتا۔

ہر گروہ اور مسلک کے لوگوں سے ان کے تعلقات تھے۔ اپنے خوردوں سے بھی نہایت بے تکلفی سے ملتے اور محبت و شفقت کا برتاؤ کرتے۔ ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ان کے معمولی اور ادنیٰ کاموں کی داد دیتے، اپنے بزرگوں اور برابر کے لوگوں سے ہمیشہ عزت و اکرام کا معاملہ کرتے بڑے مہمان نواز تھے۔

مفتی محمد عمر قادری سراجی اپنے ایک مضمون میرے آقا میرے مرشد میں لکھتے ہیں:

''میرے آقا و مولا سیدی سراج العارفین حضرت علامہ عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی روحی فداہ رضی اللہ عنہ اللہ کے ان بندوں میں تھے جن کو اللہ نے صرف اپنے لیے بنایا تھا۔ پوری زندگی اللہ کے لیے وقف کردی۔ زندگی بھر اللہ ہی کا کام کرتے رہے۔

ہر کسے را بہر کارے ساختن
میل اُو اندر دلش انداختن

زندگی بھر علم دین پڑھاتے رہے، درس و تدریس کی خدمت انجام دیتے رہے، دینی کتابیں تصنیف فرماتے رہے، وعظ و تذکیر کا کام کرتے رہے اور اپنی مسیحا نفسی سے مردہ دلوں میں جان ڈالتے رہے۔ آپ اپنے مخصوص عارفانہ رنگ میں کیا خوب ارشاد فرماتے ہیں۔

مبہم سی اک آواز ہے دھڑکن ترے دل کی
ہاں اس کو بنا ذکر الٰہی کا ترانہ

مزید لکھتے ہیں:

آپ نہایت دریا دل، سخی اور فیاض تھے۔ دل کھول کر حاجت مندوں کی حاجت روائی فرماتے تھے اور تھوڑا نہیں دیتے تھے حسب استطاعت بہت دینے والے تھے۔ آپ کا شعر ہے۔

یہ ہے فطرت اولیاء اللہ کی
صاحبِ اخلاق و فیاض و سخی

آپ کے اندر کینہ نام کی کوئی چیز نہ تھی۔ ایک مرتبہ ناچیز کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''مولوی صاحب! مجھے کسی سے کینہ نہیں ہے۔ امید ہے کہ قیامت میں اللہ تعالیٰ مجھے کینہ پر نہیں پکڑے گا۔''

ناچیز کہتا ہے: ''یہ بڑی خاص بات ہے اور اللہ والوں کی خاص پہچان ہے۔ خواجہ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

آئین ماست سینہ چوں آئینہ داشتن
کفر است در طریقت ما کینہ داشتن

اس مضمون پر ہمارے مخدوم گرامی کا کلام بھی سن لیجیے اولیائے کرام کے بارے میں فرماتے ہیں۔

خیر خواہی ہی ان کا وصف خاص ہے — ان کی فطرت دین اور اخلاص ہے
یہ بڑے مخلص بڑے ہی خیر خواہ — جو بُرے ان پر بھی شفقت کی نگاہ
ان کو اپنے مثل مت سمجھو کبھی — یہ ولی سچے ولی کامل ولی
دل سخی ہے، صاف سینہ بے گناہ — اور یہ سب کے بڑے ہی خیر خواہ

جیسا کہ گزشتہ سطور میں آپ نے دیکھا کہ حضرت علاّمہ ایک سچے صوفی اور صافی کی طرح تعصب اور تنگ نظری سے کوسوں دور تھے، ان کی نگارشات اور معمولات سے بھی پتا چلتا ہے کہ انھوں نے کبھی تصادم کی راہ اختیار نہیں کی، بل کہ کلمۂ وحدت کی بنیاد پر بین المسلکی اتحاد آپ کا نصب العین تھا، اس نصب العین کو شعری قالب عطا کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں۔

مرا مسلک محبت ہے، محبت — مرا مذہب ہے سب کی خیر خواہی

یہی اجمیر کی دل کش فقیری یہی بغداد کی ہے بادشاہی[1]

قبولیت بارگاہی

خلوص وللّٰہیت اور عشق صادق کی دولتِ فراواں میسر ہوتو بارگاہِ کریمی سے عنایات و عطیات کی بارش نہال کیے رکھتی ہے۔ اس در اقدس کے گداؤں کو ان کی طلب اور تڑپ کے باٹوں کی نسبت سے نوازا جاتا ہے اور بے طرح نوازا جاتا ہے۔

ہمارے ممدوح رحمۃ اللہ علیہ ان مقبولانِ بارگاہ میں نظر آتے ہیں جن کو شرفِ زیارت سے بہ حالتِ خواب ہی نہیں عالم بیداری میں بھی سرفراز فرمایا گیا۔[2]

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

پھر یہ بھی سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کرم گستری ہی ہے کہ ''سراج العارفین'' کا

---

[1] اہل اللہ ہمیش دل و جاں سے مسلمانوں میں اتحاد و یک جہتی کے لیے کوشاں رہے اور ان کی یہ خواہش رہی کہ مسلمانوں کی جماعت میں اختلاف وافتراق نہ پیدا ہو اور ان میں ایکا رہے جو اسلام کو مطلوب ہے۔ علامہ کوثر ندوی لکھتے ہیں: حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اختلاف سے حتی الوسع اجتناب فرماتے تھے۔ کتب حدیث میں ہے۔ حضرت علی نے ایک فقہی مسئلہ بیان کیا۔ عبیدہ سلمانی نے کچھ اختلاف کیا۔ اس میں آپ نے جو فرمایا امام بخاری اسے ان الفاظ میں روایت فرماتے ہیں:

اقضوا کما کنتم تقضون فانی اکرہ الاختلاف حتی یکون الناس جماعۃ او اموت کما مات اصحابی (صحیح بخاری، مناقب علی، ج اول، ص ۵۲۶) [''مناقب اہل بیت'' صفحات ۲۲-۲۲۱]

اس مسئلہ کے بارے میں تم لوگ اپنی قرارداد پر رہو کیوں کہ میں اختلاف کو بہت بُرا سمجھتا ہوں، میری یہ روش اس لیے ہے کہ لوگ ایک جماعت بنے رہیں، یہ بات میں عمر بھر چاہتا ہوں، حتیٰ کہ میں بھی اسی طرح دنیا سے چلا جاؤں جیسے میرے ساتھی چلے گئے۔

آج وطن عزیز مختلف مسائل اور خطرات میں گھرا ہوا ہے، ایسے میں وہ عناصر جو مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پھیلانے اور افتراق پیدا کرنے کی 'خدمت' انجام دے رہے ہیں، کو خلیفۂ راشد چہارم کا مذکور بالا ارشاد حرز جاں بنانا چاہیے۔ فرقہ بندی کی خزاں نے ملت اسلامیہ کا باغ اجاڑ دیا! ہمیں اختلاف سے بچنے کی بے حد کوشش کرنی چاہیے کیوں کہ اختلاف سے امتیں اور قومیں تباہ ہوگئیں۔ (ظہورالدین)

[2] مولانا کوثر ندوی کی زندگی میں تصوف اور روحانیت کو کلیدی حیثیت حاصل تھی، 'حیاتِ کوثر' سے بھی ان کی قلبی کیفیات اور بعض رویائے صالحہ کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔ (ظہورالدین)

منفرد اور ممتاز خطاب عطا فرمایا گیا۔ اسی نسبت سے آپ کے چشمۂ فیض سے مستفیض ہونے والے ''سراجی'' کہلاتے ہیں۔

غیرت ایمانی

محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فطری تقاضا ہے کہ اس نعمت سے سرشار مومن غیرت ایمانی کا پیکر ہوتا ہے۔ صرف دو واقعات کی تلخیص مثال کے طور پر دیکھیے۔

آپ مدرسہ مظہر العلوم کے پرنسپل کے طور پر فرائض انجام دے رہے تھے کہ ''امرت بازار پتریکا'' نامی ہندو اخبار نے جناب ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان اقدس میں گستاخی کی شرم ناک جسارت کی۔ سراپا احتجاج مسلمانوں کے اجتماعات میں آپ صف اوّل میں نظر آئے اور جلوسوں کی قیادت اور جلسوں سے خطابات کے ذریعہ حکام وقت تک اہل اسلام کی موثر ترین آواز پہنچانے کے ساتھ ساتھ ہندو قوم کو برملا تنبیہ کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے غلام ناموسِ رسالت پر اپنی جانیں قربان سے ہرگز دریغ نہ کریں گے۔

کھیلیں گے آپ کیوں مرے آقا کے نام سے
حاضر ہے میری جان مری جاں سے کھیلیے [1]

دوسرا واقعہ کچھ یوں ہے کہ آزادی سے کچھ عرصہ پہلے انگریز افسران اور اعلیٰ عہدیداران ہندو اور مسلمان دونوں کے تعلیمی اداروں میں بھی آیا کرتے تھے۔ آپ کے مدرسہ مظہر العلوم میں بھی یہ افسران گاہے چکر لگا لیتے تھے۔ بالعموم تمام اداروں میں ان افسران کی خوب آؤ بھگت ہوتی اور طلبہ ہی نہیں معلمین بھی کھڑے ہو کر ان کا استقبال کرتے۔ آپ اس رسم سے سخت نالاں تھے۔

ایک دفعہ کسی بڑے انگریز افسر کی آمد آمد تھی۔ آپ نے اپنے شاگردوں سے کہا کہ نہ تو میں اس کے آنے پر کھڑا ہوں گا نہ ہی میرا کوئی متعلم اس کے لیے احتراماً کھڑا ہو۔ اگر کسی نے میری ہدایت کے برخلاف عمل کیا تو میں اُسے اپنی درس گاہ سے نکال دوں گا۔ جب وہ افسر آپ کے حلقۂ درس کے پاس پہنچا، تو آپ شاگردوں کو تعلیم دینے میں منہمک رہے اور کھڑے نہ ہوئے ، نہ ہی کوئی طالب علم تعظیم کو اٹھا۔ اُس نے دوسرے مدرسین سے پوچھا کہ ''یہ پادری کیوں کھڑا نہیں

---

[1] لاریب انھوں نے اظہار امر حق میں وہی کیا جو ایک بے باک عالم اور درویش کو کرنا چاہیے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ كَانُوْا يَتَّقُوْن کا مظہر تھے۔ (ظہور الدین)

ہوا؟'' انھوں نے بتایا کہ آپ ترجمہ قرآن پڑھا رہے تھے۔ اس پر اس انگریز افسر نے حضرت کی تحسین کی۔[1]

وصال مبارک

بہت سے برگزیدہ اولیا اللہ کی مانند آپ نہ صرف یہ کہ اپنی وفات کا اکثر تذکرہ فرماتے، بل کہ بعض نمایاں اشارے بھی فرماتے رہے۔ کئی دفعہ فرمایا: ''میری پیدائش رمضان کی ہے ان شاء اللہ وفات بھی رمضان میں ہوگی''، یہ خبر متوسلین میں اس قدر مشہور تھی کہ وفات سے ایک سال پہلے رمضان میں علیل ہوئے تو لوگ متفکر ہوئے کہ کہیں یہ رمضان ہی تو مرشد کامل سے جدائی کا تو نہیں ہے۔ پھر یہ بھی فرماتے تھے کہ میرا وصال جمعرات کے دن ہوگا۔

بابری مسجد کی شہادت کا سانحہ ۶ /دسمبر ۱۹۹۲ء کو رونما ہوا۔ آپ اس صدمہ سے بے چین اور مضطرب تو تھے ہی، روز بہ روز بیمار اور کم زور رہنے لگے۔ پھر یہی مرض، مرض وصال ٹھہرا اور بالآخر ۱۸ /مارچ ۱۹۹۳ء مطابق ۲۳ /رمضان المبارک ۱۴۱۳ھ یہ آفتاب صداقت غروب ہو گیا۔ بنارس کی مردم خیز دھرتی پر پیدا ہونے والا یہ محبوب کبریا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محبوب غلام بنارس ہی میں آسودہ خاک ہوا۔

تاریخی رباعی

بہ سانحۂ ارتحال حضرت علامہ کوثر ندوی رحمۃ اللہ علیہ

از ڈاکٹر سید محمد طلحہ رضوی برق۔ ڈی لٹ ☆

رفتند بسی ز دہر اکثر ندوی
در عشق نبی بود مؤثر ندوی
منسوب بہ جنت شد از اعلیٰ منزل
۲۳۸
علامہ عزیز الحق کوثر ندوی
۲۳۸ + ۱۱۷۵ = ۱۴۱۳ھ

[1] حق گوئی و بے باکی پر وہ خود بھی عامل تھے، دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ فقر و استغنا کی زندہ تصویر تھے۔ ایسے ہی راہنماؤں کی پیروی ہم پر لازم ہے۔ (ظہور الدین)

☆ صدر شعبہ اردو و فارسی، ویر کنور سنگھ یونی ورسٹی، آرہ



خانقاہِ عالیہ سراجیہ، جلالی پورہ، بنارس

قطعہ از نور الہدیٰ نور

اک پھول ہے جو کھل کر ہر سو مہک رہا ہے
یا علم و آگہی کا سورج چمک رہا ہے
اے نور زیر تربت سویا ہے کون آ کر
رحمت وہ برسی پیہم، کوثر چھلک رہا ہے

۱۹۹۳ء

مختار جاوید منہاس

۱۱۹۔ جے، علامہ اقبال روڈ، لاہور
Mob: 0300-4596234

مولانا کی وفاتِ حسرت آیات پر
اُن کے ایک شاگرد رشید
کے تأثرات

مولانا کوثر ندوی کے انتقال سے بزم علم وعرفان میں جوایک بڑا خلا پیدا ہوا ہے وہ آسانی سے پُر نہ ہو سکے گا۔ ان کا حادثہ وفات نہ صرف ان کے تلامذہ اور متوسلین کے لیے ایک دل گداز سانحہ ہے بل کہ یہ کہنا صحیح ہوگا ہماری بزم علم وفن ایک شمع فروزاں سے محروم ہوگئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ ۱۹۳۵ء میں راقم الحروف (یعنی مولانا مجیب اللہ ندوی)[1] نے حفظ کے بعد جس وقت مدرسہ مظہر العلوم میں داخلہ لیا تو وہاں نصف درجن ممتاز اساتذہ تعلیم وتربیت کے فرائض انجام دے رہے تھے جن میں مولانا محمد عمر صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا کوثر ندوی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد مکی صاحب رحمۃ اللہ علیہ، مولانا محمد سعید صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور فارسی کے استاذ مولانا اکبر علی صاحب مرحوم خاص طور پر قابل ذکر تھے۔ مگر ان سب میں سب سے زیادہ مقبول مولانا کوثر ندوی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔ ہم لوگ ابھی عربی درجہ سوم کے طالب علم تھے کہ وہ حافظ کی کفایۃ المتحفظ زبانی یاد کرنے کی ترغیب دیا کرتے تھے اور اس کا جائزہ بھی لیا کرتے تھے اور ابھی دوسرے درجہ میں تھے کہ علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتابوں کا تعارف ہم لوگوں سے کرادیا۔ اسی زمانہ میں موزانہ انیس ودبیر کے

---

[1] مولانا مجیب اللہ ندوی (متوفی: ۱۲رمئی ۲۰۰۶ء)، بانی جامعۃ الرشاد، اعظم گڈھ، بھارت۔

مطالعہ اور خطبات مدراس کے کئی خطبوں کے حفظ کر لینے کی سعادت ملی۔ بحمد اللہ راقم الحروف کو بھی ان سے تلمذ کی سعادت حاصل تھی۔ شیخ تقی الدین ہلالی رحمۃ اللہ علیہ کا دور ندوہ کا دورِ زریں شمار ہوتا ہے۔ مولانا عبدالرحمٰن کاشغری مرحوم، مولانا مسعود عالم ندوی مرحوم، مولانا ابواللیث ندوی مرحوم، مولانا ناظم صاحب ندوی مدظلہ اور مولانا سید ابوالحسن ندوی مدظلہ اور مولانا کوثر ندوی مرحوم اسی دورِ زریں کی یادگار ہیں۔ مولانا نے بنارس کے گوشہ سے باہر قدم نہیں نکالا اس لیے ان کو وہ شہرت نہ مل سکی جو ان کے ہم عصروں کو ملی۔ مگر اپنے گہرے علم اور مطالعہ کی وسعت کے اعتبار سے وہ اپنے ہم عصروں میں ممتاز حیثیت کے مالک تھے۔ وہ کسی فن کی کتاب کیوں نہ پڑھاتے اس میں پورا اعتماد جھلکتا تھا۔ درس میں ایسا محسوس ہوتا کہ کتاب کا مصنف ہی درس دے رہا ہے۔ ان کے درس کی تقریر حشو و زوائد سے پاک اور ماقل ودل ہوتی تھی۔ مولانا کئی درجن علمی کتابوں کے مصنف بھی تھے، افسوس ہے کہ اس حیثیت سے ان کا تعارف بنارس سے باہر بہت کم ہو سکا۔

دارالمصنفین کے زمانہ قیام میں ایک بار وہ وہاں تشریف لائے۔ حضرت سید صاحب (علامہ سید سلیمان ندوی) تو ان کو پہچانتے تھے مگر دوسرے حضرات سے جب میں نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ یہ میرے استاذ محترم ہیں تو بعد میں از راہِ تواضع مجھ سے کہنے لگے کہ تم صرف اتنا ہی کہہ دیا کرو کہ فلاں صاحب ہیں استاذ وغیرہ نہ کہو۔ میں نے عرض کیا کہ یہ تو میرے لیے فخر کی بات ہے اس کا ذکر نہ کرنا میری ناسعادتی ہوگی۔ یہ ان کے بلندیِ فکر کی بات تھی۔

اللہ تعالیٰ ان کی نیکیوں کے بدلے ان کو جنت الفردوس میں مقام عطا کرے اور پس ماندگان کو صبر جمیل عطا کرے، آمین۔ رمضان المبارک کی پُرسعادت موت اِن شاء اللہ ان کے بلندیِ درجات کا سبب ثابت ہوگی۔

(ماہنامہ الرشاد، اعظم گڈھ، اپریل ۱۹۹۳ء)

ارمغانِ عقیدت

بحضور سراج العارفین حضرت علامہ عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی قدس سرہٗ

نتیجۂ فکر: مولانا نصیر احمد نصیر سراجی قادری

اے مرے شیخِ جلیل، اے مرے عالم پناہ — مسجدِ دل کے امام، ملکِ عقیدت کے شاہ
آپ کے زیرِ نگیں مملکتِ علم و فن — آپ کے در کی کنیز سلطنتِ عزّ و جاہ
آپ کی اِک اِک ادا پرتوِ خلقِ رسول — عشق خرد آفریں، فقر امارت پناہ
آپ کی موجِ قلم ابرِ بہار آفریں — آپ کا نطقِ زباں روشنیٔ درس گاہ
منقبتِ اہلِ بیت جامۂ باطن فروز — عشقِ امام الرسل آپ کے سر کی کلاہ
آپ کی لوحِ جبیں نقشِ سجودِ خلوص — آپ کی تنویرِ دل جلوۂ عشقِ الٰہ
آپ کا حرفِ بیاں شعلۂ طاغوت سوز — مشعلِ ایماں فروز آپ کا فیضِ نگاہ
کلکِ گہربار کے گوہرِ افکار تاب — علم کے گردوں کے ہیں نور فشاں مہر و ماہ
آپ کو بخشی گئی وہ نگہِ معرفت — عالمِ چرخِ کبود جس کی ہے طیران گاہ
آپ کا جذبِ دروں تاب و تبِ زندگی — آپ کا سوزِ نفس نورِ دلِ خانقاہ
آپ ہیں حق کے عزیز، آپ نبی کے حبیب — کرتی رہی تربیت آپ کی علوی نگاہ
جادۂ عرفاں کے ہیں آپ وہ روشن چراغ — کاہکشاں بن گئی آپ سے عرفاں کی راہ
آپ کے دربار میں اہلِ سخن ہیں نگوں — آپ کے پیشِ قدم خم ہے ادب کی کلاہ
بزمِ احبا ہو یا رزم گہِ خیر و شر — آپ کے لب پر رہا زمزمۂ لا الٰہ
چلتے رہے بے خطر جانبِ کوئے حبیب — گرد رواں کی طرح اڑتے رہے سنگِ راہ
لشکرِ اشرار کو کیسے نہ ہوتی شکست — آپ کے ہم راہ تھی صبر و رضا کی سپاہ
سیّدی و قائدی مرشدی و والدی — مجھ پہ بھی کرتے رہیے لطف و کرم کی نگاہ

اَنتَ سِرَاجُ الهُدىٰ وَابنُكَ لَيلُ الدُّجىٰ
نَادِعُ اِلٰهَ الوَرىٰ لِابنِكَ يَا سَيِّدَاهُ

تأثراتِ علمائے کرام

آپ کی نئی تالیف ''مناقب اہل بیت'' مجھے مل گئی۔ خوب اور خوب تر ہے۔ بعض حصے تو بالکل نئے ہیں، مثلاً قسطنطنیہ کی جنگ کی تاریخ اور پہلی جنگ میں یزید کی عدمِ شرکت اور اسی قسم کی بعض دوسری اور باتیں۔ اس تالیف کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ بے ساختہ یہ شعر یاد آ گیا ہے۔

فَصَاغَ مَا صَاغَ مِن تِبْرٍ وَّمِنْ ذَهَبٍ
وَحَاكَ مَا حَاكَ مِن وَّشْيٍ وَّ دِيبَاجٍ

اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے اور امتِ مسلمہ کے لیے ہدایت کا ذریعہ بنائے۔

محمد عز الدین قادری ندوی

....

فضیلت مآب حضرت گرامی عزیز العلما مولانا الحاج عزیز الحق صاحب کوثر ندوی زید مجدہم محبتِ اہل بیت رضوان اللہ علیہم اجمعین کے معاملہ میں ایک مشہور و معروف مصنف کی حیثیت سے کافی شہرت کے مالک ہیں۔ ان کی گراں قدر تصنیف ''مناقب اہل بیت'' اس خصوص میں ایک شہ کار کی حیثیت رکھتی ہے۔ میں نے خود اس کا معتدبہ حصہ پڑھا ہے، ماشاء اللہ وہ میرے نزدیک اعلیٰ درجہ کے محبِ اہل بیت ہیں۔

عبد المصطفیٰ الاعظمی عفی عنہ

....

ہمارے محترم ومخلص بزرگ حضرت الحاج مولانا عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی زاد اللہ اکرامہٗ تمام اہلِ سنت کی طرف سے قابل مبارک باد ہیں کہ ''مناقب اہل بیت'' لکھ کر مسلمانوں کو گمراہی سے بچالیا اور بہت سی غلط فہمیوں کو دور فرمایا۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اہلِ بیتِ رسول کی محبت اور کل صحابہ کی عظمت مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کوثر کو اجر جزیل عطا فرمائے اور ان کو زمرۂ محبین اہل بیت میں محشور فرمائے۔ آمین

محمد امان اللہ قادری پھلواروی

....

بحر العلوم حضرت مولانا عزیز الحق صاحب کوثر ندوی بناری زید مجدہٗ کی لاجواب کتاب ''مناقبِ اہل بیت'' سے یہ فقیر بھی مستفیض ہوا۔ اس کتاب کی تعریف مجھ سے علماء ومشائخ پھلواری شریف نے بھی کی تھی، خصوصاً حضرت اعظم العلما مولانا سید شاہ عز الدین صاحب پھلواروی وبعض بزرگان ومشائخ عظیم آباد نے۔ وہ کون بدنصیب ہے جو ''مناقب اہلِ بیت'' کی قدر وتعریف نہ کرے گا۔

غلامِ غلامان آل محمد، قتیل داناپوری غفرلہٗ

....

''مناقب اہلِ بیت'' مصنفہ مکرمی مولانا کوثر صاحب ندوی کا میں نے مطالعہ کیا۔ یہ کتاب مسلکِ اہلِ سنت کے مطابق ہے۔ اہل سنت کا مسلک ہی صحابہ کرام اور اہل بیت اطہار کی منقبت وثنا گوئی ہے، جس سے یہ کتاب مزین ہے۔ مجموعی طور پر یہ کتاب صحیح عقیدہ کی حامل ہے۔

عاجز، عون احمد قادری

....

مناقبِ اہلِ بیت

حضرت علامہ عزیز الحق کوثرؔ ندوی قادری نظامیؒ
(م ۱۹۹۳ء)

کوثر اکیڈمی
J. 31/78 مولانا کوثرؔ ندوی روڈ، پچی باغ، بنارس

نام کتاب

مناقبِ اہلِ بیت

مصنف

علامہ عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی
(م ۱۹۹۳ء)

صفحات: ۶۲۸ قیمت: -/۲۵۰

طبع سوم: مارچ ۲۰۰۶ء

باھتمام

نصیر احمد سراجی

ناشر

کوثر اکیڈمی J. 31/78 مولانا کوثر ندوی روڈ، کچی باغ، بنارس

KAUSAR ACADEMY

J. 31/78, Maulana Kausar Nadvi Road, Kachchi Bagh, Varanasi

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع ثانی

اللہ تعالیٰ نے مناقب اہل بیت کو جو مقبولیت عطا فرمائی اس پر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے عقیدت مندانِ اہل بیت نے اس کو بڑے شوق سے خریدا، بڑی عقیدت سے پڑھا، بڑی قدر دستائش کی کتاب کی مانگ ایسی ہوئی کہ قلیل عرصہ میں اڈیشن ختم ہوگیا اور مانگ اب تک جاری ہے۔

مناقب اہل بیت میں جو مضامین بیان کئے گئے ہیں۔ ان پر آیات قرآن مجید یا احادیث مقدسہ، یا آثار صحابہ کرام یا ائمۂ دین و مستند و مسلّم علماء کے اقوال پیش کئے گئے ہیں اور جن کتابوں سے ان کو اخذ کیا گیا ہے، ان کے صفحات کے نمبر بھی لکھ دیئے گئے ہیں جن کی بنا پر یہ کتاب بڑی مدلّل اور مستند مانی گئی ہے، لیکن یہ بات عجائب میں ہے کہ کچھ لوگ جو اس گرامی قدر کتاب کی بڑھتی ہوئی عظمت کو دیکھ نہ سکے، انہوں نے اس کی قدر و منزلت کو گرانے کیلئے یک طرفہ کارروائی کے ذریعہ اسے یو پی گورنمنٹ سے ضبط کرایا۔ مولف نے ہائی کورٹ میں رجوع کیا۔ اللہ کا شکر ہے کہ تین فاضل ججوں کی فل بنچ نے مبصرانہ تحقیق کر کے کتاب کی ضبطی کے حکم کو منسوخ کر دیا۔ اور کتاب بحال ہوگئی مخالف نے اس برحق فیصلہ کے خلاف سپریم کورٹ میں اپیل داخل کی لیکن یہاں سے بھی فیصلہ مذکور بحال رہا۔ فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

اللہ تعالیٰ کے اس فضل و کرم نے اس کتاب کی قدر و منزلت اور بڑھا دی اور سب پر واضح ہوگیا کہ یہ کتاب جس طرح نہایت عالمانہ اور محققانہ ہے اسی طرح نہایت سنجیدہ اور صاف ستھری بھی ہے۔ اس سے کتاب کی شہرت و عظمت اور بڑھ گئی، اور اس کی مانگ اور زیادہ ہوگئی۔

اے ربِّ کارساز یہ تیری چارہ سازی، تیرا فضل و کرم اور تیری بے پایاں بندہ نوازی ہے

زبانِ شکر یہ کلمات قبول فرمائے "اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ عَدَدَ خَلْقِہٖ وَرِضَا نَفْسِہٖ وَزِنَۃَ عَرْشِہٖ وَ مِدَادَ کَلِمَاتِہٖ" اے دعاؤں کے سننے والے مناقب اہلِ بیت کی مقبولیت و محبوبیت اور بڑھادے اور اس کو مؤلف کے لئے ذریعۂ نجات بنادے۔ اور اس کے قدر دانوں کو حبِّ اہل بیت کے ثمرات عطا فرما۔ آمین یارب العالمین

امیدوارِ رحمت

عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی

۳ ذی الحجہ ۱۴۰۱ھ مطابق ۲ اکتوبر ۱۹۸۰ء یوم جمعہ مبارک

مناقب اہل بیتؑ

حدیث کا اعلان ہے کہ

اہل بیت قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن اہل بیت کے ساتھ،

اس لئے

ان کی پوری زندگی قرآن کے سانچے میں ڈھلی ہے

اور قرآنی تعلیمات کا نمونہ ہے،

قرآنی اخلاق وصالحات کے نقوش ومعالم کو انسانی قالب میں دیکھنا ہو تو رسولؐ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اقدس کے ساتھ ان قدسی صفات بزرگوں کے فضائل اور ان کی سیر کی کتابیں بھی بکثرت پڑھئے جن میں اعلیٰ صفات اور بہترین کردار کے

انوار سمٹ آئے ہیں

شاید قلوب ان انوار کو جذب کرلیں اور شاید ان کے افق سے صبحِ نو نمودار ہوسکے۔

عزیز الحق کوثر ندوی

فہرست مضامین

یہ ایک مختصر فہرست ہے کہ ہر عنوان کی فہرست بڑی طویل ہو جاتی ہے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین ۝ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ
سیدنا محمد وآلہ واصحابہ واتباعہ اجمعین

پیش لفظ

اسلام عالمگیر مذہب ہے جو تمام عالم کو خدا پرستی، پاکبازی، اعتدال روی اور حسن کردار کی تعلیم دینے کے ساتھ اعلیٰ درجہ کی ایمانی، روحانی، اخلاقی اور دینی تربیت بھی کرتا ہے۔ رسول اعظم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کے بے شمار اعلیٰ صفات میں ایک نمایاں صفت تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ اور دوسری نمایاں صفت نفوس کا تزکیہ اور ایمانی تربیت ہے۔

آپ ہی کی تعلیم کتاب وحکمت ہے۔ جس نے بے شمار نفوس کو اللہ کا صحیح عرفان بخشا بتایا کہ انسان اور خدا میں کیا رابطہ ہے۔ اللہ کی صحیح اور کامل عبادت کا کیا طریقہ ہے اور سمجھایا کہ کائنات کی خلقت میں انسان ہی کی تخلیق مقصد اعلیٰ ہے؛ اجرام سماوی اور کائنات ارضی کا نظام حرکت وعمل انسان ہی کی تخلیق، تعمیر اور تحسین کے محور پر گردش کر رہا ہے اور ہدایت فرمائی کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے تو اس پر بہت بڑی ذمہ داری بھی ہے۔ اس کی انفرادی زندگی ہو یا اجتماعی، معاشی ہو یا معادی، تمدنی ہو یا تجریدی، سیاسی ہو یا اجتنابی اپنی جگہ ایک جواب دہ زندگی ہے کہ وہ کہیں بھی مطلق العنان نہیں، بلکہ اللہ کی حدود حکمی پر اس سے سخت باز پرس ہوگی جس کے لئے ایک دن مقرر ہے اس روز وہ اللہ کی عدالت میں حاضر ہونے پر مجبور ہوگا۔ وہی ہے ہمہ گیر جزا وسزا کا دن، اچھوں کو نیکی کی جزا، مجرموں کو بدی

کی سزا۔

جس کی زندگی خداترس اور پاکباز ہے، اس کے لئے ابدی شادمانی ہے۔ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ۝!

اور جس کی زندگی اللہ کی عدول حکمیوں میں کٹی ہے اس کے لئے عذاب الیم ہے فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ۝ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ۝

رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس طرح کتاب و حکمت کی تعلیم دیکر جہالت کی تمام تاریکیاں مٹادیں اسی طرح قلوب و نفوس کا تزکیہ اور ایمانی و اخلاقی تربیت فرماکر بیحد خداترس پاکباز اور انسانیت نواز انسان تیار کر دیئے، جن کی زندگی یہ ہے کہ اللہ کے ڈر اور محاسبہ کے خوف سے لرزاں ان کا ایمانی شعور بہت ہی بیدار، باطن عشق الٰہی سے لبریز اور سراپا سوز و گداز، ان کی روحوں پر اللہ کے شہود و حضور کا تسلط، ذکر دوام ان کا مشغلہ، ہر معاملے میں وہ بڑے امین اور دیانتدار، ان کے ہر کام میں خلوص اور رضائے الٰہی کی طلب، سب کے خیر خواہ، خلیق، شفیق، مہربان، اللہ کے بڑے ہی جاں نثار قیام حق کیلئے سراپا عمل اس کے لئے اپنی جان قربان کرنے کے لئے کمربستہ، انسان کو طاغوت کے پنجے سے نجات دینے کے لئے سراپا جہاد، سربکف اور کفن بردوش۔

جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایسی اعلیٰ اور بے نظیر تربیت پائی ہے وہ ہیں خلفائے راشدین، اہل بیت اطہار، سابقین، اولین اور سراپا رشد و ہدیٰ، صحابہ اخیار رضوان اللہ علیہم اجمعین۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت اطہار کو آغوش عاطفت میں پال کر اور صحابہ اخیار کو ظل شفقت میں لے کر ایسی بے نظیر تربیت فرمائی ہے کہ دنیا نے انبیاء علیہم السلام کے بعد ایسے برگزیدہ نفوس کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔

- حضرت ابوبکر جیسا پیکر صدق و صفا اور قامع ارتداد۔
- حضرت عمر جیسا فاروق حق و باطل، اور نظام اسلامی کا منتظم۔

- حضرت عثمان جیسا مجسم حیا اور اپنے ذاتی معاملہ میں نرمی پسند اور تشدد سے دور۔
- حضرت علی جیسا منبع حکمت و ولایت اور اسلامی ریاست کا محافظ۔
- امام حسن جیسا حلم و صبر کا تاجدار اور امت کا سردار۔
- امام حسین جیسا قیوم حق اور (مسلمانوں پر) طاغوت کے تسلط کے خلاف کلمۂ حق کا نقیب اکبر اور مجاہد اعظم۔

یہ کتنی بلند بے نظیر اور قدوسی ہستیاں ہیں؟ اور مربی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیرت انگیز ایمانی و اسلامی تربیت کے کتنے بہترین نتائج اور اعلیٰ مظاہر ہیں؟

یہ مقدس نفوس دو مستقل سلسلوں کی برگزیدہ ہستیاں ہیں:۔

ایک سلسلہ کا نام ہے: اہل بیت اطہار،

دوسرے کا نام ہے: صحابۂ اخیار،

اہل بیت سے ہماری مراد ہیں حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن، امام حسین علیہم السلام یہ اہل بیت اطہار بھی ہیں اور صحابۂ اخیار[۱] بھی آیت تطہیر کے نزول کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نورانی کملی میں حضور کے ساتھ یہی چاروں مقدس نفوس تھے۔ حضور کو لے کر یہ پانچ مقدس ہستیاں ہیں یہی حضرات پنجتن پاک ہیں، ان پر اللہ کا لاکھوں سلام

---

[۱] سننے میں آیا ہے کہ بعض لوگ کتاب "خلافت معاویہ ویزید" کے حوالے سے یہ کہتے ہیں کہ "حسین محدثین کے نزدیک صحابی بھی نہیں" ــــ معاذاللہ ایسی بدتمیزی کی بات بھلا کون دیندار کہہ سکتا ہے۔؟ معاملہ تو یہاں تک ہے کہ جب کسی مجہول نے یہ کہہ دیا کہ "صحابیت کے لئے بحال بلوغ رسول کی ملاقات شرط ہے" تو محدثین نے بڑے سخت لہجے میں اس کی تردید کی اور اس قول کو مردود کہا، تاکہ کوئی شخص اس کو بنیاد بنا کر امام حسن اور امام حسین کو صحابیت کی سطح سے گرانے کی گستاخی نہ کرے۔ علامہ امام عینی عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۷، ص ۲۸۵ میں لکھتے ہیں: ومنہم من اشترط فی ذالک ان یکون حین اجتماعہ بالغاً، وھو مردود، لأنہ یخرج مثل الحسن بن علی رضی اللہ عنہما ونحوہ من احداث الصحابۃ ۔ ۱۲ کوثر

صحابۂ اخیار کی فہرست بہت طویل ہے ان میں سابقین اولین کو قرآن و حدیث نے امتیازی شرف بخشا ہے کہ اس مجد و شرف کے تاجدار یہی ہیں، اللہ ان سے راضی اور یہ اللہ سے راضی

○

اہل بیت اطہار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ گناہوں سے پاک اور مطہر ہیں۔ قرآن مجید کا اعلان ہے :-

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ	اے اہل بیت اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ
الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ	تم لوگوں سے (گناہوں کی) گندگی کو دور رکھے
تَطْهِيْرًا ۝ (احزاب پ۲۲ ع ۱)	اور تم کو خوب ہی پاک اور مطہر بنا دے۔

قلب درون ذہن وضمیر، فکر و تصور، اور کردار و عمل کی پاکیزگی ان کی فطرت ہے۔ یہی مفہوم ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اس ارشاد کا جو آپ نے اولاد فاطمہ زہرا کے بارے میں فرمایا ہے۔

خُلِقُوْا مِنْ طِيْنَتِيْ ۔	یہ لوگ میری طینت سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور اسی بنا پر "ثقلین" صرف قرآن مجید اور اہل بیت اطہار ہیں جن سے پوری طرح وابستہ ہو جانے کے بعد گمراہ ہونے کا امکان ہی نہیں جیسا کہ حدیث ثقلین میں ہے۔ آگے حدیث ثقلین پر مفصل بحث انشاء اللہ آتی ہے۔

○

صحابۂ اخیار میں ایک سے ایک ہیں، ان میں جو حضرات سابقین اولین ہیں ان کا جوہری وصف یہ ہے کہ ان کو ایک طویل زمانہ تک آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے تربیت حاصل کرنے کے مواقع ملے ہیں جن کی بنا پر یہ اور صحابہ سے بہت زیادہ آگے ہیں۔ مربی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ اصحابہٖ وسلم کی طویل صحبت سے مستفیض ہونا اور طویل زمانہ تک آپ سے تربیت حاصل کرنا اتنی بڑی دولت ہے کہ جن لوگوں کو یہ حاصل ہو گئی ان کا راہ حق میں دو ایک رطل خرچ کر دینا دیگر

صحابہ کے اُحد پہاڑ کے برابر سونا خرچ کر دینے سے بڑھ کر ہے۔

صحیح مسلم جلد ۲ صفحہ ۳۱۰ میں ہے:۔

کان بین خالد بن الولید وبین	خالد بن ولید اور عبدالرحمٰن بن عوف کے درمیان
عبد الرحمٰن بن عوف شئ	کچھ بات ہوگئی تھی اس پر خالد نے عبدالرحمٰن
فسبّہ خالد فقال رسول اللہ	کو گالی دیدی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ
صلی اللہ علیہ وسلم لاتسبوا	وسلم نے فرمایا میرے[1] کسی صحابی کو گالی نہ دینا
احدا من اصحابی فان احدکم	کیوں کہ تم لوگوں میں سے کوئی شخص اُحد
لو انفق مثل اُحد ذھبا	پہاڑ کے برابر بھی سونا خیرات کرے تو یہ میرے
ماادرک مد احدھم ولا	کسی صحابی کے ایک مد[2] یا آدھے مد خیرات
نصیفہ۔	کے درجہ تک نہیں پہونچ سکتی۔

یوں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اقدس میں چند لمحات کی حاضری بھی بڑی بافیض نعمت ہے لیکن آپ کی تمام ایمانی و دینی تعلیمات سے پوری طرح مستفیض ہونے کے لئے طویل مدت تک حضور سے تربیت حاصل کرنے کی ضرورت ہے جس کے بغیر ناممکن ہے کہ

---

[1] حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے مقابل قدیم الاسلام ہیں اور ان کو طویل زمانہ تک حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دینی و ایمانی تربیت حاصل کرنے کے مواقع ملے ہیں اور طویل زمانہ تک فیض یاب صحبت رہ چکے ہیں۔ اسی لئے حضور نے حضرت خالد کے مقابل ان کو صحابی فرمایا ہے بعد میں حضرت خالد کو بھی طویل زمانہ تک فیض یاب صحبت ہونے کا شرف حاصل ہوگیا۔ پھر یقیناً یہ بھی صحابی ہیں گو سابقین اولین کی اس صف میں نہیں جس میں حضرات عشرہ مبشرہ، حضرت عمار، حضرت مقداد، حضرت ابن مسعود وغیرہ ہیں۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء۔ ۱۲ کوثر

[2] یہ ایک پیمانہ ہے جو اہل حجاز کے نزدیک ۱⅓ رطل ہے اور اہل عراق کے نزدیک دو رطل۔ (یعنی تقریباً دو پونڈ)

کوئی شخص اسلام کی تمام تعلیمات اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تمام اسوۂ حسنہ کو پوری طرح اپنے اندر جذب کر سکے، جن صحابۂ کرام نے ایک طویل مدت تک حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمانی اور دینی تربیت حاصل کی ہے وہ پیکر رشد و ہدیٰ بن گئے، کیوں کہ انہوں نے سالہا سال ـــ ہادی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایۂ عاطفت میں اس طرح زندگی بسر کی ہے کہ اپنے کو پوری طرح آپ کے ہاتھوں میں دیدیا۔ اور آپ نے ان کی انانیت کو بارہا زیر و زبر فرمایا۔ تبلیغ اسلام کی راہ میں جو جو مصائب اور جان کے جو جو خطرے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پیش آتے تھے۔ آپ کے رفقاءِ کار کو بھی پیش آتے رہے، لیکن وہ اپنی جگہ جمے رہے۔ فاقے پر فاقے کیے، تیروں اور تلواروں کے زخم کھائے۔ سب کچھ ہوا مگر یہ اپنی جگہ سے نہ ہلے اور اسلام کو سینے سے لگائے رکھا۔ ہر حالت میں بے نفسی اور تقویٰ ان کا شعار رہا۔

جاہلیت عرب کے اثرات جو تمام عرب کے رگ و ریشہ میں پیوست ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک ایک کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طویل صحبت اور طویل دینی وایمانی تربیت نے ان کے وجود سے چن چن کر نکال پھینکا تھا۔ اور ان کی جگہ اسلامی محاسن رکھ دیئے تھے۔

جاہلی عرب کی مطلق العنانی، سرکشی، آزادروی، خودغرضی، جاہ پرستی، اقتدار طلبی، شدید نفسانیت، جبار انانیت، بے محابا فسق و فجور، حق دشمنی، قبائلی اور خاندانی عصبیت، خونخوار مشتعل مزاجی، مظلوم آزاری، طاقت ملنے پر انتہائی ظلم و ستم اور طغیان و عدوان، جو صدیوں سے قبائل عرب کی فطرت بن چکے تھے ان سب کو یک لخت چھوڑ دینا آسان نہیں اور قدرت کا قانون بھی یہی ہے کہ جو مذموم صفات صدیوں سے کسی قوم میں راسخ ہو چکے ہیں، اور روزانہ کے معمول بن چکے ہیں وہ طویل زمانہ کی مسلسل تعلیم و تربیت کے بعد ہی دور ہو سکتے ہیں۔

سابقین اولین اور دیگر طویل الصحبۃ اصحاب کرام کی کتنی بڑی سعادت ہے کہ انھوں نے ایک طویل زمانہ تک مربی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایمانی دینی اور اخلاقی تربیت حاصل

کی جس نے یہ تمام جاہلی عیوب اور مذموم صفات انکے نفوس کی گہرائیوں سے نکال پھینکے اور ان کی جگہ ایمانی محاسن اور دینی محامد رکھ کر جما دیئے۔ اب یہ ایسے ہو گئے کہ خود ان کے مربی نے ان کو اپنا صحابی فرمایا۔ گذر چکا ہے کہ حضرت خالد نے جب ایسے ہی ایک بزرگ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو گالی دی تھی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی خفگی کے عالم میں فرمایا تھا:

"(خالد! تم لوگ) میرے کسی صحابی کو گالی نہ دینا! کیوں کہ تم لوگوں میں سے کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر بھی سونا خیرات کر دے جب بھی یہ خیرات میرے کسی صحابی کے ایک مُد یا آدھے مُد خیرات کے برابر نہیں ہو سکتی۔" (صحیح مسلم ج ۲ ص ۳۱۰)

یوں تو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ بھی فیضیاب صحبت ہیں مگر حضور نے انھیں بزرگوں کو صحابی فرمایا ہے جنھوں نے طویل زمانہ تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ اور پوری خود سپردگی کے ساتھ آپ کی تربیت سے مستفیض ہو کر پیکر رشد وہدیٰ بن گئے ہیں[1]۔ یہی ہیں نجوم ہدایت، امام بغوی، و محدث رزین کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:۔

اصحابی کالنجوم بایھم	میرے صحابہ تاروں کے مثل ہیں ان میں
اقتدیتم اھتدیتم	سے جسکی بھی اقتدا کروگے ہدایت پر رہوگے

گو اس حدیث پر محدثین نے سخت تنقید کی ہے اور در حقیقت اس کی سند ضعیف ہے، لیکن مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفۃ الاخیار فی احیاء سنۃ سید الابرار صفحہ ۸ میں اس کے متعلق صاحب صواقع کا جو بیان درج فرمایا ہے اور کوئی تردید نہیں کی ہے وہ اتنا صحیح اور متوازن ہے کہ ہر معقولیت پسند اور منصف مزاج اسے قبول کرے گا۔ صاحب صواقع فرماتے ہیں:۔

ورواہ البیھقی باسانید	اس حدیث کو بیہقی نے نوع بنوع کی

---

[1] بعد میں حضرت خالد کو بھی طویل صحبت و تربیت کا شرف حاصل ہوا۔ پھر یہ بھی صحابی ہیں۔ ۱۲ کوثر

متنوعة يرتقي بها درجة الحسن فالحديث حسن والمراد بالاصحاب من لازمه من المهاجرين والانصار وغيرهم غدوة و عشيا وصحبه في السفر والحضر وتلقى الوحي منه واخذ عنه الشريعة والاحكام وآداب الاسلام وعرف الناسخ و المنسوخ كالخلفاء الراشدين لا كل من رآه ـ

سندوں سے روایت کیا ہے جس کی بنا پر یہ حدیث (ضعیف حدیث کے درجے سے) بلند ہو کر حسن حدیث کے درجہ پر آگئی۔ لہٰذا یہ حسن حدیث ہے ضعیف نہیں اور صحابہ رضی کو حضور نے تاروں کے مثل فرمایا ہے ان سے مراد وہ مہاجرین اور انصار وغیرہ ہیں جو برابر صبح و شام آپ کے ساتھ رہا کئے۔ سفر اور حضر میں آپکی صحبت میں رہے۔ وحی الٰہی (براہ راست) آپ سے حاصل کی آپ ہی سے شریعت احکام دین اور آداب اسلام کو اخذ کیا اور ناسخ و منسوخ کو بھی پوری طرح جان لیا جیسے خلفائے راشدین۔ یہ بات نہیں ہے کہ جس نے بھی آپ کو دیکھ لیا وہ صحابی ہے[1]

---

[1] صاحب صواعق کی یہ بات محدثین کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے مگر اس کی تائید میں صحیح مسلم کی وہ حدیث ہے جس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کے مقابل حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کو صحابی فرمایا ہے، کیوں کہ حضرت عبدالرحمٰن طویل الصحبت ہیں۔ اور حضرت خالد اس وقت طویل الصحبت نہ تھے۔ نیز علمائے اصول فقہ وہی کہتے ہیں جو صاحب صواعق نے کہا ہے۔ امام عبدالعزیز بخاری جو بہت بڑے حنفی امام اور نہایت دقیق النظر محقق ہیں محض دو واسطوں سے صاحب ہدایہ کے شاگرد ہیں۔ ان کی دو کتابیں کشف الاسرار اور التحقیق اتنی بلند پایہ اور محققانہ ہیں کہ مولانا عبدالحیٔ فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ الفوائد البہیہ صفحہ ۸۰ میں لکھتے ہیں۔

علیهما اعتماد اکثر المتاخرین

اکثر متاخرین کا سہارا انھیں دو کتابوں پر ہے

یہ امام عبدالعزیز بخاری التحقیق صفحہ ۱۶۶ میں رقمطراز ہیں۔

- لفظ صحابی کی تشریح میں علما کا اختلاف ہے عام محدثین اور بعض اصحاب شافعی کا قول ہے کہ:۔

"جس نے ایک لحظہ بھی نبی علیہ السلام کی صحبت پائی وہ صحابی ہے، کیوں کہ لفظ صحابی

"یہ مقدس صحابۂ کرام جن کے صفات آپ نے صاحب صواعق کی زبان سے سُنے اور جن کی بنا پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو "اصحابی" فرمایا ہے، ان کی شان ہمارے فہم وادراک سے بالاتر ہے۔ اور یہ بہت ہی عظمت واحترام کے مستحق ہیں۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل بیت اطہار کو آغوش عاطفت میں پال کر اور صحابۂ اخیار کو ظل عاطفت میں لے کر ایسی بے نظیر تربیت فرمائی ہے کہ دنیا نے ایسے برگزیدہ نفوس کبھی دیکھے ہی نہ تھے۔

صحبت سے بنا ہے اور صحبت کے دائرہ میں کثیر صحبت اور قلیل صحبت دونوں ہیں"

لیکن جمہور علمائے اصول کا قول ہے کہ:-

لفظ صحابی اس شخص کا لقب ہے جو طویل زمانہ تک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں آپ کے نقش قدم پر چلنے کے نہج سے اور آپ سے (دینی تعلیم وتربیت) اخذ کرنے کے نہج سے رہا ہو کیوں کہ اگر کوئی شخص کسی عالم کی صحبت میں ایک ساعت بیٹھے تو یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ اس کے اصحاب میں ہے (اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے طویل صحبت نہیں پائی علمائے اصول کے نزدیک وہ صحابہ نہیں)۔

اسی طرح جو شخص کسی عالم کی طویل صحبت میں تو رہا مگر اس کی پیروی کرنے اور اس سے اخذ کرنے کے نہج پر نہیں رہا۔ اس کو بھی اس کے اصحاب میں نہیں کہا جائے گا۔ (اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے طویل زمانہ تک آپ کے نقش قدم پر چل کر آپ سے دینی تعلیم وتربیت حاصل نہیں کی وہ علمائے اصول کے نزدیک صحابی نہیں)

سطور بالا امام عبد العزیز کے بیان کا ماحصل ہیں۔ موصوف کا متن کلام یہ ہے:-

اختلفوا فی تفسیر الصحابی؟ فذهبت عامة اصحاب الحدیث وبعض اصحاب الشافعی الی ان من صحب النبی علیه السلام لحظة فهو صحابی لان اللفظ ماخوذ من الصحبة وهی تعم القلیل والکثیر، وذهب جمهور الاصولیین الی انه اسم لمن اختص بالنبی علیه السلام وطالت صحبته معه علی طریق التبع له والاخذ عنه وهذا لا یوصف من جالس عالما ساعة من الصحابه وکذا اذا طال المجالسة معه اذا لم یکن علی طریق التبع له والاخذ عنه۔

یہ اہل بیت اطہار اور صحابۂ اخیار انسانیت کے شہ کار ہیں اور انبیا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے بعد انسانی آبادیوں کے سب سے بڑے دینی پیشوا اور مقتدا یہی ہیں۔

اہل بیت اطہار بہ نص قرآنی گناہوں سے پاک و مطہر ہیں اور اس بنا پر ان کا یہ درجہ ہے کہ جو شخص قرآن مجید سے اور ان قدسیوں سے وابستہ رہے گا وہ گمراہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اور صحابۂ اخیار جو طویل زمانہ تک صحبت نبوی اور تربیت مصطفوی کی بدولت پاکیزہ صفات ہو چکے ہیں ان کا مقام یہ ہے کہ ہدایت کے ستارے ہیں اگر شب ظلمت میں چلنا پڑے تو ان تاروں کی درخشانی اور ضیا بیزی سے فائدہ اُٹھانا ضروری اور ناگزیر ہے۔

جب یہ بات ہے کہ بلا طویل زمانہ تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہے کوئی شخص صحابی نہیں، تو آخر صحابی ہونے کے لئے کتنی مدت تک حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت ضروری ہے؟

اتنی مدت تک کی صحبت ضروری ہے جتنے عرصہ میں وہ شخص آپ کا صحبت یافتہ کہے جانے کا حق دار ہو جائے یعنی جتنے زمانہ میں اس کی زندگی بالکل یا تقریباً اسلام کے سانچے میں ڈھل جائے اس حقیقت کو مسلک حنفی کے ایک بلند پایہ مفسر محدث فقیہہ، علامہ ابن امیر الحاج حلبی شرح تحریر میں جو اصول فقہ کی نہایت محققانہ کتاب ہے لفظ صحابی کی تشریح کے سلسلہ میں بیان فرماتے ہیں:

وعند جمهور الاصوليين من طالت صحبته متبعًا له مدة يثبت معها اطلاق صاحب فلان بلا تحديد	اور جمہور علمائے اصول کے نزدیک صحابی وہ شخص ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اتنی طویل مدت تک رہا جس مدت تک کسی کی صحبت میں رہنے سے یہ کہنا صادق آجاتا ہے کہ یہ شخص فلاں کا صحبت یافتہ ہے (یعنی اس کی تربیت کا آدمی ہو گیا) اس مدت کی کوئی تحدید نہیں کی جا سکتی۔
(رد المحتار ج ۱ ص ۱۰)	

- علمائے اصول نے صحابی کی جو تعریف کی ہے وہ اصول فقہ کی معیاری کتابوں کے علاوہ اصول حدیث کی کتب عالیہ کتب شروح حدیث اور کتب اقوال صحابہ مثلاً اصابہ وغیرہ میں بھی ہے۔

- مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۱۴۶ میں علامہ ابو المظفر سمعانی کا بیان ہے:-

الحمدللہ کہ ہم اہل سنت عام طور پر اہل بیت اطہار اور صحابۂ اخیار کا بے حد ادب و احترام کرتے ہیں اور ان کے نقش قدم پر چلنے کو بہت بڑی سعادت سمجھتے ہیں۔ اور بیشک یہ بہت بڑی سعادت ہے۔ لیکن جب سے عباسی کی نہایت زہریلی اور ایمان سوز کتاب "خلافت معاویہ و یزید" شائع ہوئی ہے اس کا زہریلا اثر بے سمجھ اور دین سے بے خبر لوگوں پر ایسا پڑا ہے کہ وہ اہل بیت اطہار خصوصاً حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت امام حسین علیہما السلام کی شان اقدس میں ایمان سوز بد تمیزی اور بے ہودگی کرنے لگے۔ حد ہو گئی کہ یہ ظالم ان کو مجرم اور فتنہ انگیز بتاتے ہیں۔ بعض دریدہ دہن یہاں تک بڑھ گئے کہ العیاذ باللہ انہوں نے یہ بھی کہا کہ "حسین نے یزید کے مقابلہ میں لڑکپن کیا اس کی سزا یہی تھی کہ انہیں قتل کر دیا جائے"

= اسم الصحابی من حیث اللغـة	لفظ صحابی لغت کے رو سے نیز اپنے ظاہری مفہوم کے
والظاهر يقع على من طالت	لحاظ سے اس شخص پر واقع ہوتا ہے جس نے نبی صلی اللہ
صحبته للنبی صلی اللہ علیـه	علیہ وسلم کی طویل صحبت پائی ہے اور آپ کے ساتھ اس کی نشست
وسلم وكثرت مجالسته له على	و برخواست بکثرت رہی ہے۔ اور وہ بھی آپ کے نقش قدم
طریق التبع له والاخذ عنـه	پر چلنے اور آپ سے تعلیم و تربیت اخذ کرنے کے نہج پر۔ سمعانی
قال: وهذا طريق الاصوليين	کا قول ہے کہ یہ تعریف علمائے اصول کے طریق پر ہے۔

❁ علامہ محمود بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری (مطبوعہ دار الطباعۃ العامرہ ج ۱، ص ۸۴) میں لفظ صحابی کی تشریح میں چھ اقوال درج کئے ہیں۔ ان میں علمائے اصول کا قول بھی نقل کیا ہے۔ الفاظ تقریباً وہی ہیں جو مقدمہ ابن صلاح میں ہیں۔ ملاحظہ ہو۔

"القول الثانی:۔ انہ من طالت صحبتہ لہ وکثرت مجالستہ مع طریق التبع لہ والاخذ عنہ۔ ھکذا احکاہ ابوالمظفر السمعانی عن اصولیین وقال: ان اسم الصحابی یقع علی ذالک من حیث اللغۃ والظاھر"

محدثین اور علمائے اصول دونوں کی تعریفیں صحیح ہیں: ۔ راقم السطور کے نزدیک محدثین کا یہ قول =

غور کرو کتنی ایمان سوز ہے یہ بات ؟ اس میں اور ابن زیاد و شمر کی بات میں کیا فرق ہے ؟
معاذاللہ نبی کے لال سے اتنی عداوت ؟ کہ انھیں قتل کر دیا جائے۔
کیا مرنا نہیں ہے ؟ کیا اللہ اور رسول کو منھ دکھانا نہیں ہے۔؟
افسوس صد افسوس ایسی باتیں بولی جاتی ہیں !! سوچنے کی بات ہے کہ یہ ایمان کی موت ہے کہ نہیں ؟
یہ ہے عباسی کی ایمان سوز کتاب کا زہریلا اثر ! کہ اہل بیت اطہار جنکی محبت ایمان کی بنیاد ہے ان کو قابل قتل قرار دیا جا رہا ہے۔

کہ: "صحابی وہ مسلم ہے جسکو بحالِ ایمان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کا شرف حاصل ہے۔ اور وہ دنیا سے مسلم اٹھا ہو"۔ محدثانہ نقطۂ نظر سے بالکل صحیح تعریف ہے۔

اور علمائے اصول کا یہ قول کہ: صحابی وہ مسلم ہے جو طویل زمانہ تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اقدس میں رہا ہو۔ اور اس طرح طویل زمانہ تک آپ کے نقش قدم پر چل کر آپ سے دینی تعلیم و تربیت حاصل کی ہے۔

اصولی نقطۂ نظر سے بالکل صحیح تعریف ہے۔

حقیقت میں یہ دونوں تعریفیں دو نقطۂ نظر سے کی گئی ہیں۔ ایک ہے محدثانہ نقطۂ نظر دوسرا ہے اصولی نقطۂ نظر۔

ا ۔ محدثین کا اصول ہے کہ اگر کوئی شخص کسی سے روایت کرکے بیان کر رہا ہے تو دیکھنا چاہئے کہ یہ شخص اس سے ملا ہے یا نہیں، اگر ملا ہے تو اس کا یہ کہنا تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ میں نے یہ حدیث فلاں سے حاصل کی ہے (بشرطیکہ ثقہ بھی ہو) اس بنا پر اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے یا آپ کو ایسا کرتے دیکھا ہے تو اس کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کبھی ملا بھی یا نہیں۔ اگر ملاقات کا ثبوت مل گیا تو اس کا یہ کہنا مان لیا جائے گا کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سنا ہے یا آپ کو ایسا کرتے دیکھا ہے کیوں کہ وہ آپ کی اتنی صحبت پا چکا ہے کہ آپ کی کوئی بات سن سکے یا کوئی فعل دیکھ سکے محدثین اسی معنی میں اس کو صحابی کہتے ہیں۔ یعنی اس کو صحابی کہنے کا ماحصل یہ ہے کہ اس کی روایت حدیث کو متصل روایت مانا جائے گا ۔ مرسل نہیں چنانچہ محدثین فرماتے ہیں:۔

"اس کا علم ہو جانا کہ فلاں شخص صحابی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی روایت کی ہوئی حدیث متصل ہے مرسل نہیں"۔

امام نووی تقریب میں اور امام سیوطی اس کی شرح تدریب الراوی (ص ۳۹۴) میں صحابہ کی شناخت کے علم کی اہمیت اور فائدہ ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں۔ وھذا علم کبیر، عظیم الفائدۃ بہ یعرف المتصل من المرسل۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ محدثین نے صحابی کی جو تعریف کی ہے اس میں روایت حدیث کا یہ اصول ملحوظ ہے کہ فلاں شخص

اس کتاب کی ایمان سوز پالیسی دیکھ کر ہر فرقہ کے علماء نے اس کتاب کو نہایت گمراہ کن کتاب کہا اور لکھا ہے۔ اور اس کے خلاف شدید نفرت و بیزاری کا اعلان بھی کیا ہے۔

لیکن با ایں ہمہ کچھ ناسمجھ لوگوں کے ہاتھوں میں یہ کتاب پڑ ہی گئی۔ اور چوں کہ زہر سے بھری ہوئی کتاب ہے لہٰذا اس کا زہریلا اثر پڑ ہی گیا۔ ہمارے شہر بنارس میں بھی اکا دکا لوگوں پر اس کا اثر پڑا، کیوں کہ نہ ان کو دینی معلومات ہی تھیں نہ فضائل اہل بیت کی آیتوں اور حدیثوں کا علم ہی تھا، لیکن جمہور اس اثر سے بالکل محفوظ رہے، کیوں کہ ان کی ایمانی فطرت زندہ ہے

= کی روایت حدیث متصل ہے، کیوں کہ وہ صحابی ہے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی ملاقات ثابت ہے گو تھوڑی ہی دیر کی سہی (اور کوئی ایسا قرینہ موجود نہیں جس سے سمجھا جاسکے یہ حدیث اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نہیں پائی ہے بلکہ کسی دوسرے صحابی سے پائی ہے۔ ہاں جب ایسا قرینہ موجود ہوگا تب یہ سمجھا جائے گا کہ اس کا یہ قول عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حدیث متصل نہیں بلکہ مرسل ہے)۔

ظاہر ہے کہ محدثین نے اس نقطہ نظر سے صحابی کی جو تعریف کی ہے وہ اپنی جگہ بالکل صحیح ہے، کیوں کہ تھوڑی دیر تک صحبت رسول پانے والے کو بھی یہ صحابی کہتے ہیں، تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو حدیث روایت کر رہا ہے وہ حدیث متصل ہے مرسل نہیں۔

۲ — لیکن علمائے اصول کے سامنے صرف اتنی ہی بات نہیں جتنی محدثین نے ملحوظ رکھی ہے، بلکہ یہ حضرات لفظ صحابی کی عظمت کو بھی پیش نظر رکھتے ہیں کہ یہ بڑا ہی مقدس اور اہم لفظ ہے اور حقیقت بھی ان بزرگوں کی ہمنوائی کرتی ہے کیونکہ کسی شخص کو صحابی کہنے کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص بڑے اونچے درجے کا ہے پیکر رشد و ہدایت ہے اعلیٰ درجہ کا متقی ہے اور اس کی بنا پر ہدایت کا منارہ ہے۔ (جیسا کہ حدیث میں ہے) لہٰذا اگر ہر ایسے شخص کو صحابی کہا جائے جس نے قبول اسلام کے بعد آپ سے ملاقات کی ہے یا مزید برآں کچھ زمانہ تک آپ کے پاس آیا گیا ہے، لیکن جاہلی اثرات اور منکرات سے تعلق کٹا نہیں ہے اور خدا ترسی اور پاکبازی کے سانچے میں ڈھلا نہیں ہے تو اس کو صحابی کہنے کا مطلب یہ ہوا کہ ایسا شخص بھی بلند پایہ متقی، پیکر رشد و ہدیٰ اور نجم ہدایت ہے اور کون کہہ سکتا ہے؟ کہ جس میں جاہلی اثرات ہیں اور منکرات سے اس کا تعلق کٹا نہیں وہ ہدایت کا منارہ ہے۔

=

یہ فطرت اندر سے پکار رہی ہے کہ امام حسین علیہ السلام ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لال ہیں۔ لخت جگر ہیں، نور نظر ہیں، جوان کا ہے وہ حضور کا ہے، جوان کا نہیں اس کا کہیں ٹھکانا نہیں ان کی محبت ایمان کی جان ہے، جس کو نبی کا دامن چھوڑنا ہو اور ایمان سے ہاتھ دھونا ہو وہ عباسی کی اور مخالفین اہلبیت کی سُنے۔ جمہور کو اہل بیت سے ایسی ہی ایمان افروز عقیدت، محبت شیفتگی کر دیدگی ہے جس کی بنا پر ان کو اہل بیت اطہار کے خلاف ایک حرف بھی سننے کی تاب نہیں وہ اس قسم کی تمام باتوں کو ایمان کی موت سمجھتے ہیں۔ اب تک مسلمانوں کی دین داری اسی عقیدہ کی ہے۔ یہ ایمانی شیفتگی او ر اہل بیت اطہار سے یہ عقیدت نتیجہ ہے ان اگلے اہل دل علمائے حقانی کی ایمان افروز تقریروں اور تحریروں کا جن کے اثر و تاثیر نے دلوں میں محبت اہل بیت کی ایسی روح پھونکی ہے کہ گویا کانوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ آواز برابر آرہی ہے:۔

= ولید بن عقبہ ایک صاحب ہیں جن کو قرآن مجید نے فاسق کہا ہے، حالانکہ یہ کلمہ پڑھ چکے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ان کی آمد و رفت بھی ہوتی ہے، بلکہ حضور نے انھیں کام میں بھی لگا دیا ہے۔ یہ صاحب فتح مکہ کے موقع پر مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کو شراب کا بڑا ذوق تھا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں کوفہ کے حاکم تھے۔ شراب کا شغل جاری تھا۔ ایک روز شراب پی کر کوفہ کی مسجد میں فجر کی نماز پڑھائی اور چار رکعت پر سلام پھیرا۔ سلام کے بعد لوگوں سے پوچھا کچھ اور رکعت پڑھا دوں؟ (السیف المسلول ص ۱۵۰ مطبع احمد دہلی) اس پر صالحین نے بڑا چرچا کیا اور شعراء نے خوب طنز کئے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی گئی۔ آپ نے شرعی حد جاری کی اور کوڑوں سے پٹائی ہوئی۔

کیا ایسے شخص کو صحابی کہا جائے گا؟ اور کیا ایسوں کو صحابی ماننے کے لئے محض اتنا ہی دیکھنا کافی ہے کہ یہ لوگ کلمہ پڑھنے کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں بارہا آتے گئے ہیں؟ ایسوں کو صحابی ماننے کے معنی تو یہی ہیں کہ ان کو ہدایت کے تارے کہے۔ کیا ایسے لوگ بھی صحابی ہیں۔؟ بالفاظ دیگر کیا ایسے لوگ بھی ہدایت کے ستارے ہیں؟ لفظ صحابی کا احترام کیجیے، کیا ایسوں کو صحابی کہہ کر اس لفظ کا احترام اور تقدس قائم رہ سکتا ہے؟

لہٰذا صحابی کی ایسی تشریح کرنی چاہیے کہ اس مقدس لفظ کا تقدس اور عظمت اپنی جگہ قائم رہے اور جام و شراب کے شیدائیوں کو صحابی کہہ کر اس مقدس لفظ کا وقار گرایا نہ جائے۔ اسی بنا پر علمائے اصول نے لفظ صحابی کی تشریح اس قسم کے =

اساس الاسلام حبی وحب اھل بیتی ۔	اسلام کی بنیاد میری محبت اور میرے اہلبیت کی محبت ہے ۔

اور یہ تو مسلمان کی فطرت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت سے اور آپ کی نہایت محبوب اور پاک و مطہر اولاد کی محبت سے لبریز رہتا ہے ۔ الحمد للہ کہ عام مسلمانوں کی یہ فطرت زندہ ہے جبکہ کتنے مدعیان علم و تفقہ اس سے محروم ہیں ۔

جس علم کے سینے میں نہیں جوش محبت
وہ علم نہیں موت ہے ایمان کے حق میں

الفاظ سے کی ہے :۔

صحابی وہ مسلمان ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آپ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اتنی طویل مدت تک رہا ہے جتنی طویل مدت تک کسی کی صحبت میں رہنے سے یہ کہنا صادق آجاتا ہے کہ "یہ شخص فلاں کا صحبت یافتہ ہے"۔ (یعنی اس کی زندگی اس کے سانچے میں بالکل یا تقریباً ڈھل چکی ہے) یہ تعریف شرح تحریر علامہ ابن امیر الحاج سے ماخوذ ہے جو اوپر مذکور ہے ۔

اصولی نقطہ نظر سے صحابی کی یہ تعریف حرف بحرف صحیح ہے اور اس پر کوئی فرد گیری نہیں ہو سکتی ۔ ظاہر ہے کہ اگر انہیں صفات سے متصف بزرگوں کو صحابی کہا جائے تو یہ حقیقت ہر معقولیت پسند اور منصف مزاج کے نزدیک بالکل بے غبار حقیقت ہے کہ تمام صحابہ کرام بڑے اونچے درجے کے انسان، اعلیٰ درجہ کے خدا ترس، پاکباز، تقویٰ نواز، پیکر رشد و ہدیٰ اور نجوم ہدایت ہیں یہ روشنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے اس قول سے بھی ملتی ہے :۔

من کان مستنا فلیستن بمن قد مات فان الحی لا تومن علیه الفتنـــة اولئك اصحاب محمد صلی الله علیه وسلم کانوا افضل هٰذه الامـــة ابرها قلوبا واعمقها علما واقلها تکلفا، اختارهم الله لصحبة	جس کو کسی کی پیروی کرنی ہو وہ گذرے ہوئے لوگوں کی پیروی کرے کیونکہ زندہ کے بارے میں یہ اطمینان نہیں کہ اس کو فتنہ پیش نہیں آئے گا ۔ اور ان گزرے ہوئے لوگوں سے مراد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں یہ لوگ اس امت میں سب سے بہتر ہیں احسان کے قلوب سب سے زیادہ نیک صفات یہ لوگ علوم کی گہرائی میں سب سے زیادہ رسائی

اہل دل علما جو الحمدللہ جوش محبت سے لبریز ہیں انہوں نے اپنی پراثر حقانی تحریروں اور تقریروں سے دلوں میں اہل بیت اطہار کی محبت، عظمت، تعظیم و احترام کو اسطرح جما دیا ہے کہ پہاڑوں کے جماؤ کی طرح رسوخ پیدا ہو گیا ہے موجودہ نسل کم و بیش ایسی ہی ہے۔

لیکن اہل بیت اطہار کی عظمت گرانے اور ان کی محبت مٹانے کے لئے جو ایمان سوز لٹریچر ملک میں کبھی کبھی شائع ہو جاتا ہے۔ ڈر ہے کہ کچی سمجھ کے لوگ اس کے شکار نہ ہو جائیں اور جب کہ اہل دل علما روز بروز کم ہوتے جا رہے ہیں۔ بڑا اندیشہ ہے کہ ایسے لٹریچر کو پڑھ کر آنے والی نسل خارجی مزاج اور ناصبی طبیعت نہ بن جائے۔

اس کا علاج کیا ہے؟ وہی جو صحابہ کرام، تابعین عظام اور حافظان حدیث نے تحریر فرمایا تھا تفصیل یہ ہے کہ بنی امیہ اور خوارج نے جب اہل بیت اطہار کے خلاف ایمان سوز پروپیگنڈے پھیلانے شروع کئے اور سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو گالی دینے اور ان پر لعنت کرنے کی مہم شروع کی تو اس ایمان سوز فتنہ کو ناکام بنانے کے لئے صحابہ کرام، تابعین عظام اور راویان حدیث نے اہل بیت اطہار خصوصًا سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب کی آیتوں اور حدیثوں کو سنا اور پھیلانا شروع کیا اور یہ کام اس جوش و خروش سے ہوا کہ ان قدسیوں کے فضائل و مناقب کا بہت بڑا دفتر تیار ہو گیا۔ ان بزرگوں کی پر مقدس کوشش اتنی کامیاب ہوئی کہ ہر مسلم خود بخود سمجھنے لگا کہ بنی امیہ اور خوارج جو کچھ بول رہے ہیں وہ سر سے پیر تک ناپاک پروپیگنڈا ہے

= نبیہ، ولاقامۃ دینہ، فاعرفوا لہم الفضل، واتبعوا علی اثرہم، وتمسکوا بما استطعتم من اخلاقہم وسیرہم، فانہم کانوا علی ہدی مستقیم (مشکوٰۃ ص ۳۰)

والے بہت کم تکلف والے، اللہ نے ان کو اپنے نبی کی صحبت میں رکھنے کے لئے اور اقامت دین کے لئے چن لیا ہے ان کی برتری سمجھو ان کے نقش قدم پر چلو اور جہاں تک ہو سکے ان کے اخلاق و سیرت کو پکڑو کیوں کہ یہ لوگ سیدھی ہدایت پر رہے ہیں۔

یہ ہیں صحابۂ کرام کے اعلیٰ صفات اور یہ ہیں صحابہ! جو تعلیمات اسلام اور سیرت نبوی کے سانچے میں پوری طرح ایک عدیم المثل ڈھل چکے ہیں۔ ۱۲۰ کروڑ

یکسر جھوٹ ہے، تہمت ہے، بہتان ہے، نفاق ہے۔ دل کی کپٹ ہے جو زبان سے ابل پڑی ہے اور یہ سب مسلمانوں کے ایمان لوٹنے کی چال ہے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بے حد محبوبوں سے مسلمانوں کو متنفر کرنے کی ابلیسی سیاست ہے۔

ہر مسلم دل بول اٹھا "ظالموں! ہم خوب سمجھتے ہیں تمہاری ابلیسی سیاست کو"

اور ہر مسلمان کا ضمیر اس سے پکار پکار کر کہنے لگا۔

"ایمان جان سے بڑھ کر ہے، اپنا ایمان بچاؤ اور اہل بیت اطہار کی محبت میں سرشار ہو جاؤ"

پھر ہوا بھی ایسا ہی کہ وہ اہل بیت اطہار کی محبت سے لبریز ہو گئے اور ان میں بیحد شیفتگی اور گرویدگی پیدا ہو گئی۔ حتیٰ کہ گھر گھر ان محبوبان خدا کے فضائل و مناقب کی حدیثیں پھیل گئیں اور صبح و شام ان کا چرچا ہونے لگا۔ اسی فضا میں ان کی نسل پروان بڑھی، پھر اس نے بھی یہی فضا قائم کی۔ اور یہ سلسلہ برابر قائم رہا، جس کی برکت سے آج بھی اہل بیت اطہار کی محبت ہر اہل ایمان کے دل میں بسی ہے اور ان سے شیفتگی و گرویدگی ہر سچے مسلمان کی فطرت بن چکی ہے۔

کتنی صحیح اور مبارک ہے صحابہ کرام، تابعین عظام اور حافظان حدیث کی یہ تجویز کہ اہل بیت کے خلاف جو گمراہ کن پروپیگنڈے کئے جاتے ہیں ان کو ناکام بنانے کے لئے ان محبوبان خدا کے فضائل و مناقب کی آیتوں اور حدیثوں کی خوب اشاعت کرو۔

انہوں نے اس تجویز پر عمل پیرا ہو کر ظالموں کے تمام ایمان سوز پروپیگنڈوں کو یکسر ناکام بنا دیا آج بھی ان مقدس نفوس کے خلاف جو لٹریچر کبھی کبھی شائع ہو جاتا ہے، اس کو ناکام اور بے جان بنانے کا صحیح طریقہ یہی ہے کہ صحابۂ کرام، تابعین عظام اور حافظان حدیث کی سنت پر عمل کیا جائے، یعنی اہل بیت عظام کے فضائل و مناقب کی آیتوں اور حدیثوں کی خوب اشاعت کی جائے، یہ کام عربی زبان میں خوب ہوا ہے، اردو ابھی ابتدائی منزل میں ہے، تاہم بعض اکابر نے

اس زبان میں بھی یہ کام ایک حد تک بحسن وخوبی انجام دینے کی کوشش کی ہے، ضرورت ہے کہ آج کی اردو میں بھی اس موضوع پر لکھنے کی سعادت حاصل کی جائے۔

راقم السطور نے کتاب ہٰذا میں اس سعادت کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں انھیں روایات کا انتخاب کیا ہے جو اپنے اثر و تاثیر کی بنا پر راقم السطور کے دل میں اتر گئی ہیں۔ بڑے دل کی بات کہی ہے ایک مدرسی بھائی نے ؎

ہم نے اپنے آشیانے کے لئے
جو چبھے دل میں وہی تنکے لئے

اس سلسلہ میں اگر کوئی ایسی روایت آگئی ہے جس کے رواۃ پر جرح کی گئی ہے تو اسے ضعیف اور پایۂ اعتبار سے ساقط نہ سمجھا جائے کیوں کہ اس کی تائید میں قرآن مجید کی کی آیت، یا کوئی حدیث موجود ہے۔

آج سے پچیس برس پہلے کی بات ہے کہ چند لوگ یزید کو امام مانتے تھے اور سیدنا امام حسین کی شان اقدس میں بدتمیزی کرتے تھے۔ وہ اس فرزند رسول کے لئے لفظ امام و علیہ السلام و سید الشہداء پر جز بز ہوتے اور کچھ بولتے تھے لیکن ان کی یہ بولی بہت دبی دبی تھی مگر دبی دبی بات ہمیشہ دبی نہیں رہتی، چنانچہ کچھ لوگ اب پوری بلند آہنگی سے اس کا پرچار تک کرنے لگے لہٰذا ضرورت محسوس ہوئی کہ اہل سنت کے بے شمار علمائے حقانی اور اولیائے ربانی کے مسلک کو بھی اچھی طرح واضح کر دیا جائے کہ :-

- امام حسن اور امام حسین علیہما السلام بے شک امام ہیں ان کو امام کہنا صحیح ہے اور یہ اس لفظ کا بہت صحیح استعمال ہے۔
- امام حسین اور دیگر اولاد فاطمہ زہرا علیہم السلام کے لئے لفظ علیہ السلام استعمال کرنا بھی یقیناً صحیح ہے۔
- امام حسین علیہ السلام کو سید الشہداء کہنا بھی یقیناً صحیح ہے۔

یہ کتاب صرف ان لوگوں کے لئے لکھی گئی ہے جو اہل بیت عظام سے گہری محبت رکھتے ہیں۔ امام حسن، امام حسین و دیگر اہل بیت عظام کے لئے علیہ السلام کہنا صحیح سمجھتے ہیں اور امام حسین علیہ السلام کو سیدالشہداء کہنا بھی صحیح سمجھتے ہیں۔ البتہ اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ اپنے مسلک کے دلائل بھی معلوم ہو جائیں تاکہ وہ اور ان کی نسل اس مسلک میں خوب ہی مستحکم رہیں۔

اس قسم کے حضرات کے علاوہ اور کوئی صاحب اس کے مخاطب نہیں۔ لہٰذا وہ کسی قسم کے سوال و جواب کی زحمت نہ اٹھائیں۔

حقیقت میں یہ کتاب بارگاہ اہل بیت میں ایک نذرانۂ عقیدت ہے، نذرانۂ عقیدت پیش کرنا ہر عقیدت کیش کا فطری حق ہے۔ والسلام

عقیدت کیش

عزیز الحق کوثر ندوی قادری نظامی

۲۲ جمادی الاخری ۱۳۹۱ھ، ۲۶ اگست ۱۹۷۱ء

محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی

اہمیت

اور

اہل بیت اطہار کے

فضائل

ایک حدیث

راویانِ حدیث کا بیان ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا ہے

اَسَاسُ الْاِسْلَامِ حُبِّیْ وَحُبُّ اَهْلِ بَیْتِیْ

(کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۸)

اسلام کی بنیاد میری اور میرے اہل بیت کی محبت ہے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

الحمد للہ رب العالمین ٥ والصلوٰۃ والسلام علیٰ رسولہ
محمد وآلہ وازواجہ واصحابہ وذریاتہ وجمیع الصالحین.

محبتِ رسولؐ

محبت ان کی ہے روحِ ایماں، یہ دل میں کچھ اس ادا سے آئی
کلی کے سینے میں جیسے خوشبو، گلوں کے دامن میں جیسے شبنم

زندگی کی بقا کے لئے پانی اور ہوا بے حد ضروری ہیں لیکن ایمان کی حیات و بقا کے لئے حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت ان سے بھی زیادہ ضروری ہے کہ آپ کی محبت ایمان کی جان ہے جس کو محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس قدر زیادہ شیفتگی گرویدگی اور عشق و محبت ہے اسی قدر اس کا ایمان طاقتور ہے، اور اسی قدر اس میں ایمان و روحانیت کا قدسی و برقی پاور موجود ہے۔ اسی لئے اسلام نے اس پر بہت زیادہ زور دیا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت میں اتنے سرشار ہو جاؤ کہ آپ کی محبت ہر محبت پر غالب رہے۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

لا یومن احد کم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین (مشکوٰۃ ص ۱۲)	تم لوگوں میں سے ایک آدمی بھی اس وقت تک مومن نہیں جب تک کہ میں اس کے والد سے اسکی اولاد سے اور تمام لوگوں سے بڑھ کر اس کو محبوب نہ ہو جاؤں۔

کتاب الشفاء (ج ۲ ص ۵) میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے گذارش کی۔

"آپ مجھے اپنی جان کے علاوہ ہر چیز سے بڑھ کر محبوب ہیں"۔

اس پر آپ نے فرمایا:۔

لن یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من نفسہ۔

تم میں سے ایک شخص بھی اس وقت تک مومن ہو ہی نہیں سکتا جبتک میں اس کی جان سے بڑھ کر اس کو محبوب نہ ہو جاؤں۔

ان قدوسی کلمات کا یہ اثر ہوا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی سطح سے بہت بلند ہو گئے چنانچہ کتاب الشفا میں ہے کہ: اب حضرت عمر بول اٹھے:

"اس کی قسم جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے اب تو آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں"

اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

الآن یا عمر! — اے عمر ایمان تو اب ہوا۔

اس حدیث سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی جان سے بڑھ کر محبوب بنانا فرض عین ہے۔ اس کے ضمن میں یہ آگاہی بھی نصیب ہوتی ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایمان کے اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔

جیسے ہر محبت کا تقاضا ہے کہ محبوب کی ہر چیز سے محبت کی جائے اسی طرح حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کا بھی تقاضا ہے کہ آپ کی ہر چیز سے محبت کرو آپ کی اولاد اطہار آپ کی ازواج مطہرات، آپ کے صحابۂ جاں نثار آپ کی حدیث پاک اور آپ کی ہر یادگار سے محبت کرنا لازمی ہے۔

جس دل میں حبیب خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سچی محبت ہے وہ آپ کی اولاد پاک سے گہری محبت رکھتا ہے

یہ ایک فطری حقیقت ہے کہ آپ جس سے محبت کریں گے اس کی محبوب آل و اولاد کو بھی پیار

کریں گے۔ اسی لئے ہر سلیم القلب مسلمان جو ایمانی فطرت پر قائم ہے وہ اپنے نبی کے لال سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہما السلام کی محبت سے لبریز رہتا ہے۔ ہمیشہ اس کا پاس رکھتا ہے کہ یہ آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لخت جگر ہیں اور ہیں محبوب ہیں، جو ان کا محب ہے اس سے اللہ خوش اور رسول راضی اور جس کے دل میں ان کی محبت نہیں اس سے اللہ ناخوش اور رسول ناراض جس کا انجام جہنم ہے۔

یہ محبت کی وہ روحانی و ایمانی تعلیم ہے جو ہمیں قرآن و حدیث نے دی ہے۔ اور صحابۂ کرام نے ہمیشہ اس پر عمل کیا ہے۔ ان بزرگوں نے اولاد رسول کے معاملہ میں ہمیشہ اس کا لحاظ رکھا ہے کہ ان کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس اور لحاظ رکھو۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

ارقبوا محمدا فی اہل بیتہ۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۶) — اہل بیت کے بارے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاس و لحاظ رکھو!

جب ہمیں ان کے معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاس و لحاظ رکھنا لازمی اور ناگزیر ہے تو سوچو کہ سیدنا امام حسن و سیدنا امام حسین علیہما السلام اور دیگر ذریات رسول کے بارے کس قدر ادب و تعظیم اور محبت کرنا ضروری ہے اگر دل میں ان کی محبت نہیں اور ان کا ادب واحترام ملحوظ نہیں تو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاس و لحاظ اٹھ گیا۔ اس کا انجام کیا ہوگا؟ الامان والحفیظ!

یہ تو سیدنا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تعلیم تھی کہ "اہل بیت کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پاس و لحاظ رکھو" اب آپ کا عمل بھی ملاحظہ ہو کہ آپ امامین کریمین کی محبت سے کتنے لبریز تھے۔ ایک مرتبہ کا واقعہ ہے کہ آپ نے راستے میں سیدنا امام حسن علیہ السلام کو بچوں کے ساتھ کھیلتے دیکھا تو جوش محبت میں اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا۔ مشکوٰۃ صفحہ ۵۶۲ میں ہے:۔

صلی ابو بکر العصر ثم خرج	ابو بکر عصر کی نماز پڑھ کر علی کے ساتھ چلے
یمشی ومعہ علی فرأی الحسن	اور حسن کو لڑکوں کے ساتھ کھیلتے دیکھ کر
یلعب مع الصبیان فحملہ علی	اٹھا لیا اور کندھے پر سوار کر لیا اور شعر
عاتقہ، وقال:	پڑھا جس کا ترجمہ یہ ہے۔
بابی شبیہ بالنبی	میرے باپ ان پر قربان۔ یہ تو نبی کے
لیس شبیہ بعلی	مشابہ ہیں علی کے مشابہ نہیں ہیں۔

سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ارشاد بالا اور ان کا یہ جوش محبت اس قسم کی حدیثوں کی عملی تفسیر ہے۔

احبوا اھل بیتی لحبی	مجھ سے محبت رکھتے ہو تو اس کی بنا پر
(ترمذی ج۲ ص ۲۲۰)	میرے اہل بیت سے بھی محبت رکھو۔

اس حدیث سے کتنی واضح ہدایت ملتی ہے کہ اگر حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت ہے تو اہل بیت اطہار کی محبت لازمی ہے اگر خدانخواستہ دل اہل بیت کرام کی محبت سے خالی ہے تو یقیناً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت سے بھی خالی ہے پھر اس کا انجام کیا ہوگا؟ کون نہیں جانتا کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت نہیں تو سرے سے ایمان ہی نہیں اور یہ تو خود محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فیصلہ ہے چنانچہ آپ فرماتے ہیں:

واللہ لا یدخل قلب رجل الایمان	اللہ کی قسم! کسی شخص کے دل میں اس وقت تک
حتی یحبھم اللہ ولقرابتھم منی	ایمان نہیں آسکتا جب تک میرے اہل بیت سے اللہ کیلئے اور
(ابن ماجہ ص ۱۲)	میری قرابت کی وجہ سے محبت نہ رکھے!

اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ اہل بیت کرام کی محبت ایمان و اسلام کی بنیاد ہے اور خود حدیث نے بھی یہی فرمایا ہے، سنئے:

اساس الاسلام حبی وحب اھل	اسلام کی بنیاد میری محبت اور میرے اہل بیت
بیتی (کنز العمال تقطیع کلاں ج۶ ص ۲۱۸)	کی محبت ہے۔

قرآن مجید اور اہل بیت

مسلمانوں کے لئے
بہت ہی بڑی دولت
راہ حق کی ہدایت ہے

ہدایت چاہتے ہو تو قرآن مجید اور
اہل بیت کا دامن تھامے رہو

یا ایہا الناس قد ترکت فیکم ما ان اخذتم
لن تضلوا کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی

(حدیث بروایت ترمذی)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی

ایک وصیت

اگر قرآن مجید اور میری اولاد و
اہل بیت کا دامن پکڑے رہو گے
تو کبھی گمراہ نہیں ہو سکتے۔

(ترجمۂ حدیث بروایت ترمذی)

حدیث ثقلین

یہ حدیث درحقیقت حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وسلم کی ایک وصیت ہے کیوں کہ اس کے الفاظ بول رہے ہیں کہ یہ وصیت کے کلمات ہیں چنانچہ اس میں یہ الفاظ ہیں :

"لوگو! میں ایک بشر ہوں، عنقریب میرے پاس میرے رب کا فرشتہ (رحلت کا پیام لے کر آئے گا اور میں اسے قبول کر لوں گا۔"

"ثقلین" سے مراد قرآن مجید اور اہل بیت یعنی عترت رسول ہیں۔ اہل بیت خصوصیت کے ساتھ حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین ہیں کہ خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہ میرے اہل بیت ہیں اور عترت رسول اولاد فاطمہ زہرا ہیں، جیسا کہ ایک حدیث میں آیا ہے۔ یہ حدیث انشاء اللہ آگے آئے گی۔

حدیث ثقلین متعدد صحابہ کرام سے مروی ہے۔ اور یہ حدیث کی متعدد کتابوں میں ہے ہم پہلے صحیح مسلم کی روایت درج کرتے ہیں۔ اس کے بعد انشاء اللہ اور کتابوں کی روایتیں درج ہوں گی۔ صحیح مسلم (ج ۲۔ ص ۲۶۹) میں جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

قام رسول اللہ صلی اللہ علیہ	مکہ اور مدینہ کے درمیان پانی کا ایک مقام ہے
وسلم خطیبا بماء یدعی خما	جسے خم کہا جاتا ہے وہاں رسول خدا صلی اللہ علیہ
بین مکۃ والمدینۃ، فحمد اللہ	وسلم نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس میں اللہ کی
واثنی علیہ ووعظ و ذکر،	حمد وثنا کی، وعظ ونصیحت فرمائی اس کے بعد
ثم قال: اما بعد، الا	فرمایا، (حمد وثنا کے بعد کہنا یہ ہے کہ)
ایها النّاس، فانما انا بشر	لوگو! میں ایک بشر ہوں، عنقریب میرے

يوشك ان ياتيني رسول ربي فاجيب، وانا تارك فيكم الثقلين: اولهما كتاب الله فيه الهدى والنور فخذوا بكتاب الله واستمسكوا به فحث على كتاب الله ورغب فيه ثم قال، واهل بيتي، اذكركم الله في اهل بيتي، اذكركم الله في اهل بيتي، اذكركم الله في اهل بيتي۔

(صحیح مسلم) ج ۲ ص ۲۷۹

پاس میرے رب کا فرشتہ ارحلت کا پیام لیکر آئے گا اور میں اسے قبول کروں گا۔ اور میں تم لوگوں کے پاس دو بڑی وزنی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ان میں ایک تو کتاب الٰہی ہے جس میں نور اور ہدایت ہے اللہ کی کتاب کو پکڑ لو اور مضبوطی سے پکڑے رہو، (یہاں) آپ نے کتاب الٰہی کے بارے میں ترغیب دی اور شوق دلایا۔ پھر یہ فرمایا (ثقلین میں دوسری چیز میرے اہلبیت ہیں) میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرو! میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہلبیت کے حق میں اللہ سے ڈرو! میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرو!

یہ آخری جملہ جسے آپ نے تین بار فرمایا ہے بہت ہی اہم ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل بیت کے معاملے میں اللہ سے بہت ڈرنا، ان سے خوب محبت رکھنا بڑا ادب و احترام کرنا، ان کے حقوق پورے کرنا۔

غور کرو! حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ کن لوگوں سے فرما رہے ہیں؟ اور کن لوگوں کو خطاب ہے؟ کہ "میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرو"۔

یہ خطاب حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین سے ہے اور ان کو اہل بیت کرام علیہم السلام کے بارے میں تاکید پر تاکید ہے کہ ان کے حقوق کا بڑا لحاظ رکھنا کوتاہی

ل اس جملہ کا یہ ترجمہ علامہ طیبی کی شرح مشکوٰۃ سے ماخوذ ہے۔ آپ اس کا یہ مفہوم بیان فرماتے ہیں:۔
احذرکم اللہ فی شان اہل بیتی۔ (حاشیہ مشکوٰۃ ص ۵۶۸)

نہ کرنا، اس باب میں اللہ سے ڈرتے رہنا،

جب مقدس صحابۂ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین کو اہل بیت کے حقوق کے بارے میں اتنی تاکید ہے تو سوچو کہ ہم لوگ کس شمار میں ہیں۔ اور ہمیں ان کا کتنا ادب و احترام کرنا چاہیئے؟ ان سے کتنی عقیدت و محبت رکھنی چاہیئے؟ اور ان کے حقوق کے بارے میں اللہ سے کتنا ڈرنا چاہیئے۔؟!

حدیث ثقلین میں اہل بیت سے کون لوگ مراد ہیں

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو "اھل بیتی" فرمایا ہے۔ یعنی میرے اہل بیت ہیں اس لئے لفظ اہل بیت سے عموماً یہی لوگ مراد ہوتے نیز آیت تطہیر نازل ہونے کے بعد نو مہینے تک آپ روزانہ صبح کو حضرت فاطمہ کے دروازے پر (جس کا صحن مسجد نبوی ہے) تشریف لاکر اس طرح سلام کرتے: "السّلام علیکم یا اھل البیت" اس طرح حاضرین مسجد نے تقریباً دو سو ستر مرتبہ اسے سن کر خوب اچھی طرح سمجھ لیا اور ذہن نشین کر لیا کہ اہلبیت سے مراد یہی حضرات، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین ہیں۔ لفظ اہل بیت کی یہ وہ تشریح ہے جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی زبان پاک سے بھی فرمائی ہے چنانچہ فرمایا:- "یہ میرے اہل بیت ہیں" تقریباً دو سو ستر مرتبہ اپنے عمل سے بھی فرمائی ہے۔ اس لئے حدیث ثقلین میں "اہل بیت" سے مراد یہی حضرات، (حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین) ہیں۔

چونکہ اس مضمون کی دوسری حدیثوں میں لفظ "اھل بیتی" کے ساتھ "عترتی" کا لفظ بھی ہے اس لئے اس حدیث میں بھی تمام عترت رسول کو شامل سمجھنا چاہیئے۔

عترت رسول کون لوگ ہیں

مرقاۃ شرح مشکوٰۃ (ج ۱ ص ۱۵۰) میں ہے:-

والعترة: الاقارب القريبة وهم اولاد فاطمة وذراریهم

عترت بہت قریبی رشتہ دار کو کہتے ہیں اور عترت رسول اولاد فاطمہ اور ان کی اولاد ہیں۔

اس تشریح کی تائید ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جو مستدرک میں اس طرح مروی ہے:

ان لکل بنی اب عصبة ینتمون الیها الا ولد فاطمة فانا ولیهم وانا عصبتهم وهم عترتی خلقوا من طینتی، ویل للمکذبین بفضلهم من احبهم احبه الله، ومن ابغضهم ابغضه الله۔

(کنز العمال تقطیع کلاں ج ۶ ص ۲۱۷)

جو شخص کسی باپ کا بیٹا ہے یقیناً اس کا ایسا رشتہ دار بھی ہے جس سے اس کو بڑی تقویت ہے اور اس کی طرف اس کی نسبت ہوتی ہے لیکن اولاد فاطمہ کی نسبت مجھ سے ہے، میں ہوں ان کا ولی اور مجھ ہی سے ان کی تقویت اور یہ ہیں میری عترت یہ میری طینت سے پیدا ہوئے ہیں، جو ان کی فضیلت کا منکر ہے اس کے لئے بڑی تباہی ہے، جو ان سے محبت رکھے گا اس سے اللہ محبت رکھے گا۔ اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ اس کا دشمن ہے۔

ایسا کیوں ہے کہ قرآن مجید اور اہل بیت ہی بڑی وزنی چیزیں ہیں اور حضور نے صحابہ کو بھی ان کا دامن تھامنے کی ہدایت فرمائی ہے

اس کا جواب خود حدیث پاک میں ہے۔ چنانچہ سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۹) میں ہے کہ اگر تم لوگ قرآن اور میرے اہل بیت کا دامن پکڑے رہو گے تو گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔ اس حقیقت کو حضرات صوفیہ کرام نے بہت ہی عارفانہ انداز میں بیان فرمایا ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہ جو بڑے اعلیٰ درجہ کے مفسر محدث، فقیہہ اور صوفی ہیں اپنی بے نظیر کتاب تفسیر مظہری (ج ۲ ص ۹۹) میں حدیث ثقلین اور اس کی ہم مضمون حدیثوں کو لکھ کر فرماتے ہیں۔

• قلت: اشار النبی صلی الله

میں کہتا ہوں (ان احادیث میں) نبی صلی اللہ

علیہ وسلم الی اھل البیت	علیہ وسلم نے اس کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اہل بیت
اقطاب الارشاد فی الولایات،	ولایتوں کے قطب الارشاد ہیں۔ پہلے قطب الارشاد
اولھم علی علیہ السلام ثم ابناؤہ	حضرت علی علیہ السلام ہیں پھر آپ کے فرزندان (فاطمی)
الی الحسن العسکری واٰخرھم	حسن عسکری[1] تک قطب الارشاد ہوئے ہیں اور آخری
غوث الثقلین محی الدین عبد القادر	قطب الارشاد غوث الثقلین (شیخ) عبد القادر
الجیلی رضی اللہ عنھم اجمعین لایصل	جیلانی ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین۔
احد من الاولین والاٰخرین الی درجۃ	اگلوں اور پچھلوں میں کوئی بھی ایسا نہیں
الولایۃ الا بتوسطھم، کذا قال المجدد	جو ان کے توسط کے بغیر مقام ولایت تک پہونچا ہو
رضی اللہ عنہ	مجدد رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کہا ہے۔

حضرت قاضی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس بیان سے یہ باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

۱۔ اہل بیت و عترت رسول حضرت فاطمہ، حضرت علی، امام حسن اور امام حسین ہیں اور ان کے فرزندان گرامی بھی ہیں۔

۲۔ یہ حدیث نبوی (کہ قرآن اور میری عترت کو تھامے رہو تو گمراہ ہو ہی نہیں سکتے) اس کی طرف اشارہ

---

[1] امام حسن عسکری تک فرزندان مرتضوی جو ولایت کے قطب الارشاد ہوئے ہیں جن کے توسط کے بغیر کوئی شخص درجۂ ولایت تک نہیں پہنچ سکتا۔ ان سب کو ائمۂ اہل بیت کہتے ہیں حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ نے تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۴۴ میں ان کو "الائمۃ الکرام" فرمایا ہے۔ ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔

(۱) حضرت امام حسن (۲) حضرت امام حسین (۳) حضرت امام زین العابدین

(۴) حضرت امام محمد باقر (۵) حضرت امام جعفر صادق (۶) حضرت امام موسیٰ کاظم

(۷) حضرت امام علی رضا (۸) حضرت امام محمد جواد (۹) حضرت امام علی ہادی

(۱۰) حضرت امام حسن عسکری۔ (علی جدہم وعلیہم الصلوٰۃ والسلام)

یہ دس امام ہوئے اور پہلے امام اہل بیت حضرت علی ہیں اور آخری حضرت امام مہدی اس طرح سو ائمۂ اہل بیت ہوئے۔ ۱۲ کوثر

کر رہی ہے کہ یہ اہل بیت ولایتوں کے قطب الارشاد ہیں (یعنی ولایت ملائکہ، ولایت انبیا اور ولایت خاصہ کے قطب الارشاد ہیں)۔

چنانچہ اگلی امتیں ہوں یا امت محمدیہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) ان میں سے جو بھی درجہ ولایت پر فائز ہوا وہ انہیں حضرات کے توسط سے فائز ہوا ہے اور جو بھی فائز ہوگا انہیں کے توسط سے ہوگا۔

۳۔ ولایت کے پہلے قطب الارشاد (اہل بیت کے فرد اعلیٰ) حضرت علی علیہ السلام ہیں۔

۴۔ پھر آپ کے بعد آپ کے فرزندان فاطمی امام حسن عسکری تک قطب الارشاد ولایت ہوئے۔ آخر میں حضرت غوث الثقلین شیخ عبد القادر جیلانی قطب الارشاد ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔

۵۔ یہ وہ حقائق ہیں کہ حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ نے بھی انہیں بیان فرمایا۔

حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ نے اس نقطۂ معرفت کو تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۱۴ میں بھی لکھا ہے الفاظ یہ ہیں:

کان قطب الارشاد کمالات الولایۃ علی علیہ السلام ما بلغ احد من الامم السابقۃ درجۃ الولایۃ الا بتوسط روحہ رضی اللہ عنہ ثم کان تلک المنصب الائمۃ الکرام ابنائہ الی الحسن العسکری وعبد القادر الجیلی۔	کمالات ولایت کے قطب الارشاد علی علیہ السلام ہیں اگلی امتوں میں بھی جو شخص درجۂ ولایت پر پہنچا ہے آپ ہی کی روح پاک کے توسط سے پہنچا ہے رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ پھر اس منصب پر ائمہ اہل بیت (امام حسن عسکری اور حضرت شیخ) عبد القادر جیلانی تک ہوئے ہیں۔ (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین)

دیکھا آپ نے حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ جو تفسیر میں شاہ ولی اللہ قدس سرہٗ سے بھی آگے ہیں۔ حدیث میں ان کا درجہ یہ ہے کہ شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی ان کو بیہقی وقت فرماتے تھے اور عرفان و تصوف میں یہ پایہ ہے کہ ان کے شیخ طریقت مرزا مظہر جان جاناں قدس سرہٗ ان کا بیحد احترام کرتے، دیکھ کر کھڑے ہو جاتے۔ ایسا بے نظیر مفسر، محدث، فقیہ اور عارف ربانی اہلبیت کرام علیہم السلام کی جو عظمت بیان کرتا ہے وہ کتنی بلند ہے۔؟!

حدیث ثقلین پر لمحات فکریہ

حدیث ثقلین جو حقیقت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک وصیت ہے کہ قرآن مجید اور میرے اہل بیت ثقلین ہیں یعنی دو بڑی ہی وزنی چیزیں ہیں۔ ان دونوں وزنی چیزوں کو میں تمہارے پاس چھوڑے جا رہا ہوں، ان سے ہمیشہ وابستہ رہنا۔ ان کا بڑا ہی لحاظ رکھنا۔

* کتنے پر درد ہیں ذیل کے الفاظ :-

ترکت فیکم الثقلین — میں تم لوگوں کے پاس یہ دو وزنی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں۔

پھر مندرجہ ذیل الفاظ میں وصیت نبوی کا کتنا درد بھرا نکڑا ہے؟ اور کیسی دل سوزی کی وصیت ہے؟

اذکرکم اللہ فی اھل بیتی ! — میں تم لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرنا!

اذکرکم اللہ فی اھل بیتی ! — میں تم لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرنا!

اذکرکم اللہ فی اھل بیتی ! — میں تم لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرنا!

اہل بیت کے معاملہ میں اللہ سے ڈرنے کی کیسی زبردست تاکید ہے، ایک بار نہیں تین تین بار زور دے کر فرمایا ہے۔ یہ اس لئے کہ :

ایک ایک مسلمان سن لے اور سن کر اچھی طرح یاد کر لے کہ یہ بڑی تاکیدی وصیت ہے اور بڑے ڈر کی بات ہے پھر یہ بھی سوچے کہ وصیت کتنی اہم ہوتی ہے۔ پھر رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وصیت؟ غور کرو اس کی اہمیت کتنی زیادہ ہے؟!

اس موثر انداز میں اہل بیت اطہار کے ساتھ حسن سلوک اور توقیر و احترام کی وصیت فرمانے کا ایک خاص الخاص راز یہ تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے پہلے سے یہ علم دیا تھا کہ حسین علیہ السلام کو ظلم وستم کی تلوار سے قتل کیا جائے گا (اس کو آپ نے کئی حدیثوں میں بیان فرمایا ہے) اس قتل میں جن لوگوں کا ہاتھ ہوگا وہ سب اللہ کی لعنت اور سخت عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ (اس کو بھی آپ کئی موقع پر بیان فرما چکے ہیں)۔

اس علم کی بنا پر امت کی خیر خواہی کے مدنظر بار بار یہ وصیت فرما رہے ہیں "میرے اہل بیت کے حق

میں اللہ سے ڈرنا"۔ تاکہ لوگ اس وصیت کو کبھی نہ بھولیں اسکا بہت بہت لحاظ رکھیں اپنی اولاد کو بھی یہ وصیت ذہن نشین کرادیں اور اس پر پوری طرح عمل کریں اور کرائیں ، تاکہ لوگ قتل حسین میں شریک ہو کر اللہ کی لعنت اور عذاب شدید میں گرفتار نہ ہوں۔

نیز حسینؑ کے علاوہ کسی اور اولاد نبی کیساتھ بھی ظالمانہ سلوک نہ کریں تاکہ لعنت خدا اور عذاب الٰہی سے محفوظ رہیں۔

اگر ہدایت چاہتے ہو تو قرآن مجید اور عترت رسول کا دامن تھامے رہو

اوپر جو حدیث ثقلین لکھی گئی ہے وہ مقام خم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اہم خطبہ ہے جس میں عترت رسول کی بے نظیر شان اور اہمیت بتائی گئی ہے۔

اسی قسم کا ایک اور اہم خطبہ ہے جو رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع میں عرفہ کے روز دیا ہے۔ یعنی خاص عرفات میں ہزاروں صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اپنی مبارک اونٹنی قصواء کی پشت کی بلندی سے جس پر سب کی نظریں پڑ رہی تھیں یہ ہدایت دی ہے کہ :

"میری عترت اور اولاد کا دامن تھامے رہوگے تو گمراہ ہو ہی نہیں سکتے"

سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۹) میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں :"

"رأیت رسول اللّٰہ صلی اللہ علیہ وسلم فی حجتہ یوم عرفۃ وھو علیٰ ناقتہ قصواء یخطب فسمعتہ یقول :	میں نے حجۃ الوداع میں عرفہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قصواء اونٹنی پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور میں نے (آپ کی زبانی) سنا ہے آپ یہ فرما رہے تھے :
یاایھاالناس انی ترکت فیکم ما ان اخذتم بہ لن تضلوا کتاب اللہ وعترتی اھل بیتی۔	لوگو! میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جارہا ہوں کہ اگر انہیں تھامے رہوگے تو گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ چیزیں ہیں کتاب الٰہی اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔

یہاں خود ہادیِ اعظم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمادیا کہ جن انسانوں کا دامن تھامنے سے تم لوگ گمراہ نہیں ہوسکتے وہ میری عترت ہے یعنی میری اولاد۔

غور کرو یہ کس سے ارشاد ہورہا ہے؟ حضرات صحابۂ کرام سے! اس سے اندازہ لگاؤ کہ عترت رسول کا درجہ کتنا بلند ہے؟ اور حضرات صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کو جب عترت پاک کا دامن تھامنے کی ہدایت فرمائی جارہی ہے، تو باقی لوگوں کو حصول ہدایت کے لئے عترتِ رسول کا دامن تھامنا کتنا ضروری اور ناگزیر ہے۔؟!

عترت رسول سے وابستہ رہنے کی ایک اور حدیث

ثقلین کی پہلی حدیث میں بار بار تاکید تھی کہ:

"میں تم لوگوں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرو!"

ایک حدیث میں اس کی بھی ہدایت ہے کہ میری عترت کو میری جگہ سمجھو۔ اس میں اشارہ ہے کہ میری عترت کے ساتھ جو بھی سلوک کروگے سمجھ لو کہ وہ سلوک میرے ساتھ کررہے ہو۔ مسند احمد اور معجم کبیر طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

انی تارك فیکم خلیفتین کتاب الله عزوجل حبل ممدود بین السماء والارض وعترتی اهل بیتی انهما لن یتفرقا حتی یردا علی الحوض۔	لاریب میں تم لوگوں کے پاس دو نائب و خلیفہ چھوڑے جارہا ہوں۔ ایک تو اللہ کی کتاب ہے جو آسمان و زمین کے درمیان (نور کی) ایک تنی ہوئی رسی ہے اور دوسرا نائب و خلیفہ میری عترت ہے جو میرے اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے۔ حتیٰ کہ حوض کوثر پر دونوں ایک ساتھ میرے پاس آئیں گے۔
(جامع صغیر ج ۱۔ ص ۵۷)	

مؤلف جامع صغیر حضرت امام سیوطی نے اس حدیث کو صحیح فرمایا ہے اور واقعی حدیث ثقلین کی طرح

یہ بھی بے غبار حدیث ہے اسے مفسر آلوسی نے بھی اپنی تفسیر روح المعانی جلد ۴ صفحہ ۱۸ میں نقل کیا ہے اور کوئی تنقید نہیں کی ہے۔

نوٹ : اس حدیث میں صراحت ہے کہ عترت رسول خلیفہ ہے (یعنی خلیفۂ حق دخلیفۂ رسول ہے اس خلافت سے کون سی خلافت مراد ہے۔

اس سے وہ خلافت مراد نہیں ہے جس کا ایک جزو حکمرانی و جہاں بانی بھی ہے کیوں کہ یہ خلافت تو تیس ہی سال تک رہیگی، جیسا کہ حدیث میں ہے کہ :

الخلافۃ فی امتی ثلاثون سنۃ — میری امت میں تیس سال تک خلافت[1] رہے گی۔

(ترمذی ج۲ - ص۴۵)

اور اہل بیت کی خلافت جس کا ذکر حدیث زیب عنوان میں ہے وہ اس وقت تک کے لئے ہے جب تک دنیا میں قرآن مجید رہے گا، کیوں کہ حدیث نے بتایا ہے کہ یہ خلفائے اہل بیت اور قرآن کبھی جدا نہ ہوں گے۔

جب حکمرانی اور جہاں بانی اس خلافت کا جزو نہیں تو اس کی نوعیت کیا ہے ؟

اس کی نوعیت یہ ہے کہ یہ تمام امور باطنی و روحانی کا مرکز اور سنٹر ہے۔ یعنی حدیث میں اہل بیت کو جو خلیفہ فرمایا گیا ہے تو خلیفہ سے مراد یہ ہے کہ یہ لوگ امور باطنی و روحانی کے بالفاظ دیگر ولایت کے مرکز ہیں یعنی روحانی عروج اور ولایت کا نظام تمام تران سے وابستہ ہے۔ اس حقیقت کو بعض اکابر مثلاً حضرت مجدد سرہندی اور حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی وغیرہ نے تفصیل سے بیان فرمایا ہے

---

[1] اس منصب خلافت پر حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہم علی الترتیب فائز ہوئے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق کا عہد خلافت ۲ سال ۳ ماہ ۹ روز ہے حضرت عمر کا ۱۰ سال ۶ ماہ ۵ روز حضرت عثمان کا ۱۲ روز کم ۱۲ سال حضرت علی کا ۴ سال ۹ ماہ اور حضرت امام حسن کا ۶ ماہ ۳ روز۔ اس حساب سے خلافت راشدہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شروع ہو کر امام حسن رضی اللہ عنہ کی چھ ماہ کی خلافت پر ختم ہو جاتی ہے۔ خلافت کی یہ پوری مدت تیس سال ہے۔ ۱۲ کوثر

تفسیر مظہری میں ہے :

• حدیث ثقلین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اہل بیت کرام ولایت کے قطب الارشاد ہیں پہلے قطب الارشاد علی علیہ السلام ہیں پھر آپ کے فرزندان فاطمی حسن عسکری تک قطب الارشاد ہوئے ہیں۔ آخر میں حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رضی اللہ عنہم قطب الارشاد ہوئے۔ نہ اگلوں میں کوئی ایسا ہوا نہ اس امت میں جو ان حضرات کے توسط کے بغیر درجۂ ولایت پر پہنچا ہو۔ مجدد رضی اللہ عنہ نے ایسا ہی کہا ہے۔"

یہ مضمون تفسیر مظہری جلد ۲ میں دو مقام پر ہے۔ صفحہ ۹۹ میں بھی ہے اور صفحہ ۱۴۱ میں بھی۔ ان کا عربی متن اوپر آچکا ہے۔ راقم السطور نے دونوں مقامات کی باتوں کو یہاں یکجا کر دیا ہے۔

ف : ائمۂ اہل بیت میں حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت امام حسن رضی اللہ عنہما کو وہ خلافت بھی حاصل ہے جس کا ایک جزو حکمرانی و جہان بانی بھی ہے۔ آخری زمانہ میں حضرت امام مہدی علیہ السلام اس خلافت کے منصب پر بھی فائز ہوں گے۔

کیا اہل بیت کا ہر فرد خلیفہ ہے ؟

نہیں، بلکہ وہی افراد خلیفہ ہیں (یعنی امور باطنی و روحانی کے ایسے مرکز وہی ہیں جن سے ولایت کا نظام وابستہ ہے) جو ہمیشہ قرآن کے ساتھ رہتے ہیں اور حقیقت کو خود حدیث نے بتایا ہے۔ الفاظ ملاحظہ ہوں :

انی تارك فیكم خلیفتین كتاب اللہ عزوجل حبل ممدود بین السماء والارض وعترتی اهل بیتی وانهما لن یفترقا حتی یردا علی الحوض ۔	لاریب میں تم لوگوں کے پاس دو نائب خلیفہ چھوڑے جا رہا ہوں، ایک تو اللہ کی کتاب ہے جو زمین و آسمان کے درمیان (نور کی) ایک تنی ہوئی رسی ہے اور دوسرا نائب و خلیفہ میری عترت ہے جو میرے اہل بیت ہیں۔ یہ دونوں ایک دوسرے سے کبھی جدا نہ ہوں گے حتی کہ

(الجامع الصغیر ج ۱ ص ۸۷)　　　　حوض کوثر پر دونوں ایک ساتھ میرے پاس آئیں گے۔

یہ حدیث کتنی وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ اہل بیت جو نائب و خلیفہ ہیں وہ ہمیشہ قرآن کے ساتھ رہتے ہیں، دنیا تو دنیا آخرت میں بھی یہ قرآن کے ساتھ ہی رہیں گے۔ اور قرآن کے ساتھ حوض کوثر پر جائیں گے۔

اس طرح قرآن مجید کے ساتھ رہنے کا لازمی مفہوم یہ ہے کہ ان کی زندگی قرآن حکیم کے سانچے میں ڈھلی ہے اس روشنی میں صاف نظر آتا ہے کہ وہی اہل بیت امور باطنی و روحانی میں خلیفۂ حق ہیں۔ اور انھیں سے ولایت کا نظام وابستہ ہے جن کی زندگی قرآن عزیز کے سانچے میں ڈھلی ہے۔

جو ایسے ایمان نواز، ایسے برگزیدہ صفات ایسے پاکیزہ نفس ایسے بلند پایہ قدوسی و روحانی ایسے مرکز انوار اور ایسے مربی اولیاء ہیں ان کے خلیفۂ حق اور نائب رسول ہونے میں کس کو کلام ہے؟!

تمام اہل بیت کرام میں یہ اعلیٰ صفات بہمہ وجوہ ائمۂ اہل بیت میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ حضرات خلیفۂ حق اور نائب رسول ہیں اور اسی بنا پر اکابر امت حضرت مجدد سرہندی وغیرہ نے فرمایا ہے کہ اگلی امتوں میں اور اس امت میں بھی جو درجۂ ولایت پر فائز ہوا ہے انھیں حضرات کے توسط سے فائز ہوا ہے۔

- چونکہ یہ حضرات حدیث پاک کی روشنی میں خلیفۂ حق اور نائب رسول ہیں اور خلیفۂ برحق کو امام کہنا بالکل صحیح ہے اس لئے ان کو امام کہنا ایک بے غبار حقیقت ہے۔ اور یقیناً یہ امام ہیں۔ اسی لئے اکابر اہلسنّت ان کو اب تک امام کہتے ہیں۔ ان کو امام کہنے کا مفہوم یہ ہے کہ یہ حضرات خلیفۂ حق ہیں، نائب رسول ہیں۔ ولایت کا تمام تر نظام ان سے وابستہ ہے۔ ان کو امام کہنا شیعہ مسلک کا اتباع قطعاً نہیں۔ بلکہ حدیث نبوی کا اتباع ہے۔ اسی لئے وہ اکابر اہلسنّت بھی ان بزرگوں کو امام کہتے ہیں جنہوں نے شیعہ مسلک کی تردید میں کتابیں لکھی ہیں۔ اور تشیع کے اثرات سے بچانے کیلئے بڑی قلمی جدوجہد فرمائی ہے۔ مثلاً مجدد سرہندی شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی وغیرہ بلکہ مولوی عبدالشکور صاحب پاٹانالہ لکھنؤ جو شیعوں کی تردید میں سب سے زیادہ سرگرم ہیں اور بہت سے سُنّی بزرگوں کو ان سے یہ شکایت ہے کہ یہ شیعہ کی ضد میں خارجیوں کی بولی بول جاتے ہیں۔ اور یہ شکایت بے جا بھی نہیں۔ غرض انہوں نے بھی امام حسن اور امام حسین کو امام لکھا ہے چنانچہ ترجمۂ ازالۃ الخفا صفحہ ۲۲۹ سطر ۲۳ میں لفظ

امام حسن لکھا ہے اور صفحہ ۲۳۰ سطر ۶ میں "شہادت حضرت امام حسین" کی عبارت لکھی ہے۔
اگر تفحص کیا جائے تو اور شواہد بھی مل سکتے ہیں۔

جو حضرات اپنے کو "قاسمی" لکھتے ہیں اور عام ائمۂ اہل بیت ہی کو نہیں بلکہ سیدنا امام حسین علیہ السلام کو بھی امام کہنے کے روادار نہیں بلکہ اسے سخت بُرا سمجھتے ہیں وہ اسے یاد رکھیں تو اچھا ہے۔ ان کے جلیل القدر مقتدا، فاضل اشرف علی۔ تھانوی نے بھی ان بزرگوں کو ائمۂ اہل بیت لکھا ہے۔ موصوف اپنے فتوی میں رقمطراز ہیں:

"ائمۂ اہل بیت علیہم السلام کا اکثر اہتمام افادات باطنی میں زاہد رہا۔ وھوالمفھوم مِن حدیث انی تارک ثقلین: کتاب اللہ وعترتی (فتاوی اشرفیہ ج ۴ ص ۱۳۴)

عترت رسول سے وابستہ رہنے کی ایک اور حدیث

عموماً بڑی شخصیتوں کے معتقدین ان کی زندگی میں ان کی اولاد کو بہت مانتے ہیں، لیکن ان کے پردہ کرنے کے بعد کچھ لوگوں کی نگاہیں بدل جاتی ہیں۔ اگر اولاد صحیح جانشین ہے تو اس کو نظرانداز کر دینا بڑی احسان فراموشی اور غداری ہے۔ یہ تو عام مقتداؤں کی اولاد کا معاملہ ہے اور ہادیٔ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اولاد جو رشد و ہدایت کا سرچشمہ ہے حتیٰ کہ جو شخص ان سے اور قرآن مجید سے وابستہ ہے وہ گمراہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اگر ان کو نظرانداز کر دیا جائے تو حضور انور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے کتنی بڑی غداری ہے؟ اور رشد و ہدایت سے کتنی بڑی محرومی ہے؟ کاش یزید اور یزیدی اس کو سمجھتے کہ آخر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کیوں بار بار اس کی ہدایت فرماتے ہیں کہ لوگو قرآن مجید اور میری عترت سے وابستہ رہو پھر گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔

ایک حدیث میں یہ بھی ہے کہ لوگو! اس پر بھی نظر رہے کہ میرے بعد قرآن مجید اور میری عترت کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے؟ حدیث کے الفاظ یہ ہیں:-

انی تارک فیکم ما ان تمسکتم　　　　میں تم لوگوں کے پاس ایسی دو چیزیں چھوڑے

بہ لن تضلوا بعدی احدھما	جا رہا ہوں کہ اگر ان کو تھامے رہو گے تو گمراہ
اعظم من الاخر	ہو ہی نہیں سکتے۔
کتاب اللہ حبل ممدود	ان میں ایک زیادہ عظیم الشان ہے وہ
من السماء الی الارض	ہے کتاب الٰہی جو آسمان سے زمین تک (نور کی)
وعترتی اھل بیتی، ولن	ایک تنی ہوئی رسی ہے۔
یتفرقا حتی یردا علی	اور دوسری چیز میری عترت ہے جو میرے
الحوض، فانظروا کیف	خصوصی اہل بیت ہیں۔
تخلفوا فی فیھما۔	یہ دونوں ساتھ رہیں گے۔ حتیٰ کہ دونوں
سنن ترمذی	ایک ساتھ حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے۔ لہٰذا اس پر
(ج ۲، ص ۲۲۰)	نظر رکھو کہ میری جگہ جب تم کو قرآن اور میری عترت کے ساتھ
	سلوک کرنا ہو تو کیسا سلوک کرو گے؟

یعنی قرآن مجید اور میری عترت کا بڑا لحاظ رکھنا ورنہ ہدایت سے محرومی ہے اسلام نے تو عترت طاہرہ کو اتنی اہمیت دی کہ اس سے آگے کچھ کہا نہیں جاسکتا۔ اور بتایا کہ اگر گمراہی سے بچنا ہے تو قرآن اور عترت رسول سے وابستہ ہو ان سے محبت رکھنے اور ان کے حقوق پورا کرنے پر بڑا زور دیا ہے اور ان کے ادب و احترام کو ملحوظ رکھنے کی تاکید پر تاکید فرمائی ہے۔ اب تم دیکھو ان کے ساتھ کیسا سلوک کرتے ہو۔

عترت رسول کے حقوق کیا ہیں

ان کا ادب و احترام کرو۔ ان سے ہدایت حاصل کرتے رہو۔ ان کے دامن سے وابستہ رہو، ان کی اطاعت اور فرماں برداری کرو، ان کو کسی قسم کی ایذا نہ دو۔ ان کے ساتھ اچھا سے اچھا سلوک کرو، جو شخص ان کے ساتھ ناروا یا ظالمانہ سلوک کرے گا حدیث کا اعلان ہے کہ اس پر اللہ اور رسول کی لعنت ہے۔

حدیث کا اعلان ہے کہ عترت رسول کے ساتھ ناروا سلوک کرنیوالا ملعون ہے: امام طحاوی

مشکل الآثار میں اور بتصریح مشکوٰۃ امام بیہقی مدخل میں اور محدث رزین اپنی کتاب تجرید الصحاح میں ام المومنین حضرت عائشہ طیبہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ستة لعنتهم ولعنهم الله	چھ قسم کے لوگ ایسے ہیں جن پر میں نے لعنت بھیجی
وکل نبی مجاب	ہے اور اللہ نے بھی لعنت کی ہے اور ہر نبی کی دعا و
الزائد فی کتاب الله	بددعا قبول ہے وہ لوگ یہ ہیں:-
والمکذب بقدر الله	(۱) اللہ کی کتاب میں کچھ بڑھانے والا۔
والمتسلط بالجبروت	(۲) تقدیر کا منکر ۔
لیعز من اذله الله	(۳) وہ شخص جس نے (لوگوں کو) دبا کر تسلط حاصل
ویذل من اعزه الله	کیا ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جن لوگوں کو اللہ نے (ان کے کفر
والمستحل لحرام الله	یا فسق کی وجہ سے) ذلت کے درجہ میں رکھا ہے وہ ان
والمستحل من عترتی	کو عزت سے نوازے گا۔ اور جن لوگوں کو عزت کے درجہ پر
ما حرم الله والتارک	رکھا ان کو ذلیل کرے گا۔
لسنتی ۔	(۴) اور وہ شخص جو حرم الٰہی (کعبہ) کی بے حرمتی کرے ۔
(مشکوٰۃ ص ۲۲)	(۵) اور وہ شخص جو میری عترت کے ساتھ ایسا سلوک
	کرے جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے ۔
	(۶) اور میری سنت کا تارک

اس حدیث میں اعلان ہے کہ جو شخص عترت رسول کے ساتھ ناروا سلوک کرے گا اس پر اللہ اور رسول کی لعنت ہے۔ اس قسم کے متعدد نصوص کی بنا پر بہت سے علمائے ربانی نے صاف لفظوں میں یزید پر لعنت بھیجی ہے۔

عترت رسول کے ساتھ ناروا سلوک کون سی باتیں ہیں: ایسی متعدد باتیں ہیں

اور سب حرام ہیں ۔ مثلاً (۱) ان کو ایذا دینا حرام (۲) ان کے ادب و احترام کو ملحوظ نہ رکھنا حرام (۳) ان کے حقوق کی ادائیگی میں کوتاہی کرنا حرام ۔ تفصیل حسب ذیل ہے:۔

عترت رسول کو ایذا دینا حرام ہے

کیوں کہ ان کو ایذا دینا خود رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دینا ہے۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

۱۔ مسند احمد، تاریخ کبیر امام بخاری، اور مستدرک حاکم میں حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

من اٰذی علیاً فقد اٰذانی [۱]	جس نے علی کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی۔

۲۔ حضرت امام حسن علیہ السلام کی فضیلت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

من اٰذی ھذا فقد اٰذانی	جس نے ان کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی اور
و من اٰذانی فقد آذی اللہ	جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ کو ایذا دی۔

(کنز العمال تقطیع کلاں (جلد ۶ ص ۲۲۲ بحوالہ طبرانی عن انس رضؓ)

۳۔ امام حسین علیہ السلام کی ایذا سے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتنی ایذا پہنچی ہے اس کا اندازہ ذیل کی حدیثوں سے لگاؤ۔

(۱) مسند احمد، مصنف عبد الرزاق، طبقات ابن سعد، معجم کبیر طبرانی میں حضرت علی سے مروی ہے نیز معجم کبیر طبرانی میں حضرت ابو امامہ اور حضرت انس سے مروی ہے اور طبقات ابن سعد و معجم کبیر طبرانی میں ام المومنین حضرت عائشہ سے روایت ہے، ابن عساکر میں ام المومنین حضرت ام سلمہ سے مصنف عبد الرزاق میں ام المومنین حضرت زینب سے ابن عساکر میں ام الفضل والدۂ ماجدہ حضرت ابن عباس سے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

قام عندی جبریل من قبل	جبریل نے میرے پاس کھڑے ہو کر کہا کہ حسین کو نہر
فحدثنی ان الحسین یقتل	فرات پر قتل کیا جائے گا، اور یہ بھی کہا، کیا آپ
بشط الفرات، وقال	وہاں کی خاک سونگھنا چاہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا

---

[۱] کنز العمال تقطیع کلاں ج ۶ ص ۱۵۲ ۔

هل لك ان اشمك من تربته؟ قلت نعم فمد يده فقبض قبضة من تراب فاعطانيها فلم املك عيني ان فاضتا ـ	ہاں اس پر جبریل نے ہاتھ بڑھا کر ایک مٹھی خاک اٹھائی اور مجھے دی۔ اس پر میں اتنا بیتاب ہوا کہ[1] آنکھوں پر قابو نہ رہا۔ آخر آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

(ب) طبقات ابن سعد میں ام المومنین حضرت عائشہ طیبہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :ـ

ان جبريل ارانی التربة التی يقتل عليها الحسين، فاشتد غضب الله علی من يسفك دمه فيا عائشة والذی نفسی بيده انه ليحزننی فمن هذا من امتی يقتل حسينا من بعدی ـ	جس خاک پر حسین کو قتل کیا جائے گا وہ مجھے جبریل نے دکھا دی ہے، جو شخص حسین کا خون بہائے گا اس پر اللہ کا شدید غضب ہوگا۔ اے عائشہ اس کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ قتل حسین سے مجھے بہت غم و اندوہ ہوگا۔ میری امت میں وہ کون شخص ہوگا جو میرے بعد حسین کو قتل کرے گا۔

(کنز العمال تقطیع کلاں ج ۶ ص ۲۲۳)

(ج) مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۷۲ میں دلائل النبوۃ بیہقی کے حوالے سے ہے کہ :ـ

حضرت ام الفضل رضی اللہ عنہا (جو حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی زوجہ تھیں) رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حاضر ہو کر کہتی ہیں: یا رسول اللہ میں نے رات کو بڑا ناگوار خواب دیکھا ہے۔ آپ نے فرمایا وہ کیا؟ وہ کہتی ہیں "بڑا ہی ناگوار" آپ نے فرمایا وہ ہے کیا؟ انہوں نے کہا کہ "میں نے ایسا دیکھا ہے کہ آپ کے

---

[1] یہ خط کشیدہ عبارت اس جملہ مقدرہ کا ترجمہ ہے جس کی طرف "فلم املك" کی فائے فصیحہ اشارہ کرتی ہے۔ ۱۲ کوثر

بدن کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا گیا [۱]"

آپ نے فرمایا "تم نے بڑا ہی اچھا خواب دیکھا ہے۔ انشاءاللہ فاطمہ کو لڑکا پیدا ہوگا اور تمھاری گود میں رکھا جائے گا" [۲]

(حضرت ام الفضل کا بیان ہے کہ) "پھر حسین پیدا ہوئے اور میری گود میں انہیں رکھا گیا، جیسا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا"

(ایک دن کی بات ہے کہ) میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئی اور آپ کی گود میں حسین کو دیدیا۔ پھر آپ کو دیکھا تو آپ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ میں نے گذارش کی یا رسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان آپ کو کیا صدمہ ہے؟

آپ نے فرمایا میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور یہ خبر دی کہ میرے اس بیٹے کو میری امت قتل کرے گی۔ حضرت ام فضل نے حسین کی طرف اشارہ کر کے کہا: "اس کو؟"۔

آپ نے فرمایا ہاں، اور جبریل نے حسین (کی قتل گاہ) کی سرخ مٹی بھی مجھے دی ہے"۔

ف : اس حدیث سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوتی ہیں :

۱۔ عالم غیب میں دکھایا گیا ہے کہ امام حسین علیہ السلام حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسم اقدس کا ایک ٹکڑا ہیں، یہ امام حسین علیہ السلام کی کتنی بڑی فضیلت ہے؛ اور جب حضرت امام حضور کے بدن کا ایک ٹکڑا ہیں تو صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ آپ کو ایذا دینا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا ہے، جو کچھ آپ کے ساتھ کیا گیا گویا وہ حضور کے ساتھ کیا گیا۔

۲۔ حضرت امام حسین علیہ السلام کی خبر شہادت سننے ہی سے آپ کو اتنا صدمہ ہوا کہ آنکھیں اشکبار ہو گئیں پھر میدان کربلا میں جو کچھ ہوا اس سے آپ کو کتنا عظیم غم واندوہ ہوا ہوگا؛ کیا اس کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا ہے؟

---

[۱] متن یہ ہے: رأیت کان قطعة من جسدك قطعت ووضعت فی حجری - ۱۲ کوثر

[۲] متن یہ ہے: رأیت خیرا تلد فاطمة ان شاءاللہ غلاما یکون فی حجرك ۱۲ کوثر

۴ — امام حسین علیہ السلام کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا بیٹا فرمایا ہے۔ آپ کو فرزند رسول کہنا اس حدیث پر اور اس قسم کی متعدد حدیثوں پر عمل ہے، اور حدیث پر عمل بڑے ہی ثواب کا کام ہے۔

(۵) مشکوٰۃ شریف صفحہ ۵۷۲ میں مسند احمد اور دلائل النبوۃ بیہقی کے حوالہ سے ہے کہ :-

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں میں نے ایک روز دوپہر کو خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس عالم میں دیکھا کہ بال بکھرے ہیں، دیو دپاک پر غبار پڑے ہیں اور آپ کے دست مبارک میں ایک شیشی ہے، جس میں خون ہے، میں نے عرض کی :

"یارسول اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان یہ کیا ہے ؟"

آپ نے فرمایا: "یہ حسین اور ان کے ساتھیوں کا خون ہے جسے میں آج اب تک اٹھاتا رہا"۔

حضرت ابن عباس کا بیان ہے کہ "میں نے اس وقت (اور تاریخ) کو یاد کر لیا پھر معلوم ہوا کہ اسی وقت (اور تاریخ میں) حسین کو قتل کیا گیا۔ [1]

نوٹ : اس روایت سے اندازہ لگاؤ کہ ظالموں نے امام حسین علیہ السلام کو جو شہید کیا ہے اس سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنی ایذا پہنچی ہے ؟ اور کتنا شدید صدمہ اور رنج والندوہ ہوا ہے ؟!

- اوپر ایک حدیث اس مضمون کی گذری ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے :

"جس نے علی کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی "۔

- ایک حدیث اس مضمون کی بھی گذری ہے :

"جس نے حسن کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی "۔

---

[1] اس روایت کا متن یہ ہے : عن ابن عباس انہٗ قال: رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یری النائم ذات یوم بنصف النہار اشعث اغبر بیدہٖ قارورۃ فیہا دم فقلت بابی انت وامی ما ھذا ؟ یا رسول اللہ فقال: "ھذا دم الحسین واصحابہٖ و ما زال التقطہٗ منذ الیوم" فاحصی ذالک الوقت، فاجد قتل ذالک الوقت۔ ۱۲ کوثر

- اور تین حدیثیں اس مضمون کی پیش کی گئی ہیں کہ :

" امام حسین علیہ السلام کو ایذا پہونچانے اور ان کو قتل کرنے سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو بے حد اذیت پہنچی ہے "

اب یہ سمجھنے کی بات ہے کہ جب حضرت علی، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو ایذا دینا خود حضور محبوب خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایذا دینا ہے تو اس کا انجام کیا ہے ؟

ہر باخبر مسلمان جانتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایذا دینا سو لعنت کی ایک لعنت ہے۔

قرآن مجید صاف الفاظ میں بیان فرماتا ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ	جو لوگ اللہ اور رسول کو ایذا دیتے ہیں
لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَ	یقیناً اللہ نے ان پر دنیا میں بھی لعنت کی
اَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِیْنًا ۝	ہے۔ آخرت میں بھی اور ان کے لئے بڑا ذلیل
(احزاب پ ۲۲ ع ۲۳)	کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

اس آیت کریمہ نے فیصلہ فرما دیا کہ :-

جن لوگوں نے حبیب خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایذا پہونچائی ہے ان پر

- دنیا میں بھی لعنت !
- آخرت میں بھی لعنت !
- اور ان کے لئے بڑا ذلیل کرنیوالا عذاب ہے !

اس آیت کریمہ کے رو سے جن ظالموں نے سیدنا امام حسین علیہ السلام کو قتل کیا یا قتل کرایا مثلاً شمر، ابن سنان، خولی، ابن سعد، ابن زیاد اور یزید

- ان پر دنیا میں بھی لعنت !
- آخرت میں بھی لعنت !
- اور ان کیلئے بڑا ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔

اسی لئے بے شمار علماء اور اولیاء اللہ نے ان سبھوں پر لعنت کی ہے۔ مزید تفصیل انشاء اللہ مناقب حسین کے باب میں آئے گی۔

عترت رسول کا احترام و توقیر واجب ہے اور توقیر و احترام نہ کرنا حرام ہے

اوپر اس مضمون کی حدیث گذر چکی ہے کہ عترت رسول کے ساتھ نار واسلوک کرنا حرام ہے اور جو شخص ان کے ساتھ نار واسلوک کریگا اس پر اللہ اور رسول کی لعنت ہے اور وہاں یہ بھی بتایا جا چکا ہے کہ ان کے ساتھ نار واسلوک اس قسم کی باتیں ہیں:

(۱) ان کو ایذا دینا (۲) ان کا ادب و احترام ملحوظ نہ رکھنا (۳) ان کے حقوق کی ادائگی میں کوتاہی کرنا، جو شخص ان میں سے کسی حرکت کا ارتکاب کریگا وہ ملعون ہے۔

گذشتہ صفحات میں اس کی تفصیل تھی کہ: عترت رسول کو ایذا دینا حرام ہے۔ اس فصل میں اس کا بیان ہے کہ عترت رسول کا احترام و توقیر واجب ہے اور ان کا احترام و توقیر نہ کرنا حرام ہے۔

اوپر صحیح مسلم کی روایت سے جو حدیث ثقلین لکھی جا چکی ہے اس کے آخر میں ہے۔

اذکرکم اللہ فی اھل بیتی — میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق میں اللہ
اذکرکم اللہ فی اھل بیتی — سے ڈرو۔ میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے حق
اذکرکم اللہ فی اھل بیتی — میں اللہ سے ڈرو۔ میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت
(صحیح مسلم ج۲ ص ۲۷۹) — کے حق میں اللہ سے ڈرو۔

تاکید پر تاکید ہے اور تین بار تنبیہ فرمائی گئی ہے "میرے اہل بیت کے حق میں اللہ سے ڈرو"۔ تعلیم میں بڑی عمومیت ہے، اس میں یہ سب باتیں آجاتی ہیں۔

۱۔ میرے اہل بیت سے محبت رکھو بغض و نفرت نہ کرنا۔ اس میں اللہ سے ڈرو کہ عذاب میں نہ پڑ جاؤ۔

۲۔ ان کو ایذا نہ دو اس میں بھی اللہ سے ڈرو ورنہ عذاب میں پڑ جاؤگے۔

۳۔ ان کا ادب و احترام کرو۔ گستاخی اور شوخ چشمی نہ کرنا۔ اس میں بھی اللہ سے ڈرو ورنہ عذاب ہے۔

۴۔ ان کے اور تمام حقوق کا بھی لحاظ کرو۔ ان کی ادائیگی سے باز نہ رہنا اس باب میں بھی اللہ سے ڈرو

ورنہ عذاب الٰہی میں مبتلا ہو جاؤ گے۔

اس کی تائید میں متعدد حدیثیں ہیں۔ معجم کبیر طبرانی میں حضرت ابن عباس سے روایت ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کے بارے میں فرمایا ہے:۔

انهم عترتی خلقوا من طینتی	یہ لوگ میری عترت ہیں، یہ میری طینت سے پیدا ہوئے
ورزقوا فهمی وعلمی، فویل	ہیں۔ انہیں میری سمجھ اور میرے علم کا حصہ ملا ہے
للمکذبین بفضلهم من امتی	میرے اس امتی کے لئے ویل اور تباہی ہے جو ان کی
القاطعین فیهم صلتی لا انال	فضیلت کا منکر ہے اور مجھ سے ان کا جو تعلق ہے اسے
الله شفاعتهم ۔	وہ کاٹنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو میری شفاعت
(کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۸)	عطا نہ فرمائے گا۔

اس حدیث سے حسب ذیل باتیں معلوم ہوئیں:۔

۱۔ اہل بیت اطہار حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طینت اور خمیر اطہر سے پیدا ہوئے ہیں اس مضمون کی ایک اور حدیث آگے لکھی جا چکی ہے۔

۲۔ اہل بیت اطہار کو فہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حصہ ملا ہے۔ یہ وہ فہم ہے جو عقل مزکّی میں ودیعت ہے یعنی اس عقل میں جو باطل اور غلط تصورات وخیالات سے پاک ہے اور اس پر شہود الٰہی کا تسلط ہے۔ یہ فہم غذا کے جوہر سے نہیں بلکہ نور الٰہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے حاملین اعلیٰ درجہ کے صدیقین ہیں جنہیں مفہمین کہتے ہیں۔ ان کی فہم تمام تر نورانی ہے اور فراست سے آگے ہے، حالاں کہ فراست بھی نور ہی سے پیدا ہوتی ہے جس کی بنا پر ظاہر نظر سے باطن کا علم ہو جاتا ہے۔

حدیث میں ہے:

اتقوا فراسة المؤمن فانه ینظر	مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ کے نور سے
بنور الله (الجامع الصغیر ص)	دیکھتا ہے۔

فراست شے کے دیکھنے سے پیدا ہوتی ہے اور فہم نورانی اس پر منحصر نہیں بلکہ چیز کے بلا دیکھے بھی ہوتی ہے

فہم نورانی میں الہام اور ادراک معانی کا امتزاج ہوتا ہے۔

مفہمین کے سرخیل امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں۔ اسی لیے اکابر صحابہ غوامض حقائق اور اسرار و رموز کے باب میں آپ کی طرف رجوع کرتے تھے۔ آپ نے بعض مواقع پر اس کا اظہار بھی فرمایا ہے کہ اللہ نے انہیں اس فہم سے نوازا ہے حضرت ابو جحیفہ صحابی نے حضرت علی سے ایک روز پوچھا: "کیا آپ کے پاس کوئی کتاب ہے!" آپ نے فرمایا:۔

لا الا کتاب اللہ او فہم اعطیہ رجل مسلم او مافی ھذہ الصحیفۃ	نہیں، لیکن قرآن البتہ ہے اور وہ فہم بھی ہے جو کسی مسلم کو دی گئی ہو۔ اور اس صحیفہ میں جو کچھ ہے وہی میرے پاس ہے)
(صحیح بخاری ج ۱ ص ۲۱)	

اس فہم کی تشریح مرقات شرح مشکوٰۃ میں اس طرح کی گئی ہے :۔

المراد منہ مایستنبط بہ المعانی و یدرک بہ الاشارات والعلوم الخفیۃ	اس سے وہ سمجھ مراد ہے جس سے کہ بدولت معانی کا استنباط اور اشارات و مخفی علوم کا ادراک ہوتا ہے۔
(حاشیہ مشکوٰۃ صنہ۳)	

حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ کی تشریح زیادہ مفصل ہے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں:۔

استنباط کنند بداں معنی و ادراک کنند بداں اشارات و علوم پنہانی و اسرار باطنہ راکہ ظاہر می گردد، علمائے راسخین راو منکشف می گردد مر عارفاں ارباب یقین را (اشعۃ اللمعات ج ۳ ص ۲۲۱)	یہ وہ فہم ہے جس کی بدولت معانی کا استنباط کرتے ہیں، اور ان اشارات و مخفی علوم اور باطنی اسرار کا ادراک ہوتا ہے جو صرف علمائے راسخین[۱] ہی پر ظاہر ہوتے ہیں اور عارفان ارباب یقین ہی پر ان کا انکشاف ہوتا ہے۔

---

[۱] علمائے راسخین وہ علماء ہیں جن کے علم میں بڑی استواری ہے۔ حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری ج ۲ ص ۱۰۱ ==

۳۔ اس فصل کے شروع میں عترت طاہرہ کے فضائل کی جو حدیث لکھی گئی ہے، اس کے دو الفاظ آپ نے پڑھ لئے۔ ان کے علاوہ اس حدیث میں یہ تصریح بھی ہے کہ عترت طاہرہ کو آں حضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے علم کا بھی حصہ ملا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے "رزقوا فہمی وعلمی" ان کو میری فہم اور میرا علم ملا ہے۔ یعنی یہ لوگ علم محمدی کے وارث ہیں۔ علم محمدی ایک بحر محیط ہے جس کی وسعت اور انواع و اقسام علم انسانی کے حدود سے کہیں آگے ہیں یہ علم قرآن و حدیث کے ظاہری علوم کے علاوہ ان کے باطنی علوم کا بھی مجموعہ ہے اور ان کے محتویات و اشارات ان کے پردہ در پردہ رموز و اسرار و حقائق کونیہ والٰہیہ کے نکات و غوامض کا بھی جامع ہے۔ حدیث کے بیان کے مطابق عترت طاہرہ ان علوم کی وارث ہے اس سے ان کے علوم کی ہمہ گیری کا کچھ اندازہ لگتا ہے۔ ان علوم نبوت کی چند قسموں کا بیان حاشیہ میں درج ہے۔ [1]

= یوں لکھتے ہیں :۔

صوفیہ علیہ کا قول ہے کہ علمائے راسخین وہ علما ہیں جو فنائے قلب فنائے نفس اور فنائے عناصر کی بدولت خواہشات نفس (کی گرفت) سے نکل کر تجلیات ذاتی کی تفویض میں آگئے ہیں۔ انھیں کوئی شک و شبہ پیش نہیں آتا۔ ان کی زبان پر یہ ترانہ ہوتا ہے

لوکشف الغطاء لما ازددت یقینا ۔ یعنی پردہ اٹھا بھی دیا جائے جب بھی میرے یقین میں اضافہ نہ ہوگا۔

راقم السطور کہتا ہے یہ قول حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کا ہے حدیث میں راسخین فی العلم کی تشریح یہ ہے۔

من برت یمینہ وصدق لسانہ واستقام	جس کی قسم پوری ہو کے رہتی ہے اور اس کا دل
قلبہ، ومن عف بطنہ وفرجہ	سیدھا ہے اور اس کا شکم اور عضو تولید حرام
فذالك من الراسخین فی العلم	سے پاک ہیں وہی راسخ فی العلم ہے۔

(الدر المنثور بحوالہ ابن جریر وابن ابی حاتم وطبرانی)

[1] وہ یہ ہیں: ۱۔ مامورات ومنہیات کا علم۔ اس میں پورا علم عقائد و فقہ ہے اسے علم مفترض بھی کہتے ہیں، لیکن فقہ کے بہت سے مسائل ہیں جن کا علم ہر شخص کے لئے ضروری نہیں۔

۲۔ علم وراثت : یہ علم دراست پر عمل کرنے کا ثمرہ ہے۔ علم دراست وہ علم ہے جو درس و تعلیم سے حاصل ہوتا ہے اور =

۴۔ حدیث عترت میں اسکی بھی صراحت ہے کہ جو شخص ان کی فضیلت کا منکر ہے اس کے لئے ویل ہے۔ ویل کے معنی تباہی کے ہیں۔ اور ویل جہنم میں ایک وادی ہے وہ اتنی عمیق ہے کہ کافر جب اس میں ڈالا جائیگا تو وہ چالیس سال تک گرتا چلا جائیگا، جب بھی اس کی گہرائی کی حد تک نہ پہونچ سکے گا جیسا کہ سنن ترمذی میں ہے اور معجم کبیر طبرانی کی ایک حدیث سے ظاہر ہے کہ اس میں کافر ہی نہیں بلکہ منافقین بھی ڈالے جائیں گے اس سے نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عترت طاہرہ کی فضیلت کے منکرین کے لئے جب ویل ہے تو اگر وہ کافر نہیں تو منافق ضرور ہیں کیونکہ ویل انہیں کے لئے ہے جو کافر یا منافق ہوں۔ اس حقیقت کو یوں بھی سمجھ سکتے ہو کہ جب

= انسان جب اس کے احکام پر عمل کرتا ہے اور عمل میں راسخ ہو جاتا ہے تو وہ علم منکشف ہونے لگتا ہے، جو درس و تعلیم سے حاصل نہیں ہوتا، اسی کا نام علم وراثت ہے یہ نام اس حدیث سے ماخوذ ہے۔

من عمل بما علم ورثه الله — جو شخص ان باتوں پر عمل کریگا جن کا اسے علم ہو گیا اللہ

علم مالم یعلم — اسے اس علم کا وارث بنائے گا جس کا اسے علم نہ تھا۔

ج۔ علم قیام: یا علم مراقبہ، اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے تمام ظاہری اور باطنی حرکات و سکنات میں اپنے اوپر اللہ کو نگراں اور مطلع جانتے رہو۔ یہ اصطلاح اس آیت سے ماخوذ ہے:

اَفَمَنْ هُوَ قَائِمٌ عَلٰى كُلِّ نَفْسٍ بِمَا — جو (خدائے برحق) ہر متنفس کے اعمال کا نگراں ہے

كَسَبَتْ ج (الرعد پ۱۳ ع ۱۱) — کیا وہ (بتوں) کی طرح بے علم و بے خبر ہو سکتا ہے؟

اس علم کے حصول کی علامت یہ ہے کہ اپنے ظاہر و باطن کو اطاعت خدا و رسول سے ہمیشہ آراستہ رکھو اور ہمیشہ یہ سمجھتے رہو کہ اللہ تعالیٰ ہمارے ظاہر و باطن کے حالات اور حرکات و سکنات کو دیکھ رہا ہے اس کی نگرانی کی آنکھوں سے کوئی چیز مخفی نہیں جس شخص میں یہ بات پیدا ہو گئی اسے تصوف، احسان کے تمام مقامات و احوال حاصل ہو جائیں گے اور اللہ کی نگرانی کا یہ تصور اور اس کی عظمت و جلال کا یہ شعور تمام حالات و واقعات میں اس کا رہبر و ادب آموز رہے گا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:-

ادبنی ربی فاحسن تادیبی — میرا رب میرا ادب آموز ہے اور اس نے میری =

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بکثرت حدیثوں میں عترت طاہرہ کے فضائل بیان کئے ہیں تو مومن دل و جان سے ملنے گا۔ اور جو نہ مانے گیا وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منکر نہیں ؟ ایسا شخص منافق نہیں تو کیا ہے ؟

(الجامع الصغیر ج ۱ ص ۱۷ صحیح) ادب آموزی بہترین طور پر فرمائی ہے۔

اس میں اسی شہود حق اور نگرانی الٰہی کے ذریعہ تربیت ربانی کا بیان ہے۔

حضرت سہل بن عبداللہ تستری اپنے مریدوں کو نصیحت فرمایا کرتے تھے کہ :

"چار چیزوں سے خالی نہ رہنا۔ ایک علم قیام۔ یعنی ہر حال میں اللہ کو اپنے اوپر مطلع اور نگران جانتے رہنا۔ دوسرے دوام عبودیت سے، یعنی ہمیشہ اللہ کی عبودیت میں لگے رہنا۔ تیسرے ان دو باتوں کی توفیق کے لئے اللہ سے ہمیشہ دعا مانگتے رہنا۔ چوتھے ان تینوں باتوں پر زندگی کے آخری لمحہ تک قائم رہنا"

آپ ہی کا ارشاد ہے کہ : جب تک علائق و تعلقات میں دل اسیر ہے اور جب تک خواہشات نفس کی تعمیل ہوتی رہے گی اور جب تک صحبت اغیار میں پھنسے رہوگے اس وقت تک علم قیام حاصل نہیں ہو سکتا۔

۴۔ **علم حال :** اس سے مراد یہ ہے کہ قلب اور سر[۱] کا ہر وقت ملاحظہ و مطالعہ کیا جائے کہ اس وقت اللہ اور بندے کے درمیان کون سی صورت حال ہے ؟ اور جو حال در پیش ہے وہ اس نوع کے حال کے لحاظ سے کمی کے درجہ پر ہے یا زیادتی کے ؟ نیز کمزور ہے یا قوی ؟ تاکہ اس کے لحاظ سے وہ کام کیا جائے جس سے رضائے الٰہی حاصل ہو، ہر حال کے مقتضیات اور افعال و آداب الگ ہیں۔ مثلاً فیصلۂ الٰہی پر رضا کا عالم طاری ہو تو اس کا مقتضی اور آداب یہ ہیں کہ دل پر سکون رہے کسی قسم کا اضطراب نہ پیدا ہو۔

---

[۱] قلب کا ایک رخ بدن اور اعضا کی طرف مائل ہے اور ایک رخ عالم تجرد کی طرف، اول کو قلب کہتے ہیں اور ثانی کو روح ۔ اسی طرح عقل کا ایک رخ بدن اور حواس کی طرف مائل ہے اور ایک رخ عالم تجرد کی طرف۔ اول کو عقل کہتے ہیں اور ثانی کو سر، قلب کی صفت شوق بے تاب اور وجد ہے۔ روح کی صفت انس اور انجذاب ہے۔ عقل کی صفت ان باتوں کا یقین ہے جن کا آخذ علوم عادیہ سے قریب ہے مثلاً ایمان بالغیب اور توحید افعالی۔ اور سر کی صفت ان باتوں کا شہود ہے جو علوم عادیہ سے بالاتر ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ ج ۲ ص ۹۰)

اہل بیت کی تکریم و تعظیم کرنیوالے کے لئے اللہ کی طرف سے اعزاز

اہل بیت کی تکریم و تعظیم پر اللہ تعالیٰ بڑا اعزاز عطا فرماتا ہے معجم کبیر طبرانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے :

اَللّٰھُمَّ اکرم من اکرم علیا (کنوز رماری ص ۱۵۷) یا اللہ جو علی کا احترام کرے تو اس کو محترم بنا دے۔

= معنٔے کشادہ باید و پیشانی فراغ آنجا کہ لطمہائے ید اللہ می زنند

اور جب اس اطمینان و سکون میں ترقی ہو تو شکر الٰہی بجالاؤ تاکہ مزید ترقی ہو اور نفس میں غرور و استغنا نہ آجائے اور جب اس حالت میں کمی اور تنزل ہو تو اللہ سے مدد مانگو۔ اور استغاثہ کرو۔ اگر اس حال پر رضا ہے جو اللہ کے نزدیک بہتر ہے تو اس کے آداب یہ ہیں۔ رضا پر خوش رہو۔ اور اگر اس حال پر رضا ہو جو اللہ کے نزدیک مذموم ہے تو اس کے آداب یہ ہیں کہ اس رضا پر رنج و غم ہونا چاہئے۔ اور اللہ سے استغفار اور استغاثہ کرنا چاہئے۔

غرض اس قسم کے امور کے علم کو علم حال کہتے ہیں جو شخص اس سے غافل ہے وہ شیطان کے جال سے نہیں نکل سکتا۔

سب سے بہتر حال یہ ہے کہ رضا و تسلیم کے سانچے میں ڈھل جاؤ اور اس آیت کے محور پر پوری زندگی گردش کرتی رہے۔

وَاُفَوِّضُ اَمْرِیْٓ اِلَی اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ میں اپنا کام اور معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں۔

بَصِیْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝ (المومن پ ۲۴ ع ۱۰) یقیناً اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔

تسلیم و رضا یہ ہے کہ تصرفات الٰہی تمہارے ساتھ جو معاملہ کریں اس پر سر جھکا دو اور خوش رہو۔

۵۔ **علم ضرورت** :۔ اس سے مراد یہ ہے کہ نظر رکھو کہ کون سے حرکات و سکنات اور اقوال و افعال نفس کے لئے ضروری ہیں۔ اور اس کے حقوق میں داخل ہیں۔ ان سے نفس کو روکنا نہیں چاہئے۔ اور جو اس کے حقوق میں داخل نہیں ہیں ان سے روکنا چاہئے۔

نفس کے حقوق وہ امور ہیں جن سے نفس کو روکنے میں دینی یا دنیوی خلل پیدا ہو جائے گا۔ مثلاً خلل دماغ، سقم مزاج، ضعف عقل اور فتور عبادت وغیرہ۔

۶۔ **علم توسیع** : نفس جب مطمئنہ اور صحیح معنی میں مسلم ہو جاتا ہے یعنی شہوات کے پیچھے چلنے کے بجائے اللہ اور رسول =

اس مضمون پر شفائے قاضی عیاض (ج ۲ ص ۲-۴۷۸) میں ایک حدیث ہے جو بہت اہم ہے' الفاظ یہ ہیں :۔

معرفۃ آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم	آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم (کے مقام) کا عرفان حاصل
براءۃ من النار وحب آل محمد	کرنا جہنم سے نجات ہے اور آل محمد سے محبت رکھنا
جواز علی الصراط والولایۃ	پل صراط سے پار ہو جانا ہے اور آل محمد کی نصرت وحمایت
لآل محمد امان من العذاب	کرنا عذاب سے امان پانا ہے۔

= کی اطاعت محور عمل بن جاتی ہے۔ اور اسی محور پر زندگی کے تمام اعمال گردش کرنے لگتے ہیں اور احکام الٰہی کی تعمیل ہی میں زندگی کے لمحات بسر ہوتے ہیں، تو نفس کے بعض حظوظ یعنی لطف ولذت اور راحت وآسائش (نفس کے حقوق بن جاتے ہیں، جن کے حاصل کرنے میں نفس کو کوئی فکر نہیں ہوتی گا۔ لہٰذا ان کے حاصل کرنے اور ان سے مستفید ہونے کا دائرہ جو پہلے بے حد تنگ تھا اب اس میں وسعت دی جاتی ہے۔ ملحوظ رہے کہ یہ مقام فنائے قلب اور فنائے نفس کے بعد ہی نصیب ہوتا ہے۔ اس مقام کے جاننے کو علم توسیع کہتے ہیں۔

یہ علم بے حد دقیق ہے۔ اور یہ مقام نہایت نازک ہے اس راہ میں قدم ہر شخص نہیں اٹھا سکتا کہ پھسل جانے اور گر جانے کا بہت قوی اندیشہ ہے۔ ہزاروں سالکین طریقت اس راہ میں پھسل کر گرے ہیں کہ وہ مقام توسیع کے اہل نہ تھے اور اپنے کو اہل سمجھ لیا اور حظوظ نفس کو سمجھا کہ اب یہ ہمارے لئے نفس کے حقوق ہیں۔ اور ان کا دائرہ بلا وسیع کر دیا اور ان سے لطف زندگی حاصل کرنے لگے۔ اور یہاں آ کر شیطان کا شکار بن گئے۔ پھر یہ عالم ہو گیا کہ جب تقوی کی راہ میں نہ تھے اس وقت سے بھی گر گئے۔ حتیٰ کہ ان کی وہ سابق حالت موجودہ حالت سے بدرجہا بہتر تھی۔ اس قسم کی گراوٹ سے بچنے کے لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ عطا کی ہوئی دعا ہمیشہ پڑھتے رہیں :

اعوذ باللہ من الحور بعد الکور	بن جانے کے بعد بگڑ جانے سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں۔

مقام توسیع میں آنے کا حق اسی کو ہے جو فانی فی اللہ اور باقی باللہ ہے، کہ ایسا شخص اپنی خواہش اور ارادہ سے اس مقام میں نہیں آتا۔ اسی لئے ظل الٰہی کی حمایت میں رہتا ہے۔ اور خود اللہ تعالیٰ اسے گرنے سے بچاتا ہے۔ =

شفا میں اس حدیث کی جو شرح بعض علما سے منقول ہے، بڑی قیمتی ہے، موصوف فرماتے ہیں:

معرفتهم هي معرفة مكانهم من النبي صلى الله عليه وسلم واذا عرفهم بذالك عرف وجوب حقهم وحرمتهم بسببه ـ	آل رسول کے مقام کا عرفان حاصل کرنا یہ ہے کہ اس کو جانو اور پہچانو کہ ان کو نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کیا قرب تعلق ہے۔ آدمی جب اسے جانے گا تو اس کی وجہ سے عرفان ہوگا کہ ان کے حقوق کا لحاظ رکھنا اور احترام کرنا واجب ہے۔

= ایسے ہی لوگوں کو محفوظین کہتے ہیں۔ اکابر کا ارشاد ہے، انبیاء معصوم ہیں اور اولیاء محفوظ۔ ان سے مراد فانی فی اللہ اور باقی باللہ حضرات ہیں۔

۷۔ **علم الیقین**: ایمان میں جب ایسا استحکام پیدا ہو جائے کہ کبھی بھی تزلزل نہ ہو تو اسے یقین کہتے ہیں۔ یقین کے تین درجے ہیں۔ (۱) علم الیقین (۲) عین الیقین (۳) حق الیقین۔

علم الیقین۔ یہ ہے کہ دلیل موجود ہو اور اس سے یقین پیدا ہو۔ مثلاً موت کا یقین جو ہر سمجھ دار کو حاصل ہے۔

عین الیقین۔ یہ ہے کہ مشاہدہ ہو جائے اور اس سے یقین پیدا ہو۔

حق الیقین۔ یہ ہے کہ معاملہ مشاہدہ ہی تک نہیں ہے بلکہ اپنے اوپر بیت گئی ہے اس سے جو یقین پیدا ہوتا ہے وہ سب سے اعلیٰ درجہ کا یقین ہے۔ اسی کا نام حق الیقین ہے۔

نوٹ: یقین سے مراد غیبی حقائق کا یقین ہے (غیبی حقائق سے مراد حقائق الٰہیہ ہیں جو ذات الٰہی کی وحدت صفات کی یکتائی اور اسمائے ربانی کے شئون کے حقائق ہیں۔ نیز غیبی حقائق میں کائنات ملکوت، احوال برزخ یعنی حالات علیین و سجین بھی ہیں۔ اور احوال قیامت و جنت و دوزخ بھی)۔

ان غیبی حقائق کا یقین اصل الاصول ہے جس پر دین و ملت کی پوری بنیاد کھڑی ہے۔ حیات انسانی کا سب سے قیمتی سرمایہ یہی ہے لیکن یہ دولت فلسفیانہ فکر و نظر سے نہیں ملتی کہ غیبی حقائق کے بارے میں فلسفہ کچھ جانتا ہی نہیں۔ اور جان بھی نہیں سکتا۔ فلسفہ کی پرواز عالم مشاہدات و مادیات تک جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے اوپر کیا ہے؟ غریب فلسفہ کو معلوم ہی نہیں۔ یہ غیبی حقائق اس کی سمجھ سے بالاتر اور فوق الادراک ہیں۔

=

صالحین امت نے عترت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احترام کو ہمیشہ ملحوظ رکھا ہے، سیدنا امام حسین علیہ السلام کے ایک پوتے حضرت عبداللہ بن حسن بن حسین خلیفۂ وقت حضرت عمر بن عبدالعزیز کے یہاں کسی ضرورت سے تشریف لے گئے تو حضرت عمر بن عبدالعزیز پر بڑا بوجھ پڑا کہ عترت رسول کو یہاں آنا پڑا اور متاثر ہو کر عرض کی:

اذا کان ذالک حاجۃ فارسل الی او	اگر آپ کو کوئی ضرورت ہو تو کسی کو میرے پاس بھیج دیا کیجئے یا کوئی
اکتب، فانی استحیی من اللہ ان	مکتوب تحریر فرما دیا کیجئے کیونکہ مجھے اللہ سے حیا آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ
یراک علی بابی (شفا ج۲ ص ۳۹)	دیکھے کہ آپ کو میرے دروازے پر آنا پڑا۔

= ان کا ادراک و شعور صرف انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد اور رہنمائی سے ہوتا ہے کیونکہ یہی ہیں غیبی حقائق کے دانائے راز، اور تمام حقائق ان کی نگاہ و مشاہدہ کے سامنے بے نقاب ہیں۔ لہٰذا غیبی حقائق کے بارے میں ہدایات نبوت کے بجائے فلسفیانہ کاوشوں میں پڑنا یکسر حماقت ہے اور زندگی کے قیمتی لمحات کو برباد کرنا ہے۔

غیبی حقائق کا علم الیقین ان باتوں سے ہوتا ہے۔ (۱) نبی کی تمام باتوں پر ایمان رکھو (۲) اللہ سے لو لگاؤ (۳) اس کی محبت سے بریز رہو (۴) اس کی یاد میں ڈوبے رہو۔ (۵) نفس کی خواہشات میں تزہد (۶) مباح لذتوں اور جائز آسائشوں سے بھی بہت حد تک بچو۔ ان اصولوں پر جب پوری طرح عمل کرو گے تو غیبی حقائق کا وہ یقین پیدا ہو جائے گا، جس میں تزلزل کی گنجائش ہی نہیں۔ یہی ہے غیبی حقائق کا علم الیقین۔

ان کے علم الیقین کے بعد جب محبت الٰہی اور ذکر یزدانی میں اور زیادہ استغراق ہو جاتا ہے۔ اللہ و رسول کی اطاعت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے نفس کی خواہشات سے اجتناب شدید ہو جاتا ہے۔ نیز مباح لذتوں اور آسائشوں سے احتراز اور بھی زیادہ ہو جاتا ہے تو آدمی علم الیقین کے مقام سے آگے نکل جاتا ہے، جہاں انکشاف معارف ہے، شہود تجلیات ہے، ظہور حقائق ہے، تکوینات غیبیہ اور حقائق الٰہی کا عینی مشاہدہ ہے۔ اس مشاہدے سے یقین میں جو مزید اضافہ پیدا ہوتا ہے وہی ہے عین الیقین۔

لیکن یہ مشاہدہ اور یہ عین الیقین علم الیقین کے بغیر نصیب نہیں ہوتا اور علم الیقین اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک حرص و ہوا اور اتباع شہوات سے نہ بچو اور بہت سے مباحات سے دست کش نہ ہو جاؤ۔

علم الیقین کی علامت: اللہ سے سچی لگن، محبت الٰہی کا وفور، بکثرت ذکر حق خوف خدا اور تقویٰ۔

عین الیقین کی علامت: ان امور میں مزید ترقی اور فراوانی بکثرت توبہ و استغفار، بارگاہ الٰہی میں بکثرت عجز و نیاز =

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ان جلیل القدر صحابہ میں ہیں جو اپنے علم کی بنا پر ایک مقام رکھتے ہیں۔ ایک موقع پر یہ اپنی سواری پر سوار ہونا چاہتے تھے کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے رکاب تھام لی۔ حضرت زید بن ثابت نے کہا: "اے عمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحبزادے رکاب چھوڑ دیجئے" حضرت ابن عباس نے کہا: "ہم لوگ علما کے ساتھ ایسا ہی (ادب) کرتے ہیں"۔ اس پر حضرت زید نے حضرت ابن عباس کے ہاتھ چومے اور کہا: ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ ہم لوگ نبی کے خاندان والوں کے ساتھ ایسا ہی معاملہ کریں۔ (شفا ص ۳۹/۲)

اس کلام میں یہ لفظ کہ "ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے" قابل لحاظ ہے۔ اس کا عربی متن یہ ہے: هكذا امرنا۔

= آہ و زاری، شب بیداری، دعائے سحری، دنیا سے دل برداشتہ ہو جانا اور دل میں بشرت سوز و گداز حتیٰ کہ دل کی قساوت اور سختی یک لخت مٹ جائے۔

عین الیقین حاصل ہو جانے کی بہت بڑی شرط یہ ہے کہ سینہ نور سے معمور ہو جائے کہ اس کے بغیر نہ حقائق الٰہیہ کا مشاہدہ ہوگا اور نہ عین الیقین کا مقام حاصل ہوگا، جس کا سینہ نور سے معمور ہے وہی روشن ضمیر ہے۔ سینہ کب نور سے معمور ہوتا ہے؟ اور اس کی علامتیں کیا ہیں حدیث کا بیان سنئے:

ان النور اذا دخل الصدر انفسح	نور جب سینہ میں آجاتا ہے تو اس میں وسعت پیدا ہو جاتی
قیل هل لذالك علم یا رسول الله؟	ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ اس کی کوئی علامت بھی
قال: نعم التجافی عن دار الغرور	ہے؟ فرمایا: ہاں فریب کدۂ دنیا سے دل اچاٹ ہو جانا اور
والانابة الی دار الخلود	ہمیشہ کے گھر کی لگن لگ جانا اور موت کے آنے کے قبل
والاستعداد للموت قبل نزوله ؏	موت کے لئے تیار ہو جانا۔

یقین کا مقام عام ایمان سے بلند ہے۔ اور یہی ہے ایمان کی سب سے اونچی شاخ، اس سے مراد ہے لا الٰہ الا اللہ کا یقین باقی حقائق ایمانیہ اس شاخ کے برگ و بار ہیں قرآن مجید میں یقین کو سکینہ بھی فرمایا گیا ہے (سورۂ فتح، آیت ۴، پ ۲۶) میں ہے:

؏ رواه عبدالرزاق وابن جرير وابن ابی حاتم والبیهقی۔

صحابی جب یہ کہتے ہیں کہ "ہمیں حکم دیا گیا ہے" تو جمہور ائمۂ حدیث کا قول ہے کہ یہ حکم مرفوع ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے (تقریب نووی مع تدریب ص ۱۱۲، اور مقدمہ ابن صلاح ص ۴۲ میں ہے کہ صحیح بات یہی ہے کہ یہ حکم مرفوع ہے۔)

= هُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ السَّکِیۡنَۃَ فِیۡ قُلُوۡبِ الۡمُؤۡمِنِیۡنَ لِیَزۡدَادُوۡۤا اِیۡمَانًا مَّعَ اِیۡمَانِہِمۡ ؕ

وہی اللہ تو ہے جس نے اہل ایمان کے دلوں میں سکینہ نازل فرمایا تاکہ (اپنے) پہلے ایمان کے ساتھ ان کا ایمان اور زیادہ ہو جائے۔

سکینہ کے معنی ہیں: سکون قلب اور دل میں جماؤ یعنی دل میں کسی قسم کا شک وشبہ اور تذبذب نہیں بلکہ انشراح ہے جس میں نور بھی ہے، قوت بھی اور روحانیت بھی اور اسی کا نام ہے دینی حقائق پر یقین۔ تفسیر روح المعانی میں اس آیت کی تفسیر کے سلسلہ میں سکینہ کی جو تشریح کی گئی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ: مفسرین کا قول ہے کہ سکینہ ایک ایسی چیز ہے جو نور، قوت اور روح کی جامع ہے اور اس سے سکون قلب اور انشراح پیدا ہوتا ہے۔

یہ آیت یہی روشنی عطا کرتی ہے کہ سکینہ اگلے ایمان کے ساتھ ایک مزید ایمان کا اضافہ کرتا ہے۔ یعنی بالفاظ روح المعانی "ایمان استدلالی کے ساتھ ایمان عیانی بھی نصیب ہو جاتا ہے۔"

اسی ایمان عیانی کا نام ہے عین الیقین۔

۸ ـ **علم لدنی** : یہ وہ علم ہے جو مقربین کو تعلیم الٰہی اور تفہیم ربانی سے حاصل ہوتا ہے، دلائل عقلی وشواہد نقلی سے نہیں۔ یہ نام سورۂ کہف (پ ۱۵ ع ۹) کی آیت ذیل سے ماخوذ ہے۔ جو حضرت خضر کے بارے میں ہے۔

وَعَلَّمۡنٰہُ مِنۡ لَّدُنَّا عِلۡمًا ۝ — اور ہم نے اپنے پاس سے اسے ایک علم دیا تھا۔

علم لدنی براہ راست اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا ہوتا ہے۔ اس میں مادی اسباب واکتساب کو دخل نہیں۔ اس کی مشہور قسمیں پانچ ہیں۔ وحی، الہام۔ فراست، کشف اور مشاہدہ۔ ان کی تشریح حسب ذیل ہے:۔

● **وحی**، اس کی سب سے اعلیٰ قسم قرآن مجید ہے، جس کا نزول حضرت جبریل امین کے ذریعہ ہوا ہے۔ حدیث نبوی بھی وحی الٰہی ہے۔ اکثر اکابر کا قول یہی ہے اور بعض احادیث اجتہاد نبوی ہیں مگر درحقیقت یہ بھی وحی الٰہی =

اس تفصیل کی بنا پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھوں کا چومنا اور یہ کہنا کہ "ہمیں ایسا ہی حکم دیا گیا ہے"۔ اس کا مطلب جمہور محدثین کے نزدیک یہ ہے کہ ہمیں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حکم دیا ہے اس سے اندازہ لگاؤ کہ اہل بیت نبوی کس قدر احترام کے مستحق ہیں اور ان کا کس قدر احترام کرنا چاہیئے۔ ان کے ہاتھ چومنے کا حکم ہو چکا ہے۔ حضرت زید بن ثابت جیسے بحر العلوم صحابی نے اس کی تفریح فرمائی ہے۔ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کے ہاتھ چوم کر دکھا دیا ہے، جب حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی دست بوسی اتنی اہم ہے تو غور کرو کہ حضرت علیؓ امام حسن اور امام حسین کی دست بوسی کس قدر قابل اعتنا ہے کہ یہ تینوں حضرات

= ہیں کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے صورت ملک میں رہتے ہوئے آپ کے قلب اقدس میں معانی کا القا کر دیا ہے۔ حدیث میں جو "نفث روح الامین فی روحی" آتا ہے اس سے وحی کی یہی صورت مراد ہے۔

وحی کی ایک قسم وہ حدیثیں ہیں جنہیں حضرت جبریل امین صورت بشری میں آکر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دے گئے ہیں۔

ایک قسم وہ بھی ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر شہود خاص کے مقام میں وارد ہوئی ہے۔ سورۃ النجم (پ ۲۷، ع ۱) کی آیت ذیل میں اسی کی طرف اشارہ ہے:

فَأَوْحَىٰ إِلَىٰ عَبْدِهِ مَا أَوْحَىٰ ۝ پھر اللہ نے اپنے بندے پر وحی نازل کی جو کچھ نازل کی

ایک قسم حدیث قدسی ہے جس میں صراحت ہے کہ یہ اللہ کا ارشاد ہے۔

- **الہام** : وہ علم لدنی ہے جو اولیاء کرام کو انبیاء علیہم السلام کے کامل اتباع کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔
- **فراست** بھی وہ علم لدنی ہے جو اولیاء کرام کو انبیاء کرام علیہم السلام کے کامل اتباع کی بنا پر حاصل ہوتا ہے۔ الہام اور فراست میں فرق یہ ہے کہ فراست میں صورت کے دیکھنے سے امور غیبی کا انکشاف ہوتا ہے اور الہام میں صورت دیکھنے کی احتیاج نہیں۔ لغت میں فراست کے معنی ہیں ظاہر نظر سے باطن کا حال معلوم ہو جانا۔

یہ ملحوظ رہے کہ فراست قیافہ نہیں کیونکہ قیافہ قیاس آرائی ہے اور ظن وگمان کا اندازہ ہے، لیکن فراست یہ ہے کہ نور بصیرت کی روشنی میں ظاہر نظر سے باطن کا حال معلوم ہو جاتا ہے۔ اسے فراست نوری کہا جائے تو بہتر ہے کہ حدیث ذیل اسے نور کہتی ہے۔ =

تو خاندان نبوی کی ممتاز ترین ہستیاں ہیں۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ان میں افضل ترین شخصیت ہیں اور حضرات حسنین کریمین حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے فرزند اور لخت جگر ہیں۔ لہٰذا غور کرو کہ ان کا کس قدر ادب واحترام اور تکریم وتعظیم کرنا چاہیئے۔ حضرت زید بن ثابت کی روایت نے وضاحت کر دی کہ:

اہل بیت کا خوب ادب واحترام کرو، کیوں کہ امت کو اس ادب واحترام کا حکم ہے۔ اور حکم رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعمیل ہی میں فلاح وسعادت ہے۔

ذریت طاہرہ کی تکریم پر شفاعت کا وعدہ

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذریت طاہرہ کی تعظیم وتکریم ان کی حاجت روائی اور ان کی محبت اتنی بڑی سعادت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں:

اربعۃ انا لہم شفیع یوم القیامۃ	چار قسم کے لوگوں کی میں شفاعت کروں گا
المکرم لذریتی والقاضی لہم حوائجہم	(۱) وہ جو میری ذریت کی تکریم واحترام کرے
والساعی لہم فی امورہم عند	(۲) وہ جو ان کی ضرورت پوری کرے
ما اضطروا الیہ والمحب بہ بقلبہ	(۳) وہ جو ان کے ایسے کام میں کوشش کرے جس کی انہیں ضرورت ہے
ولسانہ (کنز العمال ص ۲۱۷ ج ۶)	(۴) وہ جو اپنے دل اور زبان سے ان کا محب ہے۔

ان حضرات کے ادب واحترام میں محبت کا عنصر ہونا ضروری ہے ورنہ بے جان تعظیم ہے کیوں کہ انکی

اتقوا فراسۃ المؤمن فانہ	مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ اللہ کے نور سے
ینظر بنور اللہ (ترمذی)	دیکھتا ہے۔

● **کشف** یہ ہے کہ مستور حقیقت نگاہ بصیرت کے سامنے بے حجاب ہو جائے۔ یہ ارباب قلوب کا مقام ہے جن کے تمام امور میں تقویٰ غالب ہوتا ہے اور انہیں خواص کہتے ہیں۔ ان سے آگے اخص الخواص ہیں یہ ہیں ارباب احوال جن میں محبت الٰہی کے ذوق وانجذاب کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کا کشف بہت صاف ہوتا ہے۔

● **مشاہدہ**: قریب سے غیبی امور اور حقائق الٰہیہ کا دیکھنا ہے۔ یہ اخص الخواص کا مقام ہے۔ ۱۲ کوثر

محبت کے بغیر ایمان ہی نہیں حافظ ابوالشیخ کی روایت ہے کہ ایک دن نبی صلی اللہ علیہ وسلم بڑی خفگی کے عالم میں منبر پر تشریف لاتے اور اللہ کی حمد وثنا کے بعد ارشاد فرمایا:

مابال رجال یؤذوننی فی اھل بیتی والذی نفسی بیدہ لا یؤمن عبد حتی یحبنی، ولا یحبنی حتی یحب لذریتی۔	ان لوگوں کا کیسا معاملہ ہے؟ جو میرے اہل بیت کے بارے میں مجھے ایذا پہنچاتے ہیں۔ اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ کوئی بندہ اس وقت تک مومن نہیں جب تک مجھ سے محبت نہ رکھے اور اس وقت تک مجھ سے محبت نہیں رکھتا جب تک کہ میری ذریت سے محبت نہ رکھے۔

ذریات طاہرہ کی محبت، حاجت روائی اور مہمات میں ان کا تعاون مسلمانوں کے لئے ناگزیر ہے

مسلمانوں پر محسن عالم سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا احسان اتنا زیادہ ہے کہ اپنی جان بھی قربان کردیں، تو حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اس احسان عظیم کی بنا پر ہر مسلمان کا فرض ہے کہ آپ کے اہل بیت اور آپ کی ذریت طاہرہ کی ہر طرح خدمت کریں۔ ان کے ادب واحترام کا کوئی دقیقہ نہ چھوڑیں۔ اپنی جان سے بڑھ کر انہیں مانیں اور ان کی محبت سے لبریز رہیں۔ اگر ان کی سچی محبت ہے تو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی محبت ہے ورنہ جھوٹا دعویٰ ہے۔

کتاب کے شروع میں یہ حدیث گذر چکی ہے:

واللہ لا یدخل قلب رجل الایمان حتی یحبھم اللہ ولقرابتھم منی	اللہ کی قسم کسی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان نہیں آسکتا جب تک میرے اہل بیت سے اللہ کے لئے اور میری قرابت کی وجہ سے محبت نہ رکھے۔
(سنن ابن ماجہ ص ۳۰)	

اور یہ حدیث بھی گذر چکی ہے:

اساس الاسلام حبی وحب اھل بیتی	اسلام کی بنیاد میری محبت اور میرے اہل بیت کی محبت ہے۔
(کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۸ تقطیع کلاں)	

اور خود قرآن مجید کا ارشاد ہے:

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ۔ (شوریٰ پ۲۵ ع ۴)	آپ کہدیجئے: (میں نے تم کو اسلام کی جو دولت دی ہے اور تمہاری ایمانی تربیت کرتا ہوں) اس پر تم سے کوئی اجرت نہیں مانگتا۔ البتہ جو محبت میرے رشتہ داروں کے بارے میں ثابت[1] ہو چکی ہے بس وہ چاہیئے۔

یہ آیت کریمہ تمام امت کو یہ ہدایت دیتی ہے کہ اہل بیت اطہار اور ذریت طاہرہ کی محبت فرض ہے۔

امام ابن منذر، امام ابن ابی حاتم، امام ابن جریر، امام طبرانی، حافظ مردویہ وغیرہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں۔

لما نزلت هذه الاٰية: قل لا اسئلكم عليه اجرًا الا المودة فى القربٰى قالوا يا رسول من قرابتك هٰؤلاء الذين وجبت مودتهم؟ قال: على وفاطمه وولداهما، (الدر المنثور ج ۵ ص ۷)	جب یہ آیت نازل ہوئی قل لا اسئلکم علیہ اجرا الا المودۃ فی القربٰی، تو صحابہ نے گذارش کی یا رسول اللہ آپ کے وہ کون سے رشتہ دار ہیں جن کی محبت واجب ہے؟ آپ نے فرمایا: وہ ہیں علی اور فاطمہ اور ان کے دونوں فرزند (حسن و حسین)

یہ روایت تفسیر معالم التنزیل امام بغوی، تفسیر مدارک، امام نسفی، تفسیر بیضاوی، تفسیر خازن اور جمل وغیرہ اور بکثرت تفاسیر میں ہے۔

---

[1] اس ترجمہ میں "فی القربٰی" کے لفظ "فی" کو ملحوظ رکھا گیا ہے اس کے متعلق مفسرین عربیت کا بیان ہے:
"تقدیرہ الا المودۃ الثابتۃ فی القربٰی ومتمکنۃ فیھا" (کشاف ج ۴ ص ۲۱۹) اس کی بنا پر علامہ زمخشری لکھتے ہیں "اجعلوا امکانا للمودۃ ومقرا لھا" جس کا مفہوم یہی ہے کہ میرے رشتہ دار اہل ایمان کے لئے موضع محبت ہیں یعنی ان کی محبت لازمی ہے اور جب ان کی محبت لازمی ہے تو ان سے محبت کرنا فرض ہے۔ ۱۲ کوثر

اس آیت کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں اور یہ لفظ قربیٰ کے معانی کی بنا پر ہے مفسرین نے اس کے تین معانی لکھے ہیں۔ (۱) رشتہ دار، مراد ہیں حضرت علی، حضرت فاطمہ، اور حسنین کریمین جیسا کہ حدیث نے وضاحت کر دی ہے (۲) رشتہ داری (۳) تقرب الٰہی لے

راقم السطور کے نزدیک تینوں معنی صحیح ہیں، اور آیت کریمہ میں تینوں معانی مراد ہیں، لیکن پہلا مفہوم قابل ترجیح ہے۔

حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ جو علم تفسیر و حدیث و فقہ و تصوف کے جامع ہیں۔ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :-

الاولی ان یقال فی تاویل الآیۃ	بہتر یہ ہے کہ اس آیت کی تفسیر میں یہ کہا جائے کہ
لا اسئلکم اجرا الا ان تودوا اقربائی	(مطلب یہ ہے) میں تم لوگوں سے کوئی صلہ نہیں مانگتا
واھل بیتی، وعترتی وذالک	بس یہ کرو کہ میرے اقربا میرے اہل بیت اور میری

لے عموماً اکثر آیتوں کی متعدد تفسیریں ہوتی ہیں جن میں سے بعض لوگ کسی کو لیتے ہیں اور باقی سب کو چھوڑ دیتے ہیں، لیکن یہ طریقہ اچھا نہیں بہتر طریقہ یہ ہے کہ حتی الامکان اکابر کی تفسیروں کو مسترد نہ کیا جائے، بلکہ سب کو لے لیا جائے اور یہ اصول نقطۂ نظر بنایا جائے کہ اس آیت میں یہ سب معانی مرکوز ہیں کسی مفسر نے کسی کو بیان کیا۔ کسی نے کسی کو۔ کسی بزرگ کی تفسیر کا یہ مطلب نہیں کہ بس یہی مفہوم مراد ہے، دوسرا مفہوم مراد ہی نہیں۔ اس اصول کو مفسر آلوسی روح المعانی میں بار بار بیان کرتے ہیں، عموماً اس کی تعبیر اس مختصر اور بلیغ عبارت میں کرتے ہیں۔ "ھذا تمثیل لا تخصیص" راقم السطور نے بھی اپنی تفسیر "جواہر البیان فی تفسیر القرآن" میں جا بجا اس اصول کو بیان کیا ہے اس بہترین اصول تفسیر کی بنا پر آیت متن میں لفظ قربیٰ" کے جو تین معانی بیان کئے گئے ہیں اور ان کی جو تین تفسیر کی گئی ہیں وہ سب صحیح ہیں یہ تینوں تفسیریں حسب ذیل ہیں۔

۱۔ قربیٰ سے مراد ہیں رشتہ دار اور مقصود ہیں حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین علیہم السلام جیسا کہ حدیث نے وضاحت کر دی ہے۔ (۲) قربیٰ سے مراد ہے رشتہ داری، مراد یہ ہے کہ رسول کو تم سے جو رشتہ داری ہے اس کو ملحوظ رکھو۔

۳۔ قربیٰ سے مراد ہے تقرب الٰہی۔ مراد یہ ہے کہ تقرب الٰہی سے لگن پیدا کرو۔ ۱۲ کوثر

لانه صلی الله علیه وسلم کان
خاتم النبیین لانبی بعده وانما
انتصب للدعوة الی الله بعده
صلی الله علیه وسلم علماء
امته من اهل الظاهر والباطن
ولذالك امر الله تعالیٰ نبیه صلی
الله علیه وسلم ان یامر امته بمودة
اهل بیته لان علیا رضی الله عنه
والائمة من اولاده کانوا اقطابا بالکمالات
الولایة ومن اجل ذالك قال رسول
الله صلی الله علیه وسلم انا مدینة العلم
وعلی بابها رواه البزار والطبرانی عن
جابر وله شواهد من حدیث ابن عمر
وابن عباس وعلی واخیه وصححه حاکم
ومن اجل ذالك تری کثیرا من
سلاسل المشائخ تنتهی
الی ائمة اهل البیت ومضی
کثیر من الاولیاء فی السادات
العظام منهم غوث الثقلین محی
الدین عبد القادر الجیلی الحسنی الحسینی
بهاء الدین النقشبندی والسید السند

عترت سے محبت رکھو۔
کیوں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء ہیں
آپ کے بعد کوئی نبی نہیں آپ کے بعد دعوت حق کیلئے
امت کے علماء ظاہر اور علماء باطن کھڑے ہوئے
(یعنی آپ ہی کی نبوت کے تحت ہدایت کا نظام ہے)
اسی لئے اللہ تعالیٰ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم
دیا ہے کہ آپ اپنی امت کو حکم دے دیجئے کہ یہ لوگ
آپ کے اہل بیت سے محبت رکھیں کیوں کہ حضرت
علی اور آپ کی اولاد میں جو ائمہ ہیں وہ کمالات
ولایت کے قطب ہیں اور اسی لئے رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:
"میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں"۔
یہ حدیث بزار اور طبرانی نے حضرت جابر سے روایت
کی ہے اس کے شواہد بھی ہیں جو ابن عمرؓ ابن عباس
علی اور ان کے بھائی سے مروی ہیں حاکم نے اس
حدیث کو صحیح کہا ہے۔
اور اسی لئے تم دیکھو گے کہ مشائخ تصوف کے
بہت سے سلسلے ائمہ اہل بیت پر جا کر ملتے ہیں اور اکثر اولیاء
سادات عظام میں ہوئے ہیں جن میں غوث الثقلین
محی الدین عبد القادر جیلانی حسنی حسینی اور بہاء الدین
نقشبند اور سید السند مودود چشتی اور سید (خواجہ

مودود الچشتی والسید معین الدین الچشتی، والوالحسن الشاذلی وغیرہم ولاجل ذالک قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انی تارک فیکم الثقلین: کتاب اللہ وعترتی (تفسیر مظہری ج ۸ ص ۳۴)

معین الدین چشتی (اجمیری) اور ابوالحسن شاذلی وغیرہ ہیں۔ اور اسی لئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ میں تم لوگوں میں دو بڑی وزنی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں، ان میں ایک کتاب الٰہی ہے اور ایک میری عترت ہے۔

• ماحصل یہ ہے کہ اس آیت کریمہ نے بتایا ہے کہ علیؑ فاطمہؑ حسن اور حسین (علیہم السلام) کی محبت فرض ہے، صحابہ کرام نے اس آیت سے محبت کی فرضیت ہی سمجھی ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اس کو صحیح قرار دیا ہے۔ حدیث گذر چکی ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ نے گذارش کی، یارسول آپکے وہ کون رشتہ دار ہیں جنکی محبت واجب ہے؟ آپنے فرمایا وہ علی اور فاطمہ اور ان کے دونوں فرزند ہیں۔ اسی لئے امام شافعی فرماتے ہیں:

یا اہل بیت رسول اللہ حبکمٗ ۔۔۔ فرض من اللہ فی القرآن انزلہ

ترجمہ: اے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے اہل بیت آپ لوگوں کی محبت فرض ہے، یہ فرضیت اللہ نے قرآن میں نازل فرمائی۔

کفاکم من عظیم الفخر انکم ۔۔۔ من لم یصل علیکم لا صلوٰۃ لہ

ترجمہ: آپ لوگوں کے لئے یہ فخر عظیم کافی ہے کہ جس نے آپ لوگوں پر درود نہیں بھیجا اس کی نماز ہی نہیں ہوئی۔

• جیسے اہل بیت کرام کی محبت لازمی ہے اسی طرح ان کی حاجت روائی اور مہمات میں ان کا تعاون بھی فرض ہے جو شخص ایسا کرے گا۔ حضور انور صلی علیہ وآلہ وسلم کا وعدہ ہے کہ آپ اس کی شفاعت فرمائیں گے۔ حدیث گذر چکی ہے:۔

اربعۃ انا لہم شفیع یوم القیامۃ المکرم لذریتی، والقاضی لہم

چار قسم کے لوگوں کی میں شفاعت کروں گا۔
(۱) وہ جو میری ذریت کی تکریم و احترام کرے۔

حوائجهم والساعی لهم فی امورهم عند ما اضطروا الیه، وَ المحب بهم بقلبه ولسانه

(کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۷)

(۲) وہ جوان کی ضرورت پوری کرے۔
(۳) وہ جوان کے ایسے کام میں کوشش کرے جس کی انہیں ضرورت ہے۔
(۴) وہ جو اپنے دل اور زبان سے ان کا محب ہے۔

اسلام کی تعلیم ہے کہ عترت رسول کو ایذا دینا حرام ہے، اور اس کے مرتکب پر اللہ کی لعنت ہے، بایں ہمہ یزید کی فرعونی حکومت نے سیدنا امام حسین علیہ السلام پر وہ مظالم کئے ہیں کہ پوری تاریخ اسلام میں نظیر نہیں۔

یزید کی فرعونی حکومت نے سیدنا امام حسین علیہ السلام کو مدینہ چھوڑنے پر مجبور کیا، مدینہ منورہ سے مکہ معظمہ تشریف لائے۔ یہاں عین طواف میں آپ کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ آپ حرمت کعبہ بچانے کے لئے جو بہت ہی بڑا فرض ہے مکہ معظمہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے، مکہ معظمہ میں سب کو امن ہے مگر ظالموں نے یہاں بھی نبی کے لال کو رہنے نہ دیا۔ پوری تفصیل انشاء اللہ فضائل امام حسین کے باب میں آئے گی۔

آپ مکہ معظمہ سے کربلا تشریف لائے۔ کربلا کے بن میں آپ کو، آپ کے فرزندوں کو، عزیزوں کو، اعوان و انصار کو تین دن تک پیاسا رکھ کر اس طرح ذبح کیا کہ آج تک دنیائے اسلام اشکبار ہے۔ شہید کرنے کے بعد آپ کی نعش مقدس پر اور آپ کے فرزندوں، عزیزوں اور اعوان و انصار کے بے گناہ لاشوں پر گھوڑے دوڑا دوڑا کر پاش پاش کر ڈالے اور ان قدسیوں کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک شہر شہر اور گلی گلی گھمایا اور نبی زادیوں کو ان کی بہو ڈں کو اور امام زین العابدین کو قید میں جکڑ کر ملک شام تک شہدائے کربلا کے سروں کے ساتھ تشہیر کرتے ہوئے لے گئے۔

کیا یہ ظالم مسلمان ہیں؟ حدیث کا اعلان تو یہ ہے: جو شخص اہل بیت سے بغض رکھے وہ منافق ہے[1] اور یہ تو بغض قلبی کے علاوہ عداوت سیفی سے بھی آگے ہیں۔

---

[1] الفاظ یہ ہیں: من ابغضنا اهل البیت فهو منافق (الدر المنثور ج ۵ ص ۷) کوثر

کیا کوئی مسلمان اولادِ رسول کے ساتھ ایسا سلوک کر سکتا ہے۔؟

کیا کوئی مسلمان رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ایذا دے سکتا ہے۔؟

یہ سب مظالم جو شہدائے کربلا اور اسیران کربلا پر کئے گئے ہیں ان سے رسول اقدس کو کتنی شدید ایذا پہونچائی گئی ہے؟ کیا حضور کو ایسی ایسی ایذا پہونچانے والے مسلمان ہیں۔

لعنت ہو ان ظالموں پر! قرآن مجید فرماتا ہے:

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ	جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کو ایذا دیتے ہیں
لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ	یقیناً اللہ نے ان پر دنیا میں بھی لعنت کی ہے اور
وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَابًا مُّھِیْنًا ۝	آخرت میں بھی۔ اور ان کے لئے اہانت کرنیوالا
(احزاب پ ۲۲ ع ۳)	عذاب تیار کر رکھا ہے۔

شہیدان کربلا اور اسیران کربلا پر یزیدی حکومت نے جو جگر خراش ظلم وستم کئے ہیں ان سے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور تمام عالم اسلامی تڑپ اٹھا۔ یہ دلدوز سانحہ مسلمانوں کے لئے قیامت عظمیٰ بن گیا۔ آنکھوں سے لگاتار آنسو برستے تھے اور قلوب خون کے آنسو روتے تھے ہر مومن کے گھر قیامت برپا تھی کیونکہ حکومت اور اس کے اعوان وانصار کے علاوہ جمہور کا ایمانی شعور زندہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام نے یزیدی حکومت کو "اسلام دشمن حکومت" قرار دیا اور اس کے خلاف ہر طرف لعنت و نفرت کے جذبات ابھرے۔ اور پکے مسلمان حکومت کا تختہ اُلٹنے کے لئے کھڑے ہو گئے۔

● مدینہ منورہ جو اسلام کا مرکز تھا یزیدی حکومت کے خلاف مسلح ہو کر میدان میں آ گیا۔ اس دینی جہاد میں مدینہ کے وہ تمام اکابر شریک ہوئے جن کے تقویٰ تقدس، پاکبازی، خداترسی، رسوخ ایمان اور عزیمت عمل پر پوری تاریخ اسلام کو ناز ہے۔ ان میں ایسے سینکڑوں صحابہ کرام بھی تھے جو کفار کے جنگی حملہ میں حضور کے سامنے سینہ سپر بن کر کھڑے تھے اور حضور پر اور اسلام پر جو تیر و شمشیر اور خنجر چل رہے تھے ان کو اپنے سینے پر روکا تھا۔ ان کی فضیلت اور جاں نثاری کا تذکرہ خود اللہ مجدہٗ نے متعدد آیتوں میں فرمایا ہے۔ اور وہ ہزاروں تابعین کرام بھی اس جہاد میں شریک تھے جو رسوخ ایمان اور

کمال تقویٰ میں صحابۂ کرام کے جانشین تھے۔ اس جہاد میں اتنے صحابہ اور تابعین یزیدی درندوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے کہ اصحاب حدیبیہ جو روئے زمین کے لئے برکت عظمیٰ تھے ان میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا۔ اس معرکہ میں یزیدی شیطانوں نے مسجد نبوی کی سخت بے حرمتی کی اور ان درندوں نے اہل مدینہ کی سیکڑوں کنواری لڑکیوں کی عصمت دری بھی کی۔

● مکہ معظمہ میں بھی یزید اور اس کی حکومت کے خلاف نفرت عداوت کی آگ بھڑک اٹھی۔ حضرت عبداللہ ابن زبیر نے اہل مکہ کو لے کر یزید سے معرکہ آرائی کے تمام سامان لیس کر لئے۔ حملہ سے پہلے خود یزید نے مکہ پر قتل و غارت کے لئے فوج بھیجدی، جس نے شہر مکہ اور حرم کعبہ کی مقدس زمین کو مسلمانوں کے خون سے رنگین بنا کر بلد امین اور حرم الہٰی کی بے حد توہین کی۔

گو یزیدی حکومت نے اپنے فرعونی جبر و عدوان، قہر و طغیان اور ظلم و تشدد سے مجاہدین کو موت کے گھاٹ اتار دیا ــــــ باقی ماندہ نفوس کو کچل ڈالا اور اپنے خلاف اٹھنے والے عوام کو بے دم بنا دیا، لیکن ظلم و عدوان کے خلاف اٹھنے والا انقلاب دبایا تو جا سکتا ہے مگر مٹایا نہیں جا سکتا اسے ہر فرعونی حکومت بھی اچھی طرح سمجھتی ہے، لیکن فرعونوں نے اس کا علاج مزید ظلم و ستم اور مزید تشدد ہی سمجھا ہے اور انہوں نے ہمیشہ اسی پر عمل کیا ہے، یزید اور اس کی حکومت نے بھی یہی کیا، کہ محبان اہل بیت اور اموی حکومت سے نفرت رکھنے والے صالحین امت پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے، عوام کو کچل کر رکھ دیا، زبانوں پر تالے چڑھا دیئے۔ ذرا ذرا سی بات پر سر اڑا دیئے۔ مسلمانوں پر تلوار کا بے پناہ استعمال ہونے لگا۔ اتنا کچھ کرنے کے باوجود بھی اموی حکومت کے دل سے یہ خطرہ نہ مٹا کہ قتل حسین ایسا جاں گداز حادثہ ہے کہ خود اسلام کے قلب و جگر پر گہرا زخم لگا ہے، ہر مسلمان کا کلیجہ پاش پاش ہے پورا عالم اسلامی خون کے آنسو رو رہا ہے۔ اس جانکاہ سانحہ کا مسلمانوں پر اتنا گہرا اثر پڑا ہے کہ بوڑھے، جوان، بچے سب کے سب اموی حکومت سے سخت بیزار اور متنفر ہیں، انقلاب عظیم کے لئے موقع کے منتظر ہیں۔ اگر یہی حالت رہی تو انقلاب اٹھ کر رہے گا، جو ہمیشہ کے لئے اموی حکومت کا خاتمہ کر دے گا۔

بنی امیہ کے لئے سب سے بڑا خطرہ | بنی امیہ کی فرعونی حکومت کے لئے سب سے بڑا خطرہ اسی

انقلاب کا ڈر تھا، جس سے بچنے کے لئے حکومت نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ بالآخر ظالموں نے سب سے ضروری بات یہی قرار دی کہ "آل محمد کی محبت دلوں سے مٹا دو ورنہ خود مٹ جاؤ گے اور دلوں سے ان کا وقار و احترام نکال دو، ورنہ تمہاری حکومت مٹ کے رہے گی"۔ اس منصوبہ کے تحت طرح طرح کی چالیں چلی گئیں۔

واقعات کربلا کے علاوہ اہلبیت اطہار پر بنی امیہ کے اور بھی سیاسی مظالم

اس سلسلہ میں اموی ذہنیت نے اہل بیت مقدس کے خلاف حد درجہ زہریلے اور ناپاک پروپیگنڈوں کا زہر پھیلایا، مثلاً:

۱۔ جن آیتوں اور حدیثوں میں حضرت علی، امام حسن اور امام حسین کے فضائل مذکور ہیں اور ان سے ان مقدسوں کی تعظیم احترام و عظمت دلوں میں بیٹھتی ہے پروپیگنڈا کیا کہ ان آیتوں اور حدیثوں میں یہ لوگ مراد نہیں۔ اس پروپیگنڈے کا اثر اب بھی بہت سی کتابوں میں موجود ہے۔ منہاج السنہ ابن تیمیہ میں تو ان حضرات کے فضائل کی متعدد حدیثوں کو خصوصاً مناقب مرتضوی کی حدیثوں کو گرانے کی بھی کوشش کی گئی ہے[۱] کیونکہ بقول مؤلف انوار الباری: "ان کا نقطۂ نظر خارجی رجحانات کا اثر پذیر ہے[۲]۔" مؤلف انوار الباری شیخ ابن تیمیہ کے بے حد مداح اور معتقد ہیں مگر حق کو چھپانا اچھا نہیں سمجھنے اس لئے حقیقت بول گئے۔

۲۔ چونکہ حضرت علی اور امام حسن اور امام حسین اہل بیت ہیں۔ اور اہل بیت ہونے کی وجہ سے عام مسلمان ان کا بے حد احترام کرتے ہیں۔ اور اہل بیت کا ادب و احترام دین کا شعار سمجھتے ہیں۔ (کہ واقعی یہ دین کا شعار ہے) اس لئے بنی امیہ کی سیاست مشکل میں پڑ گئی کہ ان لوگوں کا احترام دلوں سے کیسے نکالا جائے۔ بہ اعدائے دین اس کے لئے یہ چال چلے کہ پروپیگنڈا اٹھا دیا کہ یہ لوگ اہل بیت نہیں۔

---

[۱] مثلاً مواخات کی اس حدیث کو جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو بھائی فرمایا ہے۔ مزید تفصیل انشاء اللہ ویطعمون الطعام علی حبہ کی آیت کے مباحث میں آئے گی۔ ۱۲ کوثر [۲] انوار الباری ج ۶ ص ۲۱۔ کوثر

۳۔ امام حسن اور امام حسین آل محمد ہیں (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) بنی امیہ نے دیکھا کہ جمہور ان کو آل محمد مانتے ہیں اور نماز میں آل محمد پر درود ہے اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ (یعنی یا اللہ محمد اور آل محمد پر درود بھیج) اس سے بھی اموی سیاست کو مشکل پیش آئی کہ حسنین آل محمد ہونے کی بنا پر اتنا اونچا مقام رکھتے ہیں کہ نماز میں ان پر درود پڑھا جاتا ہے یہ بھی ایک وجہ ہے کہ جس کی بنا پر حسنین مسلمانوں کے دلوں میں اترے ہوئے ہیں اور ان کی محبت وعظمت اور توقیر واحترام مسلمانوں کا ایمان بن گیا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے پنجتن کے دشمنوں اور حسین کے قاتلوں اور مخالفوں سے مسلمانوں کے دلوں میں نفرت وبغض اس طرح بیٹھ گیا ہے کہ نکل ہی نہیں سکتا۔

بنی امیہ کی سیاست نے دیکھا کہ معاملہ بڑا نازک ہے، جب تک حسنین کو آل محمد مانا جائیگا اور جب تک مسلمان نمازوں میں آل محمد پر درود پڑھتے رہیں گے حسنین کا وقار بڑھتا ہی جائیگا اور جب تک ان کا وقار رہے گا اموی حکومت خطرے سے نہیں نکل سکتی۔ اب انہوں نے اپنا ایمان جلا کر اور خاک سیاہ کر کے یہ پروپیگنڈا اٹھایا کہ حسنین آل رسول نہیں۔

ان سطور کا ماحصل یہ ہے:

بنی امیہ نے ایمان بیچ کر قرآن اور حدیث کو پس پشت ڈال کر اہل بیت اطہار کے متعلق بدترین ناپاک پروپیگنڈے شروع کئے تاکہ مسلمان ان سے بے تعلق ہو جائیں اور ان کی ہمدردی اور حمایت میں بنی امیہ کی فرعونی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش نہ کریں۔ ان کے متعدد پروپیگنڈوں میں سے چند پروپیگنڈے اس قسم کے ہیں:

۱۔ آیتوں اور حدیثوں کی جن بیان کی ہوئی فضیلتوں کو جمہور حضرت علی اور حسنین عظیمین کے فضائل مانتے ہیں بنی امیہ نے پروپیگنڈا کیا کہ ان آیتوں اور حدیثوں کے بیان کردہ فضائل ان لوگوں کے نہیں ہیں لا دران آیات اور احادیث میں یہ لوگ مراد نہیں اس پروپیگنڈے سے مفہوم قرآنی وحدیثی کو مسخ بھی کیا گیا۔

۲۔ انہوں نے یہ ناپاک پروپیگنڈا بھی کیا کہ علی حسن اور حسین اہل بیت نہیں اس پروپیگنڈے

سے مفہوم اہل بیت کا خون کیا گیا۔

۳۔ یہ پروپیگنڈا بھی کیا کہ (معاذ اللہ) حسن اور حسین آل رسول اور ذریت رسول نہیں اس پروپیگنڈے نے انسانیت کا گلا گھونٹ دیا اور اس پروپیگنڈے کو اس زور شور سے پھیلایا گیا کہ جو شخص حسنین کریمین کو آل رسول یا ذریت رسول کہتا اس کی خبر لی جاتی' حجاج کے زمانے میں اس کا اتنا اہتمام تھا کہ بڑے بڑے اساطین علم و تقویٰ اور عمائد حق و دیانت جو حضرات امامین عظیمین علیہم السلام کو ذریت رسول کہتے۔ حجاج ان کو بلا کر توبیخ کرتا کہ " ان کو ذریت رسول نہ کہو ورنہ خیر نہیں "۔ انھیں اساطین علم و تقویٰ میں ایک نہایت بلند پایہ تابعی حضرت یحییٰ بن یعمر ہیں جو علم قرآن و حدیث و فقہ کے جامع ہیں ۔ اور ان کا یہ احسان عظیم قیامت تک مسلمانوں کی گردنوں پر رہے گا کہ انھیں نے قرآن مجید پر نقطے لگائے ہیں۔ ان سے پہلے قرآن مجید کے حرفوں پر نقطے نہیں لکھے جاتے تھے۔ کہ اس زمانہ کا رسم الخط ایسا ہی تھا۔ حجاج نے اس جلیل القدر تابعی سے کہا " حسن و حسین کو ذریت رسول نہ کہو۔ یہ تو اولاد علی ہیں "۔ آپ نے جواب میں یہ آیات پڑھیں :۔

وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِ دَاوُدَ وَسُلَيْمٰنَ	اور ان کی (یعنی ابراہیم کی) اولاد میں ہم نے
وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَ	داؤد کو ہدایت بخشی اور سلیمان اور ایوب اور
هٰرُوْنَ وَكَذٰلِكَ نَجْزِي	یوسف اور موسیٰ اور ہارون کو بھی اور ہم اچھے عمل
الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَ	والوں کو ایسا ہی بدلہ دیتے ہیں اور زکریا اور
عِيْسٰى وَاِلْيَاسَ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝	یحییٰ اور عیسیٰ اور الیاس کو بھی یہ سب کے سب
(الانعام پ ۷ ع ۱۶)	سدھرے ہوئے لوگوں میں تھے۔

حضرت یحییٰ بن یعمر نے ان آیات کو پڑھ کر فرمایا :

" عیسیٰ اور ابراہیم کے درمیان اس سے کم تعلق ہے جتنا حسن و حسین اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ہے "۔

آپ نے اس جواب میں یہ حقیقت بتائی کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام صدیوں کے پشت در

پشت بعد زمانی کے باوجود حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نواسے ہوئے، اور اس پر اللہ نے ان کو ذریت ابراہیم کہا ہے تو حضرات حسن وحسین تو خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نواسے ہیں پھر ان کے ذریت رسول ہونے میں کون کلام کر سکتا ہے۔؟

اس جواب کو سنکر حجاج کی زبان بند ہوگئی۔ (شذرات الذہب ج ۱ ص ۱۷۶)

بنی امیہ کی ایک بدترین سیاست حضرت علی پر لعن اور گالی ہے

آپ نے گذشتہ سطور میں بنی امیہ کے چند ناپاک پروپیگنڈوں کا بیان پڑھا جن میں ان کی بڑی سیاسی چال تھی ان کے علاوہ ان کی ناپاک سیاست نے حضرت علی اور ذریات رسول کی محبت مٹانے اور ان کی شان وعظمت گرانے کی ایک بدترین صورت یہ بھی نکالی کہ معاذاللہ حضرت علی اور ان کی اولاد پر لعنت بھیجنے اور ان کو گالی دینے کا سلسلہ شروع کیا۔ اور حکومت کا دباؤ ڈال کر لوگوں سے بھی لعنت بھجوائی اور گالی دلوائی حتیٰ کہ معزز لوگوں کو بلا بلا کر انہیں اس کا شاہی حکم دیا۔ صحیح بخاری ومسلم میں ہے کہ مدینہ کے ایک مروانی حاکم نے ایک مقدس اور جلیل القدر صحابی حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ کو بلا کر کہا: "علی کو گالی دو" انھوں نے انکار کیا تو یہ کہا کہ: "گالی نہیں دیتے تو لعنت بھیجو"۔ مگر اس مقدس شخصیت نے اس موقع پر ایک صورت نکال کر ایک اہم فضیلت مرتضوی کی حدیث سنائی اور اپنا فرض ادا کیا۔[1]

---

[1] پوری عبارت یہ ہے ــــــ استعمل علی المدینۃ رجل من آل مروان فدعا سہلا فامرہ ان یشتم علیا فابی سہل فقال لہ اما اذا ابیت فقل: لعن اللہ ابا تراب، فقال سہل ما کان لعلی اسم احب الیہ من ھذا وکان یفرح اذا دعی بہا فقیل لہ" اخبرنا لم سمی ابا تراب؟ قال جاء رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیت فاطمۃ فلم یجد علیا علیہ السلام فقال این ابن عمک؟ قالت کان بینی وبینہ شیئ فغاضبنی فخرج فلم یقل عندی، فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لانسان: انظر این ھو؟ فجاء فقال یا رسول اللہ ھو فی المسجد راقد فجاءہ وھو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وھو مضطجع قد سقط رداءہ عن شقہ واصابہ تراب فجعل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یمسحہ عنہ، ویقول: قم ابا تراب! قم ابا تراب!
(التاج ج ۳ ص ۳۳۲)

۲۔ گالی تو گالی بنی امیہ نے ان محبوبان خدا پر لعنت بھیجنے کا بھی سلسلہ شروع کر دیا۔ کتنا بڑا ظلم ہے؟ کیسا اندھیر ہے؟ اور کیسی کافرانہ حرکت ہے؟! کہ اللہ و رسول کے ان بے حد محبوبوں اور پیاروں پر مسجدوں میں اور منبروں پر لعنت کہی جاتی تھی۔ اور بنی امیہ نے اس کو اپنا دستور بنا لیا تھا۔ حجۃ المحدثین حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری (ج ۷ ص ۵۱ مطبوعہ خیریہ مصر) میں لکھتے ہیں:

واتخذ والعنه على المنابر سنة — ان لوگوں نے منبروں پر علی کو گالی دینا اپنا دستور بنا لیا تھا۔

یہ ہے بنی امیہ کی بدترین حرکت اور فرعونی سیاست!!

یہ سیاست اس لئے کھیلی جا رہی تھی کہ اگر ان کو اسی طرح گالیاں دی جائیں گی اور لعنت کہی جائیگی اور وہ بھی مسجدوں اور منبروں پر اور جو بھی چون و چرا کرے گا اس کی خبر لی جائے گی تو پوری پبلک ان پر گالی اور لعنت سنتے سنتے خوگر ہو جائے گی، اور لوگ کہیں گے بڑے بڑے متقی اور پرہیزگار مسجد میں بیٹھ کر ان پر لعنت اور گالی سنتے ہیں۔ اور سب چپ ہیں۔ اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ اور کوئی نہیں بولتا۔ اس سے جمہور کے دل ان سے ہٹ جائیں گے، بلکہ قلوب میں لعنت اور گالیوں کا کچھ اثر بھی آجائے گا۔ ان سے خود بخود ایک طرح کی بیزاری پیدا ہو جائے گی، تصورات بدل جائیں گے، نظریات دوسرے ہو جائیں گے۔ آج جو ان کی تعریف لوگوں کی زبانوں پر ہے کل ان کی مذمت عام ہو جائیگی۔ آج دلوں میں جو ان کا وقار اور تعظیم ہے کل ان کی تحقیر و تذلیل کی فضا پیدا ہو جائیگی۔ اس فضا میں جو نئی نسل سانس لے گی وہ ان کو ایسا ہی سمجھے گی جیسا ان کے بارے میں مسجدوں اور منبروں سے سنے گی۔ اس ترکیب سے اہل بیت کا وقار و احترام اور ان کی محبت و عظمت ہمیشہ کے لئے ختم ہو جائے گی۔ پھر دنیائے اسلام میں بنی امیہ ہی بنی امیہ رہیں گے۔ اور اموی حکمرانوں نے حسین اور دیگر اولاد رسول پر جو شدید ترین مظالم کئے ہیں یا تو ان کو اہمیت ہی نہ دیجائیگی اور کہا جائے گا کہ حسین نے خلیفۂ اسلام کے خلاف بغاوت کی۔ اور بغاوت کی سزا قتل ہے[۵]۔ یا حسین کی اہمیت

---

[۵] افسوس کہ آج بھی کچھ لوگ ایسی ملعون بات زبان پر لاتے ہیں۔ اور اپنی عاقبت خراب کرتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم وصیت فرما گئے تھے کہ میں تم لوگوں کے پاس دو نہایت وزنی چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں ایک ہے قرآن مجید اور ایک ہے میری =

کم ہو جائے گی۔

یہ ہے بنی امیہ کی ناپاک سیاست! کہ:

- اولادِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو نہایت سنگ دلی سے ذبح بھی کر ڈالا۔
- اور ان مظلوموں اور اللہ کے بے حد پیاروں کو معاذ اللہ باغی قرار دیکر انھیں کو مجرم بھی ٹھہرایا۔
- معاذ اللہ مسجدوں میں ان پر گالی اور لعنت کا سلسلہ بھی جاری کیا۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ

کتنا ظلم ہے اہلِ بیت اطہار اور ذریت رسول پر؟ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم۔

اور کتنے محبوب ہیں اللہ کے یہ بے حد پیارے اور بے حد محبوب رسول پاک پر اور ان پر اللہ کا لاکھوں درود و سلام۔

اہل بیت کے دشمنوں نے اہل بیت پر لعنت کہی، لیکن اللہ والوں نے اللہ کے ان پیاروں پر سلام بھیجا اور انشاء اللہ قیامت تک ان پر سلام بھیجتے رہیں گے۔ اس لعنت کا جواب یہ سلام ہے۔

دشمنوں نے اہل بیت پر لعنت بھیجنے اور گالی دینے کے اتنے جتن کئے لیکن نتیجہ کیا نکلا؟

خود یہ لعنت کرنے اور گالی بکنے والے بدترین انسان سمجھے گئے، اور جیسے تھے ویسے ہی مانے گئے

جب یہ ظالم محبوبانِ خدا کو گالیاں دے رہے تھے۔ اس وقت صحابۂ کرام، تابعین عظام اور صالحین امت کے کانوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ آواز گونج رہی تھی:

سباب المسلم فسوق وقتاله مسلمان کو گالی دینا بہت ہی بڑا فسق ہے اور مسلمان

= ذریت، جب تک تم لوگ ان کو پکڑے رہو گے گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔ غور کرو یہ لوگ وصیت رسول کو کس طرح مٹی میں ملا رہے ہیں؟ اور اپنا ایمان یزید اور مزیدیوں اور اللہ کے دشمنوں کی حمایت میں کس طرح خراب کر رہے ہیں۔؟!

لوگو! اپنی عاقبت کی فکر کرو، تم اسی وقت ہدایت پر رہو گے جب تک قرآن مجید اور اولادِ رسول کا دامن تھامے رہو گے۔ قرآن مجید اور اولادِ رسول سے جس کا رابطہ کمزور ہوا وہ ہدایت سے محروم ہو گیا۔ ۱۲ کوثر

کفر [1]　　　　پر تلوار اُٹھانا کفر ہے۔

اور دلوں کی فضا میں حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی صدائے قدوسی بھی گونج رہی تھی۔

من سب علیا فقد سبنی ومن　　　　جس نے علی کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی اور

سبنی فقد سب اللہ [2]　　　　جس نے مجھے گالی دی اس نے اللہ کو گالی دی۔

اس قسم کی حدیثوں سے یہ اکابر ملت بے حد متاثر تھے۔

اہل بیت اطہار پر لعنت بازی اور دشنام طرازی کے زمانہ میں امت کا فرض

اس زمانہ میں جب کہ اہل بیت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر لعنت بازی اور دشنام طرازی کا یہ عالم تھا مسلمانوں پر بہت بڑی ذمہ داری تھی کہ اگر حکومت پر قابو نہیں تو عام مسلمانوں کو اس گناہ سے بچانے کی کوشش کریں۔ صحابۂ کرام تابعین عظام، صالحین امت اور راویان حدیث نے اپنی اس ذمہ داری کو پوری طرح محسوس فرمایا اور لعن و دشنام کے جواب میں حضرت علی امام حسن امام حسین علیہم السلام کے فضائل کی آیات مع شان نزول و تفسیر اور ان کے مناقب کی احادیث و آثار کی اشاعت بڑے زوروں میں فرمائی جس کا یہ اثر ہوا کہ ان بزرگوں کے مدارج علیا، ان کے مقامات بلند، ان کی عظمت و احترام، ان کی محبوبیت عظمیٰ اور بارگاہِ الٰہی میں ان کی وجاہت کبریٰ کا علم برابر جمہور کو ہوتا گیا۔ اور عوام کو اندھیرے میں رکھنے کی کوششیں ناکام ہوگئیں۔ اس طرح سب کو نظر آنے لگا کہ بنی امیہ نے ان محبوبان خدا کے وقار و عظمت کو گرانے کے جو ناپاک پروپیگنڈے پھیلا رکھے ہیں وہ سب کے سب مذہب کو پامال کرنے کی کوششیں ہیں اور ان کی لعنت بازیاں اور دشنام طرازیاں ایمان پھونکنے والے جہنمی شعلے ہیں۔

صحابۂ کرام، تابعین عظام اور راویان حدیث نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین

---

[1] یہ حدیث مسند احمد، صحیح بخاری، صحیح مسلم، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ اور معجم کبیر طبرانی میں ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] جامع صغیر ج ۲ ص ۱۵۰ بحوالہ مسند احمد و مستدرک عن ام سلمہ مشکوٰۃ ص ۵۶۵۔ کوثر

علیہم السلام کے فضائل کی آیات و احادیث کی اشاعت فرما کر مسلمانوں میں ایسی روح پھونک دی کہ اہل بیت اطہار کی محبت کو اساس ایمان و اسلام مانا گیا اور راویان حدیث نے اس قسم کی حدیثیں بنا کر اسمیں اور بھی مضبوطی پیدا کر دی۔

اساس الاسلام حبی وحب اھل بیتی۔ (کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۸)	اسلام کی بنیاد میری محبت اور میرے اہل بیت کی محبت ہے۔

ان علمی اور ایمانی کوششوں سے فضائل اہل بیت کی حدیثوں کی اشاعت اس کثرت سے ہوئی کہ بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا اور امام احمد بن حنبل (م ۲۴۱ھ) نے (جو علم حدیث میں امام بخاری سے بھی آگے ہیں اور حدیث کا پورا ذخیرہ ان کی نگاہوں کے سامنے ہے) یہ اعلان فرمایا:

ما ورد لاحد من اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من الفضائل ما ورد لعلی (تاریخ الخلفاء ص ۱۱۸)	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی صحابی کی اتنی فضیلتیں نہیں آئی ہیں جتنی (حضرت) علی کی آئی ہیں۔

یہ قول اور ائمۂ حدیث کا بھی ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری شرح صحیح البخاری (ج ۷، ص ۵۱) میں لکھتے ہیں۔

قال احمد، واسماعیل القاضی والنسائی وابوعلی النیسابوری لم یرد فی حق احد من الصحابة بالاسانید الجیاد ما جاء فی حق علی۔	(امام) احمد، قاضی اسمٰعیل (امام) نسائی (حافظ) ابو علی نیشاپوری نے کہا ہے کہ (حضرت) علی کی فضیلت میں عمدہ سندوں سے جس کثرت سے حدیثیں آئی ہیں، اتنی حدیثیں کسی صحابی کے بارے میں نہیں آئی ہیں۔

حافظ ابن حجر نے اس کی جو وجہ بتائی ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ:-

حضرت علی جب خلیفہ ہوئے اور لوگوں نے ان کے خلاف خروج کیا اور مخالفت کی نیز ایک ایسی جماعت ظہور میں آئی جس نے آپ سے جنگ تو کی ہی تھی اس کے بعد اتنی شدت برتی کہ آپ کی تنقیص

کی اور منبروں پر چڑھ کر آپ پر لعنت کرنے کو اپنا دستور بنا لیا۔ (واتخذوا لعنہ علی المنابر سنۃ) اور خوارج بھی بغضِ علی میں ان کے ہمنوا ہو گئے، بلکہ آپ کی تکفیر بھی کی اور حضرت عثمان کی بھی تکفیر کی توان وجوہ کی بنا پر اہلسنّت کو اس کی ضرورت ہوئی کہ آپ کے مناقب کی خوب اشاعت کریں۔

یہ حافظ ابن حجر کا نقطۂ نظر ہے اور اس کثرت سے فضائل مرتضوی بیان کرنے کا یہ سبب اپنی جگہ صحیح ہے، لیکن اسکے ساتھ کچھ مزید بات بھی ہے جسے علامہ سید سمہودی نے جواہر العقدین میں لکھا ہے۔ آپ فرماتے ہیں:

> اس کا سبب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو علم بخشا کہ علی جب خلیفہ ہوں گے تو لوگوں کی مخالفت سے ان کو بڑی مصیبتیں پیش آئیں گی۔ لہٰذا آپ نے امت کی خیر خواہی کے پیش نظر حضرت علی کے یہ فضائل بیان فرمائے تاکہ جو ان کو ملحوظ رکھے وہ (مخالفت علی کے خطرات سے) محفوظ رہے۔
>
> پھر جب آپ خلیفہ ہوئے اور آپ کی مخالفت کی گئی تو جن صحابۂ کرام نے ان فضائل کو سُنا تھا انہوں نے امت کی خیر خواہی کے مدنظر ان فضائل کی حدیثوں کی اشاعت فرمائی۔
>
> پھر جب بنی امیہ حضرت علی کی شان گرانے اور ان کی تذلیل کرنے میں لگ گئے اور منبروں پر آپ کو گالیاں دینے لگے اور خوارج بھی ان کے ہمنوا ہو گئے، بلکہ انہوں نے آپ کو کافر تک کہا تو اہل سنت کے حافظان حدیث اور معتبرین روایت نے امت کی خیر خواہی کے لئے اور ان کو گمراہیوں سے بچانے کی خاطر حضرت علی کے فضائل کی حدیثوں کی خوب اشاعت فرمائی، اور اس کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔

یہ ہیں سیدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہٗ الکریم کے بکثرت فضائل کے اسباب اور ان سے متعلق حدیثوں کی اتنی کثرت اور ان کی اتنی زیادہ اشاعت کے اسباب اور یہی اسباب سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہما السلام کے بکثرت فضائل کے بھی ہیں۔

اہل بیت اطہار کی تنقیص کیوقت صحابہ کرام تابعین عظام اور حافظان حدیث کے اسوۂ حسنہ کی پیروی

صحابہ کرام، تابعین عظام، حافظان حدیث اور راویان آثار نے اپنے اپنے زمانہ میں سیدنا حضرت علی مرتضیٰ اور سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہم السلام کے فضائل کی حدیثوں کے نشر و اشاعت سے ایک طرف اپنی امانت کا حق ادا کیا کہ جن حدیثوں کے وہ امین تھے ان کو امت تک پہنچا دیا۔ دوسری طرف بنی امیہ کے ناپاک پروپیگنڈوں کے اثر سے (جو انہوں نے اہل بیت اطہار اور ذریت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان عالی کو گرانے کے لئے شروع کئے تھے) اور اسی طرح خوارج کے بھی ایمان سوز پروپیگنڈوں کے اثر سے امت کو بچانے کی پوری کوشش کی۔

اس سے ہم کو سبق ملا کہ جب کبھی اہل بیت اطہار اور ذریت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی شان وعظمت کو گرانے کی کوشش ظہور میں آئے تو اس وقت علمائے قرآن و حدیث کا فرض ہے کہ ان محبوبانِ خدا کے فضائل و مناقب کی آیتوں تفسیروں اور حدیثوں کی خوب اشاعت کریں۔ یہی وہ بہترین طریق کار ہے جس سے اس قسم کے فتنوں کا پورا استیصال ہو سکتا ہے اور یہی ہے ایسے مواقع پر صحابۂ کرام تابعین عظام، حافظان حدیث اور راویان اخبار کا وہ اسوۂ حسنہ جس سے امت کو اہل بیت اطہار کی محبت میں راسخ بنایا جا سکتا ہے۔ اور ان کی تنقیص شان کے گناہ عظیم سے لوگوں کو بچایا جا سکتا ہے۔

اسی طریق کار نے امت میں محبت اہل بیت کی وہ روح پھونکی ہے کہ جب بھی ان محبوبان خدا کی شان عالی کے خلاف کوئی کارروائی کی گئی تو جمہور کی روح بیدار تڑپ اٹھی کہ یہ تو ہمارے ایمان کو الٹی میٹم دیا گیا ہے اور علمائے دین نے اس کارروائی کو خاک سیاہ بنا دینے کی انتہائی جدوجہد فرمائی۔

عہد قریب کی بات ہے کہ عباسی نے اپنی رسوائے عالم اور نہایت زہریلی کتاب "خلافت معاویہ و یزید" لکھ کر اہل بیت اطہار خصوصاً سیدنا علی مرتضیٰ اور سیدنا امام حسین شہید کربلا علیہما السلام کے خلاف بہت ہی زہر لوئے اور ایمان سوز پروپیگنڈے کئے (جن کا اثر ناسمجھ اور دین سے ناواقف لوگوں پر پڑ رہا تھا۔) تو جمہور کو نیز علمائے دین اور صالحین امت کو ناقابل بیان صدمہ ہوا۔ حالات نے

پکارا کہ اس زہریلی کتاب کے ناپاک پروپیگنڈوں، افتراپردازیوں، غلط بیانیوں اور ایمان سوزیوں کو پوری طرح واشگاف کیا جائے اور وضاحت کی جائے کہ یہ نہایت گمراہ کن کتاب ہے اور اس سے سخت نفرت و بیزاری ظاہر کی جائے۔

الحمدللہ، اس کام کو ہر مکتب فکر کے علما نے بحسن و خوبی انجام دیا۔

یہ کام جس طرح بہت ضروری تھا اسی طرح اس کی تکمیل بھی بیحد ضروری ہے وہ یہ ہے کہ کتاب "خلافت معاویہ و یزید" کے جواب میں فضائل اہل بیت و ذریات طاہرہ کی جو چند آیات و احادیث پیش کی گئی تھیں اب ان کو وسعت دی جائے۔ یعنی اہل بیت اطہار و عترت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کے فضائل و مناقب کی زیادہ سے زیادہ آیتیں اور حدیثیں پیش کی جائیں اور اس موضوع پر مستقل علمی اور ٹھوس کتابیں لکھی جائیں۔ نیز اس قسم کا باوقار پرشکوہ اور سنجیدہ لٹریچر تیار کر دیا جائے جو عصر حاضر کی زبان اور اسلوب میں ہو۔ اور اس کا میٹریل ثقہ، متدین اور دیندار علماء کی روایات ہوں، بالفاظ دیگر صحابہ کرام تابعین عظام، حافظان حدیث اور راویان آثار نے جن احادیث و روایات سے اہل بیت اطہار و عترت مقدسہ کے خلاف پروپیگنڈوں اور ان کی تنقیص شان کی کوششوں کو ناکام بنایا ہے انھیں سے نیز اس مضمون سے متعلق آیات اور ان کی تفسیروں سے اس لٹریچر کو مرتب کیا جائے۔

اردو میں اس قسم کے لٹریچر کی بڑی شدید ضرورت ہے کہ کچھ وقفہ دیدے کہ اہل بیت مطہرا ور عترت طاہرہ کے خلاف جو ناپاک اور زہریلی کتابیں چھپتی رہتی ہیں ان کا سلسلہ اس قسم کے لٹریچر سے یا تو بند ہو جائے گا یا پبلک کے لیے یہ کتابیں بالکل ناقابل توجہ بن کے رہ جائیں گی۔ اور ان کو دیکھنا بھی گناہ سمجھا جائے گا۔

اس ایمانی لٹریچر کے ساتھ فضائل صحابہ کا بھی ایسا ہی باوقار، پرشکوہ، سنجیدہ لٹریچر عصر حاضر کی زبان و اسلوب میں پیش کرنے کی ضرورت ہے حقیقت میں یہ دونوں لٹریچر ایک ایمانی سلسلہ کی دو نورانی کڑیاں ہیں۔

کتاب "خلافت معاویہ ویزید" نے کچی سمجھ والوں اور دین سے ناواقف لوگوں پر جو زہریلا اثر ڈالا ہے اور اس سے متاثر ہو کر اہل بیت اطہار اور ذریت طاہرہ کے خلاف جو پروپیگنڈے کیے جاتے ہیں ان کے استیصال کے لئے ان محبوبان خدا کے فضائل ومناقب بیان کرنے سے بڑھ کر کوئی دوسری چیز کامیاب وموثر نہیں اور سردست اس کی شدید ضرورت ہے۔ لہٰذا راقم السطور نے اس موضوع پر قلم اٹھایا ہے گو اس کے لئے کافی وقت چاہئے لیکن پبلک کا اصرار ہے کہ کتاب جلد از جلد چھپے مجبوراً بالعجلت یہ کتاب تالیف ہو رہی ہے۔ اگر اللہ کو منظور ہے تو اس کے دوسرے ایڈیشن میں مزید مباحث کا اضافہ کیا جائے گا۔ اور ترتیب بھی کچھ بدل دی جائے گی۔

اہل بیت اطہار کی طرف دلوں کی اتنی کشش کیوں ہے؟

حکومت بنی امیہ نے پوری کوشش کی کہ دلوں کو اہل بیت اطہار سے پھیر دے اور اس لئے اس پر لعنت بکنے اور گالی دینے کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ حتیٰ کہ حجاج کے زمانہ میں جو شخص محبت وعقیدت سے حضرت علی کا نام لیتا اس پر آفت توڑی جاتی[1] لیکن ان تدبیروں کے باوجود حکومت کی پوری طاقت اہل بیت کی محبت دلوں سے نہ نکال سکی۔

---

[1] حد ہو گئی کہ جن ائمہ دین کا پبلک پر بہت زیادہ اثر تھا۔ مثلاً امام حسن بصری ان پر یہ دارو گیر تھی کہ علی کی زبان سے جو حدیث سُنی ہے اسے علی کے حوالے سے زبیان کرنا بے چارے بے بس تھے کیا کرتے۔ امام سیوطی الغرقة برفع الخرقة میں لکھتے ہیں اور علامہ احمد قشاشی (جو شاہ ولی اللہ صاحب کے اوپر کے مشائخ حدیث وتصوف میں ہیں) اسے السمط المجید۔ صفحہ ۷۰ میں نقل کرتے ہیں کہ ایک روز امام حسن بصری کے ایک شاگرد موسیٰ بن جبید نے ان سے کہا: "آپ بعض حدیثوں کی روایت میں جو یہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے اور راوی کا نام نہیں لیتے آخر اس کی کیا وجہ ہے؟ خود آپ نے تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کوئی حدیث سنی ہی نہیں اور آپ کا زمانہ تو پایا ہی نہیں"۔ امام حسن بصری اس کے جواب میں فرماتے ہیں: "مجھ سے یہ بات صرف تم نے پوچھی ہے اگر تم سے میرا خاص تعلق نہ ہوتا تو میں اس کی وجہ نہ بتاتا۔ میں جس زمانے میں ہوں تم دیکھ رہے ہو اس عہد میں سب کچھ حجاج کے ہاتھ میں ہے۔ لہٰذا جب میں راوی کا نام لئے بغیر کہوں۔ قال رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم، تو سمجھ لو میں نے یہ حدیث =

اس کے اسباب یہ ہیں کہ یہ لوگ اللہ و رسول کے بڑے ہی پیارے ہیں۔ ان میں رسول کا خون ہے ایمان ان کے گھر سے ملا۔ نیز بکثرت احادیث نے ان کی محبت دلوں میں بٹھا دی ہے۔ چند احادیث یہ ہیں :۔

۱۔ حافظ ابن عساکر کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

اساس الاسلام حبی وحب اھل بیتی (کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۸)

اسلام کی بنیاد میری محبت اور میرے اہل بیت کی محبت ہے۔

۲۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

واللہ لا یدخل قلب امرأ الایمان حتی یحبھم للہ و لقرابتی (ابن ماجہ ص ۱۴)

اللہ کی قسم کسی کے دل میں اس وقت تک ایمان نہیں آسکتا جب تک میرے اہل بیت سے اللہ کے لئے اور میری قرابت کی وجہ سے محبت نہ رکھے۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

من احبنی واحب ھذین واباھما وامھما کان معی فی درجتی یوم القیامۃ (احمد و ترمذی)

جو شخص مجھ سے محبت کرے گا اور ان دونوں (حسن و حسین) سے اور ان کے والد سے اور ان کی والدہ سے وہ قیامت کے روز میرے ساتھ رہے گا۔

۴۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

ان مثل اھل بیتی فیکم مثل سفینۃ نوح من رکبھا نجا ومن تخلف عنھا غرق (مستدرک بحوالہ کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۵)

تم لوگوں میں میرے اہل بیت ایسے ہیں جیسے طوفان سے بچنے کے لئے نوح کی کشتی، جو اس کشتی پر سوار ہو اس نے ڈوبنے سے نجات پائی اور جو اس سے الگ رہا وہ ڈوب گیا۔

= حضرت علی سے سنی ہے۔ آپ کا نام نہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ نام لینے نہیں دیا جاتا۔ یہ واقعہ الکوکب الدری ج ۱ ص ۱۰۱ میں بھی ہے۔ اس میں امام حسن سے پوچھنے والے کا نام موسٰی جعید کے بجائے یونس ابن جعید ہے۔ ۱۲ کوثر

۵۔ حضرت سلمہ ابن اکوع رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

النجوم امان لاھل السماء واھل	تارے آسمان والوں کے لئے امن وامان ہیں اور
بیتی امان لامتی۔	میرے اہل بیت میری امت کے لئے امن وامان ہیں
(مسند ابو یعلی بحوالہ کنز العمال ۲۱۶/۶)	(یعنی ان کی برکت سے امن وامان ہے)۔

۶۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

احبوا اللہ لما یغذوکم بہ من نعمہ	اللہ سے محبت رکھو کہ وہ تمھیں اپنی نعمت کی روزی
واحبونی لحب اللہ واحبوا اھل بیتی	دیتا ہے اور اللہ سے محبت کی بنا پر مجھ سے محبت رکھو اور
لحبی۔ (ترمذی ومستدرک کنز العمال ۲۱۶/۶)	میری محبت کی بنا پر میرے اہل بیت سے محبت رکھو۔

۷۔ حضرت ابو موسیٰ سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

انا وعلی وفاطمۃ والحسن والحسین	میں اور علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین قیامت
یوم القیامۃ فی قبۃ تحت العرش۔	کے روز ایک قبہ میں ہوں گے جو عرش کے نیچے ہوگا
(معجم کبیر طبرانی کنز العمال ۲۱۵/۶)	(یعنی عرش اس کی چھت ہوگی)۔

۸۔ حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان من اشفع لہ یوم القیامۃ من	قیامت کے روز میں اپنی امت میں سب سے پہلے
امتی اھل بیتی ثم الاقرب فالاقرب	اپنے اہل بیت کی شفاعت کروں گا پھر قریش میں ان
من قریش، ثم الانصار، ثم من	لوگوں کی جو مجھ سے قریب تر ہیں۔ اسی طرح حسب
آمن بی واتبعنی من الیمن، ثم	قرابت لوگوں کی پھر انصار کی پھر اہل یمن میں ان
من سائر العرب، ثم الاعاجم	لوگوں کی جو مجھ پر ایمان رکھیں گے اور میری پیروی
ومن اشفع لہ اولا افضل۔	کریں گے پھر تمام عرب کی پھر اہل عجم کی، اور جس کی
(معجم کبیر طبرانی کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۵)	میں شفاعت پہلے کروں گا وہ افضل ہے۔

۹۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

نحن ولد عبد المطلب سادة اهل الجنة، انا وحمزة وعلی وجعفر والحسن، والحسین والمهدی

ہم اولاد عبد المطلب اہل جنت کے سردار ہیں۔ یعنی میں اور حمزہ اور علی اور جعفر اور حسن اور حسین اور مہدی۔

(ابن ماجہ و مستدرک کنز العمال ص ۲۱۶)

۱۰۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

من سره ان یحیی حیاتی ویموت مماتی ویسکن جنة عدن غرسها ربی فلیوال علیا من بعدی ولیوال ولیه، ولیقتد باهل بیتی من بعدی فانهم عترتی خلقوا من طینتی، ورزقوا فهمی وعلمی فویل للمکذبین بفضلهم من امتی القاطعین فیهم صلتی، لاانالهم الله شفاعتی۔

(طبرانی والرافعی کنز العمال ج ۶ ص ۲۱۸)

جس کو یہی بھلا لگتا ہے کہ میرے طور پر زندگی بسر کرے اور میرے طور پر دنیا سے اٹھے اور جنت عدن میں بسے جس میں اللہ نے خصوصیت کے ساتھ نخل بندی کی ہے تو اس کو ایسا کرنا چاہیئے کہ میرے بعد بھی علی سے موالات و محبت رکھے اور ان کے وارثوں سے بھی اور میرے بعد میرے اہل بیت کی اقتدا کرے کیونکہ یہ لوگ میرے خمیر و طینت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور ان کو میری سمجھ اور میرے علم کا حصہ ملا ہے۔ میرے اس امتی کے لئے ویل و تباہی ہے جو ان کی فضیلت کا منکر ہے اور مجھ سے ان کا جو تعلق ہے اسے کاٹنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو میری شفاعت سے محروم رکھے گا۔

ف: ان میں سے بعض حدیثوں کی سند اگرچہ ضعیف ہے لیکن چونکہ ان کے مضمون کی تائید دوسری حدیثوں سے ہوتی ہے لہذا ان کو لیا جا سکتا ہے بعض لوگوں نے معاملہ اور وسیع کر دیا ہے، محدث وقت مفسر کبیر عارف ربانی حضرت علامہ عبد الحق مہاجر مکی الدر المنظم ص ۱۵۸ میں لکھتے ہیں:۔

قال اسماعیل الدهلوی: انه قد

اسماعیل دہلوی نے کہا ہے: جو فضائل غیر موضوع حدیث سے

یوخذ الموضوع یعنی مالم یثبت وضعہ بخصوصہ فی بیان الفضائل ماثبت فضلہ بغیرہ تائیدا۔

ثابت ہیں ان کی تائید میں کبھی اس حدیث کو بھی لیا جاتا ہے جو (محدثین کے عام قاعدہ سے تو) موضوع ہے لیکن خاص اس کے متعلق ثبوت نہیں کہ یہ کبھی جعلی ہے۔[1]

۱۱۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ آیت کریمہ حضرت علی کے بارے میں نازل ہوئی ہے[2]

اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ۝ (مریم، ۹۶)

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ ایمان لائے اور اچھے عمل کئے عنقریب اللہ ان کی محبت (مومنوں کے دلوں[3] میں) پیدا کردے گا۔

تفسیر مظہری (ج ۶ ص ۱۲۲) میں اس شانِ نزول کے لکھنے[4] کے بعد کتب حدیث کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

- من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ (احمد ابن ماجہ نسائی ترمذی) جس کا میں مولا علی اس کا مولا۔
- ذکر علی عبادۃ۔ (مسند الفردوس) علی کا ذکر عبادت ہے۔
- حب علی عبادۃ۔ (مسند الفردوس) علی کی محبت عبادت ہے۔

---

[1] یہ ترجمہ راقم السطور کا ہے۔ حضرت مہاجر کی کا ترجمہ لفظی ہے اور عام فہم نہیں۔ ۱۲ کوثر

[2] الدر المنثور ج ۴ ص ۲۸۷۔ ۱۲ کوثر

[3] یہ عبارت حضرت ابن عباس کی تفسیر ہے۔ ۱۲ کوثر

[4] شانِ نزول ان الفاظ میں لکھی ہے، عن ابن عباس قال نزلت ھٰذہ الاٰیۃ فی علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، یعنی یجعل اللہ تعالٰی محبتہ فی قلوب المؤمنین و سائر الخلائق غیر الکافرین ۱۲ کوثر

اہل بیت

قرآن کی روشنی میں

اہلبیت گناہوں سے پاک ہیں

قرآن مجید کا بیان

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ
اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ۝

(اے اہلبیت اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم لوگوں سے (گناہوں کی) گندگی کو دور رکھے اور تم کو خوب ہی پاک و طاہر بنا دے)

آیۂ تطہیر

حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کا تقدس اور پاکیزگی

ان پاک طینت اور پاکیزہ صفات و کردار حضرات کی ایک ممتاز صفت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی شانِ عالی میں فرماتا ہے:

اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ اَهْلَ الْبَيْتِ وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا ○ (احزاب پ۲۲ ع۱)	اے اہل بیت اللہ تو بس یہی چاہتا ہے کہ تم لوگوں سے (گناہوں کی) گندگی کو دور رکھے اور تم کو خوب ہی پاک بنادے۔

اس آیت میں اہل بیت سے کون لوگ مراد ہیں ؟

خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے موقع پر فرمادیا کہ "اہل بیت" یہ لوگ ہیں "علی، فاطمہ، حسن اور حسین" (ترمذی باب التفسیر ج ۲ ص ۱۵۲ و دیگر متعدد کتب حدیث و تفسیر) اب اس کے بعد کسی کو لب کشائی کی گنجائش ہی نہیں۔ مزید تفصیل انشاء اللہ آگے آئے گی۔

اس آیت کے رو سے یہ حضرات گناہوں سے پاک و مطہر ہیں۔ حافظ طبرانی، امام ابونعیم اصفہانی امام بیہقی، حکیم ترمذی، حافظ ابن مردویہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت لکھتے ہیں جو طویل ہے اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث ہے اس کا آخری جملہ یہ ہے:

فانا واھل بیتی مطھرون من الذنوب (الدر المنثور ج ۵ ص ۱۹۹)	میں اور میرے اہل بیت گناہوں سے پاک و صاف ہیں۔

مشہور تابعی مفسر حضرت ضحاک بن مزاحم کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

نحن! اهل بیت طهرهم الله من شجرة النبوة وموضع رسالة ومختلف الملائکة وبیت الرحمة ومعدن العلم (الدر المنثور ج ۵ ص ۱۹۹)

ہم لوگ اہل بیت ہیں جن کو اللہ نے پاک و مطہر بنایا ہے۔ ہم لوگ شجرۂ نبوت، محل رسالت، محیطِ ملائکہ، بیت رحمت اور معدن علم سے (ظہور میں) آئے ہیں۔

آیۂ تطہیر کی شان نزول

مشہور صحابی حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

نزلت هذه الآية فی خمسة: فیّ وفی علی، وفاطمة وحسن وحسین انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا [1]

یہ آیت 'انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیرا' پانچ شخصوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے میرے بارے میں اور علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین کے بارے میں ہے۔

اس روایت کی تائید حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ آپ فرماتی ہیں:

نزلت هذه الآية فی رسول الله صلی الله علیه وسلم وعلی وفاطمة وحسن وحسین علیهم السلام [2]

یہ آیت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

شان نزول کا تفصیلی بیان

امام ترمذی، امام طحاوی، امام ابن جریر، امام ابن منذر، امام بیہقی، امام طبرانی وغیرہم کی روایت ہے کہ ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:-

---

[1] الدر المنثور ج ۵ ص ۱۹۸ بحوالہ ابن جریر و ابن ابی حاتم۔ نور الابصار میں مسند احمد کا بھی حوالہ ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۳۳ مطبوعہ دائرۃ المعارف حیدرآباد دکن ۱۳۳۳ھ۔ کوثر

في بيتي نزلت انما يريد الله ليذهب عنكم الرجس اهل البيت ويطهركم تطهيرا وفي البيت علي وفاطمه و حسن وحسين فجللهم رسول الله صلى الله عليه وسلم ثم قال: اللّٰهم هؤلاء اهل بيتي فاذهب عنهم الرجس وطهرهم تطهيرا [1]

یہ آیت: انما یرید اللہ لیذہب عنکم الرجس اہل البیت ویطہرکم تطہیراً میرے گھر میں نازل ہوئی ہے اس وقت میرے گھر میں علی، فاطمہ، حسن، اور حسین تھے آپ نے ان لوگوں کو اپنی کملی اڑھا دی جو آپ کے بدن پر تھی۔ پھر کہا: یا اللہ یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں ان سے (گناہوں کی) گندگی دور رکھ اور انھیں خوب ہی پاک و مطہر بنا دے۔

یہ شانِ نزول متواتر روایت ہے جسمیں کسی شک وشبہہ کی گنجائش ہی نہیں

آیت تطہیر کے بارے میں یہ روایت کہ یہ آیت حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کے گھر میں نازل ہوئی اور اس کے نزول کے موقع پر رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسن وحسین علیہم السلام کے بارے میں فرمایا ہے: "یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں"۔ بالکل یقینی روایت ہے اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ یہ متواتر ہے جس کے یقینی ہونے میں کسی کو کلام نہیں اور اس کے خلاف جو بات کہی جائے گی وہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے۔ [2]

شان نزول کی یہ روایت متعدد صحابیات وصحابہ سے مروی ہے مثلاً ام المومنین حضرت اُم سلمہ ام المومنین حضرت عائشہ، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت ابوسعید خدری، حضرت واثلہ بن اسقع، حضرت انس، حضرت معقل بن یسار، حضرت ابوالحمراء رضی اللہ عنہم اجمعین۔

---

[1] الدر المنثور ج ۵ ص ۱۹۸۔ اس میں طحاوی کا حوالہ نہیں، لیکن مشکل الآثار طحاوی ص ۱/۳۳۳ میں اس مضمون کی حدیث موجود ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] وہ عروہ کی بات ہو یا عکرمہ کی یا کسی اور کی۔ ۱۲ کوثر

عہد صحابہ کے علاوہ اور دور میں بھی اس کے راوی اس کثرت سے ہیں کہ یہ روایت متواتر ہو گئی ہے ۔

پنجتن پاک آیت تطہیر کی شان نزول کی متعدد روایتوں نے پوری وضاحت کے ساتھ بتایا ہے کہ یہ آیت مقدسہ پانچ قدسیوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔ (۱) رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم (۲) حضرت علی (۳) حضرت فاطمہ (۴) امام حسن (۵) امام حسین علیہم السلام (ان میں سے دو روایتیں اوپر لکھی جا چکی ہیں) ۔

اس سے ہمیں روشنی ملتی ہے کہ قرآن و حدیث کی رو سے یہ پانچوں مقدس ہستیاں گناہوں سے پاک و مطہر ہیں اسی لئے ان کو پنجتن پاک کہا جاتا ہے ۔ ذہن نشین کر لیجیے پنجتن پاک یہ حضرات ہیں (۱) رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم (۲) حضرت علی (۳) حضرت فاطمہ (۴) امام حسن (۵) امام حسین علیہم السلام ۔

آیۂ تطہیر میں لفظ اہل البیت سے کون لوگ مراد ہیں؟ اس باب کے شروع میں لکھا گیا ہے کہ: خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس آیت کے نزول کے موقع پر فرمادیا کہ اہل بیت یہ لوگ ہیں "علی فاطمہ، حسن اور حسین"۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تفسیر کے بعد کسی تفسیر کی ضرورت نہیں ۔ اس کے خلاف جو کچھ کہا گیا ہے وہ ناقابل اعتنا ہے کہ نص کے مقابلہ میں کسی کی بات کوئی وزن ہی نہیں رکھتی ۔

رسول پاک صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس تفسیر کے بعد نیز بکثرت صحابہ کے اس بیان کے بعد یہ کہ آیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لازمی تھا کہ اسے بلا چون و چرا مان لیا جاتا ۔ اور کسی قسم کی قیاس آرائی نہ کی جاتی لیکن بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ :۔

"قرآن کی رو سے آیۂ تطہیر میں "اہل البیت" سے مراد صرف نبی کی بیویاں ہیں، اور علی، فاطمہ، حسن اور حسین (معاذ اللہ) قرآن کے رو سے اہل بیت نہیں ۔

ہاں حدیث کے رو سے انہیں بھی اہل بیت کہہ لو۔"

حیرت! اور تعجب! کہ رسول اعظم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم تو اس آیت کے لفظ "اہل البیت" کی تفسیر خود فرمائیں اور بالکل کھلے الفاظ میں حضرت علی حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہ و علیہم السلام کو اس آیت کے نزول کے موقع پر "ھٰؤلاءِ اھل بیتی" (یعنی یہ میرے اہل بیت ہیں) فرماکر توضیح فرمادیں کہ "یہ ہیں اہل بیت" جس کے بعد کسی کو لب کشائی کی مجال نہیں، لیکن یہ لوگ اس پر بھی اپنی تفسیر پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ اور مزید بے باکی یہ کہ اپنی تائید کے لئے بعض مفسرین مثلاً امام بغوی، امام رازی اور مفسر ابن کثیر وغیرہم کی کتابوں سے حوالہ پیش کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں، حالاں کہ ان مفسروں نے کہا بھی ہے کہ "اس آیت میں لفظ اہل بیت سے مراد رسول صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں بھی ہیں اور حضرت علی حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین بھی" گویہ بات بھی امام طحاوی جیسے بلند پایہ محقق کے نزدیک صحیح نہیں بلکہ اس آیت میں لفظ "اھل البیت" سے مراد صرف حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین علیہم السلام ہیں۔ تفصیل حسب ذیل ہے:

جن مفسرین نے لکھا ہے کہ آیۂ تطہیر میں لفظ "اھل البیت" سے مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں بھی ہیں ان کے اس قول کی بنیاد صرف قیاس پہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آیت تطہیر کے پہلے بھی ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہے اور اس کے بعد بھی انہیں کا ذکر ہے۔ لہٰذا آیۂ تطہیر میں "اھل البیت" سے ان کو مراد لینا ہی چاہیئے ورنہ کلام بے ربط ہو جائیگا۔

لیکن یہ بات وزنی نہیں۔ اسی لئے امام طحاوی جیسے امام مجتہد اور قرآن و حدیث کے عدیمُ المثال نکتہ شناس نے اس کی سخت تردید کی ہے جس کا بیان ان شاءاللہ ایک مستقل فصل میں آئیگا۔

اس کے صحیح نہ ہونے کی ایک وجہ یہ ہے کہ ربط کلام کا انحصار اس پر نہیں ہے کہ "اہل البیت" سے مراد ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہی لیا جائے۔ (ورنہ کلام بے ربط ہو جائے گا۔)

بے ربط قرآن کا ایک اہم اصول

اس سے بھی ربط کلام کھل جاتا ہے کہ جو کلام غیر مربوط معلوم ہو رہا ہے، اسے

جملہ مستانفہ سمجھو[1]۔ اگر یہاں جملہ مستانفہ مانئے تو اسلوبِ کلام بے حد بلیغ نظر آنے لگتا ہے اور افادیت بڑھ جاتی ہے۔ قرآن مجید میں مستانفہ کی مثالیں بکثرت ہیں، کشاف، بیضاوی، تفسیر کبیر، تفسیر ابی سعود، البحر المحیط، روح المعانی، جلالین اور جمل وغیرہ میں جابجا موجود ہے کہ یہ قرآنی جملہ مستانفہ ہے۔

جملہ مستانفہ پیش کرنا عربی ادب کا نہایت حسین و بلیغ اسلوب ہے اس سے کلام میں بڑی لطافت پیدا ہو جاتی ہے اور کلام اتنا مدلل ہو جاتا ہے کہ کسی سوال و ایراد کی جگہ نہیں رہتی۔

جملہ مستانفہ کا مطلب یہ ہے کہ:

دورانِ کلام میں اگر کسی کو کچھ پوچھنے کی جگہ ہو تو اس کے پوچھے بغیر جواب دیدو۔ اس سے مخاطب میں بڑا انبساط پیدا ہو جاتا ہے پھر جواب دینے کے بعد وہ سلسلۂ کلام آگے بڑھاؤ جو پہلے سے جاری تھا۔ عربی میں اس اسلوبِ بیان کو استیناف کہتے ہیں اور اس کے پیش کئے ہوئے جملہ کو جملہ مستانفہ کہتے ہیں۔ اس کے بارے میں یہ حقیقت ہمیشہ ملحوظ رکھو کہ یہ جملہ ایک پوشیدہ سوال کو حل کرتا ہے جس کے بعد کسی سوال و ایراد کی جگہ نہیں رہتی۔ ہر زبان کے ادبِ اعلیٰ میں اور معجز بیان ادیب و شاعر کے کلام میں اس کی بکثرت مثالیں موجود ہیں جو لطفِ زبان اور حسنِ بیان کے لعل و جواہر مانے جاتے ہیں اور قرآن مجید کے مستانفہ جملے تو حسن بلاغت کا اعجاز ہیں۔ یہ دلوں کی ان باتوں کو بھی حل کر دیتے ہیں، جو نوکِ زبان پر کبھی نہیں آئی ہیں اور اس سلسلے میں بڑے بڑے حقائق و معارف اور حکمات و بصائر بیان کرتے ہیں۔

آیۂ تطہیر جملہ مستانفہ ہے

امام علامہ قاضی ابو المحاسن یوسف بن موسیٰ (م ۸۰۳ھ) جو نہایت بلند پایہ حنفی محقق اور امام طحاوی (م ۳۲۱ھ) کے علوم کے خازن ہیں۔ اپنی عدیم المثال کتاب "المعتصر" (ج ۲ ص ۲۶۷) میں لکھتے ہیں۔

---

[1] جملہ مستانفہ کی تشریح آگے آتی ہے۔ ۱۲ کوثر

ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو (اِنْ کُنْتُنَّ تُرِدْنَ) سے جو خطاب تھا وہ اَقِمْنَ الصَّلٰوۃَ وَاٰتِیْنَ الزَّکٰوۃَ پر ختم ہو گیا، (اس کے بعد) یہ ارشاد الٰہی: اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْہِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ جملہ مستانفہ ہے جو اہل بیت کی توقیر اور رفعت شان کے لئے آیا ہے۔ غور کرو (ازواج النبی کو مؤنث کے صیغہ سے خطاب ہے اور) اہلبیت کو مذکر کے صیغہ سے اسی لئے لیذہب عنکم فرمایا ہے عنکن نہیں فرمایا۔ لہٰذا کسی کے پاس ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس آیت میں شامل کرنے کی کوئی حجت ہی نہیں ہماری ایک دلیل یہ بھی ہے کہ (اس آیت کے نزول کے بعد) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم صبح کو حضرت فاطمہ کے دروازے پر تشریف لا کر یہ کہتے :

"السلام علیکم اهل البیت، انما یرید الله
لیذهب عنکم الرجس اهل البیت
ویطهرکم تطهیرا[1] ۝"

اس کی تشریح کے لئے آیۂ تطہیر کے پہلے کی آیتیں پڑھئے جن میں ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب فرمایا گیا ہے اور پہلے پس منظر پر نظر ڈالئے۔ پس منظر یہ ہے کہ :

---

[1] قاضی صاحب کا متن یہ ہے : ۔ والکلام لخطاب ازواج النبی صلی اللہ علیہ وسلم ثم عند قولہ: واقمن الصلٰوۃ واٰتین الزکوٰۃ، وقولہ تعالیٰ انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت (ویطهرکم تطهیرا ۝) استیناف تشریفاً لاهل البیت وترفیعاً لمقدارهم الاترى انه جاء علی خطاب المذکر فقال عنکم، ولم یقل عنکن، فلا حجة لاحد فی ادخال الازواج فی هذه الآیة، یدل علیه ما روی ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کان اذا اصبح الی باب فاطمة فقال: السلام علیکم اهل البیت، انما یرید اللہ لیذهب عنکم الرجس اهل البیت ویطهرکم تطهیرا ۝ ۱۲ کوثر

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محترم بیویوں نے آپ سے مزید گھریلو خرچ طلب کیا اور آپ پر زیادہ بار ڈالنا چاہا چونکہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا کے مزخرفات اور تکلفات سے یکسر کنارہ کش تھے یہ طلب خاطر اقدس پر گراں گذری، اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں، جن میں آپ کو حکم الٰہی ہے کہ آپ اپنی بیویوں کو یہ ہدایات اور یہ احکام سنا دیجئے، آیات میں متعدد ہدایات اور تنبیہات ہیں۔ ان کو توجہ سے پڑھیے:

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّبِيُّ قُل لِّأَزْوَٰجِكَ إِن كُنتُنَّ	اے نبی اپنی بیویوں سے کہدو: اگر تم دنیا کی زندگی
تُرِدْنَ ٱلْحَيَوٰةَ ٱلدُّنْيَا وَزِينَتَهَا	اور دنیا کی آرائش چاہتی ہو تو آؤ میں تمہیں کچھ
فَتَعَالَيْنَ أُمَتِّعْكُنَّ وَأُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا	سامان دیکر حسن و خوبی کے ساتھ چھوڑ دوں، اور
جَمِيلًا ۝ وَإِن كُنتُنَّ تُرِدْنَ ٱللَّهَ وَ	اگر تم اللہ اور رسول اور دار آخرت چاہتی ہو تو اللہ
رَسُولَهُۥ وَٱلدَّارَ ٱلْءَاخِرَةَ فَإِنَّ ٱللَّهَ	نے تم میں سے نیک عمل والیوں کے لئے بڑا ثواب
أَعَدَّ لِلْمُحْسِنَٰتِ مِنكُنَّ أَجْرًا عَظِيمًا ۝ ۲۹	مہیا کر رکھا ہے۔
يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ مَن يَأْتِ مِنكُنَّ بِفَٰحِشَةٍ	اے نبی کی عورتو تم میں سے جو عورت صریح
مُّبَيِّنَةٍ يُضَٰعَفْ لَهَا ٱلْعَذَابُ	بے حیائی کا کام کرے گی اس کو دونا عذاب دیا
ضِعْفَيْنِ ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى ٱللَّهِ	جائیگا۔ اور یہ کام اللہ کے لئے بہت آسان ہے۔
يَسِيرًا ۝ وَمَن يَقْنُتْ مِنكُنَّ لِلَّهِ وَ	اور تم میں سے جو عورت اللہ اور رسول کی
رَسُولِهِۦ وَتَعْمَلْ صَٰلِحًا نُّؤْتِهَآ	فرماں بردار رہے گی اور عمل صالح کرے گی
أَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ وَأَعْتَدْنَا لَهَا	اس کو ہم دونا ثواب دیں گے اور اس کیلئے
رِزْقًا كَرِيمًا ۝ ۳۱	عزت کی روزی مہیا کر دیں گے۔
يَٰنِسَآءَ ٱلنَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَأَحَدٍ مِّنَ	اے نبی کی عورتو تم اور عورتوں کی طرح
ٱلنِّسَآءِ ۚ إِنِ ٱتَّقَيْتُنَّ فَلَا تَخْضَعْنَ	نہیں ہو بشرطیکہ تقویٰ کے ساتھ رہو، پھر دبی
بِٱلْقَوْلِ فَيَطْمَعَ ٱلَّذِى فِى قَلْبِهِۦ	زبان کو کرکے بات نہ کرو کہ جس کے دل میں روگ ہے

مَرَضٌ وَّقُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝	اسے بڑا لالچ پیدا ہوگا اور بڑے قرینہ کی بات بولنا
وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ	اور اپنے گھروں میں قیام رکھنا اور قدیم جاہلیت
تَبَرُّجَ الْجَاهِلِیَّةِ الْاُوْلٰی وَاَقِمْنَ	کی طرح گھروں سے نکل کر اپنے کو نمایاں نہ کرنا۔
الصَّلٰوةَ وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ وَاَطِعْنَ اللّٰهَ	اور نماز پڑھتی رہنا، زکوٰۃ دیتی رہنا اور اللہ
وَرَسُوْلَهٗ ؕ	ورسول کی فرماں برداری کرتی رہنا۔

یہاں تک آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو اللہ کی طرف سے بڑا ہی اہم ہدایت نامہ اور تنبیہات ملیں جو بے حد موثر ہیں اور اس بنا پر دی گئی ہیں کہ ان کی باتوں سے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تکلیف پہنچی تھی۔ اب یہاں یہ سوال ہو سکتا ہے خصوصاً حضرت فاطمہ زہرا اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کو کہ ازواج مطہرات کی باتیں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خاطر اقدس پر گراں ہوئی تو ان کو اتنی تنبیہات کی گئیں۔ آپ سے ہم لوگوں کے تعلقات تو اور بھی اہم ہیں جنکی بنا پر متعدد قسم کی اہم ترین باتیں پیش آسکتی ہیں۔ اگر خدانخواستہ ہماری باتیں خاطر اقدس پر گراں گذریں تو نہ جانے ہمارے متعلق کیسی کچھ تنبیہات نازل ہوں گی اور کیا ہوگا ؟

یہ ایک قدرتی سوال ہے جس میں بڑا خوف ہے۔ قرآن مجید اس کے جواب میں جو فرماتا ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ تم لوگوں سے یہ گناہ نہ ہوگا۔ تمہارے متعلق تو اللہ کی مشیت یہی ہے۔ تم کو گناہوں سے پاک رکھے گا، الفاظ یہ ہیں :

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰهُ لِیُذْهِبَ عَنْكُمُ الرِّجْسَ	اے اہل بیت تم لوگوں کے متعلق تو اللہ بس یہی
اَهْلَ الْبَیْتِ وَیُطَهِّرَكُمْ تَطْهِیْرًا ۝	چاہتا ہے کہ تم سے (گناہوں کی) گندگی دور رکھے
(احزاب، ع - ۴)	اور تمھیں خوب پاک بنا دے۔

دیکھا آپ نے ؟ آیۂ تطہیر کو جملہ مستانفہ قرار دیجئے تو یہ حقائق و معارف سامنے آتے ہیں حقیقت میں یہ جملۂ مستانفہ اصحاب کساء (حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن، امام حسین) کے اعزاز اور رفعت شان کو نمایاں کرتا ہے اسی لئے علامہ قاضی ابوالمحاسن نے المعتصر میں لکھا ہے :

اِنَّمَا یرید اللّٰہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت (ویطہرکم تطہیرا)
جملہ مستانفہ ہے جو اہل بیت کی توقیر اور رفعت شان کیلئے آیا ہے[1]۔"

چونکہ آیۂ تطہیر جملۂ مستانفہ ہے یعنی قدرتی سوال کا جواب ہے اور یہ سوال کلام اللہ کی مذکورہ بالا ہدایات و تنبیہات سے قدرتاً پیدا ہوا تھا۔ لہٰذا جواب دینے کے بعد اثنائے کلام کی بات ختم ہو جاتی ہے اور پہلا سلسلۂ کلام پھر شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدایت شروع کر دی جاتی ہے اس طرح دیکھو تو کلام اول سے آخر تک مربوط ہے۔ کہیں بھی غلاء اور بے ربطی نہیں، بیچ میں جو ایک جملہ آگیا تھا وہ اسی سلسلہ کے ایک قدرتی سوال کا جواب تھا اور اس سے کلام کے کچھ اور زاویے بھی سامنے آگئے۔ اور افادیت بڑھ گئی۔ ایسے جملے اعلیٰ درجہ کے مربوط کلام میں ہوا کرتے ہیں۔ اور کلام کی افادیت بڑھا دیتے ہیں۔

آیۂ تطہیر کے بعد ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو ہدایات دی گئی ہیں وہ یہ ہیں:

وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِي بُيُوْتِكُنَّ مِنْ	اور تمھارے گھروں میں اللہ کی جو آیتیں اور حکمت
اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ	کی باتیں پڑھی جاتی ہیں انھیں یاد کرو اور یاد رکھو
كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝	بالیقین اللہ بار یک سے باریک چیزوں کو دیکھتا ہے
	اور ظاہر و باطن سے باخبر ہے۔

امام طحاوی کی تحقیق کہ آیۂ تطہیر میں اہل بیت سے مراد حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین ہیں، ازواج النبی مراد نہیں

قدیم مفسرین میں عکرمہ کو بڑا اصرار ہے کہ آیۂ تطہیر ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور تم لوگ جن کے بارے میں سمجھتے ہو ان کے بارے میں نازل نہیں ہوئی ہے الفاظ یہ ہیں:

---

[1] اس کا عربی متن گزشتہ صفحہ کے حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے۔ ۱۲ کوثر

لیس بالذی تذھبون الیہ انما ھو نساء النبی صلی اللہ علیہ وسلم (الدر المنثور ج ۵ ص ۱۹۸)	تم لوگ جدھر جا رہے ہو وہ بات نہیں ہے، یہ آیت جن کے بارے میں نازل ہوئی ہے وہ تو صرف نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں ہیں۔

عکرمہ اس جملہ میں اپنے زمانے کے ان لوگوں کی بات کاٹ رہے ہیں جن کا قول ہے کہ یہ آیت حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ عکرمہ اپنی رائے میں اتنے متشدد تھے کہ بازاروں میں چلا چلا کر کہتے تھے کہ: یہ آیت خاص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ (ابن جریر ج ۲۲ ص ۸ مطبع مصطفیٰ البابی مصر) اور یہ تشدد اتنا بڑھ گیا تھا کہ وہ علانیہ کہتے تھے:

من شاء باھلتہ انھا نزلت فی شان نساء النبی صلے اللہ علیہ وسلم (ابن کثیر ج ۳ ص ۴۸۳)	یہ آیت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے بارے میں جو چاہے میں اس سے مباہلہ کرنے کو تیار ہوں۔

یہ صحابہ اور تابعین کا زمانہ تھا، عکرمہ کا یہ تشدد اور مباہلہ کی آمادگی بتا رہی ہے کہ لوگ عکرمہ کے برعکس یہ کہتے تھے کہ یہ آیت علی، فاطمہ، حسن اور حسین کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور یہ قیاس ہی نہیں ہے کہ بلکہ روایت سے ثابت بھی ہے کہ متعدد صحابہ اور تابعین کا قول ہے کہ یہ آیت علی فاطمہ اور حسن اور حسین کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ پھر ان کے ارشاد کے سامنے عکرمہ کی بات کا وزن ہی کیا؟ مزید برآں جب یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ خود ان کے زمانہ میں یہ بات شہرت پکڑ چکی تھی کہ عکرمہ خارجی رجحان کے آدمی ہیں تو ان کی بات اور بھی بے وزن ہو جاتی ہے۔ ان کی خارجیت والی رائے کی شکایت عوام ہی کو نہیں بلکہ بڑے بڑے اماموں کو بھی ہے جن میں امام یحییٰ بن سعید انصاری اور امام مالک بھی ہیں۔ امام حافظ ابن ابی حاتم[1] الجرح والتعدیل (قسم ثانی ج ۳ ص ۸) ذکر عکرمہ میں اپنے جلیل القدر

---

[1] یہ بزرگ حضرت امام ابو حاتم ہمدوش امام احمد حنبل کے صاحبزادے ہیں یہ امام عبدالرحمٰن ابن ابی حاتم ہے ۳۲۷ھ میں =

والد امام کبیر حافظ ابو حاتم کا ارشاد نقل کرتے ہیں :

والذی انکر علیہ یحیی بن سعید الانصاری و مالک فلسبب رایہ۔ — یحیی ابن سعید انصاری اور (امام) مالکؒ نے جو عکرمہ کو برا سمجھا ہے اس کا سبب عکرمہ کی خارجی رائے ہے۔

چونکہ عکرمہ اپنے خارجی رجحان کے علاوہ باقی دینی معلومات میں بڑے پایہ کے آدمی اور حضرت عباسؓ کے ایک بڑے شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ حضرت عائشہؓ، حضرت ابن عمرؓ حضرت ابوہریرہ اور حضرت ابوسعید خدری وغیرہ جیسے صحابہ کے بھی مشہور شاگرد ہیں۔ اور مدینہ منورہ، مکہ معظمہ بصرہ وغیرہ اہم اسلامی ممالک میں ان کے شاگردوں کی بڑی تعداد تھی، جن کی فہرست کتاب الجرح والتعدیل امام ابن ابی حاتم اور دیگر کتب رجال میں ہے اس لئے آیۂ تطہیر کے بارے میں ان کا نظریہ عالم اسلام میں خوب پھیلا۔ اور بہت سے مفسرین کم و بیش اس سے متاثر ہوئے۔ قدیم کتب تفسیر بھی اس سے خالی نہیں۔

جب بڑے بڑے اہل علم کسی بات کو بولنے لگتے ہیں تو مشاہیر کی کتابوں سے بھی ان کی آواز کی بازگشت آنے لگتی ہے اور بہت کم حضرات ہیں جن پر اس کا کچھ بھی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بڑے پایہ کے عبقری اور علم و تحقیق کے مجدد ہوتے ہیں انھیں میں امام طحاوی ہیں۔ پورا نام مع کنیت و نسب یہ ہے : امام ابوجعفر احمد بن محمد بن سلامہ ازدی مصری ۳۲۱ھ میں آپ کا وصال ہوا۔ تاریخ ولادت ۲۲۹ھ ہے آپ امام بخاری کے معاصر ہیں۔ امام بخاری کے وصال کے وقت آپ ۲۷ سال کے تھے۔[1] آپ کی محدثانہ اور مفسرانہ عظمت کا اعتراف امت کے ہر طبقہ کو ہے۔ آپ کی کتاب شرح معانی الآثار کے متعلق محققین کا بیان ہے کہ یہ کتاب سنن ابوداؤد کے ہم پلہ ہے۔ اور آپ کی کتاب مشکل الآثار

= وصال ہوا۔ فن رجال میں امام بخاری کے ہم پایہ ہیں، امام بخاری سے التاریخ الکبیر میں جو غلطیاں ہوئی ہیں ان کو سب سے پہلے آپ ہی نے بڑے عالمانہ انداز میں واضح فرمایا ہے۔ ۱۲ کوثر

[1] کیوں کہ آپ کی ولادت ۲۲۹ھ میں ہوئی۔ وصال ۳۲۱ھ میں اور امام بخاری کا وصال ۲۵۶ھ میں ہوا ہے۔ ۱۲ کوثر

کے متعلق یہ فرمایا گیا ہے کہ حدیث کے مشکل ترین فن "تاویل مختلف الحدیث" میں اس پایہ کی کوئی بھی کتاب نہیں۔ اس کتاب سے اندازہ لگتا ہے کہ قرآن و حدیث کے معانی کے نقعد اور ان کے مشکلات کے حل کرنے میں آپ کا پایہ امام بخاری سے بھی بلند ہے۔

آپ علوم دین کی تنقیح و تجدید میں تیسری صدی کے مجدد ہیں۔

اور فقہ حنفی کے آپ اتنے بڑے امام ہیں کہ حضرت مولانا عبدالحی صاحب فرنگی محلی التعلیقات السنیہ (صفحہ ۲۵) میں آپ کے متعلق لکھتے ہیں۔

وبالجملة فهو فی طبقة ابی یوسف	الغرض آپ (امام) ابو یوسف اور (امام)
ومحمد لا ینحط عن مرتبتهما	محمد کے طبقہ میں ہیں اور صحیح قول یہ ہے کہ آپ کا پایہ
علی القول المسدد۔	(امام) ابو یوسف اور (امام) محمد سے کم نہیں۔

آپ کے علمی تبحر کا اندازہ اس سے لگائیے کہ حج قِران پر آپ نے ایک ہزار اوراق[1] لکھے ہیں۔ بعد کے فقہا محدثین اور مفسرین میں کوئی بھی آپ کا ہم پایہ نہیں اور مفسرین میں امام بغوی، امام رازی اور مفسر ابن کثیر وغیرہ آپ کے سامنے تلامذہ کی بھی حیثیت نہیں رکھتے۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ امام طحاوی آیۂ تطہیر کے لفظ "اھل البیت" کے متعلق کیا تحقیق فرما رہے ہیں۔ آپ نے مشکل الآثار ج ۱ میں اس پر بڑی شرح و بسط کے ساتھ بحث کی ہے جس کا سلسلہ ۳۳۲ سے ۳۳۸ تک پھیلا ہوا ہے اس کا ماحصل حسب ذیل ہے:

۱۔ اس آیت میں اہل بیت سے مراد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علاوہ یہ چار حضرات ہیں: علی، فاطمہ، حسن اور حسین، اور اس کو خود آں حضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرما دیا ہے۔

---

[1] عمدۃ القاری شرح بخاری ج ۴ ص ۵۴۹ میں حج قِران کے متعلق قاضی عیاض کا قول نقل کیا ہے کہ اس مسئلہ میں بعض علماء نے اختصار سے کام لیا ہے۔ بعض نے متوسط درجہ پر لکھا ہے اور بعض نے زیادہ لکھا ہے اس کے بعد قاضی صاحب کہتے ہیں: و اوسع نفسا فی ذالک ابو جعفر الطحاوی الحنفی المصری فانه تکلم فی ذالک علی الف ورقة۔ ۱۲ کوثر

اور حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے بھی فرمایا ہے، ثبوت میں امام صاحب روایت درج کرتے ہیں۔
ان میں سے چند روایتیں حسب ذیل ہیں:

ا۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ راوی ہیں:

لما نزلت ھذہ الآیۃ دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیا و فاطمۃ و حسنا و حسینا و قال: اللھم ھؤلاء اھل بیتی۔	جب یہ آیت (آیۂ تطہیر) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن، اور حسین کو بلا کر فرمایا: یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں۔

(مشکل الآثار ص ۳۳۳ ج ۱)

امام صاحب اس حدیث کو لکھ کر فرماتے ہیں: "یہ حدیث ثبوت ہے کہ اس آیت میں اہل بیت سے مراد آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہٖ وسلم اور علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین ہیں۔

(ب) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا بیان پڑھئے جن کے گھر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے اور جنہوں نے بچشم خود دیکھا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین کو اپنی کملی میں لے کر فرمایا ہے "یا اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں"۔

اس پر حضرت ام سلمہ عرض کرتی ہیں: یا رسول اللہ کیا میں بھی اہل بیت ہوں؟ یہاں قابل لحاظ بات یہ ہے کہ جواب میں آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ تم بھی اہل بیت ہو بلکہ یہ جواب دیتے ہیں:

انتِ من ازواج النبی وانتِ علی خیر۔ (مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۳۵)	تم نبی کی بیویوں میں ہو اور تم اچھائی (کے طریقہ) پر ہو۔

نوٹ: بعض روایتوں میں ہے کہ آپ نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کو یہ جواب دیا: "انتِ من اھلی" اس کا بھی مفہوم یہی ہے کہ تم میری بیوی ہو۔ امام طحاوی نے بدلائل ثابت کیا کہ اس کا یہی مطلب ہے (اور اپنی بیوی کو "اھل" کہنا متداول محاورہ ہے۔ اس طرح یہ حدیث اور گذشتہ حدیث دونوں ایک ہی بات کو بیان کر رہی ہیں۔ اور دونوں میں بیان کا کوئی اختلاف

نہیں، اس سے ہٹ کر دوسری بات کہنا حدیث میں تعارض اور پیچیدگی پیدا کرنا ہے جو سخت مذموم ہے)۔

امام طحاوی اس کو لکھ کر کہ "انتِ اھلی" کے معنی ہیں کہ تم میری بیوی ہو، یہ افادہ فرماتے ہیں کہ آپ نے حضرت ام سلمہ کو یہ نہیں فرمایا کہ تم میرے اہل بیت ہو، بلکہ یہ فرمایا کہ تم میری بیوی ہو۔

۲۔ اس سلسلہ میں ایک بڑی خاص بات یہ ہے کہ ایک روایت میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا یہ تفصیلی بیان آتا ہے کہ جب انہوں نے عرض کی "یا رسول اللہ کیا میں بھی اہل بیت ہوں؟" تو حضور نے فرمایا: "اَنتِ عند اللہ خیرا" یعنی تمہارے لئے اللہ کے یہاں بھلائی ہے۔ اس جواب پر حضرت ام سلمہ کو یہ تمنا رہ گئی کہ کاش آپ یہ فرما دیتے کہ ہاں تم بھی اہل بیت میں ہو۔ اس تمنا کو حضرت ام سلمہ ان الفاظ میں بیان فرماتی ہیں:

فوددت انہ قال نعم فکان احب الیّ مما تطلع علیہ الشمس وتغرب۔	میرے دل کی لگن یہ تھی کہ آپ جواب میں "ہاں" فرما دیتے اگر کہیں ایسا ہو جاتا تو مجھے یہ جواب ان تمام چیزوں سے بڑھ کر محبوب ہوتا جن پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے۔

(مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۳۶)

یہ روایت اس حقیقت کو نہایت وضاحت کے ساتھ بیان کرتی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام سلمہ کو اہل بیت میں شمار نہیں فرمایا اور انھیں اس کی تمنا رہ گئی۔

۳۔ اس موضوع کا ایک اہم پہلو یہ ہے کہ آیۂ تطہیر کے نازل ہونے کے بعد آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی، حضرت فاطمہ، اور حضرات حسنین ہی کو اہل بیت فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابوالحمراء رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں جن کو حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی غلامی کا شرف حاصل ہے۔ ان کا بیان ہے کہ:

صحبت رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم تسعۃ شھر، کان اذا صبح	میں نو مہینے تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں رہا ہوں۔ صبح ہوتی تو آپ فاطمہ کے دروازے

اتی باب فاطمه فقال السلام علیکم اهل البیت انما یرید الله لیذهب عنکم الرجس ویطهرکم تطهیراً ○	پر تشریف لاکر یہ فرماتے: السلام علیکم یا اہل البیت، انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیراً ○

امام طحاوی اس روایت کو درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

فی ھذا ایضاً دلیل علی ان ھذہ الآیة فیھم۔	اس روایت میں بھی ثبوت ہے کہ یہ آیت انھیں لوگوں کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

امام طحاوی نے آیت تطہیر سے متعلق احادیث وروایات کو سامنے رکھ کر جو تحقیق فرمائی ہے اس کا خلاصہ

آیۂ تطہیر میں "اہل البیت" سے مراد حضرت علی، حضرت فاطمہ، اور حضرات حسنین ہیں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مراد نہیں۔ کیونکہ:۔

۱۔ اس آیت کے نزول کے موقع پر خود رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لفظ "اہل البیت" کی ان الفاظ میں تفسیر فرمادی کہ "ھولاء اھل بیتی" یعنی یہ علی، فاطمہ، حسن اور حسین میرے اہل بیت ہیں۔ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضور کے اس ارشاد پر جب یہ سوال کیا کہ: "یا رسول اللہ کیا میں بھی اہل بیت میں ہوں؟" تو آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ "ہاں تم بھی اہل بیت میں ہو"۔ بلکہ یہ فرمایا کہ "تم میری بیوی ہو۔"

۲۔ حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا بھی اس کا یہی مطلب سمجھتی ہیں کہ آپ نے ان کو اہل بیت میں شمار نہیں فرمایا اور انہیں یہ تمنا رہ گئی کہ کاش رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم ان کو اہل بیت میں شمار فرمالیتے اور فرمادیتے کہ ہاں تم بھی اہل بیت میں ہو۔ حضرت ام سلمہ اس تمنا کو جن

---

۵ مشکل الآثار ج ۱ ص ۳۳۸ - ۳۳۹ کوثر

الفاظ میں ادا فرمائی ہیں ان کا لب لباب یہ ہے :

"میں نے جب یہ سوال کیا تھا : یا رسول اللہ کیا میں بھی اہل بیت میں ہوں ؟ تو میرے دل کی بڑی لگن اور تمنا تھی کہ آپ جواب میں یہ فرما دیتے "ہاں تم بھی اہل بیت میں ہو۔" لیکن آپ نے یہ نہیں فرمایا۔ اگر فرما دیتے تو یہ جواب مجھے ان تمام چیزوں سے بڑھ کر محبوب ہوتا جن پر سورج طلوع اور غروب ہوتا ہے"۔

کیسی حسرت کا اظہار ہے کہ کاش رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھے اہل بیت میں شمار فرمالیتے۔ یہ بہت بڑا ثبوت ہے کہ آیۂ تطہیر میں اہل البیت کا جو لفظ آیا ہے اس میں نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں شامل نہیں۔

۳ ۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیۂ تطہیر کے نازل ہونے کے بعد زبان مبارک سے بھی فرمادیا کہ "اہل البیت" علی، فاطمہ، حسن اور حسین ہیں اور اپنے عمل سے بھی لوگوں کو سمجھا دیا کہ اہل بیت یہ ہیں۔ چنانچہ ۹ مہینے تک روزانہ فجر کے وقت حضرت فاطمہ کے دروازے پر تشریف لاکر انہیں اس طرح سلام کرتے :

السلام علیکم یا اہل البیت، انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت و یطھرکم تطھیرا۔

صحابۂ کرام جو مسجد اقدس میں حاضر رہا کرتے تھے خصوصاً اصحاب صُفّہ جو حضرت فاطمہ کے کاشانۂ مقدس کے قریب ہی ایک چبوترہ یا دالان میں رہا کرتے تھے وہ نو مہینے تک یعنی تقریباً ۲۷۰ دنوں تک روزانہ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان اقدس سے سُنا کرتے تھے کہ حضور پاک حضرت علیؑ حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین ہی کو اہل بیت فرماتے ہیں اور ان کو اہل البیت کے خطاب سے مخاطب فرما کر سلام کرتے ہیں پھر آیۂ تطہیر پڑھتے ہیں۔

یہ لفظ "اہل بیت" کی وہ عملی تفسیر ہے جو آپ نے ۹ مہینے تک روزانہ فرمائی ہے۔ یعنی تقریباً

۷۰ روز تک حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین کو اس طرح سلام فرما کر صحابہ کو دکھا دیا کہ "اهل البیت" یہ ہیں اور آیۂ تطہیر میں جو لفظ "اهل البیت" آیا ہے اس سے مراد یہ لوگ ہیں۔

کسی لفظ کی ایسی نبوی تفسیر جو قولی بھی ہو اور عملی بھی، اور عملی بھی ایسی کہ مسلسل نو مہینے تک حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے عمل کر کے مفہوم واضح کر دیا ہو کتنی اہم ہے؟ کیا اس کے خلاف کسی کی بات مانی جا سکتی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ آیۂ تطہیر کے لفظ "اهل البیت" کے علاوہ کسی بھی قرآنی لفظ کی ایسی نبوی تفسیر کا وجود ہی نہیں۔ اس سے اس تفسیر کی اہمیت کتنی بڑھ جاتی ہے لیکن حیرت ہے کہ بعض لوگ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اس تفسیر مقدس سے بالکل چشم پوشی کر رہے ہیں اور تفسیر نبوی کے مقابلہ میں اپنی تفسیر پیش کرنے کی جسارت کر رہے ہیں۔ امام طحاوی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ بحث فرما کر اور متعدد حدیثوں کے حوالے دے کر اصل حقیقت واضح فرمائی کہ:

"اهل البیت" کا لفظ جو آیۂ تطہیر میں آیا ہے اس سے مراد حضرت علی، حضرت فاطمہ، اور حضرات حسنین ہیں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی بیویاں مراد نہیں ہیں"

اور محقق حنفی علامہ قاضی ابو المحاسن بھی قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے بھی تفسیر نبوی کا پورا التزام ملحوظ رکھا اور اپنی کتاب المعتصر (ج ۱ ص ۲۶۰) میں حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تفسیر مبارک کو نقل فرما کر کھلے الفاظ میں لکھ دیا:

لاحجة لاحد فی ادخال الازواج فی ھذہ الآیة۔	کسی کے لئے کوئی حجت ہی نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کو اس آیت میں شامل کر سکے۔

موصوف نے یہ معاملہ بھی صاف کر دیا کہ اتنی اہم تفسیر نبوی کے ہوتے ہوئے بھی جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ازواج النبی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو "اهل البیت" میں شامل نہ کیا جائے تو آیۂ تطہیر سابق آیتوں سے بے تعلق ہو جاتی ہے" کوئی صحیح بات نہیں۔ موصوف ان لوگوں کے جواب میں فرماتے ہیں: بے تعلق کیسے ہو گی؟ آیۂ تطہیر جملہ مستانفہ ہے (یعنی کیا جملہ مستانفہ کے آنے سے کلام کا رابطہ ٹوٹ جاتا ہے؟ اور کیا قرآن مجید میں بکثرت مستانفہ جملے نہیں ہیں؟) آپ کے الفاظ یہ ہیں:

قولہ تعالی: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت (ویطھرکم تطھیرا) استیناف تشریفا لاھل البیت، وترفیعا لمقدارھم۔	اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد: انما یرید اللہ لیذھب عنکم الرجس اھل البیت ویطھرکم تطھیراہ جملہ مستانفہ ہے جو اہل بیت کی توقیر اور رفعت شان کے لئے آیا ہے۔

جملہ مستانفہ پر مفصل بحث، اور اس آیت کے جملہ مستانفہ ہونے کی بنا پر مفہوم کی توضیح ایک مستقل فصل[1] میں آچکی ہے اور اس سے ذرا پہلے بھی کچھ بیان آچکا ہے۔

اہل بیت اطہار آیۂ تطہیر کی بنا پر معصومیت سے قریب تر ہیں

اہل سنت کے نزدیک ملائکہ اور انبیاء کے علاوہ کوئی معصوم نہیں انبیاء علیہم السلام کے معصوم ہونے کی سب سے دل پذیر توضیح وہ ہے جو علوم قرآن و حدیث و تصوف کے جامع بزرگوں نے لکھی ہے۔ اور حقیقت میں اس کی تشریح انہیں بزرگوں کا کام ہے کہ ان کے نفوس نہایت مزکیٰ اور قلوب نہایت مصفا ہیں اور یہی ہیں حقیقت[2] کے دانائے راز اور یہی ہیں شریعت و طریقت کے مجمع البحرین، ان بزرگوں کے جلیل القدر ترجمان اور علوم شریعت و طریقت کے عدیم النظیر جامع امام عبدالوہاب شعرانی رحمۃ اللہ علیہ الیواقیت والجواہر جلد ۲ کے بالکل شروع میں فرماتے ہیں:

"انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام ان تمام حرکات و سکنات اور ان تمام اقوال و افعال سے معصوم ہیں جن سے ان کے مقام اکمل میں کچھ بھی نقص آسکے کیوں کہ وہ حاشیہ

---

[1] جس کا عنوان ہے: آیۂ تطہیر جملہ مستانفہ ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] حقیقت مغز شرع ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں: "الحقیقۃ لب الشرع" اور اہل حقیقت کی تشریح اس طرح کی ہے: ھم الجامعون بین الشریعۃ والطریقۃ: یعنی یہ لوگ شریعت و طریقت کے جامع ہیں (رد المحتار ج ۱ ص ۴۷) کوثر

بارگاہ الٰہی میں حاضر باش رہا کرتے ہیں۔ کبھی تو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا مشاہدہ کرتے ہیں اور کبھی اس کا مشاہدہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں دیکھ رہا ہے مشاہدہ کے ان دونوں مقامات سے وہ کبھی باہر آتے ہی نہیں، جس کا یہ عالم ہو نا ممکن ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی مخالفت کرے اور حقیقت میں جس کا نام مخالفت ہے ان کے متعلق اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا"۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

شہود کے ان دونوں مقامات کو مقام احسان کہتے ہیں۔ اسی مقام احسان کی بنا پر انبیا معصوم ہیں اور اولیاء محفوظ، کہ اولیاء اس مقام میں آتے بھی ہیں جاتے بھی ہیں، لیکن انبیاء کرام یہاں ہمیشہ اقامت گزیں ہیں، یہاں سے کبھی نکلتے ہی نہیں، اور جن اولیاء اللہ کو یہاں اقامت گزیں ہو جانے کا شرف حاصل ہوا ہے مثلاً حضرت سہل بن عبداللہ تستری اور سیدی ابراہیم متبولی کو، تو حقیقت میں استقلالاً ان کو یہ مقام حاصل نہیں ہوا ہے، بلکہ انبیاء علیہم السلام کی وراثت اور ان کے پیچھے پیچھے رہنے میں یہ مقام ملا ہے۔

لے امام موصوف کی اصل عبارت یہ ہے: (المبحث الحادی والثلاثون) فی بیان عصمة الانبیاء علیهم الصلوٰة والسلام من کل حرکة اوسکون او قول او فعل ینقص مقامهما الاکمل وذالك لدوام عکوفهم فی حضرة الله تعالیٰ الخاصة فتارة یشهدونه سبحانه تعالیٰ وتارة یشهدون انه یراهم ولا یرونه، ولا یخرجون ابداً عن شهود هٰذین الامرین ومن کان مقامهٗ کذالك لا یتصور فی حقه مخالفة قط حقیقیة وانما هی مخالفة صوریة کما یأتی بیانه ان شاء الله تعالیٰ، وتسمی هٰذه حضرة الاحسان، ومنها عصم الانبیاء وحفظ الاولیاء فالاولیاء یدخلون ویخرجون، والانبیاء مقیمون فیها ومن اقام فیها من الاولیاء کسهل بن عبدالله التستری، وسیدی ابراهیم المتبولی =

جہاں تک راقم السطور کو علم ہے حضرت امام شعرانی کے اس بیان پر آج تک کسی نے کلام نہیں کیا۔ اس طرح یہ حقیقت بالکل بے غبار اور مسلّم حقیقت ہے اس کی روشنی میں بہت سی باتیں واضح ہو جاتی ہیں مثلاً شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی بعض وہ عبارتیں جو اہل سنت کے مسلک سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہیں اور ان کے عقیدتمندوں کے لئے سخت حیران کن معمہ بن گئی ہیں۔ حضرت امام شعرانی کے اس بیان کو سامنے رکھو تو پیچیدگی کی تمام گرہیں خود بخود کھل جاتی ہیں۔

شاہ ولی اللہ صاحب تفہیمات الٰہیہ (ج ۲ ص ۱۴) میں لکھتے ہیں:۔

فوارثه الذين اخذوا الحكمة والعصمة، والقطبية الباطنية هم اهل بيته، وخاصته۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ وارث جنہوں نے آپ سے حکمت عصمت اور باطنی قطبیت اخذ کی ہے اور آپ کے اہل بیت اور آپ کے مخصوص اقربا ہیں۔

صفحہ ۲۲ میں لکھتے ہیں:

واذا تمت العصمة كانت افاعيلها كلها حقة، لا اقول: انها تطابق الحق، بل هي الحق بعينها، بل الحق امر ينعكس من تلك الافاعيل كالضوء من الشمس، واليه اشار رسول الله صلى الله عليه

عصمت جب مکمل ہو جاتی ہے تو اس کے تمام افعال حق ہو جاتے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ حق کے مطابق ہو جاتے ہیں بلکہ یہی افعال بعینہٖ حق ہو جاتے ہیں۔ بلکہ حق ایسی چیز ہے کہ انہیں افعال سے اس کا انعکاس ہوتا ہے جیسے سورج سے روشنی کا انعکاس۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اس دعا میں

= فاما ذالك بحكم الارث والتبعية للانبياء استمدادا من مقامهم لا بحكم الاستقلال۔ ۱۲ کوثر

وسلم حیث دعا اللہ تعالیٰ	اسی کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو آپ نے حضرت علی
لعلی: اللّٰھم ادر الحق حیث دار	کو دی ہے کہ یا اللہ جدھر علی جائیں ادھر حق کو گھما دے۔
ولم یقل: ادرہ حیث دار الحق	آپ نے یہ نہیں فرمایا ہے کہ جدھر حق جائے ادھر علی کو
	گھما دے، بلکہ یہ فرمایا کہ جدھر علی جائیں ادھر حق کو گھما دے

شاہ صاحب کی ان عبارتوں سے یہ پیچیدگی پیدا ہوتی ہے کہ شاہ صاحب اہل بیت کے متعلق لکھتے ہیں کہ یہ لوگ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عصمت (یعنی معصومیت) کے وارث ہیں، حالانکہ اہل سنت کے نزدیک ملائکہ اور انبیاء کرام علیہم السلام کے علاوہ کوئی معصوم نہیں۔

حضرت امام شعرانی کے مذکورہ بالا بیان کی روشنی میں اس کا حل یہ ہے کہ شاہ صاحب اہل بیت میں استقلالاً معصومیت کے قائل نہیں جو ملائکہ اور انبیاء کے لئے مخصوص ہے بلکہ وراثۃً اور تبعیۃً عصمت کے قائل ہیں۔ چنانچہ خود آپ کا لفظ "فوارثہ" الخ اس کا ثبوت ہے اور یہ عصمت انبیاء کی عصمت سے الگ ہے وہ استقلالاً ہے اور یہ وراثۃً وتبعیۃً۔

شاہ صاحب نے اپنی دوسری عبارت میں یہ دکھایا ہے کہ حضرت علی میں عصمت تامہ ہے جس کی بنا پر آپ کے تمام افعال عین حق ہیں بلکہ جدھر جدھر آپ جاتے ہیں ادھر ادھر حق بھی جاتا ہے اس عصمت تامہ سے شاہ صاحب کی مراد یہی وراثۃً اور تبعیۃً عصمت ہے جو آپ میں مکمل شان کے ساتھ موجود ہے استقلالاً عصمت قطعاً مراد نہیں، کیونکہ یہ انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ مخصوص ہے۔

شاہ ولی اللہ صاحب کے علاوہ اور بھی اکابر امت نے اہل بیت اطہار میں وراثۃً اور تبعیۃً عصمت کو بیان فرمایا ہے۔ انہیں میں حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی بھی ہیں جو علم تفسیر وحدیث وفقہ وتصوف کے بے نظیر جامع ہیں۔ آپ نے اپنی لاجواب کتاب تفسیر مظہری (ج ۲ ص ۴۲) میں اسے لکھا ہے۔ ذیل کی آیت کریمہ حضرت مریم کی والدہ کی ایک دعا ہے جو انہوں نے حضرت مریم کو ان کی ولادت کے بعد دی ہے۔

وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِكَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (آل عمران ۳)

اور میں اس لڑکی کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے محفوظ رکھنے کے لئے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں[۱]:

"صحیح حدیث ہے اور صحیح ابن حبان میں حضرت انس سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی سے کی ہے تو آپ نے حضرت فاطمہ کو ان الفاظ میں دعا دی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِكَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ۝ (آل عمران ۳)

یا اللہ میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان مردود سے محفوظ رہنے کے لئے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔

یہ دعا وہی ہے جو حضرت مریم کی والدہ نے حضرت مریم اور ان کی ذریت کے لئے مانگی تھی۔ حضرت فاطمہ کو دعا دینے کے بعد یہ دعا آپ نے حضرت علی کو بھی دی۔"

قاضی صاحب اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں:

"نبی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ دعا (جو آپ نے حضرت فاطمہ اور ان کی اولاد اور حضرت علی کے لئے مانگی تھی) عمران کی بیوی (یعنی مادرِ مریم) کی دعا سے بڑھ کر قابل قبول ہے لہٰذا مجھے حضرت فاطمہ اور ان کی اولاد کی عصمت کی امید ہے۔"

---

[۱] آپ کا متن کلام یہ ہے: قلت وقد صح ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال لفاطمۃ حین زوجھا علیا: اللھم انی اعیذھا بک وذریتھا من الشیطن الرجیم، وکذا قال لعلی حینئذ، رواہ ابن حبان من حدیث انس ودعاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم اولی بالقبول من دعاء امرأۃ عمران فارجو عصمتھا واولادھا من الشیطان وعلم مسہ ایاھم، وحصر عدم المس فی مریم وابنھا الثابت بالحدیث علی ھذا یکون حصرا اضافیا بالنسبۃ الی الاسم الاغلب۔ ۱۲ کوثر

حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ قرآن و حدیث کی روشنی میں حضرت فاطمہ (مع حضرت علی) اور ان کی ذریت طاہرہ کے لئے عصمت کا جو اظہار فرماتے ہیں اس سے بھی وہی عصمت مراد ہے، جو وراثتاً اور تبعیۃً ہے۔ استقلالاً نہیں کیوں کہ استقلالاً عصمت ملائکہ اور انبیائے کرام علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے اور تبعیۃً عصمت انبیائے کرام کی عصمت نہیں۔ یہی وہ عصمت ہے جس کے متعلق شاہ ولی اللہ صاحب نے فرمایا ہے:

"رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے وہ وارث جنھوں نے آپ سے حکمت عصمت اور باطنی قطبیت اخذ کی ہے، وہ آپ کے اہل بیت اور آپ کے مخصوص اقربا ہیں۔"

یہ عصمت انبیائے کرام علیہم السلام کی عصمت سے قریب تر ہے یعنی اولیا کی محفوظیت سے اوپر ہے، اور انبیا کی معصومیت سے نیچے ہے اور یہی چیز ہے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ۝	اے اہل بیت اللہ بس یہی چاہتا ہے کہ تم لوگوں سے (گناہوں کی) گندگی کو دور رکھے اور تم کو خوب ہی پاک و مطہر بنا دے۔

اسی بنا پر حضرت علی اور حسنین عظیمین علیہم السلام نفوس کو پاک و مطہر بنانے والوں کے امام ہیں۔ اسی لئے تزکیۂ نفوس کے تمام سلسلے حضرت علی کی ذات پاک سے وابستہ ہیں کہ جو پاک ہے وہی نفوس کو پاک بنا سکتا ہے اور جن لوگوں کی تطہیر کو خود اللہ تعالیٰ بیان فرماتا ہے وہی نفوس کے پاک بنانے والوں کی مربی و معلم اور مقتدا و امام ہیں، اور وہی ہیں گناہوں سے مبرا جو اگرچہ انبیاء کرام علیہم السلام کی طرح استقلالاً معصوم نہیں ہیں، لیکن ان کی عصمت سے قریب تر ہیں یہی ہے اس فصل کے عنوان کا مفہوم کہ "اہل بیت اطہار معصومیت سے قریب تر ہیں۔" یعنی اولیا کی محفوظیت سے اوپر ہیں اور انبیاء کی معصومیت کے نیچے ہیں۔ ان کی معصومیت کے وجوہ حسب ذیل ہیں:-

۱۔ ان کے بارے میں اللہ کی مشیت یہی ہے کہ ان کو پاک و مطہر رکھے، اور گناہوں کی گندگی ان سے دور رہے، جیسا کہ آیۂ تطہیر میں ہے۔

۲۔ طینت نبوی اور خمیر مصطفوی سے ان کی تخلیق ہوئی ہے جس کا خاصہ معصیت کی گندگی اور گناہوں کی آلودگی سے یکسر پاک وصاف رہنا ہے۔ ان کی اس تخلیق کا بیان کئی حدیثوں میں ہے مثلاً:

(ا) امام حاکم اور حافظ ابن عساکر حضرت جابر رضی اللہ عنہ کی روایت بسند لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے

ان لکل بنی اب عصبة ینتمون	جو شخص کسی باپ کا بیٹا ہے اس کا ایسا رشتہ دار
الیها الا ولد فاطمة، فانا	بھی ہے جس سے اس کو بڑی تقویت ہے اور اس کی
ولیهم وانا عصبتهم وهم	طرف اس کی نسبت ہوتی ہے، لیکن اولاد فاطمہ
عترتی خلقوا من طینتی ویل	کی نسبت مجھ سے ہے، میں ہی ان کا ولی اور مجھ ہی
للمکذبین بفضلهم، من احبهم	سے ہے ان کی تقویت، یہ ہیں میری عترت یہ میری طینت
احبه الله ومن ابغضهم ابغضه	سے پیدا ہوئے ہیں، جو ان کی فضیلت کا منکر ہے اس
الله۔ (کنز العمال ص ۲۱۶ ج ۶)	کے لئے بڑی تباہی ہے، جو ان سے محبت رکھے گا اللہ اس
	سے محبت رکھے گا۔ اور جو ان سے بغض رہے گا اللہ
	اس کا دشمن!

(ب) امام حافظ ابوالقاسم طبرانی اور امام رافعی حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی روایت بسند لکھتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

من سره ان یحیی حیاتی ویموت	جس کو یہی بھلا لگتا ہے کہ میرے طور پر زندگی بسر
مماتی، ولیسکن جنة عدن	کرے، اور میرے طور پر دنیا سے اُٹھے اور جنت
غرسها ربی فلیوال علیا	عدن میں رہے جس میں اللہ نے خصوصیت کے
من بعدی ولیوال ولیه	ساتھ نخل بندی کی ہے۔ اس کو ایسا کرنا چاہیے کہ میرے

ولیقتد باھل بیتی من بعدی	بعد بھی علی سے موالات و محبت رکھے اور ان کے
فانھم عترتی، خلقوا من	وارثوں سے بھی اور میرے بعد میرے اہلبیت کی
طینتی، رزقوا فھمی و علمی،	اقتدا کرے کیوں کہ یہ میرے خمیر اور طینت سے
فویل للمکذبین بفضلھم من	پیدا ہوئے ہیں اور ان کو میری سمجھ اور میرے علم کا
امتی القاطعین فیھم صلتی	حصہ ملا ہے، میرے اس امتی کے لئے ویل و تباہی ہے
لا انالھم شفاعتی ـ	جو ان کی فضیلت کا منکر ہے اور مجھ سے ان کا جو تعلق
	ہے اسے کاٹنا چاہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو میری
	شفاعت سے محروم رکھے گا۔

۳۔ ان بزرگوں کی معصومیت وراثیتہ کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ محبوب خدا صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے لئے شیطان سے محفوظ رہنے کی دعا فرمائی ہے۔ اوپر صحیح ابن حبان کی پیش کی ہوئی حدیث لکھی جا چکی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب حضرت فاطمہ کی شادی حضرت علی سے کر دی تو حضرت فاطمہ اور حضرت علی دونوں حضرات کے لئے فرداً فرداً یہ دعا فرمائی:

"یا اللہ میں اس کو اس کی اولاد کو تیری پناہ میں دیتا ہوں کہ شیطان مردود سے یہ محفوظ رہیں۔"

۴۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے تمام حرکات و سکنات عین حق ہیں تاکہ جدھر یہ جاتے ہیں اسی طرف حق بھی جاتا ہے۔ اور آپ کے وہ فرزندان فاطمی جو آپ کے تمام روحانی اور باطنی کمالات کے وارث ہیں یعنی ائمۂ اہل بیت وہ بھی آپ کے اس کمال کے حامل ہیں۔ سیدنا حضرت علی کے اس

لہ اس کا ثبوت یہ ہے کہ یہ عترت رسول منبع ہدایت ہیں حتی کہ ثقلین میں قرآن مجید ہے اور یہ کہ جو بھی ان سے وابستہ رہے گا وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔ یہ ایک برہان منیر ہے کہ یہ حضرات سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی طرح مرکز حق ہیں اور ان کے اقوال و افعال عین حق ہیں۔ ۱۲ کوثر

کمال کی طرف اس حدیث نے اشارہ فرمایا ہے جس میں مذکور ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے آپ کو یہ دعا دی ہے۔

اَللّٰھُمَّ ادرِ الحق حیث دار علی — یا اللہ جدھر علی جائیں اسی طرف حق کو گھما دے۔

اوپر آپ شاہ ولی اللہ صاحب کا بیان پڑھ چکے ہیں کہ "عصمت جب کمل ہو جاتی ہے تو تمام افعال عین حق ہو جاتے ہیں اور انھیں افعال سے حق کا اس طرح انعکاس ہوتا ہے، جیسے سورج سے روشنی کا انعکاس ہوتا ہے"۔

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی اس دعا "اَللّٰھُمَّ ادرِ الحق حیث دار علی" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے"۔

راقم السطور نے اس موقع پر لکھا ہے کہ اس عصمت سے استقلالاً عصمت مراد نہیں ہے جو انبیاء کے ساتھ مخصوص ہے بلکہ وراثۃً اور تبعیۃً عصمت مراد ہے۔

۵۔ ان قدسیوں کی معصومیت (یعنی معصومیت وراثیۃ) اس لئے بھی ہے کہ یہ حضرات ہدایت کے ایسے مرکز ہیں کہ جو ان سے وابستہ رہے وہ کبھی گمراہ ہو نہیں سکتا، جیسا کہ حدیث ثقلین کا بیان ہے[1]۔ ہدایت کی یہ مرکزیت ان کی عصمت کی دلیل ہے۔ اس کی تائید حدیث سفینہ سے بھی ہوتی ہے۔ حدیث سفینہ یہ ہے۔

امام حاکم حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے بسند روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان مثل اهل بيتي فيكم مثل سفينة نوح، من ركبها نجا ومن تخلف عنها هلك۔ (کنز العمال ص۲۱۶)

تم لوگوں میں میرے اہل بیت کی مثال ایسی ہے جیسے نوح کی کشتی کہ اس پر جو سوار ہے اس کو نجات ہے اور جو اس سے الگ ہے وہ تباہ ہوا۔

---

[1] حدیث ثقلین پر مفصل بیان ایک مستقل باب میں ہو چکا ہے۔ ۱۲ کوثر

ظاہر ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی مرکزِ نجات ہے اور اس پر جو سوار ہے وہی حق اور ہدایت پر ہے اور وہی ڈوبنے سے محفوظ رہے گا۔ اور وہی نجات کے ساحل پر پہونچے گا۔ حدیث بتاتی ہے کہ اہل بیت کی بھی یہی نوعیت ہے کہ جو لوگ ان سے وابستہ ہیں وہی حق اور ہدایت پر ہیں۔ اور وہی نجات کی منزل پر پہونچیں گے۔ اہل بیت کی یہ شان ان کی عصمت کا ایک ثبوت ہے[1]۔ واضح رہے کہ ان کی عصمت استقلالاً عصمت نہیں ہے، جو حضرات انبیاء علیہم السلام کے لئے مخصوص ہے۔

نوٹ: چوں کہ ان بزرگوں کی عصمت بتاتی ہے کہ ان کا قول و فعل حق ہے، اس لئے سیدنا حضرت ابوبکر، سیدنا حضرت عمر اور سیدنا حضرت عثمان رضی اللہ عنہم اجمعین کی خلافت یقیناً برحق ہے، کیوں کہ ان حضرات نے ان کی خلافت کو برحق مانا ہے اور مدح و ثنا فرمائی ہے۔

---

[1] کچھ حدیثیں ایسی ہیں جن کو پڑھ کر راقم السطور اس نتیجہ پر پہونچا ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما میں بھی عصمت بطور تبعیت ہے، اور یہ حضرات بھی معصومیت سے قریب تر ہیں۔ ۱۲ کوثر

پنجتن پاکؑ اور آیت مباہلہ

پنجتن پاکؑ یہ ہیں:

۱۔ رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم

۲۔ حضرت علی مرتضیٰ،

۳۔ حضرت فاطمہ زہرا،

۴۔ حضرت امام حسن مجتبیٰ

۵۔ حضرت امام حسین مقتدا

علیہم السلام

آیت مباہلہ

یہ ہے

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ
مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ
تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَ
كُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ
وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ قف ثُمَّ
نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى
الْكٰذِبِيْنَ ○ (آل عمران۔ ع ۶۔ آیت ۶۱)

(مسیح کے انسان ہونے کے بارے میں) تمہارے پاس علم وحی آنے کے بعد جو تم سے جھگڑا کرے اس سے کہہ دو، آؤ اس کا فیصلہ ہم یوں کر لیں کہ ہم بھی اپنے بیٹے بیٹی اور خاص الخاص رشتہ دار کو بلا لیں اور تم بھی اپنے بیٹے بیٹی اور خاص الخاص رشتہ دار کو بلا لو۔ پھر ہم لوگ خشوع کے ساتھ اللہ سے دعا کریں اور جھوٹوں پر اللہ کی لعنت کریں (کہ مسیح کے بارے میں جو جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اس پر اللہ کی لعنت)

شان نزول

نجران مکہ معظمہ سے یمن کی طرف سات منزل پر ایک وسیع ضلع ہے جہاں عیسائی عرب آباد تھے۔ ملک عرب میں عیسائیوں کا سب سے بڑا مرکز یہی تھا۔ یہاں ایک عظیم الشان گرجا تھا جس کو وہ کعبہ کہتے تھے۔ اور حرم کعبہ کا جواب سمجھتے تھے۔ اس میں بڑے بڑے مذہبی پیشوا رہتے تھے جن کا لقب سید اور عاقب تھا۔ ۹ھ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو دعوت اسلام کا خط لکھا تو اس کے محافظ ائمہ مذہب اور معززین کا ایک وفد جو ساٹھ آدمیوں کا تھا مدینہ منورہ آیا۔ ان میں لارڈ بشپ بھی تھا جس کا نام ابو حارثہ تھا۔ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف مذہبی باتیں پوچھیں۔ آپ نے وحی الٰہی کی رو سے جواب دیا۔ اس سلسلہ میں سورۂ آل عمران کی ابتدائی اسّی

آیتیں اتری ہیں۔ وفد کا مرکزی مسئلہ یہ تھا کہ مسیح خدا تھے۔ آپ نے جواب میں آیات قرآنی پڑھیں جن میں دلائلِ ناطقہ[1] کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ مسیح اللہ کے بندہ ہیں خدا نہیں۔ بلا باپ کے پیدا ہونا اس بات کا ثبوت نہیں کہ وہ خدا ہیں۔ آخر آدم کا بھی تو کوئی باپ نہیں۔ مسیح کا پیدا ہونا تو خود ایک ثبوت ہے کہ وہ مخلوق ہیں خدا نہیں۔

لیکن عیسائیوں کا یہ وفد دلائل ناطقہ سننے کے باوجود اپنی بات کی پچ کرتا رہا، ضد باندھ لی اور سخن پروری پر اڑا رہا۔ اس پر آیت مباہلہ نازل ہوئی کہ اگر تمہیں اپنے دعویٰ پر یقین ہے کہ یہ حق اور صحیح ہے تو آؤ ہم اور تم اپنے بال بچوں کو لے کر اللہ کے سامنے دعا مانگیں کہ جو اپنے دعویٰ میں جھوٹا ہے اس پر اللہ لعنت بھیجے۔ اگر تمہیں اپنی بات کی صداقت پر یقین ہے تو اس مباہلہ پر تیار ہو جاؤ۔

اور آپ نے آیت مباہلہ پڑھی جو اوپر مذکور ہے جس کا ماحصل یہ ہے کہ اگر تم لوگ مسیح کو انسان کے بجائے خدا مانتے ہو تو آؤ مباہلہ کر لو کہ ہم بھی اپنے بال بچوں کو لائیں اور تم بھی، پھر ہم سب اللہ سے دعا مانگیں کہ مسیح کے بارے میں جو شخص جھوٹا دعویٰ کرتا ہے اس پر اللہ کی لعنت کہ مع اہل و عیال غارت ہو جائے۔

اب حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرات اہل بیت اطہار یعنی حضرت علی حضرت فاطمہ امام حسن اور امام حسین علیہم السلام کو گھر سے لے کر تشریف لائے اور ان سے فرمایا کہ جب میں مباہلہ کی دعا

---

[1] وہ دلائل یہ ہیں: (۱) مسیح مریم کے شکم سے پیدا ہوئے ہیں (۲) انہیں تورات و انجیل کا علم بخشا گیا جو پہلے انہیں حاصل نہ تھا، (۳) خود ان کا بیان ہے کہ وہ مردوں کو جو زندہ کرتے ہیں یا جنم کے اندھے یا برص ان کے معجزے سے شفایاب ہوتے ہیں یہ سب حکم الٰہی ملنے کے بعد ہی کرتے ہیں، اس کے بغیر نہیں کر سکتے (۴) ان کا قول ہے کہ اللہ میرا بھی رب ہے اور تم لوگوں کا بھی (۵) اللہ کسی کا باپ نہیں کہ رشتہ ناتہ خدائی شان کے خلاف ہے۔ (۶) مسیح کا بن باپ کے پیدا ہونا اس کا ثبوت نہیں کہ وہ خدا ہیں۔ آخر آدم بھی تو بلا باپ کے پیدا ہوئے ہیں، اور پھر جو پیدا ہو وہ خدا کہاں؟ (۷) کوئی بشر جس کو اللہ نے کتاب اور حکمت اور نبوت سے نوازا ہے کیا وہ ایسی غلط بات بول سکتا ہے کہ میرے بندے بن جاؤ یا مجھ کو یا کسی رسول یا کسی فرشتے کو رب بنالو۔

مانگوں تو تم لوگ آمین کہنا:

وفد میں نجران کا اسقف یعنی بشپ پادری بھی تھا۔ اس نے پنجتن پاک کو دیکھ کر وفد سے کہا "یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ان سے مباہلہ کیا تو عیسائیت ہمیشہ کے لئے دنیا سے مٹ جائے گی۔"

مباہلہ کا بیان متعدد روایتوں میں ہے، ایک روایت یہ ہے کہ:

نجران کے اسقف (بشپ پادری) نے دیکھا کہ محمد (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مباہلہ کے لئے اپنے بال بچوں؛ علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو لے کر آئے ہیں تو اس پر یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہوں نے مباہلہ کی دعا کی تو عیسائیت کا وجود ہی ختم ہو جائے گا۔ چنانچہ اس نے وفد سے کہا:

یا معشر النصاریٰ انی لأری وجوها لو سألوا الله ان یزیل جبلاً من مکانه لأزاله فلا تباهلوا فتهلکوا (روح المعانی ج ۳ ص ۱۸۸-۱۸۹)	اے گروہ نصاریٰ میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں کہ اگر یہ لوگ اللہ سے یہ دعا مانگیں کہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے تو اللہ ان کی دعا سے پہاڑ کو (جائے قرار سے) ہٹا دے گا۔ لہٰذا مباہلہ نہ کرو، ورنہ غارت ہو جاؤ گے۔

اس صوابدید کی بنا پر عیسائی مباہلہ سے ہٹ گئے اور آپ سے کہا کہ مباہلہ کے بجائے ہم آپ سے اس شرط پر صلح کرتے ہیں کہ:

"ہم لوگ ہر سال دو ہزار جوڑے کپڑے، تیس زرہیں، ۳۳ اونٹ اور ۳۴ گھوڑے پیش کرتے رہیں گے۔"

صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۷۸) میں ہے کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو بلا کر فرمایا:

اَللّٰهُمَّ هٰؤُلَاءِ اَهْلِی۔	یا اللہ یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں۔

پوری روایت یہ ہے :-

امر معاویة بن ابی سفیان سعدًا
فقال: مامنعك ان تسب اباتراب
فقال: اما ماذكرت ثلاثا قالهن
له رسول الله صلی الله علیه وسلم
فلن اسبه لان تكون لی واحدة
منهن احب الیّ من حمر النعم،
سمعت رسول الله صلی الله علیه وسلم
یقول له وخلفه فی بعض مغازیه
فقال له علی، یارسول الله خلفتنی
مع النساء والصبیان، فقال له
رسول الله صلی الله علیه وسلم
اماترضیٰ ان تكون منی بمنزلة
هارون من موسیٰ الا انه لا
نبوة بعدی وسمعته یقول یوم
خیبر لاعطین الرایة رجلا یحب
الله ورسوله ویحبه الله ورسوله
قال: فتطاولنالها، فقال: ادعوا
الی علیا، فاُتی به ارمد
فبصق فی عینیه ودفع الرایة
الیه، ففتح الله علیه،

معاویہ ابن سفیان نے سعد کو حکم دیا،
پھر کہا: ابوتراب کو گالی دینے سے آپ کو کیا چیز روک
روک رہی ہے؟ سعد نے کہا: مجھے یاد ہے کہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے
میں تین ایسی باتیں فرمائی ہیں جن کی بنا پر میں
ان کو کبھی گالی نہ دوں گا، ان تینوں چیزوں
میں سے مجھے ایک چیز بھی مل ہوتی تو مجھے سرخ
اونٹ سے بھی محبوب تر ہوتی (وہ تینوں باتیں یہ ہیں)
(۱) میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حدیث
سنی ہے (وہ یہ ہے کہ) آپ علی کو مدینہ میں اپنی جگہ
رکھ کر کسی غزوہ میں تشریف لے جا رہے تھے کہ
علی نے کہا: آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ
کر تشریف لے جا رہے ہیں۔ اس پر آپ نے فرمایا: علی
کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو میری طرف سے
ایسی ہی منزلت و حیثیت ہے جیسی موسیٰ کی طرف
سے ہارون کو تھی، لیکن میرے بعد نبوت نہیں ہے۔
(۲) اور میں نے خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ "میں اسے فرد رجھنڈا دوں
گا جو اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و
رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں" سعد کا قول

ولما نزلت هٰذہ الآیۃ نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَکُمْ دعا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علیا وفاطمۃ وحسنا وحسینا فقال: اَللّٰھُمَّ ھٰؤُلَاءِ اھلی۔

ہے کہ اس پر ہم لوگ اپنے کو اونچا کرکے نمایاں کرنے لگے (کہ ہم پر نظر پڑے اور ہمیں جھنڈا ملے) مگر آپ نے فرمایا: علی کو بلاؤ۔ لوگ بلا لائے اُن کی آنکھوں میں آشوب تھا۔ آپ نے آنکھوں میں لعاب دہن لگا دیا اور انہیں جھنڈا عطا فرمایا اور اللہ نے انہیں کے ہاتھ پر فتح دی۔

(۳) اور جب یہ آیت نازل ہوئی نَدْعُ اَبْنَاءَنَا وَاَبْنَاءَکُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علیؓ، فاطمہ اور حسن اور حسین کو بلا کر فرمایا "یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں"۔

نوٹ: یہاں "اھلی" کے معنی ہیں میرے اہل بیت کیوں کہ بعض کتابوں میں "اھل بیتی" آیا ہے اور مشکوٰۃ (صفحہ ۵۶۸) میں بھی بحوالہ مسلم "اھل بیتی" ہے[۱]۔

اس حدیث میں حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین کی بڑی فضیلت ہے کہ آپ نے اس موقع پر تمام بنی ہاشم میں صرف انہیں کو اہل بیت فرمایا کہ درحقیقت خصوصی اہل بیت یہی ہیں۔

آیت مباہلہ کے ان الفاظ "ابناءنا ونساءنا وانفسنا" سے کون لوگ مراد ہیں؟

"اَبْنَاءَنَا" یعنی فرزندان رسول سے مراد حضرات حسنین ہیں اور "نِسَاءَنَا" یعنی نبی کے گھر کی اہم ترین عورت سے مراد حضرت فاطمہ ہیں اور "اَنْفُسَنَا" سے مراد رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی ہیں۔

یہ تفسیر حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے[۲]۔ (الدر المنثور ج ۲ ص ۳۹) مفسر ابن کثیر کا بیان ہے

---

[۱] غالباً اس کی وجہ نسخوں کا اختلاف ہے کہ صحیح مسلم کا جو نسخہ ہمارے سامنے ہے اس میں تو "اھلی" ہے اور صاحب مشکوٰۃ کے سامنے جو نسخہ تھا اس میں "اھل بیتی" رہا ہوگا۔ ۱۲ کوثر

[۲] الفاظ یہ ہیں "انفسنا" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وعلی و "ابناءنا" الحسن والحسین، "ونساءنا" فاطمۃ ۱۲ کوثر

کہ حضرت ابن عباس اور حضرت براء سے بھی ایسی ہی تفسیر مروی ہے۔ اور مسند ابی داؤد طیالسی میں شعبی سے بھی ایسی ہی تفسیر منقول ہے (ابن کثیر ج ۱ ص ۳۷۱)

درحقیقت یہ تفسیر حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عملی تفسیر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے:

- "اَبْنَاءَنَا" یعنی اپنے فرزندوں کے نام سے حسنین کریمین ہی کو مباہلہ کے لئے پیش فرمایا ہے۔
- اور "نِسَاءَنَا" یعنی اپنے گھر کی سب سے اہم ترین عورت کی جگہ حضرت فاطمہ ہی کو رکھا ہے۔
- "اَنْفُسَنَا" کی جگہ خود اپنے کو اور حضرت علی کو قرار دیا ہے۔

اب اندازہ لگاؤ کہ قرآن مجید اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس عملی تفسیر نے حضرت علی حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین علیہم السلام کو کتنی فضیلت بخشی ہے۔ ان کی شان کتنی بلند ہے اور ان کا درجہ کتنا اونچا ہے؟! ذرا شان کی یہ بلندی دیکھو کہ ان میں :-

★ — حضرات حسنین فرزند رسول ہیں، تمام امت میں ابنائے نبوی کے علاوہ یہ شرف کس کو حاصل ہے؟

★ — حضرت فاطمہ وہ ہیں کہ بیت رسول کی تمام عورتوں میں سب سے افضل اور اہم یہی ہیں، تمام عالم میں یہ اعلیٰ ترین فضیلت کس کو نصیب ہے؟

★ — حضرت علی وہ ہیں کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب سے بڑھ کر خاص الخاص عزیز و قریب یہی ہیں، یہ مجد و شرف خاص آپ ہی کا حصہ ہے۔

ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ (المائدہ پ ۶ ع ۱۲) — یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے۔

نوٹ : سطور بالا سے واضح ہے کہ "انفسنا" کی صحیح تفسیر (جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی تفسیر سے ماخوذ ہے) یہی ہے کہ اس سے مراد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں، اس بنا پر اس لفظ کے معنی ہوئے ہم اور ہمارے مخصوص یگانے، لفظ "اَنْفُس" مخصوص اور یگانے کے معنی میں بکثرت مستعمل ہے۔ اور خود قرآن مجید میں کئی جگہ آیا ہے۔ مثلاً :-

وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ (بقرہ ع ۱۰ پ ۱) اور اپنے یگانوں کو ان کے گھر والے نہ نکالنا۔

ارباب افراط و غلو لفظ "انفسنا" سے یہ سمجھتے ہیں کہ حضرت علی نفس رسول ہیں، لیکن یہ غلط ہے۔ اس کی غلطی اس سے ظاہر ہے کہ اگر حضرت علی کو نفس رسول مانا جائے یعنی ذات رسول تو بالکل محال بات ہے کہ ایک شے کی ایک ہی ذات ہوتی ہے، دو نہیں اور اگر نفس رسول سے یہ مراد لی جائے کہ علی مساوی رسول ہیں، یعنی جناب امیر فضل و درجہ میں رسول اعظم کے مساوی ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں یہ اتنی بڑی غلطی ہے جس کی کوئی حد ہی نہیں۔ بھلا جو نبی نہیں ہے وہ نبی سے بڑھ کر یا نبی کا ہم پایہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اہل بیت کرام کی محبت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ ان کو نبی بنا دیا جائے یا نبی سے بھی آگے بڑھا دیا جائے، یا ان کی ایسی تعریف کی جائے جو نص کے خلاف ہے۔ تفریط بھی بری ہے افراط بھی برا۔ ہم اہل سنت افراط اور تفریط دونوں سے بچتے ہیں۔ ہمارا مسلک اعتدال ہے اور یہی ہے صراط مستقیم!

اہل بیت کی غریب نوازی اور قرآن مجید

چونکہ اہل بیت اطہار طینت نبوی سے بنے ہیں اور خمیر مصطفوی سے ان کی تخلیق ہوئی ہے مزید برآں آغوش رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم میں پلے ہیں۔ اس لئے اخلاق محمدی کے بڑے معیاری نمونے ہیں۔ اور اصطفائے الٰہی نے ان کی سیرت مطہرہ کو قرآن مجید کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ یوں تو ان کے اخلاق کی ایک ایک ادا انسانیت کا صحیفۂ ناطق ہے، لیکن اس فصل میں ہم ان کی غریب نوازی کا وہ نمونہ پیش کرتے ہیں جن پر اللہ کا اتنا پیار ہوا کہ ان کی مدح و ثنا میں متعدد آیتیں نازل فرمائیں۔ صورت واقعہ بروایت مفسر ثعلبی یہ ہے کہ:

حسنین کریمین علیہما السلام بیمار ہوئے، آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا: "شفا کے لئے نذر مانو" انہوں نے اور خاتون جنت نے ان کی شفا کے لئے تین روزے

کی نذر مانی، اللہ نے شفا دی، نذر کا روزہ شروع ہوا۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم تھوڑا سا جَو قرض لائے، تینوں روزوں کے افطار کے لئے بس اتنا ہی تھا۔ حضرت سیدہ نے پیسا، تینوں روز ایسا اتفاق ہوا کہ حضرت سیدہ نے روٹیاں پکا کر افطار کے لئے رکھیں تو کوئی حاجت مند سامنے تھا، ان دونوں حضرات نے ساتھ ہی نہایت ننھی عمر والے حسنین کریمین نے بھی اپنی اپنی روٹیاں ہر روز حاجت مند کو دے دیں گھر کی کنیز فضہ نے بھی ایسا ہی کیا " ایک روز مسکین آیا تھا۔ دوسرے روز یتیم، تیسرے روز اسیر بھیج دیا گیا تھا (یعنی غیر مسلم جو مشترک فوج کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا۔ اور شکست کھا کر گرفتار ہوگیا تھا) چاروں اہل بیت اور فضہ نے ہر روز ایسی انسانیت نوازی فرمائی کہ ان لوگوں کو اپنی اپنی روٹیاں دے کر پانی سے افطار کیا۔ اور پانی ہی پی کر اگلا روزہ رکھا۔

اہل بیت کی ناداری ایسی تھی کہ تھوڑا سا جَو قرض لیا تو روٹی پکی۔

مگر دریا دلی اور غریب نوازی ایسی کہ نہایت ننھی عمر والے حسنین کریمین نے بھی اپنے والدین کے ساتھ تینوں روز اپنا اپنا کھانا ان محتاجوں کو دیدیا۔ ہر روز پانی سے افطار کیا۔ اور پانی ہی پی کر اگلا روزہ رکھا [1]

روزے پر روزے ہیں اور فاقے پر فاقے، اور یہ اس لئے کہ سب کچھ محتاجوں کو دے کر بھوکے رہ جانا بڑی عزیمت کا کام ہے جو اللہ کو بے حد پسند اور محبوب ہے اور یہ حضرات اللہ کی محبت سے لبریز ہیں؛ جو اسے پسند وہی انھیں مرغوب، لہٰذا محض اللہ کے لئے اور محض اس کی محبت میں یہ غریب نوازی۔ فرما رہے ہیں نہ عوض کا تصور نہ کسی شکریہ کی خواہش کتنی اعلیٰ اور بے لوث ہے یہ غریب نوازی؟! کتنی پر خلوص ہے محتاجوں کی یہ امداد؟! کتنا عظیم ہے محتاجوں کو سب کچھ دے کر بھوکے رہ جانے کا یہ ایثار؟! یہ اعلیٰ کردار، یہ عدیم المثال ایثار، یہ بے نظیر شرافت و ہمدردی اور اپنی نوعیت کی یہ واحد غریب نوازی اعلان کرتی ہے کہ دیکھو اہل بیت اطہار کیسے بے لوث اور محتاج نواز انسان ہیں اور ان کی سیرت محتاجوں کی پر خلوص امداد و ہمدردی کا کیسا انسانیت نواز سبق دیتی ہے؟ بڑے بھی یہ سبق دیتے ہیں۔ اور بے حد ننھی عمر والے معصوم بچے بھی! یہ ہے قرآن مجید کی تعلیم انسانیت کا کامل فیض و تاثیر اور یہ ہے تربیت

مصطفوی کا کامل ترین نتیجہ ۔

اہل بیت اطہار مسکین و یتیم کو سب کچھ دیکر بھوکے تو رہتے ہی ہیں ذرا اس پر بھی نظر ڈالو کہ غیر مسلم جو مشرک فوج کے ساتھ مسلمانوں کا اور شیر اسلام علی مرتضیٰ کا گلا کاٹنے کی نیت سے آیا ہے لیکن جب شکست کھا کر گرفتار ہو جاتا ہے تو علی مرتضیٰ، فاطمہ زہرا اور حسنین علیہم السلام اس کے ساتھ بھی یہ معاملہ کرتے ہیں کہ اپنا سب کچھ دیکر پانی پر افطار کرتے ہیں اور بھوکے رہ جاتے ہیں ۔ اس روز تین دن کے بھوکے ہیں، مگر غیر مسلم کے ساتھ وہ بھی خون کے پیاسے غیر مسلم کے ساتھ یہ سلوک ؟!

کیا پوری تاریخ انسانیت میں اس کی مثال ہے ؟

اہل بیت اطہار کا یہ عظیم کارنامہ اسلام کے دین رحمت ہونے کی ایک دلیل ناطق ہے جس کی تعلیم نے یہ بہترین نمونے پیش کئے ہیں ۔ اور رسول اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے سب سے بڑے محسن انسانیت ہونے کا ایک بیّن ثبوت ہے جن کی تربیت نے اتنی بلند انسانیت کے نمونے اور اتنے اعلیٰ کردار کے حاملین دنیا کو عطا فرمائے ہیں ۔

اچھا اب یہ بھی دیکھئے کہ سیدنا علی مرتضیٰ، خاتون جنت، فاطمہ زہرا، سرداران فردوس امام حسن اور امام حسین علیہم السلام اور کنیز اہل بیت حضرت فضہ کی یہ وسیع القلبی، یہ انسانی ہمدردی یہ بے نظیر خلوص والا ایثار اور یہ غریب نوازی اللہ کو اتنی پسند آئی کہ ان کی فضیلت میں آیت نازل فرمائی۔ اس میں یہ سبق ہے کہ ان کے نقش قدم پر چلنے والا بھی بلند کردار انسان ہو جائے گا ۔ اور اس کا شمار بھی ابرار میں ہوگا ۔ راوی کا بیان ہے کہ اس سلسلے میں جو آیت نازل ہوئی وہ یہ ہے :

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ	اور یہ لوگ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم
مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ۝	اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں ۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بس اتنا ہی حصّہ مراد ہے ۔ غالباً اس کے پہلے اور بعد کی وہ آیتیں

(حاشیہ صفحہ ۱۳۳ :)

لے حضرت علی اور حضرت سیدہ کا روزہ نذر کا تھا ۔ اور امامین علیہما السلام نے مقدس والدین کی پیروی کی تھی ۔ ۱۲ کوثر

بھی مراد ہیں جو اس سلسلہ کی مربوط کڑیاں ہیں، یہ سورۂ دہر کی سترہ آیتیں ہیں (پانچویں سے اکیسویں آیت تک) جو ذیل میں درج ہیں:

إِنَّ الْأَبْرَارَ يَشْرَبُونَ مِنْ
كَأْسٍ كَانَ مِزَاجُهَا كَافُورًا ۝
عَيْنًا يَشْرَبُ بِهَا عِبَادُ اللَّهِ
يُفَجِّرُونَهَا تَفْجِيرًا ۝ يُوفُونَ
بِالنَّذْرِ وَيَخَافُونَ يَوْمًا كَانَ
شَرُّهُ مُسْتَطِيرًا ۝ وَيُطْعِمُونَ
الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا
وَأَسِيرًا ۝ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ
اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنْكُمْ جَزَاءً
وَلَا شُكُورًا ۝ إِنَّا نَخَافُ
مِنْ رَبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا
قَمْطَرِيرًا ۝ فَوَقَاهُمُ اللَّهُ
شَرَّ ذَٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقَّاهُمْ
نَضْرَةً وَسُرُورًا ۝ وَجَزَاهُمْ
بِمَا صَبَرُوا جَنَّةً وَحَرِيرًا ۝
مُتَّكِئِينَ فِيهَا عَلَى الْأَرَائِكِ ۚ
لَا يَرَوْنَ فِيهَا شَمْسًا وَلَا

تحقیق کہ نیک سلوک کرنے والے لوگ (جنت میں)
وہ جام پئیں گے جس میں چشمۂ کافور کی آمیزش ہوگی
یہ ایک چشمہ ہے جس کا پانی ملا کر اللہ کے بندگان خاص
پئیں گے۔ اس میں سے نہریں نکال کر (حسب
مرضی) جاری کریں گے یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی نذر
پوری کرتے ہیں[1] اور اس دن کا انہیں خوف لگا
رہتا ہے جس کی شدت ہر طرف پھیلی ہوگی۔ اور یہ
لوگ مسکین اور یتیم اور اسیر کو اللہ کی محبت میں کھانا
کھلاتے ہیں کہ ہم تو خاص اللہ ہی کے لئے تمہیں کھانا
کھلاتے ہیں، نہ تم سے اس کا عوض چاہتے ہیں نہ شکریہ
ہم کو اپنے رب کی طرف سے اس دن کا ڈر لگتا ہے
جو بڑا ہی ہیبت ناک اور بڑا ہی سخت دن ہے۔
لہٰذا اللہ ان کو اس روز کی شدت سے بچائیگا
اور انہیں چہرہ کی شادابی اور دل کا سرور عطا
فرمائے گا اور صبر اور ضبط نفس کے صلہ میں انہیں
جنت کے باغات اور ریشمی پوشاک مرحمت
فرمائے گا۔ بہشت میں وہ تخت پر مسند لگائے

---

[1] حضرت علی اور حضرت فاطمہ نے نذر کے روزوں کو کس حسن و کمال سے ادا فرمایا ہے، ان الفاظ میں ان کا اشارہ ہے۔ ۱۲ کوثر

زَمْهَرِيرًا ۚ وَدَانِيَةً عَلَيْهِمْ
ظِلَالُهَا وَذُلِّلَتْ قُطُوفُهَا تَذْلِيلًا ۝۱۴
وَيُطَافُ عَلَيْهِمْ بِآنِيَةٍ مِّنْ
فِضَّةٍ وَّأَكْوَابٍ كَانَتْ قَوَارِيرَا ۝۱۵
قَوَارِيرَا مِنْ فِضَّةٍ قَدَّرُوهَا
تَقْدِيرًا ۝ وَيُسْقَوْنَ فِيهَا كَأْسًا
كَانَ مِزَاجُهَا زَنْجَبِيلًا ۚ عَيْنًا
فِيهَا تُسَمَّىٰ سَلْسَبِيلًا ۝ وَيَطُوفُ
عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُونَ ۚ
إِذَا رَأَيْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا
مَّنثُورًا ۝ وَإِذَا رَأَيْتَ ثَمَّ
رَأَيْتَ نَعِيمًا وَّمُلْكًا كَبِيرًا ۝ عَالِيَهُمْ
ثِيَابُ سُندُسٍ خُضْرٌ وَّإِسْتَبْرَقٌ ۖ
وَحُلُّوا أَسَاوِرَ مِن فِضَّةٍ ۚ وَ
سَقَاهُمْ رَبُّهُمْ شَرَابًا طَهُورًا ۝
إِنَّ هَٰذَا كَانَ لَكُمْ جَزَاءً وَّ
كَانَ سَعْيُكُم مَّشْكُورًا ۝۲۲

بیٹھے ہوں گے، وہاں نہ دھوپ کی تپش دیکھیں گے نہ سردی کی شدت، درختان جنت ان پر سایہ فگن ہوں گے جن کے پھلوں اور میووں کے گچھے لٹک رہے ہوں گے۔ ان پر چاندی کے برتن اور شیشے کے جام کا دور چلے گا۔ یہ شیشہ بھی چاندی ہی کا ہوگا۔ برتن اور جام مناسب انداز میں بنے ہوں گے۔ جنت میں ان کو چشمہ زنجبیل کا (بھی) جام پلایا جائے گا۔ یہ بہشت میں وہ چشمہ ہے جس کا نام سلسبیل ہے۔ اور ان کے پاس ان لڑکوں کی آمد و رفت رہے گی جو ہمیشہ لڑکپن ہی کی حالت میں رہیں گے۔ انہیں دیکھو تو یہ سمجھو گے کہ بکھرے ہوئے موتی ہیں، وہاں جدھر بھی تمہاری نظر اُٹھے گی کثرت سے نعمت اور عظیم الشان سلطنت دیکھو گے۔ ان کے بدن پر سبز مہین لباس بھی ہوں گے اور دبیز بھی۔ یہ لوگ (شیشہ کی طرح شفاف) چاندی کے کنگن بھی زیب تن کئے ہوں گے۔ انہیں ان کا رب نہایت ہی پاکیزہ شراب پلائے گا۔ یہ تمہارا صلہ ہے اور تمہاری کوشش مقبول ہوئی۔

تبصرہ مفسر ثعلبی کی روایت جو اوپر گزری کہ آیت وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَّيَتِيمًا وَّأَسِيرًا ۝ حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین و کنیز اہل بیت حضرت فضہ کی طعام بخشی پر نازل ہوئی ہے کہ انہوں نے حسب تفصیل بالا مسکین، یتیم اور اسیر کو اپنا اپنا کھانا دے کر

خود پانی پر افطار کیا، اس پر محدث ابن جوزی نے بہت سخت ریمارک کیا ہے۔ حتّٰی کہ اسے موضوع کہہ دیا، لیکن سب کو معلوم ہے کہ علامہ ابن جوزی کا ریمارک قابل اعتنا نہیں، وہ اس معاملہ میں بہت زیادہ تشدد پسند ہیں حتیٰ کہ نہایت صحیح روایتوں اور حدیثوں کو بھی موضوع کہہ دیا کرتے ہیں، جس کا شکوہ تمام محدثین کو ہے۔

شیخ ابن تیمیہ نے بھی اس روایت پر بڑا کڑا ریمارک کیا ہے لیکن فضائل اہل بیت کی روایتوں پران کا ریمارک خارجی رجحانات سے تاثر کا نتیجہ ہے جس کی تصریح ایک قاسمی اہل قلم احمد رضا صاحب بجنوری نے انوار الباری (ج ۶ ص ۲۱) میں کی ہے حالانکہ موصوف شیخ ابن تیمیہ کے علمی تبحر اور وسعت معلومات کے بڑے ہی مداح بلکہ معتقد ہیں۔ موصوف اسی صفحہ میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ:

"یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ حافظ ابن تیمیہ بھی دوسرے تیز لوگوں کی طرح جب کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو اس کے خلاف دوسروں کو ناحق یقین کرتے ہیں اور ان کی تردید میں ضرورت سے زیادہ زور صرف کر دیتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والا صحیح نقطۂ تحقیق تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور کسی غلط فہمی کا شکار تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔"

بجنوری صاحب کی یہ عبارت حرف بہ حرف صحیح ہے چونکہ یہ ابن تیمیہ کے بے حد معتقد ہیں لہٰذا کوئی مخالفانہ بیان نہیں ہے، بلکہ صورت واقعہ کا اظہار ہے۔

جب ابن تیمیہ کی تحریر سے جو کسی کی تردید میں لکھی گئی ہے "آدمی غلط فہمی کا شکار ضرور ہی ہو جاتا ہے" تو ان کے ریمارک اور تردید کا وزن ہی کیا ٹھہرا؟ اور اس پر کان ہی کیوں دھرا جائے؟ خصوصاً ان کے اس ریمارک کو سنا ہی کیوں جائے؟ جو فضائل اہل بیت کی روایات و احادیث پر انہوں نے کیا ہے، وہ تو اس قسم کی احادیث سے اگرچہ کتنی ہی صحیح ہوں، کبیدہ خاطر ہوتے ہیں کیوں کہ بقول مؤلف انوار الباری ان کا نقطۂ نظر خارجیت سے متاثر ہے (دیکھو انوار الباری ج ۶ ص ۲۱) اور اسی لئے انہوں نے مواخات کی اس حدیث کو بھی رد کر دیا ہے جس میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم نے حضرت علی کو اپنا بھائی قرار دیا ہے، حالانکہ یہ حدیث کسی طرح بھی قابل تردید نہیں، اسی لئے امام حدیث حافظ الدنیا شیخ الاسلام احمد بن علی مشہور حافظ ابن حجر عسقلانی (م ۸۵۲ھ) کو بھی اس کا بڑا شکوہ ہے اور تصریح فرمائی ہے کہ ابن تیمیہ نے اس حدیث کو محض اپنی رائے اور قیاس کی بنا پر رد کیا ہے۔ امام موصوف فتح الباری شرح صحیح البخاری (ج ۷، ص ۱۹۲) میں لکھتے ہیں:

وانکر ابن تیمیۃ فی کتاب الرد علی ابن مطھر الرافضی المواخات بین المھاجرین وخصوصًا مواخاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعلی قال لان المواخاۃ شرعت لارفاق بعضھم بعضًا: ولتألف قلوب بعضھم بعضًا فلا معنی لمواخاۃ النبی لاحد منھم ولا لمواخاۃ مھاجری لمھاجری۔	ابن مطہر علی رافضی کی تردید میں ابن تیمیہ نے جو کتاب لکھی ہے (یعنی منہاج السنۃ) اس میں مہاجرین کی باہمی مواخاۃ کا خصوصًا نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو جو اپنا بھائی قرار دیا ہے اس کا انکار کیا ہے اور یہ کہا ہے کہ شریعت میں مواخاۃ اس لئے ہے کہ بعض لوگ بعض لوگوں سے تعاون حاصل کریں اور ان کے قلوب باہم مانوس رہیں لہٰذا اس کے کوئی معنی ہی نہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کسی کو اپنا بھائی بنائیں اور اس کے بھی کوئی معنی نہیں کہ کوئی مہاجر کسی مہاجر کا بھائی بنایا جائے۔"
وھٰذا رد النص بالقیاس	
واغفال عن حکمۃ المواخاۃ لان بعض المھاجرین کان اقوی من بعض بالمال والعشیرۃ والقوی	ابن تیمیہ کی یہ بات (در حقیقت) نص کو اپنے قیاس سے رد کرنا ہے۔ اور مواخاۃ کی حکمت سے

ل حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کسی قول یا فعل میں قیاس بازی کرنا پھر یہ کہہ کر رد کر دینا کہ: "اس کے کوئی معنی نہیں"۔ بڑی گستاخی اور شوخ چشمی ہے اور اپنی رائے کو بڑا درجہ دینا اور اس کے مقابلہ میں نص کو مسترد کر دینا ہے اس مذموم حرکت کو رد النص بالقیاس کہتے ہیں۔ ۱۲ کوثر

فآخی بین الاعلی والادنی لیرتفق الادنی بالاعلی، ولیستعین الاعلی بالادنی، وبھذا تظہر مواخاۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم لعلی لانہ ھو الذی کان یقوم بہ من عہد الصبا من قبل البعثۃ واستمر وکذا مواخاۃ حمزۃ وزید بن حارثۃ، لان زیدًا مولاھم فقد ثبت اخوتہما وھما من المہاجرین۔

غفلت برتتا ہے، کیوں کہ بعض مہاجرین بعض مہاجرین کے مقابلہ میں مال، خاندان، اور قوت میں قوی تر ہیں لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلیٰ اور ادنیٰ میں مواخات قائم فرمائی ہے. تاکہ ادنیٰ شخص اعلیٰ سے فائدہ حاصل کرے اور اعلیٰ شخص ادنیٰ سے تعاون حاصل کرے۔

اس سے ظاہر ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو جو اپنا بھائی بنایا ہے اس میں کیا حکمت ہے کیوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت علی کی کفالت ان کے بچپن ہی سے فرماتے تھے (اور) بعثت کے پہلے ہی سے اس کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ اسی طرح حضرت حمزہ اور حضرت زید بن حارثہ کی باہمی مواخات بھی ہے کہ زید (بن حارثہ) غلام تھے اور ان کی مواخاۃ اپنی جگہ ثابت ہے، حالانکہ یہ دونوں حضرت مہاجرین ہیں۔

حافظ ابن حجر نے مہاجرین کی باہمی مواخات کی اور بھی مثالیں پیش کی ہیں۔ اور کتب حدیث کا حوالہ بھی دیا ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی کو جو اپنا بھائی فرمایا ہے اس کی ایک ہی نہیں بلکہ دو دو روایتیں نقل کی ہیں اس طرح اس کا درجۂ استناد اور بڑھ جاتا ہے۔

● آپ نے شیخ ابن تیمیہ کا حال پڑھ لیا کہ ان کے علم و تبحر کے بے حد معتقدین میں جو لوگ اصلیت کا چھپانا اچھا نہیں سمجھتے مثلاً مؤلف انوار الباری ان کا بیان ہے کہ:

"حافظ ابن تیمیہ بھی دوسرے تیز لوگوں کی طرح جب کوئی رائے قائم کر لیتے ہیں تو اس کے خلاف دوسرے لوگوں کو ناحق یقین کرتے ہیں اور ان کی تردید میں ضرورت سے زیادہ زور صرف کر دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مطالعہ کرنے والا صحیح نقطۂ

تحقیق تک نہیں پہنچ سکتا۔ اور کسی غلط فہمی کا شکار تو ضرور ہی ہو جاتا ہے۔"

(انوار الباری ج ۷ ص ۲۱)

• مؤلف انوار الباری یہ بھی بتاتے ہیں کہ :

" ابن تیمیہ کا نقطۂ نظر خارجیت سے متاثر ہے۔" (انوار الباری ج ۷ ص ۲۱)

• امام حافظ ابن حجرؒ جن کے بعد تمام دنیا میں اس پایہ کا محدث پیدا ہی نہیں ہوا، ان کا بیان آپ نے ابھی پڑھا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی باہمی مواخات کی حدیث کا (جس سے شیر خدا کی بہت بڑی فضیلت ظاہر ہوتی ہے) ابن تیمیہ نے انکار کیا اور قیاس بازی کرنے لگے تو حضرت موصوف نے فرمایا :

" یہ تو ابن تیمیہ اپنے قیاس سے حدیث کو رد کر رہے ہیں۔"

جب معاملہ یہاں تک ہے کہ فضیلت مرتضوی کی حدیث سے ابن تیمیہ کو اتنی کبیدگی ہوتی ہے کہ اس کی تردید میں قیاس بازی اور علت سازی کرنے لگتے ہیں، حالانکہ نص کے مقابلہ میں ایسی جسارت کرنا حرام [1] ہے۔ اس سے اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے کہ شیر خدا کی فضیلت والی روایت پر ان کے ریمارک کی حیثیت ہی کیا [2] ہے!

---

[1] کیونکہ نص کے مقابلہ میں چون وچرا کرنا اور علت سازی اور قیاس بازی کرنا سخت مضر ہے، اس سے دین میں تحریف ہوتی ہے۔ اگر روک تھام نہیں ہوئی تو دین کی اصلی صورت مسخ ہو جائے گی۔ اسی لئے مفکرین اسلام نے فرمایا ہے :

والتعلیل فی مقابلة النص مردود۔ (شامی ج ۱ ص ۱۱۶) نص کے مقابلہ میں علت بازی کرنا مردود ہے (یعنی اسے یکسر رد کر دیا جائے گا)۔

[2] اگر ابن تیمیہ میں خارجی اثرات نہ ہوتے اور روضۂ نبوی کی زیارت اقدس کے بارے میں بے باکی نہ کرتے تو بڑے کام کے آدمی تھے۔ ان کی وسعتِ علمی کا کسے انکار ہے؟ لیکن اہل بیت اطہار کے بارے میں ان کی خارجی ذہنیت، اکابر کے بارے میں ان کی شوخ چشمی اور عقائد میں ان کی کج روی نے ان کی کتابوں میں خطرناک جراثیم بھی رکھ دیئے ہیں۔ حقیقت میں وہ وسعت علمی کے لیک دریائے ذخار ہیں جس میں جابجا ایسے گرداب بھی ہیں کہ جو کشتی ان کے چکر میں پڑی ڈوب کے رہی۔ =

جب دو ایک مشہور نقاد کسی حدیث میں جرح کرتے ہیں تو ان کے ڈر پر کچھ اور لوگ بھی جرح کرنے لگتے ہیں، جس کی بنیاد تحقیق پر نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس کی کوئی علمی حیثیت نہیں۔ مفسر ثعلبی کی مذکورہ روایت پر جو جرح کی گئی ہے وہ بھی اسی نوعیت کی ہے۔

محدثین جرح و انتقاد میں عموماً چار چیزوں کو ملحوظ رکھتے ہیں:

۱۔ رواۃ ثقہ اور معتبر ہیں کہ نہیں۔

۲۔ سلسلۂ رواۃ کی کوئی کڑی رہ تو نہیں گئی، کیونکہ راویوں کو جانچنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ ہر شخص جس سے روایت لے کر بیان کر رہا ہے، اس کا نام بھی بتلائے تاکہ جانچا جاسکے کہ یہ شخص ثقہ اور معتبر

قاسمی مکتبِ فکر کے سب سے بڑے عالم شاہ انور صاحب کشمیری شیخ ابن تیمیہ کی وسعتِ علمی کے بے حد مداح اور معتقد ہیں لیکن طلبۂ مدارس اور کچی معلومات کے مدرسین کے لئے ان کی کتابوں کا مطالعہ سخت مضر سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ اپنی درسگاہ میں ان کے آنے کے بھی روادار نہیں۔ ثبوت کے لئے شاہ صاحب موصوف کا بیان ملاحظہ ہو جسے ان کے مشہور شاگرد اور داماد نیز ان کے علوم و افکار کے ترجمان فاضل احمد رضا صاحب بجنوری اپنی مشہور کتاب (انوار الباری کے مقدمہ ج ۲ صفحہ ۲۵۲) میں نقل کرتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں:

"ابن تیمیہ جبالِ علوم میں سے ہیں۔ ان کی رفعتِ شان اور جلالتِ قدر کا یہ عالم ہے کہ اگر میں ان کی عظمت کو سر اٹھا کر دیکھنے لگوں تو ٹوپی نیچے گر جائے گی۔ اور پھر بھی نہ دیکھ سکوں گا، لیکن با ایں ہمہ مسئلۂ استواء عرش میں اگر وہ یہاں آنے کا ارادہ کریں گے تو درس گاہ میں گھسنے نہ دوں گا۔"

غور کیجئے یہ کس کا بیان ہے؟ ان کے کسی مخالف کا نہیں بلکہ ان کے بے حد مداح اور بے حد معتقد کا جو اس جوش کے ساتھ ان کی مداحی کرتا ہے، کہ مشکل سے اس کی مثال ملے گی۔

آخر ابن تیمیہ کو مدارس میں کیوں نہیں گھسنے دینا چاہئے؟

اس لئے کہ طلبہ اور کچی علمیت کے مدرسین ان کے تفردات اور غلط عقائد و نظریات کے شکار نہ ہو جائیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ابن تیمیہ بڑے اچھے انشا پرداز اور جادو نگار اہلِ قلم ہیں، حتیٰ کہ غلط بات بھی لکھتے ہیں تو کچی معلومات

ہے کہ نہیں، اگر اس ضابطہ کا لحاظ نہیں رکھا گیا تو روایت پر اطمینان نہیں کیا جا سکتا، ممکن ہے کہ جس راوی کا نام نہیں بتایا گیا ہے وہ غیر معتبر ہو۔

۳۔ اس روایت کے مدمقابل کوئی ایسی روایت نہ ہو جس کے رواۃ اسکے راویوں سے زیادہ معتبر ہوں۔

۴۔ ان ضوابط کے علاوہ اس پر بھی نظر رہے کہ اس کی تہ میں کوئی ایسی بات تو نہیں جس سے روایت پایۂ اعتبار سے گر جاتی ہے۔

محدثین اور فقہائے ملت فقہی مسائل والی حدیثوں کی جانچ پڑتال میں تو ان ضوابط پر سختی سے عمل کرتے ہیں، لیکن جن حدیثوں سے فقہی مسائل کا استنباط نہیں ہوتا، ان میں اتنی کدوکاوش ضروری نہیں سمجھتے، بس اتنا جانچنا کافی سمجھتے ہیں کہ روایت جعلی تو نہیں۔

= والے لوگ سمجھتے ہیں کہ قرآن و حدیث ہی سے تو بول رہے ہیں اور جو لوگ سحر کلام سے جلد متاثر ہو جاتے ہیں وہ ابن تیمیہ کے انداز بیان سے مسحور ہو کر ان کی غلط بات میں بھی ان کے ہمنوا ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی بولی بولنے لگتے ہیں۔ اور جہاں وہ خارجیت سے متاثر ہو کر کچھ لکھتے ہیں وہاں ان لوگوں کی زبان سے بھی یہی باتیں نکلنے لگتی ہیں۔

ابن تیمیہ کی متعدد ہنگامہ خیز غلطیاں ہیں جن کا اثر بہتوں پر پڑا ہے۔ انہیں میں ان کا یہ قول بھی ہے کہ روضۂ نبوی کی زیارت کی نیت سے سفر کرنا حرام و معصیت ہے۔ اور اس میں اتنی شدت اختیار کی ہے کہ چاروں مذاہب کے علمائے کبار نے جو علوم دین کے امام تھے انہیں طرح طرح سے سمجھایا مگر یہ اپنی ضد سے باز نہیں آئے۔ مناظرہ میں بھی ہارے مگر ضد نہیں چھوڑی، چونکہ روضۂ نبوی کی زیارت پاک کی نیت سے سفر کو وہ حرام و معصیت کہہ رہے تھے، جس کا اثر حد درجہ مضر تھا اس لئے حکومت نے جیل میں ڈال دیا رہا ہونے کے بعد پھر وہی بات اٹھائی۔ لہٰذا دوبارہ جیل میں ڈالے گئے۔ کاش ضد پر نہ اڑتے اور ائمۂ دین کی بات مان لیتے۔

ابن تیمیہ پر امور ذیل قابل ذکر ہیں:۔

۱۔ علمی باتوں میں بھی وہ ضد باندھتے ہیں، حتیٰ کہ ان کے بے حد معتقد شاہ انور صاحب کشمیری کو بھی اس کا شکوہ ہے۔ شاہ صاحب موصوف کا قول ہے کہ:۔

=

فقہائے مجتہدین نے یہاں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھا ہے کہ روایت کے ان اصولوں میں اگر عمومیت پیدا کردی گئی کہ ہر جگہ ان کو استعمال کیا گیا اور جو روایتیں ان کے معیار پر پوری نہ اتریں انہیں چھوڑ دیا گیا تو امت بہت سی ایسی حدیثوں اور روایتوں سے محروم ہو جائے گی، جو اگرچہ صحیح ہیں مگر محدثین کے بنائے ہوئے ضابطے نکتہ چینی کر رہے ہیں۔ اس لئے انہوں نے ایک نہایت بے بہا ضابطہ پیش فرمایا ہے، وہ یہ ہے کہ:۔

کسی روایت کی تردید یا اس پر کڑا انتقاد اسی وقت مناسب ہے جبکہ اس کی تائید میں کوئی آیت قرآنی یا کوئی معتبر حدیث یا اجماع یا امت کا توارث و تعامل[ع] یا ایسے ہی کوئی بڑے وزن اور پاور کی چیز نہ ہو اور اگر ان میں سے کوئی چیز روایت کی تائید کر رہی ہو تو روایت قابل قبول ہے اور اس کو نظر انداز کر دینے

= " وہ (یعنی ابن تیمیہ) اپنی ہی کہتے ہیں دوسروں کی سنتے بھی نہیں " (انوار الباری ج ۶ ص ۹۲)

فاضل احمد رضا صاحب بجنوری جو اپنے استاد شاہ انور صاحب کشمیری کی طرح ابن تیمیہ کے بے حد مداح اور معتقد ہیں شاہ صاحب موصوف کا مذکورہ بالا جملہ نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں :

" یعنی دوسروں کے دلائل سے صرف نظر کر لیتے ہیں، نہ ان کو پوری طرح ذکر کرتے ہیں نہ ان کی جواب دہی ضروری سمجھتے ہیں۔ یہ بات علمی تحقیق کی شان کے خلاف ہے "

اس عادت کا نتیجہ دیکھئے کہ کسی بڑی شخصیت کی اچھی بات پر بھی کان نہیں دھرتے۔ بس اپنی ہی کہے جاتے ہیں۔ غور کیجئے کہ ان کی کتابوں کے ناظرین پر کیسا کچھ اثر پڑے گا۔ خصوصاً جب کہ ان کی بات علمی تحقیق کی شان کے بھی خلاف ہے۔

۲۔ اس کی بھی عام شکایت ہے کہ وہ حق کو نظر انداز کر دیتے ہیں۔ فاضل احمد رضا بجنوری چونکہ اصلیت کا اظہار اچھا سمجھتے ہیں۔ اس لئے ابن تیمیہ کے بے حد مداح اور معتقد ہونے کے باوجود یہ بھی لکھتے ہیں :

= " حافظ صاحب موصوف (یعنی ابن تیمیہ) بعض اوقات زور تحریر میں اپنی بات کی حمایت میں حق و

[ع] کسی چیز پر عہد رسالت سے لیکر ہر زمانہ میں جو عمل ہو رہا ہے اسے تعامل و توارث کہتے ہیں۔ اسکو بڑی اہمیت حاصل ہے حتیٰ کہ واجب کہا گیا ہے۔ غنیۃ المستملی صفحہ ۵۷۰ میں ہے : فالثابت بالفعل التوارث حینئذٍ یفید الوجوب لا الفرضیۃ ۱۲۔ کوثر

کی کوئی وجہ نہیں. لہٰذا ایسی روایت کی تردید یا اس پہ جارحانہ انتقاد کرنا محض بے سود ہے، بلکہ امت کو ایک مفید چیز سے محروم کرنا ہے. دیکھا جاتا ہے کہ ایسی روایتوں پر جارحانہ تنقید کا مقصد محض اپنی فن دانی اور قابلیت کا اظہار و نمائش ہے۔

ان ضوابط کے پیش کرنے کے بعد کہنا یہ ہے کہ مفسر ثعلبی کی پیش کردہ روایت معتبر ہے جس میں مذکور ہے کہ حسنین بیمار ہوئے اور ان کے والدین کریمین نے بہ ارشاد نبوی شفا کے لئے نذر کے تین روزے رکھے

انصاف کو بھی بالائے طاق رکھ دیتے ہیں. (انوار الباری ج ۶ ص ۴۲)

یہ بہت بڑی بات ہے اب سوچئے کہ ان میں کتنی حق پرستی اور انصاف مزاجی ہے ؟!

۳ ۔ جن مسائل کا تعلق حضور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وسلم سے شدید ایمانی وابستگی اور جوش محبت کا ہے، ان میں سے بعض اہم مسائل پر ابن تیمیہ بڑے جوش و خروش سے ایسی باتیں لکھتے ہیں جن سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے شیفتگی کے مقدس جذبات آپ سے کامل عقیدت اور ایمان آفریں محبت پر بڑی کاری ضرب لگتی ہے اور جمہور میں بڑی تشویش پیدا ہو جاتی ہے ۔

ان میں سب سے اہم مسئلہ روضۂ نبوی کی زیارت کے لئے سفر کا مسئلہ ہے ۔

امت کا اجماع ہے کہ یہ زیارت پاک حصول درجات کے سب سے بڑے ذرائع میں ہے. بہترین طاعات اور کامیاب ترین مساعی میں داخل ہے اور واجب کے قریب ہے، بلکہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ واجب ہے. (شرح اللباب مع ارشاد الساری ص ۳۴۲)

جب روضۂ پاک کی زیارت واجب یا قریب واجب ہے تو اس کے لئے سفر کرنا بھی واجب یا قریب واجب ہے، کیوں کہ جو چیز واجب ہے اس کا وسیلہ بھی واجب ہے اور جو چیز قریب واجب ہے، اس کا وسیلہ بھی قریب واجب ہے (غرض جو چیز جس نوعیت کی ہے اس کا وسیلہ بھی اسی نوعیت کا ہے)

علامہ حافظ ابن حجر مکی (متوفی ۹۷۳ھ) الجوہر المنظم ص ۱۲ میں لکھتے ہیں =

اجمع العلماء على مشروعية الزيارة — علماء کا اجماع ہے کہ یہ زیارت اور اس کے لئے

دونوں شاہزادوں نے بھی ان کی پیروی کی اور گھر کی کنیز نے بھی، اور افطار کے لئے قرص پر کچھ جو آیا تھا حضرت سیدہ نے پیا۔ تینوں روز ایسا اتفاق ہوا کہ افطار کے پہلے کوئی حاجتمند سامنے تھا۔ حضرت علی حضرت فاطمہ، حضرات حسنین اور گھر کی کنیز غرض کہ سب نے اپنا اپنا کھانا اس کو دیدیا اور پانی سے افطار کر کے اگلے دن کا روزہ پانی ہی پی کر رکھا۔ پہلے روز ایک مسکین آیا تھا، دوسرے روز یتیم، تیسرے دن اسیر۔ اس واقعہ پر یہ آیت نازل ہوئی۔

= والسفر الیہا۔ سفر کرنا ایک شرعی فعل ہے (غیر شرعی نہیں)

نیز اس زیارت کے لئے امت کا ایک تعامل ہے جو عہد صحابہ سے برابر جاری رہا ہے اور امت کا تعامل وجوب کی دلیل ہے اس سے اندازہ لگائیے کہ روضۂ اطہر کی زیارت کے لئے سفر کرنا کتنا اہم شرعی فعل ہے۔ جب امت کا اجماع ہے کہ روضۂ نبوی کی زیارت حصول درجات کے سب سے بڑے ذرائع، بہترین طاعات اور کامیاب ترین مساعی میں داخل ہے تو اس کے لئے سفر کرنا بھی ایسی ہی اہمیت کا حامل ہے، کیوں کہ یہ سفر اس زیارت پاک کا وسیلہ ہے اور کسی شئے کی جو نوعیت ہوتی ہے وہی اس کے وسیلہ کی بھی ہوتی ہے۔

کہاں روضۂ نبوی کی زیارت کے لئے سفر کرنے کی یہ شان، یہ درجہ اور اتنی بڑی اہمیت اور کہاں ابن تیمیہ کا یہ قول کہ "قبر نبوی کی زیارت کے لئے سفر کرنا حرام اور معصیت کا سفر ہے"!

اپنے اس بدترین نظریہ کو انہوں نے بڑے تشدد سے بیان کیا ہے (شد رحال والی حدیث سے غلط استدلال کیا ہے) جس سے ہر طرف ان کی مخالفت کی گئی۔

ان کے اس حد درجہ غلط نظریہ اور اس میں زبردست تشدد نے زیارت نبوی کے عشاق کو اور ذکی الحس محبانِ رسول کے لطیف احساس مقدس جذبات کامل عقیدت اور ایمان آفریں محبت کو بڑی شدید اور کاری ضرب لگائی ہے جس سے جمہور میں شدید بے چینی کی لہر دوڑ گئی، مگر انہوں نے کچھ بھی اثر نہ لیا جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے چاروں مذاہب کے علمائے کبار نے جو علوم دین کے امام تھے، انھیں ہر طرح سمجھایا، مگر یہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ مناظرے بھی ہوئے مگر ضد نہ چھوڑی بات بڑی اہم تھی، تمام مسلمانوں کے قلوب مجروح ہو گئے تھے۔ اور سب بیزار تھے، =

وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا وَّيَتِيْمًا وَّاَسِيْرًا ۝ — اور یہ لوگ اللہ کی محبت میں مسکین اور یتیم اور اسیر کو کھانا کھلاتے ہیں.

اس روایت پر جو بھی جارحانہ تنقید کی گئی ہے خواہ فنی اعتبار سے صحیح ہو لیکن چونکہ اس کی تائید میں اور روایات بھی ہیں لہٰذا نظر انداز کر دینے کے قابل نہیں۔ اور اسے قبول کیا جائے گا کیوں کہ علمی اور فنی نقطۂ نظر سے قابل قبول روایت ہے یہاں امام سبکی کا یہ ارشاد یاد رکھنے کی بات ہے کہ محدثین کسی حدیث کو منکر یا غریب کہتے ہیں، تو عموماً کسی خاص سلسلۂ رواۃ کی بنا پر کہتے ہیں۔ لہٰذا ان کے اس قول کی بنا پر اصل حدیث پایۂ اعتبار سے ساقط نہ ہو جائے گی۔ (الجوہر المنظم ص ۹)

اس روایت کی تائید میں ایک روایت وہ ہے جسے تیرھویں صدی کے بہت بڑے محدث و مفسر اور روایات کے بلند پایہ نقاد و مبصر علامہ محمد بن علی شوکانی (متوفی ۱۲۵۰ھ) نے اپنی تفسیر فتح القدیر (جلد ۵ صفحہ ۳۴۸) میں درج کیا ہے، الفاظ یہ ہیں:

واخرج ابن مردویہ عن ابن عباس — (حافظ) ابن مردویہ نے ارشاد ربانی

═ حکومت کو توجہ کرنی پڑی اور ابن تیمیہ جیل میں ڈال دیئے گئے۔

اس باب میں ابن تیمیہ کی کافی تردید کی گئی۔ حافظ ابن حجر مکی کا بیان ہے کہ ائمۂ دین کی ایک جماعت نے مثلاً علامہ عز بن جماعہ نے ان کو سخت گمراہ کہا ہے۔ اور یہاں تک کہہ دیا "عبد اضله الله واغواه والبسه رداء الخزي وارداه" (الجوہر المنظم ص ۱۵)

شیخ الاسلام امام تقی الدین سبکی نے ابن تیمیہ کے اس غلط نظریہ کی تردید میں ایک مستقل کتاب شفاء السقام لکھی جس کا ترجمہ استاذ محترم مولانا شاہ عز الدین صاحب مجیبی پھلواری رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے۔ اس موقع پر قاسمی مکتب خیال کے مشہور اہل قلم فاضل احمد رضا بجنوری بتانا چاہتے ہیں کہ ضد پر اڑے رہنا ابن تیمیہ کی عادت تھی۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں:۔

═ • حافظ ابن تیمیہ نے شد رحال والی حدیث کی وجہ سے زیارت روضۂ مقدسہ کی نیت سے سفر کو بھی

فی قولہ تعالیٰ: وَيُطْعِمُونَ الطعام الآیة ۔ قال نزلت فی علی بن ابی طالب و فاطمة بنت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہ وسلم۔	وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ (الخ) کے بارے میں ابن عباس کا قول روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا ہے: یہ آیت علی ابن ابی طالب اور فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔

یہ روایت مفسر ثعلبی کی روایت بالا کی ہم نوا ہے۔ فرق صرف اجمال وتفصیل کا ہے یہ روایت مجمل ہے اور مفسر ثعلبی کی پیش کی ہوئی روایت میں واقعہ کی پوری تفصیل ہے۔ ایسی روایتیں اور حدیثیں بکثرت ہیں، جو مجمل ہیں۔ اور ان کے مقابل دوسری روایت و حدیث میں

= حرام قرار دیا ہے، جس کو ان کے بدترین اقوال وآراء میں شمار کیا گیا ہے، مگر ان کی عادت تھی کہ جب ایک طرف چل پڑتے تو پیچھے مڑ کر نہیں دیکھتے تھے۔" (انوار الباری ص ۲۵/۱)

۴۔ ابن تیمیہ نے روضۂ نبوی کی زیارت کے لئے سفر کو اس لئے حرام کہا ہے کہ ان کے دل میں ایسی چیزوں کی وقعت ہی نہیں اس کے علاوہ ان کی عربیت ناقص ہے جس کی وجہ سے وہ شد رحال کی حدیث کو سمجھ نہ سکے اور جو غلط بات ان کے ذہن میں آئی اس پر ہنگامہ کی بنیاد کھڑی کر دی۔ آپ کو یہ سنکر حیرت ہوگی کہ شاہ انور صاحب کشمیری جو ابن تیمیہ کی علمیت کے بڑے مداح اور معتقد ہیں، ان کا بھی یہی قول ہے کہ ابن تیمیہ کی عربیت ناقص ہے انوار الباری (ج ۲ ص ۱۰۸) میں شاہ صاحب موصوف کا بیان ہے کہ:

"حافظ ابن تیمیہ کی عربیت چونکہ ناقص ہے اس لئے انہوں نے صابی کے معنی وحقیقت کو صحیح طور سے نہیں سمجھا، اور غلط فہمی سے اسکو دین صادی کا ایک فرقہ اور مومن قرار دیا ہے۔"

۵۔ سفر زیارت کے مذکورہ بالا مسئلہ پر ابن تیمیہ نے اپنا جو غلط نظریہ پیش کیا ہے اس کے علاوہ قبر نبوی کے اس حصہ کی عظیم الشان افضلیت پر جو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اطہر سے متصل ہے نہ صرف نکتہ چینی کی ہے بلکہ بقول مؤلف انوار الباری حیرت انگیز بھی بات لکھ گئے ہیں، اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ: =

تفصیل ہے. خود صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں مجمل اور مفصل دونوں قسم کی روایتیں اور حدیثیں موجود ہیں، صحاح ستہ میں ان کا کافی ذخیرہ ہے۔

مفسر ثعلبی کی اس روایت نیز اس کی موید روایات پر یہ ریمارک بھی کیا جاتا ہے کہ "ان میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ مکہ معظمہ کا واقعہ نہیں ہو سکتا (کیوں کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی میں نہ حضرت فاطمہ اور حضرت علی کی شادی ہوئی ہے اور نہ حسنین کریمین کا وجود ہے) حالانکہ وہ آیت جسکے نزول کا سبب اس واقعہ کو بتایا جاتا ہے سورۂ دہر کی ہے جو مکی سورہ ہے لہٰذا یہ آیت مکی ہے ایسی صورت میں مذکورہ بالا واقعہ کو اس کی شان نزول کیسے قرار دیا جا سکتا ہے؟

ظاہر ہے کہ یہ ریمارک بالکل بے جان ہے کیوں کہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سورہ مکی ہے مگر اس کی کوئی آیت مدنی ہے۔ نیز خود یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ مدنی ہے کیوں کہ اس میں "اسیر" کا لفظ آیا ہے اور اسیر یعنی وہ

= حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قبر مطہر کا وہ حصہ جس سے جسم اطہر لگا ہے تمام روئے زمین کے حصوں سے افضل ہے اور اس پر امت کا اجماع ہے، حتیٰ کہ کعبۂ مقدسہ سے بھی افضل ہے جیسا کہ امام مناسک علامہ رحمت اللہ سندی (متوفی ۹۹۳ھ) نے لباب میں لکھا ہے اور ملا علی قاری نے اس کی شرح (صفحہ ۲۵۲ مطبوعہ مع ارشاد الساری) میں مزید توضیح کی ہے جسے علامہ شامی نے بھی رد المحتار (ج ۲ ص ۲۵۰) میں نقل کیا ہے۔ ملا علی قاری اس کے بعد یہ بھی لکھتے ہیں اور علامہ شامی بھی نقل کرتے ہیں کہ :۔

"نقل القاضی العیاض وغیرہ الاجماع علی تفضیل ما ضم الاعضاء الشریفۃ حتیٰ علی الکعبۃ المنیفۃ"

اس کا ماحصل یہ ہے کہ قبر شریف کا وہ حصہ جس سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اعضائے شریف کا اتصال ہے اس کے بارے میں قاضی عیاض وغیرہ نے اجماع نقل کیا ہے کہ یہ حصہ تمام روئے زمین سے افضل ہے، حتیٰ کہ کعبہ شریف سے بھی۔ شیخ ابن تیمیہ اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ قبر نبوی کا وہ حصہ کعبہ سے افضل نہیں، بلکہ کعبہ افضل ہے، خیر یہ تو ان کی رائے تھی، لیکن قاضی عیاض کے مذکورہ بالا قول پر جو بات انہوں کہی ہے وہ حد درجہ حیرت انگیز ہے، چنانچہ کہہ دیا کہ =

مشرک جو مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا، اور شکست کھا کر گرفتار ہوا ہے، مکہ میں کہاں؟ یہ تو مدینہ کا واقعہ ہے کہ مشرکین لڑنے آئے اور اسیر ہوئے، یہاں انہیں رکھا گیا اور یہیں کھاتے پیتے رہے۔ لہٰذا اسیر کو کھانا کھلانے کی صورت جو آیت میں مذکور ہے وہ مکہ کا واقعہ ہو ہی نہیں سکتا۔ پس آیت میں مدنی واقعہ کا بیان ہے اور آیت مدنی ہے۔

• قاضی عیاض سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی اور نہ ان کے بعد کسی نے ان کی موافقت کی ہے"۔ (انوار الباری ج ۶ ص ۷۱) یا للعجب! ابن تیمیہ بول کیا رہے ہیں؟ کیا واقعی قاضی عیاض سے پہلے کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے اور ان کے بعد کسی نے ان کی موافقت نہیں کی ہے؟ حقیقت تو یہ ہے کہ ان سے پہلے ان پر اجماع ہو چکا ہے ــــ امام ابو الولید باجی (متوفی ۴۷۴ھ) جو قاضی عیاض متوفی ۵۴۴ھ سے پہلے گذرے ہیں۔ ان کا بھی یہی قول ہے۔ اور امام ابن عساکر متوفی ۵۷۱ھ جو قاضی عیاض کے زمانہ میں تھے، وہ بھی یہی کہتے ہیں اور بعد کے علماء بھی یہی کہتے ہیں۔ ملاحظہ ہوں کتب مناسک اس موضوع پر علامہ زرقانی نے شرح مواہب لدنیہ میں بڑی خبیرانہ واقفیت جمع کر دی ہے۔

اس روشنی میں دیکھئے تو نظر آتا ہے کہ ابن تیمیہ بڑی کچی بات بول گئے ہیں، بلکہ جو ان سے بد ظن ہے وہ تو بے جھجک کہہ دیگا کہ غلط بیان کر گئے ہیں، مگر راقم السطور اتنا ہی کہتا ہے کہ اس موقع پر شیخ ابن تیمیہ کے ایک بڑے مداح و معتقد نے اپنی کتاب انوار الباری (ج ۶ ص ۷۱) میں یہ لکھ ہی دیا کہ:

> • حافظ ابن تیمیہ کے قلم سے ایسی کچی بات پڑھ کر بڑی حیرت بھی ہوئی کیوں کہ اپنی رائے پیش کرنے کا حق تو ہر شخص کو ہے مگر مذکورہ بالا قسم کے دعاوی بھی ساتھ لگا دینے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا۔"

۶ ـ متن میں گذر چکا ہے کہ ابن تیمیہ فضائل مرتضوی کی حدیث کو اپنے قیاس سے رد کرنے کے مرتکب بھی ہیں کیونکہ خارجیت سے متاثر ہیں۔ اسی تاثر کی بنا پر رد شمس کی حدیث کو بھی انہوں نے رد کیا ہے اور اس میں اتنا آگے بڑھ گئے ہیں کہ امام طحاوی جیسے عدیم المثال امام اور علوم دین کے ایک ستون عظیم کی شان میں بھی نازیبا بات بول گئے ہیں اور بیان ہے کہ انہوں نے حدیث کو صحیح فرمایا ہے اور ابن تیمیہ اس کی تردید پر تلے ہوئے ہیں۔ تفصیل یہ ہے:

محبتِ اہل بیتؑ اور قرآن مجید

جب تک مسلمانوں کے ہاتھوں میں قرآن مجید اور اہل بیت کا دامن رہے گا وہ گمراہ ہو ہی نہیں سکتے جیسا کہ حدیث ثقلین نے فرمایا ہے اور واقعات نے ہمیشہ تصدیق کی ہے اس لئے ضروری ہے کہ مسلمان اہل بیت اطہار کی محبت سے لبریز رہیں۔ اس کی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ خود قرآن مجید نے بھی اس

= غزوۂ خیبر کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو اس کے قریبی مقام موضع صہبا میں کسی ضرورت سے بھیجا تھا۔ واپس آئے تو عصر کی نماز ہو چکی تھی اور تھوڑی دیر کے بعد سورج ڈوب گیا۔ حضرت علی نے ابھی عصر نہیں پڑھی تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کے لئے سورج نکل آنے کی دعا فرمائی۔ سورج نکل آیا۔ اور حضرت علی مرتضیٰ نے نماز پڑھی۔ اس واقعہ سے حضرت علی کی بڑی محبوبیت، مقبولیت، اور فضیلت کا ظہور ہوا۔

امام طحاوی اس حدیث کو صحیح فرماتے ہیں، لیکن چونکہ یہ حدیث ابن تیمیہ کے نقطۂ نظر کے خلاف ہے جو خارجیت سے متاثر ہے کیونکہ اس سے حضرت علی کی بڑی محبوبیت، مقبولیت اور فضیلت کا اعلان ہوتا ہے۔ اس لئے انہوں نے اسے گرانے کی غلط کوشش کی ہے اور اس سلسلے میں امام طحاوی جیسے امام المحدثین کی تصحیح کو بے اثر بنانے کے لئے ان کی حدیث دانی اور مہارت فن کو خام اور ناقص قرار دینے کی جسارت تک کر گئے اور یہاں تک کہہ گئے کہ :

"طحاوی اگرچہ کثیر الحدیث فقیہ وعالم ہیں لیکن دیگر اہل علم کی طرح اسناد سے کما حقہٗ واقف نہ تھے۔"

اس پر عصر حاضر کے امام علوم حضرت علامہ زاہد الکوثری مصری رحمۃ اللہ علیہ الحاوی فی سیرۃ الطحاوی میں لکھتے ہیں :

"امام طحاوی کے بارے میں ابن تیمیہ کا اتنا سخت ریمارک اس لئے ہے کہ انہوں نے ردِّ شمس والی حدیث کی تصحیح کر دی ہے جس سے ضمناً حضرت علی کی منقبت نکلتی ہے۔ اور اس سے ابن تیمیہ کے اس زاویۂ نگاہ پر اثر پڑتا ہے، جو حضرت علی کے متعلق انہوں نے قائم کیا ہے!!"

بجنوری صاحب انوار الباری میں اسے نقل کر کے لکھتے ہیں :

=

پر زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے :۔

قُلْ لَّآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ؕ (الشّوریٰ ، ۲۳)

کہہ دیجئے میں تم لوگوں سے اس (دین کی تعلیم و تربیت پر) اجرت نہیں مانگتا، البتہ جو محبت میرے رشتہ داروں کے بارے میں ثابت ہو چکی ہے بس وہ (چاہیئے)۔

ذریاتِ طیبہ کی محبت کے بیان میں گذر چکا ہے کہ یہ آیت کریمہ تمام امت کو ہدایت دیتی ہے کہ اہل بیت اطہار اور ذریت طاہرہ کی محبت فرض ہے۔

امام ابن منذر، امام ابن جریر، امام ابن ابی حاتم، امام طبرانی، حافظ مردویہ وغیرہ حضرت ابن

"کیونکہ ان کا نقطۂ نظر خارجی رجحانات کا اثر پذیر ہے۔ اور اس کا ثبوت ان کی عبارتوں سے ملتا ہے"۔ (صفحہ ۲۰۰-۲۱)

یہ کون لکھ رہا ہے؟ ابن تیمیہ کا مخالف نہیں بلکہ بڑا مداح اور معتقد لکھ رہا ہے۔ اور اس کا بیان ہے کہ ابن تیمیہ میں خارجیت ہے اور اس کا ثبوت ان کی کتابوں سے ملتا ہے۔

ابن تیمیہ کی ایک روش ان احادیث اور تاریخی حقائق کا انکار ہے جن سے اہل بیت اطہار کی اونچی شان کا اظہار ہوتا ہے جیسا کہ گذشتہ سطور سے ظاہر ہے اس سلسلہ میں بقول علامہ شبلی وہ گستاخی اور خیرہ چشمی کرتے ہیں، علامہ موصوف سیرۃ النعمان صفحہ ۳۹ میں لکھتے ہیں :

"ابو حنیفہ ایک مدت تک استفادہ کی غرض سے ان کی (یعنی امام باقر کی) خدمت میں حاضر رہے اور فقہ و حدیث کے متعلق بہت سی نادر باتیں حاصل کیں۔ شیعہ اور سنی دونوں نے مانا ہے کہ امام ابو حنیفہ کی معلومات کا بڑا ذخیرہ حضرت ممدوح کا فیض صحبت تھا۔ امام صاحب نے ان کے فرزند رشید حضرت جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے فیض صحبت سے بھی بہت کچھ فائدہ اٹھایا، جس کا ذکر عموماً تاریخوں میں پایا جاتا ہے۔ ابن تیمیہ نے اس کا انکار کیا ہے اور اس کی وجہ یہ خیال کی ہے کہ امام ابو حنیفہ حضرت امام جعفر صادق کے معاصر اور ہمسر تھے۔ اس لئے ان کی شاگردی کیوں کر اختیار کرتے لیکن یہ ابن تیمیہ کی گستاخی اور خیرہ چشمی ہے امام ابو حنیفہ لاکھ مجتہد اور فقیہ ہوں لیکن فضل و کمال میں ان کو حضرت جعفر صادق سے کیا نسبت ہے؟ حدیث بلکہ تمام مذہبی علوم اہل بیت کے گھر سے نکلے و صاحب البیت ادریٰ بما فیہ" ۱۲ کوثر

عباس سے روایت کرتے ہیں کہ جب آیت نازل ہوئی " قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى " تو صحابہ نے گذارش کی " یا رسول اللہ آپ کے وہ کون رشتہ دار ہیں، جنکی محبت ہم پر فرض ہے؟" آپ نے فرمایا " وہ ہیں، علی، فاطمہ اور ان کے دونوں فرزند " گو لفظ قوبی کے کئی معانی ہیں. اور جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے وہ سب اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں لیکن ان میں یہ مفہوم ترجیح رکھتا ہے کہ قربیٰ سے مراد حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین ہیں۔ اس پر مفصل بحث ذریات طیبہ کی محبت کی فصل میں گذر چکی ہے ۔

نوٹ :۔ فضائل اہل بیت کا باب بہت وسیع ہے، اس پر کافی لکھنے کی ضرورت ہے، لیکن احباب کے شدید تقاضے کی بنا پر کتاب کا ابتدائی حصہ چھپنے کے لئے جا چکا ہے اور کتاب کی جلد از جلد تکمیل واشاعت کا تقاضا مجبور کر رہا ہے کہ محبین کے اشتیاق کو بھی ملحوظ رکھا جائے اور یوں بھی زندگی کا کیا بھروسہ۔ لہٰذا بہت سے مباحث چھوڑ کر آگے بڑھنا ضروری ہوا۔ کتاب کی طباعت شروع ہو چکی ہے لہٰذا اس کا موقع نہیں رہا کہ کتاب مکمل ہونے کے بعد اول سے آخر تک سب پر نظر ثانی کر لی جاتی، ضروری ترمیم واضافہ کیا جاتا۔ ترتیب میں کچھ ردوبدل کیا جاتا۔ تکمیل کار کی فکر ہے اس لئے یہ باب ختم کیا جاتا ہے۔ مزید مباحث چھوڑ کر صرف ذیل کی حدیث پر اکتفا کیا جا رہا ہے جس سے ایک حد تک مزید مباحث کے مقاصد پورے ہو جاتے ہیں۔ گو یہ حدیث پہلے لکھی جا چکی ہے لیکن اب دل میں اتار لیجئے۔

فضائل اہل بیت کی ایک اہم حدیث

قاضی عیاض شفا جلد ۲ صفحہ ۴۸-۴۰ (مطبع دار الکتب مصر) میں لکھتے ہیں :۔

قال صلی اللہ علیہ وسلم : معرفۃ اٰل محمد صلی اللہ علیہ وسلم براءۃ من النار، وحب اٰل محمد جواز علی الصراط والولایۃ لاٰل محمد	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: آل محمد (کے مقام) کا عرفان حاصل کرنا جہنم سے نجات ہے اور آل محمد سے محبت رکھنا پل صراط سے پار ہو جانا ہے اور آل محمد کی نصرت وحمایت کرنا عذاب سے امان

امان من العذاب۔ پاتا ہے۔

قاضی عیاض حدیث کے مسلّم امام ہیں، امام نووی کی شرح صحیح مسلم ان کے محدثانہ اقوال و تحقیقات سے بھری پڑی ہے۔ اس بلند پایہ امام حدیث کو اس حدیث پر اتنا اعتماد ہے کہ وہ اسے اس اسلوب میں نہیں پیش کرتے کہ راوی کہتا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے، بلکہ راوی پر ذمہ داری ڈال دینے کے بجائے خود ذمہ داری لے لیتے ہیں۔ اور اپنی پوری ذمہ داری کے ساتھ کہتے ہیں " قال صلی اللہ علیہ وسلم" یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے۔ ائمہ حدیث اس ذمہ داری کے ساتھ کوئی حدیث اس وقت بیان کرتے ہیں جب کہ وہ ان کے نزدیک بالکل صحیح اور بے غبار ہوتی ہے۔

غرض قاضی عیاض کا یہ اسلوب بیان بتاتا ہے کہ یہ حدیث ان کے نزدیک بالکل صحیح اور بے غبار ہے۔[1]

---

[1] کسی امام حدیث کی تصحیح احادیث خواہ وہ صراحۃً ہو یا اشارۃً ماننے کی چیز ہے، لیکن یہ نکتہ ہمیشہ یاد رکھنا چاہیے کہ قاضی عیاض ہوں یا ان سے بھی بلند پایہ ائمۂ حدیث ہوں صرف حدیث کی تصحیح و تضعیف جیسے امور میں ان کی باتیں اور ان کے فنی اشارات سند مانے جا سکتے ہیں، لیکن معانی کے استنباط اور دیگر فقہی اور علمی مسائل میں سند نہیں اور انھیں ماننا کچھ ضروری نہیں اسی لئے محققین نے فرمایا ہے اور حقیقت کا بھی اعلان ہے کہ "لکل فن رجال" یعنی ہر فن کے الگ الگ آدمی ہیں۔ حدیث میں محدثین کے اقوال سند ہیں؛ فقہ میں ائمۂ مجتہدین کے، تاریخ میں مورخین کے اور علوم عربیت (نحو، لغت اور معانی و بیان) میں ائمۂ عربیت کے۔ اگر کوئی شخص عربیت کا امام ہو تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ حدیث و تفسیر اور فقہ میں بھی اس کا قول اور اشارہ سند ہے۔ اسی طرح ہر فن کے اماموں کا معاملہ ہے، لیکن ائمۂ مجتہدین کا قول اور اشارہ فن حدیث و تفسیر میں بھی سند ہے کیوں کہ یہ حضرات ان علوم کے بھی امام ہیں، بلکہ حدیث کی تصحیح وغیرہ میں

== ان کا فیصلہ ائمۂ حدیث بلکہ بخاری و مسلم کے فیصلہ سے بھی زیادہ وزنی ہے کیوں کہ محدثین کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف و موضوع عموماً علم اسناد ہی کے ضوابط کی بنا پر کہا کرتے ہیں۔ لیکن ائمۂ مجتہدین ان ضوابط کے ساتھ اور بھی متعدد زاویۂ نظر سے جانچتے ہیں۔ جب تحقیق کا ہر پہلو اسے موضوع کہتا ہے جبھی یہ حضرات کسی حدیث کو موضوع فرماتے ہیں۔ اسی لئے محدثین کسی حدیث کو رد کردیں تو محض علم اسناد کے رو سے تردید ہوئی ہے جس کا ماننا کچھ ضروری نہیں، لیکن مجتہدین کسی حدیث کو موضوع فرمادیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حدیث علم اسناد کے ضوابط سے بھی موضوع ہے اور دیگر ممکنات تحقیق کی رو سے بھی موضوع ہے۔ لہٰذا با ہمہ وجوہ موضوع ہے، اسی لئے اسے موضوع ماننا ہی چاہئے۔ اس حقیقت کو امام سبکی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

ومما یجب ان یتنبہ لہ ان حکم المحدثین بالانکار والاستغراب قد یکون بحسب تلک الطریق فلا یلزم من ذالک رد متن الحدیث بخلاف اطلاق الفقیہ: ان الحدیث موضوع فانہ حکم علی المتن من حیث الجملۃ.

(الجوہر المنظم ابن حجر مکی صفحہ ۹ مطبع میمنیہ مصر) ۱۲ کوثر

فضائل

امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ

کَرَّمَ اللہُ وَجْہَہُ الْکَرِیْم ۝

یہ شان و منزلت!؟

کہ

حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم حضرت علی سے فرماتے ہیں:-

اے علی تم کو میری طرف سے وہی منزلت حاصل ہے جو موسیٰ کی طرف سے
ہارون کو حاصل تھی
البتہ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔

انت منی بمنزلت هارون من موسیٰ
الا انہ لا نبوۃ من بعدی (مسلم وترمذی)

حضرت علی معیارِ ایمان ہیں!

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے :-

اے علی تم سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہے، اور تم سے وہی بغض رکھے گا جو منافق ہے۔

لا یحبك الاّ مومن،
ولا یبغضك الا منافق،
(ترمذی، نسائی، ابن ماجہ)

حضرت علی کی محبوبیت عظمیٰ

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس چڑیے کا گوشت تو آپ نے یہ دعا فرمائی :-

اے اللہ تیری مخلوق میں جو سب سے بڑھ کر تیرا محبوب ہو اسے
بھیج دے کہ میرے ساتھ یہ گوشت کھائے پس
اس کے بعد حضرت علی آئے اور یہ گوشت تناول فرمایا۔

عن انس بن مالك، قال: كان عند النبي صلى الله عليه وسلم طير، فقال: اللهم ائتني باحب خلقك اليك ياكل معي هذا الطير فجاء علي، فاكل؛

(سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳)

حیاتِ مرتضوی کا ایک باب

نام ونسب اور خاندانی حالات

علی نام، ابوالحسن اور ابوتراب کنیت، حیدر لقب، والد کا نام ابوطالب، والدہ کا فاطمہ اور دادا کا عبدالمطلب جو حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بھی دادا تھے۔ پردادا کا نام ہاشم ابن عبدمناف، یہ مکہ معظمہ کے سب سے ذی اثر بزرگ تھے۔ ان کی اولاد کو بنی ہاشم کہتے ہیں بنی ہاشم کعبہ کے متولی تھے۔ ان کو تمام عرب میں مذہبی بالادستی اور خصوصی امتیاز حاصل تھا۔

حضرت علی کے والد ماجد جناب ابوطالب اور حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد بزرگوار حضرت عبداللہ ماں جائے بھائی تھے۔ یعنی حضرت علی حضور کے چچیرے بھائی ہیں۔

جناب ابوطالب حضرت عبدالمطلب کے جانشین تھے اور تمام بنی ہاشم نے ان کو بڑا مان لیا تھا۔ اپنی عظمت، وجاہت، نیک مزاجی اور شرافت کی بنا پر مکہ کے نہایت ذی اثر بزرگ تھے۔ حضرت عبدالمطلب کے انتقال کے بعد جناب ابوطالب ہی نے حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی آغوش کفالت میں لیا تھا۔ اس وقت حضور انور کی عمر شریف آٹھ سال کی تھی۔ ابوطالب آپ سے اس قدر محبت رکھتے تھے کہ آپ کے مقابلہ میں اپنے لڑکوں کی بھی پروا نہیں کرتے تھے۔ سوتے تو آپ کو ساتھ لے کر سوتے اور سفر میں جاتے تو آپ کو ساتھ لے کر جاتے بعثت نبوی کے بعد تمام عرب حضور کا دشمن ہو گیا تھا۔ اور قریش نے ہر طرح کی ایذا دی اس وقت صرف ابوطالب ہی آپ کے پشت پناہ تھے۔ اور اپنی جان کو خطرہ میں ڈال کر آپ کی پشت پناہی کی ہے۔ قریش نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پشت پناہی اور حمایت کی وجہ سے ابوطالب اور ان کے خاندان کو طرح طرح کی تکلیفیں پہونچائیں۔ حضور کے ساتھ ان کو بھی تین سال تک شعب ابی طالب میں

(جو پہاڑ کی ذرہ ہے) محصور کر دیا۔ اس پوری مدت میں یہ اہتمام تھا کہ ان لوگوں کے پاس کھانے پینے کا کوئی سامان نہ جا سکے۔ بالآخر طلح کے پتے کھا کر تین سال کی طویل مدت بسر کی گئی۔ غرض ہر طرح ابوطالب کو ایذا پہونچائی گئی، مگر (بالفاظ حاجی معین الدین ندوی مرحوم) اس نیک طینت بزرگ نے آخری لمحۂ حیات تک اپنے عزیز بھتیجے کے سر سے دست شفقت نہ اٹھایا، اس بزرگ کے انتقال کے سلسلے میں دو روایتیں آتی ہیں۔ ایک روایت میں ہے کہ ان کے انتقال کے وقت حضور نے فرمایا "مرتے مرتے لا الٰہ الا اللہ کہہ لیجئے کہ میں اللہ کے یہاں آپ کے ایمان کی شہادت دوں گا۔" ابوجہل اور عبداللہ بن ابی امیہ پہلے سے موجود تھے۔ دونوں نے کہا "کیا عبدالمطلب کے دین سے پھر جاؤ گے؟" بالآخر ابوطالب نے کہا "میں عبدالمطلب کے دین پر مرتا ہوں"، پھر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے کہا۔ "میں وہ کلمہ کہہ دیتا مگر قریش کہیں گے موت سے ڈر گیا۔"

لیکن اس کے بعد کیا ہوا؟ اس کا بیان دوسری روایت میں ہے وہ یہ ہے کہ:-
حضرت عباس کا بیان ہے "آخر وقت میں ان کی زبان پر کلمۂ توحید تھا۔"
اس موقع پر علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا تاثر یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

"ابوطالب نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کے لئے جو جاں نثاریاں کیں اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ اپنے جگر گوشوں تک کو آپ پر نثار کرتے تھے آپ کی محبت میں تمام عرب کو اپنا دشمن بنا لیا۔ آپ کی خاطر محصور ہوئے فاقے اٹھائے، شہر سے نکالے گئے۔ تین برس تک آب و دانہ بند رہا۔ کیا یہ محبت یہ جوش، یہ جاں نثاریاں سب ضائع جائیں گی۔"

حضرت علی کی والدہ ماجدہ حضرت فاطمہ بھی ہاشمی تھیں۔ انہوں نے ماں کی طرح بے حد شفقت و محبت سے آمنہ کے یتیم کی پرورش کی۔ علانیہ اسلام قبول کیا۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم عہد نبوت میں بھی ان کو ماں کہا کرتے تھے۔ ان کا انتقال ہوا تو کفن میں اپنا مقدس پیراہن پہنایا۔ اور قبر میں لیٹ کر اس کو انوار اور فیوض و برکات سے معمور فرما دیا۔ اور یہ ارشاد فرمایا: "ابوطالب کے بعد

سب سے زیادہ اسی نیک سیرت خاتون کا ممنون احسان ہوں"

سال ولادت اور مقام ولادت

کہا گیا ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم بعثت نبوی سے دس سال پہلے پیدا ہوئے آپ کی والدہ ماجدہ کعبہ شریف میں زیارت کے لئے گئی تھیں، وہیں آپ کی ولادت ہوئی۔

حلیہ

رنگ گندمی اور کھلتا ہوا۔ چہرہ نہایت حسین اور ہنستا ہوا، قد متوسط اور موزوں، آنکھیں بڑی اور نہایت خوبصورت، اعضا نہایت سڈول، اور بے حد مضبوط، جوان ہوئے تو آپ کی قوت وطاقت فوق الادراک تھی۔ بڑے سے بڑے پہلوان بھی آپ کے سامنے گرد تھے۔ آپ کے ہاتھوں میں اللہ نے معجز نما قوت بخشی تھی اسی لئے آپ کو ید اللہ کہتے ہیں۔ آخر میں سر مبارک اور ریش مقدس کے بال سفید ہو گئے تھے۔

پرورش

جناب ابو طالب کثیر العیال اور پریشان حال تھے؛ اس لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کی پرورش اپنے ذمہ لے لی، اس وقت سے وہ آپ کی کفالت میں رہنے لگے۔ آپ ہی کی آغوش کفالت میں جوان ہوئے اور اسی ظل رحمت میں تربیت محمدی کے تمام کمالات حاصل کئے حتیٰ کہ سرچشمۂ ولایت ہو گئے۔ چنانچہ سلسلۂ اولیاء اللہ کی تمام نہریں آپ ہی سے نکلی ہیں۔ اور بقول اکابر طریقت جو شخص ولی ہوا ہے وہ آپ ہی کے فیض و توسط سے اس درجہ پر فائز ہوا ہے اور آئندہ بھی ایسا ہی ہوگا۔ اسی لئے ارباب طریقت آپ کے بیحد گرویدہ ہیں اور آپ کو مرشد اعظم مانتے ہیں۔

اولین مسلمان

اس میں سب کا اتفاق ہے بلکہ اجماع ہے کہ سب سے پہلے ام المومنین حضرت خدیجہ صدیقہ کبریٰ رضی اللہ عنہا مسلمان ہوئیں۔ آپ کے بعد اولین مسلمان کون ہے؟ اسمیں تین اقوال ہیں۔ (۱) اولین مسلمان حضرت علی ہیں (۲) حضرت ابوبکر صدیق ہیں (۳) حضرت زید بن حارثہ ہیں، لیکن حافظ الدنیا امام ابن حجر عسقلانی جن کے بعد علوم حدیث و اسماء الرجال میں اس پایہ کا محقق آج تک نہیں ہوا۔ تقریب التہذیب صفحہ ۲۰۷ میں حضرت علی کے اوصاف

بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

الرجح انہ اول من اسلم۔ — ترجیح اسی قول کو ہے کہ اولین مسلمان حضرت علیؓ ہیں۔

بات بھی معقول ہے کہ حضرت علی فطرتاً نہایت پاک طینت اور حق پرست تھے اور آغوش نبوی میں تربیت پائی تھی جس سے قلب و ضمیر میں پوری نورانیت تھی اور اسلام کے مذہبی مناظر سب سے پہلے انہیں نے دیکھے تھے۔ اب قبول اسلام میں کیا دیر تھی ۔؟

پہلے نمازی

محققین نے تصریح کی ہے کہ اس امت میں سب سے پہلے حضرت علی نے نماز پڑھی ہے۔ مسند ابی داؤد طیالسی میں خود حضرت علی کا ارشاد مروی ہے کہ :-

انا اول من صلی مع النبی صلی اللہ علیہ وسلم (اکلیل ج ۴ ص ۱۱۴) — میں ہی نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سب سے پہلے نماز پڑھی ہے۔

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ابتدائے اسلام میں عموماً مخفی مقامات پر نماز پڑھتے حتیٰ کہ کسی سنسان وادی میں یہ عبادت ادا فرماتے ، وہاں حضرت علی بھی شریک نماز ہوتے۔

ایک مرتبہ اللہ کے یہ دونوں پیارے وادی نخلہ میں نماز پڑھ رہے تھے کہ جناب ابوطالب آ پہونچے، پوچھا: "تم دونوں یہ کیا کر رہے تھے؟" حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "یہ اللہ کی نماز و عبادت ہے۔" ابوطالب نے کہا: "کوئی حرج کی بات نہیں۔" (مسند احمد ج ۱ ص ۹۹)

حضرت علی کی مکی زندگی کے چند احوال و کوائف

حضرت علی دس سال کے تھے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اور حضرت خدیجہ کے بعد آپ ہی نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا، اس وقت سے آپ ہجرت کرنے سے پہلے تک مکہ معظمہ میں عبادت الہی، دینی خدمت اور حضور کی ہم راہی میں رہا کرتے تھے۔ حضور تبلیغ اسلام کے لئے تشریف لے جاتے تو اکثر آپ اور حضرت ابوبکر صدیق اور زید بن حارثہ بھی ہمراہ ہوتے۔

مسند احمد ج ۱ ص ۸۴ میں ہے کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خانۂ کعبہ میں تشریف لے جاتے تو کبھی کبھی بتوں کو توڑ پھوڑ بھی دیتے۔

اولین دعوتِ اسلام میں حضرت علی کا کارنامہ

بعثت نبوی کے چوتھے سال حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم ہوا کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو تبلیغ کرو، اور یہ آیت نازل ہوئی۔

وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ (شعرآء - ۲۱۴)

اپنے قریبی رشتہ داروں کو عذابِ الٰہی سے متنبہ کرو۔

اس سلسلہ میں آپ نے حضرت علی سے فرمایا "رشتہ داروں کی دعوت کا انتظام کرو"۔ یہ درحقیقت دعوت اسلام کا پہلا[۱] موقع تھا، جیسا کہ علامہ شبلی نے لکھا ہے۔ گو اس وقت حضرت علی کی عمر ۱۳ سال کی تھی، لیکن اس کم سنی کے باوجود بہت ہی اچھا انتظام کیا۔ تمام خاندانِ عبد المطلب کو دعوت دی گئی تھی۔ چالیس آدمی آئے۔ ان میں جناب ابو طالب، حضرت حمزہ، حضرت عباس اور ابو لہب بھی تھے۔ لوگ کھانا کھا چکے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کھڑے ہو کر فرمایا:

"میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کو کفیل ہے۔ اس بارِ گراں کے اٹھانے میں میرا کون ساتھ دے گا؟"

تمام مجلس میں سناٹا تھا، دفعتہً حضرت علی نے اٹھ کر کہا۔

"گو مجھے آشوبِ چشم ہے، گو میری ٹانگیں پتلی ہیں، گو میں سب سے نو عمر ہوں، تاہم میں آپ کا ساتھ دوں گا"۔

قریش کے لئے یہ حیرت انگیز منظر تھا کہ دو شخص جن میں ایک سیزدہ ۱۳ سالہ نوجوان ہے دنیا کی قسمت کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ حاضرین کو بے ساختہ ہنسی آگئی، لیکن آگے چل کر زمانے نے بتا دیا کہ یہ

---

۱ یہاں سے "سراپا پیچ" تک "سیرۃ النبی" ج ۱ ص ۲۱۱ طبع ششم سے ماخوذ ۔۔۔ ۱۲ کوثر

سراپا سچ تھا۔

تاریخ طبری صفحہ ۱۲۰۲ میں ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کے اس جواب کے بعد پھر وہی کلمات فرمائے کہ "میں وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کو کفیل ہے، اس بارِ گراں کے اٹھانے میں میرا کون ساتھ دے گا؟" حضرت علی نے اٹھ کر پھر وہی کہا جو اوپر مذکور ہے، تیسری بار آپ نے پھر وہی فرمایا، پھر حضرت علی ہی نے حضور کے دست و بازو بننے کے کلمات بالا کا اعادہ کیا۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا۔

"علی بیٹھ جاؤ، تم میرے بھائی اور میرے وارث ہو"[1] (یعنی میرے علوم کے وارث)۔

شب ہجرت اور حضرت علی کی عدیم المثال جاں نثاری

شب ہجرت اسلام کی وہ تاریخی رات ہے جو حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مدنی زندگی کا دیباچہ ہے۔ اور مدنی زندگی ہی اسلام کی آزادی، توسیع تبلیغ اور خلافت الہیہ کے قیام و استحکام کا زمانہ ہے۔ اس مبارک رات میں دو بزرگوں کی اسلامی خدمات سب پر بالا ہیں۔ ایک بزرگ ہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جو حضور اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہجرت کر رہے ہیں اور یار غار بننے کا شرف حاصل کیا۔ دوسرے بزرگ ہیں حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم، حضور پر قربان ہونے کے لئے آپ کے اس بستر پر لیٹے ہیں جس پر حملہ کرنے کے لئے قریش کے بہادروں کی تلواریں کھنچی ہوئی ہیں کہ صبح ہونے ہی تمام تلواریں سونے والے پر برس پڑیں۔ تفصیل یہ ہے:

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابۂ کرام پر قریش نے جب ہر طرح کے ظلم ڈھائے آپ نے

---

[1] یہ روایت سنن کبریٰ امام نسائی میں بھی ہے جس کا خلاصہ حافظ عراقی نے تخریج احیاء العلوم میں درج کیا ہے الفاظ یہ ہیں:
جمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بنی عبد المطلب الحدیث۔ وفیہ فایکم یبایعنی علی ان یکون اخی وصاحبی ووارثی فلم یقم الیہ احد (قال علی) فقمت الیہ وفیہ حتی اذا کان فی الثالثۃ ضرب بیدہ علی یدی) تخریج ما فی احیاء العلوم من الاخبار المطبوع مع احیاء العلوم ج ۲ ص ۲۸۸) ۱۲ کوثر

سب کو مدینہ ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ چنانچہ چند مظلوموں کے علاوہ قریب قریب تمام حضرات ہجرت کر گئے، مشرکین مکہ نے دیکھا کہ مسلمان ہمارے پنجہ سے نکل گئے اور مدینہ میں اپنا مضبوط اڈہ بنا لیا۔ یہاں اسلام برابر پھیلتا جا رہا ہے اور مسلمان روز بروز طاقت پکڑتے جا رہے ہیں۔ اس سے انھیں خطرہ محسوس ہوا کہ یہ منظم ہو کر اور سامان جنگ سے لیس ہو کر ہمارے مظالم کا انتقام لیں گے۔ اب کیا ہونا چاہئے۔ اسکے لئے قریش کے تمام سرداروں کی میٹنگ ہوئی بالآخر طے پایا کہ پیغمبر اسلام کو مدینہ جانے سے پہلے ہی دنیا سے رخصت کر دو۔ پروگرام بنا کہ رات کو قریش کے ہر قبیلے کا ایک شخص اکٹھا ہو جائے اور یہ پورا مجمع مسلح ہو کر پیغمبر کے مکان کا محاصرہ کر لے اور صبح ہوتے ہی سب کے سب ایک ساتھ ان پر تلواریں برسا کر خاتمہ کر دیں۔ وحی الٰہی نے حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کو ان کے منصوبہ سے مطلع کیا۔ اور ہجرت کا حکم ہوا۔ آپ نے اس خیال سے کہ مشرکین کو شبہ نہ ہو حضرت علی کو اپنے بستر پر لیٹنے کا حکم دیا اور حضرت ابوبکر صدیق کو ساتھ لے کر مدینہ روانہ ہو گئے۔

یہ بڑا نازک موقع تھا حضرت علی کو کفار کے خطرناک منصوبہ سے مطلع فرمایا جا چکا تھا۔ انہیں پوری اطلاع تھی کہ آج رات کاشانہ نبوی قریش کے سورماؤں کے گھیرے میں ہے۔ مسلح محاصرہ ہے مکان کے چاروں طرف تلواریں کھنچی ہیں۔ منصوبہ ہے کہ صبح ہوتے ہی تمام محاصرین حضور کے بستر اطہر پر ایک ساتھ تلواریں برسائیں گے ہاں اسی بستر پر لیٹنے کا حکم ہے۔

حضرت علی اس وقت تئیس سال کے نوجوان ہیں، جینے کے دن ہیں۔ آج بستر نبوی پر لیٹنا اپنی جان کی قربانی ہے، لیکن حضرت علی اپنے محبوب آقا پر قربان ہونے کے لئے خوشی خوشی تیار ہو گئے، یہ وہ کارنامہ ہے جس کی مثال سے مذاہب کی تاریخ خالی ہے۔ اور عالم ملکوت اس جان نثاری پر محو حیرت ہے۔ مفسر کبیر محدث وقت، عارف باللہ صاحب کرامات و مقامات حضرت مولانا عبدالحق مہاجر مکہ، اکلیل (جلد ۴ صفحہ ۱۱۸) میں مفسر ثعلبی کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

• حضرت علی کی اس جاں نثاری کے موقع پر اللہ تعالیٰ نے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل سے فرمایا: میں نے تم دونوں میں مواخات قائم کر دی، ایک

کی عمر دوسرے سے زیادہ ہے تم دونوں میں کوئی ہے؟ کہ اپنی زندگی اپنے بھائی کو نذر کردے، دونوں جلیل القدر فرشتوں نے اپنی اپنی زندگی عزیز سمجھی۔ اس پر اللہ نے فرمایا میں نے علی بن ابی طالب اور اپنے نبی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے درمیان مواخات قائم کی ہے۔ دیکھو آج ان کے بستر پر علی لیٹے ہیں اور میرے نبی پر اپنی جان قربان کر رہے ہیں۔ تم دونوں علی کی طرح اپنے بھائی کے جاں نثار نہیں ہوئے۔ اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور ان کی حفاظت کرو کہ دشمن کچھ نہ کرسکیں۔ حکم پاتے ہی دونوں فرشتے اترے رات بھر حضرت جبریل حضرت علی کے سرہانے تھے۔ اور حضرت میکائیل پائنتی اور حضرت جبریل کی زبان پر مبارکباد تھی کہ اے ابن ابی طالب آفریں، آفریں! اللہ تمھاری ذات پر فخر کرتا ہے۔"

حضرت علی کی مدنی زندگی کے چند احوال وکوائف

قریش کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قدر عداوت تھی پھر بھی وہ آپ کو اس درجہ امین وصادق مانتے تھے کہ مال واسباب عموماً آپ ہی کے پاس امانت رکھتے تھے۔ ہجرت کے موقع پر آپ کے پاس بہت سی امانتیں جمع تھیں مدینہ روانہ ہوتے وقت آپ نے حضرت علی کو بستر اطہر پر لیٹنے کا حکم دے کر فرمایا: فلاں، فلاں کی یہ امانتیں ہیں۔ ان کو دے کر مدینہ آجانا۔ حضرت علی سب امانتیں پہونچا کر تیسرے دن مدینہ روانہ ہوگئے۔ پیدل چلنے کی وجہ سے آپکے قدم مبارک پر ورم آگیا تھا۔ اور جابجا شگاف ہوگیا تھا۔ اسی عالم میں آپ مدینہ کے مشہور گاؤں قبا میں پہونچے، وہاں اس وقت حضور صلے اللہ علیہ وسلم سردار قبا حضرت کلثوم بن الہدم کے مہمان تھے۔ اپنے محبوب اور لے پالے ہوئے بھائی کے سوجے ہوئے اور خون آلود قدم دیکھکر اور اتنے طویل پیدل سفر کی تکالیف ملاحظہ فرماکر حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم پر گریہ طاری ہوگیا اور دیکھنے کے ساتھ ہی جوش محبت میں کھڑے ہوگئے۔ اور گلے لگاکر پیار کیا۔ حضرت کلثوم ابن الہدم نے حضرت علی کو بھی مہمان رکھا۔ حضور اکرم

صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہاں چودہ روز مہمان رہنے کے بعد پندرھویں دن حضرت ابوبکر، حضرت علی اور دیگر مہاجرین کو لے کر مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ قیام مدینہ کے ساتویں مہینہ میں مسجد نبوی کی بنیاد پڑی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین والانصار اللہ کے مزدور بن گئے۔ سب مل جل کر مسجد بنا رہے ہیں، صحابہ پتھر اٹھا اٹھا کر لاتے تھے اور رجز پڑھتے جاتے تھے۔ حضور کی زبان اقدس پر یہ کلمات طیبات تھے:

اللّٰھم لا خیر الا خیر الآخرۃ — اے اللہ کامیابی تو آخرت ہی کی کامیابی ہے

فاغفر الانصار والمھاجرۃ — الٰہی انصار اور مہاجرین کو بخش دے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم پتھر اور گارا لالا کر دیتے جاتے تھے اور یہ رجز پڑھتے تھے:

لا یستوی من یعمر المساجدا — جو شخص مسجد تعمیر کرتا ہے اور اس مشقت کو کھڑے ہو کر

یداب فیہ قاعدا وقائما — اور بیٹھ کر برداشت کرتا ہے اس کے برابر وہ نہیں ہو سکتا

ومن یری عن الغبار حائدا — جو گرد و غبار کی وجہ سے کنارہ کش ہے۔

غزوۂ بدر میں شیر خدا کا کارنامہ

ہجرت رسول کے بعد مشرکین مکہ کے غیظ و غضب کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مصارف جنگ کے انتظام کے لئے ایک کاروان تجارت ملک شام کو روانہ ہوا جس میں تمام قریش نے اپنی پوری دولت لگا دی کہ اس کے منافع سے جنگ کا سامان کیا جائے۔ اسی اثناء میں، مکہ میں چند مفسدوں نے یہ غلط خبر اڑا دی کہ مسلمان کاروان تجارت کو لوٹنے کیلئے آ رہے ہیں۔ سننے کے ساتھ ہی قریش کا غیظ و غضب آپے سے باہر ہو گیا۔ اور ہزار آدمیوں کی فوج اچھی طرح مسلح ہو کر بڑے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیلئے روانہ ہو گئی۔ اسمیں ابوجہل وغیرہ تمام سرداران قریش تھے صرف ابولہب بیماری کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا۔

وحی الٰہی نے آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اطلاع دی، آپ بھی اپنے تین سو تیرہ جاں بازوں کو لے کر مقابلہ کیلئے روانہ ہوئے۔ آگے آگے دو جھنڈے تھے ان میں ایک شیر خدا کے ہاتھ میں تھا۔ بدر کے قریب پہونچ کر حضور نے حضرت علی کو چند صحابہ کے ساتھ غنیم کی نقل و حرکت کا پتہ لگانے کے لئے بھیجا

آپ نے نہایت حسن و خوبی سے اس کام کو انجام دیا۔

سترہویں رمضان المبارک ۲ھ کو میدان بدر میں کفر و اسلام کی پہلی جنگ ہوئی۔ لشکر قریش کا سپہ سالار عتبہ (جو امیر معاویہ کا نانا تھا) اپنے بھائی شیبہ اور اپنے بیٹے ولید کو لے کر سب سے پہلے میدان میں اترا اور مبارز طلبی کی۔ مقابلہ کے لئے تین انصار حضرت عبداللہ بن رواحہ، حضرت عوف اور حضرت معاذ سامنے آئے، عتبہ نے نام پوچھا جب معلوم ہوا کہ یہ انصار ہیں تو کہا۔ کھیتی باڑی کرنے والوں سے لڑنا ہماری شان کے خلاف ہے۔ اور پکار کر کہا "محمد ہمارے جوڑ کے لوگوں کو بھیجو۔" حضور نے انصار بزرگوں کو بلا لیا۔ اور حضرت حمزہ، حضرت علی اور حضرت عبیدہ بن حارث بن عبدالمطلب کو مقابلہ پر بھیجا عتبہ حضرت حمزہ کے مقابل ہوا اور مارا گیا۔ ولید شیر خدا پر حملہ آور ہوا مگر شمشیر حیدری نے واصل جہنم کیا شیبہ نے حضرت عبیدہ پر حملہ کیا۔ اور سخت زخمی کر دیا لیکن شیر خدا نے جھپٹ کر اس کے دو ٹکڑے کر دیئے اور حضرت عبیدہ کو کندھے پر اٹھا کر حضور کی خدمت میں لائے۔ قریش کو اب کہاں تاب غیظ میں آپے سے باہر ہو کر عام حملہ شروع کر دیا۔ مسلمان بھی نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے نرغہ میں گھس گئے۔ اور بڑے گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ شیر خدا نے صفیں کی صفیں الٹ دیں۔ شمشیر حیدری اس شان سے چلتی تھی کہ اعدائے دین کترا کترا کے منتشر ہو جاتے۔ جدھر اللہ کے شیر نے جھپٹ کر وار کیا ادھر مطلع صاف کسی میں دم نہ تھا کہ سامنے آتا۔ آپ اس سرے سے لے کر آخری صف تک چیرتے اور حملہ کرتے نکل جاتے۔ پھر وہاں سے باندازِ حیدری حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں نگرانی کے لئے پہونچ جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت کی خدمت انجام دیکر پھر اعدائے دین پر حملہ کرتے۔ یہ دونوں کام انجام دینا (حفاظت رسول کی نگرانی بھی اور فوج کفار پر حملہ بھی) حضرت علی کا بڑا ہی اہم کارنامہ ہے، جسے ابن سعد اور امام بیہقی نے بھی روایت کیا ہے (خصائص کبریٰ سیوطی ج ۱ ص ۲۰۰) غزوہ بدر میں شیر خدا کے ان عظیم ترین فاتحانہ کارنامہ کی بنا پر ان کو فتوحات اسلامیہ کا فاتح الباب کہنا تاریخ اسلام کی ایک اہم حقیقت ہے۔ اس غزوہ میں آپ کے ساتھ تحفظ الٰہی کا یہ اہتمام تھا کہ حضرت جبریل آپ کے ساتھ تھے جیسا کہ بعض روایات میں ہے ایسا ہی ملکوتی اہتمام حضرت صدیق کے ساتھ بھی تھا۔ چنانچہ حضرت علی مرتضیٰ کا ارشاد ہے۔ غزوۂ بدر میں مجھ سے اور ابوبکر سے

ارشاد ہوا ہے کہ تم دونوں میں سے ایک کے ساتھ جبریل ہیں اور دوسرے کے ساتھ میکائیل (خصائص کبریٰ ج ۱ ص ۲۰۱ بحوالہ احمد۔ بزار و ابو یعلی و حاکم و بیہقی)

اور غزوات میں بھی حضرت علی کے ساتھ اس قسم کا ملکوتی معاملہ ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ آپ کی شہادت کے بعد سیدنا امام حسن علیہ السلام نے جو تاریخی خطبہ دیا ہے اس میں صراحت فرمائی ہے:

"لوگو! کل ان کا ارتحال ہوا ہے جن سے اگلے لوگ آگے نہ بڑھ سکے اور پچھلے لوگ ان کے مقام تک نہ پہنچ سکیں گے۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جب ان کو کسی مہم پر روانہ فرماتے تو انہیں کو جھنڈا دیتے۔ پھر وہ بلا فتح کئے واپس نہ لوٹتے۔ جبریل ان کے داہنے جانب ہوتے اور میکائیل بائیں جانب[1]"

(کنز العمال ج ۶ ص ۴۱۲)

غزوۂ بدر کے حیدری کارنامہ سے حضرت علی کا سکہ بیٹھ گیا۔ اور مشرکین مکہ کے دلوں میں ایسا رعب جم گیا کہ شاعران قریش آپ کے قتل کرنے کی پر جوش تحریک کرنے لگے۔ اور اس سلسلے میں نہایت پرجوش اور حمیت آفریں اشعار کہے ہیں۔ اُسید بن ایاس کے اشعار اسد الغابہ وغیرہ میں درج ہیں جن میں وہ قریش کے بہادروں اور نوجوانوں کو قومی عار دلاتا ہے۔ اور جوش ابھارتا ہے ان میں سے چند اشعار کا مفہوم یہ ہے:-

"فاطمہ بنت اسد کے بیٹے (حضرت علی کی والدہ ماجدہ کا نام فاطمہ بنت اسد ہے)

---

[1] اس خطبہ کا عربی متن یہ ہے: یا ایہا الناس لقد فارقکم امس رجل ماسبقه الاولون ولا یدرکه الآخرون ولقد کان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یبعثه المبعث، فیعطیه الرایة۔ فما یرجع حتی یفتح اللہ علیه، جبریل عن یمینه، ومیکائیل عن شماله۔ اس کے بعد یہ الفاظ بھی ہیں۔ ماترک بیضاء ولا صفراء الا سبع مائة درهم فضلت من عطائه: اراد به ان یشتری به خادماً (کنز العمال ج ۶ ص ۴۱۲ بحوالہ ش، حم، کر، وفیه وادرد ابن جریر عن طریق الحسن عن الحسین)۔

نے تم لوگوں کو حد درجہ ذلت دی ہے حالانکہ وہ ابھی نوخیز ہے اس نے تمہاری قوم کو فنا کر دیا۔ اس نے کس بری طرح تم کو قتل کیا ہے۔ تم لوگ اس کے وار سے بچ بچ کر بھاگتے تھے۔ یہ تم نے کیسی ذلیل حرکت کی ہے۔ تمہارے وہ اساطین قوم جن سے مشکلیں حل ہوتی تھیں اور ان سے وادی بطحا کی زینت تھی۔ ان لوگوں کو اس نے فنا کر دیا۔ اس کی تلوار کی دھار نے کسی کو معاف نہیں کیا۔"

شیرانِ اسلام حضرت علی اور حضرت حمزہ وغیرہ کی عدیم المثال بہادری نے ایک ہزار کفار قریش کو شکست فاش دیدی۔ ستر صنادید قریش قتل ہوئے اور ستر گرفتار ہوئے۔ بے شمار مال غنیمت ہاتھ آیا جس میں سے ایک تلوار ایک زرہ اور ایک اونٹ حضرت شیر خدا کے حصے میں آئے۔

جنت کی شہزادی سے آپ کی شادی

غزوۂ بدر رمضان ۲ھ میں ہوا تھا۔ اسکے چوتھے مہینہ ذی الحجہ میں خاتون جنت حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے آپ کی شادی ہوئی۔ اس وقت حضرت سیدہ کی عمر ۱۸ سال کی تھی۔ شادی کے کئی پیغام آچکے تھے، حضرت ابوبکرؓ اور ان کے بعد حضرت عمرؓ نے بھی عقد نکاح کی درخواست پیش کی تھی، لیکن حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ لوگوں نے حضرت علی کو درخواست پیش کرنے کی تحریک کی جسے حضور نے فوراً منظور فرما لیا۔ اس وقت حضرت علی کی عمر شریف ۲۴ سال کی تھی۔ اقلیم قناعت کے اس تاجدار کے پاس شادی کا کوئی سروسامان نہیں تھا۔ مہر تک کیلئے بھی کچھ نہ تھا۔ اس کے واسطے اپنی زرہ جو بدر کے مال غنیمت میں ملی تھی حضرت عثمان کے پاس ۴۸۰ درم میں بیچی جس کے تقریباً سوا سو روپے ہوتے ہیں۔

نکاح اور مہر

نکاح خود سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پڑھایا، سوا سو روپے مہر مقرر ہوا۔ نکاح کے بعد حضور نے حصول برکت کے لئے میاں بیوی پر پانی چھڑکا اور حضرت فاطمہ کے لئے یہ دعا فرمائی:

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا — یا اللہ میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان

مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيْمِ ۝ مردود سے محفوظ رہنے کے لئے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔
(تفسیر مظہری بحوالہ صحیح ابن حبان)

اور حضرت علی کو بھی یہی دعا دی۔ اس میں اُعِیْذُھَا کے بجائے اُعِیْذُہٗ ہے (یعنی مذکر کی ضمیر ہے)۔

اس موقع پر آپ نے خاتون جنت سے ارشاد فرمایا (جیسا کہ مسند احمد اور معجم کبیر طبرانی میں ہے):

انی زوجتك اول المسلمین اسلاما واعلمهم علما، واعظمهم حلما۔ میں نے تمہاری شادی اس سے کی ہے جو سب سے پہلا مسلمان ہے، سب سے زیادہ علم رکھتا ہے اور علم و تحمل میں سب سے بڑھا ہوا ہے۔
(کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۳)

جہیز شہنشاہ دو عالم نے جنت کی شہزادی کو جو جہیز دیا اس کی کل کائنات یہ تھی بان کی ایک چارپائی، ایک بستر، ایک چھاگل، ایک مشک، مٹی کے دو گھڑے اور دو چکیاں، جب نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پورے عرب سے خزانے آتے تھے۔ اس وقت بھی حضرت سیدۂ عالم کی کل کائنات اتنی ہی تھی کہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ تمام خزانے مہاجرین وانصار کو تقسیم فرما دیتے۔ اور اہل بیت کو ذکر و تسبیح اور قناعت کی دولت عطا فرماتے۔

یہ ہے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت پاک! اور آپ کی لخت جگر فاطمہ زہرا اور علی مرتضیٰ کی زہد و قناعت والی زندگی! حضرت سیدہ کی پوری حیات طیبہ ذکر الٰہی، تسبیح و عبادات صبر و تحمل اور زہد و قناعت کا صحیفۂ ناطق ہے۔ اور حضرت مولا علی کی پوری حیات قدسی بھی اسی شان کی ہے جس میں مردان کامل کی تمام اعلیٰ صفات بھی یکجا ہو گئے ہیں۔

ولیمہ حضرت علی کی زندگی حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ کی نہج پر بڑے زہد و قناعت کی زندگی تھی، درویشوں اور فقیروں کے اس شیخ اعظم کو مال دنیا سے واسطہ نہ تھا۔ لیکن ولیمہ سنت ہے، کسی طرح انتظام کیا۔ جو کی روٹی، سالن، کھجور اور پنیر سے چند صحابہ کی دعوت کی۔ ولیمہ کی سنت ادا ہو گئی۔

حضرت سیدہ کی رخصتی حضرت علی اب تک حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کے پاس رہتے

تھے۔ شادی کے بعد ایک الگ گھر کی ضرورت ہوئی حضرت حارثہ بن نعمان انصاری کے متعدد مکان تھے انہوں نے ایک مکان نذر کیا۔ حضرت علی شادی کے گیارہ ماہ بعد جنت کی شہزادی کو رخصت کرا کے لائے اقلیم قناعت کے اس تاجدار کے پاس جو کچھ سرمایہ تھا وہ ایک بھیڑ کی کھال اور ایک پرانی یمنی چادر تھی جسے حضرت فاطمہ کو نذر کیا۔

غزوۂ احد میں شیر خدا کا کارنامہ

بدر میں قریش کے بڑے بڑے سردار مارے گئے تھے، جن کا گھر گھر ماتم تھا۔ اس کے انتقام کے لئے مکہ کے دو بڑے شاعر عمرو جمحی اور مسافع نے ابوسفیان وغیرہ کی تحریک پر بڑے پُر جوش اشعار لکھے اور تمام قبائل قریش میں گھوم گھوم کر اپنی آتش بیانی سے انتقام کی آگ لگا دی، جس سے مدینہ پر چڑھائی کے لئے ایک بڑی ــــ فوج مسلح ہوگئی۔ اس میں خالد بن ولید، عکرمہ بن ابی جہل، صفوان بن امیہ اور قریش کے تمام سردار تھے۔ صرف حضرت عباس نے شرکت نہیں کی۔ فوج کا سپہ سالار ابوسفیان تھا۔ عورتیں بھی دلوں کو گرمانے کے لئے ساتھ تھیں۔ ابوسفیان کی بیوی ہندہ پیش پیش تھی سب ملکر انتقام کے اشعار دف پر گاتی تھیں۔ اس اہتمام سے یہ فوج مدینہ پر حملہ کے لئے چلی شوال ۳ھ بدھ کے دن کوہ احد کے دامن میں پڑاؤ ڈالا، جو مدینہ سے دو میل کے فاصلہ پر ہے۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ایک روز کا وقفہ دیا۔ اور جمعہ کے روز نماز جمعہ پڑھ کر سات سو صحابہ کے ہمراہ دفاع کے لئے تشریف لائے۔ پہاڑ کو پشت پر رکھ کر صف آرائی کی۔ اس خیال سے کہ ادھر سے حملہ نہیں ہو، پہاڑ پر حضرت عبداللہ بن جبیر کی ماتحتی میں ایک دستہ بٹھا دیا اور تاکید فرمادی کہ فتح ہونے کے بعد بھی اپنی جگہ سے نہ ہٹنا۔

سنیچر کو لڑائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے مشرکین کے علمبردار طلحہ نے صف سے نکل کر مبارز طلبی کی حضرت شیر خدا کرم اللہ وجہہ الکریم اجازت لیکر مقابلہ کے لئے نکلے۔ ایک ہی وار میں طلحہ کی لاش زمین پر تڑپنے لگی۔ اس کے بھائی عثمان نے جھنڈا سنبھالا۔ مقابلہ میں حضرت حمزہ نکلے اور ایک ہی وار میں موت کا لقمہ بنا دیا۔ قریش نے عام حملہ شروع کر دیا۔ حضرت حمزہ حضرت علی اور حضرت ابودجانہ نے اس زور شور سے مقابلہ کیا کہ قریش کے قدم رک گئے۔ حضرت حمزہ دو دستی تلوار چلاتے تھے۔ وحشی

ایک حبشی غلام تھا اس کے آقا جبیر بن مطعم نے کہا اگر حمزہ کو قتل کر دے تو آزاد کر دیا جائے گا۔ ابو سفیان کی بیوی ہندہ نے لالچ دیا کہ اس کے صلہ میں مالا مال کر دوں گی۔ وحشی حضرت حمزہ کی تاک میں تھا۔ زد پر پاکر حبشیوں کا مجھا ہوا ہتھیار جسے حربہ کہتے ہیں (یہ ایک چھوٹا سا نیزہ ہوتا ہے) آپ پر پھینک مارا وہ آکر ناف پر لگا اور پار ہو گیا۔ حضرت حمزہ نے اس پر حملہ کرنا چاہا تھا کہ لڑکھڑا کر گر پڑے اور روح اقدس نے عرش اعظم کی طرف پرواز کی۔ لڑائی نے زور پکڑا۔ حضرت شیر خدا نے قلب فوج میں گھس کر صفیں کی صفیں صاف کر دیں۔ کفار کے علمبردار ابو سعد بن طلحہ کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ علم گرنے نہیں پایا تھا کہ دوسرے سورمانے بڑھ کر اٹھا لیا۔ اسے بھی کسی صحابی نے ٹھکانے لگایا۔ غرض کئی علمبردار مارے گئے۔ آخر میں ایک جانباز عورت عمرہ بنت علقمہ نے بڑھ کر علم اٹھایا' قریش کو بڑی غیرت آئی اور بڑے جوش و خروش سے لڑنے لگے، لیکن شیر خدا اور حضرت ابو دجانہ کے بے پناہ حملوں سے قدم اکھڑ گئے اور بھگدڑ مچ گئی۔

مسلمانوں نے مال غنیمت لوٹنا شروع کر دیا۔ تیر انداز جو پہاڑ پر متعین کئے گئے تھے اپنا محاذ چھوڑ کر نیچے اتر آئے اور لوٹنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن جبیر نے بہت روکا لیکن وہ نہ رکے' ان کی جگہ خالی پاکر خالد بن ولید ایک دستہ لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ادھر مسلمانوں کی پشت تھی انہوں نے پشت پر سے حملہ کر دیا' مسلمان لوٹ میں مصروف تھے کہ پیچھے سے سروں پر تلواریں برسنے لگیں۔ بدحواسی میں افراتفری مچ گئی۔ حضرت مصعب بن عمیر جو مسلمانوں کے علمبردار تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ مشابہ تھے شہید ہو گئے۔ شیر خدا نے بڑھ کر علم سنبھالا۔ حضرت مصعب کی شہادت پر کسی کافر نے چلا کر پکارا کہ نبی شہید ہو گئے۔ اس آواز سے مسلمانوں کے ہوش جاتے رہے، کتنے جانبازوں کے قدم اکھڑ گئے۔ اور ہمت چھوٹ گئی۔ حضرت عمرؓ نے بھی مایوس ہو کر ہتھیار پھینک دیئے تھے۔

حضرت علیؑ بے پناہ تلواریں چلاتے جاتے تھے اور کفار کی صفیں درہم برہم کرتے جاتے تھے اتنے میں کعبؓ بن مالک کی نظر حضور پر نور صلے اللہ علیہ وسلم پر پڑی، پکار اٹھے "مسلمانوں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہاں ہیں" مسلمان ہر طرف سے دوڑ دوڑ کر آتے گئے۔ کفار بھی اسی طرف ٹوٹ پڑے۔

حضرت علی نے اس زور شور سے حملہ کیا کہ آگے بڑھنے والا ہجوم آگے نہ بڑھ سکا۔ کسی بدنصیب نے حضور پر پتھر پھینک مارا، دندان مبارک شہید ہو گئے۔ چہرۂ مبارک زخمی ہو گیا۔ حضرت علی چند صحابہ کے ہمراہ حضور کو لے کر پہاڑ پر چڑھ گئے۔ ڈھال میں پانی لائے، حضرت فاطمہ نے زخم دھویا، لیکن خون نہیں تھمتا تھا۔ حضرت فاطمہ نے چٹائی جلا کر اس کی راکھ زخم پر رکھی۔ اس سے خون بند ہو گیا۔

پہاڑ پر کفار نہ چڑھ سکے کہ مسلمان سنگ باری کر رہے تھے۔ بالآخر ابوسفیان کے حکم سے فوج کفار مکہ واپس گئی۔

مشرک عورتوں نے شہید مسلمانوں کے ناک کان کاٹ لئے اور امیر معاویہ کی ماں ہندہ نے ان کا ہار بنا کر گلے میں پہنا۔ اس کا باپ عتبہ غزوۂ بدر میں حضرت حمزہ کے ہاتھ سے مارا گیا تھا۔ جوش انتقام میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کا پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکالا اور چبایا، لیکن گلے سے نہ اتر سکا اس لئے اگل دیا۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ تاریخوں میں ہندہ کا لقب جو جگر خورہ لکھا جاتا ہے اسی بنا پر لکھا جاتا ہے۔ (سیرۃ النبی ج ۱ ص ۳۸۳)

غزوۂ خندق حضرت علی کا کارنامہ

شوال ۵ھ میں خندق کا معرکہ پیش آیا جس کا سلسلہ شروع ذو قعدہ تک رہا۔ اسے غزوۂ احزاب بھی کہتے ہیں۔ اسی میں قریش یہود اور قبائل عرب نے ایکا کر کے دس ہزار کی فوج سے مدینہ پر دھاوا بول دیا تھا۔ سپہ سالار اعظم ابوسفیان تھا۔ عرب نے اتنی بڑی فوج کا دھاوا کبھی نہیں دیکھا تھا۔ ان کی روانگی کی خبر ملی تو غنیم کو شہر میں گھسنے سے روکنے کیلئے حضرت سلمان فارسی کے مشورہ پر حضور نے سلع پہاڑ کی وادی میں خندق کھودنے کا حکم دیا، جو تقریباً ساڑھے تین میل لمبی تھی اور تین ہزار صحابہ نے بیس دن میں تیار کی تھی اس میں شہنشاہ دو عالم کے دست و بازو نے سب سے زیادہ کام کئے تھے۔ صحابہ خندق کھودتے جاتے اور سلع پہاڑ کی وادی ان کے اس ترانے سے گونج رہی تھی:

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا	بخدا اگر اللہ (رہبر ہادی) نہ ہوتا تو ہم نہ ہدایت
ولا تصدقنا ولا صلینا	پاتے نہ زکوٰۃ دیتے نہ نماز پڑھتے۔

فانزلن سکینۃ علینا	الٰہی ہم پر سکون قلب نازل فرما اور معرکہ میں ہمیں
وثبت الاقدام ان لاقینا	ثابت قدم بنا۔
ان الاُلیٰ قد بغوا علینا	ان لوگوں نے ہم پر بڑی زیادتی کی ہے ہمیں مصائب
اذا ارادو فتنۃ ابینا[۱]	میں مبتلا کر کے دین سے ہٹانا چاہا تو ہم نے ان کی بات ٹھکرا دی۔

ادھر یہ انتظام تھا، ادھر قریش، یہود اور قبائل عرب کی دس ہزار فوج نے مدینہ کی اوپری اور نشیبی زمین سے آکر خندق کو اس طرح سے گھیر لیا کہ کمزور دل والوں کے کلیجے اچھلنے لگے۔[۲] اور اسلامی فوج میں جو منافق تھے حیلہ بہانہ بنا بنا کر اپنے اپنے گھر واپس جانے لگے لیکن صحابۂ کرام جو تربیت نبوی کے سانچے میں ڈھل چکے تھے ان کے ایمان میں اور بالیدگی آگئی۔ قرآن مجید ان کی شان میں فرماتا ہے :

---

۱ یہ ترانہ اتنا اہم ہے کہ بائبل میں اس کی پیشین گوئی موجود ہے۔ یہ اس لئے کہ اس جنگ میں یہود نے بھی شرکت کی تھی جو بائبل پڑھتے تھے۔ اب اس ترانہ کو سنکر انہیں ہوش پکڑنا چاہیے کہ یہی وہی نبی ہیں جن کا اور ان کے اس غزوہ کا بیان حضرت یسعیاہ کے صحیفہ کی ۴۲ ویں آیت میں ہے اس کا عبرانی متن مع ترجمہ درج ذیل ہے :

یِسلَعُ مِرُوش عاریم یَمِوا احُویا سیمو	سلع والے ایک ترانہ گائیں گے، پہاڑ کی چوٹیوں سے بلند
لیمو اوتِہلا تو ایا ایّیم ۔	آواز کریں گے اور خدا کی عظمت قائم کریں گے۔

صحیفہ یسعیاہ کی اس پیشین گوئی کی تشریح راقم السطور نے اپنی ایک تالیف "رسول اعظم نبیوں کے صحیفوں میں" اور اپنی تفسیر جواہر البیان فی تفسیر القرآن میں کی ہے۔ ۱۲ کوثر۔ ۲ے جیسا کہ قرآن مجید سورہ احزاب رکوع ۲ میں ہے اِذْ جَاءُوْكُمْ مِّنْ فَوْقِكُمْ وَمِنْ اَسْفَلَ مِنْكُمْ وَاِذْ زَاغَتِ الْاَبْصَارُ وَبَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ وَتَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ الظُّنُوْنَا ہُنَالِكَ ابْتُلِيَ الْمُؤْمِنُوْنَ وَزُلْزِلُوْا زِلْزَالًا شَدِيْدًا ترجمہ یہ ہے :۔ یہ فوج جب تمہارے اوپر کی طرف سے بھی آئی اور نیچے کی طرف سے بھی اس وقت تمہاری نگاہیں ادھر ادھر پڑنے لگیں اور دل (مارے دہشت کے) گلے تک آگئے۔ اور تم لوگ اللہ کے بارے میں طرح طرح کے گمان (یعنی امید و یاس کے گمان) کرنے لگے۔ اس موقع پر مسلمانوں کا (پورا) امتحان لیا گیا۔ اور انہیں پوری طرح جھنجھوڑ دیا گیا۔ ۱۲ کوثر

وَلَمَّا رَاَ الْمُؤْمِنُوْنَ الْاَحْزَابَ ۙ
قَالُوْا هٰذَا مَا وَعَدَنَا اللّٰهُ
وَرَسُوْلُهٗ وَصَدَقَ اللّٰهُ وَ
رَسُوْلُهٗ وَمَا زَادَهُمْ اِلَّآ اِيْمَانًا
وَّتَسْلِيْمًا ۝ (احزاب ۲۲)

ایمان والوں نے جب (قبائل کی) فوجیں دیکھیں تو
بول اٹھے یہ تو وہی ہے جس کا اللہ اور رسول نے وعدہ
فرمایا تھا۔ اللہ اور رسول نے سچ کہا تھا، اس
واقعہ سے ان کے ایمان اور اطاعت میں اور بھی
ترقی ہوئی۔

کفار کا یہ محاصرہ تقریباً ۲۲ روز تک رہا۔ مسلمان متواتر فاقے کر رہے تھے۔ راتوں کو جاگنا پڑتا تھا۔ دس ہزار کفار تیر اور پتھر برابر پھینکتے تھے۔ مومنوں کے لئے بڑی پریشانی کا زمانہ تھا۔ کسی غزوہ میں اتنی پریشانی نہ تھی۔

ایک روز فوج کفار کے مشہور بہادر عمرو بن ود، ضرار، ہبیرہ، اور نوفل نے ٹھان لی کہ آج خندق کو پار کر کے مسلمانوں پر تلوار چلائیں گے۔ اتفاق سے ایک جگہ خندق کی چوڑان کم تھی۔ گھوڑے اچھال کر اندر آگئے۔ ان میں عمرو بن ود سب سے زیادہ بہادر تھا۔ اور ایک ہزار سواروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ سب سے پہلے یہی آگے بڑھا اور پکارا۔ "میرے مقابلہ میں کون آتا ہے؟" شیر خدا نے فرمایا "میں" حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روکا کہ یہ عمرو بن ود ہے، لیکن کوئی اور نہ اٹھ سکا۔ عمرو نے دوبارہ پکارا۔ پھر حضرت علی ہی تھے کہ اٹھ کھڑے ہوئے، حضور نے پھر روکا۔ تیسری پکار پر پھر آپ ہی اٹھے اور حضور کے اس ارشاد پر یہ عمرو ہے عرض کی: "ہاں رسول اللہ! یہ عمرو ہے، لیکن تین بار پکار چکا۔" اب آپ نے مقابلہ کی اجازت دی، اپنی تلوار عنایت فرمائی اور دست مبارک سے آپ کے سر پر عمامہ باندھا، جو اعزاز خصوصی کا تاج ہے۔ عمرو کا قول تھا کہ اگر کوئی شخص میرے سامنے تین باتیں رکھے گا تو ایک ضرور قبول کروں گا۔ حضرت علی نے اس کی تصدیق کرانے کے بعد فرمایا:

پہلی بات یہ ہے کہ مسلمان ہو جا، اس نے کہا یہ نہیں ہو سکتا۔
آپ نے فرمایا لڑائی سے واپس جا، اس نے کہا، میں عورتوں کا طعنہ نہیں سن سکتا
آپ نے فرمایا۔ پھر مجھ سے مقابلہ کر عمرو ہنسا، اور کہا "مجھے امید نہ تھی کہ آسمان کے

نیچے کوئی بھی مجھے مقابلہ کی دعوت دے سکے گا۔" اور پوچھا "صاحبزادے کس کے لڑکے ہو؟" آپ نے فرمایا ابوطالب کا فرزند ہوں۔" اس نے کہا "ابوطالب سے میرے تعلقات تھے۔ میں ان کے بیٹے سے لڑنا نہیں چاہتا۔" آپ نے فرمایا "اسلام کے محارب سے میں لڑنا چاہتا ہوں۔" عمرو غصے میں آپے سے باہر ہو گیا۔ تلوار اس زور سے چلائی کہ ڈھال کاٹتی ہوئی شیر خدا کی پیشانی پر لگی۔ اب اللہ کے شیر نے جو تلوار ماری تو عمرو خاک اور خون میں تڑپ رہا تھا۔ ساتھ ہی آپ نے اللہ اکبر کا نعرہ مارا۔ شور ہو گیا کہ عمرو مارا گیا۔ وہیں ضرار، جبیرہ اور نوفل بھی تھے۔ تینوں نے حضرت علی پر وار کیا لیکن حملۂ حیدری ہوا تو تینوں بھاگ نکلے۔ نوفل خندق میں گر پڑا۔ شیر خدا نے خندق میں اتر کر موت کا لقمہ بنا دیا۔

تاریخ نے ہمیشہ ثبوت دیا ہے کہ اللہ کی مدد اکثر اس کا انتظار کرتی ہے کہ کوئی جاں نثار پہلے اپنی جاں نثاری تو پیش کرے۔ شیر خدا کی اس عدیم المثال ہمت مردانہ اور بے نظیر جاں نثاری کے بعد اللہ کی غیبی مدد کا دروازہ کھل گیا۔ بحکم الٰہی آندھی کا طوفان بڑے زور شور کا آیا، جس کی زد لشکر کفار پر پڑی، رات کا وقت تھا چراغ بجھ گئے۔ ان کے خیموں کی طنابیں اکھڑ گئیں۔ ان کے دیگچے چولھوں سے الٹ کر گر پڑے، رسد کا بڑا حصہ طوفان کی نذر ہو گیا۔ جاڑے کا موسم تھا۔ خیموں کے اکھڑ جانے کے بعد طوفانی سردی سے بچنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ کفار کی ہمتیں چھوٹ گئیں۔ ان کے سپہ سالار اعظم ابوسفیان نے فوج کے جرنلوں سے کہا، کافی رسد غارت ہو گئی۔ دس ہزار آدمیوں کے کھانے کا انتظام کہاں سے ہو۔ آندھی کا یہ طوفان سردی کا یہ عالم، اب مصلحت یہی ہے کہ ڈیرا اٹھاؤ، یہ کہا اور قریش کی فوج لے کر روانہ ہو گیا۔ اور جرنلوں نے بھی یہی کیا۔ خندق کا میدان ان دشمنان اسلام سے پاک ہو گیا اور ۲۲ روز کے بعد مدینہ کی فضا پر سکون ہوئی۔ یہ اللہ کا کتنا بڑا فضل و کرم ہے کہ دس ہزار کی فوج یوں بے دست و پا ہو کر میدان سے بھاگ گئی۔ اللہ نے فرمایا:

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَاءَتْكُمْ

اے ایمان والو اللہ کے اس فضل و کرم کو یاد کرو کہ جب تم پر فوجیں چڑھ آئیں

جُنُودٌ فَأَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيحًا وَّجُنُودًا لَّمْ تَرَوْهَا (احزاب ۹)

تو ہم نے ان پر آندھی بھیجی اور ایسے لشکر بھی بھیجے جو دکھائی نہیں دیتے تھے۔

یہود قریظہ پر حکم تورات کا نفاذ اور حضرت علی کا اہتمام

بنی قریظہ مدینہ کے یہود اس کے بالائی حصہ میں رہتے تھے جس کا نام عوالی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے شروع ہی میں ان سے معاہدہ کیا تھا کہ وہ کفار کا ساتھ نہ دیں گے اس کے صلہ میں ان کی جان و مال اور مذہب کو آزادی رہیگی۔ لیکن اس غدار قوم نے غزوہ خندق کے موقع پر معاہدہ توڑ دیا۔ اور لڑنے آگئی، جب قریش اور قبائل عرب کی فوجیں خندق کا میدان چھوڑ کر چلی گئیں تو ان کو اپنا انجام سجھائی دیا۔ اور اپنے قلعہ میں آکر پھاٹک بند کرلیا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم ان کے محاصرہ کیلئے روانہ ہوئے جھنڈا حضرت علی کو دیا۔

محاصرہ تقریبًا ایک مہینہ تک جاری رہا۔ عہد جاہلیت میں قریظہ اور حضرت سعد بن معاذ کا قبیلہ باہم حلیف تھے۔ قریظہ نے اس تعلق کی بنا پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ سعد بن معاذ ہمارے بارے میں جو فیصلہ کریں گے ہمیں منظور رہے۔ حضور نے اسے منظور فرمالیا۔ اب اس کا وقت آگیا جس کا حکم تورات میں پہلے ہی سے تھا کہ عوالی کے یہود کو اللہ میدان سے بھگا دے گا۔ اور ان میں سے جو نبی سے لڑیں گے ان پر بنی اسرائیل کی کتاب کے مطابق حدود قائم فرمائے گا۔ سفر تثنیہ باب ۳۳ کی ۱۳ ویں اور ۱۴ ویں آیات ہیں :

بَهْنَحِيلَ عِلْيُونْ گُوئِيمْ بِهَفْرِيدُ وِبَنِي آدَامْ
يُصِّيبْ گُوَلُوتْ عَمِيمْ لَمِسْپَارْ بَنِي اِسْرَائِيلْ

ترجمہ یہ ہے :- (اے یہود تمہارے اکابر تم کو بتائیں گے) خدا اس نبی کے گروہ کو عوالی کا مالک بنائے گا اور جو اس سے لڑیں گے ان کو بھگا دے گا۔ اور ان میں سے جن لوگوں نے اس نبی سے جنگ کی ان پر بنی اسرائیل کی کتاب

کے مطابق حدود جاری فرمائے گا۔

ہوا یہی کہ قریظہ نے حضرت سعد بن معاذ کو فیصلہ کا اختیار دیا۔ اور ان کی زبان سے تورات کا فیصلہ صادر ہوا۔

۱۔ لڑنے والے قتل کیے جائیں۔

۲۔ عورتیں اور بچے قید ہوں۔

۳۔ مال و اسباب کو غنیمت قرار دیا جائے۔

یہ فیصلہ تورات کتاب استثنا اصحاح ۲۰ آیت۔ میں موجود ہے کہ لڑنے والے قلعہ بند ہو جائیں تو ان پر قبضہ پانے کے بعد یہ احکام جاری ہوں گے۔

محصور یہود اس فیصلہ سے واقف تھے چنانچہ یہود کا ایک سردار حیی بن اخطب مقتل میں لایا گیا تو اس نے یہ الفاظ کہے۔

یٰایہا الناس لا باس بامر اللہ	لوگو خدا کے حکم کے نفاذ میں کیا مضائقہ
کتاب و قدر و ملحمۃ کتبہا	یہ تو حکم الٰہی ہے، یہ کتاب (تورات) کی بات
اللہ علیٰ بنی اسرائیل۔	ہے تقدیر کا فیصلہ ہے، اور وہ سزا
(ابن ہشام)	ہے جو اللہ نے بنی اسرائیل پر لکھی ہے۔

قلعہ سے ان کو نکال کر باہر لانا ایک بڑا کام تھا۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو یہ کام حوالہ فرمایا۔ جناب امیر نے قلعہ پر قبضہ کیا۔ اور ان کو قلعہ سے باہر نکالا پھر ان پر تورات کے احکام بالا کا نفاذ ہوا۔

صلح حدیبیہ اور حضرت علی کا جوش ایمانی

سنہ ۶ ھ میں حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو صحابہ کے ہمراہ عمرہ کیلئے مکہ معظمہ روانہ ہوئے مقام حدیبیہ میں اطلاع ملی کہ قریش بڑے زور شور سے مقابلہ کی تیاریاں کر رہے ہیں۔ آپ نے بدیل بن ورقہ سے کہلا بھیجا کہ "ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں، لڑنا مقصود نہیں، جنگ نے قریش کو توڑ دیا ہے۔ لڑائی کا خیال چھوڑ دیں۔ اور مجھ سے صلح کا معاہدہ کر لیں"۔ لیکن شورہ پشتوں نے اس پیام

امن ومحبت کو ٹھکرادیا اور لڑائی کا تہیہ کرلیا۔ پہلے ہی سے متعدد قبائل کی بڑی جمعیت اکٹھا کرلی تھی۔ عروہ بن مسعود ثقفی ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ طائف کے رئیس اعظم تھے۔ قریش بھی باپ کی طرح ان کا ادب واحترام کرتے تھے۔ بڑے سمجھ دار اور دوراندیش تھے۔ قریش کو سمجھایا محمد (صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے گفتگو کرلینے دو۔ ایسا نہ ہو کر لڑائی میں تمہاری طاقت ختم ہو جائے، قریش نے ان کو بھیجا لیکن کوئی بات یہ طے نہیں کرسکے۔ حضور نے حضرت عثمان کے ذریعہ صلح کا وہی پیغام پھر بھیجا جو بدیل بن ورقہ کے ذریعہ بھیجا تھا، لیکن شورہ پشتوں نے ان کو قید کرلیا اور لڑائی کی ٹھان لی۔ مفسدوں نے یہ خبر اڑا دی کہ عثمان کو مار ڈالا گیا۔ دستور کے مطابق قصاص لینا ضروری تھا۔ اور قریش کے جنگی تہیہ کا مقابلہ بھی ناگزیر تھا بالآخر آپ نے ببول کے ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر صحابہ سے جاں نثاری کی بیعت لی۔ پندرہ سو فدویوں نے آپ کے دست مبارک پر جاں نثاری کا معاہدہ کیا۔ اس بیعت کو بیعۃ الرضوان کہتے ہیں۔ قرآن مجید میں اس بیعت کا ذکر ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ	اللہ اہل ایمان سے راضی ہو گیا، جب کہ (اے نبی)
اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ	وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے ان کے
فَعَلِمَ مَا فِيْ قُلُوْبِهِمْ	دلوں میں جو (صدق وخلوص) ہے اللہ کو اس کا علم ہے
فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ	اور ان پر سکون قلب نازل فرمایا اور انہیں عاجلانہ
وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ۙ (فتح ۱۰ ع)	فتح عطا فرمائی۔

اب قریش کو انجام سوجھا اور سہیل بن عمرو کو حضور کے پاس گفت وشنید کے لئے بھیجا۔ ان کی پیش کی ہوئی شرطوں کو حضور نے منظور فرمالیا جو مسلمانوں کے لئے بڑی سخت تھیں لیکن نتیجہ بہت ہی اچھا نکلا۔ شرطیں یہ تھیں (جو سیرۃ النبی — ج ا ص ۵۵ ۴ سے نقل کی جارہی ہیں)۔

۱۔ مسلمان اس سال واپس جائیں۔

۲۔ اگلے سال آئیں اور تین دن قیام کرکے چلے جائیں۔

۳۔ ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ لائیں، وہ بھی نیام میں۔ اور نیام بھی تھیلہ میں۔

۴۔ مکہ میں جو مسلمان پہلے سے ہیں ان میں سے کسی کو ساتھ نہ لے جائیں اور مسلمانوں میں سے کوئی شخص مکہ میں رہ جانا چاہئے تو اس کو نہ روکیں۔

۵۔ کافروں یا مسلمانوں میں سے کوئی شخص اگر مدینہ جائے تو واپس کر دیا جائے، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ میں آجائے تو واپس نہ کیا جائے گا۔

۶۔ قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو انہیں قلمبند کرنے کا حکم دیا۔ جناب امیر نے پہلے بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھی سہیل نے کہا قریش ابتدا میں باسمک اللھم لکھتے ہیں۔ بس یہی لکھا جائے۔ آپ نے منظور فرمایا کہ صلح مقصود تھی اس کے بعد حضرت علی نے یہ لکھا:۔

"ھذا ما قاضیٰ علیہ محمد رسول اللّٰہ" یہ وہ معاہدہ ہے جسے محمد رسول اللہ نے منظور کیا ہے

سہیل کو پھر اعتراض تھا، کہا: "اگر آپ کو رسول اللہ مان لیں تو جھگڑا کون سا؟" صرف اپنا اور اپنے والد کا نام لکھوایئے۔ حضور نے فرمایا۔ گو تم نہیں مانتے مگر میں بخدا اللہ کا رسول ہوں۔ پھر حضرت علی کو حکم دیا کہ اچھا اسے مٹا کر خالی میرا نام لکھ دو۔

یہ بڑا ہی نازک مرحلہ ہے۔ حضرت علی جیسا اول المومنین لفظ رسول اللہ کو مٹا دے، عرض کی میں اس کی جسارت نہیں کر سکتا۔ سبحان اللہ کیا جوش ایمانی ہے۔ جاں نثار رسول خود مٹ جائے گا۔ مگر لفظ رسول اللہ کو مٹا ہی نہیں سکتا۔ یہ جذبۂ ایمانی ایک ایک مسلمان کے دل میں ہے۔ اس معاملہ میں حضرت علی کی یہ سنت ہر مومن کے لئے دستور حیات ہے، آئین محبت ہے اور روح ایمان ہے اور اس راہ میں آپ امت کے مقتدائے اوّل ہیں۔

چوں کہ رحمت عالم صلے اللہ علیہ وسلم کو صلح مقصود تھی اس لئے سہیل کی بات گوارا کر لی اور بہ نفس نفیس اس لفظ جلیل کو مٹا کر خود اپنے دست مبارک سے لفظ "محمد بن عبد اللہ" تحریر فرما دیا۔ یہ حضور کا ایک معجزہ ہے کہ امی ہونے کے باوجود قلم اٹھا کر لکھ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی

نے حسب الحکم صلح کے شرائط تحریر فرمائے اور صلح نامہ مرتب فرمایا۔

فتح خیبر اور شیر خدا کا عظیم الشان کارنامہ

غزوۂ خندق میں جن قبائل واقوام نے مدینہ پر دھاوا کیا تھا اور ۲۲ روز تک محاصرہ کئے رہے، تیر چلاتے اور سنگ باری کرتے رہے، ان میں خیبر کے یہود بھی تھے بلکہ اس حملہ کے بڑے محرک یہی تھے۔ چنانچہ قریش کو اپنی حمایت و مدد کا یقین دلا کر مدینہ پر حملہ کرنے کی پُرزور تحریک انھیں نے کی تھی غزوۂ خندق کے بعد یہ بیٹھ نہیں رہے بلکہ مدینہ پر حملہ کرنے کی پھر تیاری کرنے لگے، اس کے لئے قبیلۂ غطفان کو بھی آمادہ کر لیا تھا۔ غطفان عرب کے نہایت جنگ جُو تھے۔ خود خیبر کے یہود بھی بڑے جنگ آزما اور طاقتور تھے اور عرب کے سب سے زیادہ سرمایہ دار اور سب سے بڑے تاجر یہی تھے۔ خیبر بڑا محفوظ مقام تھا، یہاں چھ[1] مضبوط قلعے تھے، سالم، قموص، نطاط، قصارہ، شق، مربط، جن میں فوجیں رہا کرتی تھیں، یہ بڑا زرخیز علاقہ تھا" کھجوریں بکثرت پیدا ہوتی تھیں، عرب میں یہود کا سب سے بڑا مرکز یہی خیبر تھا۔ ان وجوہ کی بنا پر خیبر کے یہود کو اپنی قوت پر بڑا غرہ تھا۔ اور تل گئے تھے کہ اسلام کو مٹا کر رہیں گے۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جب اطلاع ملی کہ خیبر کے یہود غطفان کو لے کر مدینہ پر حملہ کرنا چاہتے ہیں، تو ان کے اقدام کو روکنے کے لئے سولہ سو صحابہ کرام کو لے کر خیبر روانہ ہوئے[1] یہ مدینہ سے آٹھ منزل پر ہے، انگریز جغرافیہ داں کی تحقیق ہے کہ دو سو میل کے فاصلہ پر ہے۔

چوں کہ اسلامی غزوہ کا مقصد مال غنیمت نہیں ہے بلکہ صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہے اس لئے آپ بار بار اس کی تلقین فرمایا کرتے تھے کہ جہاد وہی ہے جو محض کلمۃ اللہ کی سربلندی کے لئے ہو، جو شخص غنیمت کے لئے اور دنیا کی غرض سے جہاد میں شریک ہوگا اس کا جہاد ہی نہ ہوگا۔ اور اس جہاد میں آپ نے اعلان فرما دیا کہ ہمارے ساتھ وہی لوگ چلیں جن کا مقصد صرف اعلاء کلمۃ اللہ ہو مال غنیمت وغیرہ ہرگز مقصود

---

[1] تمام غزوات نبوی کی طرح غزوۂ خیبر بھی دفاعی جنگ تھی۔ اس کا ایک ثبوت ہے کہ یہ غزوہ محرم میں ہوا اور محرم میں جنگ حرام ہے صرف دفاعی جنگ جائز ہے۔ ۱۲ کوثر۔

نہ ہو اس اعلان سے اس پر پوری روشنی پڑتی ہے کہ اس جہاد کا مقصد مال غنیمت یا کوئی اور دنیوی غرض قطعاً نہیں، بلکہ ان طاقتوں کو راہ راست پر لانا ہے جو اپنی تلوار سے اسلام کو مٹانا چاہتی ہیں۔ اور اسلامی ریاست کے لئے خطرہ بن گئی ہیں۔

محرم ۷ھ میں آپ خیبر کے علاقہ میں وارد ہوئے۔ چھوٹے چھوٹے جھنڈے متعدد صحابہ کو دیئے تھے اور خاص علم نبوی حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ الکریم کو عنایت فرمایا تھا۔

خیبر کے قریب صہبا ایک مقام ہے۔ یہاں آپ نے حضرت علی کو کسی کام سے روانہ فرمایا۔ واپس آئے تو عصر کی نماز ہو چکی تھی۔ اور تھوڑی دیر میں سورج ڈوب گیا۔ حضرت علی نے ابھی نماز نہیں پڑھی تھی۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کے لئے سورج نکل آنے کی دعا فرمائی۔ سورج نکل آیا اور مولیٰ علی نے نماز پڑھی[۱]۔

---

[۱] اس معجزہ کو حدیث کے متعدد ائمہ و اکابر نے نقل و روایت کیا ہے۔ مثلاً :-

۱۔ امام طحاوی نے مشکل الآثار میں
۲۔ امام حاکم نے مستدرک میں
۳۔ امام طبرانی نے معجم کبیر و اوسط میں
۴۔ حافظ ابن مردویہ نے اپنی مرویات میں
۵۔ حافظ عقیلی نے اپنی مرویات میں
۶۔ حافظ ابو البشر دولابی نے الذریۃ الطاہرہ میں
۷۔ قاضی عیاض نے شفا میں۔
۸۔ حافظ خطیب بغدادی نے تلخیص المتشابہ میں۔
۹۔ حافظ مغلطائی نے الزہر الباسم میں۔
۱۰۔ علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں۔
۱۱۔ حافظ ابن سید الناس نے بشری اللبیب میں۔
۱۲۔ امام سیوطی نے کشف اللبس اور الدرر المنتثرہ میں۔
۱۳۔ علامہ محمد بن یوسف دمشقی نے مزیل اللبس میں۔
۱۴۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ازالۃ الخفا میں۔

اس روایت کی جتنی سندیں ہیں سب کو محدث کبیر علامہ ابو الحسن شاذان فضلی نے جمع کر دیا ہے، علامہ ابن جوزی نے اس روایت میں جو خردہ گیری کی ہے علامہ عینی عمدۃ القاری ج ۷، ص ۱۴۶ میں لکھتے ہیں۔ وہ قابل التفات بھی نہیں۔ امام سیوطی اللآلی المصنوعہ میں علامہ ابن جوزی کا جواب دیتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں :

=

خیبر کے قریب اس معجزہ کا ظہور یہود کو ایک اعلام ہے کہ یہ نبی کریم اسرائیل کے جلیل القدر نبی حضرت یوشع سے بھی زیادہ عظیم تر ہیں کہ حضرت یوشع کے لئے سورج کو تھوڑی دیر کیلئے ڈوبنے سے روک دیا گیا تھا۔ اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ عظمت وجلالت ہے کہ آپ کی دعا سے ڈوبا ہوا سورج دوبارہ نکل آیا۔

با ایں ہمہ یہود نے اپنی روش میں کوئی بھی تبدیلی نہیں کی۔ اور آپ سے لڑنے پر آمادہ ہوگئے۔ اب آپ نے صحابۂ کرام کو وعظ ونصیحت فرما کر جہاد کی ترغیب دی۔ سب سے پہلے قلعۂ ناعم پر معرکہ ہوا اور بہت جلد فتح ہوگیا۔ اس کے بعد پانچ اور قلعے بھی بآسانی فتح ہوگئے۔ لیکن چھٹے قلعۂ قموص میں کافی فوجیں تھیں اور یہ شیر یہود مرحب کے ماتحت تھا جو عرب کا نہایت مشہور پہلوان تھا۔ ایک ہزار بہادروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ اس کو فتح کرنے میں بڑی دشواری پیش آئی کئی روز تک یہ مہم سر نہ ہوسکی۔ حضور نے حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو بھی اس مہم پر بھیجا، لیکن کامیابی نہ ہوسکی۔ اب شیر خدا کی ضرورت تھی چنانچہ حضور نے فرمایا۔

لاعطین الرایة غدا رجلا	کل میں اسے جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ سے اللہ فتح
یفتح اللّٰہ علی یدیہ یحب اللّٰہ	عطا فرمائے گا۔ وہ اللہ اور رسول کا محب ہے
ورسولہ، ویحبہ اللّٰہ ورسولہ	اور اللہ ورسول کا محبوب بھی ہے۔

= الحدیث صرح جماعة من الحفاظ بانه صحیح — حدیث کے حافظوں کی ایک جماعت نے تصریح کی ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے

امام کبیر طحاوی نے اس کی دو سندیں لکھ کر فرمایا:

ھذان الحدیثان ثابتان ورواتھما ثقات — یہ دونوں روایتیں ثابت ہیں اور ان کے راوی ثقہ ہیں۔

حافظ ابوالفتح نے بھی اس کو صحیح کہا ہے، بلکہ جیسا کہ امام سیوطی نے لکھا ہے۔ حافظانِ حدیث کی ایک جماعت نے صراحۃً اس کو صحیح فرمایا ہے۔

امام احمد بن صالح جو حدیث میں امام نسائی کے ہم پلہ ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔ یہ روایت عظیم ترین معجزات کی حدیث ہے لہٰذا اس کو یاد کرنے میں اہل علم کو پیچھے نہیں رہنا چاہئے (عمدۃ القاری ج۷ ص۱۴۶) راقم السطور نے رسالہ تعلیمات اپریل ۱۹۵۲ء میں اس معجزہ پر مفصل لکھا ہے۔ ۱۲ کوثر

قال: فبات الناس یدوکون لیلتھم ایھم یعطاھا۔ (صحیح بخاری ۲ ص ۶۰۵)

راوی کا بیان ہے کہ لوگوں نے یہ رات بڑے اضطراب میں گذاری کہ دیکھئے کل کس (خوش نصیب) کو جھنڈا ملتا ہے۔

صبح ہوئی تو صحابۂ کرام خدمت اقدس میں اس امید کو لیکر حاضر ہوئے کہ نعمت بے بہا ہمیں ملے[1]۔ لیکن یہ صدائے اقدس کانوں میں آئی کہ علی کہاں ہیں؟ گذارش کی گئی یا رسول اللہ انکی آنکھوں میں تکلیف ہے، لیکن حضور نے بلوا کر آنکھوں میں لعاب دہن لگادیا۔ اور دعا فرمائی شکایت فوراً دور ہوگئی۔ پھر آپ کو جھنڈا عنایت فرمایا، آپ نے گذارش کی یا رسول اللہ لڑکر انھیں اپنا جیسا (مسلمان) بنالیں؟ ارشاد ہوا بڑے سکون سے جاؤ اور انہیں اسلام کی دعوت دو۔ اور بتاؤ کہ مسلمان ہوجانے کے بعد ان پر فلاں فلاں حقوق الہی واجب ہیں بخدا اگر ایک آدمی بھی تمہاری بدولت راہ اسلام پر آگیا تو یہ دولت تمہارے لئے سرخ اونٹ سے بھی زیادہ بہتر ہے[2]

حضرت علی نے قلعہ کے قریب پہنچ کر اسلام کی دعوت دی لیکن یہود نے دعوت کا جواب تلوار سے دیا چنانچہ مرحب بڑے طنطنہ سے یہ رجز پڑھتا ہوا حملہ کے لئے بڑھا۔

قد علمت خیبر انی مرحب ۔۔۔ شاکی السلاح بطل مجرب

ترجمہ: خیبر جانتا ہے کہ میں مرحب ہوں ۔۔۔ اسلحہ پوش ہوں، بڑا ہی بہادر ہوں، بڑا ہی تجربہ کار ہوں،

فاتح خیبر نے جواب میں یہ رجز پڑھا۔

---

[1] یہ اس لئے کہ جس کو جھنڈا ملے گا اس کے لئے تین بشارتیں ہیں (۱) اللہ ورسول کا محب ہے (۲) نیز اللہ ورسول کا محبوب ہے (۳) خیبر اسکے ہاتھ سے فتح ہوگا (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۹) ہیں حضرت عمر کا بیان درج ہے کہ اس روز مجھے بڑی تمنا تھی کہ آج مجھے جھنڈا عنایت ہوتا۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ اس موقع کے سوا مجھے کبھی سرداری یا افسری کی تمنا نہ تھی۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۸ میں حضرت سعد کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اور صحابۂ کرام بھی اس دولت بے بہا کے آرزو مند تھے۔ ۱۲ کوثر

[2] ماخوذ از صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۶ ۔ کوثر

انا الذی سمتنی امی حیدرہ   کلیث غابات کریہ المنظرہ ٥

ترجمہ : میں وہ ہوں کہ میری ماں نے میرا نام حیدر یعنی شیر رکھا ہے ۔ میں کچھار کے شیر کی طرح مہیب ہوں۔

مرحب کے سر پر مغفر تھا اور مغفر کے اوپر پتھر کا خود لیکن اس کے وار کے بعد شیر خدا کی ایک ہی ضرب سے خود کٹا، مغفر کٹا اور ذوالفقار حیدری سر کو کاٹتی ہوئی دانتوں تک اتر آئی۔ کاٹ کی آواز فوج تک پہنچی۔ مرحب کے مارے جانے کے بعد یہود شیر خدا پر ٹوٹ پڑے لیکن ذوالفقار حیدری بجلی کی طرح چمک کر گرتی تھی جس سے صفیں کی صفیں الٹ گئیں۔ یہود کے اور مایۂ ناز بہادر حارث، اسیر، یاسر عامر وغیرہ بھی مارے گئے۔ شیر خدا نے آگے بڑھ خیبر کے مایۂ ناز قلعہ (قموص) کا پھاٹک اکھیڑ ڈالا، اور حیرت انگیز شجاعت کے ساتھ خیبر کو فتح کر لیا۔ صداقت کی زبان پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد جاری تھا۔

"کل میں اسے جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ سے اللہ فتح عطا فرمائے گا، وہ اللہ ورسول کا محب ہے اور اللہ ورسول کا محبوب بھی ہے۔"

بیشک حضور مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم اللہ ورسول کے محب بھی ہیں۔ اور اللہ ورسول کے محبوب بھی۔ اور اللہ نے خیبر کی فتح آپ کے ہاتھ سے عطا فرمائی، یہ وہ فتح عظیم ہے جس نے جزیرۃ العرب میں ہمیشہ کے لئے یہود کی جنگی قوت کا خاتمہ کر دیا۔

فتح خیبر سے پہلے اسلام نرغہ کی حالت میں تھا لیکن اس فتح کے بعد نرغہ ٹوٹ گیا، اور آگے کے فتوحات کے دروازے کھل گئے۔ چنانچہ فتح مکہ وغیرہ سب اس کے بعد ہی ہوئی اس لئے فاتح خیبر کی ذات سے تمام اسلامی فتوحات کا سلسلہ وابستہ ہے۔

عمرۂ حدیبیہ کی ادائیگی کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد جس میں ایک اہم فضیلت مرتضوی کا بیان ہے

گذر چکا ہے کہ سنہ ۶ ہجری میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چودہ سو مقدس صحابۂ کرام کو لے کر عمرہ کے لئے روانہ

ہوئے، مگر قریش مزاحم ہوئے۔ بالآخر معاہدہ ہوا کہ مسلمان اگلے سال آکر عمرہ کر سکتے ہیں معاہدہ کے رُو سے ۷ھ میں آپ عمرہ ادا کرنے کے لئے تشریف لے گئے۔ حاضرینِ حدیبیہ میں جتنے صحابہ بحیات تھے، حسب الحکم سب ہمرکاب تھے۔

عمرہ ادا کرنے کے بعد جب آپ مدینہ منورہ روانہ ہونے لگے تو حضرت حمزہ کی صاحبزادی امامہ چچا[1] چچا کہتی ہوئی دوڑی آئیں۔ ان کا یہاں کوئی سرپرست نہ تھا۔ صحیح بخاری باب عمرۃ القضا صفحہ ۶۱۱ میں ہے۔

"حضرت علی نے ان کو اُٹھا لیا اور حضرت فاطمہ کے حوالہ کر دیا کہ اس کو اپنے پاس رکھو"[2]

اس پر حضرت علی، حضرت جعفر اور حضرت زید بن حارثہ میں سے ہر بزرگ امامہ کی کفالت کرنے کا استحقاق پیش کرنے لگے اور یہ گفتگو ہوئی۔

حضرت علی :۔ میں نے اس کو پہلے اُٹھایا، اور میرے چچا کی لڑکی بھی ہے۔

حضرت جعفر :۔ میرے بھی چچا کی لڑکی ہے اور اس کی خالہ میری بیوی ہے۔

حضرت زید :۔ حمزہ میرے مواخاتی بھائی تھے۔ اور یہ ان کی لڑکی ہے۔

اس پر آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فیصلہ کیا کہ خالہ ماں کے درجہ پر ہے اور امامہ کو انھیں کے حوالہ کیا۔

پھر حضرت علی سے فرمایا: انت منی وانا منک یعنی تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں۔

حضرت جعفر سے فرمایا : اشبہت خلقی وخلقی یعنی صورت و سیرت میں تم میرے مشابہ ہو۔

حضرت زید بن حارثہ سے فرمایا: انت اخونا و مولانا۔ یعنی تم میرے دینی بھائی اور میرے آزاد کیے ہوئے غلام ہو۔

---

[1] چچا اس لئے کہ حضرت حمزہ آپ کے رضاعی بھائی تھے۔ دونوں حضرات کو ثویبہ نے دودھ پلایا تھا۔ ۱۲ کوثر

[2] صحیح بخاری جو فتح الباری کے حاشیہ پر چھپی ہے اس میں حضرت فاطمہ کے نام کے ساتھ لفظ علیہا السلام بھی ہے۔ عبارت یہ ہے۔ وقال لفاطمۃ علیہا السلام دونکِ ابنۃ عمّکِ حملتہا۔ ۱۲ کوثر

نوٹ :۔ ان تینوں حضرات کے متعلق حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو کلمات ارشاد فرمائے ہیں ان کی بڑی فضیلت کا اعلان ہے اور سب کا مطلب واضح ہے کسی تشریح کی ضرورت نہیں لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے بارے میں جو ارشاد ہوا ہے

انت منی وانا منک — تم مجھ سے ہو اور میں تم سے ہوں

اس میں بڑا بلیغ ایجاز ہے اس کا مطلب یہی نہیں ہے کہ تم میرے قرابت دار ہو، بلکہ اس میں بڑی وسعت ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں :

> اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ "رشتہ داری اور قبول اسلام میں سابقیت میری اور تمہاری باہمی محبت ان کے علاوہ دیگر فضائل میں تم مجھ سے ہو، میں تم سے ہوں" (یعنی ان باتوں میں تم کو مجھ سے ایک خاص رابطہ ہے) اس کلام سے صرف قرابت داری کا رابطہ مراد نہیں بلکہ اس میں تو حضرت جعفر بھی شریک ہیں۔[1]"

---

[1] حافظ ابن حجر کا عربی متن یہ ہے:۔

"قولہٗ لعلی انت منی وانا منک" ـــــ ای فی النسب والصہر والمسابقۃ والمحبۃ وغیر ذالک من المزایا۔ ولم یرد محض القرابت والا فجعفر شریکہ فیہا۔

علامہ عینی نے بھی عمدۃ القاری ج ۸ ص ۲۲۹ میں یہی لکھا ہے انکی عبارت میں وغیر ذالک کے بعد لفظ مزایا نہیں ہے کہ وغیر ذالک سے اس لفظ کی طرف خود اشارہ ہو جاتا ہے۔

ایک نکتہ : یہ حدیث جس میں حضرت علیؓ حضرت جعفر اور حضرت زید کے یہ اعلیٰ صفات مذکور ہیں۔ مسند احمد میں بھی ہے۔ اس میں یہ بھی ہے کہ جب آپ نے حضرت جعفر سے یہ فرمایا "تم صورت و سیرت میں میرے مشابہ ہو" تو حضرت جعفر نے حضرت نبی صلی اللہ علیہ کے گرد ایک خاص قسم کا رقص کیا۔ (فحجل حول النبی صلی اللہ علیہ وسلم)۔

حافظ ابن حجر فتح الباری (۷ ـ ۵۰۷) میں اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ ایک پیر پر کھڑے ہو کر ایک خاص ہیئت کا رقص ہے" ایک روایت میں ہے کہ یہ رقص تینوں حضرات نے کیا ہے۔

اس تشریح کی بنا پر حدیث کا عام فہم ترجمہ یہ ہے کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی سے فرماتے ہیں :-

" تم ہمارے ہو، ہم تمھارے ہیں "

یہ اتحادِ معاملہ کا مقام ہے، یعنی جو معاملہ تمہارے ساتھ کیا جائے گا گویا وہ ہمارے ساتھ کیا گیا۔ جیسا کہ متعدد حدیثوں میں صراحت کے ساتھ فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ من کنت مولاہ فعلی مولاہ[۱]	۱۔ میں جس کا مولا، علی بھی اس کے مولا۔
۲۔ من احب علیا فقد احبنی[۲] ومن ابغض علیا فقد ابغضنی	۲۔ جس نے علی سے محبت رکھی اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے علی سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا
۳۔ من سب علیا فقد سبنی ومن سبنی فقد سب اللہ[۳]	۳۔ جس نے علی کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی اس نے اللہ کو گالی دی۔
۴۔ من احب علیا فقد احبنی ومن احبنی فقد احب اللہ ومن ابغضہ فقد ابغضنی ومن ابغضنی فقد ابغض اللہ[۴]	۴۔ جس نے علی سے محبت کی اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے محبت کی اس نے اللہ سے محبت کی اور جس نے علی سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ اور جس نے مجھ سے بغض رکھا اس نے اللہ سے بغض رکھا۔

= حضور نے جب حضرت جعفر سے فرمایا۔ یہ کیا کر رہے ہو؟ تو انہوں نے عرض کی۔ میں نے حبشہ میں دیکھا ہے کہ بادشاہ نجاشی جب اپنے کسی مصاحب کو خوش کرتا ہے تو وہ کھڑا ہو کر اس کے گرد اسی طرح رقص کرتا ہے۔ (فتح الباری)

اس حدیث کی بنا پر متبحر علما ارباب قلوب کے وجد و رقص پر کچھ بولنے کی جسارت نہیں کرتے۔ ۱۲ کوثر

[۱] مسند احمد، نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مختارہ (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۲) کوثر

[۲] مستدرک (کنز العمال ص ۱۵۲/۶) کوثر [۳] مسند احمد و مستدرک (کنز العمال ص ۱۵۲/۶) کوثر

[۴] معجم کبیر طبرانی (کنز العمال ص ۱۵۸/۶)

۵ - من اطاع علیا فقد اطاعنی ومن عصیٰ علیا فقد عصانی[۱]

۵ - جس نے علی کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے علی کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

۶ - من فارق علیا فقد فارقنی ومن فارقنی فقد فارق اللہ[۲]

۶ - جس نے علی کو چھوڑ دیا اس نے مجھے چھوڑ دیا۔ اور جس نے مجھے چھوڑ دیا اس نے اللہ کو چھوڑ دیا۔

فتح مکہ اور حضرت علی کے ساتھ سے کعبہ کی تطہیر مؤرخہ ۲۰ رمضان ۸ھ

سرزمین مکہ میں جس رسول مقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی ابراہیم السلام نے کعبہ میں دعائیں کی تھیں تاکہ وہ اس قلب زمین کے باشندوں کے دل ودماغ قلب وضمیر اور سیرت وکردار کو پاکیزہ بنادیں اور انہیں کتاب الٰہی کے معارف وبصائر کے حامل اور حکمت ربانی کے دانائے رازبنا کر دنیا میں توحید وانسانیت کا اُجالا پھیلا دیں وہ رسولِ اعظم مکہ معظمہ میں مبعوث ہوئے۔ اور جن کو انسان کامل بنانے کی جدوجہد شروع فرمائی انہیں کی اکثریت نے شدید ترین مزاحمت اور مخالفت کی۔ حتیٰ کہ مکہ معظمہ میں رہنے تک نہیں دیا۔ مدینہ منورہ تشریف لے گئے کہ وہاں فریضۂ نبوت ادا کریں اور انسانوں کو جہالت کی تہ بہ تہ تاریکیوں سے نکال کر علم ہدایت، اور انسانیت کی روشنی میں لائیں تو مکہ معظمہ کے صنادید قوم نے وہاں بھی امن سے نہیں رہنے دیا اور طرح طرح سے مزاحمت کرتے رہے۔ بار بار فوج گراں لے کر مدینہ پر چڑھائی کی تاکہ تلوار کی طاقت سے آپ کو اور آپ کی دعوت حق کو مٹادیں۔

۶ھ بمقام حدیبیہ صلح کا معاہدہ ہوا تھا لیکن قریش نے اسے توڑ دیا۔ بنی خزاعہ کو عین حرم میں رکوع اور سجدہ کی حالت میں قتل کیا۔ اس طرح مسلمانوں کو جنگ کی دعوت دی۔ اب وقت آگیا کہ قریش کے ظلم وستم سے مظلوموں کو نجات دلائی جائے۔ اس کا بھی وقت آگیا کہ مکہ معظمہ سے شرک و جہالت کا خاتمہ کیا جائے۔ اور کعبہ شریف کو پھر خدا خانہ بنادیا جائے۔ بتوں سے یکسر پاک کر دیا جائے

---

[۱] مستدرک (کنزالعمال ص۱۵۶) کوثر

[۲] المعجم الکبیر ۱۳۵۵۹ للطبرانی؛ مناقب علی لابن المغازلی ۲۸۷

کہ اسلام اب اس مقام پر آچکا ہے کہ مکہ معظمہ بآسانی فتح ہو سکتا ہے چنانچہ ۲۰ رمضان المبارک ۸ھ میں آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم دس ہزار صحابہ کرام کے ساتھ مکہ معظمہ میں فاتحانہ تشریف لائے، شہر تھوڑی دیر میں فتح ہو گیا۔ آپ نے سب کو پناہ بخشی، حرم کعبہ میں آپ خطبہ دے رہے ہیں۔ قریش کے تمام سردار اور ذی اثر سامنے موجود ہیں۔ خطبہ کے عمودی مضامین حسب ذیل ہیں:-

۱۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، اس کا کوئی شریک نہیں۔

۲۔ اللہ نے فتح مکہ کا جو وعدہ فرمایا تھا وہ پورا ہوا۔ اسی ذات واحد نے اپنے بندہ کی مدد فرمائی اور تمام مخالف جتھوں کو شکست دیدی۔

۳۔ سُن لو! تمام فخر و غرور، خون کے تمام انتقامات اور تمام خون بہا (جن کا مطالبہ اُٹھا کر سالہا سال خونی جنگ ہوتی تھی) ان سب کو میں نے اپنے پیر کے نیچے ڈال دیا۔

۴۔ قبائل قریش! اللہ نے جاہلیت کا غرور اور نسب کا فخر مٹا دیا۔ سُن لو!

تمام انسان آدم کی اولاد ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔

اللہ کے یہاں اسی انسان کی قدر و منزلت ہے جو اللہ سے بہت ڈرتا ہے اور بڑا محتاط پرہیز گار ہے۔

خطبہ کے بعد آپ نے قریش کے جباروں پر نظر ڈالی۔ سب سامنے موجود تھے یہ وہی ہیں:

- جب آپ قرآن مجید پڑھتے تو یہ گالیوں کی بوچھار کرتے۔
- آپ وعظ فرماتے تو یہ آپ پر پتھر برسا کر لہولہان کر دیتے۔
- اندھیری رات میں آپ کے راستے میں کانٹے بچھاتے۔
- نماز کی حالت میں آپ کی چادر سے آپ کا گلا گھونٹتے۔
- بیکس مسلمانوں کو آگ پر لٹا کر سینے پر بھاری پتھر رکھ دیتے۔
- آپ کو، آپ کے تمام خاندان کو تین سال تک شعب ابی طالب میں اس طرح محصور رکھا

کر ان کے پاس ذرا سا کھانا اور غلہ بھی لے جانے نہیں دیتے تھے گھاس اور پتے کھا کھا کر پورے تین سال تک بسر ہوئے۔

• حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو شہید کرنے کے لیے سب جتن کیے۔

• شب ہجرت میں ہتھیار باندھ کر آپ کے مکان کا محاصرہ کر لیا کہ صبح ہوتے ہی سب ایک ساتھ آپ پر تلواریں برسائیں اور معاذاللہ کام تمام کر دیں۔

• آپ کو اور آپ کے صحابہ کرام کو مکہ میں رہنے ہی نہیں دیا اور سب کو خانۂ خدا کا شہر چھوڑنے پر مجبور کیا۔ حضور کی مظلومیت کتنی دردناک ہے کہ محض اس بنا پر آپ کو تمام مظالم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ آپ ان کو انسان بنانے والی تعلیم دے رہے ہیں۔ آپ بڑے غم واندوہ کے ساتھ بیت اللہ کا جوار چھوڑ کر اپنے وطن سے دور جا رہے ہیں، لیکن یہ ظالم اب بھی اپنے ظلم سے باز نہیں آئے بلکہ بے پناہ داروگیر شروع کر دی اور اعلان عام کر دیا کہ "جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا سر کاٹ کر لائے سو اونٹ انعام آئے گا۔

• پھر آپ ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لے جاتے ہیں تو اب بھی یہ ظالم اپنے مظالم سے باز نہیں آتے بلکہ بڑی بڑی فوجیں لے کر بار بار مدینہ پر چڑھائی کرتے ہیں اس سلسلے میں آپ کے نہایت پیارے چچا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو شہید کر کے ان کے ہاتھ، پیر، ناک اور کان کاٹے اور ان کے سپہ سالار اعظم کی بیوی نے ان کا ہار گلے میں ڈال کر اپنا کلیجہ ٹھنڈا کیا۔ اور اتنے ہی بس نہیں کیا بلکہ ان کا پاک ترین سینہ چاک کر کے ان کا کلیجہ نکالا اور چبا کر دل کا ارمان پورا کیا۔

ان ظالموں کے جرم اتنے ہی نہیں ہیں۔ پورے بیس برس تک روزانہ مظالم ہی کیے ہیں۔

کیا دنیا کا کوئی فاتح ایسے خطرناک دشمنوں پر قابو پا کر چھوڑ سکتا ہے؟

نہیں، ہرگز نہیں! ـــــ تمام عالم یہی کہے گا کہ ایسے مجرم چھوڑے نہیں جا سکتے ہر زبان پکارے گی۔ "ان سفاک ظالموں کو قتل کر دو" ـــــ خود ان ظالموں کے ضمیر کا بھی یہی فیصلہ ہے۔

اچھا اب رحمتِ عالم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا فیصلہ سنو۔

حضورؐ اپنے خون کے ان پیاسوں اور سفاکوں پر نظر ڈال کر فرماتے ہیں۔

"جاؤ تم سب آزاد ہو،

تمہیں ملامت تک نہیں کی جائے گی۔"

تمام دنیا بتائے۔ ہے کوئی ایسا جس نے اپنے خون کے ایسے پیاسوں، اور اپنے ایسے سنگین دشمنوں پر قابو پا کر ایسے لطف و کرم کا سلوک کیا ہو؟

ہے کوئی ایسا کریم؟

ہے کوئی ایسا رحیم؟

ہے کوئی ایسا سراپا رحمت؟

لطف و کرم کی حد یہ ہے کہ ——— "جاؤ تم سب آزاد ہو۔"

یہی نہیں بلکہ ——— "تمہیں ملامت تک نہیں کی جائے گی۔"

یہ ہے عفوِ کامل کہ سزا کیسی، ملامت بھی نہیں کی جائے گی۔ جاؤ آزاد ہو۔

درود و سلام اس ذات اقدس پر کہ جو عفوِ کامل، اور رحمت عالم کا پیکر جمیل ہے۔

جس نے ایسے ایسے سنگین دشمنوں پر ایسا عدیم المثال سلوک کیا۔

سلام اے رحمت عالم، سلام اے فخر انسانی

زباں پر نام آتا ہے تو جھک جاتی ہے پیشانی

اب ان جباروں کی گردنیں جھک گئیں۔

ان میں سے جن کے سینوں میں قبول حق کی کچھ بھی جگہ تھی، وہ صدق دل سے مسلمان ہو گئے، اور جاں نثار بن گئے کہ جہاں حضورؐ کا پسینہ گرے وہاں یہ اپنے خون بہا دیں۔

تیسرا اعلیٰ ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا یہ سلوک جو بتاتا ہے۔

- دشمن کو بھی پیار کرو۔
- دل کو وسیع بناؤ۔

- تنگ دلی چھوڑ دو۔
- یہی ہے دلوں پر فتح پانے کا اصلی طریقہ۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

کعبہ شریف جسے خلیل بت شکن نے خدائے واحد کی عبادت کے لئے بنایا تھا، زمانہ کی بوالعجبی دیکھئے اولاد ابراہیم مشرکوں سے متاثر ہو کر شرک پرست ہو گئی اور خانۂ خدا میں سیکڑوں بت رکھ دیئے سیدنا ابراہیم خلیل علیہ السلام کے جانشین کا سب سے مقدم فرض دنیا کو شرک سے، اور خانۂ خدا کو بتوں سے پاک کرنا تھا۔ فتح مکہ کا سب سے بڑا مقصد یہی اشاعت توحید، اعلاء کلمۃ اللہ، تطہیر کعبہ اور دنیا کو شرک اور اوہام پرستی، بت پرستی اور وہم پرستی کے غار عمیق سے نکالنا تھا۔ اسلام نے مکہ فتح کر لیا تو تمام عرب کے دل میں یہ بات جم گئی کہ یقیناً اسلام اللہ کا دین ہے کہ اللہ ہی کی فوج کعبہ کے حدود میں فاتحانہ داخل ہو سکتی ہے، اصحاب فیل کے حادثہ نے یہ حقیقت دلوں میں بٹھا دی تھی کہ جبار فوج ان حدود میں پہونچے گی تو غیبی طاقت اس کو یک قلم فنا کر دے گی۔ اب دیکھ لو کہ اسلام نے مکہ معظمہ کے چپہ چپہ کو فتح کر لیا، پھر اس کے دین حق ہونے میں کیا شبہ ؟

لہٰذا فتح مکہ کے بعد قبول اسلام کی سب سے بڑی رکاوٹ جو عرب کے لئے سد راہ بنی تھی یکسر دور ہو گئی چنانچہ اس کے بعد پورے عرب میں اسلام پھیل گیا۔ اس فتح عظیم سے اسلام اس مقام پر آ گیا کہ کعبہ کو بتوں سے یکسر پاک بنائے اور اس کو اپنا مرکز بنا کر تمام دنیا میں توحید خالص کا نور پھیلائے اور انسان کو شرک اور توہم پرستی کے اندھیرے سے نکالے۔ انسانیت کی اعلیٰ تعلیم دے کر اولاد آدم کو انسان بنائے اور ان پر مادی اور روحانی ترقیات کے تمام دروازے جو شرک اور توہم پرستی سے بند تھے ایک ایک کر کے کھول دیئے۔

اس وقت حرم کعبہ میں ۳۶۰ بت تھے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک لکڑی کی نوک سے ان کو سرنگوں کرتے جاتے تھے، اس وقت یہ آیت وردِ زبان تھی :

جَاءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ إِنَّ   حق آیا اور باطل مٹ گیا۔ اور باطل

اَلْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا ۝ مٹنے ہی کی چیز تھی۔

اور یہ بھی فرماتے تھے:

وَمَا يُبْدِئُ الْبَاطِلُ وَمَا يُعِيْدُ ۝ اور باطل کا (یہاں) پھر وجود نہ ہوگا، اور (یہاں) پھر نہ آئے گا۔

سب سے بڑا بت ہبل تھا جسے عرب خدائے اعظم مانتے تھے۔ یہ انسان کی شکل وصورت کا تھا، کعبہ کی چھت پر لوہے کی مضبوط سلاخوں سے نصب کیا گیا تھا کہ کوئی وہاں سے ہٹا نہ سکے۔ قریش جنگوں میں اس کی دہائی اور جے پکارتے تھے۔ ابوسفیان نے جنگ احد میں اسی کی جے پکاری تھی۔

اس کو جڑ سے اکھیڑنے کے لئے قدرت حق نے شیر خدا کرم اللہ وجہہ الکریم کا انتخاب فرمایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کے بچپن میں ان کو بارہا اپنے کندھے پر سوار کیا تھا۔ آج بھی اپنے گود کے پالے علی کو دوش مبارک پر سوار فرمایا کہ میرے کندھے پر چڑھ کر ہبل کو کعبہ کی چھت سے اکھیڑ پھینکو، شرک اعظم مٹانے کے لئے یہ تعمیل ارشاد ضروری تھی۔ حضرت علی کو ایسا کرنا پڑا۔ پھر تو ایک طرف عین حرم کعبہ میں راکب دوش نبی بننے کا اعزاز حاصل ہوا اور دوسری طرف کعبہ کو صنم اعظم سے پاک کرنے کی عدیم المثال فضیلت بھی ملی۔ کتنی بڑی یہ فضیلت ہے؟!

غزوۂ حنین میں حضرت علی کا کارنامہ

حنین مکہ اور طائف کے بیچ میں ایک وادی ہے، مکہ فتح ہوگیا تو قبائل عرب کو یقین ہوگیا کہ بلاشبہ یہ سچے نبی ہیں ورنہ مکہ میں فاتحانہ داخل ہی نہیں ہو سکتے تھے۔ لیکن ہوازن اور ثقیف پر اس کا الٹا اثر ہوا کہ ان کو اپنی ریاست کا خاتمہ نظر آتا تھا۔ اس لئے انہوں نے مل کر طے کیا کہ مسلمان جو اس وقت مکہ میں جمع ہیں ان پر دھاوا بول دیا جائے۔ اس لئے یہ لوگ حنین میں جمع ہونے لگے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ صحابہ کو لیکر شوال ۸ھ میں حنین کی طرف روانہ ہوئے۔ فوج میں دس ہزار وہ قدسی نفوس تھے، جن کو لے کر آپ فتح مکہ کے لئے تشریف لائے تھے۔ اور دو ہزار مکہ کے باشندے تھے جن میں طلقا تھے اور کچھ مشرکین بھی تھے۔ طلقا وہ لوگ

ہیں جن کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فتح مکہ کے بعد فرمایا تھا "جاؤ تم لوگ آزاد ہو" ان میں کتنے لوگ صدق دل سے مسلمان نہیں ہوتے تھے، محض جان کی خیر منائی تھی، اس جنگ میں ان کی نیت اچھی نہ تھی، بلکہ عین جنگ میں مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے شریک ہو گئے تھے۔

چنانچہ جب حنین میں معرکہ ہوا اور ہوزان نے تیر برسانا شروع کیا تو طلقا بھاگ نکلے، اس سے اور لوگوں کے بھی قدم اکھڑ گئے اور مسلمانوں کو ہزیمت ہوئی۔ ان کی اس حرکت پر حضرت اُم سلیم رضی اللہ عنہا نے جو اس غزوہ میں شریک تھیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گذارش کی۔

اقتل من بعدنا من الطلقاء انہزموا بك . (صحیح مسلم ص ۱۱۶/۲)	ہم لوگوں کے علاوہ، جو طلقا ہیں، انھیں قتل کر دیجئے انھیں لوگوں نے آپ کو شکست دلوائی ہے۔

یعنی ان کے بھاگنے کی وجہ سے شکست ہوئی تھی، یہ کیوں بھاگے؟ ان کی ایک چال تھی کہ اس طرح مسلمانوں کو شکست ہو جائے گی۔ علامہ آلوسی روح المعانی ج ۱۰ ص ۷۶ میں لکھتے ہیں۔

وکان اول من انہزم الطلقاء مکرا منہم، وکان ذالك سببا لوقوع الخلل وہزیمۃ غیرھم۔	سب سے پہلے طلقا بھاگے، یہ ان کی ایک چال تھی کہ اور لوگوں کے بھی قدم اکھڑ جائیں گے) اور اس کی وجہ سے مسلمانوں میں بے ترتیبی اور پسپائی کی صورت پیدا ہو گئی۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے:

وَيَوْمَ حُنَيْنٍ إِذْ أَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْأَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُدْبِرِينَ ۝ ثُمَّ أَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَىٰ رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَنْزَلَ جُنُودًا لَمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَذَٰلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ۝	اور حنین کے دن جب کہ تم اپنی کثرت پر نازاں تھے، لیکن وہ کام نہ آئی اور زمین اپنی وسعت کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی، پھر تم لوگ پیٹھ پھیر کر بھاگ نکلے، پھر اللہ نے اپنے رسول پر اور اہل ایمان پر سکون قلب نازل فرمایا اور ایسی فوجیں نازل کیں جو تمھیں نظر نہیں آتی تھیں۔ اور کافروں کو عذاب دیا اور یہی ان کی سزا ہے۔

جب مسلمانوں کے قدم اکھڑ گئے تھے اس وقت رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محض انگشتی نفوس تھے ان میں کچھ تو آپ کے اہل خاندان تھے، مثلاً حضرت علی، حضرت عباس، حضرت ابوسفیان[1] بن حارث، حضرت ربیعہ بن حارث، حضرت فضل بن عباس، ان بزرگوں کے علاوہ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت اسامہ بن زید، حضرت ایمن ابن ایمن بھی میدان کارزار میں اپنی جگہ پر قائم تھے۔

ان قدسیوں میں حضرت عباس کا ہاتھ حضور کی رکاب پر تھا، اور حضرت ابوسفیان بن حارث حضور کی سواری کی لگام پکڑے ہوئے تھے۔ اور حضرت علی اپنی عدیم المثال شجاعت سے دشمنوں کو حضور کی طرف بڑھنے سے روک رہے تھے، اور اس فرض کو جس سرفروشی اور جانبازی کے ساتھ ادا کیا وہ آپ ہی کا حصہ تھا۔ حسب معمول اس غزوہ میں بھی آپ کی مجاہدانہ شان سب سے بالا رہی۔ چنانچہ آپ ہی نے کفار کے سپہ سالار کو قتل کیا جس سے ان کے حوصلے بیٹھ گئے اور بالآخر شکست کھائی۔

حالاں کہ یہ وہ خطرناک جنگ تھی جس میں کفار کی تیراندازیوں سے دس ہزار انصار و مہاجرین کو دفعتاً ہزیمت ہو گئی تھی اور ایسے جاں نثاروں کے قدم بھی اکھڑ گئے تھے، لیکن بہر حال وہ انصار و مہاجرین تھے۔ چنانچہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر حضرت عباس نے انھیں آواز دی کہ "اے انصار و مہاجرین!" تو دلوں میں سرفروشی کی روح دوڑ گئی۔ چنانچہ جو قدم میدان کارزار کو چھوڑ کر جا رہے تھے وہ دوڑ کر پروانہ وار حضور کے چاروں طرف آ گئے۔ غزوۂ بدر کی طرح اس معرکہ میں بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مشت خاک اٹھا کر کفار کی طرف پھینکی تھی۔ یہ خاک کے ذرے نہ تھے بلکہ معجزہ کے ایٹمی ذرات تھے۔ اب دفعتاً لڑائی کا نقشہ بدل گیا۔ پوری فوج کفار کی آنکھیں غبار آلود ہو گئیں۔ اب نگاہیں کام نہیں کر رہی تھیں، اس عالم میں شیر خدا اور مجاہدین اسلام کے حملوں کی تاب وہ کیا لاتے، قدم اکھڑ گئے۔ اور بہت سے بھاگ نکلے، جو رہ گئے وہ قید ہوئے۔

---

[1] یہ ابوسفیان امیر معاویہ کے والد نہیں، بلکہ حضور کے چچا حارث بن عبدالمطلب کے صاحبزادے ہیں۔ کوثر۔

غزوۂ طائف میں حضور کی حضرت علی سے طویل سرگوشی، اور حضور کا ارشاد کہ علی سے اللہ کی سرگوشی ہے یعنی باذن الٰہی ہے

کفار نے غزوۂ حنین میں شکست کھاکر طائف میں پناہ لی اور جنگ کی تیاری کرنے لگے۔ طائف بڑا محفوظ مقام تھا چاروں طرف شہر پناہ کی چار دیواری تھی یہاں ثقیف کا قبیلہ آباد تھا جو نہایت بہادر تھا۔ اور ایک محفوظ قلعہ بھی تھا۔ اہل طائف اور حنین کی شکست خوردہ ـــــ فوج کا استحکام کیا۔ سال بھر کی رسد رکھ لی۔ قلعہ کے چاروں طرف منجنیقیں لگادیں۔ اور فوج اسلام سے لڑنے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ اطلاع ملنے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف تشریف لائے۔ لشکر اسلام نے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ قلعہ والوں نے لوہے کی گرم سلاخیں برسائیں۔ بہت سے لوگ زخمی ہوگئے۔ ۲۰ روز تک محاصرہ رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم دیا کہ محاصرہ اُٹھا لیا جائے اور جنگ کے بجائے رحمت عالم نے ـــ ان کے حق میں دعا فرمائی کہ:

اللّٰھم اھد ثقیفًا وأیت بھم — الٰہی ثقیف کو ہدایت فرما کہ میرے پاس (قبول اسلام کے لئے) آجائیں۔

اس دعا کا اعجاز تھا کہ طائف کے رئیس اعظم عروہ بن مسعود ثقفی کے دل میں قبول اسلام کی تحریک پیدا ہوئی۔ چنانچہ ابھی حضور مدینہ پہونچے بھی نہ تھے کہ راستے ہی میں یہ خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور قبول اسلام کی دولت سے مالامال ہوکر طائف واپس گئے۔ گو ثقیف کے سنگ دلوں نے انھیں شہید کردیا، لیکن بالآخر چند روز کے بعد اہل طائف نے ایک وفد خدمت اقدس میں بھیجا جو مسلمان ہوگیا۔ اور طائف واپس جاکر اسلام کی تبلیغ کی۔ اس کا نتیجہ ہوا کہ حجۃ الوداع کے موقع پر ایک بھی ایسا ثقفی نہ تھا جو قبول اسلام کی دولت سے محروم رہا ہو۔

غزوۂ طائف کا محاصرہ اپنی جگہ بڑا ہی اہم تھا۔ ۲۰ روز محاصرہ میں لگ گئے۔ گیارہ، بارہ ہزار فوج کی رسد کا انتظام کس طرح کیا جائے ایک دقت یہ ہے، دوسری دقت یہ ہے کہ اگر

محاصرہ اُٹھالیا جائے تو کفار مسلمانوں کو کمزور سمجھ کر اور دلیر ہو جائیں گے۔ اس سلسلہ میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بڑی دیر تک حضرت علی سے سرگوشی فرمائی جس میں اور بھی اہم معاملات رہے ہوں گے اس پر بعض لوگوں کو رشک ہوا اور بالآخر بول اُٹھے۔

لقد طال نجواہ مع ابن عمہ — آپ نے اپنے چچیرے بھائی سے بڑی طویل سرگوشی کی ہے

اس پر حضور نے فرمایا:

ما انتجیتہ ولکن اللہ انتجاہ — میں نے ان سے سرگوشی نہیں کی بلکہ اللہ نے کی

امام ترمذی اس حدیث کو لکھ کر فرماتے ہیں: "اللہ نے ان سے سرگوشی کی ہے"۔ اس کا مطلب یہ ہوا

ان اللہ امرنی ان انتجی معہ — اللہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں ان سے سرگوشی کروں

(سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴)

اس سلسلہ میں یہ بات خود یاد آجاتی ہے کہ حضرت علی مرتضیٰ کو اللہ تعالیٰ نے امین راز بنایا ہے نیز اپنے نبی کو ان سے رازدارانہ گفتگو کرنے کا حکم دیا ہے۔ اور آپ کی اس فضیلت کو اس قدر نمایاں فرمایا ہے کہ گیارہ بارہ ہزار آدمیوں کی موجودگی میں آپ سے رازدارانہ گفتگو کرنے کے لئے حضور کو مامور فرمایا ہے تاکہ آپ کا یہ اعزاز سب کی نگاہوں کے سامنے آجائے اور پوری امت آپ کی اس خصوصیت سے واقف ہو جائے غالباً اسی خصوصیت کی بنا پر آپ علم سینہ کے شیخ اوّل اور مرشدِ اعظم ہیں۔

تبوک کی روانگی کے موقع پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد جس میں ایک اہم فضیلت مرتضوی کا بیان ہے

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ مدینہ سے باہر تشریف لے جاتے تو کسی کو مدینہ میں جانشین بنا دیتے۔ رجب ۹ھ میں جب آپ تبوک روانہ ہونے لگے تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اپنا جانشین مقرر فرمایا۔ اس سلسلہ میں یہ بھی فرمایا: تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۳ میں ہے

ان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم خرج الیٰ تبوک فاستخلف علیا، فقال: اتخلفنی فی الصبیان والنساء۔ قال: الا ترضیٰ ان تکون منی بمنزلہ ھارون من موسیٰ، الا انہ لا نبی بعدی

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک روانہ ہونے لگے تو علی کو اپنا جانشین بنایا۔ علی نے کہا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑے جا رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا۔ کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو ہارون کو موسیٰ سے تھی۔ لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

یہ حدیث صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۰ میں بھی ہے۔ اور سنن ترمذی و ابن ماجہ میں بھی، اس میں جناب امیر علیہ السلام کی بہت بڑی منقبت ہے اور اس کا بھی بیان ہے کہ آپ کو حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم سے کس قدر اختصاص اور رابطہ ہے۔ بس مقام موسیٰ اور ہارون کا معاملہ ہے۔

حضرت خالد کی ایک غلطی اور حضرت علی کے ذریعہ اسکی تلافی

فتح مکہ کے بعد اکثر قبائل عرب خود مسلمان ہونے لگے۔ اور بعض قبائل میں حضور نے تبلیغی وفد بھیجا۔ بنو جذیمہ کے پاس ۳۵۰ آدمیوں کا ایک وفد حضرت خالد کی سرکردگی میں بھیجا اور ہدایت فرما دی کہ صرف دعوت اسلام مقصود ہے، لڑائی سے کام نہیں، طبقات ابن سعد میں ہے:

بعثہ الی بنی جُذیمہ، داعیا الی الاسلام، ولم یبعثہ مقاتلا

(سیرۃ النبی اول ص ۴۰۶)

رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خالد کو بنی جذیمہ کے پاس دعوت اسلام کے لئے بھیجا، لڑنے کے لئے نہیں۔

باوجود اس کے حضرت خالد نے تلوار سے کام لیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنا تو کھڑے ہوگئے اور قبلہ رخ ہو کر کہا "الٰہی خالد نے جو کچھ کیا ہے، میں اس سے بری ہوں" یہ الفاظ تین دفعہ فرمائے۔ پھر اس غلطی کی تلافی کے لئے حضرت علی کو روانہ فرمایا۔ انہوں نے ایک ایک مقتول کا یہاں تک کہ کتوں کا بھی خون بہا ادا فرمایا اور اس پر مزید رقم دی۔ (ماخوذ سیرۃ النبی ج ۱ ص ۴۰۵)

یمن میں حضرت علی کی تبلیغ اسلام

حضرت خالد اعلیٰ درجہ کے فوجی قائد تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سے تبلیغ وارشاد کی خدمت بھی لینا چاہتے تھے کہ ایسے جفاکش اور سرکش آدمی میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے تو بڑا کام کرے گا۔ اسی لئے بنی جذیمہ کے واقعہ کے بعد انھیں ۸ھ میں پھر تبلیغ کے کام میں لگایا اور یمن میں تبلیغ اسلام کے لئے بھیجا۔ مگر بڑی تاکید کر دی کہ کسی قسم کی سختی نہ کرنا۔

انھوں نے چھ مہینے تک کوشش کی لیکن بے اثر رہی۔ اور کچھ نتیجہ نہ نکلا، علامہ شبلی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں۔ "اب (حضور نے) حضرت علی کو بھیجا، انھوں نے قبائل کے سامنے جب اسلام کی تبلیغ کی تو دفعۃً ملک کا ملک مسلمان تھا" (سیرۃ النبی ج ۲ ص ۲۲)

یہ واقعہ یمن کے ایک ممتاز مقام کا ہے، جہاں ہمدان آباد تھے۔ یہ قبیلہ یمن کا سب سے بڑا اور کثیر التعداد اور بڑا صاحب اثر خاندان تھا۔ پورا قبیلہ حضرت علی کے فیض تبلیغ سے مسلمان ہو گیا۔ حضرت علی نے جب بارگاہ رسالت میں اس کی اطلاع بھیجی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سجدہ کیا اور سر اُٹھا کر دو مرتبہ فرمایا:

"السّلام علیٰ ھمدان" یعنی ہمدان سلامت رہیں۔

اہل یمن حضرت علی سے بہت مانوس ہو گئے تھے اور یمن میں بڑا اثر تھا، جس کی بنا پر حضرت ابن عباس نے حضرت امام حسین کو (جب کہ آپ کوفہ جا رہے تھے) یہ مشورہ دیا تھا۔ آپ یمن تشریف لے جایئے۔ وہاں آپ کے والد بزرگوار کے بڑے ماننے والے لوگ ہیں۔

اور آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اہل یمن سے بہت خوش تھے اور ان کے ایمان کو بڑا وزنی قرار دیا ہے۔ صحیحین کی حدیث ہے۔

الایمان یمان والحکمۃ یمانیۃ — ایمان تو یمن کا ہے اور حکمت یمن کی حکمت ہے —

(مشکوٰۃ ص ۵۸۲)

حضور نے حضرت علی کو یمن کا قاضی بنا دیا تھا اس کی بنا پر وہ یمن میں کچھ زمانہ تک قیام پذیر

رہے۔ اور تبلیغ اسلام کرتے رہے، جس کی بدولت پورے یمن میں اسلام پھیل گیا۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ۱۰ھ میں جب حج کرنے کے لئے روانہ ہوئے تو حضرت علی یمن ہی میں تھے اور وہیں سے حج کے لئے تشریف لائے۔

حج ۹ھ میں حضرت علی کا اعلان برات

مکہ معظمہ ۸ھ میں فتح ہوا۔ اس سال حضرت عتاب بن اُسید کی ماتحتی میں مسلمانوں نے فریضۂ حج ادا کیا۔ حضرت عتاب اس وقت مکہ معظمہ کے اسلامی حکمران تھے۔ ۹ھ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ سے تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ حج کے لئے روانہ فرمایا۔ خود تشریف نہیں لے گئے کہ حضرت ابوبکر کو قافلہ کا سالار بنا کر ہدایت فرمادی کہ حج کا اہتمام کریں۔ مشرکین کو بتائیں کہ اس سال کے بعد وہ مشرک رہتے ہوئے حج نہیں کرسکتے۔ اور سورۂ برات کا اعلان عام کریں۔

مسند احمد میں ہے کہ ان کی روانگی کے بعد رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لا یبلغھا الا انا او رجل من اھل بیتی	سورۂ براءۃ کا اعلان و تبلیغ یا تو میں کروں گا یا میرے اہلبیت کا کوئی فرد۔

اور حضرت علی کو یہ منصب تبلیغ حوالہ فرما کر روانہ فرمایا۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۳۳)

امام احمد کے صاحبزادے عبداللہ کی روایت میں یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حضرت علی نے گذارش کی "یارسول اللہ میں بلند آہنگ خطیب نہیں، اور اعلان و تبلیغ میں اس کی ضرورت ہے"۔ حضور نے فرمایا "ان آیتوں کا اعلان و تبلیغ کے لئے ضروری ہے کہ یا تو میں جاؤں یا تم جاؤ" حضرت علی نے عرض کی "جب ایسا ہے تو یارسول اللہ (آپ زحمت نہ فرمائیں) میں جاؤں گا" حضور نے ان کو دعا دی اور فرمایا

انطلق، فان اللہ یثبت لسانک ویھدی قلبک۔	جاؤ، اللہ تمھاری زبان کو ثبات بخشے اور تمھارے دل کو ہدایت پر قائم رکھے۔

اس کے بعد حضور نے حضرت علی کے دہن مبارک پر اپنا دست کرم بھی رکھ دیا۔

(تفسیر ابن کثیر ج ۲ ص ۳۳۳)

اب حضرت علی روانہ ہوئے، راستہ میں حضرت ابوبکر سے ملاقات ہوئی۔ انھیں بتایا کہ اب سورۂ براءت کی آیتوں کی تبلیغ و اعلان کا منصب مجھے عطا ہوا ہے۔ حضرت ابوبکر بدستور قافلہ سالار رہے اور فریضۂ حج اسلامی طریقہ پر ادا کرنے کا اہتمام فرمایا۔ اور حضرت علی نے سورۂ براءت کی تیس یا چالیس آیتیں حج کے تمام اجتماعی مقامات میں نیز ایام حج کے تمام بازاروں میں بلند آواز سے پڑھ پڑھ کر سنائیں۔ آپ کی نیابت میں حضرت ابوہریرہ وغیرہ بھی اس خدمت کو انجام دیتے تھے۔ اعلان اس کثرت سے کیا گیا کہ لوگوں کے گلے پڑ گئے۔ اعلان میں یہ امور بہت اہم تھے۔

(۱) جنت میں مومن ہی جائے گا۔

(۲) کوئی شخص برہنہ ہوکر طواف نہیں کرسکتا۔

(۳) اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہیں کرسکتا۔ اور مسجد حرام کے پاس آ بھی نہیں سکتا۔

(۴) جن قبائل سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا معاہدہ کسی میعاد تک کے لئے ہوا ہے وہ اسی میعاد تک قائم رہے گا۔

(۵) لیکن جس معاہدہ کی میعاد مقرر نہیں ہوئی ہے، اعلان کیا جاتا ہے کہ اس کی میعاد آج سے چار مہینے تک ہے۔ (یعنی ذی الحجہ ۹ھ سے ربیع الاول ۱۰ھ تک)

(۶) اس اعلان کے ساتھ سورۂ براءت کی آیتوں کو بھی پڑھ کر سنایا جاتا تھا۔

عرب کعبہ شریف کا برہنہ طواف کرتے تھے۔ صرف قریش مستثنیٰ تھے، اور وہ لوگ جن کو قریش اپنا لباس دیدیں۔ اس طرح طواف کرنے سے کعبہ شریف اور حرم الٰہی کی کتنی توہین ہوتی تھی۔ اس بدترین رسم کو مٹانے والے اعلان کے منادی سیدنا علی مرتضیٰ ہیں کہ مشیت حق نے اس کے لئے آپ ہی کا انتخاب فرمایا اور کعبہ کی تقدیس آپ ہی کی ذات پاک سے ظہور میں آئی۔

اس اعلان کے بھی منادی آپ ہی ہیں کہ کوئی مشرک کعبہ کا طواف نہیں کرسکتا۔ اور کوئی

مشرک مسجد حرام کے پاس آ بھی نہیں سکتا۔ کعبہ کی یہ تقدیس بھی آپ ہی کی ذات پاک سے ظہور میں آئی۔

حقیقت یہ ہے کہ تقدیس کعبہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دست و بازو ہونے کا جو شرف آپ کو حاصل ہے وہ کسی کو نہیں۔ چنانچہ

(۱) ہبل کو جو عرب کا خدائے اعظم تھا۔ آپ ہی نے کعبہ کی چھت سے اکھیڑ کر پھینکا، اور اس طرح خانۂ خدا کو صنم اکبر کی آلودگی سے پاک کیا۔

(۲) برہنہ طواف سے کعبہ کی بے حرمتی ایک زمانہ سے ہو رہی تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت میں حضرت علی ہی کے اعلان نے ہمیشہ کے لئے اس کا خاتمہ کر دیا اور بیت اللہ کی تقدیس ہمیشہ کے لئے قائم کر دی۔

(۳)۔ مشرکین عرب اپنے گوناگوں شرک سے خانۂ خدا کی حد درجہ بے حرمتی کر رہے تھے اور اس مرکز توحید کو مشرکین کے اجتماع کا سنٹر بنا دیا تھا۔ رسول خدا کی نیابت میں حضرت شیر خدا کے اعلان نے خانۂ خدا اور مسجد حرام میں مشرکوں کا آنا ہمیشہ کے لئے بند کر دیا۔ اور ان کے مشرکانہ رسم و رواج سے ہمیشہ کے لئے اللہ کا گھر اور اس کے حرم محترم کو پاک کر دیا۔

کتنے اہم اور مرکزی فضائل کے جامع ہیں مولا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے یہ عدیم المثال اوصاف!

ذَالِكَ فَضْلُ اللهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاءُ ۚ وَاللهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝ — یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہے عطا فرمائے اور اللہ بہت ہی فضل و کرم عطا فرمانے والا ہے۔

حجۃ الوداع اور حضرت علی کا حج

سنہ ۱۰ھ ۲۶ ذی قعدہ سنیچر کے دن نماز ظہر پڑھ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مدینہ سے حج کے لئے نکلے ذوالحلیفہ سے جو مدینہ سے ۶ میل کے فاصلہ پر ہے، حج کا احرام باندھا اور تلبیہ پڑھا۔ حج کے لئے آپ کے تشریف لے جانے کا عام اعلان ہو چکا تھا۔ مدینہ ہی سے بکثرت آدمی حج کے لئے ہمراہ چلے تھے۔ اور ذوالحلیفہ میں تو آگے پیچھے، دائیں بائیں جہاں تک نظر کام کرتی تھی آدمی ہی آدمی نظر آتے تھے اور آپ کے لبیک کی آواز پر ہر طرف سے لبیک کا اس طرح غلغلہ ہوتا تھا کہ تمام دشت و جبل اور فضائے

آسمانی گونج رہی تھی۔ راستہ میں آدمی برابر بڑھتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ عرفات میں ایک لاکھ حجاج ہو گئے تھے۔

۴ ذی الحجہ اتوار کے دن صبح کے وقت مکہ معظمہ میں داخل ہوئے۔ ۹ دنوں میں یہ سفر طے ہوا۔ سب سے پہلے طواف کعبہ کیا۔ پھر عمرہ کے دوسرے رکن سعی صفا و مروہ ادا کیا لیکن عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہیں کھولا بلکہ حج کے تمام مناسک ادا کرنے کے بعد کھولا۔ اس طرح حج کرنے کو حج قران کہتے ہیں۔ اس میں عمرہ اور حج دونوں کو ایک ہی احرام سے ادا کرنے کی نیت کی جاتی ہے۔ پہلے عمرہ کیا جاتا ہے پھر حج کے مناسک ادا کئے جاتے ہیں۔ انھیں پورا کرنے کے بعد احرام کھولا جاتا ہے۔

حضرت علی جو یمن میں قاضی کے منصب پر تھے۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روانگی حج کی خبر سن کر یمن سے حاجیوں کا قافلہ لے کر مکہ معظمہ تشریف لائے۔ ساتھ میں حضور کے لئے قربانی کے اونٹ بھی لیتے آئے۔ حضور نے ان سے فرمایا۔

کن الفاظ کو بول کر احرام باندھا تھا۔؟

حضرت علی نے عرض کی۔ میں نے یہ کہا تھا۔ یا اللہ جو احرام نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے باندھا ہے وہی میں بھی باندھتا ہوں۔

یہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا احرام قران والا تھا جو بندھ گیا تو بیت اللہ کے طواف اور سعی صفا و مروہ کرنے کے بعد کھولا نہیں دیا جاتا بلکہ حج کے تمام مناسک ادا کرنے کے بعد کھولا جاتا ہے۔ اس لئے آپ نے حضرت علی سے فرمایا:

"ابھی احرام نہ کھولنا"

۱۰ ذی الحجہ کو آپ نے سو اونٹوں کی قربانی کی۔ ان میں سے ۶۳ کی قربانی خود اپنے دست مبارک سے کی۔ باقی ۳۷ اونٹوں کی قربانی حضرت علی سے کرائی۔ صحیح مسلم ج ۱۔ ص ۳۹۹ میں ہے:

فنحر ثلاثا وستین بیدہ ثم اعطی علیا فنحر ماغبر، واشرکہ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ۶۳ اونٹوں کو اپنے ہاتھ سے نحر فرمایا پھر حضرت علی کے حوالہ کیا

فی ھدیہ۔ ثم امر من بدنۃ ببضعۃ فجعلت فی قدر۔ فطبخت فاکلا من لحمھا وشربا من مرقھا

اور انہوں نے سو میں سے باقی اونٹوں کو نحر کیا آنحضرت نے حضرت علی کو قربانی میں شریک کر لیا پھر آپ نے حکم دیا کہ ہر قربانی کا ایک ٹکڑا لے کر پکاؤ۔ تیار ہو گیا تو آپ نے اور حضرت علی نے گوشت تناول فرمائے اور سالن نوش فرمایا۔

نوٹ: عرفات میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جو خطبہ دیا ہے اس میں اہم ترین امور کی ہدایت فرمائی ہے جس کی بنا پر یہ خطبہ تمام خطبات میں سب سے زیادہ اہم ہے۔

یوں تو اسلام کے علاوہ دنیا میں اور بھی انبیائی مذاہب ہیں لیکن اللہ کی طرف سے ان کو جو ہدایتیں ملی تھیں، ان کے بڑے حصّہ کا آج کہیں پتہ نہیں اس کے اسباب دو ہیں۔

۱۔ امتوں نے اپنے صحیفۂ ربانی پر عمل چھوڑ دیا، بلکہ اس میں ترمیم واضافہ بھی کر ڈالا۔
۲۔ ان امتوں میں ہر زمانہ میں ایسے افراد نہ تھے جو کردار وگفتار میں اپنے مذہب کی صحیح تصویر ہوں، اور ہدایت کے چراغ ونور ہوں۔

جب مذہب کا صحیفۂ ربانی نظر انداز کر دیا جائے گا۔ اور ایسے رہنما بھی نہ رہیں گے جو اپنے کردار وگفتار سے مذہب کو قائم اور زندہ رکھ سکیں۔ اور امت ان کے نقش قدم پر چل کر راہ ہدایت پر گامزن رہ سکے تو ظاہر ہے کہ مذہب اپنی اصلی شکل پر کیسے رہ سکتا ہے۔

چونکہ اسلام ابدی مذہب ہے اور محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کسی نبی کی بعثت نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اسلام کے تحفظ کیلئے ضروری تھا کہ:

۱۔ قرآن مجید کا ایک ایک حرف محفوظ رہے، اور مسلمان اس سے وابستہ رہیں۔
۲۔ ہر زمانہ میں ایسے برگزیدہ نفوس بھی رہیں جن کی سیرت اسلام کی اصلی تصویر ہے اور ان کے نقش قدم پر چلنے والا راہ ہدایت ہی پر گامزن رہے گا۔ حضور نے صراحت فرمادی کہ یہ میری عترت مطہرہ ہے اور ان سے وابستہ رہو تا کہ گمراہی نہ آسکے۔

حجۃ الوداع میں چونکہ ہر طرف کے مسلمان عرفات میں اکٹھا موجود تھے، لہٰذا مسلمانوں کی ابدی ہدایت کے یہ دونوں اصول آپ نے تعلیم فرمائے کہ سب کو واقفیت رہے اور اس طرح اسلام کو ہر تحریف و اختراع سے ہمیشہ کے لئے محفوظ کر دیا۔ اور مسلمانوں کو بتا دیا کہ جب تک قرآن اور میری عترت سے وابستہ رہو گے، گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔ سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۹) میں ہے کہ حضرت جابر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رأیت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فی حجتہ یوم عرفۃ، وھو علی ناقتہ قصواء یخطب فسمعتہ یقول: یاایھا الناس انی ترکت فیکم ما ان اخذ تم بہ لن تضلوا کتاب اللّٰہ وعترتی اھل بیتی۔	میں نے حجۃ الوداع میں عرفہ کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قصواء اونٹنی پر خطبہ دیتے ہوئے دیکھا ہے اور میں نے آپ کی زبان سے سنا ہے کہ آپ یہ فرما رہے تھے: لوگو میں تمہارے پاس وہ چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر انھیں تھامے رہو گے تو گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔ یہ چیزیں یہ ہیں کتاب الٰہی اور میری عترت جو میرے (مخصوص) اہلبیت ہیں۔

عترت میں حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین ہیں اور حضرت علی بھی ہیں، ایک حدیث میں اس کا اشارہ موجود ہے جو ابھی آتی ہے۔

غدیر خم میں حضور کا ایک خطبہ جس میں عترت مطہرہ اور حضرت علی کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے

حجۃ الوداع میں ۱۴ ذی الحجہ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مع شر کا رحج خانہ کعبہ کا رخصتی طواف کیا، جس کو طواف الوداع کہتے ہیں۔ اس کے بعد مہاجرین و انصار کے ساتھ مدینہ منورہ روانہ ہوئے راہ میں ایک مقام خم آیا۔ یہاں ایک تالاب ہے۔ عربی میں تالاب کو غدیر کہتے ہیں اس لئے اس مقام کو "غدیر خم" بھی کہتے ہیں۔ یہاں آپ نے تمام ہمراہی صحابہ کو جمع فرما کر ایک خطبہ دیا، جس میں یہ کلمات ہیں۔

امابعد۔ الا ایها الناس فانما انا بشر یوشک ان یاتی رسول ربی فاجیب وانا تارک فیکم ثقلین : اولهما کتاب الله فیه الهدیٰ والنور۔ فخذوا کتاب الله و استمسکوا به فحث علی کتاب الله ورغب فیه، ثم قال :	حمد و ثنا کے بعد، لوگو! میں ایک بشر ہوں، جلد ہی میرے پاس میرے رب کا فرشتہ (رحلت کا پیام لے کر) آئے گا اور میں اسے قبول کروں گا میں تمہارے درمیان دو بڑی وزنی چیزیں چھوڑتا ہوں، ان میں ایک تو کتاب الٰہی ہے جس میں نور اور ہدایت ہے۔ اللہ کی کتاب کو پکڑو اور مضبوطی سے پکڑے رہو یہاں آپ نے کتاب الٰہی کے بارے میں ترغیب دی اور شوق دلایا پھر فرمایا۔
واهل بیتی	اور ثقلین میں دوسری چیز میرے اہل بیت ہیں.
اذکرکم الله فی اهل بیتی	میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمھیں خدا کو یاد دلاتا ہوں[1]
اذکرکم الله فی اهل بیتی	میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں
اذکرکم الله فی اهل بیتی	میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تمہیں خدا کو یاد دلاتا ہوں۔

یہ صحیح مسلم (باب مناقب علی ج ۲ ص ۲۷۹) کی روایت ہے۔ مسند احمد، سنن نسائی، سنن ترمذی، مستدرک حاکم اور معجم کبیر طبرانی میں کچھ اور کلمات بھی ہیں جن میں حضرت علی کی منقبت بیان فرمائی گئی ہے۔ اس میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ ، — جس کا میں مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں[2]

---

[1] علامہ طیبی نے بتایا ہے کہ اس جملہ کا مفہوم ہے : میں تمہیں متنبہ کرتا ہوں کہ میرے اہل بیت کے بارے میں اللہ سے ڈرو، کتاب کے شروع میں لفظی ترجمہ کے بجائے اس مفہوم کو ترجمہ میں درج کیا گیا ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] عربی میں مولا کے معنی آقا کے بھی ہیں۔ اور محبوب کے بھی۔ ان کے علاوہ اور معانی بھی ہیں، یہاں یہ لفظ محبوب کے معنی میں ہے۔ اکثر علمائے اہل سنت کا یہی قول ہے۔ ۱۲ کوثر۔

اَللّٰھمّ وال من والاہ وعاد من عاداہ۔ — الٰہی جو علی سے محبت رکھے اس سے تو بھی محبت رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو بھی عداوت رکھ۔

یہ ارشاد مقدس کہ "ثقلین قرآن مجید ہے اور میری عترت جو میرے اہل بیت (مخصوص) ہیں"۔ اور اس کے بعد یہ ارشاد کہ "جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں"۔ (آخر تک پڑھ جاؤ)۔

اس میں اشارہ ملتا ہے کہ حضرت علی بھی عترت مطہرہ میں داخل ہیں اور اہل بیت میں تو صراحتہً آپ داخل ہیں۔ اسی نکتہ کے لئے حدیث میں "عترتی" کے بعد لفظ "اہل بیتی بھی ہے"۔

لہ عترت رسول، اولاد رسول ہیں۔ اس میں حضرت علی بھی عموم مجاز کے طور پر آجاتے ہیں کیونکہ داماد کو عرف عام میں فرزند کہتے ہیں۔ قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی تفسیر مظہری جلد ۲ ص ۶۱ میں اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَکُمْ کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ جاز ان یکون علیٌّ مرادًا بالابناء کالحسن والحسین بعموم المجاز، فان الختن یطلق علیہ الابن عرفًا۔

حدیث ثقلین جسے ترمذی نے روایت کیا ہے اسمیں مذکور ہے کہ ثقلین یہ ہیں: کتاب اللّٰہ وعترتی اھل بیتی"۔ یہاں اہل بیتی سے مراد عام اہل بیت نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ وہ عترت رسول نہیں۔

لفظ اہل بیت کی تحقیق کے سلسلہ میں یہ حقیقت ملحوظ رکھنا چاہئے کہ لفظ اہل بیت تین معانی میں آیا ہے۔

(۱) عام اہل خاندان، اس میں تمام اولاد عبد المطلب آسکتے ہیں۔

(۲) خاندان کے خاص الخاص افراد۔ اس میں صرف حضرت فاطمہ، حسنین کریمین اور حضرت علی ہیں۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آیۂ تطہیر کے نزول کے سلسلے میں ان کو خصوصی طور پر اہل بیت فرمایا ہے۔ اور نو مہینے تک یعنی تقریبًا ۲۷۰ روز تک حضرت فاطمہ کے دروازہ پر ان کو اہل بیت فرما کر سلام کیا ہے اس طرح حاضرین مسجد نے اتنے دنوں تک سنا کہ حضور ان کو خصوصیت کے ساتھ روزانہ اہل بیت فرماتے ہیں۔ اس سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ خاص الخاص اہلبیت یہ ہیں۔ اور آیۂ تطہیر میں انہیں کو اہل بیت فرمایا گیا ہے۔

(۳) اہل بیت بیوی کو بھی کہتے ہیں۔ اس میں حضور کی تمام ازواج مطہرات ہیں۔

غدیر خم کی اس حدیث میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ارشاد مقدس ہے کہ جس کا میں مولا ہوں، علی بھی اس کے مولا ہیں۔ علمائے اہلسنّت کے نزدیک یہاں مولا محبوب کے معنی میں ہے اس نقطۂ نظر سے حدیث کا مفہوم یہ ہے۔

میں جس کو محبوب ہوں علی بھی اس کو محبوب ہیں۔

اس کے مضمرات میں یہ حقیقت بھی ہے کہ

جس کو علی محبوب نہیں اس کو مجھ سے بھی محبت نہیں۔ یعنی وہ مومن نہیں اس کی تائید اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جس میں حضور نے حضرت علی سے فرمایا ہے:

لا یحبك الا مومن ولا یبغضك الا منافق (کنز العمال ص۱۵۲ بروایت ترمذی ونسائی وابن ماجہ)	اے علی تم سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہے اور تم سے وہی بغض رکھے گا جو منافق ہے۔

= لیکن خاص الخاص اہلبیت وہی ہیں جن میں یہ دو امتیازی جوہر ہوں۔ (۱) اپنی پیدائش کے دن ہی سے اہلبیت ہوں۔ (۲) ان سے بیت نبوی یعنی نسل رسول کا سلسلہ قائم ہوا ایسے اہلبیت صرف حضرت فاطمہ، حسنین کریمین اور حضرت علی ہیں، کہ یہ مقدس حضرات پیدائش کے دن ہی سے اہل بیت نبوی ہیں۔ اور حضور کی نسل مطہرہ کا سلسلہ انھیں سے جاری ہے۔

ایسے خصوصی اور امتیازی اوصاف والے اہل بیت نہ ازواج نبوی ہیں اور نہ دیگر اولاد عبد المطلب جو حضرت علی حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین کے علاوہ ہیں کہ ازواج نبوی اپنی پیدائش کے دن سے اہل بیت نہیں۔ یہ تو نکاح کے بعد اہل بیت نبوی میں داخل ہوگئے۔ اور آل عبا (یعنی حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین) کے علاوہ کوئی بھی اولاد عبد المطلب ایسی نہیں جس سے نسل رسول جاری ہوئی ہے۔

اس تشریح سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ خاص الخاص اہلبیت جن میں اہلبیت کی دو خاص الخاص صفتیں پائی جاتی ہیں۔ صرف حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین علیہم السلام ہیں۔ اسی لئے جب اہل بیت کا لفظ مطلق آتا ہے تو یہی چار حضرات مراد ہوتے ہیں۔ حضرت شیخ عبد الحق محدث دہلوی جن کو آیۂ تطہیر میں لفظ "اہل بیت" =

اس سے اندازہ لگاؤ کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی محبت کتنی اہم ہے اس سلسلے میں یہ حدیث بھی سُن لو کہ ایک روز حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے حسنین کریمین کے ہاتھوں کو اپنے دست مبارک میں لے کر فرمایا۔

من احبنی واحب ھذین وابا ھما وامھما کان معی فی درجتی یوم القیامۃ	جو شخص مجھ سے محبت رکھے گا اور میرے ان دو نواسوں سے اور ان کے والد سے اور ان کی والدہ سے وہ قیامت کے دن میرے درجہ میں میرے ساتھ رہے گا۔
(ترمذی ج ۲ ص ۲۱۵)	

= پر اگرچہ وہ شرح صدر حاصل نہیں جو امام طحاوی کو حاصل ہے (جس کی بنا پر امام موصوف بڑی صراحت اور شرح وبسط نیز حدیثی دلیل کے ساتھ بیان فرماتے ہیں کہ آیۂ تطہیر میں اہل البیت سے مراد حضور انور، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین ہیں)، تاہم وہ شیخ محدث ہیں۔ چنانچہ جہاں امام رازی کی تقلید سے آزاد ہو کر خالص محققانہ گفتگو کرتے ہیں، وہاں تصریح فرماتے ہیں کہ خاص الخاص اہل بیت یہی چار حضرات ہیں۔ علی، فاطمہ، حسن اور حسین، اور یہ بھی لکھتے ہیں کہ جب اہل بیت کا لفظ مطلق طور پر آتا ہے تو ذہن کا تبادر انھیں چار حضرات کی طرف ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۶۸۱۔ موصوف اس میں اہل بیت نسب اہل بیت سکنیٰ اور اہل بیت ولادت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ اولاد شریف آنحضرت اہل بیت ولادت اند وبا وجود شمول اہل بیت تمامۂ اولاد آنحضرت را، علی وفاطمہ وحسن وحسین سلام اللہ علیہم اجمعین از میاں شان میزاند، بمزید فضل وکرامت در تعلق محبت ومودت ممتاز ومخصوص اند، چنانکہ متبادر از اطلاق اہل بیت ایشانند، در فضائل ومناقب وکرامت وایشاں احادیث بیروں از حد عدد واحصار وارد شدہ۔

شیخ دہلوی کے اس کلام کا ماحصل یہ ہے کہ اگرچہ تمام اولاد رسول اہل بیت میں داخل ہیں، لیکن ان میں حضرت علی، حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین کو خصوصی امتیاز حاصل ہے کہ ان کو مزید فضل وبزرگی ملی ہے اور حضور کی محبت اور قلبی تعلق میں یہ ممتاز اور مخصوص ہیں۔ چنانچہ جب اہل بیت کا لفظ مطلق طور پر بولا جاتا ہے تو یہی حضرات (علی، فاطمہ اور حسنین) مراد ہوتے ہیں اور ذہن انھیں حضرات کی طرف جاتا ہے۔

یہ حدیث مسند احمد میں بھی ہے۔ (کنز العمال ج ۷ ص ۲۱۶)

اس میں حضرت علی کے ساتھ حضرت فاطمہ اور حسنین کریمین کی محبت کا بھی بیان ہے اور کتنی زبردست اہمیت بتائی گئی ہے۔ ذریت طاہرہ کی محبت پر ایک اور حدیث سن لیجئے۔

لایومن عبد حتی یحبنی ولا	اللہ کا کوئی بندہ جب تک مجھ سے محبت نہ رکھے،
یحبنی حتی یحب ذریتی،	وہ مومن ہی نہیں اور مجھ سے اس کو محبت ہی نہیں
(ابوالشیخ، نورالابصار صفحہ ۱۱۴)	جب تک میری ذریت سے محبت نہ رکھے۔

ارتحال نبوی کے بعد حیات مرتضوی کے حالات

صدمۂ جانکاہ غدیر خم کے خطبہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے

یوشک ان یاتینی رسول ربی	جلد ہی میرے رب کا فرشتہ میرے پاس (رحلت
فاجیب	کا پیام لے کر) آئے گا اور میں اسے قبول کروں گا۔

(پھر اس کے بعد ثقلین کو مضبوطی سے پکڑے رہنے کی وصیت فرمائی) اس مذکورہ جملہ میں صراحت فرمادی ہے کہ میرے ارتحال کا زمانہ قریب ہے۔ چنانچہ حجۃ الوداع سے واپسی کے بعد ۲۰ صفر یوم چہارشنبہ کو آپ بیمار ہوئے۔ علالت کا سلسلہ ۱۲ روز تک رہا۔ اس پوری مدت میں حضرت علی تیمارداری اور خدمت گذاری کا فرض کما حقہٗ ادا فرماتے رہے۔ نماز کے وقت میں بھی آپ ہی کی خدمت میں لگے رہتے، چنانچہ مسجد نبوی میں جماعت ہو رہی ہے مگر آپ اور حضرت عباس حضور کی تیمارداری میں لگے ہوئے ہیں کہ حضور کی تیمارداری اور خدمت جماعت نماز میں شریک ہونے سے بدرجہا افضل ہے صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۵ و ج ۲ ص ۶۳۹) میں ہے کہ حضرت ابوبکر حضور کی علالت کی وجہ سے بحکم نبوی نماز پڑھا رہے تھے کہ حضور بیماری میں کچھ افاقہ پانے کی وجہ سے حضرت عباس اور حضرت علی کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر مسجد میں تشریف لائے اور نماز پڑھائی۔

اس حدیث سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ مسجد میں جماعت ہو رہی تھی مگر حضرت علی اور حضرت عباس حضور کی خدمت میں حاضر تھے اور حضور کو چھوڑ کر جماعت میں شریک ہونے نہیں گئے تھے۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ یہ حضرات ایام علالت میں حضور کی خدمت اور تیمارداری کس تن دہی کے ساتھ کر رہے تھے اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بھی زیادہ خدمت اور تیمارداری میں منہمک رہا کرتے تھے جیسا کہ متعدد روایات سے ظاہر ہوتا ہے، اور یہ ہونا بھی یہی چاہیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی کو جتنا پیار کرتے تھے، اور حضور سے آپ کو جو گوناگوں تعلقات تھے ان کا تقاضا یہی ہے۔

۱۳ روز کی علالت کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وصال فرمایا[1]۔ اہل بیت کرام اور صحابۂ عظام کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہو گئی۔ سنن ترمذی میں حضرت انس سے مروی ہے۔

لما کان الیوم الذی دخل فیه — جس روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں

---

[1] تاریخ وفات میں راویوں کا اختلاف ہے۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا بیان نہیں ملتا۔ علامہ سید سلیمان کو بھی کتب حدیث کا تمام دفتر چھاننے کے بعد بھی ایسی کوئی روایت کتب احادیث میں نہ مل سکی۔ علامہ موصوف فرماتے ہیں۔ ارباب سیر کے یہاں تین روایتیں ہیں۔ یکم ربیع الاول، دوئم ربیع الاول، ۱۲ ربیع الاول۔ علامہ لکھتے ہیں "دوئم ربیع الاول کو اکثر قدیم مؤرخوں (مثلاً یعقوبی و مسعودی وغیرہ) نے قبول کیا ہے لیکن واقدی کی مشہور ترین روایت جس کو اس نے متعدد اشخاص سے نقل کیا ہے وہ ۱۲ ربیع الاول کی ہے۔

۲ ربیع الاول کو امام بیہقی نے بسند صحیح سلیمان تیمی سے روایت کیا ہے۔

لیکن خود علامہ مرحوم کی تحقیق ہے کہ تاریخ وفات یکم ربیع الاول ہے اور بتایا ہے کہ یہ تاریخ موسیٰ بن عقبہ سے بھی مروی ہے اور امام لیث مصری سے بھی اور امام سہیلی نے الروض الانف میں اس کو اقرب الی الحق کہا ہے اور انہیں نے یہ نکتہ دریافت کیا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کی روایت قطعاً ناقابل تسلیم ہے۔ علامہ مغفور نے حساب لگا کر تحقیق کی ہے کہ تاریخ وفات یکم ربیع الاول ہی لکھی ہے (ملاحظہ ہو سیرۃ النبی ج ۲ ص ۲۰۰، ۱۷۳-۱۷۴، ۱۷۰ اس کا حاشیہ) کو تحریر کرتا ہے با ایں ہمہ مشہور روایت جو ۱۲ ربیع الاول کی ہے وہی مقبول عام ہے۔ ۱۲

رسول اللہ صلی اللہ المدینۃ اضاء منھا کل شیئ فلما کان الیوم الذی مات فیہ اظلم منھا علی کل شیئ، و ما نفضنا ایدینا عن التراب وانا لفی دفنہ حتی انکرنا قلوبنا ۔
(مشکوٰۃ صفحہ ۵۴۷)

تشریف لائے، مدینہ کی ہر چیز درخشاں ہو گئی تھی اور جس روز آپ کا وصال ہوا مدینہ کی ہر چیز تاریک ہو گئی۔ آپ کو دفن کر کے ہم لوگ ہاتھوں کی مٹی جھاڑنے بھی نہیں پائے تھے کہ ہمارے دلوں میں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی (یعنی حضور کے مشاہدہ سے دلوں میں جو بات تھی وہ اب نہیں رہی۔

اہل بیت اطہار کی نگاہوں میں تو ساری کائنات تاریک ہو گئی تھی۔ چنانچہ حضرت فاطمہ زہرا صبر مجسم ہونے کے باوجود پکار اٹھیں۔

صبت علیّ مصائب لو انّھا صبت علی الایام صرن لیالیا

ترجمہ: مجھ پر ایسی سخت مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر روز روشن پر پڑتیں تو یکسر تاریک ہو جاتے۔
اس موقع پر حضرت سیدہ سلام اللہ علیہا کی زبان پاک سے ایسے الفاظ نکلے ہیں کہ کلیجہ شق ہوتا ہے۔

صحیح بخاری کی روایت ہے کہ جب رسول خدا کا وصال ہوا تو حضرت فاطمہ کی زبان سے یہ الفاظ نکل پڑے ۔

یا ابتاہ اجاب ربا دعاہ یا ابتاہ
من جنّۃ الفردوس ماواہ
یا ابتاہ الی جبریل ننعاہ
(صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۱)

ابّا! اللہ نے آپ کو بلایا اور آپ (ہم کو چھوڑ کر) چلے گئے۔ ابّا آپ تو جنت میں گئے (اور ہم یہیں ہیں۔ ابّا (یہ دن دیکھنا پڑا کہ) جبریل[1] کو آپ کے ارتحال کی خبر ہم سنا رہے

---

[1] یہاں سے آخر تک ان الفاظ کا ترجمہ ہے الی جبریل ننعاہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے بھی یہ ترجمہ کیا ہے الفاظ یہ ہیں: اے پدر من بسوئے جبریل می رسانم خبر او، وی کریم نزد دے ...... اشعۃ اللمعات صفحہ ۶۰۶ ج ۴

ہیں اور ان کے سامنے رو رہے ہیں۔

آپ کے غم واندوہ کا یہ عالم تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے بعد حضور کے خادم خاص حضرت انس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

یا انس اطابت انفسکم ان تحثوا علی رسول اللہ التراب (صحیح بخاری ج۲ ص۶۴۱) اے انس کیا تم لوگوں کے دلوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مٹی ڈالنا گوارا کر لیا۔

کیسے دل دوز الفاظ ہیں کہ کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ اب اندازہ لگائیے کہ حضرت خاتون جنت کے غم واندوہ کا کیا عالم رہا ہوگا۔ کیا کسی بیٹی نے یہ جانکاہ صدمہ دیکھا ہے؟ کیا ہے کوئی ایسی لاڈلی؟ جس کے والد تمام نبیوں کے سردار ہیں اور ان کا داغ مفارقت اسے اٹھانا پڑا ہے۔ کتنی دلدوز ہے حضرت سیدۂ کونین کی یہ مصیبت؟ اس حادثۂ عظمیٰ کے بعد حضرت سیدہ صرف چھ مہینے دنیا میں رہیں اس چھ مہینے کے اندر غم واندوہ کا یہ عالم رہا کہ ہنسی نہیں آئی۔

عہد صدیقی

یہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ تھا۔ اس چھ مہینے کے اندر حضرت سیدہ کے حقیقی مونس وغمخوار حضرت علی ہی تھے۔ اب حضرت علی کے معمولات زندگی صرف یہ رہ گئے تھے، اللہ کی عبادت، حضرت خاتون جنت کی دلجوئی وغم گساری، حسنین پاک کی روحانی تربیت، قرآن مجید کی تلاوت اور اس کی خدمت۔

تاخیر بیعت کا سبب

قرآن مجید کی خدمت کے سلسلہ میں قرآن مجید کا لکھنا بھی تھا، گو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ اقدس ہی میں قرآن مجید کی کتابت ہو چکی تھی، لیکن آئندہ نسل کی تعلیم کے لئے متعدد نسخوں کی ضرورت تھی۔ یہ کام حضرت علی کی نگاہ میں سب سے اہم تھا اور آپ اس میں اس طرح منہمک ہو گئے تھے کہ ہر کام میں کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور بیعت خلافت کو بھی اس کے سامنے اہمیت نہیں دیتے تھے جس کی بنا پر بیعت کرنے میں چھ مہینے تک حصہ نہیں لیا۔ یہی ہے اس کی تاخیر کا سب سے بڑا سبب، چنانچہ جب حضرت ابوبکر نے آپ سے تاخیر بیعت کی وجہ پوچھی تو آپ نے فرمایا:

الیت ان لا ارتدی ردائی الا الی صلوٰۃ حتیٰ اجمع القرآن (ابن سعد)

میں نے قسم کھائی ہے کہ جب تک قرآن مجید کو جمع نہ کر لوں گا نماز کے علاوہ اور کسی کام کے لئے چادر نہ اوڑھوں گا۔

اس روایت سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے ارتحال نبوی کے بعد ہی سے یہ کام شروع کر دیا تھا اس سے اس کا بھی علم ہوتا ہے کہ ارتحال نبوی کے بعد کتابت قرآن کا سب سے پہلا کام آپ ہی نے انجام دیا ہے کہ جن بزرگوں نے اس کام کو کیا ہے اس کے بعد کیا ہے۔ آپ کی اس کتابت قرآن کا ذکر صحیح بخاری و مسلم، و ابو داؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ سب میں ہے۔ صحیح بخاری کے الفاظ یہ ہیں:

عن علی قال: ما کتبنا عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم الا القرآن وما فی ھذہ الصحیفہ۔

حضرت علی نے فرمایا ہے میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل کر کے جو چیزیں لکھی ہیں ان میں بس قرآن اور یہ صحیفہ ہے۔

بے نفسی اور اختلاف سے نفرت

حضرت علی نے چھ مہینے تک جو حضرت ابوبکر کی بیعت خلافت نہیں کی ہے اس کا بڑا سبب یہی ہے جو مذکور ہوا، اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بطور فلتہ بیعت ہوئی تھی۔ یعنی عام مشورہ حاصل کئے بغیر بیعت کی گئی تھی۔ صحیح بخاری ج ۲ ص ۱۰۰۹ میں ہے کہ حضرت عمر اپنے ایک خطبہ میں فرماتے ہیں:

بلغنی ان قائلا منکم یقول: واللہ لومات عمر بایعت فلانا، فلا یغترن امرأ ان یقول: انما کانت بیعۃ ابی بکر فلتۃً وتمت، الا و انہا قد کانت کذالک ولکن اللہ وقی شرھا۔

مجھے اطلاع ملی ہے کہ ایک شخص یہ کہہ رہا تھا کہ "اگر عمر کا انتقال ہوا تو میں فلاں کے ہاتھ پر بیعت کر لوں گا" کوئی دھوکہ میں پڑ کر یہ بات نہ بولے کہ ابوبکر کی بیعت بطور فلتہ ہوئی تھی لیکن مانی ہی گئی۔ ہاں اس میں شبہ نہیں کہ ابوبکر کی بیعت بطور فلتہ ہوئی تھی لیکن اللہ نے اس کے شر سے محفوظ رکھا۔

چونکہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت بطور فلتہ ہوئی تھی (یعنی عام مشورہ حاصل کئے بغیر ہوئی تھی[1]۔ اس لئے حضرت علی اور بنی ہاشم نے عجلت سے کام نہیں لیا، بلکہ چھ مہینے تک دیکھ لیا کہ اللہ نے اس کے شر سے بچایا تب بیعت کی، اس طرح بیعت صدیقی میں جناب مرتضےٰ کا عجلت نہ کرنا ان کے حزم و احتیاط کی بات ہے۔

معاذ اللہ کسی نفسانیت کی بنا پر یہ تاخیر نہ تھی۔ بھلا وجود قدسی میں نفسانیت کہاں؟ آپ تو بے نفسی اور فنائے نفس کے سرچشمہ ہیں۔ اولیاء اللہ میں جو بے نفسی پائی جاتی ہے وہ آپ ہی کے وجود مقدس کا پرتو ہے۔ اسی لئے صوفیۂ کرام بے نفسی کو نسبت اہل بیت کہتے ہیں شاہ ولی اللہ صاحب کے والد مولانا شاہ عبدالرحیم صاحب جو ان کے پیر بھی ہیں اور سلسلۂ نقشبندیہ کے نہایت بلند پایہ شیخ ہیں، فنائے نفس اور بے نفسی کو نسبت اہل بیت کہا کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ صاحب القول الجمیل کی ساتویں فصل کے شروع میں لکھتے ہیں:

ومنها النسبة کسر النفس	ایمانی و روحانی نسبتوں میں ایک نسبت کسر نفس
والتبری عن حظوظها	(یعنی بے نفسی) ہے اور نفس کی لذتوں سے
وکان سیدی الوالد یسمیها	دست کش ہو جانا ہے۔ میرے والد بزرگوار نے
نسبت اهل البیت	اس نسبت کا نام نسبت اہل بیت رکھا ہے۔

اس کو نسبت اہل بیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل بیت اطہار فنائیت کے سرچشمہ ہیں — اور معلوم ہے کہ حضرت علی ان کے بھی سرچشمہ ہیں کہ آپ ہی وہ منبع انوار ہیں کہ جس سے تزکیۂ نفوس

---

[1] اس کو حضرت علی نے بھی بیان فرمایا ہے۔ چنانچہ آپ نے بیعت کی گفتگو کے لئے حضرت ابوبکر صدیق کو اپنے گھر بلایا ہے تو ان سے یہ فرمایا ہمیں آپ کا فضل و کمال معلوم ہے اور ہمیں آپ کو اس منصب کے ملنے پر کوئی رشک نہیں، لیکن آپ نے خلافت کے انتخاب کے لئے ہم لوگوں سے مشورہ نہیں لیا، حالانکہ قرابت رسول کی بنا پر ہم لوگ اس کو اپنا حق سمجھتے تھے کہ ہم سے بھی مشورہ لیتے۔) اس پر حضرت ابوبکر اشکبار ہو گئے (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۰۹)

اور جلائے قلب کی تمام نورانی نہریں نکلی ہیں اور آپ ہی تمام اولیاء اللہ کے شیخ اعظم ہیں کہ آپ ہی کے قلب اطہر اور روح اقدس کے انعکاس انوار سے نفسانیت کی تاریکیاں دور ہوتی ہیں۔ فنائے قلب اور فنائے نفس کی سعادت نصیب ہوتی ہے اور ولایت کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ اوپر تفسیر مظہری صفحہ ۱۱۴ کا بیان گذر چکا ہے کہ:۔

کان قطب ارشاد کمالات الولایۃ علی علیہ السلام، وما بلغ احد من الامم السابقۃ الا بتوسط روحہ رضی اللہ عنہ ثم کان بذلک المنصب الائمۃ الکرام ابناؤہ الی الحسن العسکری وعبد القادر الجیلی۔	کمالات ولایت کے قطب الارشاد علی علیہ السلام ہیں۔ اگلی امتوں میں بھی جو شخص درجۂ ولایت پر پہونچا ہے۔ وہ آپ ہی کی روح پاک کے توسط سے پہونچا ہے۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پھر اس منصب پر ائمۂ اہل بیت (امام) حسن عسکری اور شیخ عبد القادر جیلانی تک ہوئے ہیں (رضی اللہ تعالیٰ عنہم اجمعین۔)

چونکہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم بے نفسی کے سرچشمہ ہیں اس لئے گو حزم واحتیاط کی بناء پر چھ مہینے تک حضرت ابوبکر کی خلافت کے لئے آپ نے بیعت نہیں کی تھی کہ یہ بیعت بطور فلتہ تھی جس میں شر کا امکان تھا۔ چھ مہینے دیکھ لینے کے بعد واضح ہوگیا کہ شر کا ظہور نہ ہوگا، تو بیعت قبول کرلی مگر بیعت نہ کرنے کے زمانہ میں بھی آپ کی ہر ادا سے بے نفسی کا ظہور ہوتا تھا۔ بے نفسی کا یہ عالم تھا کہ تمام بنی ہاشم یہ چاہتے تھے کہ آپ کی خلافت کے لئے کوشش کی جائے، لیکن آپ نے محسوس فرمایا کہ جب ایک خلیفہ بنایا جاچکا ہے تو کسی اور کی خلافت کے لئے کوشش کرنا مناسب نہیں۔ اور بنی ہاشم کو کوئی قدم اٹھانے ہی نہیں دیا۔

حضرت زبیر باوجودیکہ حضرت ابوبکر صدیق کے داماد ہیں، لیکن وہ حضرت علی کو خلافت کا زیادہ مستحق سمجھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ حضرت علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت لی جائے اس معاملے میں وہ اتنے زیادہ سرگرم تھے کہ جو نہ مانے اس کے خلاف تلوار سے کام لینا چاہتے تھے۔ تاریخ طبری میں ہے:

اخترط زبیر سیفہ، و قال لا اغمدہ حتی یبایع علی — زبیر نے نیام سے تلوار کھینچ لی، اور کہا جب تک حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت نہ کی جائے میں تلوار کو نیام میں نہ ڈالوں گا۔

لیکن حضرت علی نے ان کو ٹھنڈا کیا۔ اس طرح بنی ہاشم اور اہل بیت اطہار کی طرف سے کوئی بات نہیں اٹھی، گو ان کو یہ خیال ضرور تھا کہ خلافت اہل بیت کا حق ہے اور حضرت علی اس کے زیادہ مستحق ہیں، لیکن حضرت علی اس کو بہت ہی برا سمجھتے تھے کہ حضرت ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت ہو چکی ہے تو اس کے خلاف کوئی محاذ کھڑا ہو چنانچہ حضرت ابوبکر کے خلیفہ ہو جانے کے بعد امیر معاویہ کے والد ابوسفیان نے حضرت علی سے جا کر کہا۔

ابسط یدک ابایعک فانت احق الناس بھذا الامر (العقد الفرید ج ۲ ص ۱۹۱) — ہاتھ پھیلایئے میں آپ کی بیعت کرتا ہوں کہ آپ تمام لوگوں سے بڑھ کر خلافت کے مستحق ہیں۔

مگر حضرت علی نے اسے ٹھکرا دیا۔ آپ نے اپنے خط میں جو امیر معاویہ کے پاس لکھا ہے، اس واقعہ کو تحریر فرمایا ہے اور تصریح کی کہ میں نے ابوسفیان کی اس استدعا کو مسترد کر دیا کیونکہ مسلمانوں میں افتراق کا اندیشہ تھا، اور بہت سے لوگ ایسے تھے جن کا زمانہ کفر بھی قریب ہی کا زمانہ تھا[1] (یعنی نہ جانے وہ کیا کرتے۔)

کنز العمال (ج ۵ ص ۳۸۵) میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے، جس سے اس پر مزید روشنی پڑتی ہے کہ حضرت

---

[1] اس کے بعد مکتوب گرامی کی عبارت یہ ہے۔ فابوک اعلم بحقی منک وان تعرف من حقی ما کان ابوک یعرفہ تصب رشدک، واللہ نستعین علیک، ترجمہ یہ ہے۔ اے معاویہ! تمہارے والد تم سے زیادہ میرا حق خلافت سمجھتے تھے۔ اگر تم اپنے والد کی طرح میرے حق کو سمجھ لو تو ہدایت پا جاؤ گے۔ اگر نہ سمجھو گے تو تمہارے مقابلہ میں اللہ کی مدد کافی ہے میں اسی سے مدد مانگتا ہوں۔ (العقد الفرید۔ ج ۲ ص ۱۹۱) کوثر

علی کرم اللہ وجہہ الکریم کیسے بےنفس اور قدوسی وجود ہیں کنز العمال کے الفاظ یہ ہیں۔

دخل ابو سفیان علی علی والعباس	ابوسفیان نے حضرت علی اور حضرت عباس کے پاس
فقال یا علی وانت یا عباس ما	آکر کہا " اے علی اور اے عباس قریش کے سب سے
بال ھذا الامر فی اذل قبیلۃ	کم حیثیت اور سب سے کم تعداد والے قبیلہ کا آدمی
من قریش واقلھا، واللہ لئن	کیسے خلیفہ ہو گیا۔؟ اگر آپ تیار ہو جائیں تو میں اس کے
شئت لاملأنہا علیہ خیلا ورجالا	مقابلہ میں سواروں اور پیادوں سے وادی بھر دوں۔"
فقال لہ علی: لا واللہ ما ارید	حضرت علی نے جواب دیا " میں قسم کھا کر کہتا ہوں
ان تملأھا علیہ خیلا ورجالا	کہ میں اسے گوارا نہ کروں گا کہ تم ابوبکر کے خلاف سواروں
ولولا انا رأینا ابابکر لذلک	اور پیادوں سے وادی بھر دو، اگر ہم ابوبکر کو
اھلا ماخلیناہ وایاھا، یا ابا	اس منصب کا اہل نہ سمجھتے تو انھیں اس منصب
سفیان ان المؤمنین قوم نصحۃ	پر رہنے ہی نہ دیتے۔ اے ابوسفیان! اہلِ ایمان
بعضھم لبعض متوادون، وان	ایک دوسرے کے خیر خواہ اور آپس میں محبت کرنے
بعدت دیارھم وابدانھم وان	والے لوگ ہیں۔ گو ان کے دیار اور اجسام ایک دوسرے
المنافقین قوم غششۃ بعضھم	سے دور ہی کیوں نہ ہوں۔ البتہ منافقین ایک دوسرے
لبعض۔ (کنز)	کے بدخواہ ہوا کرتے ہیں اور باہم دھوکہ بازی سے کام لیا کرتے ہیں۔

سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے اس جواب کو بار بار پڑھو، معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کا نہایت برگزیدہ بندہ، اعلیٰ درجہ کا نیک طینت انسان اور فرشتہ صفت قدوسی وجود انسانیت کبریٰ کی بلندی سے اپنی نیک نفسی کی شعاعیں پھیلا رہا ہے۔ اور سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خلاف محاذ قائم کرنے کو انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور جو شخص محاذ قائم کرنے کی گفتگو کر رہا ہے اس کو سمجھا رہا ہے کہ اہلِ ایمان کا طریقہ یکر ٹو، مسلمان خیر خواہ ہوا کرتا ہے، کسی کے خلاف بدخواہی کی بات نہیں سوچتا، بدخواہی اور چالبازی مسلمانوں کا طریقہ نہیں۔ یہ تو اہلِ نفاق کا طریقہ ہے۔

غور کرو، اگر سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے بجائے کوئی اور شخص ہوتا جسے حکومت کی خواہش بھی ہوتی پھر اس سے ابوسفیان جیسے زعیم قریش اور قبائل عرب کو ہموار بنانے کی بے نظیر صلاحیت رکھنے والا لیڈر خلافت کے لئے کھڑے ہوجانے کی اپیل کرتا تو یقیناً وہ خلیفہ بن جاتا، کہ تمام قبائل عرب کی اسے حمایت حاصل ہوتی، اور اس کی قرابت رسول اور سبقت اسلامی اس کے لئے بڑی موثر طاقت بن جاتی لیکن کیسی بے نظیر بے نفسی ہے، سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی جس کی بنا پر آپ نے ابوسفیان کی استدعا کو مسترد کر دیا بلکہ اسے نہایت غلط کام قرار دیا۔ اور بڑی نصیحتیں فرمائیں، دیکھو اس آئینہ میں بے نفس سیرت مرتضوی کی تصویر نظر آتا ہے کہ آسمانی فرشتہ انسانی قالب میں آگیا ہے، جس کو اپنے کسی اعزاز کی خواہش نہیں اور سب سے اونچے منصب کی خواہش سے بھی کہیں بالاتر ہے۔

حضرت علی مرتضیٰ نے جس طرح اپنے اس طریقہ عمل سے خلافت صدیقی کو ایک بڑے تصادم اور اختلاف سے بچایا کاش عہد مرتضوی میں اکابر امت بھی اس روش کو اختیار کرتے اور خلافت مرتضوی کو اختلاف و تصادم سے بچانے کی کوشش کرتے تو مسلمانوں کا اتنا خون نہ ہوتا۔ اختلاف سے امتیں اور قومیں تباہ ہوگئیں، اختلاف سے بچو، محبان مرتضوی کو اختلاف سے بچنے کی بیحد کوشش کرنی چاہئے۔ آپ نے عہد صدیقی میں اختلاف کی راہیں جس طرح بند کی ہیں اور اس سے امت کو جتنا فائدہ پہنچا یا ہے اس کو ہمیشہ نگاہ میں رکھنا چاہئے کہ آپ اختلاف سے ہمیشہ اجتناب فرماتے تھے، کتب حدیث میں ہے۔ حضرت علی نے ایک فقہی مسئلہ بیان کیا۔ عبیدہ سلمانی نے کچھ اختلاف کیا۔ اس میں آپ نے جو فرمایا امام بخاری اسے ان الفاظ میں روایت فرماتے ہیں :۔

اقضوا کما کنتم تقضون فانی اکرہ الاختلاف حتی یکون الناس جماعۃ او اموت کما	اس مسئلہ کے بارے میں تم لوگ اپنی قرار داد پر رہو کیوں کہ میں اختلاف کو بہت برا سمجھتا ہوں میری یہ روش اس لئے ہے کہ لوگ ایک جماعت بنے

مات اصحابی (صحیح بخاری، مناقب علی ج ۱ ص ۵۲۶) رہیں، یہ بات میں عمر بھر چاہتا ہوں حتی کہ میں بھی اسی طرح دنیا سے چلا جاؤں جیسے میرے ساتھی چلے گئے۔

جس طرح حضرت علی مرتضیٰ نے عہد صدیقی کو اختلاف سے بچایا ہے اسی طرح حضرت ابوبکر صدیق نے بھی خلافت قبول فرما کر امت کو اختلاف و افتراق میں پڑنے سے روکا ہے۔ چنانچہ خلیفہ ہونے کے بعد آپ نے جو خطبہ دیا ہے اس میں قبول خلافت کی جو وجہ بتائی ہے وہ یہ ہے:۔

اشفقت من الفتنة ومالی فی الامارة راحة، مجھے فتنہ اٹھنے کا ڈر ہوا، حالانکہ خلافت میں مجھے کوئی راحت نہیں ہے۔

کتنا صحیح ہے حضرت صدیق کا یہ خیال کہ "فتنہ اٹھنے کا ڈر ہو گیا تھا۔ قریش کے بہت سے لوگ جن کے بڑے حضرت علی کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے، وہ ان کے شدید مخالف تھے، فرض کر لو اگر حضرت ابوبکر کے بجائے حضرت علی کو خلیفہ بنا لیا جاتا تو یہ لوگ چپکے بیٹھے رہتے؟ اور کیا بغاوت کے وہی فتنے کھڑے نہ ہو جاتے جو آگے چل کر بعہد مرتضوی کھڑے ہو گئے تھے، جس کی بنا پر ایک روز بھی جناب امیر علیہ السلام کو سکون نہ مل سکا۔

اس بنا پر مصلحت یہی تھی کہ حضرت علی کے بجائے کسی اور بزرگ کو خلیفہ بنایا جائے، تاکہ لوگوں کی طرف سے جس فتنہ کا اندیشہ ہے وہ کھڑا نہ ہو۔ اب جس پر نظر ڈالئے سوائے حضرت ابوبکر صدیق کے کوئی بھی ایسا نہیں جو سبقت اسلامی میں سب سے آگے ہو۔ اس کے علاوہ ان میں اور بھی متعدد خوبیاں ہیں جو اوروں میں نہ تھیں لہٰذا حضرت ابوبکر ہی کو خلیفہ بنانا مناسب تھا، اس سے وقت کی بہت بڑی مصلحت پوری ہوئی۔ ورنہ مؤلفۃ القلوب اور ان کے ہم نوا، اور ان کے زیر اثر لوگ، ان کے پروپیگنڈہ میں آجاتے اور بغاوت کا بڑا فتنہ اور ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ آخر حضرت علی کی خلافت میں ان لوگوں نے امیر معاویہ کی دعوت پر کیسے قیامت خیز ہنگامے اٹھائے اور کیسے کیسے معرکے ہوئے۔ اگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردہ فرماتے ہی یہ ہنگامے کھڑے ہو جاتے تو نظام اسلامی کا شیرازہ ہی بکھر جاتا۔ اس فتنے کے نتائج کتنے ہولناک ہیں، اسی لئے حضرت صدیق نے فرمایا "مجھے فتنہ اٹھنے کا ڈر ہوا" اور

اسی بنا پر خلافت منظور کی۔

جیسے حضرت صدیق کو اس فتنہ کا اندیشہ تھا اسی طرح حضرت عمر وغیرہ کو بھی تھا اور اسی بنا پر حضرت عمر نے حضرت صدیق کو خلیفہ بنانے کی کوشش کی۔ اور کامیاب ہو کر فتنے کو اٹھنے ہی نہیں دیا۔ یہ محض راقم السطور ہی کا خیال نہیں بلکہ خود حضرت عمر نے بھی اس کی صراحت فرمائی ہے کہ کچھ ضلالت شعار لوگ فتنہ کے منتظر ہیں اور شورشے کھڑے کریں گے۔ صحیح مسلم باب النہی عن اکل الثوم ج ۱ ص ۲۱۰ میں حضرت عمر کا ایک بیان مروی ہے جس میں وہ فرماتے ہیں :-

فان عجل بی امر فالخلافۃ شوریٰ	اگر مجھے موت جلد ہی آگئی تو خلافت ان چھ[1] آدمیوں کے
بین ھٰؤلاء الستۃ الذین توفی	شوریٰ سے ہوگی جن سے آخر وقت تک رسول صلی اللہ
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	علیہ وسلم راضی رہے۔
وھو عنھم راض، وانی قد علمت	اور میں جانتا ہوں کہ کچھ لوگ خلافت میں چون
ان اقواماً یطعنون فی ھٰذا الامر	وچرا کریں گے اور حملہ کریں گے۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کو
انا ضربتھم بیدی ھذہ علی	اسلام منوانے کے لئے میں نے اپنے ہاتھ سے پیٹا ہے۔
الاسلام فان فعلوا ذالک	اگر یہ لوگ ایسی حرکت کریں تو دشمن لوکہ یہ لوگ اللہ
فاولٰئک اعداء اللہ الکفرۃ الضلال	کے دشمن ہیں، کافر ہیں اور گمراہ ہیں۔

اکمال اکمال المعلم صحیح مسلم کی نہایت بلند پایہ شرح ہے قاسمی جماعت کے مایۂ ناز عالم فاضل شبیر احمد عثمانی فتح الملہم شرح صحیح مسلم (ج ۲ ص ۱۵۴) میں اس حدیث کی شرح کرتے ہوئے کتاب مذکور سے اخذ کر کے لکھتے ہیں۔

اللہ اعلم بمن عنی عمر بھؤلاء القوم	حضرت عمر نے جو فرمایا ہے کہ کچھ لوگ خلافت میں
الطاعنین الآبین من الخلافۃ	چون وچرا کریں گے اور حملہ کریں گے تو اللہ بہتر جانتا

---

[1] ان چھ آدمیوں کے نام مسند حمیدی ج ۱ ص ۱۷ میں یہ ہیں۔ عثمانؓ، علیؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، عبدالرحمٰن بن عوفؓ، سعد بن ابی وقاصؓ۔ ۱۲ کوثر

نعم كان قوم يابون ان تكون
فى اهل البيت، فعن ابن عباس
قال قال لى عمر يوما ابوك عم
رسول الله صلى الله عليه وسلم
وانت ابن عمه فما يمنع قومكم منكم؟
قلت لا ادرى، قال ـ لكنى ادرى كرهوا
ان تجتمع فيكم النبوة والخلافة،
قالوا ان فضلونا بالخلافة والنبوة
لم يبقوا للناس شيئاً وان افضل النصيبين
مابين ايديكم، وما اخالها
الا مجتمعة فيكم، وان نزلت على
رغم انف قريش، وعن المقداد انه
قال: واعجبا لقريش ردفعهم
هذا الامر عن اهل بيت نبيهم و
فيهم اول المؤمنين وابن عم رسول
الله صلى الله عليه وسلم اعلم الناس
وافقههم فى دين الله عزوجل و
افضلهم عناء فى الاسلام، وابصرهم
بالطريق واهداهم الى صراط المستقيم،
والله لقد ردوها عن الهادى
المهتدى الطاهر النقى، والله

ہے کہ ان لوگوں سے انہوں نے کن شخصوں کو مراد لیا ہے
ہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو اہل بیت میں خلافت
کے آنے کو ناپسند کرتے ہیں اور مخالف ہیں چنانچہ
ابن عباس کہتے ہیں کہ مجھ سے ایک روز عمر نے کہا
تمہارے والد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا
ہیں اور تم آپ کے چچیرے بھائی ہو۔ پھر تمہاری قوم
نے خلافت کو تم لوگوں کے پاس آنے سے کیوں رکاوٹ
ڈالی؟ ابن عباس کہتے ہیں۔ میں نے کہا۔ مجھے
معلوم نہیں۔ عمر نے کہا، لیکن میں جانتا ہوں۔
لوگوں کو یہ گوارا نہ ہوا کہ تم لوگوں میں نبوت و خلافت
دونوں رہیں۔ چنانچہ انہوں نے کہا خلافت اور
نبوت دونوں کا شرف اسی خاندان والوں نے پایا
تو ہمارے لئے کیا رہا، مگر حقیقت یہ ہے کہ ان
دونوں میں جو افضل حصہ ہے وہ تمہیں لوگوں
کے پاس ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ دونوں نعمتیں
تمہارے خاندان میں اکٹھا ہو کے رہیں گی اگرچہ
قریش کو کتنا ہی ناگوار ہو۔ اور حضرت مقداد کا قول
ہے۔ قریش پر تعجب ہے اور ان کی اس حرکت
پر بھی کہ خلافت کو اہل بیت نبوی میں آنے سے رکاوٹ
ڈالی حالانکہ امت میں وہ شخص موجود ہیں جو نبی صلی اللہ
علیہ وسلم کے چچیرے بھائی ہیں۔ سب سے زیادہ علم

ما ارادوا بها صلاحا للامة
ولكنهم آثروا الدنيا على الآخرة
يعني بذالك علي بن ابي طالب
كرم الله وجهه، وتطاول عمرو
بن العاص للشورى فقال عمر:
اطمئن كما وضعك الله والله
لا جعلت فيها احدا حمل السلاح
على رسول الله صلى الله عليه
وسلم، وقال مرة: ان هذا الامر
لا يصلح للطلقاء، ولا لابناء الطلقاء
ولو استقبلت من امري ما استدبرت
ما جعلت ليزيد بن ابي سفيان
ومعاوية بن ابي سفيان
ولاية الشام۔

فيتحمل ان يكون عمر رضي الله
عنه اراد بالطاعنين هولاء الآبين
كونها في اهل البيت وقد يشهد
لذالك قوله انا ضربتهم بيدي
هذا على الاسلام۔ كذا في اكمال
اكمال المعلم۔

رکھتے ہیں، دین کے سب سے بڑے فقیہہ ہیں، اسلام کی راہ
میں سب سے زیادہ مشقت اٹھائی ہے، راہ حق کے
سب سے بڑے دیدہ ور ہیں۔ صراط مستقیم کی ہدایت
سب سے زیادہ رکھتے ہیں۔ اللہ کی قسم ان لوگوں نے
خلافت کو اس شخص کے پاس آنے سے روکاوٹ
ڈالی ہے، جو ہادی ہے، راہ حق پر ہے، پاک مقدس
ہے، بڑا متقی ہے، اللہ کی قسم ان لوگوں نے خلافت
سے امت کا سدھار نہیں چاہا ہے لیکن دنیا کو
آخرت پر ترجیح دی ہے۔ حضرت مقداد جس کی اتنی
تعریف کر رہے ہیں اس سے مراد حضرت علی ہیں۔

جب حضرت عمر نے چھ آدمیوں کے شوریٰ پر
خلیفہ کا انتخاب رکھا تو عمرو بن عاص نے اپنے کو
نمایاں کیا (کہ ہمارا انتخاب کریں) اس پر حضرت عمر
نے فرمایا۔ بس وہیں رہو جہاں اللہ نے تمہیں رکھا
ہے۔ میں انتخاب خلافت میں اس کو نہیں رکھوں گا جس
نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ہتھیار اٹھایا ہے حضرت
عمر نے ایک بار یہ بھی فرمایا کہ طلقا خلافت کے لائق ہیں
نہ ان کی اولاد۔ بعد میں جو بات مجھے سمجھی ہے اگر پہلے
اسے سمجھ لیتا تو یزید بن ابی سفیان اور معاویہ بن
ابی سفیان دونوں کو شام کی ولایت نہ دیتا۔

ان باتوں کی بنا پر احتمال ہے کہ حضرت عمر نے

خلافت میں چون وچرا کرنیوالوں اور حملہ کرنیوالوں سے
مراد انھیں لوگوں کو لیا ہے جو اہل بیت میں خلافت کے
آنے کو بُرا سمجھتے ہیں اور مخالف ہیں۔ اس کا ثبوت
یہ ہے کہ ان چون وچرا کرنیوالوں اور حملہ کرنیوالوں کے
متعلق وہ فرماتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں جن کو اسلام منوانے
کے لئے میں نے اپنے ہاتھ سے پیٹا ہے۔

عہد فاروقی میں

حضرت ابو بکر کی خلافت کا زمانہ بہت مختصر ہے، صرف دو سال چار مہینے، اس زمانہ میں حضرت علی قرآن مجید کو لکھنے اور حسنین کریمین کی تعلیم و تربیت میں مشغول تھے۔ البتہ حضرت عمر کی خلافت کا زمانہ دس سال چھ مہینے ہیں۔ اس زمانہ میں آپ کے معمولات زندگی بہت وسیع ہو گئے تھے۔ حسنین پاک کی تعلیم و تربیت کے علاوہ اور بھی بہت سے خوش نصیب حضرات آپ سے علمی، دینی اور روحانی تعلیم و تربیت حاصل کر رہے تھے جن کی فہرست بہت طویل ہے۔

حضرت عمر تمام انتظامی اور سیاسی امور میں آپ سے مشورہ کر لیا کرتے تھے۔ فاروقی مجلس شوریٰ کے ایک رکن رکین آپ بھی تھے۔ حضرت فاروق آپ کے مشورہ کو اتنی اہمیت دیا کرتے کہ حضرت سعید بن مسیب کا بیان ہے۔

کان عمر یتعوذ باللہ من معضلۃ لیس لھا ابوحسن۔	عمر اس سے اللہ کی پناہ مانگتے تھے کہ کوئی مشکل پیش ہو جائے اور ابوالحسن یعنی حضرت علی اس کو حل کرنے کے لئے موجود نہ رہیں۔
(تاریخ الخلفا ص ۱۲۰)	

اس حل مشکلات والی شان مرتضوی کے پیش نظر عربی کی ایک مثل بنی ہے، وہ یہ ہے کہ ایسی جب مشکل آپڑے کہ کوئی مشکل کشا نہ ہو تو عربی میں بطور مثل یہ جملہ بولتے ہیں۔

معضلۃ ولا ابا حسن لھا۔	مشکل ہے اور کوئی ابوالحسن نہیں ہے جو اسے دور کردے

ابوالحسن حضرت علی کی کنیت ہے۔

مشہور ہے کہ ایک موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی کے ایک مشورہ پر فرمایا ہے۔

لولا علی لھلک عمر — اگر علی نہ ہوتے تو عمر ہلاک ہو جاتا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ حضرت علی کی بصیرت کتنی گہری ہے اور حضرت عمر ان کے مشورہ کو کتنا قیمتی اور ہلاکت سے بچانے والا سمجھتے تھے۔ الفاروق حصہ دوم صفحہ ۲۶۹ میں ہے کہ

"حضرت عمر بڑی بڑی مہمات میں حضرت علی کے مشورے کے بغیر کوئی کام نہیں کرتے تھے۔ اور حضرت علی بھی نہایت دوستانہ اور مخلصانہ مشورہ دیتے تھے۔ نہاوند کے معرکہ میں ان کو سپہ سالار بھی بنانا چاہا تھا، لیکن انہوں نے منظور نہیں کیا۔ بیت المقدس گئے تو کاروبار خلافت انہیں کے ہاتھ میں دیکر گئے۔"

اس کی خاص وجہ غالباً یہ ہے کہ حضرت عمر موجودہ لوگوں میں خلافت کے لئے سب سے زیادہ مناسب حضرت علی کو سمجھتے تھے۔ امام بخاری ادب مفرد میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے ایک انصاری سے پوچھا۔ میرے بعد لوگ کس کو خلیفہ بنانا چاہتے ہیں؟ انصاری نے چند مہاجرین کا نام لیا۔ ان میں حضرت علی کا نام نہ تھا۔ حضرت عمر نے فرمایا:

مالھم عن ابی الحسن ؟ فواللہ لاحراھم	یہ لوگ علی سے کیوں کنارے ہیں؟ بخدا علی الخلافت
ان کان علیھم لیقیمھم علی طریقۃ الحق	کے لئے سب سے زیادہ مناسب ہیں۔ اگر یہ خلیفہ ہوئے
(کنز العمال طبع دوم ج ۵ ص ، ۲۳۴)	تو سب کو راہ حق پر قائم رکھیں گے۔

حضرت عمر نے اس کا اظہار کئی مواقع پر کیا ہے۔ ایک بار حضرت ابن عباس ان کو متفکر پا کر کہتے ہیں؟ شاید آپ کو یہ فکر ہے کہ میرے بعد خلافت کے لئے کون زیادہ مناسب ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا۔ تم نے میرے دل کی بات کہی۔ حضرت ابن عباس اس سلسلہ میں حضرت عثمان، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کا نام یکے بعد دیگرے لیتے ہیں اور حضرت عمر سے پوچھتے جاتے ہیں کہ ان کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟ حضرت عمر اپنی رائے بتلاتے ہیں۔ آخر میں حضرت علی کے

بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

ھُوَلَھا، لولا دعابة فيه، ووالله ان وُلّي ليحملنهم على المحجة البيضاء[1]	یہ ہیں خلافت کے لائق کاش ان میں خوش مزاجی نہ ہوتی اگر انہیں خلیفہ بنا یا گیا تو لوگوں کو راہ حق پر چلا کے رہیں گے۔

نوٹ: خلیفہ ہو جانے کے بعد آپ میں خوش مزاجی نام کو بھی نہیں تھی۔

عہد عثمانی میں

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی خلافت کا زمانہ بارہ سال ہے۔ خلافت کے آخری سال میں مدینہ منورہ میں بڑی شورش پیدا ہوئی۔ مصر، بصرہ اور کوفہ سے بلوائی آئے اور بڑا ہنگامہ پیدا ہوا مدینہ منورہ کے اکثر حضرات حج کو گئے تھے، اس لئے بلوائیوں کو موقع مل گیا۔ اور امیر المومنین کو اپنے ظلم و ستم کا نشانہ بنا کر شہید کر دیا۔ حضرت سعید بن مسیب کا یہ مختصر جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ فرماتے ہیں:

قتل عثمان مظلوماً، ومن قتله	عثمان مظلوم مارے گئے، جس نے ان کو قتل

---

[1] یہ استفسار و جواب محدثین نے پورا روایت کیا ہے اور فتح الملہم ج ۲ ص ۲۵۴ میں ہے جو قاسمی مکتب فکر کی نہایت بلندپایہ کتاب ہے۔ عبارت یہ ہے۔ عن ابن عباس قال: رأيت عمر متفكراً، قلت: يا امير المؤمنين كانك تفكر فيمن يصلح لهذا الامر بعدك فقال ما اخطأت ما فى نفسى، فقلت: يا امير المؤمنين ما تقول فى عثمان؟ فقال: كلف باقاربه يحمل ابناء بنى معيط على رقاب الناس فيحطمونهم حطم الابل نبت الربيع، فيدخل الناس من ههنا فيقتلونه واشار الى مصر والعراق، والله ان فعلت ليفعلن وان فعل ليقتلن. قلت فطلحة؟ قال: صاحب بأو زهو وهذا الامر لا يصلح لمتكبر، قلت فزبير قال يظل نهاره بالبقيع يحاسب على الصاع من التمر، وهذا الامر لا يصلح الا لمن شرح الصدر، قلت فسعد؟ قال صاحب شيطان اذا غضب، والانسان اذا رضى فمن للناس اذا غضب؟ قلت فابن عوف؟ قال لو وزن ايمانه بايمان الناس لرجحهم لكنه ضعيف ــــ قلت: فعلىٌّ؟ فصفق باحدى يديه على الاخرى، وقال: هُوَلَها، لولا دعابة فيه. ووالله ان وُلّى ليحملنهم على المحجة البيضاء ــــ ۱۲ کوثر

کان ظالما، ومن خذله کان	کیا وہ ظالم ہے۔ اور وہ لوگ (صحابہ وغیرہ) معذور ہیں
معذورا (تاریخ الخلفاء ص۱۱۰)	جو اصلاح بلوائیوں کے مقابلہ میں) انکی (اصلح) مدد کیلئے نہیں اٹھے۔

شورش کے اس آخری سال میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے اصلاح حال کی انتہائی کوشش فرمائی اس میں آپ کا کارنامہ تمام صحابہ کرام سے بڑھا ہوا ہے، کہ جتنا آپ نے کیا کوئی اور بزرگ اتنا نہ کرسکے۔

شورش کی بنیاد یہ ہے کہ حضرت عثمان کے عاملین نے ان کی سخت ہدایتوں کے باوجود غلط قدم اٹھایا، جس سے مصر، کوفہ اور بصرہ والوں کو تکلیف ہوئی اور شکایت کی، چوں کہ یہ عمال حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خاص رشتہ دار تھے اس لئے عوام کو حضرت عثمان سے بھی بدگمانی پیدا ہوگئی، جو سراسر غلط تھی۔

بڑی غلط فہمی عبداللہ بن ابی سرح کے طریقۂ کار سے پیدا ہوگئی تھی۔ گو دیگر عمال عثمانی کے عمل سے بھی شکایت پیدا ہوئی۔ تاریخ الخلفاء (ص۱۱۰) میں ہے:۔

کان کثیرا ما یولی بنی امیۃ ممن	(حضرت) عثمان زیادہ تر بنی امیہ کو والی (گورنر) بناتے
لم یکن لہ مع رسول اللہ صحبتہ	تھے جس میں وہ لوگ بھی تھے جن کو رسول کی صحبت نصیب
فکان یجیٔ من امرائہ ماینکرہ	نہیں ہوئی نیز یہ حکام وہ کام کرتے جن کو صحابہ بہت برا
اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم	سمجھتے اور (حضرت) عثمان ان کی خوشنودی کے طالب تھے۔
وکان عثمان یستعتب فیھم فلا	پھر بھی ان حکام کو معزول نہیں کیا۔
یعزلھم۔	

گو حضرت عثمان تمام حکام کو تقویٰ کی سخت تاکید فرماتے مگر چوں کہ نرم مزاج تھے اور حضرت عمر کی طرح دبدبہ کا مزاج نہ تھا (جس سے تمام عمال فاروقی بلا چون وچرا فاروقی ہدایت پر عمل کیا کرتے تھے) اس سے حکام عثمانی نے غلط فائدہ اٹھایا۔ اور نڈر ہو کر اپنی من مانی کی، خصوصاً عبداللہ بن ابی سرح نے چنانچہ اس نے حضرت عثمان کی تہدید کا بھی اثر نہیں لیا۔ تاریخ الخلفاء میں ہے:

مصر کے لوگ حضرت عثمان کے پاس ———— عبداللہ بن ابی سرح کی شکایت لے کر آئے اس پر حضرت عثمان نے اسے ایک مکتوب لکھا، جس میں قابلِ شکایت باتوں کی ممانعت فرمائی تھی اور تہدید بھی کی تھی لیکن اس نے آپ کی بات نہیں مانی، بلکہ جو مصری آدمی حضرت عثمان کا مکتوب لے کر گیا تھا اس کو پیٹا اور مار بھی ڈالا، اس کا اثر یہ ہوا کہ مصر کے سات سو آدمی مدینہ منورہ آئے، مسجد نبوی میں اترے اور نماز کے وقت صحابۂ کرام کے سامنے عبداللہ بن ابی سرح کے یہ مظالم رکھے اسے سُنکر حضرت طلحہ فوراً اٹھے اور حضرت عثمان سے بڑی سخت گفتگو کی۔ حضرت عائشہ نے عثمان کے پاس تحریر بھیجی کہ:

"صحابۂ رسول تمہارے پاس گئے تھے کہ اس شخص کو معزول کردو، لیکن تم نے ان کی بات نہیں مانی، اب اس نے ان میں سے ایک شخص کو مار ڈالا لہٰذا اپنے عامل سے اس کا انصاف چکاؤ۔"

حضرت علی حضرت عثمان کے پاس تشریف لے گئے اور فرمایا:

"یہ لوگ (جو مصر سے آئے ہیں) ایک خاص شخص کے بجائے کسی دوسرے شخص کو والی بنانے کی درخواست کرتے ہیں کہ اس نے ایک آدمی کو (ناحق) مار ڈالا ہے لہٰذا اسے معزول کر دیجئے اور قضیہ کا فیصلہ کیجئے۔ اگر قاتل پر قصاص آتا ہے تو لوگوں کا انصاف کیجئے۔"

اس پر حضرت عثمان نے لوگوں سے فرمایا۔

"کسی کا انتخاب کرلو میں اسی کو تم لوگوں کا والی بناؤں گا۔"

لوگوں نے حضرت محمد بن ابی بکر کا نام پیش کیا۔

حضرت عثمان نے منظور فرمایا اور انھیں مصر کا حاکم مقرر کیا۔

حضرت محمد بن ابی بکر لوگوں کو لے کر مصر روانہ ہوئے۔ ساتھ میں متعدد مہاجرین و انصار بھی چلے کہ اہلِ مصر اور عبداللہ بن ابی سرح کے معاملہ کا معائنہ کریں۔ ابھی ان لوگوں نے تین دن

کی راہ طے کی تھی کہ ایک سیاہ فام غلام اونٹ پر سوار ملا۔ وہ اس طرح اونٹ چلا رہا تھا جیسے ڈر کر بھاگا جا رہا ہو یا بعجلت کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ صحابۂ کرام جو مصر جا رہے تھے انہوں نے فرمایا "تیرا کیا معاملہ ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ڈرا ہوا بھاگا جا رہا ہے، یا کسی کی تلاش میں جا رہا ہے"

غلام نے کہا: "میں امیر المومنین کا غلام ہوں، آپ نے مجھے مصر کے عامل کے پاس بھیجا ہے" اس پر ایک آدمی نے حضرت محمد بن ابی بکر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ "مصر کے عامل یہ ہیں" غلام نے کہا "یہ مطلوب نہیں ہیں" اب غلام کو حضرت محمد بن ابی بکر کے پاس لائے۔ اس نے پوچھنے پر کبھی یہ کہا۔ میں امیر المومنین کا غلام ہوں۔ اور کبھی یہ کہا کہ مروان کا غلام ہوں۔ ایک آدمی اسے پہچانتا تھا اس نے کہا یہ عثمان کا غلام ہے۔

حضرت محمد بن ابی بکر نے اس سے پوچھا۔ تمہیں کہاں بھیجا گیا ہے؟

اس نے کہا عامل مصر کے پاس۔

کیا لے کر جا رہے ہو؟

ایک پیام۔

کیا تمہارے پاس کوئی تحریر بھی ہے؟

نہیں۔

تلاشی لینے پر ایک مکتوب ملا جو سربمہر تھا۔ حضرت محمد بن ابی بکر نے ان مہاجرین و انصار کو جمع کیا، جو ان کے ساتھ مصر جا رہے تھے اور ان کے سامنے مہر توڑی گئی۔ اس میں یہ لکھا تھا۔

"جب محمد بن ابی بکر اور فلاں فلاں آدمی تمہارے پاس پہنچیں تو کسی حیلہ سے انھیں مار ڈالنا اور اپنے عہدہ پر قائم رہنا۔ اور جو شخص تمہاری شکایت کی فریاد لے کر مصر سے میرے پاس جانے کے لئے قدم اٹھائے اسے قید کر ڈالنا۔"

خط پڑھ کر یہ لوگ مدینہ منورہ روانہ ہوئے اور حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت علی اور دیگر صحابہ کو جمع کر کے یہ خط پیش کیا اور غلام کا پورا واقعہ سنایا۔ اس خط کو پڑھ کر تمام

اہل مدینہ میں برہمی پیدا ہوئی کہ عثمان نے ایسا خط لکھا ہے۔ اور صحابۂ کرام غم واندوہ کے ساتھ اپنے اپنے گھر گئے۔[1]

برہمی کا بڑا سبب یہ ہے کہ کسی مسلمان کو ناحق قتل کر دینے کا آرڈر لکھنا صحابۂ کرام کے لئے ناقابل برداشت بات ہے، پھر محمد بن ابی بکر کے متعلق ایسا آرڈر، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فرزند دل بند کے قتل ناحق کا آرڈر! اس سے دلوں میں غم وغصہ کا ہیجان پیدا ہوا۔

ضرورت تھی کہ معاملہ کی صحیح تحقیق کی جائے لیکن ہیجان کے وقت اس کا دھیان کس کو رہتا ہے۔ اگر واقعی کوئی بھی تحقیقات نہ کرتا تو دنیا حضرت عثمان جیسے نیک صفات خلیفۂ راشد کو کیا کہتی؟ اور تاریخ اسلام کس رنگ روپ میں نمایاں ہوتی؟

لیکن حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا تاریخ اسلام پر بہت بڑا احسان ہے کہ آپ نے واقعہ کی صحیح تحقیقات فرما کر ایک طرف دنیا کو یہ حقیقت ذہن نشین فرمادی کہ "عثمان بے قصور ہیں، ایسے ظالمانہ آرڈر سے ان کو کوئی تعلق نہیں اور یہ ان کا لکھا ہوا مکتوب نہیں" دوسری طرف تاریخ اسلام کو خلیفۂ راشد حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کو ایک ظالم خلیفہ کی شکل میں پیش کرنے سے بچا لیا۔ تفصیل یہ ہے کہ:

اس خط کے پڑھے جانے کے بعد حضرت علی اور بزرگوں کی طرح غم وغصہ سے لبریز ہو کر گھر نہیں چلے گئے بلکہ حضرت طلحہ، زبیر، سعد ابن ابی وقاص، عمار، اور متعدد بدری صحابہ کو بلایا اور انھیں لے کر حضرت عثمان کے پاس تشریف لے گئے۔ تحقیقات کے لئے اس خط کو، اور لے جانے والے غلام اور اس اونٹ کو بھی ساتھ لے لیا جس پر یہ جا رہا تھا اور حضرت عثمان سے گفتگو کی، جس سے معاملہ کی پوری تحقیقات ہو رہی ہے۔ گفتگو حسب ذیل ہے۔

---

[1] یہاں تک تاریخ الخلفا کی عبارت کا ترجمہ ہے۔ ۱۲ کوثر

حضرت علی : یہ آپ کا غلام ہے ؟

حضرت عثمان : جی ہاں ۔

حضرت علی : یہ اونٹ (جس پر غلام سوار ہو کر گیا ہے) آپ کا ہے ؟

حضرت عثمان : جی ہاں ،

حضرت علی : یہ خط (جسے لے کر یہ غلام اونٹ پر جا رہا تھا) آپ نے لکھا ہے ؟

حضرت عثمان : نہیں، بخدا نہ میں نے لکھا ہے، نہ لکھنے کا حکم دیا ہے نہ مجھے اسکا علم ہے۔

حضرت علی : لیکن اس پر تو مہر آپ ہی کی ہے ؟

حضرت عثمان : جی ہاں مہر میری ہے ۔

حضرت علی : آپ کا غلام آپ کے اونٹ پر سوار ہو کر اس خط کو لے کر جس پر آپ کی مہر ہے بلا آپ کے علم کے کیسے گیا۔ ؟

حضرت عثمان نے اللہ کی قسم کھا کر بیان دیا کہ نہ تو میں نے یہ خط لکھا ہے نہ لکھنے کا حکم دیا ہے، نہ اس غلام کو مصر بھیجا ہے ۔

اب دیکھا گیا کہ خط میں کس کی رائٹنگ ہے۔ شناخت کی گئی کہ مروان کی رائٹنگ ہے ۔ صحابۂ کرام جو حضرت علی کے ساتھ تحقیقات میں گئے تھے مطمئن ہو گئے کہ عثمان جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے، اب حضرت عثمان سے کہا۔ مروان کو ہمیں حوالہ کر دو، حضرت عثمان نے محسوس فرمایا کہ جوش میں لوگ مروان کو قتل کر دیں گے اور اسلام میں اس جرم کی سزا قتل نہیں ہے۔ لہٰذا مروان کا حوالہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور فرمایا، میں ایسا نہیں کر سکتا، حالاں کہ مروان اس وقت آپ کے مکان میں موجود تھا۔[۲]

مروان کے حوالہ نہ کرنے پر گو حضرات صحابۂ کرام ناراض ہو کر حضرت عثمان کے پاس سے واپس گئے، لیکن انہیں یہ اطمینان تھا کہ حضرت عثمان کی بات غلط نہیں، کہ وہ جھوٹی قسم نہیں کھا سکتے۔[۳]

تحقیقات مرتضوی کی بنا پر شریف اور نیک مزاج لوگوں کو باور ہو گیا کہ حضرت عثمان

۱۔ پوری تحقیقات تاریخ الخلفاء ص ۱۱۲ سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ کوثر ۲۔ تاریخ الخلفاء ص ۱۱۲ ۔ کوثر ۔

خط کے معاملہ میں بے گناہ ہیں۔ اور ان کا دامن اس جرم سے پاک ہے۔ اب جو کچھ شکایت تھی مروان سے تھی جسے حضرت عثمان پیش بینی کی بنا پر حوالہ نہیں کر رہے تھے۔ اس میں حضرت عثمان کی نظر اس مصلحت پر تھی کہ جوش میں مروان کو قتل کر دیا جائیگا، جو شرعاً جائز نہیں۔ ظاہر ہے کہ حضرت عثمان کی صوابدید برحق ہے۔ لہٰذا ان کے خلاف کسی اقدام کی گنجائش نہیں۔

لیکن عوام نے یہ مطالبہ کرنا شروع کر دیا کہ جب تک عثمان مروان کو حوالہ نہ کرینگے معاملہ پوری طرح صاف نہ ہوگا۔ عثمان مروان کو حوالہ کریں۔ اب ہم تحقیقات کریں گے کہ اس نے یہ خط کیوں لکھا؟ اگر ثابت ہوا کہ یہ خط عثمان نے لکھوایا ہے تو ان کو معزول کرینگے، اور اگر خود مروان نے اپنی طرف سے لکھا ہے تو مروان پر جو مناسب کارروائی ہوگی وہ کرینگے[1]

حضرت علی نے اس قسم کی باتوں کی ضرورت نہیں سمجھی کہ ان کی تحقیقات کا نتیجہ سامنے آگیا کہ حضرت عثمان کا دامن جرم سے پاک ہے۔ اب رہا یہ معاملہ کہ حضرت عثمان مروان کو حوالہ کیوں نہیں کر رہے ہیں؟ حضرت علی جیسے عدیم المثال، معاملہ فہم کی نگاہوں سے یہ حقیقت چھپی ہوئی نہیں ہے کہ حضرت عثمان کی پیش بینی صحیح ہے، نیز حضرت عثمان امیرالمومنین ہیں اگر وہ اپنی صوابدید کی بنا پر مروان کو حوالہ کرنا مناسب نہیں سمجھتے تو خلیفۂ وقت کے فیصلہ کا احترام کرنا چاہیئے۔ ان دونوں اسباب کی بنا پر حضرت علی تو خیر باب الحکمۃ ہیں، ہم جیسے لوگ بھی یہی کہیں گے کہ حضرت عثمان پر دباؤ ڈالنے کی ضرورت نہیں۔

لیکن عوام مروان کو حوالہ کرنے کے مطالبہ پر اڑ گئے۔ مطالبہ نے مظاہرہ اور احتجاج کی شکل اختیار کی اور احتجاج نے شدت پکڑی حتّٰی کہ خلیفۂ مظلوم کو قتل کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

احتجاج کرنے والوں میں اہل مصر کے علاوہ عراق کے لوگ بھی تھے، جو اپنے یہاں کے گورنر کے مظالم کی شکایت لے کر آئے تھے، ان لوگوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ انکی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ مدینہ منورہ کے باشندے ان کا کچھ نہ کر سکے، مزید برآں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اہل مدینہ سے برابر فرماتے رہے، میری حمایت میں کوئی آدمی مدینۂ رسول میں تلوار نہ اُٹھائے۔ اس طرح

---

[1] تاریخ الخلفاء ص ۱۱۲ ۔

محاصرہ کرنے والے اپنے خلاف کسی جنگی طاقت کو نہ پاکر اپنے منصوبے پورے کرتے گئے۔ چنانچہ حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کر کے گھر والوں کو باہر نکلنے اور ضروریات زندگی کو اندر لے جانے کی آزادی سے محروم کر دیا۔ بڑی ضرورت پانی کی تھی۔ بلوائیوں نے پانی بھی اندر جانے نہیں دیا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو اس کی اطلاع ملی تو آپ نے تین مشک پانی روانہ فرمایا بلوائی مزاحم ہوئے اور پانی لے جانے والوں کو بھی زخمی کیا، لیکن بنی ہاشم نے جان پر کھیل کر پانی پہونچایا۔ حضرت علی کو حضرت عثمان کے ان مصائب سے بے حد تکلیف ہوئی۔ کئی بار اپنے کاشانۂ مبارک سے نکل کر بلوائیوں کو سمجھانے کے لئے تشریف لے گئے اور ہر طرح سمجھایا مگر ظالم یہ طے کر چکے تھے کہ کسی کی نہ سُنیں گے۔ بالآخر آپ غصہ میں اپنا عمامۂ مبارک پھینک کر یہ کہتے ہوئے واپس گئے کہ ظالموں تم لوگوں نے جو صورت اختیار کی ہے وہ نہ صرف اسلام بلکہ انسانیت کے بھی خلاف ہے۔ اللہ کی پکڑ سے بھی ڈرو۔

مگر یہ ظالم یہی کہتے رہے کہ "یا تو عثمان خلافت چھوڑ دیں کہ اس کے اہل نہیں، یا مروان کو حوالہ کریں، کہ اس نے جو ظالمانہ خط لکھا ہے اس کی سزا دی جائے"

اب بلوائی حضرت علی کے بھی درپے ہو گئے۔ اور آپ پر بھی بندش لگادی، چنانچہ جب حضرت عثمان نے آخری مرتبہ آپ کو کاشانۂ خلافت میں بلایا اور آپ نے جانا چاہا تو ظالموں نے آپ کو زبردستی روک لیا۔ اور کسی طرح نہ جانے دیا۔ بالآخر آپ نے اپنا عمامہ اتار کر قاصد کو دیا، اور فرمایا جو حالت ہے دیکھ لو اور جا کر کہہ دو۔

بلوائیوں کے اتنے تشدد کے بعد یہی صورت رہ گئی تھی کہ مدینہ منورہ میں جو صحابۂ کرام موجود ہیں مثلاً حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد وغیرہ وہ بلوائیوں کے خلاف اس قوت سے کام لیں جس کے ہاتھ میں تلوار ہے، لیکن صحابۂ کرام مدینہ منورہ میں ایسا کر ہی نہیں سکتے تھے۔ انکے سامنے حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے یہ ارشادات ہیں۔

۱۔ اللّٰھم ان ابراھیم حرم مکہ و — یا اللہ ابراہیم نے مکہ کو حرم بنایا ہے اور میں

انی حرمت المدینۃ حرا ما ما بین مازمیھاان لایھراق دم، ولا یحمل فیھا سلاح تقتال۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۴۳)	نے مدینہ کو حرم بنایا، مدینہ کے دونوں کناروں کے پہاڑوں کے درمیان جو خطہ ہے وہ حرم ہے یہاں خون نہ بہایا جائے، اور لڑنے کے لئے ہتھیار نہ اٹھائے جائیں۔
۲۔ المدینۃ حرم مابین عیرا الی ثور، فمن احدث فیھا حدثا او اوی محدثا فعلیہ لعنۃ اللہ والملئکۃ والناس اجمعین، لا یقبل اللہ منہ یوم القیامۃ صرفا ولا عدلا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۴۴۲)	مدینہ عیر پہاڑ سے لے کر احد پہاڑ تک حرم ہے اس میں جو شخص بھی خون ریزی اور خلاف شرع کام کرے گا یا اس کے مرتکب کو جگہ دے گا اس پر اللہ کی بھی لعنت ہے اور فرشتوں کی بھی اور تمام انسانوں کی بھی، اللہ ایسے شخص کا نہ تو فرض قبول فرمائے، نہ کوئی نفلی عبادت۔

یہ دوسری حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے۔ آپ کی نگاہوں میں یہ اتنی اہم ہے کہ جن خاص حدیثوں کو آپ نے قلم بند فرمایا تھا، ان میں یہ حدیث بھی ہے، آپ کا لکھا ہوا یہ حدیثی مجموعہ بڑی اہمیت رکھتا ہے، اور حدیث کا بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔ کتب حدیث میں ہے کہ آپ اس کو اپنی تلوار کے نیام میں لٹکا کر رکھتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نیام دیکھتے ہی یاد آجائے کہ مدینہ منورہ میں خون بہانا گناہ عظیم ہے، جس پر اللہ اور فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہے جیسا کہ حدیث میں ہے۔

حدیث کی اس زبردست تاکید کی بنا پر شیر خدا بلوائیوں کے خلاف کسی جنگی طاقت سے کام نہ لے سکے۔ اور اسی بنا پر مدینہ کے اور صحابۂ کرام بھی اس کی جسارت نہ کر سکے۔ اگر یہ حضرات تلوار باندھ کر بلوائیوں کے مقابلہ میں کھڑے نہیں ہوئے تو یہ ان کا تقویٰ، حرم مدینہ کا احترام اور ارشاد رسول کی تعمیل ہے، اور اگر معاذ اللہ یہ بھی تلوار سے کام لیتے تو حرم مدینہ کی بے حرمتی کے مرتکب ہوتے، اور بلوائیوں پر حدیث میں لعنت ہے۔ اب یہ میدان میں نہیں آئے تو ان کی مجبوری

دیکھو کتنی بصیرت کی بات فرمائی ہے، علامۂ تابعین حضرت سعید بن مسیب نے :۔

قتل عثمان مظلومًا، ومن قتلہ کان ظالمًا، ومن خذلہ کان معذورا ۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۱۲)	عثمان مظلوم مارے گئے، جس نے ان کو قتل کیا وہ ظالم ہے۔ اور وہ (صحابہ وغیرہ) معذور ہیں جو (مسلح بلوائیوں کے مقابلہ میں) ان کی مسلح مدد کے لئے نہیں اُٹھے۔

حضرت عثمان کے سامنے بھی یہ حقیقت تھی کہ مدینہ منورہ حرم نبوی ہے یہاں تلوار نہیں اُٹھانی چاہیئے۔ طبقات ابن سعد (ج ۳ ق اول ص ۴۸) میں ہے کہ :

حضرت زید ابن ثابت انصار کی جماعت لے کر حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور بلوائیوں کے مقابلہ کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا: "میں جنگ کی اجازت نہ دوں گا۔"

حضرت عبداللہ بن زبیر نے بھی اس کی اجازت طلب کی، آپ نے فرمایا: میں خدا کی قسم دلاتا ہوں کہ میرے لئے خونریزی نہ کی جائے۔

یہ سب اسی لئے ہے کہ آپ کے سامنے ارشاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے کہ مدینہ حرم ہے یہاں خونریزی نہ کی جائے۔ اس قسم کی حدیثوں کی بنا پر حضرت علی اور اکابر امت اگرچہ حضرت عثمان کی کوئی مسلح مدد کرنے سے معذور رہے، لیکن اس کے علاوہ آپ کے تحفظ کی جو امکانی صورتیں تھیں صحابۂ کرام نے اختیار فرمائیں۔ حضرت علی اس معاملہ میں بھی سب سے آگے رہے۔ چنانچہ محسوس فرمایا کہ عثمان کی حفاظت کی سب سے مؤثر اور مفید تر صورت یہ ہے کہ حسنین کو ان کے مکان کے دروازہ پر حفاظت کے لئے کھڑا کر دیا جائے کہ کوئی کلمہ گو نبی کے ان فرزندوں کو مار کر اندر جانے کی کوشش کر ہی نہیں سکتا، اس کے مدنظر آپ نے حسنین عظیمین کو حضرت عثمان کے دروازہ پر حفاظت کے لئے کھڑا کر دیا۔ اور صحابۂ کرام نے بھی اس تدبیر کو اختیار فرمایا چنانچہ حضرت طلحہ نے اپنے صاحبزادے محمد کو، حضرت زبیر نے اپنے صاحبزادہ حضرت عبداللہ کو یہاں تعینات کر دیا۔ اور حضرت محمد بن مسلمہ وغیرہ بھی حفاظت کے لئے یہاں آگئے۔

اس کا فائدہ بھی ہوا چنانچہ کوئی بلوائی پھاٹک سے مکان کے اندر نہ جا سکا۔ اب بلوائیوں میں سے تین شخص دوسری طرف گئے، اور وہاں ایک شخص کے مکان میں جاکر اس کی دیوار سے حضرت عثمان کے صحن میں اترے اور ان میں سے ایک شخص نے اس پیکر صبر و تحمل کو شہید کر ڈالا۔ اس کو شہید کیا کہ جو ذی النورین تھا، نبی کا داماد تھا، مسلمانوں کا محسن تھا۔

وہ تین شخص جو حضرت عثمان کے گھر میں گھسے تھے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق کے صاحبزادے حضرت محمد بھی تھے۔ انھوں نے آپ کی داڑھی پکڑ کر کچھ گستاخانہ الفاظ بھی کہے تھے، لیکن حضرت عثمان نے کچھ ایسی گفتگو فرمائی جس کا بڑا اثر پڑا، اور فوراً نادم ہو کر واپس چلے گئے۔

امیر المومنین کو کس نے شہید کیا؟ آج تک اس کا صحیح علم نہ ہو سکا کیونکہ اس وقت گھر کا کوئی آدمی آپ کی بیوی کے سوا آپ کے پاس نہ تھا۔ سب چھت پر بلوائیوں کی دیکھ بھال کے لئے تھے اور آپ کی بیوی قاتل کو نہیں پہچانتی تھیں۔

حضرت عثمان کی شہادت ۱۸ ذی الحجہ یوم جمعہ ۳۵ھ میں ہوئی، اس وقت آپ کی عمر شریف ۸۲ سال کی تھی، مدت خلافت چند روز کم بارہ سال ہے۔ جیسا کہ اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۲۸۵ میں جامع الاصول کے حوالہ سے مذکور ہے، آپ کی شہادت یوم جمعہ کو ہوئی۔ پورا دن گذر گیا اور دوسرے دن سنیچر کو بھی میت بے گور و کفن رہی کہ بلوائیوں نے پورے مدینہ میں ہراس پھیلا دیا تھا، سب کو جان کا خطرہ تھا، سنیچر کو مغرب بعد سترہ آدمیوں نے جان پر کھیل کر نماز جنازہ پڑھی اور لاش مطہر دفن کی۔

خلافت مرتضوی

حضرت عثمان کی شہادت کے بعد تین روز تک مسلمان بلا خلیفہ کے رہے، لیکن خلافت کا قیام وقت کا سب سے بڑا فریضہ ہے۔ جتنے بدری صحابہ زندہ تھے وہ سب اور مدینہ کے تمام انصار

ومہاجرین جن میں حضرت طلحہ وزبیر بھی تھے، حضرت علی کی خدمت میں حاضر ہوئے اور گذارش کی کہ "آپ ہی کی ذات ہے جو خلافت کی سب سے زیادہ مستحق ہے، ہاتھ بڑھائیے، ہم سب بیعت کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

آپ نے فرمایا: "آپ لوگ کسی اور کو منتخب کیجیے، جس کو منتخب کریں گے میں بھی اس کو خلیفہ مانوں گا۔"

ان حضرات نے عرض کی: "آپکی موجودگی میں کوئی دوسرا اس منصب کا مستحق نہیں، لہٰذا آپ کے علاوہ ہم لوگ کسی دوسرے کو منتخب کر ہی نہیں سکتے۔"

آپ نے پھر معذرت کی اور فرمایا "مجھے خلیفہ ہونے کے بجائے مشیر ہونا پسند ہے۔"

لیکن ان بزرگوں نے بااصرار عرض کیا کہ "ہم لوگ آپ ہی کے ہاتھ پر بیعت کریں گے اور کسی کے ہاتھ پر کر ہی نہیں سکتے کہ آپ کے سوا کوئی دوسرا اس منصب کے مستحق ہی نہیں۔"

ان بزرگوں کے بشدّ اصرار پر آپ نے منصب خلافت کو قبول فرمایا کہ اب اس کے بغیر نظام اسلامی قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اور مجمع عام میں مدینہ کے تمام حضرات نے آپ کی بیعت کی۔

اور تمام عالم اسلامی نے آپ کی بیعت کی۔ صرف امیر معاویہ اور ان کی پارٹی نے اختلاف کیا۔

فتح الباری ج ۷، ص ۵۱ باب مناقب علی میں ہے۔

کانت بیعۃ علی بالخلافہ عقب قتل عثمان فی اوائل ذی الحجۃ سنۃ خمس وثلاثین فبایعہ المہاجرون والانصار وکل من حضر وکتب بیعتہ الی الآفاق فاذعنوا کلھم الا معاویۃ فی اھل الشام

قتل عثمان کے بعد ذی الحجہ ۳۵ھ کے اوائل میں حضرت علی کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی گئی اور مہاجرین والانصار اور تمام حاضرین مدینہ نے بیعت کی اور آپ نے عالم اسلامی میں ہر طرف بیعت کے لئے خطوط لکھے اور سب لوگوں نے آپ کی خلافت تسلیم کی اور اطاعت کی، بجز معاویہ اور ان کے شامی ساتھیوں کے۔

بیعت خلافت کے بعد حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا سب سے پہلا کام

بیعت عام کے بعد حضرت علی نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ حضرت عثمان کے قاتل کو سزا دینے کے لیے قاتل کی تحقیق شروع فرمائی۔ چنانچہ آپ حضرت عثمان کی بیوی نائلہ کے پاس تشریف لے گئے[1] اور فرمایا عثمان کو کس نے قتل کیا ہے؟ انھوں نے کہا میں نہیں جانتی۔ البتہ محمد بن ابی بکر اور دو شخص گھر میں گھسے تھے جن کو میں نہیں پہچانتی، محمد ابن ابی بکر نے امیر المومنین کی داڑھی پکڑ کر کچھ گستاخی کی باتیں کہی تھیں، لیکن امیر المومنین نے جب یہ کہا کہ صاحبزادے اگر تمھارے والد ابوبکر زندہ ہوتے تو تمھاری اس روش کو پسند نہ کرتے" اس کو سُن کر محمد ابن ابی بکر واپس چلے گئے۔ پھر ان دونوں آدمیوں نے امیر المومنین کو قتل کر ڈالا۔

کوئی شرعی گواہ نہیں کہ حضرت عثمان کا قاتل کون ہے؟

اب حضرت علی نے محمد ابن ابی بکر کو بکڑا کر بولو نائلہ کیا کہتی ہیں؟ اور وہ دونوں کون شخص تھے؟ محمد بن ابی بکر نے کہا وہ سچ کہتی ہیں، واقعی میں نے عثمان کی داڑھی پکڑی تھی لیکن ان کی اس گفتگو سے متاثر ہو کر فوراً واپس چلا آیا، جیسا کہ نائلہ کا بیان ہے، اور میں اللہ کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ ان دونوں شخصوں کو میں نہیں پہچانتا (جن کو نائلہ قاتل کہتی ہیں) اور میں ان کے نام بھی نہیں جانتا، اور میں نے عثمان کی جو گستاخی کی ہے اس سے تائب ہوں۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے قاتل کا پتہ چلانے کی امکانی کوشش فرمائی، لیکن کوئی شہادت نہ مل سکی کہ قاتل کون ہے؟ حضرت عثمان کی شہادت کے وقت ان کی بیوی نائلہ کے سوا کوئی شخص وہاں موجود ہی نہ تھا۔ گھر کے سب لوگ چھت پر تھے کہ بلوائی چڑھنے نہ پائیں۔ حضرت

---

[1] یہاں سے پہلا اور دوسرا پیراگراف تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ کوثر

محمد بن ابی بکر شہادت سے پہلے ہی واپس جاچکے تھے، جس کی تصدیق حضرت نائلہ نے کی ہے۔ اور وہ دو شخص جن کو نائلہ قاتل کہہ رہی ہیں ان کو وہ نہیں پہچانتیں اور کسی دوسرے نے دیکھا ہی نہیں۔ کہ کس نے قتل کیا ہے۔ حضرت محمد حلفیہ بیان دے رہے ہیں کہ بخدا میں بھی ان دونوں کو نہیں پہچانتا کہ کون ہیں اور کیا نام ہے اور وہ حضرت عثمان کی شہادت کے وہاں موجود بھی نہ تھے۔

اب کس کو قاتل مانا جائے

اب قاتل کون ہے؟ چشم دید گواہ کوئی بھی نہیں پھر کس کو قاتل مانا جائے؟ اور کس کو پکڑا جائے؟

کیا تمام بلوائیوں کو پکڑ کر اور زدوکوب کرکے قاتل کا سراغ لگایا جائے۔؟

مدینہ منورہ میں جتنے مہاجرین و انصار ہیں بلوائیوں کی تعداد ان سے زیادہ ہے اور ان کی طاقت پورے مدینہ پر مسلط ہے۔[1] ایسی صورت میں ان کو گرفتار کرکے زدوکوب کرنے کا سوال ہی کیا؟ اس وقت سب سے بڑی ضرورت اس کی تھی کہ "قصاص عثمان" کی تحریک اٹھانے کے بجائے خلیفۂ اسلام امیر المومنین حضرت علی مرتضیٰ کی اطاعت کی جاتی، اور جو لوگ "قصاص عثمان رضؓ" کے طالب ہیں وہ حضرت علی کے دست و بازو بن کر بلوائیوں پر حاوی ہو جاتے اس طرح "قصاص عثمان" لیا جا سکتا تھا۔ اور اس کی بس یہی ایک صورت تھی۔ خود حضرت علی رضؓ نے بھی "قصاص عثمان رضؓ" کی تحریک اٹھانے والوں سے فرمایا تھا کہ "پہلے خلیفۂ وقت کی اطاعت کرو، اس کی طاقت کو مضبوط بنا کر بلوائیوں پر حاوی ہو جاؤ پھر "قصاص عثمان رضؓ" لیا جا سکتا ہے"۔ لیکن افسوس کہ اس کلمۂ حق کو قبول نہیں کیا گیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحریک قصاص ہزاروں کا خون پی

---

[1] حضرت طلحہ و زبیر جنہوں نے "قصاص عثمان رضؓ" کی تحریک اٹھائی ہے خود ان کا بھی بیان ہے کہ بلوائیوں کے مقابلہ میں اہل مدینہ کو اپنی حفاظت کی طاقت نہیں (طبری ج ۶ ص ۳۰۹۵) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جو اس تحریک کی ایک محرکہ ہیں وہ بھی فرماتی ہیں کہ: اہل مدینہ کو بلوائیوں سے بچنے کی نہ طاقت ہے، نہ وہ ان سے محفوظ ہیں۔ (طبری ج ۶ ص ۳۱۱۶)۔ کوثر

گئی پھر بھی قاتل کا پتہ نہ چلا سکی اور جس کا نام قصاص ہے وہ نہ ہو سکا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے قاتل کا پتہ چلانے کی پوری امکانی کوشش فرمائی، لیکن قاتل کون ہے؟ اس کی کوئی شرعی شہادت نہ مل سکی اور ایک متنفس بھی بتا نہ سکا کہ قاتل فلاں شخص ہے یا فلاں فلاں اشخاص ہیں۔

بلوائیوں کو گرفتار کر کے اور زد و کوب کر کے قاتل کا پتہ چلانے کا امکان ہی نہیں جیسا کہ مفصل مذکور ہوا۔

اب قصاص کی صرف ایک صورت رہ جاتی ہے، وہ یہ ہے کہ جس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو قتل کرنے کا شبہ ہوا سے پکڑ کر قتل کر دیا جائے۔

لیکن ایسا کیا ہی نہیں جا سکتا کہ یہ فعل اسلامی شریعت میں بہت بڑا جرم ہے۔

اور کیا خلیفۂ برحق شبہ میں کسی کو قتل کر سکتا ہے؟

اگر ایسا کیا گیا تو خلیفۂ رسول اور مطلق العنان بادشاہِ ظالم میں فرق ہی کیا رہا؟ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ جیسے مجسم عدل و انصاف اور پیکرِ حق و تقویٰ سے اسکی امید ہی کیوں رکھی جائے؟ یہاں یہ حقیقت بھی ملحوظ رکھنی چاہئیے کہ صرف اصلی قاتل یعنی جس نے اپنے ہاتھوں سے قتل کیا ہے اسی سے قصاص لینے کا حکم ہے اور جو ایسا نہیں اس سے قصاص لینے کا حکم نہیں بلکہ اسے قید کرنے کا حکم ہے۔ حدیث میں ہے۔

اذا امسك الرجل الرجل و قتله الاٰخر يقتل الذى قتل ويحبس الذى امسك	اگر ایک شخص نے کسی آدمی کو پکڑ لیا، اور دوسرے نے قتل کر دیا تو جس نے قتل کیا ہے اسی کو قتل کیا جائے گا اور جس نے پکڑا ہے اسے قید کیا جائے گا۔
(بلوغ المرام ص ۱۴۸)	

ان تمام حقائق پر سنجیدگی سے غور کرنے والا دماغ اور معقولیت پسند انسان یہی کہے گا کہ:

"قصاص عثمانؓ" کی تحریک غیر آئینی اور بے ضابطہ ہے اور اس تحریک نے خلیفۂ برحق کی اطاعت کے بجائے ان کے خلاف جو محاذ قائم کیا ہے اس کی بنیاد ہی اسلامی آئین کے خلاف ہے اور حق سے دور[1] ہے۔ اس محاذ نے امت میں نہایت خطرناک انتشار وافتراق پیدا کر دیا جس کا وبال آج تک قائم ہے اور اسی محاذ نے اسلام میں خانہ جنگی کی ابتدا کی ہے۔

پھر قصاص کی تحریک قصاص لینے میں کسی طرح بھی کامیاب نہ ہو سکی۔ البتہ ایک خون کے بدلہ میں ہزاروں کا خون ہوا، اور جنگ جمل وصفین کے دردناک وغم انگیز نتائج مسلمانوں کے سامنے آکر رہے۔ پھر معاملہ روز بروز بڑھتا ہی گیا۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کی بدنصیبی کی ایسی ایسی آندھیاں اٹھیں کہ خلافت راشدہ کی آخری شمع کو بھی بجھا ہی کے مانا۔ اس چراغ نور کے گل ہوتے ہی مسلمانوں کی سیاست اندھیری ڈگر پر تہ بہ تہ ظلمتوں میں پڑ گئی۔ اور غلط روی کا شکار ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مختلف صدیوں اور زمانوں کی ہزاروں کوششوں کے باوجود آج تک مسلمانوں کی کوئی ایسی حکومت قائم نہ ہو سکی جس کا ہر شعبہ مشکوٰۃ نبوت کی روشنی میں کام کر رہا ہو یہ ہے آخری خلافت راشدہ سے محروم ہو جانے کا نتیجہ! جسے مسلمان آج تک بھگت رہے ہیں۔

خلافت مرتضوی کا قیام بڑے ہی عالم آشوب خلفشار کے زمانہ میں ہوا، اور آپکے خلاف بڑے بڑے فتنے اٹھے لیکن سب کے سب فتنے ہی تھے جنکے خلاف جنگ کرنیکا حکم ہے

اس نازک ترین زمانہ میں حق وباطل کے معرکے قدم قدم پر پیش آئے۔ ایک طرف

[1] اور یہ اتنی واضح حقیقت ہے کہ جب حضرت زبیر اور حضرت طلحہ رضی اللہ عنہما نے محسوس فرمایا کہ یہ محاذ (جو حضرت علی سے معرکہ آرا ہے) خلاف حق ہے تو اسے محسوس فرماتے ہی تائب ہو گئے اور محاذ اور اس کا میدان چھوڑ دیا۔ یہ ان کی بزرگی کا بہت بڑا ثبوت ہے، اللہ تعالیٰ ان بزرگوں پر اپنی رحمت کے پھول برسائے اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے جو اس میں حصہ لیا تھا، اس پر عمر بھر نادم رہیں، جب اس کی یاد آجاتی تو زار زار روتیں۔ رضی اللہ عنہا۔ ۱۲ کوثر

خلیفۂ برحق امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں دوسری طرف قصاص عثمان رضؓ کی تحریک ہے جو خلیفۂ برحق کے مقابل محاذ کھڑا کر رہی ہے۔ اس کا ایک میدان جنگ جمل کا میدان ہے جسمیں حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ جیسی بلند پایہ ہستیاں مغالطہ کھا جانے کی بنا پر خلیفۂ برحق حضرت علی کے خلاف فوج لئے نبرد آزما ہیں۔ اس کو جنگ جمل اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں حضرت عائشہؓ اونٹ پر سوار تھیں اور اونٹ کو عربی میں جمل کہتے ہیں۔ ان کی فوج اپنے کو اصحاب جمل کہتی تھی۔ حدیث میں ان کو ناکثین یعنی بیعت شکن فرمایا گیا ہے کہ ان لوگوں نے حضرت علی کی بیعت توڑ کر جنگ کی تھی۔

اس کا دوسرا میدان صفین کا میدان ہے جس میں امیر معاویہ اپنی فوج لئے خلیفۂ برحق سے جنگ کر رہے ہیں۔ حدیث میں ان کو باغی جماعت فرمایا گیا ہے۔ اور قاسطین یعنی ارباب ظلم بھی فرمایا گیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو حکم دیا ہے کہ ناکثین اور قاسطین اور مارقین سے قتال کرنا۔

ان کے بارے میں جمہور اہل سنت کا نقطۂ نظر

جیسے حدیث کا فیصلہ ہے کہ حق علی کے ساتھ ہے اور ان کے مخالفین ناحق ہیں، اسی طرح جمہور اہل سنت کا بیان ہے کہ سیدنا حضرت علی حق پر تھے اور اصحاب جمل نیز امیر معاویہ مع پارٹی حق کے خلاف تھے[1] اور حضرت علی سے ان کا لڑنا بغاوت ہے۔ یہاں

[1] لیکن حضرت طلحہؓ، حضرت زبیر اور حضرت عائشہ کو کچھ لوگوں نے اُلٹی سیدھی باتیں سُنا سُنا کر مغالطہ دیا تھا۔ حضرت زبیر کو جب سیدنا حضرت علی نے عین میدان جمل میں وہ حدیث یاد دلائی جس میں اس کا ذکر ہے کہ "اے زبیر تم ایک دن علی سے جنگ کرو گے اور اس میں ناحق پر ہو گے" تو ان پر اچھی طرح واضح ہو گیا کہ ہم لوگ حق سے دور ہیں۔ اور ناحق خلیفۂ برحق سے جنگ کر رہے ہیں پھر تائب ہوئے اور میدان جنگ چھوڑ کر چلے گئے۔ انہوں نے حضرت طلحہ کو بھی یہ حدیث سُنائی تو وہ بھی تائب ہوئے اور میدان چھوڑ کر جا رہے تھے کہ مروان نے کہا لڑائی چھوڑ کر ہٹ رہے ہو اور تیر مار کر شہید کر دیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ حضرت زبیر معرکۂ کارزار چھوڑ کر ایک سنسان مقام پر نماز پڑھ رہے تھے کہ ایک شخص نے ان کو بھی شہید کر دیا۔ =

فقہائے اسلام کے ملحوظات چار باتیں ہیں۔

۱۔ حضرت علی خلیفۂ برحق ہیں۔

۲۔ لہٰذا ان سے لڑنے والے باغی ہیں کہ جو لوگ برحق و عادل خلیفہ سے جنگ کریں، شرعاً باغی ہیں۔

۳۔ حضرت علی نے جو ان کے ساتھ معاملات کئے ہیں وہ باغیوں سے کئے جانے والے معاملات ہیں۔

۴۔ چونکہ حضرت علی امام واجب الاطاعۃ ہیں۔ لہٰذا ان کے طریقہ کو لینا لازمی ہے اس بنا پر ان کے وہ معاملات جو انھوں نے اہل بغاوت کے ساتھ کئے ہیں فقہائے اسلام نے ان کو اس باب کے آئینی احکام مانے ہیں اور انھیں معیار کی حیثیت سے پیش کیا ہے، ہدایہ (ج ۲ کتاب السیر ص ۵۸۹) میں ہے:

ولا يسبى لهم ذرية ولا يقسم — نہ باغیوں کی اولاد کو قید کیا جائے نہ ان کا مال

= رضی اللہ تعالیٰ عنہ، شہادت کے پہلے آپ نے حضرت علی کی جماعت کے ایک شخص کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا، تم علی کی طرف سے میری بیعت لو، اس طرح تجدید بیعت بھی کی۔

یہ حالات ثبوت ہیں کہ حضرت زبیر اور حضرت طلحہ بڑے نیک نفس انسان تھے۔ انہوں نے نفسانیت کی بنا پر جنگ نہیں کی تھی، بلکہ الٹی سیدھی سنا کر انھیں مغالطہ دیا گیا تھا، البتہ اصحاب جمل میں لوگ ایسے نہ تھے، اور ان میں سے کوئی بھی جنگ سے کنارہ کش نہیں ہوا۔ لہٰذا یہ بغاوت پر اڑے رہے اور باغی ہیں، لیکن حضرت طلحہ و زبیر نہ اس پر اڑے رہے نہ باغی ہیں۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

رہا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا معاملہ تو انھیں غلط غلط باتیں سنا کر حضرت علی کے خلاف بھر دیا گیا تھا پھر مقام حوءب میں انھیں احساس ہوا کہ علی کے خلاف حصہ لینا غلط روی ہے اور واپس جانا چاہتی تھیں کہ لوگوں نے غلط بیانی کر کے جانے نہیں دیا گو میدان جنگ میں تو حضرت علی کے خلاف لڑنے کی غلطی کا علم انھیں ہونے نہیں دیا گیا، لیکن بعد میں اچھی طرح ہو گیا اور اس پر عمر بھر نادم رہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ جنگ جمل کا تذکرہ ہوتا تو عائشہ زار زار روتیں اور کہتیں کاش آج سے بیس برس پہلے میں مر جاتی۔ نصب الرایہ ج ۴ ص ۷ میں استیعاب کے حوالہ سے ہے کہ حضرت عائشہ نے ابن عمر سے کہا۔ تم نے مجھے راہ جنگ میں جانے سے کیوں نہیں روکا؟ انھوں نے کہا کہ ایک شخص (یعنی ابن زبیر) آپ پر حاوی تھا، پھر مری کیا چلتی۔ حضرت عائشہ نے کہا، اگر تم مجھے اس راہ میں قدم اٹھانے سے روکتے تو بخدا میں قدم نہ اٹھاتی۔ یہ اس کا ثبوت ہے کہ حضرت عائشہ کو بڑا زبردست دھوکہ دیا گیا تھا ورنہ وہ یہ غلطی ہرگز نہ کرتیں اور ان سے حکم قرآنی وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ کی خلاف ورزی ہرگز نہ ہوتی۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہا۔ ۱۲ کوثر

لهم مال، لقول علیؓ یوم الجمل ولا یقتل اسیر، ولا یکشف ستر، ولا یوخذ مال وهو القدوة فی هذا الباب،

فوج پر تقسیم کیا جائے، کیوں کہ حضرت علی نے جنگ جمل کے روز فرمایا ہے "آج کسی قیدی کو قتل نہ کیا جائے، نہ ان کی کسی عورت کا پردہ ہٹایا جائے اور نہ ان کا مال لیا جائے"۔

● اور باغیوں کے باب میں حضرت علی مقتدا ہیں۔

اسی لئے باغیوں کے باب میں جتنے فقہی مسائل ہیں سب کا مآخذ حضرت علی کا وہ عمل اور ارشاد ہے جو آپ نے اصحاب جمل وغیرہ کے بارے میں فرمایا ہے، امام سرخسی نے مبسوط میں اس قسم کے متعدد مسائل لکھے ہیں اور ثبوت میں حضرت علی کے عمل یا ارشاد کو پیش کیا ہے۔ اور کئی جگہ تصریح کی ہے کہ اس باب میں امام مقتدا حضرت علی ہی ہیں۔ موصوف کے الفاظ یہ ہیں۔

أ۔ والامام فیه علی رضی الله عنه

(مبسوط ج ۱۰ ص ۱۲۴)

ا۔ باغیوں کے باب میں حضرت علی امام مقتدا ہیں۔

ب۔ وهو المتبع فی هذا الباب

(مبسوط ج ۱۰ ص ۱۳۱)

ب۔ باغیوں کے باب میں حضرت علی ہی کا اتباع کیا جاتا ہے۔

اسی بنا پر بعض مشائخ فقہ نے تصریح کی ہے کہ اگر حضرت علی نہ ہوتے تو ہم لوگوں کو علم ہی نہ ہوتا کہ اہل قبلہ سے کس طرح قتال کیا جائے۔

علامہ شامی رد المحتار (ج ۳ ص ۳۰۹) میں لکھتے ہیں۔

قال بعض المشائخ: لولا علی رضی الله عنه ما دری نا القتال مع اهل القبلة، وکان علی ومن تبعه من

بعض مشائخ فقہ[1] نے فرمایا ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ نہ ہوتے تو ہم لوگ نہ جانتے کہ اہل قبلہ سے قتال کی کیا صورت ہے ● اور حضرت

---

[1] فقہائے حنفیہ کی اصطلاح میں مشائخ ان اکابر فقہ کو کہتے ہیں جنہوں نے امام ابوحنیفہ کا زمانہ نہیں پایا ہے شامی (ج ۳ ص ۳۵۴) اس بنا پر امام ابویوسف امام محمدؒ امام زفر کے تلامذہ جو امام ابوحنیفہ کے بعد پیدا ہوئے مشائخ کہے جائیں گے۔ ۱۲ کوثر

اهل العدل وخصمه من اهل البغی ۔ — علی اور ان کے رفقا اہل عدل تھے۔ اور آپ کے مخالفین باغیوں میں تھے۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے۔

لولا علی لم نعرف السیرۃ فی الخوارج (شرح الفقہ الاکبر علی قاری ص ۶۳) — اگر حضرت علی نہ ہوتے تو ہم لوگ نہ جانتے کہ باغیوں کے ساتھ کون سی روش اختیار کرنی چاہیئے۔

حضرت علی نے اہل بغاوت سے جو قتال کیا ہے اسے خانہ جنگی کہنا بہت بڑی غلطی ہے

کیوں کہ باغیوں سے قتال کرنا فرض ہے اور امت پر یہی واجب ہے کہ امام کا ساتھ دے اور باغیوں سے قتال کرے۔ اس کی فرضیت قرآن سے ثابت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ۔ (الحجرات ع ۱) — اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے دوسری جماعت کے ساتھ بغاوت کی ہے تو باغی جماعت سے اس وقت تک قتال کرو جب تک یہ حکم الٰہی (یعنی اطاعت خلیفہ) کی طرف رجوع نہ کرے۔

یہ ارشاد قرآنی کہ "باغیوں سے قتال کرو" ایک حکم الٰہی ہے اور حکم الٰہی کی اصل حقیقت یہی ہے کہ اس کی تعمیل فرض ہے۔ اس بنا پر تمام فقہائے اسلام فرماتے ہیں کہ باغیوں سے قتال کرنا فرض ہے امام سرخسی نے اس کے فرض ہونے کو اور دلائل سے بھی ثابت کیا ہے اور اس پر مبسوط میں بڑی عمدہ بحث کی ہے یوں تو ہر خلیفۂ برحق کا فرض ہے کہ باغیوں سے قتال کرے، اور باغی وہ لوگ ہیں جو خلیفۂ برحق کے خلاف ناحق خروج کریں (ھم الخارجون علی الامام الحق بغیر حق۔ الدر المختار مع شامی ج ۳ ص ۳) لیکن اس باب میں حضرت علی کی ذمہ داری اوروں سے بڑھی ہوئی ہے کہ آپ کو رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بخصوصیت کے ساتھ حکم دیا تھا کہ ناکثین اور قاسطین اور مارقین[1] سے قتال کرنا۔ امام سرخسی حضرت علی کا قول نقل

[1] ناکثین اصحاب جمل ہیں، قاسطین امیر معاویہ اور ان کے اعوان و انصار ہیں اور مارقین مقام نہروان کے خارجی لوگ ہیں، جن کے متعلق حضور نے فرمایا ہے کہ اگر میں ان کو پاؤں گا تو عاد و ثمود کی طرح مٹا دوں گا۔ ۱۲ کوثر

کرتے ہیں کہ:

امرت بقتال المارقین، والناکثین، والقاسطین (مبسوط ج ۱۰ ص ۱۲۴)	مجھے مارقین، اور ناکثین، اور قاسطین سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔

یہ حدیث متعدد طرق واسناد سے مروی ہے اور متعدد ائمہ حدیث نے روایت کی ہے، مثلاً امام طبرانی نے معجم اوسط میں، محدث ابن عدی نے الکامل میں، حافظ عبد الغنی ابن سعید نے ایضاح الاشکال میں، امام ابو نعیم نے کتاب الحجہ میں، حافظ ابن مندہ نے غرائب شعبہ میں اور حافظ ابن عساکر نے متعدد طرق واسناد سے اپنی تاریخ میں غرض حدیث کے ان اماموں نے یہ حدیث حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے باسناد روایت کی ہے۔

نیز امام بزار نے اپنی مسند میں، امام طبرانی نے معجم اوسط میں ایک اور سند سے بڑے ہی واضح الفاظ میں اس حدیث کو روایت کیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

عن علی عہد الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی قتال الناکثین، والقاسطین والمارقین	حضرت علی سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے عہد لیا ہے کہ ناکثین اور قاسطین اور مارقین سے قتال کرنا۔

(مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۸۷)

غور کرو ان تینوں گروہوں سے قتال کرنا رسول پاک کی نگاہ میں اتنا اہم ہے کہ آپ حضرت علی سے عہد لیتے ہیں کہ ان سے قتال کرنا، اب ان سے قتال کرنے کی شرعی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ نکات ذیل پر غور کرو۔

۱۔ یہ قتال حکم الٰہی ہے جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ باغی جماعت سے قتال کرو۔

۲۔ اس بنا پر یہ فرض ہے، جس پر عمل نہ کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔

۳۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی حضرت علی کو اس کا حکم دیا ہے، جیسا کہ حدیث میں ہے۔ اس طرح یہ بڑا تاکیدی حکم ہے۔

۴۔ حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی سے اس قتال کا معاہدہ بھی لیا ہے، حضور کا معاہدہ توڑنا کتنی بڑی نافرمانی اور عدول حکمی ہے؟ حضور کا معاہدہ لینا بتارہا ہے کہ ان سے قتال کرنا حضور کا بہت بڑا منشا ہے۔

اب کون مسلمان ہے؟ جو حضرت علی کے اس قتال جنگ جمل و صفین و نہروان کو حد درجہ ضروری اور وقت کا بہت بڑا فریضہ نہ کہے گا اور کیا ایک مسلمان بھی اس قتال حیدری کو خانہ جنگی کہہ کر اپنی عاقبت خراب کرنے کا مرتکب ہونا پسند کرے گا۔؟ اس قتال پر ایک اور حدیث سُن لیجئے جس میں اس کی تشریح بھی ہے کہ قاسطین اور مارقین کون لوگ ہیں۔

عن علی قال: امرت بقتال ثلاثہ القاسطین، والناکثین، والمارقین فاما القاسطون فاھل الشام، و اما الناکثون فذکرھم، واما المارقون فاھل نھروان،

(یعنی الحروریۃ کنز العمال ص۔ح)

حضرت علی سے مروی ہے کہ مجھے تین طرح کے لوگوں سے قتال کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ وہ ہیں قاسطین اور ناکثین اور مارقین ● قاسطین اہل شام ہیں ● اور ناکثین کا بھی آپ نے ذکر کیا اور مارقین نہروان کے لوگ ہیں۔ یعنی حروری لوگ۔

حضرت علی کے خلاف جمل اور صفین کے میدان میں جو لڑائیاں ہوئی ہیں انکی بنیاد "قصاص عثمان" کی تحریک ہے۔

تقدیر کا لکھا! کہ حضرت عائشہ، حضرت زبیرؓ، حضرت طلحہ جیسے بزرگوں نے یہ تحریک اٹھائی کہ عثمان کا قصاص لو، لیکن حقیقت میں بنی امیہ نے ان تینوں حضرات کو مغالطہ دیکر یہ تحریک کھڑی کی تھی ان بلند پایہ ہستیوں کی قیادت سے اس میں بڑا جوش پیدا ہوگیا۔ بالآخر اس تحریک نے جنگ جمل میں دس بارہ ہزار سے زیادہ مسلمانوں کا خون کرایا۔

اس کے نتیجے میں جو عورتیں بیوہ اور جو بچے یتیم ہوئے تھے ابھی ان کا رونا پیٹنا بند نہیں ہوا تھا کہ امیر معاویہ نے یہ تحریک چلائی اور وہ صورت اختیار کی کہ تمام مولفۃ القلوب، قریش کے طلقا، جنگ جو بدو اور جاہل قبائل عرب نیز شام کے نو مسلم جو ابھی دین سے واقف نہ تھے، ان کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے۔ اس تحریک میں اس سے بڑا ہی جوش پیدا ہوا کہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا خون آلودہ پیراہن پبلک کو دکھا کر ہزاروں شامی ماتم کرتے اور قصاص عثمان کا نعرہ لگاتے جس سے کچھ سادہ لوح مسلمان بھی متاثر ہوئے اور تحریک میں حصہ لیا۔

اب اس تحریک کا معرکۂ قتال صفین کا میدان بنا جہاں اس نے ستر ہزار سے زیادہ مسلمانوں کی گردنیں کٹوائیں اور کچھ فتنے آئندہ کے لئے چھوڑ رکھے۔
کس قدر خطرناک اور کس قدر مہلک تھی یہ تحریک۔

اس سے سبق ملتا ہے کہ حضرت علی جیسے سراپا ایمان و تقویٰ خلیفۂ برحق کے خلاف کوئی تحریک اٹھانا حد درجہ خطرناک ہے۔ اور اس کے نتائج حد درجہ قیامت خیز ہیں، کاش مسلمان اب کسی خدا ترس، پاکباز، عادل اور منصف مزاج فرماں روا کے خلاف ایسا اقدام نہ کریں، بلکہ قدر کریں ایسے نیک انسانوں کی، اسی میں دین و دنیا کی عافیت ہے۔

اس قیامت خیز تحریک کے زمانہ میں صرف ایک ذات تھی جس کی بدولت نظام حق اپنی جگہ قائم تھا، وہ تھی حضرت علی کی ذات پاک

سیدنا عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کے وقت بلکہ ان کے محاصرہ کے زمانہ ہی سے عالم اسلامی میں انقلاب عظیم کا طوفان برپا تھا، لیکن جب ان کے قصاص کی تحریک اٹھی تو یہ انقلاب سیکڑوں ہزاروں درجہ آگے بڑھ گیا۔ کہ اس وقت صرف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی جان گئی تھی اور اب اسی ہزار سے زیادہ مسلمانوں کی جانیں جا چکی ہیں، مگر طوفان کا جوش و خروش اپنی جگہ قائم ہے۔

ایسے ہی قیامت خیز زمانہ میں سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو خلافت راشدہ چلانا، اور نظام حق کو قائم رکھنا تھا۔ آپ کا یہ کمال حیرت انگیز ہے بلکہ قدرت کا ایک معجزہ ہے کہ اس ہوش ربا زمانہ میں خلافت راشدہ کو قرآن و حدیث کے قائم کئے ہوئے خطوط سے بال برابر ہٹنے نہیں دیا۔ اور نظام حق عہد رسالت کی طرح اس وقت بھی ٹھیک اپنے محور ہی پر گھومتا رہا، جس کی بدولت آج ہم لوگ اسلام کو اصلی شکل میں پا سکے۔ غور کر واس زمانہ میں جو کہ خلافت راشدہ کا عہد اور اصحاب بدر کا زمانہ تھا۔ اگر نظام اسلامی میں تبدیلی ہو جاتی تو بعد میں کس کو طاقت تھی کہ اس کو اصلی شکل میں لاتا اور اس کا کیا جواب تھا کہ خلافت راشدہ اور اصحاب بدر نے اسے گوارا کیا ہے۔ کیا ایسی صورت میں اسلام اپنی اصلی شکل میں موجود رہ سکتا تھا۔؟

درحقیقت اس قیامت خیز زمانہ میں جب کہ سیاسی مصلحتیں نظام اسلامی میں بہت سی تبدیلیوں کی دعوت دے رہی تھیں۔ حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے علاوہ ایک متنفس بھی خلافت سنبھالنے کے لئے موزوں نہ تھا۔

اس وقت یہ دعوت دی جارہی تھی کہ :

جتنے لوگوں نے حضرت عثمان کے مکان کا محاصرہ کیا ہے سب کو قتل کر ڈالو۔ امیر معاویہ کہہ رہے تھے کہ یا تو ان سب کو مار ڈالو یا ہمارے پنجۂ انتقام کے حوالہ کرو۔ اس کے بعد تمہاری بیعت کرنے کو تیار اسی قسم کی باتیں اور لوگ بھی بول رہے تھے۔

اگر سیدنا علی مرتضیٰ ایسا کرتے تو اس میں کیا شبہ کہ حضرت طلحہ و زبیر اور امیر معاویہ وغیرہ سب آپ کے اطاعت گذار ہو جاتے، اور آپ کی زندگی بڑی پرسکون ہو جاتی، لیکن کیا اس سے نظام عدل اپنی جگہ قائم رہ سکتا تھا۔؟

خون کے بارے اسلام کا نظام عدل یہ ہے :

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ	اے ایمان والو جو لوگ قتل کر دیئے جائیں، ان کے
الْقِصَاصُ فِی الْقَتْلٰی ؕ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ	قصاص کا حکم تم پر لکھ دیا گیا ہے۔ اگر آزاد کو آزاد

وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰی بِالْاُنْثٰی ط
(بقرہ ع ۲۲)

نے قتل کیا ہے تو بدلہ میں اسی آزاد کو قتل کیا جائے، اگر غلام کو غلام نے قتل کیا ہے تو بدلہ میں اسی غلام کو قتل کیا جائے۔ اور اگر عورت کو عورت نے قتل کیا ہے تو بدلہ میں اسی عورت کو قتل کیا جائے۔

مفہوم یہ ہے کہ جو قتل کرے وہی قتل کیا جائے خواہ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام یہ نہیں ہو سکتا کہ:

۱۔ قاتل کے علاوہ اس کے قبیلہ یا جماعت کے کسی اور شخص کو بھی یا کئی افراد کو بھی قتل کر دیا جائے جیسا کہ عرب جاہلیت کا دستور تھا کہ طاقت ور اور ذی اثر قبائل اپنے مقتول کے بدلہ میں قاتل کی جان لینے ہی کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ اس قبیلہ کے کئی آدمیوں کو قتل کرنا ضروری سمجھتے تھے اور اس سے سالہا سال تک قتل و خوں ریزی کا سلسلہ جاری رہتا۔ عرب جاہلیت کی اکثر لڑائیاں اسی قسم کی ہیں۔

۲۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ قاتل تو ہے کوئی اور قتل کیا جائے کسی اور کو۔ مثلاً قاتل ہے تو غلام اور قتل کیا جائے اس کے آقا کو یا آقا کے خاندان کے کسی دوسرے فرد کو یا قاتل تو ہے عورت اور قتل کیا جائے اس کے باپ یا شوہر یا اس کے بیٹے یا ناتے کے کسی اور شخص کو، جیسا کہ عرب جاہلیت کا دستور تھا کہ قاتل غلام ہوتا تو اس کے آقا کو یا اس کے خاندان کے کسی اہم شخص کو بھی قتل کرتے تھے اور اگر کوئی عورت کسی طاقتور خاندان کی کسی عورت کو مار ڈالتی تو بدلہ میں اس کے باپ یا بیٹے یا شوہر یا کسی اور اہم رشتہ کو قتل کرتے، اس سے بھی لڑائیوں کا سلسلہ چھڑ جاتا اور بکثرت خوں ریزی ہوتی۔

اسلام کے قانون قصاص نے جو آیت مذکورہ میں بیان فرمایا گیا ہے۔ ان تمام ظالمانہ قتل و خوں ریزی کو یکسر مٹا دیا۔ اس قانون عدل کا ماحصل یہ ہے کہ:

۱۔ تمام انسان، انسان ہونے کے لحاظ سے برابر ہیں اور سب کا خون قانون کی نگاہ میں یکساں ہے۔ اس لئے قصاص میں کوئی امتیاز رکھا ہی نہیں جا سکتا۔ اس باب میں مساوات ہی ملحوظ رہے گی اور عدل و مساوات ہی پر اس کی بنیاد ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ سزائے قتل کو اسلام قصاص کہتا ہے جس کے معنی ہی

مساوات کے ہیں اور یہی اس کی بنیادی حقیقت ہے۔ اس سے اسلام ذہن میں یہ تصور قائم کرتا ہے کہ سزائے قتل میں مساوات کا لحاظ رکھنا حد درجہ ضروری ہے کہ یہی اس کی بنیادی حقیقت ہے، لہٰذا ایک شخص قاتل ہے تو بدلہ میں اسی ایک کو قتل کیا جائے۔ دو شخص قاتل ہیں تو انھیں دو کو قتل کیا جائے، اور اگر زیادہ کو قتل کیا گیا تو یہ قصاص نہیں ظلم ہے۔

۲۔ قصاص کا مقصد زندگی کی حفاظت اور فتنہ کا انسداد ہے اس کو پوری صراحت کے ساتھ بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ چنانچہ آیت مذکورہ کے بعد ہی ارشاد ہے۔

وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ٥ (بقرہ آیت ۱۷۹)	اے مغز کلام سمجھنے والو قصاص کے حکم میں تمھارے لئے زندگی ہے (یعنی زندگی کی حفاظت ہے) تاکہ تم لوگ (قتل و خوں ریزی سے) بچو، (اور قتل و خوں ریزی کی راہیں بند ہو جائیں)۔

لہٰذا قصاص کو فتنہ کا ذریعہ نہ بناؤ اور اس کے نام سے ظلم و خونریزی کا دروازہ نہ کھولو۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس تعلیم قرآنی کا پورا پورا لحاظ رکھا، اور اس کو کسی طرح بھی گوارا نہ فرمایا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خون بے گناہی کے بدلہ میں قاتل (جس کا پتہ ہی نہ چل سکا اور ایک بھی شہادت نہ مل سکی کہ قاتل فلاں ہے اس) کے عوض میں کسی اور کو قتل کر دیا جائے یا ایک بڑی جماعت کو قتل کر دیا جائے محض اس بنا پر کہ قاتل اسی جماعت کا ایک فرد ہے جو نامعلوم ہے۔

اگر حضرت علی ایسا کرتے کیوں کہ امیر معاویہ وغیرہ کا مطالبہ یہی ہے تو یہ قرآن مجید کی صریح عدول حکمی ہوتی، پھر ان کی خلافت قرآنی خلافت نہ ہوتی۔ اور اسے کوئی بھی خلافت راشدہ نہ کہتا، اس سے اسلام کا نظام عدل پارہ پارہ ہو جاتا، جس کے بعد پھر ظلم کے دروازے کھل جاتے۔

ایک بڑی خرابی یہ ہوتی کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے نظام قصاص کے بجائے ایک ظالمانہ نظام قصاص جگہ لے لیتا۔ پھر اس کو بھی اسلامی نظام سمجھا جاتا اور کہا جاتا کہ اس پر اجماع

ہو چکا ہے کہ صحابہ نے اس پر اتفاق کیا ہے، وہ فتنۂ عظیم ہے کہ اس کے بعد اسلام میں عدل وانصاف کی کوئی قیمت ہی نہ رہتی۔

بے شمار احسان ہے سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کا کہ قرآن مجید کے بتائے ہوئے نظام قصاص کے بجائے کسی دوسرے نظام کو گوارا ہی نہ فرمایا۔ اور اسلام میں ظالمانہ قانونِ قصاص کو کسی طرح آنے ہی نہ دیا۔ اس سے اسلام کا نظام عدل اپنی جگہ قائم رہا۔

آپ کے خلافت راشدہ کا سب سے بڑا مقصد اسلام کے نظام عدل کو قائم رکھنا ہے۔

اس کے سامنے ملکوں کی فتوحات اور مال غنیمت کی تحصیل کوئی حیثیت ہی نہیں رکھتی۔

اگرچہ آپ کو اسلام کے نظام قصاص اور نظام عدل کے قائم رکھنے کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور جنگ جمل اور جنگ صفین کے طوفان ہائے خون بھی آپ کے سر سے گذرے، لیکن آپ نے سب کو گوارا کیا، بلکہ اپنی جان عزیز بھی نظام عدل قائم رکھنے کے لئے قربان کر دی۔ اور خلافت راشدہ کا حق جیسا چاہئے ادا کر گئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عظیم عالم آشوب زمانہ میں آپ ہی کی ذات مقدس کی بدولت نظام حق اپنی جگہ قائم تھا اور قائم رہ گیا۔ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

جنگ جمل

جمادی الاخری ۳۶ھ

امیر المومنین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بنی امیہ کے لوگ مروان اور اس کے ساتھی جو سخت مفسد تھے مدینہ منورہ سے بھاگ کر مکہ معظمہ چلے آئے، اور یہاں آکر ان مفسدوں نے واقعات کو اس طرح پیش کیا کہ لوگوں میں حضرت عثمان کے قصاص لینے کا جوش پیدا ہو گیا۔

حضرت عائشہ رض حج کے بعد مدینہ منورہ جا رہی تھیں کہ راستہ میں خبر ملی کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے، اور حضرت علی خلیفہ منتخب ہوئے، مگر مدینہ میں ابھی سکون نہیں۔ یہ خبر سن کر آپ مکہ لوٹ گئیں اب مدینہ منورہ کے جو حالات آپ نے سُنے وہ زیادہ تر مروان جیسے مفسد اور اس کے ساتھیوں کے بیانات ہیں، جو مدینہ سے مکہ بھاگ آئے تھے۔ ان کے بیان کئے ہوئے حالات سے جس طرح اہل مکہ متاثر ہوئے کہ خونِ عثمان کا قصاص لینا چاہیئے۔ اسی طرح حضرت عائشہ بھی متاثر ہوئیں اور چونکہ آپ بڑی ذکی الحس تھیں اس لئے انھیں قصاص عثمان کا احساس اس شدت کے ساتھ ہوا کہ اس کی طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ نبی کی بیویوں کو سیاسی معاملات میں حصّہ نہیں لینا چاہیئے۔ اور لوگوں کے بیان پر جس میں بڑی رنگ آمیزی ہوتی ہے کوئی قدم نہیں اٹھانا چاہیئے۔ ان کو تو اپنے گھر میں بیٹھنا چاہیئے، قرآن نے فرمایا ہے:

وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔	اور اپنے گھروں میں بیٹھی رہو اور قدیم جاہلیت کی طرح گھروں سے نکل کر اپنے کو نمایاں نہ کرنا۔
(احزاب ع ۴)	

غرض حضرت عائشہ ان لوگوں کے بیان سے اس قدر متاثر ہوئیں کہ اعلان کیا: "لوگو عثمان کے قاتلوں سے قصاص لے کر اسلام کی عزت بچاؤ"۔ (طبری ص ۳۰۹۸) اسی دوران میں حضرت طلحہ اور حضرت

زبیر بھی مکہ معظمہ چلے آئے تھے۔ حضرت عائشہ کو ان کی زبانی بھی علم ہوا کہ حضرت عثمان شہید کر دیئے گئے۔ اب حضرت عائشہ نے قصاص عثمانؓ کی دعوت شروع کر دی اور حضرت طلحہ اور حضرت زبیر بھی اس تحریک میں شامل ہو گئے۔

یہاں ان بزرگوں سے اجتہادی غلطی ہو گئی۔ اور اجتہادی غلطی سے کون مفکر بچا ہے۔ وہ غلطی یہ ہے کہ یہ حضرات "قصاص عثمانؓ لینے کے بارے میں چوک گئے۔ کیونکہ قصاص لینا حکومت کا کام ہے۔ پبلک کو اس کا حق ہی نہیں، اس لئے" قصاص عثمان کی دعوت دینا ایک بنیادی غلطی ہے، جو محض اجتہادی ہے۔

حضرت عائشہ کی زبان سے خلیفہ مظلوم کے قصاص کی دعوت کوئی معمولی بات نہ تھی، ہزاروں آدمی لڑنے مرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ سب سے پہلے عبداللہ بن عامر خضرمی کھڑا ہوا۔ اور اعلان کر دیا کہ جو شخص اس تحریک میں شریک ہونا چاہے اگر اس کے پاس ساز و سامان اور سواری نہ ہو تو ہم دیں گے، اور چھ سو سواریوں کا انتظام مع اخراجات کر دیا۔ اور یعلی بن امیہ نے بھی بڑی رقم پیش کی مروان جیسا مفسد اور اس کے تمام ساتھی جو مدینہ منورہ سے بھاگ کر یہاں آئے تھے وہ سب اس تحریک میں پیش پیش رہے اور قصاص کی آگ بھڑکاتے رہے، اس طرح یہ ہزاروں آدمیوں کی تحریک ہو گئی۔

اس تحریک کی اصل حقیقت

اس کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیئے کہ اس تحریک کا مقصد قاتلانِ عثمانؓ سے قصاص لینا تھا، حضرت علی سے لڑنا حضرت طلحہ و زبیر اور ان کے ساتھی صحابہ کا ہرگز مقصد نہ تھا۔ اور یہ لوگ حضرت علی سے جنگ کرنے کے لئے نہیں چلے تھے (عینی ج ۷ ص ۱۵۵۔ الفاظ یہ ہیں لم یخرجوا القتال علی)۔

بصرہ کی روانگی

حضرت عائشہ چاہتی تھیں کہ اس جمعیت کو لے کر مدینہ چلیں، وہاں قاتلانِ عثمان ہیں انھیں سزا دی جائے۔ ابھی معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت طلحہ و زبیر کا مقصد حضرت علی سے لڑنا تھا ہی نہیں۔ اس لئے قیاس کا فیصلہ ہے کہ یہ حضرات ام المومنین ہی کے ہم نوا تھے، لیکن اب ہزاروں کی جمعیت ساتھ ہے۔ اس نے ام المومنین کی تجویز کو مسترد کر دیا۔

بصرہ چلنے پر زور دیا اور مصلحت دکھائی کہ قاتلان عثمان سے قصاص لینے کے لئے بڑی فوج واسلحہ اور کافی رقم کی ضرورت ہے، ورنہ ان سے قصاص لینا دشوار ہے، بصرہ میں عراق کا خزانہ ہے جو مال وزر سے پُر ہے پہلے بیت المال پر قبضہ کر کے تحریک قصاص کے لئے مالی سہولت پیدا کی جائے اور لوگوں کی خدمات حاصل کی جائیں۔ اس طرح اپنی طاقت مضبوط کی جائے۔

حضرت طلحہ و زبیر اور دیگر اکابر اس غلط تجویز کو کیسے پسند کر سکتے تھے، لیکن ساتھ میں جو ہزاروں کی جمعیت ہے وہ اس پر مصر ہو گئی۔ جمعیت جذبات قصاص سے لبریز تھی اور جذباتی ہجوم کس کی سنتا ہے؟ ان لوگوں نے جذبات کی رو میں نہ جانے کیا کیا باتیں کہی ہوں گی۔ کیا عجب جو یہ بھی کہا ہو کہ بصرہ کے بیت المال پر قبضہ کئے بغیر قصاص عثمان کی کوئی صورت ہی نہیں۔ "قصاص کو ہم سب ضروری مانتے ہیں۔ اور دین کی خدمت سمجھتے ہیں لہٰذا ہمیں اس تجویز پر عمل کرنا ہی چاہیئے" "ورنہ یہ تحریک کامیاب ہو نہیں سکتی۔ اور دین کی یہ اہم خدمت رہ جائے گی۔ مقصد بیت المال نہیں ہے" دین کی خدمت ہے۔

غرض بات جو بھی رہی ہو، حضرت عائشہ کی فوج صفر ۳۵ھ میں مکہ سے بصرہ کے لئے روانہ ہو گئی۔ یہ کوئی معمولی واقعہ نہ تھا، اس کا انجام کیا ہوگا؟ اس کو سوچ کر مکہ معظمہ کے تمام معاملہ فہم حضرات سخت متاسف تھے۔ ان کو اس روانگی سے اتنا صدمہ تھا کہ سب زار زار رو رہے تھے۔ اس روز مکہ والے اسلام کے نقصانات پر اتنا روئے کہ اس سے پہلے کبھی نہیں روئے تھے، حتیٰ کہ اس دن کا نام ہی یوم النحیب یعنی یوم گریہ پڑ گیا۔ (طبری ج ۶ ص ۳۱۱۴)

جیسا کہ انقلابی تحریکوں میں مفاد پرست لوگ شامل ہو جایا کرتے ہیں۔ اس تحریک میں شروع ہی سے بہت سے مفسدین مثلاً مروان وغیرہ شامل تھے، جن کا کام ہی جنگ کی آگ بھڑکانا تھا۔

راستہ میں پانی کا ایک مقام ملا جسے حوءب کہتے ہیں۔ یہاں حضرت عائشہ نے کتوں کے بھونکنے کی آواز سنی۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مقام کا نام حوءب ہے۔ فرمایا مجھے واپس کر دو۔ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

"عائشہ تو ان لوگوں میں نہ ہونا جن پر حوأب کے کتے بھونکیں گے"۔[1]

اور اصرار کیا کہ اب آگے نہیں جائیں گی۔ یہ ام المومنین کی پاک نفسی تھی کہ اگرچہ قصاص عثمانؓ کی تحریک کی موجد ہیں، لیکن جب حدیث یاد آئی اور اپنا اقدام غلط نظر آیا تو واپس جانے کے لئے اصرار کرنے لگیں، مگر افسوس کہ مفاد پرستوں نے مغالطہ دیا، چنانچہ چالیس آدمیوں نے قسم کھا کر شہادت دی کہ اس مقام کا نام حوأب نہیں، قسم اور اتنے آدمیوں کی قسم بھلا کیسے جھٹلائی جاتے، حضرت عائشہ کو ماننا ہی پڑا، اور آگے بڑھیں۔

یہ فوج بصرہ کے قریب پہونچی تو بیت المال کی حفاظت کے لئے بصرہ کے حاکم حضرت عثمان بن حنیف نے حضرت عائشہ کی فوج کو روکا۔ ردوکد میں جنگ چھڑ گئی، اور بصرہ فوج نے شکست کھائی، عثمان بن حنیف اور بصرہ کے بہت سے آدمی گرفتار ہوئے۔ عثمان کو تو رہا کر دیا گیا، لیکن بہت سے اہل بصرہ کو یہ سمجھ کر قتل کر دیا گیا کہ یہ لوگ قاتلین حضرت عثمان کے گروہ کے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بصرہ کے بہت سے آدمی حضرت عائشہ کی تحریک کے مخالف ہو گئے۔

فتنہ کے انسداد کے لئے امیر المومنین حضرت علی کا عراق روانہ ہونا۔

حضرت علی کو حضرت عائشہ کی تحریک "قصاص عثمان" کی رپورٹ ملی اور یہ بھی خبر ملی کہ یہ لوگ عراق کے بیت المال پر قبضہ کرنے کے لئے بصرہ جا رہے ہیں۔ اور کچھ مفسد بھی ساتھ ہیں جن کا مقصد شر و فساد ہے تو آپ کو بڑی تشویش ہوئی۔ اس وقت آپ کا سب سے بڑا فرض ان مفسدوں کے شر و فساد کو مٹانا اور خلافت کو خطرہ

---

[1] اس باب میں کئی حدیثیں مروی ہیں۔ ایک حدیث یہ ہے کہ حضرت عائشہ کا بیان ہے: ہم لوگوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: تم عورتوں میں سے وہ کون سی عورت ہوگی؟ جس پر حوأب کے کتے بھونکیں گے۔ (ایتکن تنبح علیہا کلاب حوأب ــ احمد و موصلی والبزار جمع الفوائد ص۲۸) یہ حدیث سنا کر حضرت عائشہ واپس جانے کو آمادہ ہو گئیں۔ اس کے علاوہ جمع الفوائد میں ایک اور روایت مذکور ہے۔ ایک روایت عمدۃ القاری شرح بخاری ج۷، ص۱۵۳ باب برکۃ الغازی میں مسند احمد کے حوالہ سے مذکور ہے۔ ۱۲ کوثر

سے بچانا تھا، چونکہ آپ کے تشریف لے جانے کے بغیر معاملہ پڑنا یو پانا دشوار بلکہ ناممکن تھا کہ عام مسلمان حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہؓ اور حضرت زبیرؓ کے مقابلہ میں کسی اور کی سن ہی نہیں سکتے تھے۔ اس لئے بے حد ضروری ہوگیا تھا کہ خود امیرالمومنین بصرہ تشریف لے جائیں۔ عینی شرح بخاری[1] میں ہے کہ آپ مدینہ کے چار ہزار نفوس کے ساتھ روانہ ہوئے، جن میں چار سو اصحاب حدیبیہ اور آٹھ سو انصار تھے۔ اور کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اصحاب بدر بھی تھے، لیکن حضرت سعدؓ، حضرت اسامہؓ اور حضرت ابن عمرؓ وغیرہ نے ساتھ نہ جانے سے معذرت پیش کی، کہ یہ لوگ فیصلہ نہ کر سکے کہ ہمیں اس راہ میں قدم اٹھانا ضروری ہے لیکن بعد میں ان بزرگوں پر بھی یہ حقیقت روشن ہوگئی کہ امیرالمومنین کی اطاعت ضروری تھی اور عراق جانے میں وہ حق پر تھے۔

خود امیرالمومنین نے بصرہ جانے کی جو مصلحت بیان فرمائی وہ حد درجہ بصیرت افروز ہے چنانچہ جب آپ نے عراق کا قصد فرمایا تو حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ جو بدری صحابی ہیں بارگاہ خلافت میں حاضر ہوئے اور انصار کی طرف سے درخواست پیش کی کہ "دارالخلافہ چھوڑ کر جانا مناسب نہیں، آپ کے جاں نثار کافی ہیں جو حکم ہو بجا لائیں گے"۔

جواب میں آپ نے فرمایا:

"یہ صحیح ہے، لیکن عراق پر مخالفین کے تسلط سے نہایت دشواری پیش آئے گی، وہ اس وقت مسلمانوں کی بہت بڑی نوآبادی ہے۔ وہاں کے بیت المال بھی مال وزر سے پُر ہیں، اس لئے وہاں میرا رہنا ضروری ہے۔"

امیرالمومنین کی اول سے آخر تک یہی خواہش رہی کہ مسلمان شر و فساد سے دور رہیں۔ اور خروج بغاوت کے بجائے خلافت کے اطاعت گذار بن کر اپنی طاقت مضبوط بنائیں۔ چنانچہ جب آپ نے کوفہ سے مدد حاصل کرنے کے لئے داعیان حق کو بھیجا ہے تو انھیں ایک مکتوب بھی تحریر فرمایا، جس میں آپ لکھتے ہیں:

---

[1] ج ۷، ص ۱۵۳، باب برکۃ الغازی۔ ۱۲ کوثر

"ہم چاہتے ہیں کہ اس امت میں پھر قوت واتحاد پیدا ہو جائے"۔

غرض امیرالمومنین، فتنہ و فساد کے استیصال کرنے، خلافت راشدہ کو خطرہ سے بچانے اور اصلاح امت کا فریضہ انجام دینے کے لئے بصرہ روانہ ہوئے، مقام ذی قار میں خبر ملی کہ طلحہ و زبیر بصرہ پہنچ گئے، لوگوں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی ہے[1]۔ صورت حال نازک ہے۔ آپ نے یہاں سے حضرت امام حسن اور حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کو کوفہ سے مدد حاصل کرنے کے لئے روانہ فرمایا۔ امام حسن علیہ السلام نے کوفہ کی جامع مسجد میں امیرالمومنین سے تعاون کرنے پر تقریر فرمائی اور حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ جو کوفہ کے نہایت مقدس بزرگ اور بڑے بلند پایہ صحابی تھے، تائید کی اور فرمایا۔

"لوگو! امیرالمومنین نے اپنے صاحبزادے کو بھیج کر تمہیں تعاون کرنے کی دعوت دی ہے اسے قبول کرو اور علم حیدری کے نیچے جمع ہو کر فتنہ و فساد کی آگ کو بجھا دو، میں سب سے پہلے چلنے کو تیار ہوں۔"

ہر طرف سے لبیک کی صدائیں بلند ہوئیں اور دس ہزار جاں بازوں کی جماعت مسلح ہو کر حضرت امام حسن کے ساتھ روانہ ہوئی اور مقام ذی قار میں پہونچ کر امیرالمومنین کی فوج میں شامل ہو گئی۔

امیرالمومنین کی طرف سے مفاہمت کی کوشش

امیرالمومنین بے حد کوشاں تھے کہ کسی طرح فتنہ دب جائے اور جنگ نہ ہو، اس سلسلہ میں آپ نے ایک مقدس صحابی حضرت قعقاع کو حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ و زبیر

---

[1] اس کو حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم نے بھی خلفائے راشدین ص ۲۹۰ میں لکھا ہے۔ اس نئی بیعت سے ان لوگوں نے بیعت مرتضوی کو توڑ دیا۔ حدیث میں جو آیا ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے عہد لیا ہے کہ ناکثین، قاسطین اور مارقین سے قتال کرنا تو ناکثین سے یہی لوگ مراد ہیں کہ ناکثین کے معنی بیعت شکن کے ہیں۔ اور قاسطین اہل شام ہیں، اور مارقین نہروان کے خارجی ہیں۔ ۱۲ کوثر۔

کے پاس مفاہمت کے لئے روانہ فرمایا، انھوں نے ان تینوں حضرات سے جو گفتگو کی وہ حسب ذیل ہے:

حضرت قعقاع: آپ حضرات بصرہ کیوں تشریف لائے ہیں؟

جواب: لوگوں کی اصلاح کے لئے۔

حضرت قعقاع: بتایئے اصلاح کا طریقہ کیا ہے؟ واضح ہوجائے تو ہم بھی وہی کریں گے۔

جواب: اصلاح کا طریقہ یہ ہے کہ عثمان کا قصاص لیا جائے، اگر اسے چھوڑ دیا گیا تو قرآن کو چھوڑ دیا گیا اور اگر اسے لیا گیا تو قرآن کو زندہ کیا گیا۔

حضرت قعقاع: قاتلین عثمان کے گروہ میں جو لوگ بصرہ کے تھے ان میں سے کچھ لوگوں کو آپ حضرات نے قتل کیا جس کے نتیجہ میں چھ ہزار بصریوں نے آپ کا ساتھ چھوڑ دیا۔ قاتلوں کے گروہ کا ایک فرد حرقوص بھی ہے آپ لوگوں نے اسے گرفتار کرنا چاہا تو مقابلہ کے لئے یہی چھ ہزار آدمی کھڑے ہوگئے اور آپ لوگ اسے چھوڑنے پر مجبور ہوگئے۔ اس طرح جس قصاص کا آپ دعویٰ کر رہے ہیں اس کو خود چھوڑ چکے ہیں لہٰذا آپ حضرات امت کو فتنہ میں نہ ڈالئے فتنہ دونوں جماعتوں کو برباد کر ڈالے گا۔ یہ ایک آدمی، یا چند انسان، یا ایک جماعت ہی کے قتل کا معاملہ نہیں ہے بلکہ ساری امت میں قتل و خون ریزی پھیل جانے کا سوال ہے۔

حضرت قعقاع کی یہ گفتگو اتنی معقول تھی، کہ حضرت عائشہؓ، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر تینوں نے پسند کی، اور کہا۔ آپ بالکل بجا کہتے ہیں۔ علی سے بھی پوچھئے، اگر وہ بھی آپ کے ہم خیال ہوں تو معاملہ صاف ہوگیا، اور صلح ہو جائے گی۔

حضرت قعقاع نے امیرالمومنین کو یہ خوشخبری سنائی، آپ بہت ہی خوش ہوئے کہ عائشہ اور طلحہ و زبیر مان گئے۔ اور آپ نے اپنی فوج سے فرمایا: "ان لوگوں (طلحہ و زبیر اور عائشہ) کے بارے میں اپنے ہاتھ اور اپنی زبان کو قابو میں رکھو، آنے والے واقعات کا صبر کے ساتھ انتظار کرو، پیش دستی سے بچو، آج جو شخص جنگ کی ابتدا کرے گا کل وہ اللہ کے نزدیک دشمن سمجھا جائے گا۔ (الطبری ۴۶۹)

امیرالمومنین اور حضرات طلحہ و زبیر میں صلح کی گفتگو

امیرالمومنین حضرت علی اور حضرات طلحہ و زبیر صلح میں صلح کی فائنل گفتگو ہوگئی۔ حضرات طلحہ و زبیر قصاص عثمان کے مطالبہ سے دست بردار ہوگئے۔ اور امیرالمومنین کی اطاعت قبول کرلی طے پایا کہ کل صبح کو صلح کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس سے مروان اور اس کی پارٹی کو بڑا دھکا لگا کہ یہ پارٹی جب بصرہ کو چلی تھی تو مرالظہران کے مقام پر سعید ابن العاص نے کہا تھا: اگر عثمان کا قصاص لینا ہے تو ان لوگوں کو قتل کر دو جو تمہارے ساتھ اس لشکر میں موجود ہایں۔ اشارہ تھا کہ طلحہ و زبیر کو مار ڈالو (کیونکہ ان لوگوں نے حضرت عثمان پر اعتراضات کئے تھے اور عثمان کی کوئی مدد نہیں کی تھی) مروان نے کہا ہم ان کو یعنی طلحہ و زبیر کو اور علی کو باہم لڑائیں گے۔ پھر جس کو شکست ہوگی وہ تو ختم ہی ہو جائے گا اور جو فتحیاب ہوگا وہ کمزور ہو جائے گا، جس سے ہم بآسانی نمٹ لیں گے۔[۱]

اب مروان اور اس کی پارٹی جس نے پہلے ہی سے منصوبہ بنا لیا تھا کہ ہم طلحہ و زبیر اور علی کو آپس میں لڑا کر اپنی حکومت قائم کرنے کی راہ نکالیں گے، اس پر تل گئے کہ جیسے بھی ہو ان کو لڑا دو۔ مروان سعید بن عاص اور ان کی پارٹی نے قصاص عثمان کی آڑ لے کر عراق سے ہزاروں آدمی اپنے حامی بنا لئے تھے اب ان لوگوں نے طے کیا کہ رات کے اندھیرے میں طلحہ و زبیر اور علی کی فوجوں پر شب خون مارو۔ شب خون مارنے کی بات حضرت عثمان کا محاصرہ کرنے والوں نے بھی سوچی کہ اسی میں ان کی اپنی خیر نظر آئی۔ انہیں سجھائی دینے لگا کہ صلح کے اعلان کے بعد سب جھمیلے ختم ہو جائیں گے۔ پھر ہماری کارروائیوں پر فیصلہ کا معاملہ آئے گا۔

غرض مروان کی پارٹی اور بلوائی جماعت نے اپنی اپنی مصلحت کے پیش نظر حضرت علی کی فوج پر بھی شب خون[۲] مارا اور حضرات طلحہ و زبیر کی فوج پر بھی۔ دونوں فوجوں نے سمجھا کہ فریق مخالف نے

---

[۱] طبقات ابن سعد ج ۵ ص ۳۴-۳۵۔ کوثر

[۲] لوگوں کا قیاس ہے کہ شب خوں مارنے کا ارتکاب بلوائیوں نے کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس میں مروان ═══

بد عہدی کی اور جنگ کی آگ اس سرے سے اس سرے تک پھیل گئی اور ہر طرف تلواریں چلنے لگیں۔

میدان کارزار میں حضرت علی نے پہلا کام یہ کیا کہ جنگ روکنے کی کوشش فرمائی، چنانچہ فوراً حضرت زبیر کو پکار کر فرمایا:

"ابو عبداللہ تم کو یاد ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روز تم سے پوچھا تھا کہ تم علی کو دوست رکھتے ہو؟

تم نے جواب دیا: ہاں، آپ نے فرمایا، ایک روز تم ان سے ناحق لڑوگے۔ (مستدرک ج ۳ فضائل زبیرؓ)

حضرت زبیر نے کہا، ہاں مجھے یاد آگیا، اب حضرت زبیر جنگ سے کنارہ کش ہوگئے۔ اور اپنے بیٹے عبداللہ بن زبیر سے فرمایا۔ میرے فرزند! علی نے مجھے ایسی حدیث یاد دلائی ہے کہ اب میں لڑائی میں حصّہ نہیں

= اور اس کی پارٹی آگے ہے یہ سب اسی لئے بصرہ آئے تھے کہ لڑائی لگا دو طلحہ و زبیر اور علی کی فوجوں کو لڑانا بے حد ضروری ہے، جو شکست کھائے گا وہ مٹ ہی جائے گا اور جو فتحیاب ہوگا لوگوں کی نگاہوں میں مبغوض رہے گا۔ اور اتنا کمزور ہو جائے گا کہ ہم اس سے بآسانی نمٹ لیں گے پھر اپنی حکومت قائم کرلیں گے۔ یہ پارٹی اپنے خبیث منصوبے کے تحت شروع سے کام کر رہی تھی۔ اسی نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے حضرت عثمان کی شہادت کا واقعہ اس پُر فریب انداز میں بیان کیا کہ ام المؤمنین نے قصاص عثمان کی تحریک کھڑی کردی اور حضرات طلحہ و زبیر کو بھی مغالطہ دیکر تحریک میں لے لیا۔ اور اپنا قائد بنا کر اپنے منصوبہ کی راہ ہموار کرنی شروع کردی۔ پھر ان بزرگوں کو بصرہ کے بیت المال پر قبضہ کرنے کی اسکیم پر مجبور کیا۔ اور خلیفہ برحق کے خلاف خروج کرا کر بصرہ پر حملہ کرادیا۔ مقام حوئب سے جب حضرت عائشہ واپس جانے کو کہہ رہی تھیں اور زور دے رہی تھیں تو اسی پارٹی کے چالیس آدمیوں نے جھوٹی قسم کھا کر انھیں مغالطہ دیا۔ اور واپس جانے سے روک لیا۔ غرض یہ پارٹی شروع ہی سے جنگ کرانے کی کوششیں برابر کرتی رہی۔ جب دیکھا کہ کل صبح کو صلح کا اعلان ہوگا تو اسے نظر آیا کہ اب تو ہمارے تمام منصوبے خاک میں مل جائیں گے۔ سب کچھ کیا کرایا ملیامیٹ ہو جائے گا اور جنگ نہ ہوسکے گی۔ پھر ہم کامیاب ہو ہی نہ سکیں گے۔ لہٰذا اسکے سوا کوئی صورت ہی نہیں کہ دونوں فوجوں پر شب خوں مار کر جنگ کرادو۔ اب اگر علی فتحیاب بھی ہوئے تو بہت سے لوگ جنگ کی بنا پر ان کے دشمن ہو جائیں گے۔ پھر ہم ان سے نمٹ لیں گے۔ اور اموی حکومت قائم کرنے کی صورت بآسانی پیدا ہو جائے گی۔ افسوس کہ جنگ جمل نے اسکی توقع پوری کردی۔ ۲ کوثر

لے سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہم لوگ حق پر نہیں ہیں۔ اب میں میدان جنگ سے الگ ہوتا ہوں، تم بھی میرا ساتھ دو، لیکن عبداللہ بن زبیر نے اپنے والد بزرگوار کی بات پر عمل نہیں کیا۔ البتہ حضرت طلحہ جنگ سے کنارہ کش ہوگئے۔ چنانچہ حضرت زبیر کے چلے جانے کے بعد یہ بھی جانے لگے۔ مروان نے دیکھا کہ طلحہ بھی چلے گئے تو فوج یہی سمجھے گی کہ علی حق پر ہیں۔ اور ہم سب ناحق ہیں۔ پھر طلحہ جن کا اثر پورے بصرہ پر ہے لوگوں سے یہی کہیں گے کہ علی حق پر ہیں، اور ہم لوگوں سے بڑی غلطی ہوگئی اس سے علی کی عظمت دلوں میں بیٹھ جائے گی اور ان کا اثر و اقتدار بڑھ جائے گا۔ پھر ہم لوگ ان سے نمٹ نہ سکیں گے اور اموی حکومت قائم کرنے کا منصوبہ رہ جائے گا۔ لہٰذا طلحہ کا خاتمہ کر دو، یہ سوچ کر اس بد ترین مفسد[لے] نے حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کو زہر بجھا تیر مارا جس سے وہ شہید ہوگئے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری ج، ص ۵۹ میں تصریح

لے مروان پر کئی حدیثوں میں لعنت ہے، چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن زبیر حرم کعبہ میں لوگوں کو سناتے ہیں: ورب ھذہ الکعبۃ لعن اللہ الحکم وما ولد علی لسان نبیہ صلی اللہ علیہ وسلم (البزار، والکبیر، واحمد نحوہ۔ مجمع الفوائد ص۱۳۶ ج۱) ترجمہ: کعبہ کے مالک کی قسم ہے کہ مروان کے باپ حکم اور اسکی اولاد پر اللہ نے اپنے رسول کی زبانی لعنت فرمائی ہے۔

۲۔ امام حسن علیہ السلام مروان کی ایک منافقانہ بے ادبی پر فرماتے ہیں۔ واللہ لقد لعنک اللہ علی لسان نبیہ وانت فی صلب ابیک (للموصلی بلین، مجمع الفوائد۔ ج۱ ص ۳۲۶) ترجمہ:۔ بخدا اللہ نے تجھ پر اپنے نبی کی زبانی لعنت فرمائی ہے۔ اس وقت تو اپنے باپ کی پشت میں تھا۔

۳۔ ۔۔ ان کے باپ حکم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آنے کی اجازت مانگی۔ آپ نے فرمایا۔ ائذنوا لہ فعلیہ لعنۃ اللہ والملٰئکۃ والناس اجمعین، ومایخرج من صلبہ یسرفون فی الدنیا، ویرذلون فی الآخرۃ ذو ومکر وحیلۃ (للکبیر مجمع الفوائد، ج۱ ص ۳۲۶)

ترجمہ: اس کو اجازت دے دو، اس پر اللہ اور ملائکہ اور تمام انسانوں کی لعنت ہے اور جو اس کی صلب سے پیدا ہوگا اس پر بھی۔ یہ لوگ دنیا میں زیادتی کریں گے آخرت میں رذیل ہوں گے۔ یہ لوگ بڑے ہی مکر و فریب والے ہیں۔ ۱۲ کوثر

کی ہے کہ اس جنگ میں یہ پہلا خون تھا، اس سے یہ بات بے نقاب ہوگئی کہ حضرت زبیر میدان جمل میں خوں ریزی ہونے سے پہلے کنارہ کش ہو گئے تھے اور چونکہ حضرت علی کے سمجھانے کے بعد وہ کنارہ کش ہوئے تھے، اس لئے یہ حقیقت پوری طرح واضح ہو جاتی ہے کہ حضرت علی نے میدان جمل میں سب سے پہلا کام یہ کیا ہے کہ جنگ روکنے کی کوشش فرمائی ہے۔

حضرت طلحہ و زبیر کے بعد اب میدان میں قائد کی حیثیت سے جو ذات تھی وہ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا تھیں اور لڑائی ان کے اونٹ کے چاروں طرف ہو رہی تھی، جس میں وہ زرہ پوش ہودج میں سوار تھیں۔ حضرت امیر المومنین رضی اللہ عنہ کی صوابدید یہ ہوئی کہ اونٹ کو بٹھا دیا جائے تو لڑائی کا خاتمہ ہو جائے۔ اس صوابدید کی بنا پر ایک شخص نے اونٹ کے پاؤں پر تلوار ماری، اونٹ بلبلا کر بیٹھ گیا۔ اور حضرت عائشہ کی فوج کے قدم اکھڑ گئے۔ اور اسے شکست ہوگئی۔ امیر المومنین نے حضرت عائشہ کے بھائی حضرت محمد رضی اللہ عنہ سے فرمایا جو آپ کی فوج کے ایک افسر تھے کہ اپنی بہن کو بڑی حفاظت سے عبداللہ بن خلف خزاعی کے قصر میں پہونچاؤ اور وہاں بڑے ادب و احترام کے ساتھ رکھنے کا انتظام کرو۔ حضرت محمد نے اس کا بہترین انتظام کیا۔ حضرت عبداللہ بن خلف نے ماں سے بڑھ کر حضرت عائشہ کی توقیر کی اور قصر میں ہر شخص نے ان کی شان کے لائق ادب و احترام کیا۔

حضرت علی نے جنگ جمل میں جو طریقہ اختیار فرمایا ہے اس سے ایک فاتح بادشاہ اور ایک خلیفۂ راشد کا فرق پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ چنانچہ آپ نے منادی کرادی :-

(۱) کسی بھاگنے والے کا تعاقب نہ کرنا (۲) کسی زخمی کو قتل نہ کرنا (۳) کسی کا مال نہ لوٹنا (۴) کسی عورت کو گرفتار نہ کرنا (۵) ان تمام لوگوں کو امان ہے جو ہتھیار ڈال دیں (۶) وہ تمام لوگ مامون ہیں جو گھر کا دروازہ بند کرلیں۔ (درایۃ ابن حجر بحوالہ ابن ابی شیبہ)

مخالف لشکر کے مال کو بصرہ کی جامع مسجد میں جمع کر کے اعلان کرا دیا کہ جو اپنا مال پہچان لے ثبوت دے کر لے جائے۔

لوگوں کا خیال تھا کہ اب تو علی بصرہ کے مردوں کو قتل کریں گے اور عورتوں کو لونڈیاں بنائیں

گئے، لیکن آپ نے اس کی پرزور تردید فرمائی۔ اور ارشاد فرمایا: مجھ جیسا آدمی مسلمانوں کے ساتھ ایسا سلوک کبھی نہیں کرے گا۔ اور سب کے ساتھ ایسا بہترین سلوک کیا کہ مخالفین نے بھی مان لیا کہ یہ ہیں خلیفۂ راشد! اور یہی ہیں اس زمانہ میں رسول کے سچے جانشین!

امیر المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے پاس تشریف لائے اور مزاج پرسی فرمائی، اور بڑے حسن وسلوک کے معاملے کئے۔ چند روز ان کو آرام کر لینے کے بعد حضرت محمد ابن ابی بکر کو حکم دیا کہ اپنی بہن کو نہایت عزت واحترام کے ساتھ مدینہ لے جاؤ، انہوں نے تعمیل حکم کی، امیر المومنین نے زادراہ، نقد وجنس اور جملہ ضروری سامان دیئے، بصرہ کی چالیس معزز خواتین کو بھی آپ کے ہمراہ کر دیا، غرض بڑے حسن سلوک اور اعزاز کے ساتھ حضرت عائشہ کو مدینہ روانہ فرمایا۔ ام المومنین نے روانہ ہوتے وقت لوگوں سے فرمایا۔

"یہ جنگ محض غلط فہمی کا نتیجہ تھی، ورنہ میرے اور علی کے درمیان کوئی رنجش نہ تھی وہ میرے نزدیک بہترین لوگوں میں ہیں۔"

جواب میں حضرت علی نے فرمایا:

"عائشہ ٹھیک کہتی ہیں۔ میرے ان کے درمیان کبھی کوئی بات نہ تھی۔ یہ دنیا اور آخرت میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی بیوی ہیں۔"

اعزاز وتکریم کی اس باہمی گفتگو کے بعد حضرت عائشہ مدینہ منورہ روانہ ہوئیں۔ حضرت علی نے کچھ دور مشایعت فرمائی اور امام حسن اور امام حسین علیہما السلام بھی کچھ دور ساتھ گئے۔ حضرت عائشہ نے مدینہ پہنچ کر حضرت علی کے حسن سلوک کو سراہا اور کہا کہ علی کی شانِ کرم میں ترقی ہی ہوتی ہے۔ (عمدۃ القاری ج ۷، ص ۱۵۴)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے خلاف اقدام کرنے پر عمر بھر نادم رہیں جب اس کا تذکرہ آتا تو زار زار روتیں اور کہتیں، کاش آج سے بیس برس پہلے میں مرجاتی۔ (مسند احمد) امام احمد اپنی مسند میں، امام بزار اپنی مسند میں، امام طبرانی معجم کبیر میں حدیث درج کرتے

ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا ہے۔

"تمہارے اور عائشہ کے درمیان کچھ بات ہو جائے گی۔ حضرت علی نے گذارش کی یا رسول اللہ میرے درمیان؟ فرمایا۔ ہاں۔ حضرت علی نے پھر عرض کی، صحابہ میں میرے ہی درمیان؟ فرمایا۔ ہاں۔ اب حضرت علی نے کہا کیا صحابہ میں میں ہی ایسا بدنصیب ہوں؟ آپ نے فرمایا تم بدنصیب نہیں جب ایسا ہو جائے، تو عائشہ کو اس کے امن کی جگہ پہونچا دینا"[۱]

جنگ جمل میں حضرت علی کا بہترین طریقۂ کار

امام بیہقی روایت کرتے ہیں کہ: حضرت علی نے جنگ جمل میں تین روز تک مخالفین کو (قبول حق کی) دعوت دی تیسرے روز حسنین اور عبداللہ بن جعفر نے عرض کی، ان لوگوں نے ہمارے بہت سے آدمی زخمی کر ڈالے (مطلب یہ تھا کہ اب جوابی کارروائی کی اجازت مرحمت ہو۔) آپ نے فرمایا: ان کی ہر بات مجھے معلوم ہے، اس کے بعد آپ نے دو رکعت نماز پڑھی، سلام کے بعد ہاتھ اٹھا کر دعا مانگی پھر اپنے آدمیوں سے فرمایا۔

"اگر تم لوگ کامیاب ہو جاؤ تو (۱) بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کرنا (۲) کسی زخمی کو قتل نہ کرنا (۳)، ہاں جو ہتھیار یہ لائے ہیں ان پر قبضہ کر لینا، لیکن ان کے علاوہ کسی کا بھی کوئی مال نہ لینا، جو مارے جائیں ان کا ساز و سامان ان کے وارثوں کو دیا جائے گا۔ (نیل الاوطار ص۱۴۲)

کیا کوئی حکومت اپنے باغیوں کے ساتھ جو حکومت کی فوج پر حملہ کرتے ہوں اور زخمی بناتے

---

[۱] متن حدیث یہ ہے: عن ابی رافع قال ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال لعلی۔ انہ سیکون بینک وبین عائشۃ امر، قال: انا یا رسول اللہ؟ قال نعم، قال۔ انا من بین اصحابی؟ قال نعم، قال۔ انا اشقاھم یا رسول اللہ؟ قال۔ لا، ولکن اذا کان ذالک فارددھا الی مامنھا۔ جمع الفوائد ص۲۸۹)

ہوں بھلا دعوت و مفاہمت کا ایسا سلوک کر سکتی ؟ ایسی عدیم المثال حکومت حضرت علی کی خلافت راشدہ ہے جس کا ایک اہم اصول ہر معاملہ میں حق پرستی اور بے نفسی ہے۔ آپ کا یہ آرڈر اور طریق عمل کہ :۔

(۱) بھاگنے والوں کا تعاقب نہ کرنا (۲) کسی زخمی کو قتل نہ کرنا (۳) کسی کا مال و اسباب نہ لینا، کیسی بے نفسی کے اصول ہیں۔ فقہ اسلامی میں ان کو اتنی اہمیت حاصل ہے کہ فقہائے اسلام نے باغیوں پر فتح پانے کے بعد انھیں اصول کو آئین و دستور قرار دیا ہے اور تصریح کی ہے کہ یہ اصول حضرت علی کے ہیں۔ اور چونکہ وہ خلیفۂ راشد ہیں۔ ہٰلذا ان کے اصول و طریق پر عمل کرنا لازمی اور ناگزیر ہے اس کی مفصل بحث اوپر لکھی جا چکی ہے۔

جنگ جمل اور جنگ صفین کے وقت مسلمانوں کے تین گروہ

جنگ جمل، اسی طرح جنگ صفین میں (جس کا بیان انشاء اللہ آگے آتا ہے) مسلمان تین گروہوں میں منقسم تھے۔

(۱) کچھ لوگوں کا فیصلہ تھا کہ ہمیں جنگ میں حصہ نہیں لینا چاہیئے، حالانکہ خلیفۂ برحق سے بغاوت کرنے والوں سے جنگ کرنا واجب ہے، لیکن یہ حقیقت ان پر بعد میں کھلی ہٰلذا یہ لوگ معذور رہیں۔ انھیں میں حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت اسامہ، اور حضرت ابن عمر وغیرہ ہیں۔ لیکن جب حضرت ابن عمر پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ حضرت علی سے قتال کرنے والے باغی ہیں تو ان کا نقطۂ نظر بدل گیا۔ چنانچہ ان کا قول ہے :

لما اجد نی آسی علی شئی الا انی لما قاتل الفئة الباغیة مع علی (جمع الفوائد ص۲۵۲)

میں اپنے کو کسی چیز پر متاسف نہیں پاتا، لیکن صرف اس بات پر افسوس کرتا ہوں کہ میں نے حضرت علی کا ساتھ دے کر باغی جماعت سے قتال کیوں نہیں کیا۔

حضرت ابن عمر کا یہ افسوس ناگزیر تھا جب کہ انھوں نے جنگ صفین کے بعد دیکھ لیا کہ ان جیسے

ذمہ دار نفوس کی کنارہ کشی کی بدولت حضرت علی سے قتال کرنے والوں کو ایک طرح کی طاقت مل گئی جس کا نتیجہ یہ ہُوا کہ غیر راشد حکومت قائم ہو گئی اور فرماں روائی کا نظام منہاج نبوت سے دور جا پڑا۔

(۲) کچھ لوگوں نے خلیفۂ برحق امیرالمومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے جنگ کی، حدیث نے ان کو باغی کہا ہے۔ حضرت عائشہ اور حضرت طلحہ و زبیر اس خطاب کے مستحق نہیں۔ کیوں کہ یہ حضرات لڑنا نہیں چاہتے تھے، ہاں یہ ضرور ہے کہ حضرت طلحہ و زبیر نے اپنی فوج بنائی جو حضرت علی سے جنگ کے لئے نہ تھی بلکہ قاتلان عثمان سے قصاص کے لئے تھی۔ اس فوج نے خلافت سے تصادم کیا اور جنگ ہو گئی، لیکن آغاز جنگ ہی میں طلحہ و زبیر کنارہ کش ہو گئے۔ اور اپنی غلطی پر نادم ہو کر یکسر تائب ہو گئے۔ اور حضرت عائشہ مقام حوءب سے واپس جانے کے لئے تیار ہو گئی تھیں لیکن لوگوں نے جھوٹی قسم کھا کر انھیں مغالطہ میں رکھا۔ یہ بھی جنگ کے خلاف تھیں، لیکن مفاد پرستوں نے اپنی کارروائی کر ڈالی۔

ہاں ان کی فوج یقیناً باغی ہے اور اس سے قتال کرنا واجب ہے کیوں کہ قرآن مجید کا حکم ہے۔

(۳) ایک گروہ نے خلیفۂ برحق، مولائے کائنات امیرالمومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا ساتھ دیا آپ کے مخالفین کے مقابلہ میں جان کی بازی لگا دی۔ یہ لوگ حق کے حامی اور حق کے بہترین مددگار و انصار ہیں۔ مدینہ منورہ کے بیشتر انصار بلکہ قریب قریب سب انصار، اور قریب قریب تمام سابقین اولین اسی گروہ میں ہیں۔ ان کے علاوہ وہ تمام حضرات بھی اسی گروہ میں ہیں جنہوں نے خلافت راشدہ کی نصرت و امداد کی اہمیت سمجھی۔

حامیان حق کے اس گروہ کے خلاف وہی لوگ تھے جو فتنہ اٹھا رہے تھے یا مفسدوں کے مغالطہ میں آگئے تھے۔ اور خلیفۂ رسول سیدنا علی مرتضیٰ کی مخالفت میں وہی لوگ پیش پیش تھے جو یا تو مؤلفۃ القلوب یا طلقا[۱] ہیں کہ فتح مکہ کے روز مسلمان ہوئے، یا وہ ہیں جن کے اعزا و اقربا حضرت شیر خدا کے

---

[۱] طلقا آزاد کئے ہوئے غلاموں کو کہتے ہیں۔ مشرکین مکہ جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بے حد مظالم

ہاتھ سے جہاد میں مارے گئے' یا وہ لوگ ہیں جن کو اپنی حکومت قائم کرنے کی فکر ہے' یا وہ لوگ ہیں جن کو مال و دولت یا کسی صوبہ کی گورنری کا لالچ دیکر ہموار کر لیا گیا ہے۔ یا وہ بدو اور جاہل قبائل ہیں جو قتال و پیکار کے خوگر ہیں اور مال غنیمت حاصل کرنا ان کی معاشیات کا اہم مقصد ہے۔

حضرت حذیفہ وغیرہ کی ہدایت کہ جب حضرت علی کے خلاف محاذ قائم ہو تو حامیان علی کے گروہ میں شامل رہنا

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ بڑے پایہ کے صحابی ہیں۔ انھیں صاحب السر یعنی رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا رازدار کہا جاتا تھا، کیوں کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے انھیں تمام منافقوں کے نام بتائے تھے۔ اور تمام ہونے والے فتنوں کے متعلق معلومات عطا فرمائی تھیں۔ ان کی یہ شان تھی کہ ایک موقع پر صحابہ نے حضور سے گذارش کی: یارسول اللہ آپ کسی کو خلیفہ بنا دیتے تو بہت اچھا ہوتا، آپ نے فرمایا۔

ان استخلفت علیکم فعصیتموہ عذبتم ولکن ما حدثکم حذیفة فصدقوہ، وما اقرأکم عبد اللہ فاقرءوہ۔	اگر میں نے کسی کو خلیفہ بنا دیا اور تم لوگوں نے اس کی نافرمانی کی تو عذاب میں پڑ جاؤ گے۔ لیکن ایسا کرو کہ حذیفہ جو سنائیں اس کی تصدیق کرنا اور ابن مسعود جس طرح قرآن پڑھائیں اسی طرح پڑھنا۔
(ترمذی۔ ج ۲ ص ۲۲۲)	

= ڈھائے اور آپ سے جنگ کرتے رہے۔ فتح مکہ کے روز یہ لوگ مغلوب ہوگئے۔ قانون جنگ کی رو سے ان کو غلام بنانے کا حق تھا، لیکن حضور نے ان پر یہ احسان فرمایا کہ انھیں طلقا فرما کر چھوڑ دیا۔ اس لئے ان لوگوں کو طلقا کہا جاتا ہے۔ ان میں کچھ تو خلوص دل سے مسلمان ہوگئے اور کچھ سیاسی مصلحت سے مسلمان ہوئے صدق دل سے نہیں۔ قرآن نے ان کو مولفۃ القلوب فرمایا ہے۔ طلقا کے بارے میں حضرت عمر کا ارشاد ہے

ان ھذا الامر لا یصلح للطلقاء ولا ابناء الطلقاء (کنز العمال جدید ج ۵ ص ۷۳۶)	یعنی امر خلافت کا طلقا اور ان کی اولاد کو حق نہیں۔

اس بنا پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بیانات کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی ان سے بیانات حاصل کرتے تھے۔ اور جس کے جنازہ میں حضرت حذیفہ شریک ہوتے اسی کی نماز جنازہ حضرت عمر پڑھاتے (قسطلانی شرح بخاری ج ۲ ص ۱۰۶) کیونکہ حضرت حذیفہ کو تمام منافقین کے نام معلوم تھے۔ اب وہ منافقین کی نماز جنازہ کیسے پڑھتے، ہاں جس کا جنازہ پڑھ لیتے ثبوت ہو جاتا کہ یہ منافق نہیں ہے۔

ایک موقع پر حضرت حذیفہ نے لوگوں کے سامنے بیان دیا کہ:

نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے گھر والے[۱] دو فرقے ہو جائیں گے، اور باہم تلوار چلے گی، اس وقت تم لوگ کس حالت کو پسند کرو گے؟

انظروا الفرقة التی تدعوا الی	اس فرقہ کو دیکھنا جو علی کی خلافت کی دعوت دے
امر علی فالزموها، فانها علی هدی	اور خوب مضبوطی سے اس کا ساتھ پکڑنا کہ بلاشبہ یہی
(مجمع الفوائد ص ۲۵۲ بحوالہ بزار)	جماعت حق پر ہوگی۔

درحقیقت یہ اس حدیث کی ایک تعبیر ہے۔

سیکون بعدی فتنة فاذا کان	عن قریب میرے بعد فتنہ ہوگا، جب اس کا
ذالک فالزموا علی بن ابی طالب	ظہور ہو تو علی بن ابی طالب سے وابستہ ہو جانا
فانه الفاروق بین الحق والباطل	کیوں کہ وہ حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز
(کنز العمال ص ۱۵۵ بحوالہ ابو نعیم)	کر دینے والے ہیں اور فاروق ہیں۔

ایک موقع پر بنو عبس نے حضرت حذیفہ سے کہا امیر المومنین عثمان تو قتل کر دیئے گئے۔ اب آپ ہمیں کیا حکم دیتے ہیں؟ حضرت حذیفہ نے فرمایا۔

● "میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ عمار کو مضبوطی سے پکڑے رہنا۔ بنو عبس نے کہا، عمار تو علی سے

---

[۱] یہاں گھر والے سے مراد حضرت علی اور حضرت عائشہ ہیں جیسا کہ خود اس روایت میں اشارہ موجود ہے۔ ۱۲ کوثر

چمٹے ہوئے ہیں اور بڑا ہی زبردست ساتھ پکڑا ہے۔"

اب حضرت حذیفہ نے فرمایا:

"حسد نے حاسدین کو غارت کر ڈالا، تم لوگوں کو عمار سے اسی بنا پر نفرت اور گریز ہے کہ یہ حضرت علی سے تقرب رکھتے ہیں۔ اللہ کی قسم ہے کہ جتنا خاک زمین اور بادل میں فاصلہ ہے اس سے کہیں زیادہ علی کو عمار پر فضیلت حاصل ہے، حالانکہ عمار بہترین لوگوں میں ہیں۔"

● — راوی کا بیان ہے کہ آپ نے حضرت عمار کا دامن پکڑنے کا اس لئے حکم دیا ہے کہ آپ اچھی طرح جانتے تھے کہ جب لوگ حضرت عمار کو مضبوطی سے پکڑے رہیں گے تو حضرت علی کے ساتھ ہو جائیں گے۔

حضرت علی کا ساتھ دینے اور آپ کی مدد کرنے کی چند حدیثیں

حضرت حذیفہ کے علاوہ اور صحابۂ کرام نے بھی حضرت علی سے وابستہ ہو جانے کی تاکید کی ہے اور ان کا ساتھ دینے اور مدد کرنے پر زور دیا ہے ان سے مناقب مرتضوی کا ایک اہم باب کھلتا ہے۔ چند حدیثیں ملاحظہ ہوں۔

حدیث ۱۔ اللّٰھمّ انصر من نصرہٗ واعن من اعانہٗ[1]۔ (کنز العمال ص۱۵۴ بحوالہ الطبرانی)

۱۔ یا اللہ جو علی کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد فرما اور جو علی کا تعاون کرے تو بھی اس کی اعانت فرما۔

حدیث ۲۔ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہٗ[2]

(کنز العمال ص۱۵۴ بحوالہ الطبرانی)

۲۔ یا اللہ جو علی کی مدد کرے تو بھی اس کی مدد فرما اور جو شخص ان کی مدد کرنے سے دست کش رہے تو بھی اس کی مدد سے ہاتھ اٹھالے۔

---

[1] یہ عبارت اس حدیث کا ایک پرزہ ہے۔ اللّٰھم من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ۔ وانصر من نصرہ واعن من اعانہ۔ ۱۲ کوثر

[2] یہ عبارت اس حدیث کا ایک پرزہ ہے: من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ اللّٰھم وال من والاہ وعاد من عاداہ وانصر من نصرہ واخذل من خذلہ۔ ۱۲ کوثر

حدیث ۳۔ من فارق علیا فقد فارقنی ومن فارقنی فقد فارق اللّٰہ۔

(کنز العمال ص۱۵۴ ج۶ بحوالہ طبرانی)

۳۔ جس نے علی کو چھوڑا اس نے مجھے چھوڑا، اور جس نے مجھے چھوڑا اس نے اللہ کو چھوڑا۔

حدیث ۴۔ سیکون بعدی فتنۃ، فاذا کان ذالک فالزموا علی ابن ابی طالب فانہ الفاروق بین الحق والباطل۔ (کنز العمال ص۱۵۵ ج۶)

۴۔ میرے بعد فتنہ ہوگا جب اس کا ظہور ہو تو مضبوطی سے علی ابن ابی طالب کا ساتھ پکڑ لینا کیونکہ یہ حق اور باطل کے درمیان فرق اور امتیاز کرنے والے ہیں اور فاروق ہیں۔

حدیث ۵۔ یا علی ستقاتلک الفئۃ الباغیۃ وانت علی حق فمن لم ینصرک یومئذ فلیس منی۔[1]

(کنز العمال ص۱۵۵ ج۶)

۵۔ یا علی عنقریب تم سے باغی جماعت قتال کرے گی اور تم حق پر رہو گے، اس دن جو شخص تمہاری مدد نہ کرے گا وہ میرے گروہ میں نہیں۔

حدیث ۶۔ جن راتوں میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جنات کو تعلیم و تبلیغ فرمائی ہے وہ اکابر کے علم میں چھ راتیں ہیں۔ ان میں سے ایک رات کے متعلق مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ نے اس شب میں ایک ٹھنڈی سانس لی، اس پر حضرت ابن مسعود نے جو عرض کیا اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو ارشاد فرمایا وہ حسب ذیل ہے۔

ابن مسعود ۔ یا رسول اللہ کیا مزاج ہے؟

حضور ۔ مجھے میرے ارتحال کی خبر دی گئی ہے۔

ابن مسعود ۔ کسی کو خلیفہ بنا دیجئے۔

حضور ۔ کس کو؟

---

[1] یہ وعید اس کے لئے ہے جس کو علم ہو چکا ہے کہ حضرت علی کی مدد کرنا ضروری ہے پھر بھی وہ مدد نہیں کرتا۔ لہٰذا ان متقی صحابہ پر نکتہ چینی کرنا غلط ہے جن کو اس کا علم نہ ہو سکا، یا جو حضرات معذور و مجبور ہیں اس بنا پر مدد نہ کر سکے۔ ۱۲ کوثر

ابن مسعود ابوبکر کو۔

حضور خاموش رہے، تھوڑی دیر کے بعد پھر ٹھنڈی سانس لی،

ابن مسعود استفسار حال کے بعد اور جواب ملنے کے بعد کہ مجھے میرے ارتحال کی خبر دی گئی ہے عرض کرتے ہیں کسی کو خلیفہ بنا دیجئے۔

حضور کس کو ؟

ابن مسعود عمر کو۔

حضور پھر خاموش رہے[1] اور تھوڑی دیر کے بعد پھر ٹھنڈی سانس لی۔

ابن مسعود استفسار حال کے بعد اور جواب ملنے کے بعد کہ مجھے میرے ارتحال کی خبر دی گئی ہے عرض کرتے ہیں۔ کسی کو خلیفہ بنا دیجئے۔

حضور۔ کس کو ؟

ابن مسعود علی کو۔

حضور خدا کی قسم اگر لوگوں نے علی کی اطاعت کی تو وہ ان کو جنت میں داخل کریں گے[2]۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔

والذی نفسی بیدہ لئن اطاعوہ لید خلن الجنۃ (ترجمہ وہی ہے جو اوپر ہے)

---

[1] حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کے نام پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سکوت ان کے عدم صلاحیت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اس بنا پر ہے کہ کسی کو صراحتہً خلیفہ بنانا حضور کو منظور نہ تھا۔ اوپر سنن ترمذی کے حوالے سے حدیث گذر چکی ہے۔ کہ اگر آپ کسی کو خلیفہ بناتے تو جو لوگ اس کی اطاعت نہ کرتے ان پر عذاب نازل ہوتا۔ ۱۲ کوثر

[2] خلافت کے لیے حضرت علی کا نام پیش کرنے پر ان کلمات گرامی کے ارشاد فرمانے کا مقصد حضرت علی کی اطاعت و اتباع کی ترغیب دینا ہے، کیوں کہ حضور کو معلوم تھا کہ لوگ خلافت علی کے زمانہ میں علی کی مخالفت اور بغاوت کریں گے۔ ۱۲ کوثر

نوٹ : یہ حدیث حسن ہے، مزید تفصیل فتاویٰ مولانا عبدالحی فرنگی محلی ص ۱۲۴ میں مذکور ہے۔ ۱۲ کوثر

حدیث ۷۔ ایک موقع پر حضور اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم حضرت ابوبکر کا تذکرہ فرما کر یہ دعا دیتے ہیں کہ ابوبکر پر اللہ کا رحم و کرم ہو۔ پھر حضرت عمر کا تذکرہ فرما کر یہی دعا دیتے ہیں اور حضرت عثمان کا تذکرہ فرما کر بھی یہی دعا دیتے ہیں۔

پھر حضرت علی کا تذکرہ فرما کر یہی دعا دیتے ہیں اور ایک دعا یہ بھی دیتے ہیں۔

اَللّٰھُمَّ ادر الحق معہ حیث دار — یا اللہ جدھر علی جائیں اسی طرف حق کو بھی ان کے ساتھ چلا۔

(ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳)

اس حدیث پر غور کرو۔ حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم یہ نہیں کہتے کہ یا اللہ جدھر حق جائے اسی طرف علی کو بھی چلا، بلکہ یہ دعا مانگتے ہیں کہ یا اللہ جدھر علی جائیں اسی طرف حق کو بھی ان کے ساتھ چلا۔ اس دعائے پاک کا یہ اثر ہوا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم حق کا محور بن گئے، کہ آپ کے تمام افعال حق ہیں۔ یہ بات نہیں کہ حق کے مطابق ہیں، بلکہ یہ افعال بعینہ حق ہیں، بلکہ حق ایسی چیز ہے کہ افعال مرتضوی سے اس کا انعکاس ہوتا ہے۔ جیسے سورج سے روشنی کا انعکاس۔ شاہ ولی اللہ صاحب نے التفہیمات الالٰہیہ میں اس حقیقت کو بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔ شاہ صاحب کی عبارت راقم نے اس فصل میں درج کر دی ہے، جس کا عنوان ہے "اہل بیت آیۂ تطہیر کی بنا پر معصومیت سے قریب تر ہیں"۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی یہ شان عظیم کہ حق آپ کے ساتھ ساتھ ہے جدھر آپ ہیں اسی طرف حق ہے بلکہ آپ حق کا محور ہیں۔ اور آپ کے افعال سے حق کی شعاعیں اس طرح نکلتی ہیں جیسے سورج سے کرنیں پھوٹتی ہیں کہ یہی افعال حق کا مرکز ہیں، جیسے سورج شعاعوں کا مرکز ہے۔ اسی لئے جن جن لوگوں نے آپ کے خلاف قدم اٹھایا اس کا قدم راہ حق سے ہٹ گیا۔ اور اہل سنت نے عہدِ مرتضوی میں حق اور ناحق کو اسی سے پہچانا کہ حق آپ کے ساتھ ہے اور آپ کے خلاف جو قدم اٹھا اور جو کام ہوا وہ ناحق ہے اور اس سے امت کے نیک مزاج لوگ جلد یا بدیر اس نتیجہ پر پہنچ ہی گئے کہ حق وہی ہے جو حضرت علی کہتے ہیں اور جو لوگ ان کے خلاف لڑ رہے ہیں وہ حق سے دور ہیں۔

عہد صحابہ کے بعد بھی ائمۂ دین اور مشائخ اسلام نے ہمیشہ یہی کہا ہے اور فقہائے اسلام نے بھی تصریح کی ہے کہ :

● کان علیاً ومن معہ من اھل العدل وخصمہ من اھل البغی ، (شامی ص ٣٠٦/٣)

حضرت علی اور ان کے ساتھ اہل عدل ہیں اور آپ کے مقابلہ میں جو لوگ اٹھے وہ اہل بغاوت ہیں ۔

امام جمال الدین عبداللہ بن یوسف زیلعی نصب الرایہ (ج ۴ ص ۶۹ مطبوعہ مصر) میں لکھتے ہیں :

قال امام الحرمین فی کتاب الارشاد علی رضی اللہ عنہ کان اماما حقا فی ولایتہ ، ومقاتلوہ بغاۃ وحسن الظن بھم یقتضی ان یظن بھم قصد الخیر ،

امام الحرمین نے کتاب الارشاد میں فرمایا ہے کہ علی رضی اللہ عنہ اپنی خلافت میں امام برحق تھے اور جن لوگوں نے ان سے قتال کیا ہے وہ باغی تھے ان لوگوں کے ساتھ حسن ظن کا تقاضا یہ ہے کہ یہ گمان کیا جائے کہ ان کا مقصد اچھا تھا ۔

واجمعوا علیٰ ان علیا کان مصیبا فی قتال الجمل ، وھم طلحۃ والزبیر وعائشۃ ومن معھم واھل الصفین ، وھم معاویۃ وعسکرہ ۔

اور اس پر اجماع ہے کہ حضرت علی اہل جمل سے قتال کرنے میں بھی برحق تھے ۔ اہل جمل طلحہ ، زبیر ، عائشہ اور ان کا ساتھ دینے والے لوگ ہیں اور حضرت علی اہل صفین سے قتال کرنے میں بھی برحق تھے ، اہل صفین معاویہ اور ان کی فوج ہے ۔

حدیث ۸ ۔ قریش کا ایک ممتاز سردار سہیل بن عمرو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آکر کہتا ہے : " ہمارے کچھ غلام آپ کے پاس آ گئے ہیں ، جن میں کچھ دین داری نہیں ہے ، آپ انھیں واپس کر دیجیے " ۔ اس پر حضرت ابوبکر اور حضرت عمر نے عرض کی یا رسول اللہ یہ بات صحیح ہے

کہ یہ لوگ سہیل بن عمرو وغیرہ کے غلام ہیں[۱]۔ اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔

لن تنتھوا معشر قریش حتیٰ یبعث	"اے گروہ قریش تم لوگ اپنا باطل طریقہ کبھی نہ
اللہ علیکم رجلا امتحن اللہ قلبہ	چھوڑو گے حتیٰ کہ یہ نوبت آئے گی اللہ تعالیٰ
بالایمان یضرب اعناقکم وانتم	اس انسان کو (قیام حق) کے لئے کھڑا کرے گا،
مجفلون عنہ اجفال الغنم	جس کا دل اللہ نے ایمان کے لئے جانچ رکھا
فقال ابوبکر: اناھو یارسول اللہ؟	ہے وہ تمہاری گردنیں اڑائے گا اور تم لوگ
قال: لا، قال عمر: اناھو یا	اس کے حملہ سے بھیڑ بکری کی طرح بھاگو گے"۔
رسول اللہ؟ قال: لا ولکنہ خاصف	اس پر ابوبکر نے کہا۔ یارسول اللہ کیا وہ
النعل، قال: وفی کف	شخص میں ہوں؟ آپ نے فرمایا نہیں۔
علی نعل یخصفھا لرسول	عمر نے کہا: یارسول اللہ وہ شخص میں ہوں؟
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم،	آپ نے فرمایا نہیں، بلکہ وہ ہے جو میرا جوتا درست
(کنز العمال خطرج ۶ ص ۳۹۳)	کر رہا ہے: راوی کا بیان ہے کہ علی اس وقت
	حضور کا جوتا درست کر رہے تھے۔

اس حدیث سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ شیر خدا کرم اللہ وجہہ الکریم نے اپنے عہد خلافت میں باغیوں[۲] سے جو جہاد کیا ہے وہ عین منشائے نبوی کے موافق ہے، جو لوگ اس پر چون وچرا کرتے

---

[۱] ان دونوں حضرات کا مقصد اس کا جاننا تھا کہ غلام کی واپسی کے بارے میں کیا ارشاد ہوتا ہے۔ معاذ اللہ یہ مقصد نہ تھا کہ سہیل بن عمرو کی خواہش پوری کی جائے۔ ۱۲ کوثر

[۲] حضرت طلحہ وحضرت زبیر باغی نہیں ہیں کہ ان کا مقصد حضرت علی سے لڑنا نہ تھا، صرف قاتلان عثمان سے قصاص لینا تھا۔ ملاحظہ ہو اس کتاب کی وہ فصل جس کا عنوان ہے "اس تحریک کی اصل حقیقت"۔ لیکن ان بزرگوں کی فوج یقیناً باغی تھی۔ ۱۲ کوثر

ہیں، وہ منشائے نبوی پر چون وچرا کرتے ہیں۔ منشائے نبوی کے علاوہ خود قرآن مجید کا بھی یہی حکم ہے کہ باغیوں سے قتال کرو۔

فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ۔

اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے دوسری جماعت سے بغاوت کی ہے تو باغی جماعت سے اس وقت تک قتال کرو جب تک یہ حکم الٰہی کی طرف رجوع نہ کرے۔ (یعنی جب تک بغاوت سے باز نہ آجائے۔)

علامہ ابو البرکات عبداللہ بن احمد نسفی (مولف کنز الدقائق والمنار) جو فقہ حنفی کے ایک بلند پایہ مجتہد اور بڑے متبحر مفسر ہیں، اپنی تفسیر مدارک التنزیل میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حکم الفئة الباغية وجوب قتالها ما قاتلت، فاذا كفت وقبضت عن الحروب ايديها تركت۔

باغی جماعت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ جب تک یہ قتال کرے اس وقت تک اس سے قتال کرنا فرض ہے لیکن جب یہ ہاتھ روک لے تو قتال ترک کر دیا جائے گا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے مخالفوں اور باغیوں سے جو جہاد کیا ہے وہ حکم الٰہی کی تعمیل ہے، اور ان لوگوں سے قتال کرنا بحکم قرآنی فرض تھا۔

جنگ صفین (۳۷ھ)

جنگ جمل کے بعد امیر معاویہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا قصاص لینے کے لئے اس دعویٰ

کے ساتھ اٹھے کہ علی قاتلین عثمان کے حامی ہیں اور قتل عثمان میں ان کا ہاتھ بھی شامل ہے۔

لیکن یہ امیر معاویہ کی غلطی ہے۔ حضرت علی محور حق ہیں۔ اور محور حق سے اتنی بڑی غلطی کا صدور محال اور ناممکن ہے۔

حضرت عثمان کی شہادت مدینہ میں ہوئی ہے۔ امیر معاویہ اس وقت شام میں تھے، انھیں کیسے معلوم ہوا کہ قتل عثمان میں علی کا ہاتھ بھی شامل ہے۔ یا انہوں نے اس بدترین فعل کی حمایت کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے دشمن جو درحقیقت منافق ہیں جیساکہ حدیث میں ہے[1]۔ یہ منافقین حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد امیر معاویہ کے پاس پہنچے اور اپنی نفاق پروری اور عداوت علی کی بنا پر بہتان تراشی اور غلط بیانی سے کام لیا اور بتایا کہ علی قاتلان عثمان کے حامی ہیں، اور قتل عثمان میں ان کا بھی ہاتھ شامل ہے، امیر معاویہ نے ان مفسدوں کا بیان صحیح مان لیا، حالانکہ انھیں اصل حقیقت کا پتہ لگانا چاہیے تھا[2]۔ بہرحال یہی بات ہو یا کچھ اور بھی ہو، اللہ اعلم بالصواب، غرض امیر معاویہ قصاص عثمان کے نام سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے خلاف ایک فوج گراں لے کر لڑنے کے لئے اٹھے، اسلام نے کہا یہ باغی جماعت ہے اور خلیفہ برحق کے خلاف خروج کرنا بغاوت ہے۔

---

[1] حدیث یہ ہے لا یحبك الا مومن ولا یبغضك الا منافق۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۵ نسائی ج ۲ ص ۲۷۱ ونحوہ عند مسلم ج ۱ ص ۶۰ وابن ماجہ ص ۱۲) ترجمہ یہ ہے: اے علی تم سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہے اور تم سے وہی بغض رکھے گا جو منافق ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] اصلیت یکار رہی تھی کہ منافقین آپ کے بارے میں جو ایسی باتیں بول رہے ہیں سراسر بہتان ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماچکے تھے کہ "اے علی تمہاری مثال عیسیٰ علیہ السلام جیسی ہے۔ یہود نے عیسیٰ سے عداوت کی حتیٰ کہ ان کی ماں پر بہتان باندھا اور نصاریٰ نے ان کو وہ درجہ دیا جو ان کا ہے ہی نہیں (بزار ابو یعلی۔ حاکم، تاریخ الخلفاء ص ۱۲۰) ہوا یہی کہ جیسے عیسیٰ علیہ السلام پر بہتان لگایا گیا۔ اسی طرح حضرت علی پر بہتان لگایا گیا کہ قتل عثمان میں ان کا ہاتھ بھی شامل ہے۔ اور جیسے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں غلو کر کے خدا کہا گیا! اسی طرح حضرت علی کے بارے میں غلو کر کے نصیری فرقہ نے ان کو خدا کہا۔ ۱۲ کوثر۔

بغاوت کے مقابلہ میں خلیفۂ برحق امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا اٹھنا فرض تھا، قرآن مجید کا حکم ہے۔

فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِىْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ‘

(الحجرات ع ۱)

اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے دوسری جماعت کے ساتھ بغاوت کی ہے تو باغی جماعت سے اس وقت تک قتال کرو جب تک یہ حکم الٰہی (یعنی اطاعت خلیفہ) کی طرف رجوع نہ کرے۔

اس حکم الٰہی کی بنا پر فقہائے اسلام نے اعلان کیا ہے کہ باغیوں سے قتال کرنا فرض ہے اور تصریح کی ہے کہ:۔

ھم الخارجون علی الامام الحق بغیر حق (الدر المختار علی الشامی صفحہ ۳۰۹ ج ۳)

باغی وہ لوگ ہیں جو خلیفۂ برحق کے خلاف ناحق خروج کریں۔

ان لوگوں کا قصاص عثمان کے نام پر خلیفۂ برحق سے لڑنے کے لئے کھڑا ہونا ہی سرے سے غلط ہے، لہٰذا ناحق خروج ہے۔ اس پر کچھ بحث گذر چکی ہے۔ مزید باتیں ملاحظہ ہوں۔ تسلسل کے لئے گذشتہ مباحث بھی لے لئے گئے ہیں۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امیر المومنین سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ مظلوم قتل ہوئے، ان کا قصاص لینا چاہیئے۔

لیکن قصاص کون لے؟

حکومت یا پبلک؟

اور قاتل شرعی ثبوت سے متعین کیا جائے گا۔؟ یا لوگوں کی خواہشات سے؟ بالفاظ دیگر قانون اسلام کو مد نظر رکھا جائے گا؟ یا لوگوں کے جذبات کو قانون کا درجہ دیا جائے گا؟

ان باتوں پر سنجیدگی سے غور کرنا بے حد ضروری ہے۔ اور امیر المومنین کرم اللہ وجہہ الکریم نے اس کا پورا پورا لحاظ رکھا ہے۔ ان امور سے نکات ذیل پر پیدا ہوتے ہیں جن کی روشنی میں

صاف نظر آتا ہے کہ حضرت علی کی پوزیشن ہر خردہ گیری سے بالاتر ہے کہ اسلامی قانون میں کسی کی تبدیلی کو آپ نے گوارا نہیں فرمایا۔ وہ نکات یہ ہیں۔

۱۔ قصاص کی سزا حکومت ہی دے گی، پبلک کو اس کا حق نہیں۔

۲۔ اب پبلک سے یہ کہنا کہ عثمانؓ کا قصاص لو، اور اس کے لئے فوج جمع کرنا، اور خلیفۂ برحق سے جنگ کے لئے اٹھنا نقض امن کی نہایت خطرناک صورت ہے اور خلافت کی صریح بغاوت ہے جو قطعاً حرام ہے، قرآن مجید، حدیث اور فقہ سب کی تصریحات ہیں کہ باغی سے قتال کرنا فرض ہے۔ فقہائے اسلام نے یہاں تک لکھا ہے کہ:

ومن دعا الامام الیٰ ذالک ای قتالھم افترض علیہ اجابتہ (الدر المختار علی الشامی ص۳۱۱/۳)	امام برحق باغیوں سے قتال کرنے کے لئے جن لوگوں کو بلائے ان پر فرض ہے کہ اس کے لئے حاضر ہوجائیں اور اطاعت کریں۔

اس فقہی قانون کی بنیاد قرآن و حدیث کے نصوص پر ہے جو حسب تصریح علامہ شامی وغیرہ حسب ذیل ہیں۔

- قرآن مجید میں ہے:

اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ	اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اور اپنے صاحب حکم (خلیفۂ برحق) کی۔

- حدیث میں ہے:

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی کان راسہ زبیبۃ (بخاری مشکوٰۃ ص ۳۱۹)	سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر کوئی ایسا حبشی غلام فرماں روا بنا دیا جائے جس کا سر علمقی کی طرح (پچکا) ہو۔

اس مضمون کی حدیثیں متعدد ہیں۔

۳۔ جب قصاص کی سزا دینا حکومت ہی کا کام ہے، تو خلیفۂ وقت حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم

نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے قصاص کی سزا کیوں نہیں دی۔
اس کا ایک بھی ثبوت نہ مل سکا کہ قاتل کون ہے؟

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفۂ مظلوم حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے تین روز بعد خلیفہ منتخب ہوئے۔ اور منصب خلافت پر فائز ہوتے ہی سب سے پہلے قصاص عثمان رضی اللہ عنہ ہی کے مسئلہ پر توجہ فرمائی، لیکن اس کا جاننے والا ایک متنفس بھی نہ نکلا کہ قاتل فلاں ہے اور ایک بھی عینی شہادت نہ مل سکی کہ فلاں شخص نے خلیفۂ مظلوم کو قتل کیا ہے۔
اب قتل کی سزا کس کو دی جائے؟

اگر شبہ میں کسی کو یہ سزا دی جائے یعنی قتل کر دیا جائے تو یہ بہت بڑا ظلم ہے اور سخت حرام ہے۔ اور اس سے قانون اسلام کے بجائے ایک ظالمانہ قانون کا نفاذ ہوگا، امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ الکریم اسے ایک سیکنڈ کے لئے بھی گوارا نہیں کر سکتے کہ اسلام میں ظلم وجور کا قانون نافذ ہو۔

کیا تمام بلوائیوں کو قتل کر دیا جائے جنہوں نے خلیفۂ مظلوم کے مکان کا محاصرہ کر لیا تھا؟
ایسا بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی صریح ظلم ہے کیونکہ محاصرہ کرنے والوں میں صحابۂ کرام بھی ہیں ان لوگوں نے بطور احتجاج محاصرہ کیا تھا۔ ان کا محاصرہ قتل کے لئے قطعاً نہ تھا، بلکہ اس لئے تھا کہ مروان کو حوالہ کر دو، ایسی صورت میں ان لوگوں کو کیسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ اگر انھیں قتل کر دیا گیا تو اسلام میں ظلم وجور کا قانون نافذ کیا گیا۔ امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اسلام کے نظام عدل کے محافظ ہیں، انہوں نے بلوائیوں کو قتل کی سزا نہ دے کر اسلام کے نظام عدل کی حفاظت فرمائی اور خلافت راشدہ کو بال برابر بھی اپنی جگہ سے ہٹنے نہیں دیا۔ یہ آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے کہ گو پروپیگنڈے کی بنا پر ہزاروں آدمی کا مطالبہ ہے کہ محاصرین ہی قاتلین عثمان ہیں۔ ان سب کو قتل کر ڈالو یا ہمیں حوالہ کر دو کہ ہم قتل کر ڈالیں، لیکن آپ نے قرآن اور اسلام کے قانون عدل کے مقابلہ میں ہزاروں آدمیوں کی باتوں کو ٹھکرا دیا اور قانون اسلام میں ذرا بھی ترمیم گوارا نہ

کی۔ اس طرح اسلام کے نظام عدل کو زندہ رکھا۔ گو آپ کو اس کی بہت بڑی قیمت دینی پڑی حتیٰ کہ جنگ جمل و جنگ صفین کے طوفان خون آپ کے سر سے گذر رہے بالآخر اپنی جان عزیز بھی قربان کرنی پڑی۔ یہ سب ہوا مگر آپ نے آیت قصاص کے معنی میں تحریف نہ ہونے دی اور اس کے جو عجیب و غریب معنے ایجاد کئے جا رہے تھے جس کی بنا پر پورے محاصرین کا قتل کرنا ضروری قرار دیا جا رہا تھا، آپ نے اسے چلنے نہ دیا، اور قرآن مجید کی غلط تاویل کا دروازہ کھلنے ہی نہ دیا۔ اس لئے آپ کے مقابلہ میں فوجیں کھڑی ہوئیں۔ آپ نے ان کے قتال کا جواب دیا، مگر غلط تاویل کو گوارا نہ فرمایا آپ کی یہ شان عظیم اسلام کی محافظ عظیم ہے، جس کا تذکرہ حدیث میں بھی آیا ہے۔ مسند احمد مصنف عبد الرزاق، مستدرک حاکم، مسند سعید ابن منصور وغیرہ میں حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے حدیث مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

ان منکم من یقاتل علی تاویل القرآن کما قاتلت علی تنزیله قیل ابوبکر و عمر؟ قال لا، ولکن خاصف النعل- یعنی علیا، (کنز العمال ص۱۵۵)	بالیقین تم لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے جو قرآن کے خود ساختہ مطلب نکالنے پر اسی طرح قتال کریگا جس طرح میں نے قرآن کے نزول پر قتال کیا ہے لوگوں نے کہا یہ ابوبکر و عمر ہوں گے؟ آپ نے فرمایا نہیں یہ علی ہیں جو اس وقت میرا جوتا درست کر رہے ہیں۔

ایک حدیث میں مزید تفصیل آئی ہے جو درج ذیل ہے:

والذی نفسی بیدہ ان فیکم لرجلا یقاتل الناس من بعدی علی تاویل القرآن کما قاتلت المشرکین علی تنزیله وھم یشھدون ان لا اله الا الله فیکبر قتلھم علی الناس حتیٰ	اس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ بالیقین تم لوگوں میں ایک ایسا شخص بھی ہے جو قرآن کے خود ساختہ مطلب نکالنے پر اسی طرح قتال کرے گا، جس طرح میں نے قرآن کے نزول (کے انکار) پر مشرکین سے قتال کیا ہے۔ حالاں کہ قرآن مجید کے اس غلط معنی نکالنے والے لا الٰہ الا اللہ

یطعنون علی ولی اللہ تعالیٰ و یسخطون عملہ کما سخط موسیٰ امر السفینۃ والغلام والجدار فکان ذالک کلہ رضی اللہ تعالیٰ (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۵)

کی شہادت دیں گے۔ اسی لئے ان کو قتل کرنا لوگوں کو بڑا ناگوار معلوم ہوگا۔ اور اس فعل کو لوگ اس طرح برا سمجھیں گے جیسے موسیٰ نے خضر کے کشتی توڑنے، لڑکے کو مار ڈالنے اور دیوار کو درست کرنے کو برا سمجھا تھا، حالانکہ یہ سب رضائے الٰہی کے لئے تھا۔

یہاں اسلام کا یہ قانون قصاص بھی ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ جو قاتل ہے بس اسی کو قصاص میں قتل کیا جائے۔ کسی دوسرے کو قتل کرنا ہرگز جائز نہیں۔ اس قانون کو قرآن مجید نے آیت قصاص میں بیان فرمایا ہے اور حدیث نے بڑی واضح تشریح فرمائی ہے حتیٰ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہاں تک فرمایا ہے:

اذا امسک الرجل الرجل وقتلہ الآخر یقتل الذی قتل ویحبس الذی امسک[1] (دار قطنی)

اگر کسی نے ایک آدمی کو پکڑ لیا۔ اور دوسرے آدمی نے اسے قتل کر ڈالا تو جس نے قتل کیا ہے (قصاص میں) اسی کو قتل کیا جائے گا اور جس نے پکڑا ہے (اسے قتل نہیں کیا جائے گا) بلکہ قید کر دیا جائے گا۔

فقہائے اسلام نے اس قانون اسلام کی بنا پر جزئیات کی تصریح بھی کی ہے۔

اور اسلام کا یہ قانونِ عدل ہمیشہ ملحوظ رکھنا پڑے گا جو حدیث کے ان الفاظ میں ہے:

المسلمون تتکافا دماءھم (مشکوٰۃ ص ۳۰۳ بحوالہ ابوداؤد، ترمذی، ابن ماجہ)

قصاص میں مسلمانوں کا خون مساوی حیثیت رکھتا ہے۔

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۰۳۔ منتقی الاخبار ہمراہ نیل الاوطار ج ۷ ص ۱۸۱۔ بلوغ المرام ص ۱۴۸۔ حافظ ابن حجر نے بلوغ المرام میں لکھا ہے اس کے راوی ثقہ ہیں (رجالہ ثقات) ۱۲ کوثر

حدیث کا مطلب یہ ہے کہ شریف اور وضیع، چھوٹے بڑے اور عالم و جاہل، مرد و زن غرض سب کا خون مساوی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کے خون کے بدلہ میں خواہ وہ کتنے ہی پایہ کا آدمی ہو ایک سے زائد آدمی کو قتل کیا جائے۔ بس جو قاتل ہے اسی کو قتل کیا جائے گا۔ اس کے برخلاف جاہلیت کا اصول یہ تھا کہ بڑے آدمی کو کوئی شخص قتل کرتا تھا تو قصاص میں بہتوں کو قتل کر دیا جاتا تھا۔ اسلام نے اس ظالمانہ دستور کو یک لخت مٹا ڈالا۔

قصاص عثمان کیلئے امیر معاویہ کا خروج اور حضرت علی کا دفاع

امام سیوطی تاریخ الخلفاء ص ۱۲۲ میں لکھتے ہیں کہ جنگ جمل کے بعد حضرت علی بصرہ میں پندرہ روز تک مقیم رہے پھر کوفہ تشریف لائے۔

ثم خرج علیہ معاویۃ بن ابی سفیان ومن معہ بالشام فبلغ علیا، فسار فالتقوا بصفین فی صفر سنۃ سبع وثلاثین، ودام القتال بہا ایاما فرفع اھل الشام مصاحف یدعون الی ما فیہا مکیدۃ من عمرو بن العاص فکرہ الناس الحرب۔

اس کے بعد معاویہ ابن ابی سفیان نے اپنے شامی رفقا کو لے کر علی کے مقابلہ میں خروج کیا، علی کو اس کی اطلاع ملی تو (مقابلہ کے لئے) روانہ ہوئے اور صفر ۳۷ھ میں بمقام صفین مقابلہ ہوا اور کئی روز تک جنگ کا سلسلہ قائم رہا آخر میں اہل شام نے (نیزوں پر) قرآن شریف بلند کیا کہ ہم اس کے حکم کی دعوت دیتے ہیں، یہ عمرو بن عاص کی ایک چال تھی، اب لوگوں نے جنگ کو برا سمجھا (اور ہاتھ روک لیا)

یہ جنگ صفین کی مختصر سے مختصر رپورٹ ہے اور مفصل بیان دیگر کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ حقیقت حال سمجھنے کے لئے کچھ ضروری واقعات ذیل میں درج کئے جاتے ہیں۔

حضرت علی کی طرف سے امیر معاویہ کو مفاہمت

امیر معاویہ بیس برس تک شام کے گورنر

رہ چکے تھے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد میں ان کی گورنری کا رقبہ بہت وسیع کر دیا تھا اس میں شام، لبنان، اردن اور آج کا اسرائیلی علاقہ بھی تھا۔ اتنی طویل مدت تک گورنر رہنے کی بنا پر یہاں ان کا رسوخ اتنا بڑھ گیا تھا، گویا سیاہ و سفید کے مالک تھے، گو اصولاً وہ حضرت عثمان کے ماتحت تھے، لیکن مستقل فرماں روائی کے لئے بہت کچھ راستہ ہموار ہو چکا تھا اسی لئے جب حضرت علی نے ان کو بیعت کے لئے خط لکھا تو انہوں نے بیعت نہیں کی بلکہ یہ اٹکاؤ ڈال دیا کہ پہلے حضرت عثمان کے قاتلوں کو گرفتار کر کے قصاص لو، یا ہمارے حوالہ کر دو کہ ہم انہیں قتل کر ڈالیں اس کے بغیر ہم بیعت نہیں کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ انہیں اس مطالبہ کا کوئی حق نہیں تھا کیونکہ یہ تو خلیفہ کی عدول حکمی ہے جو شرعاً حرام ہے، سب کو معلوم ہے کہ حضرت علی خود ساختہ خلیفہ نہ تھے بلکہ مہاجرین و انصار نے ان کے بار بار انکار کے باوجود آزاد مشاورت سے انہیں خلیفہ منتخب کیا تھا۔ اور ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی تھی اور شروع سے اب تک مہاجرین و انصار ہی کی بیعت سے کوئی شخص خلیفہ ہوتا تھا کیوں کہ ان کی اس صوابدید پر تمام مسلمانوں کو اعتماد تھا۔ اس لئے کہ دیانت، صداقت، خلوص، حسن نیت، اسلام کی مفاد طلبی، مسلمانوں کی خیر خواہی اور دینی اصابت رائے میں یہ سب سے آگے تھے۔ اس لئے ان کی بیعت نے جسے خلیفہ بنا دیا اسے بلا چون و چرا خلیفہ راشد مانا گیا ہے، جس کے بعد تمام مسلمانوں پر اس کی اطاعت واجب ہو گئی اس صحیح ترین اصول پر جب مہاجرین و انصار نے حضرت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی تو تمام مسلمانوں پر ان کی اطاعت واجب ہو گئی، اور امیر معاویہ پر بھی بحکم قرآنی یہ فرض عائد ہو گیا کہ بلا چون و چرا حضرت علی کی اطاعت کریں، اطاعت کی بیعت کر لینے کے بعد جو کہنا ہو اس کی درخواست کر سکتے ہیں اس کے بغیر کسی بھی مطالبہ کا نہ کوئی حق ہے نہ اس کی کوئی وجہ جواز ہے۔

پھر خود امیر معاویہ کا مطالبہ ایک مثبت ثبوت ہے کہ امیر معاویہ کے اصول پر بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ خلیفہ تھے۔ اگر خلیفہ نہ تھے تو یہ کیوں کہا؟ کہ قاتلان عثمان سے قصاص لو، یا ہمارے حوالہ کر دو تا کہ ہم انہیں قتل کریں، جب خود امیر معاویہ کے اصول پر بھی حضرت علی خلیفہ ہیں تو ان

کا فرض ہے کہ حضرت علی کی اطاعت کریں اور اطاعت کی بیعت کرلیں کیونکہ خلیفہ کی اطاعت کرنا فرض ہے۔

جیسا کہ اوپر شرح و بسط کے ساتھ لکھا جاچکا ہے کہ قصاص عثمان کا مطالبہ ہی خلاف آئین ہے، نیز شریعت اسلام میں اس کی کہیں بھی گنجائش نہیں کہ کسی مقتول کے قصاص کے لئے جو چاہے کھڑا ہو جائے اور اپنی مرضی کے مطابق جس کو چاہے مجرم ٹھہرا کر قتل کر ڈالے یا حکومت کو مجبور کرے کہ ان مجرموں کو ہمارے حوالہ کر دو ہم انھیں قتل کر ڈالیں اور اگر ایسا نہیں کیا گیا تو ہم حکومت کو جائز حکومت ہی نہ مانیں گے۔ اور اطاعت کی بیعت ہی نہ کریں گے۔

قرآن و حدیث اور شریعت اسلام ہی نہیں بلکہ دنیا کا کوئی بھی آئین و قانون اسے جائز کارروائی نہیں مان سکتا لیکن امیر معاویہ اپنی ضد پر اڑے رہے، حضرت علی نے مفاہمت کے خطوط بھی لکھے، ایک خط میں تحریر فرماتے ہیں:

"جن لوگوں نے ابو بکر و عمر کے ہاتھ پر بیعت کی تھی انھوں نے میری بیعت کرلی ہے۔ اس کے بعد کسی کو چون و چرا کی گنجائش نہیں ہے، خلیفہ کے انتخاب کا حق انصار و مہاجرین کو ہے، انصار و مہاجرین کی طرح تم بھی بیعت کرلو عافیت اسی میں ہے۔"

اس معقول تحریر کے بعد بیعت کرلینی چاہئے تھی، مگر امیر معاویہ کے سامنے تو ایک دوسرا منصوبہ تھا جو بیعت سے روک رہا تھا۔ اس کو پورا کرنے کے لئے انھیں ضرورت ہوئی کہ عمرو بن عاص کو اپنا دست و بازو بنائیں کہ سیاست میں پورے عرب کے اندر فرد تھے۔ امیر معاویہ نے ان کی مانگ کی بنا پر مصر کی حکومت دینے کا تحریری معاہدہ انھیں حوالہ کر دیا اب عمرو بن عاص نے نہایت مذموم اور خطرناک اسکیم بنائی جس میں قتل عثمان کا ایک مجرم خلیفۂ رسول سیدنا علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کو قرار دیا، جو اس زمانہ کے سب سے بڑے متقی تھے جن کی تعریف میں قرآن کی متعدد آیتیں ہیں اور ان کے فضائل میں اتنی حدیثیں ہیں جتنی کسی کی بھی تعریف میں نہیں جن کی بنا پر تمام مسلمانوں کا

اجماع ہے کہ حضرت علی کے بعد نہ کوئی شخص اس درجہ کا ہوا ہے، نہ آئندہ ہوگا۔ افسوس کہ اللہ ورسول کی ایسی محبوب شخصیت کو عمرو بن عاص نے اپنی سیاسی مصلحت کی بنا پر قتل عثمان کا مجرم ٹھہرانے کی اسکیم بنائی اور امیر معاویہ کو مشورہ دیا کہ علی جیسے شخص کی مخالفت میں بڑے خطرات ہیں اس لئے پہلے شام کے بااثر لوگوں کو سمجھاؤ اور یقین دلاؤ کہ عثمان کے قتل میں علی کی شرکت تھی[۱]۔

اس مشورہ پر عمل ہوا اور اس زور شور سے اس اسکیم کو پھیلایا گیا کہ شام کا پورا صوبہ حضرت علی سے لڑنے اور ان سے قصاص عثمان لینے کے لئے امیر معاویہ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوگیا، درحقیقت اس کا مقصد قاتلان عثمان سے نہیں بلکہ خلیفۂ وقت سے خون عثمان کا بدلہ لینا ہے۔

حضرت علی نے مفاہمت کا پھر خط لکھا، مگر امیر معاویہ نے کوئی اثر نہ لیا۔ آپ نے ایک خط عمرو بن عاص کو بھی لکھا کہ:۔

"دنیا کا لالچ چھوڑ دو، اور جو طریقہ اختیار کیا ہے اس سے باز آؤ اور معاویہ کی غلط روی میں معاویہ کا ساتھ دیکر اپنے اعمال برباد نہ کرو"۔[۲]

لیکن اس کا بھی کوئی نتیجہ نہ نکلا۔

حضرت علی کے قاصد عبداللہ بن جریر بجلی کو امیر معاویہ نے شام کا یہ نقشہ دکھلایا کہ:

حضرت عثمان کا خون آلود پیرہن اور ان کی بیوی نائلہ کی کٹی ہوئی انگلیاں جن کو امیر معاویہ نے مدینہ منورہ سے منگوا کر دمشق کی جامع مسجد میں آویزاں کرا دیا تھا، انھیں دیکھ دیکھ کر شامیوں کے جذبات قابو سے باہر ہو گئے ہیں اور ان کے سامنے کھڑے ہو کر زار زار روتے ہیں اور کہتے ہیں:

"علی نے عثمان کو قتل کیا ہے، ہم ان سے لڑکر یا اپنی جان دے دیں گے یا جان لے کر رہیں گے"۔[۳]

---

[۱] اس مشورہ کو مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے بھی تاریخ اسلام ج ۱ ص ۳۷۰ میں اخبار الطوال کے حوالہ سے لکھا ہے۔ ۱۲ کوثر

[۲] اس خط کو مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے بھی تاریخ اسلام ج ۱ ص ۳۲۱ میں اخبار الطوال کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ ۱۲ کوثر

[۳] یہ قول تاریخ اسلام ج ۱ ص ۳۲۸ میں بھی ہے جو تاریخ طبری ج ۶ ص ۳۲۵۵ سے منقول ہے۔ ۱۲ کوثر

جنگ روکنے کی کوشش

حضرت جریر نے حضرت علی کو یہ پورا واقعہ سنایا اور امیر معاویہ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دی۔ یہ نقشہ بڑا تشویشناک تھا اسے دیکھ کر امت کے خیر خواہ بزرگوں نے جنگ روکنے کی کوشش کی، مگر امیر معاویہ اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو درداء اور حضرت ابوہریرہ نے بھی سیدنا علی مرتضیٰ اور امیر معاویہ سے گفتگو کی اور حضرت علی کو امیر معاویہ کا ایک ایسا پیام بھی سنایا جس پر ان کو توبہ کرنی پڑی کہ حضرت علی سے ایسی بات کیوں کہی۔

شاہ ولی اللہ صاحب نے ازالۃ الخفاء (ص ۱۱-۱۲ و ص ۹۳) میں اس واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا ہے، لکھتے ہیں۔

(کلام عبد الرحمٰن بن غنم اشعری فقیہ شام)

چوں ابوہریرہ و ابو درداء از نزدیک	جب ابوہریرہ و ابو درداء حضرت علی کو معاویہ
حضرت مرتضیٰ برگشتند، دانشیاں میانجی	کا یہ پیام سنا کر واپس ہوئے کہ معاویہ کا مطالبہ
بودند میان معاویہ و حضرت مرتضیٰ، و معاویہ	ہے کہ "خلافت کو چھوڑ دو اور اسے مسلمانوں کے درمیان
طلب می کرد کہ خلافت بگزارد و شوریٰ	شوریٰ پر رکھو" تو حضرت عبد الرحمٰن بن غنم
گردد میان مسلمین فکان مما قال: عجبا	نے ان دونوں سے کہا: تم دونوں سے سخت تعجب
منکما کیف جاز علیکما ما جئتما بہ	ہے کہ علی کے پاس ایسا پیغام لے جانا تم نے کیسے
تدعوان علیا ان یجعلہا شوریٰ	جائز سمجھا؟ تم دونوں نے علی کو اسکی دعوت کیسے دی؟
وقد علمتما انہ قد بایعہ المہاجرون	کہ خلافت کو شوریٰ کے اندر رکھ دیں حالانکہ
والانصار، واہل الحجاز والعراق	تم دونوں جانتے ہو کہ علی کی بیعت مہاجرین
وان من رضیہ خیر ممن کرہہ،	وانصار اور اہل حجاز و اہل عراق نے کی ہے
ومن بایعہ خیر ممن لم یبایعہ	اور یہ بھی جانتے ہو کہ جو لوگ علی کی خلافت کو
وای مدخل المعاویۃ فی الشوریٰ	پسند کرتے ہیں اور خوش ہیں وہ ان لوگوں سے بہت بہتر ہیں

وهو من الطلقاء الذين لا يجوز لهم الخلافة، وهو وابوه رؤس الاحزاب۔

فندما على مصيرهما وتابا بين يديه، اخرجه ابو عمرو في الاستيعاب

ہیں جو اس سے ناخوش ہیں اور یہ بھی جانتے ہو کہ جن لوگوں نے علی سے بیعت کی ہے وہ ان لوگوں سے بہت بہتر ہیں جنہوں نے بیعت نہیں کی ہے اور شوریٰ میں معاویہ کو داخل ہونے کی جگہ کہاں؛ یہ تو طلقا میں ہیں جن کو خلافت ملنے کا جواز ہی نہیں یہ اور ان کے باپ غزوۂ خندق میں کافروں کے سردار تھے

ابوہریرہ و ابو درداء عبدالرحمٰن بن غنم کا کلام سن کر پیام لے جانے پر نادم ہوئے اور ان کے سامنے توبہ کی۔ اسے ابو عمرو (ابن عبدالبر) نے استیعاب میں روایت کیا ہے۔

اس واقعہ سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت ابو درداء اور حضرت ابوہریرہؓ جیسے بلند پایہ صحابہ بھی امیر معاویہ کی باتوں میں آکر زبان پر ایسی بات لائے جن پر ان کو سخت ندامت ہوئی اور توبہ کرنی پڑی پھر شام کے عوام تو عوام ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ امیر معاویہ کا اصل مقصد یہ تھا کہ علی کے ہاتھ سے خلافت نکل جائے، اور شوریٰ کسی دوسرے کو خلیفہ منتخب کرے۔ ظاہر ہے کہ خود شوریٰ نے تو حضرت علی کو خلیفہ منتخب کیا ہے۔ اب شوریٰ کے دوبارہ انتخاب کا کیا سوال ہے؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ شوریٰ میں توسیع کی جائے، اس راستے سے اپنے کافی آدمی اس میں آجائیں گے، ممکن ہے کہ کوئی دوسرا مقصد ہو، واللہ اعلم بالصواب۔

غرض امیر معاویہ اپنے منصوبہ کے تحت حضرت علیؓ سے لڑنے کے لئے اس طرح کمر بستہ ہو گئے کہ ہر مفاہمت بے نتیجہ ہو کر رہ گئی اور شامیوں کو لے کر لڑنے کے لئے نکل پڑے، اب چار و ناچار حضرت علی کو بھی میدان میں آنا پڑا۔ آپ کی فوج میں ستر بدری صحابہ، سات سو بیعت الرضوان والے صحابہ، ان کے علاوہ بکثرت مہاجرین و بیشتر انصار تھے۔

میدان صفین

دریائے فرات پر شامی فوجوں کی ساحل بندی

امیر معاویہ کو فوج حیدری کی روانگی کی اطلاع ملی تو آگے بڑھ کر میدان صفین میں اپنی فوجیں اتار دیں۔ یہ مقام فرات کے مغربی جانب رقہ کے قریب ہے۔ ان لوگوں نے دریائے فرات پر قبضہ کر کے پانی پر پہرہ لگا دیا۔ اور فوج حیدری پر پانی بند کر دیا۔ اس سے حضرت علی کی فوج کو بڑی پریشانی ہوئی۔ آپ نے پیام بھیجا کہ پانی کی بندش مناسب نہیں، لیکن شامی اپنی ضد پر اڑے رہے۔

پانی پر حضرت علی کا قبضہ اور سب کو پانی سے فائدہ اٹھانے کا اذن عام

مجبور ہو کر حضرت علی کو پانی پر قبضہ کر لینے کا حکم دینا پڑا، آپ کی فوج نے پانی پر قبضہ کر لیا، لیکن آپ نے شامیوں کا پانی بند نہیں کیا، بلکہ ان کو بھی پانی لینے اور فائدہ اٹھانے کا اذن عام دیدیا۔

کتنا عظیم الشان فرق ہے امیر معاویہ اور حضرت علی کے طرز عمل میں۔

حضرت علی کی طرف سے مفاہمت کی پھر کوشش

جیسے حضرت علی نے مفاہمت کی بارہا کوشش فرمائی ہے اسی طرح میدان صفین میں بھی اسکی کوشش فرمائی۔ چنانچہ مفاہمت کے لئے امیر معاویہ کے پاس ایک وفد بھیجا، مگر انہوں نے یہ جواب دیا "میرے پاس سے چلے جاؤ، میرے اور تمہارے درمیان اب تلوار ہی سے فیصلہ ہوگا۔"[1]

---

[1] کامل ابن اثیر (ج ۳ ص ۱۴۶)

جنگ کا آغاز

امیر معاویہ نے جمادی الاولیٰ ۳۶ھ میں جنگ چھیڑ دی جس کا سلسلہ جمادی الاخری کے آخر تک قائم رہا۔ اس پورے عرصہ میں صبح و شام معمولی جھڑپ ہو جاتی تھی، کوئی بڑی خوں ریز جنگ نہ ہوئی۔ رجب میں جنگ روک دی گئی۔ اور محرم کے آخر تک کے لئے التوائے جنگ کا اعلان ہو گیا۔

حضرت علی کی طرف سے مفاہمت کی پھر کوشش

التوائے جنگ کے زمانہ میں حضرت علی نے مفاہمت کی پھر کوشش فرمائی۔ اور مشہور صحابی حضرت عدی بن حاتم کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا جس نے امیر معاویہ کو سمجھایا کہ "سب لوگوں نے حضرت علی کی خلافت پر اجماع کر لیا ہے۔ آپ اور آپ کے ساتھی ہی اجماع سے الگ ہیں۔ اور یہ تفرقہ ہے جس سے بچنا ضروری ہے"۔

امیر معاویہ نے کوئی معقول جواب نہیں دیا، وہی مطالبہ رکھا کہ "علی قاتلان عثمان کو ہمارے حوالہ کر دیں کہ ہم انھیں قتل کر ڈالیں، اس کے بعد ہم علی کی بات مان لیں گے۔ اور اطاعت قبول کر کے جماعت کے ساتھ ہو جائیں گے"۔

"علی کا دعویٰ ہے کہ ہم نے عثمان کو قتل نہیں کیا ہے تو جن لوگوں نے قتل کیا ہے انھیں ہمارے حوالہ کر دیں کہ ہم حضرت عثمان کے بدلہ انھیں قتل کر دیں۔ اسکے بعد وہ خلافت سے دست بردار ہو جائیں تاکہ مسلمان شوریٰ سے اتفاق کر کے کسی کو خلیفہ بنائیں"۔

غور کیجئے عجیب و غریب باتیں ہیں (۱) قصاص عثمان کا مطالبہ ہے جو سراسر آئین و ضابطہ کے خلاف ہے کہ اطاعت خلیفہ کے لئے اس قسم کی شرط منوانے کا کسی کو حق ہی نہیں (۲) پھر خلافت سے دست بردار ہو جاؤ (۳) اور شوریٰ پھر سے خلیفہ منتخب کرے۔ یہ دونوں باتیں نظام اسلامی کو توڑنے والے مطالبات ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ انتخاب خلیفہ کے لئے شروع سے نظام اسلامی یہی رہا ہے کہ مہاجرین و انصار نے جس کے ہاتھ پر بیعت کر لی وہ باضابطہ خلیفہ مانا گیا، اب یہ مطالبہ کرنا کہ تم خلافت سے دست بردار ہو جاؤ اور شوریٰ اتفاق کر کے کسی کو خلیفہ بنائے۔ انتخاب خلیفہ کے نظام کو یکسر توڑنے

والامطالبہ ہے جس کے بعد مہاجرین و انصار کے فیصلہ کا کوئی وزن ہی نہیں رہتا۔ ان کی دینی حیثیت یک قلم مٹ جاتی ہے۔ اور ان کے فیصلہ سے جو دینی نظام بنا ہے گویا وہ ایسا ہے جس کے توڑنے کا ہر شخص کو حق حاصل ہے۔

حقیقت میں اس قسم کی باتیں خلیفۂ رسول کی مخالفت و بغاوت کے لازمی نتائج ہیں اس لئے قرآن و حدیث نے اس مخالفت و بغاوت پر بڑے سخت احکام جاری کئے ہیں۔ اس موقع پر قرآن و حدیث کے نصوص ذیل اور ائمۂ دین کے ارشادات فطری طور پر ذہن میں آتے ہیں:—

۱۔ فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ۔ (الحجرات ع ۱)	۱۔ (قرآن) اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے دوسری جماعت کی بغاوت کی ہے تو باغی جماعت سے اس وقت تک قتال کرو جب تک یہ حکم الٰہی کی طرف رجوع نہ کرے۔ (سورہ الحجرات ع ۱)
۲۔ حکم الفئة الباغية وجوب قتالها قاتلت فاذا كفت و قبضت عن الحرب ايديها ترك (تفسیر مدارک برا کلیل ج ۶ ص ۲۲۲)	۲۔ (تفسیر) باغی جماعت کے بارے میں حکم یہ ہے کہ جب تک یہ قتال کرے اس وقت تک اس سے قتال کرنا فرض ہے لیکن جب یہ ہاتھ روک لے تو قتال ترک کر دیا جائے گا۔
۳۔ یا علی ستقاتلك الفئة الباغية وانت على حق۔ (حدیث کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۵)	۳۔ (حدیث) اے علی عنقریب تم سے باغی جماعت قتال کرے گی اور تم حق پر رہو گے۔
۴۔ سیکون بعدی فتنة فاذا کان ذالك فالزموا علی ابن ابی طالب فانه	۴۔ (حدیث) میرے بعد فتنہ ہوگا۔ جب اس کا ظہور ہو تو علی ابن طالب کا ساتھ خوب مضبوطی سے

لہ تاریخ کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۴۰ - ۱۴۸ - کوثر

الفارق بين الحق والباطل (حديث۔ کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۵)

پکڑ لینا کہ یہ حق و باطل کے درمیان فرق و امتیاز کرنے والے ہیں اور فاروق ہیں۔

۵ ۔ انظروا الفرقة التی تدعوا الی امر علی فالزموها، فانها علی هدی۔ (قول حذیفة صاحب السر جمع الفوائد ج ۳ ص ۲۰۷)۔

۵ ۔ حضور صلے اللہ علیہ والہ وسلم کے دانائے راز خصوصی حضرت حذیفہ کی ہدایت کہ: اس فرقہ کو دیکھنا جو علی کی خلافت کی دعوت دے اور اس کا ساتھ خوب مضبوطی سے پکڑنا کہ بلاشبہ یہی جماعت حق پر ہوگی۔

۶ ۔ علی رضی اللہ کان اماما حقا وما تلوہ بغاۃ ۔ (امام الحرمین و دیگر ائمۂ دین، النصب الرایہ صفحہ ۶۹/۴)

۶ ۔ امام الحرمین و دیگر ائمۂ دین کا ارشاد کہ: علی رضی اللہ عنہ خلیفہ برحق تھے اور جن لوگوں نے ان سے قتال کیا وہ باغی تھے۔

۷ ۔ اجمعوا علی ان علیا کان مصیبا فی قتال اهل الجمل وهم طلحة والزبیر وعائشة ومن معهم واهل الصفین وهم معاویة وعسکرہ (النصب الرایہ)

۷ ۔ اس پر اجماع ہے کہ حضرت علی اہل جمل یعنی طلحہ و زبیر اور عائشہ وغیرہ سے قتال کرنے میں بھی حق پر تھے اور اہل صفین یعنی معاویہ اور ان کی فوج سے قتال کرنے میں بھی حق پر تھے

حضرت علی کی بہترین ہدایات

رجب سے محرم تک جنگ ملتوی رہنے کا معاہدہ تھا۔ اس کے بعد صفر میں نہایت شدید جنگ کا سلسلہ شروع ہوا، لیکن جنگ سے پہلے حضرت علی نے اپنی فوج میں یہ اعلان کرا دیا:

(۱) خبردار لڑائی کی ابتدا اپنی طرف سے نہ کرنا۔

(۲) مخالف کو شکست دینے کے بعد کسی بھاگنے والے کو قتل نہ کرنا

(۳) کسی زخمی کی جان نہ مارنا۔

(۴) کسی کو برہنہ نہ کرنا۔

(۵) کسی مقتول کی لاش کا مُثلہ نہ کرنا۔

(۶) کسی کے گھر میں نہ گھسنا۔

(۷) کسی کا مال نہ لوٹنا۔

(۸) کسی عورت کو بے پردہ نہ کرنا، وہ تمہیں گالیاں دیں جب بھی درگذر سے کام لینا

سب پر روشن ہوگیا کہ امیر معاویہ کی جماعت باغی ہے

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بڑے اونچے درجہ کے صحابی ہیں

ان کے متعلق حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے یہ سر سے پیر تک ایمان سے لبریز ہیں (نسائی)

اور یہ بھی فرمایا ہے۔

تقتله الفئة الباغية۔ عمار کو باغی جماعت قتل کرے گی۔

یہ حدیث دس سے زیادہ صحابہ سے مروی ہے اور مسند احمد، صحیح بخاری و مسلم، سنن ترمذی ونسائی و بیہقی، مسند ابوداؤد طیالسی، مسند عبداللہ بن حارث، معجم طبرانی وغیرہ میں مذکور ہے امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن (ج ۳ ص ۴۹۲) میں لکھا ہے کہ یہ حدیث تواتر کے ساتھ مروی ہے اور سب نے صحیح مانی ہے حتیٰ کہ جب عبداللہ بن عمرو بن عاص نے امیر معاویہ سے اسکو بیان کیا تو وہ بھی اس کا انکار نہ کر سکے۔ امام ابن عبدالبر نے استیعاب (ج ۲ ص ۴۲۴) میں لکھا ہے کہ "یہ متواتر حدیث ہے۔ اور صحیح ترین حدیثوں میں ہے۔

صحیح بخاری میں اس کے الفاظ یہ ہیں۔

ويح عمار تقتله الفئة الباغية يدعو هم الى الجنة ويدعونه الى النار — افسوس! عمار کو باغی جماعت قتل کرے گی، عمار ان کو جنت کی دعوت دیں گے اور باغی لوگ ان کو جہنم کی دعوت دیں گے۔

(صحیح بخاری جلد اول ص۳۹۴، جمع الفوائد ج ۲ ص ۴۱۹)

حضرت عمار ان لوگوں کو امیر المومنین علی رضی اللہ عنہ کی اطاعت کی دعوت دے رہے تھے، حدیث نے تصریح کر دی کہ یہ جنت کی طرف بلاتا ہے اور باغی لوگ امیر المومنین کی بغاوت کی

دعوت دیتے تھے۔ حدیث نے تصریح کر دی کہ یہ جہنم کی طرف بلاتا ہے۔

مسند عبداللہ بن حارث کی حدیث میں اس کی تصریح ہے کہ:

قاتل عمار وسالبہ فی النار — عمار کا قاتل اور ان کا سامان لوٹنے والا جہنم میں جائے گا۔

(مجمع الفوائد ۲ - ۲۱۹)

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی فوج کے ایک ممتاز فرد تھے اور صفین میں حمایت حق کے جذبہ سے لبریز ہو کر بڑے جوش مردانہ کے ساتھ باغیوں سے لڑ رہے تھے۔ کہ ایک شقی نے ان کو شہید کر دیا۔ ان کا شہید ہونا تھا کہ سب پر آشکارا ہو گیا کہ امیر معاویہ کی جماعت باغی ہے۔ متعدد صحابۂ کرام جو صفین کی جنگ میں پس وپیش کر رہے تھے حضرت عمار کی شہادت کے بعد ان پر بھی واضح ہو گیا کہ امیر معاویہ اور ان کے ساتھی اہل بغاوت ہیں۔ اور حضرت علی اور ان کی جماعت یقیناً حق پر ہیں اس کے بعد وہ کھل کر حضرت علی کے طرفدار ہو گئے۔

حافظ ابن کثیر بھی جو علامہ ابن تیمیہ کے مخصوص شاگرد ہیں۔ البدایہ والنہایہ (ج ۷، ص ۲) میں حضرت عمار کی شہادت کا ذکر کرتے ہوئے اس حدیث کو لکھتے ہیں اور تصریح کرتے ہیں کہ:

"اس سے یہ بات ظاہر ہو گئی کہ علی حق پر ہیں اور معاویہ باغی ہیں۔"

عہد صحابہ سے لے کر آج تک اس علامت کو بڑی اہمیت دی گئی ہے کہ جو گروہ عمار کو قتل کرے یقیناً وہ باغی ہے کہ اس کی بغاوت کی علامت ہزاروں آدمیوں کے سامنے آفتاب نصف النہار کی طرح ظہور میں آئی ہے۔ عمرو بن عاص بھی اس سے متاثر ہوئے۔ چنانچہ دو شخص امیر معاویہ کے پاس حضرت عمار کو قتل کرنے کا کارنامہ اپنی طرف منسوب کرنے میں نزاع کرنے لگے تو عمرو بن عاص نے کہا۔

"خدا کی قسم یہ دونوں جہنم میں جانے کے لئے جھگڑ رہے ہیں۔"[1]

---

[1] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۶۹ - کوثر۔

امیر معاویہ نے کہا: "عمرو تمہاری عجیب حالت ہے کہ جو لوگ ہمارے لئے اپنی جان کھپا رہے ہیں تم ان کو جہنمی قرار دے رہے ہو"

عمرو بن عاص نے کہا: "خدا کی قسم حقیقت یہی ہے۔ کاش آج سے بیس برس پہلے میں مر گیا ہوتا۔"[1] اس واقعہ کی بنا پر عمرو بن عاص کو بڑی فکر تھی کہ اب ہمیں کیا کرنا چاہئے، لیکن پھر بھی باغی جماعت کی قیادت نہیں چھوڑی۔ اور اس سے الگ نہیں ہوئے، کہ ان کے سینہ میں حضرت زبیر کا دل نہ تھا۔

پھوٹ ڈالنے کی تدبیر

حضرت عمار کی شہادت ۹ صفر ۳۷ھ کو ہوئی ہے۔ ۱۰ صفر کو بڑی خونریز جنگ ہوئی، امیر معاویہ کی فوج شکست کھانا ہی چاہتی تھی کہ انہوں نے عمرو بن عاص سے کہا۔ اب کیا کرنا چاہئے؟ جواب دیا ایسے موقع کے لئے میں نے پہلے ہی سے تدبیر سوچ رکھی تھی اور مشورہ دیا کہ ہماری فوج قرآن کو نیزوں پر بلند کر کے یہ پکارے: "ھذا حکم بیننا و بینکم" یعنی یہ ہمارے اور تمہارے درمیان حَکَم ہے اور بتایا کہ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ علی کی فوج میں پھوٹ پڑ جائے گی، کچھ لوگ کہیں گے یہ بات مان لی جائے کچھ لوگ کہیں گے نہ مانی جائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ محض حضرت علی کی فوج میں پھوٹ ڈالنا اور تفرقہ پیدا کرنا مقصود تھا۔ قرآن مجید کو حَکَم بنانا سرے سے مقصود ہی نہ تھا۔ قرآن کا نام لینا محض ایک سیاسی چال تھی جیسا کہ حضرت علی نے فرمایا ہے۔ اور اکابر ائمۂ دین امام سیوطی وغیرہ نے بھی اسے فریب ہی کہا ہے[2]۔ امیر معاویہ کے لشکر نے قرآن مجید نیزوں پر بلند کیا۔ اور حضرت علی کے لشکر سے پکار پکار کر کہا یہ قرآن ہمارے اور تمہارے درمیان حکم ہے۔ عمرو بن عاص کی تدبیر کامیاب ہوگئی۔ کچھ لوگوں نے کہا یہ بات ہمیں مان لینی چاہیئے۔ کچھ لوگوں نے کہا۔ یہ محض چالبازی ہے۔ سمجھ سے کام لو اور خوب جم کر لڑو، ان

---

[1] یہ واقعہ مولانا حاجی معین الدین ندوی مرحوم نے بھی مہاجرین (ج ۱ ص ۲۰۳ - ۳۰۴) میں لکھا ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] ملاحظہ ہو امام سیوطی کی تاریخ الخلفاء ص ۱۲۲ جس کی عبارت اس کتاب میں عنوان ذیل کے تحت نقل کر دی گئی "قصاص عثمان کے لئے امیر معاویہ کا خروج اور حضرت علی کا دفاع" ۱۲ کوثر

کی چال میں نہ آؤ، دشمن کی شکست میں اب کچھ دیر نہیں ہے۔ حضرت علی نے بھی لاکھ سمجھایا کہ ان کا فریب ہے دھوکہ نہ کھاؤ، لیکن چونکہ قرآن مجید ہاتھ میں لے کر یہ بات کہی گئی تھی، ایک بڑی جماعت شکار ہو ہی گئی۔ فریب کا جادو ان لوگوں پر ایسا چلا کہ حضرت علی کی مخالفت پر تل گئے۔ اور کہا کہ شامیوں کو قرآن مجید کا پابند بنانے ہی کے لئے تو ہم ان سے لڑ رہے تھے۔ اب جب کہ وہ ہم سے کہتے ہیں کہ قرآن مجید ہمارے تمہارے درمیان حکم ہے تو انکار کی کوئی گنجائش نہیں، کچھ لوگوں نے تو یہاں تک کہا کہ اگر آپ نے قرآن مجید کو حکم ماننے سے انکار کیا تو ہم آپ سے لڑینگے اور مار ڈالیں گے۔ اس قسم کی باتوں سے بڑا اختلاف پیدا ہوا قریب تھا کہ فوج حیدری آپس ہی میں لڑ جائے، ایسی صورت میں حضرت علی مجبور ہو گئے کہ جنگ بند کر دیں اور اس تحکیم کو مان لیں۔

تحکیم امیر معاویہ کی طرف سے قرآن اٹھا کر جو یہ کہا گیا تھا کہ "قرآن مجید ہمارے تمہارے درمیان حکم ہے"۔ اس کا مفہوم یہ بتایا گیا کہ دونوں فریق کی جانب سے ایک حکم مقرر کیا جائے۔ یہ دونوں قرآن مجید کے رو سے جو فیصلہ کریں گے وہ فریقین کے لئے واجب التسلیم ہوگا۔ اسی کا نام ہے تحکیم۔

اس کی اسکیم بنا کر فوج حیدری میں جو پھوٹ پیدا کی گئی تھی وہ حکم کے انتخاب میں بھی اپنا کام کر گئی کہ پھوٹ میں پڑ کر جن لوگوں نے اپنے قائد اعظم سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے اختلاف کیا اور ان کو تحکیم قبول کرنے پر مجبور کیا۔ اب وہ گمراہ بھی اسی راہ پر گامزن رہے۔ چنانچہ جب حکم مقرر کرنے کا معاملہ آیا تو امیر معاویہ نے اپنی طرف سے عمرو بن عاص کو حکم مقرر کیا۔ اور حضرت علی نے ابن عباس کو تجویز فرمایا، لیکن فوج حیدری کی یہ جماعت جس نے آپ کو تحکیم پر مجبور کیا تھا، فوراً بول اٹھی، "یہ تو آپ کے چچازاد بھائی ہیں۔ اس لئے ابو موسیٰ اشعری مناسب ہیں"۔ آپ نے فرمایا "مجھے ان پر اعتماد نہیں۔ یہ ہماری مخالفت کر چکے ہیں۔ لوگوں کو ہمارے خلاف بھڑکاتے تھے۔ ان کے فہم و تدبر پر بھی بھروسہ نہیں، ایسا ہے تو اشتر نخعی کو حکم بنا لو"۔ لیکن یہ لوگ حضرت ابو موسیٰ اشعری ہی کے نام پر اصرار کرتے رہے آخر ان کے اصرار پر حضرت ابو موسیٰ اشعری ہی کو حکم ماننا پڑا۔

حکم کس اصول پر فیصلہ کریں تحکیم کا معاہدہ جو حضرت علی اور امیر معاویہ کے درمیان

ہوا تھا، اس کے رو سے دونوں حکم کو اس اصول پر اختلاف باہمی کے دور کرنے کا اختیار دیا گیا تھا۔

دونوں حکم قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق فیصلہ کریں گے۔ اگر ان

کا فیصلہ قرآن مجید یا سنت رسول کے مطابق نہ ہوگا تو قابل قبول نہ ہوگا۔

لیکن اس اصول پر فیصلہ نہیں کیا گیا

دونوں حکم عہد نامہ کے مطابق شام و عراق کی سرحد دومۃ الجندل میں فیصلہ سنانے کے لئے اکٹھا ہوئے، یہ فیصلہ امت کے نظام دینی کی حیات و موت کا فیصلہ تھا اس لئے ہزاروں مسلمان اس کے سننے کے لئے آئے۔ جن میں حضرت سعد ابن ابی وقاص، حضرت عبد اللہ بن عمر اور بہت سے صحابہ کرام تھے۔

دونوں حکم کو اس کا اختیار دیا گیا تھا کہ قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق فیصلہ کریں۔ اگر ان کا فیصلہ قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق نہ ہوگا تو قابل قبول نہ ہوگا[1]۔ لیکن بڑا اصلی اور بنیادی بات ہی سرے سے ان کے درمیان بحث میں نہ آئی کہ مسلمانوں کے دو گروہ جب آپس میں لڑ پڑیں تو اس میں قرآن مجید اور سنت رسول کا کیا حکم ہے؟ اور جب مہاجرین و انصار کی بیعت نے علی کو خلافت کی مسند پر بٹھا دیا تو وہ یقیناً خلیفہ برحق ہیں اب ان کی اطاعت سے انکار کرنے والی جماعت کے بارے میں قرآن مجید اور سنت رسول کا کیا فیصلہ ہے؟

قرآن حکیم اور سنت پاک میں اس کے صریح احکامات موجود ہیں۔ چنانچہ سورہ حجرات میں یہ آیت موجود ہے۔

فَاِنۡ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۔	اگر مسلمانوں کی ایک جماعت نے دوسری جماعت سے بغاوت کی ہے تو باغی جماعت سے اس وقت تک قتال کرو جب تک یہ حکم الٰہی کی طرف رجوع نہ کرے (حکم الٰہی ہے کہ اولی الامر کی اطاعت کرو)۔

---

[1] تحکیم کے معاہدہ نامہ کا یہ ایک جزو ہے جو تاریخ طبری وغیرہ میں مفصل مذکور ہے۔ ۱۲ کوثر۔

حضرت عمار کی شہادت کے بعد حدیث نے فیصلہ کر دیا تھا کہ امیر معاویہ کی جماعت باغی ہے۔ حدیث کی اس تصریح کے بعد قرآن مجید کے رو سے جو فیصلہ کیا جا سکتا ہے وہ یہی ہوتا کہ:

"چونکہ امیر معاویہ کی جماعت باغی ہے اس لئے بحکم قرآنی اسے بغاوت چھوڑنی پڑے گی اور خلیفۂ وقت کی اطاعت قبول کرنی ہوگی۔"

قرآن و حدیث میں صاف حکم موجود ہے کہ مسلمانوں کے اولی الامر کی اطاعت کرنا ضروری ہے۔ چوں کہ حضرت علی کو مہاجرین و انصار نے خلیفہ منتخب کیا ہے اور ان کی موجودگی میں کسی دوسرے کو انتخاب خلیفہ کا حق ہی نہیں، لہٰذا حضرت علی یقیناً خلیفۂ برحق ہیں۔ اس کے رو سے بھی امیر معاویہ اور ان کی جماعت پر بحکم قرآنی حضرت علی کی اطاعت کرنا فرض ہے، اس کی بنا پر بھی وہی فیصلہ کیا جا سکتا ہے جو اوپر لکھا گیا ہے۔

لیکن افسوس کہ حکمین نے قرآن عزیز اور سنت رسول کے سامنے ہی نہیں رکھا جس کی بنا پر ایسا غلط فیصلہ کیا کہ مسلمانوں میں خلافت راشدہ کے بجائے ملوکیت آگئی۔ مسلمانوں کا سیاسی نظام اور طریق جہاں بانی منہاج نبوت سے اس طرح دور پڑ گیا کہ آج تک اس راستہ پر نہ آسکا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

قرآن و حدیث کے ان احکام کی موجودگی میں امیر معاویہ اور ان کی جماعت کو اس کا قطعاً حق نہ تھا کہ قصاص عثمان کا سہارا لے کر خلیفۂ برحق کی اطاعت سے انحراف کریں اور لڑیں کہ یہ بغاوت ہے جو قطعاً حرام ہے، اور قتل عمار سے متعلق حدیث نے صاف فیصلہ کر دیا کہ امیر معاویہ اور ان کی جماعت باغی ہے۔ افسوس کہ دونوں حکموں نے ان روشن ترین حقائق کو یکسر نظر انداز کر دیا اس سلسلے میں عمرو بن عاص نے جو روش اختیار کی ہے اسے ائمۂ دین نے فریب اور چالبازی کہا ہے۔

دونوں حکم جب دومۃ الجندل میں فیصلہ کے لئے اکٹھا ہوئے تو جیسا کہ لکھا گیا ہے قرآن و حدیث کے احکام کو (جن کا اوپر ذکر ہوا ہے) معرض بحث ہی میں نہ لائے بلکہ وہ باتیں درمیان میں لائے جس سے قرآن و حدیث کے احکام یکسر نظر انداز ہو گئے۔ اور نہایت غلط فیصلہ سنا یا۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری بڑے سادہ دل بزرگ تھے، عمرو بن عاص کی باتوں میں آگئے جو سیاست میں تمام عرب میں فرد تھے۔ عمرو بن عاص نے حضرت ابوموسیٰ پر اپنا اثر ڈالنے کے لئے ان کی تعظیم وتکریم شروع کر دی۔ ہر موقع پر کہتے تھے آپ میرے بزرگ ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے جلیل القدر صحابی ہیں، پہلے آپ اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔

حکمین میں جو باہم گفتگو ہوئی وہ حسب ذیل ہے۔

عمرو بن عاص۔ آپ کے نزدیک اس معاملہ میں کیا صورت مناسب ہوگی؟

ابوموسیٰ اشعری۔ ہم ایسے شخص کو خلیفہ منتخب کریں کہ اللہ کی خوشنودی اور امت کی بہبودی ہاتھ آئے۔

عمرو بن عاص کس کو؟

ابوموسیٰ عبداللہ بن عمر کو۔

عمرو بن عاص معاویہ میں کیا خرابی ہے؟

ابوموسیٰ معاویہ کو کون سا درجہ حاصل ہے؟ وہ خلافت کے مستحق ہی نہیں، مہاجرین وانصار کے مقابلہ میں کسی طرح میں معاویہ کو خلیفہ نہیں بنا سکتا۔

عمرو بن عاص حضرت عثمان مظلوم شہید ہوئے۔ معاویہ ان کے خون کے قصاص کے لئے اٹھے ہیں اور اس کے ولی ہیں۔ ام المومنین حضرت ام حبیبہ کے بھائی ہیں اور صحابی رسول ہیں۔

ابوموسیٰ ابن عاص خدا سے ڈرو، استحقاق خلافت کے لئے یہ باتیں کافی نہیں۔ اگر یہ شرف ہے تو شرف میں علی اور معاویہ کا کیا مقابلہ؟ اگر میں سب سے افضل قریشی کے لئے خلافت کا فیصلہ کرنے والا ہوتا تو علی کے حق میں کرتا۔ تمہارا یہ کہنا کہ "معاویہ قصاص عثمان کے ولی ہیں" صحیح بات نہیں۔ اس کا سب سے زیادہ

حق عثمان کے لڑکے کو ہے، جو موجود ہیں۔

اگر تم مجھ سے اتفاق کرو تو عبداللہ بن عمر کو خلیفہ بنا دیا جائے، وہ اپنے باپ کی یاد تازہ کر دیں گے۔

عمرو بن عاص میرے لڑکے عبداللہ میں کیا خرابی ہے؟ اس کے مناقب تو آپ جانتے ہی ہیں۔

ابو موسیٰ اس میں شک نہیں کہ تمہارا لڑکا نیک ہے اور خلافت کی اہلیت رکھتا ہے۔ لیکن فتنہ میں شرکت کی وجہ سے اس کا دامن بھی داغدار ہو گیا۔ کیوں نہ طیب بن طیب عبداللہ بن عمر کو خلیفہ بنا دیا جائے۔

عمرو بن عاص خلیفہ ایسے شخص کو ہونا چاہیئے جو ایک ڈاڑھ سے خود کھائے اور دوسری ڈاڑھ سے دوسروں کو کھلائے۔

ابو موسیٰ عمرو! تمہارا برا ہو، بڑے خون خرابے کے بعد مسلمانوں نے ہمارا دامن پکڑا ہے اب ان کو فتنہ میں نہ ڈالو۔

عمرو بن عاص پھر آپ کی کیا رائے ہے؟

ابو موسیٰ ہماری رائے ہے کہ علی اور معاویہ دونوں کو معزول کر دیں اور مسلمانوں کی مجلس شوریٰ پھر سے خلیفہ کا انتخاب کرے۔

عمرو بن عاص مجھے اس سے اتفاق ہے امت کی بھلائی اسی میں ہے[1]

پوری گفتگو پڑھ جایئے اس میں اصلی اور بنیادی گفتگو کہیں بھی معرض بحث میں نہیں آئی کہ مسلمانوں کے دو گروہ جب آپس میں لڑ پڑیں تو اس میں قرآن مجید اور سنت رسول کا کیا حکم ہے؟ اور مہاجرین و انصار جن کو خلیفہ منتخب کرنے کا حق ہے۔ انہوں نے جب علی کو خلیفہ چن لیا تو امیر معاویہ

---

[1] یہ گفتگو عام طور پر کتب تاریخ میں مذکور ہے۔ مولانا حاجی معین الدین صاحب ندوی مرحوم نے خلفاء راشدین ص ۳۰۸۔۳۰۹ میں، اور مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے بھی تاریخ اسلام ج ۱ ص ۳۳۹۔۳۴۰ میں اسے درج کیا ہے۔ ۱۲ کوثر

کو ان کی اطاعت سے انحراف کرنے اور بغاوت کرنے کی کوئی وجہ جواز ہے؟ اور قرآن مجید اور سنت اس بغاوت پر کیا حکم لگاتے ہیں۔؟

ان اصلی اور بنیادی امور کو چھوڑ کر جو گفتگو ہوئی ہے اس کی حیثیت وہی ہے کہ ریل کا انجن لائن سے اتر گیا اور اس کا نتیجہ جو ہونا چاہئے وہی ہوا۔

اس گفتگو کے بعد حکمین اپنا فیصلہ سنانے کے لئے جامع مسجد میں آئے، فیصلہ سننے کے لئے ہزاروں آدمی آئے تھے، بڑے بڑے صحابۂ کرام بھی تشریف لے آئے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے حضرت ابوموسیٰ اشعری کو اس خطرہ سے آگاہ کیا کہ آپ دونوں کسی فیصلہ پر متفق ہو چکے ہوں تو اس کے اعلان میں پیش قدمی نہ کیجئے گا۔ پہلے عمرو بن عاص سے اعلان کرائیے گا۔ وہ بڑے چالاک آدمی ہیں۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر آپ نے پہلے اعلان کیا تو عمرو بن عاص دھوکہ دے جائیں گے لیکن ابوموسیٰ نے کہا خطرہ کی کوئی بات نہیں، ہم دونوں نے بالاتفاق ایک فیصلہ تجویز کیا ہے۔

اب فیصلہ سنانے کا وقت آگیا۔ ہزاروں مسلمانوں کی نگاہیں حکمین پر گڑی ہوئی ہیں۔

فیصلہ کا اعلان :—

حضرت ابوموسیٰ اشعری نے عمرو بن عاص سے کہا، پہلے تم فیصلہ سنادو، انہوں نے کہا، آپ فضل وکمال میں آگے ہیں، آپ کے ہوتے ہوئے میں اس کی جسارت نہیں کرسکتا۔ حضرت ابوموسیٰ باتوں میں آگئے اور منبر پر کھڑے ہو کر اعلان کیا:

"میں اور میرے رفیق کار (عمرو بن عاص) دونوں اس بات پر متفق ہو گئے ہیں کہ علی اور معاویہ دونوں کو معزول کردیں۔ اور مجلس شوریٰ پھر سے خلیفہ کا انتخاب کرے۔ لہٰذا میں علی اور معاویہ دونوں کو معزول کرتا ہوں۔ اب مجلسِ شوریٰ پھر سے خلیفہ کا انتخاب کرے۔"

اس کے بعد عمرو بن عاص کھڑے ہوئے اور کہا:

"ابوموسیٰ نے جو کچھ کہا وہ آپ لوگوں نے سن لیا۔ انہوں نے علی کو معزول کر دیا

میں بھی انھیں معزول کرتا ہوں، اور معاویہ کو برقرار رکھتا ہوں، وہ حضرت عثمان کی جانشینی کے سب سے زیادہ مستحق ہیں، کیوں کہ ان کے قصاص کے طالب ہیں اور ان کے ولی ہیں۔"

حضرت ابو موسیٰ اشعری اس خلاف بیانی سے ششدر رہ گئے۔ اور بہت برہم ہو کر بولے

مالك لا وفقك الله غدرت وفجرت — یہ تم نے کیا کیا؟ اللہ کرے تم کو توفیق نصیب نہ ہو تم نے غداری کی اور بڑے فسق و فجور کا کام لیا۔

لیکن تیر کمان سے نکل گیا۔ اب ابو موسیٰ اشعری سر پیٹا کریں۔ یہ نتیجہ ہے اس کا کہ حکمین اصلی اور بنیادی امور کو چھوڑ کر بالکل غیر متعلق باتیں معرض بحث میں لائے اور قرآن و سنت کو چھوڑ کر دوسرے راستے پر پڑ گئے۔

مسلمانوں میں عمرو بن عاص کے اس فعل سے سخت برہمی پیدا ہو گئی، حضرت شریح بن ہانی نے ان پر کوڑے برسانے شروع کئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے بھی لوگ سخت ناراض ہوئے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص نے فرمایا۔ ابو موسیٰ، تمہارے حال پر افسوس ہے، تم عمرو کی چالوں کے مقابلے میں بڑے کمزور نکلے۔ حضرت ابو موسیٰ نے جواب دیا، اب میں کیا کروں؟" اس شخص نے مجھ سے ایک بات پر اتفاق کر لیا تھا اور اب پلٹ گیا۔" حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے فرمایا "ابو موسیٰ اس سے پہلے مرگئے ہوتے تو ان کے حق میں اچھا ہوتا۔" حضرت عبداللہ بن عمر نے فرمایا: "دیکھو اس امت کا حال کہاں جا پہنچا اس کا معاملہ دو شخصوں کے حوالہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے ایک کو اس کی پرواہ ہی نہیں کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اور دوسرا شخص ضعیف الرائے ہے۔"

اس کے بعد عمرو بن عاص نے امیر معاویہ کو خلافت کی بشارت دی اور اس غلط طریقہ سے ان کو خلیفہ بنایا، حقیقت نے کہا کہ کیا خلافت رسول — کا منصب ایسے غلط طریقے سے مل سکتا ہے؟

حضرت ابو موسیٰ کو سخت شرمندگی اٹھانی پڑی۔ شرم کے مارے حضرت علی کا سامنا نہ کر سکے

اور عمر بھر کے لئے گوشہ نشین ہو گئے۔

حضرت امام حسن بصری جو تفسیر حدیث، فقہ اور تصوف کے مسلم امام ہیں، انہوں نے عمرو بن عاص کے متعلق (جنہوں نے امیر معاویہ کو خلیفہ بنانے کے یہ سب جتن کئے) اور مغیرہ بن شعبہ کے متعلق (جنہوں نے یزید کو خلیفہ بنانے کی اسکیم امیر معاویہ کو سجھائی) یہاں تک کہا ہے۔

هما افسدا امر الامة ان دونوں نے امت کے معاملہ کو

(فتح الباری) بگاڑ ہی ڈالا۔

حکمین کے خطرناک اعلان کا خطرناک نتیجہ

افسوس حکمین نے اس کو پس پشت ڈال دیا کہ ان کو کون سا اختیار دیا گیا ہے اور قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ کرنے کی کتنی بڑی ذمہ داری ان کے سر رکھی گئی ہے۔ ان کا کام صرف یہی تھا کہ حضرت علی اور ان کے مخالف گروہ کے بارے میں قرآن و حدیث کے رو سے جو فیصلہ ہو سکتا ہے وہ امت کو سنائیں۔ قرآن و حدیث کا ہر جاننے والا جانتا ہے کہ خلیفۂ برحق کی اطاعت فرض ہے۔ اور جو گروہ اطاعت نہ کرے بلکہ لڑے وہ باغی ہے۔ لہٰذا امیر معاویہ اور ان کی پارٹی یقیناً باغی ہے۔ اور حضرت عمار کی شہادت نے اس کو روز روشن کی طرح واضح کر دیا ہے۔ ایسی صورت میں حکمین کا فرض تھا کہ وہ قرآن و حدیث کے اس فیصلہ کو سنا کر اپنی ذمہ داری پوری کر دیتے کہ امیر معاویہ اور ان کی پارٹی قرآن و حدیث کی رو سے باغی ہے۔ لہٰذا فیصلہ کیا جاتا ہے کہ وہ بغاوت سے باز آئیں اور حضرت علی کی اطاعت کریں، لیکن حیرت ہوتی ہے کہ حکمین نے قرآن و حدیث کا راستہ یکسر چھوڑ دیا۔ چنانچہ امیر معاویہ کو خلیفۂ برحق امیر المومنین حضرت علی کی اطاعت پر مجبور کرنے اور بغاوت ختم کرنے والا فیصلہ سنانے کے بجائے بغاوت کی جڑ اور مضبوط کر دی اور صاف کہہ دیا کہ ہم نے علی کو معزول کر دیا۔ اس کا بے حد خطرناک نتیجہ یہ نکلا کہ امیر معاویہ اور تمام اہل شام کی باغیانہ کارروائی بے حد مضبوط ہو گئی اور ملوکیت نے قدم جما لیا۔ عمرو بن عاص نے تو یہ غضب کیا کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کو دھوکا دیا کہ علی اور معاویہ دونوں

کو معزول کرنے میں ہم آپ سے بالکل متفق ہیں۔ آپ بزرگ ہیں پہلے آپ اس کا اعلان کر دیجئے پھر میں بھی کر دوں گا، لیکن کھڑے ہو کر جو اعلان کیا ہے (وہ آپ پڑھ چکے ہیں) کیا وہ فریب کے سوا کچھ اور ہے؟ اب حضرت موسیٰ کی آنکھ کھلی تو پکار رہے ہیں۔

"عمرو بن عاص تم نے یہ کیا کیا؟ خدا کی توفیق نصیب نہ ہو، تم نے غداری کی اور بڑے فسق و فجور کا کام کیا۔"

منصف مزاج حضرات نے عمرو بن عاص کے اس فعل کو ہمیشہ مکر و فریب ہی مانا ہے حتیٰ امام سیوطی رحمۃ اللہ علیہ جو قرآن و سنت کے بے حد متبع ہیں، امام العلوم ہیں۔ ان کے جیسا حافظ الحدیث ان کے بعد آج تک نہیں ہوا، پھر نہایت محتاط اور معتدل مزاج ہیں۔ اگلوں کے متعلق کوئی کڑا لفظ ان کے قلم سے نہیں نکلتا، لیکن انہوں نے بھی اپنی تاریخ الخلفاء میں عمرو بن عاص کے اس کارنامہ کو لکھتے ہوئے یہ تصریح کر دی کہ یہ عمرو بن عاص کا مکر و فریب ہے۔ (الفاظ یہ ہیں: مکیدۃ منہ" ص ۱۲۲) جنگ صفین میں شامیوں نے جب نیزوں پر قرآن مجید بلند کر کے لشکر حیدری سے کہا تھا کہ جنگ بند کر دو، اب ہمارے تمہارے درمیان قرآن مجید حکم ہے، تو یہ بھی عمرو بن عاص ہی کی اسکیم تھی، اور بڑا گہرا فریب تھا۔ امام سیوطی اس کے متعلق بھی لکھتے ہیں:

مکیدۃ من عمرو بن العاص — یہ عمرو بن عاص کا فریب تھا۔

بعض حضرات ایسی باتوں کے متعلق بھی کہہ دیتے ہیں کہ "یہ اجتہادی غلطی تھی" لیکن کیا مکر و فریب بھی کوئی دینی اجتہاد ہے۔؟

یہ حقیقت ہمیشہ ملحوظ رکھنی چاہیئے کہ علمائے ملت کا اجماع ہے کہ:

نص کے مقابلہ میں قیاس کرنا حرام ہے، یعنی کسی معاملہ میں قرآن و حدیث کا فیصلہ موجود ہو تو اس کے مقابلے میں اپنا قیاس پیش کرنا سخت مذموم ہے، بلکہ حرام ہے، کہ یہ تو قرآن و حدیث کے مقابلہ میں اپنی رائے اور قیاس کو چلانا ہے۔

عمرو بن عاص اور امیر معاویہ کے بارے میں احتیاط

یہ صحیح ہے کہ عمرو بن عاص نے مسلمانوں کے نظام حکمرانی جیسے مسئلہ میں جو درحقیقت خلافت راشدہ کی موت وحیات کا مسئلہ ہے، بڑا غلط کام کیا ہے اور فریب سے کام لیا ہے اور امیر معاویہ نے بھی بڑا غلط کام کیا ہے کہ وقت کے بہترین انسان اور بعد کے بھی تمام انسانوں سے بڑھ کر افضل ترین شخصیت امیرالمومنین سیدنا علی مرتضیٰ کی بغاوت کی ہے اور اپنی فوج لے کر ان سے ناحق لڑے ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میدان صفین میں اسّی ہزار مسلمان مارے گئے۔ اور خلافت راشدہ کے بجائے ملوکیت کا تسلط ہو گیا، لیکن بایں ہمہ ان کے بارے میں سب ولعن[1] سے ہمیشہ پرہیز کرنا چاہیئے۔ سمجھداری کا راستہ یہی ہے کہ احتیاط سے کام لو۔ علامہ سعدالدین تفتازانی شرح العقائد النسفیہ ص ۱۱۶ میں لکھتے ہیں۔

لم ینقل عن السلف المجتهدين	معاویہ اور ان کی جماعت پر لعنت کرنا سلف
والعلماء الصالحين جوازاللعن	مجتہدین اور علمائے صالحین سے منقول نہیں ہے
علی معاوية واحزابه، لان	کیوں کہ غایۃ الامر (حد سے حد) یہ ہے کہ انہوں نے
غاية امرهم البغی والخروج	بغاوت کی اور امام برحق کے مقابلہ میں خروج کیا
على الامام وهولا يوجب اللعن	لیکن یہ باتیں لعنت واجب نہیں ٹھہرا رہی ہیں۔

ابو موسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص کے اعلان کے بعد

ان دونوں صاحبوں کے نہایت خطرناک اعلان کے بعد تمام حاضرین نے پوری طرح محسوس کر لیا کہ حضرت علی کے خلاف نہایت غلط

---

[1] سب وطعن گالی اور لعنت کو کہتے ہیں۔ اس سے اپنی زبان کو آلودہ نہ کرو۔ ان لوگوں نے جو غلطی کی ہے اس پر تم یہ غلطی نہ کرو کہ انھیں گالی دے کر اپنی زبان خراب کر دو۔ یا لعنت بھیج کر دل میں بخار پیدا کر دو کہ دونوں باتیں سخت مضر ہیں۔ ۱۲ کوثر

کارروائی کی گئی ہے، اور قرآن و سنت کو یکسر چھوڑ دیا گیا، حالانکہ ان کو اس شرط کے ساتھ حکم بنایا گیا تھا کہ "قرآن مجید اور سنت رسول کے مطابق فیصلہ کریں۔ اگر ان کا فیصلہ قرآن یا سنت رسول کے خلاف ہوگا تو قابل قبول نہ ہوگا" لہٰذا حضرت علی کا فرض تھا کہ قرآن و حدیث کے اس خلاف فیصلہ کو یکسر ٹھکرا دیں۔ آپ نے اس فرض کو ادا کیا اور ان کا فیصلہ ٹھکرا دیا۔ اور اس کی وجہ بھی بتادی۔ چنانچہ فرمایا:۔

"تم لوگوں نے ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص کو جو حکم مقرر کیا تھا، انہوں نے قرآن مجید کے حکم کو پس پشت ڈال دیا، خدا کی ہدایت چھوڑ کر اپنے خیالات کی پیروی کی اور ایسا فیصلہ سنایا جو (قرآن کی) واضح حجت اور سنت ماضیہ پر مبنی نہیں ہے۔ پھر اس فیصلہ میں دونوں کی باتیں باہم مخالف بھی ہیں دونوں میں کوئی بھی حق فیصلہ تک نہیں پہنچا۔"[1]

عمرو بن عاص اپنا اعلان سنانے کے بعد خوش خوش امیر معاویہ کے پاس پہونچے۔ ان کو بشارت سنائی کہ میں نے آپ کو امیر المومنین بنا دیا۔ پھر ان کے ہاتھ پر خلافت کی بیعت کی، حالانکہ نہ ان کو خلیفہ بنانے کا حق ہے نہ ان کے خلیفہ بنانے سے وہ خلیفہ ہو سکتے ہیں۔ غلط کام غلط ہی رہے گا۔ امیر معاویہ اور ان کی پارٹی اب بھی باغی ہی ہے، عمرو بن عاص ان کو خلیفہ کہتے ہیں لیکن حدیث رسول ان کو باغی کہتی ہے۔ پورے قوانین اسلام میں ایک دفعہ بھی ایسی نہیں کہ جو عمرو بن عاص کے اس فعل کو جائز قرار دے سکے، قرآن مجید، سنت رسول، اجماع امت اور قیاس شرعی سب کے رو سے یہ فعل باطل ہے یا انھیں مع حضرت ابوموسیٰ اشعری قرآن و سنت کی رو سے فیصلہ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ اسکے خلاف کرنے کا یا ورا انھیں حاصل ہی کب ہے؟ پھر خلیفہ برحق کو معزول کرنا اور باغی کو خلیفہ بنانا حد درجہ مذموم حرکت ہے، حق حق ہے، باطل باطل۔ سب کو معلوم ہے کہ حضرت علی خلیفہ برحق ہیں۔

ائمہ اسلام نے ہمیشہ اعلان کیا ہے، فقہ حنفی کی نہایت بلند پایہ کتاب فتح القدیر باب ادب القاضی میں ہے:

---

[1] طبری ج ۴ ص ۵۷ ۔ کوثر

انما كان الحق معه (اى مع علي) في تلك النوبة لصحة بيعته و انعقادها، فكان علي الحق في قتال اهل الجمل وقتال معاوية بصفين، وقوله عليه السلام لعمار ستقتلك الفئة الباغية، وقد قتله اصحاب معاوية يصرح بانهم بغاة (حاشیہ ہدایہ اخیرین ص ۴۴۴)	حضرت علی کے عہد میں حق صرف حضرت علی کے ساتھ تھا، کیوں کہ ان کے ہاتھ پر خلافت کی جو بیعت کی گئی تھی بالکل صحیح تھی اور اس کا انعقاد بھی صحیح تھا، لہٰذا حضرت علی اہل جمل کے قتال میں بھی حق پر تھے۔ اور صفین میں معاویہ کے قتال میں بھی حق پر تھے۔ حضرت عمار سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم کو باغی جماعت قتل کرے گی اور معاویہ کی جماعت نے ان کو قتل کیا، اس طرح ارشاد رسول نے صراحت کر دی کہ یہ لوگ باغی ہیں۔

یہ پورا بیان ہدایہ کے اس جملہ کی شرح ہے۔

والحق كان بيد علي رضي الله عنه في نوبته (ہدایہ اخیرین ص ۴۴۴)	حضرت علی کے عہد میں حق حضرت علی کے ہاتھ میں تھا۔

لہٰذا عمرو بن عاص وغیرہ نے بھی حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے خلاف جو کچھ کیا ہے وہ حق کے بالکل خلاف ہے نیز اتنا غیر منصفانہ ہے کہ کوئی بھی حق پسند اسے باطل کہے بغیر نہیں رہ سکتا۔

عمرو بن عاص نے اپنی غلط کارروائی سے ایک طرف امت پر ملوکیت کو مسلط کر دیا، دوسری طرف خلیفۂ راشد حضرت علی کو جو کہ خلافت راشدہ کے نظام کو بچانے کی انتہائی کوشش فرما رہے تھے، بڑی مشکلات میں ڈال دیا۔ حضرت علی پہلے سے یہ خطرہ محسوس فرما رہے تھے کہ اگر معاویہ وغیرہ کی حکمرانی رہ گئی تو مسلمانوں میں قیصر و کسریٰ کی ملوکیت آجائے گی۔ چنانچہ آپ اپنے ایک خطاب میں فرماتے ہیں:

" خدا کی قسم اگر یہ لوگ تمہارے فرماں روا ہو گئے تو تمہارے درمیان

قیصر و کسریٰ کی طرح کام کریں گے۔[1]

اب عمرو بن عاص کی اس کارروائی کے بعد یہ خطرہ کھل کر سامنے آگیا۔ چنانچہ وہ حضرات بھی اس کو دیکھنے لگے جو جنگ صفین وغیرہ میں غیر جانبدار تھے۔ اور حضرت علی کا ساتھ دیکر ان کے مخالفین کی طاقت توڑنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ انھیں میں حضرت عبداللہ بن عمر بھی تھے۔ ان کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس ہوا کہ ہم سے بڑی غلطی ہوئی کہ غیر جانبدار رہ گئے۔ اور حضرت علی کا ساتھ دیکر ان کے مخالفین کی طاقت توڑنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ وہ عمر بھر اس کا افسوس کرتے رہے اور یہاں تک کہہ دیا کہ :-

لما اجد فی نفسی علیٰ شیٔ	میں اپنے کو کسی چیز پر متاسف نہیں پاتا لیکن
الا انی لما اقاتل الفئة	صرف اس بات پر افسوس کرتا ہوں کہ میں نے
الباغیة مع علی (للکبیر	حضرت علی کا ساتھ دے کر باغی جماعت سے
مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۸۷)	قتال کیوں نہیں کیا۔

یہ اتنا شدید افسوس ہے کہ انھیں اچھی طرح ادراک ہوگیا کہ حضرت علی خلافت راشدہ کا نظام بچانے کی انتہائی اہم کوشش فرمارہے تھے۔ اور ملوکیت کے خلاف آہنی دیوار کھڑی کر رہے تھے تاکہ اسے مسلمانوں کے نظام حکمرانی میں کام آنے کا راستہ ہی نہ ملے۔ اور یہ نظام جہاں بانی خلافت رسول کے بجائے قیصر و کسریٰ کی شہنشاہی نہ بن جائے۔ اگر تمام ذی اثر صحابہ کرام مثلاً حضرت ابن عمر وغیرہ بھی غیر جانبدار رہنے کی پالیسی چھوڑ کر حمایت حق کی پالیسی اختیار کرتے اور علانیہ خلیفہ برحق حضرت علی کا ساتھ دیکر باغی طاقت سے جہاد کرتے تو وہ خلافت راشدہ کی اطاعت پر مجبور ہو جاتی اور اپنی ملوکیت قائم کرنے کی اس میں سکت ہی نہ رہتی۔ اب وہ افسوس

---

[1] کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۷۱ ۔ کوثر

کر رہے ہیں کہ ہم غیر جانبدار کیوں رہے؟ اور حضرت علی کا ساتھ دے کر باغی جماعت سے جہاد کیوں نہیں کیا؟ اور خلافت راشدہ کا نظام بچانے اور ملوکیت کے آگے آہنی دیوار کھڑی کرنے میں ان کے دست و بازو بننے کے شرف سے کیوں محروم رہے؟ ان باتوں کو سوچ سوچ کر وہ بیحد متاسف ہیں، حتیٰ کہ انھیں افسوس ہے تو بس اسی کا۔

اور بعض بزرگان دین اپنے غیر جانب دار رہنے کو ایسا گناہ سمجھتے تھے کہ اس پر توبہ واستغفار کرتے تھے۔ امام ابن عبدالبر کی استیعاب (ج ۲ ص ۳۰۰) میں ہے کہ حضرت مسروق بن اجدع حضرت علی کا ساتھ نہ دینے پر توبہ واستغفار کرتے تھے۔

خوارج سے جہاد

خارجیوں کا ظہور اور ان کی سرکشی

عمرو بن عاص کی غلط کارروائی کے بعد ملوکیت کی بنیاد پڑ گئی۔ حضرت علی نے شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ امت کو اس کے پنجۂ تسلط سے بچانے کے لئے از سر نو پوری طاقت سے کام لینا چاہئے۔ اس سلسلے میں آپ اپنی جماعت کو خطاب فرماتے ہیں۔

"چلو ان کے مقابلہ کے لئے جو تم سے اس لئے لڑ رہے ہیں کہ جبار بادشاہ بن جائیں۔ اور اللہ کے بندوں کو اپنا غلام بنالیں۔" (کامل ابن اثیر ج ۳ ص ۱۶۲)

آپ ان کی طاقت توڑنے کی تیاری کر رہے تھے کہ ایک نیا فتنہ کھڑا ہوگیا، وہ خارجیوں کا خروج۔

خارجی کون ہیں؟ یہ وہ لوگ ہیں جو پہلے حضرت علی کے حامی تھے اور جب تحکیم

کے بعد دونوں حکم (ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص نے) اپنا غلط فیصلہ سُنایا تو ان کو احساس ہوا کہ ہم نے زبردست غلطی کی کہ علی کو تحکیم پر مجبور کیا۔ پھر انہوں نے طے کیا کہ تحکیم ایک غلط کام ہے بلکہ کفر ہے۔ لہٰذا تحکیم پیش کرنے والے اور اس کو قبول کرنے والے نیز دونوں حکم معاذاللہ کافر ہیں۔ اپنے اس غلط نظریہ کی بنا پر خود کو بھی کفر کا مرتکب سمجھا اور توبہ کی اور حضرت علی اور ان کے رفقاء عمل، نیز امیر معاویہ اور ان کی پارٹی، اور ابوموسیٰ اشعری اور عمرو بن عاص سب کو کافر کہا۔ اور حضرت علی کی فوج سے نکل کر چلے گئے۔ اور آپ کو اپنا یہ ناپاک پیغام دیا کہ جیسے ہم لوگوں نے تحکیم کو کفر سمجھ کر توبہ کی ہے اگر آپ بھی ایسا ہی کریں تو ہم آپ کا ساتھ دے کر معاویہ سے لڑیں گے ورنہ خود آپ سے قتال کریں گے۔ تمام مسلمانوں نے ان کے حد درجہ گمراہ نظریہ سے شدید اختلاف کیا۔ اور انہوں نے اپنے سوا تمام مسلمانوں کو اپنا ہم خیال نہ ہونے کی بنا پر کافر قرار دیا۔ اور اعلان کر دیا کہ جس کو ہماری اس بات سے اتفاق نہیں وہ بھی کافر ہے۔ اور اس کا خون مباح ہے، اب جو بھی انھیں ملا اسے اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کی، ہم خیال نہیں ہوا تو قابو پا جانے پر مار ڈالا۔ اس سلسلے میں انہوں نے حضرت عبداللہ بن خباب کو نہایت بے دردی سے قتل کر ڈالا اور ان کی اہلیہ کا شکم چاک کر کے پیٹ کے بچہ کو بھی ذبح کر ڈالا، اور بھی متعدد مسلمانوں کو بے قصور قتل کیا۔ واقعی یہ بدترین لوگ ہیں جیسا کہ حدیث میں ہے۔

ان کی مذمت میں متعدد حدیثیں ہیں اور اکابر ائمہ حدیث نے انھیں اپنی کتابوں میں درج فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری، صحیح مسلم، مسند احمد، سنن ابی داؤد، سنن ترمذی، سنن نسائی، سنن ابن ماجہ، مسند اسحاق بن راہویہ، مسند ابی یعلی، مسند یعقوب بن سفیان، مسند بزار، مستدرک حاکم، معجم اوسط طبرانی وغیرہ میں یہ حدیثیں موجود ہیں[1]۔ ان میں سے چند احادیث درج ذیل ہیں

[1] امام بخاری کے استاد علامہ محمد بن قدامہ جوہری، اور ہیثم بن عدی وغیرہ نے خوارج کے حالات میں مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ علامہ مبرد نے اپنی کتاب میں ان کے احوال اور ان سے متعلق باتیں یکجا کر دی ہیں۔ ان مباحث کا خلاصہ علامہ محمد بن علی شوکانی نے نیل الاوطار (ج ۷ ص ۱۳۱-۱۴۱) میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے اور محدث کبیر علامہ بن =

یہ لوگ مارقین ہیں یعنی دین سے نکل گئے ان کو مار ڈالنا شریعت کے اہم مقاصد میں داخل ہے

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں:

۱۔ امرت بقتال ثلاثہ، القاسطین و الناکثین والمارقین، فاما القاسطون فاھل الشام، واما الناکثون فذکرھم واما المارقون فاھل النھروان (کنز العمال تقطیع کلاں ج ۶۔ ص ۸۲)

۱۔ مجھے تین جماعتوں سے قتال کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ہیں قاسطین[1]، ناکثین[2] اور مارقین[3]۔ قاسطین یعنی اہل ظلم، شام کے لوگ ہیں۔ ناکثین (یعنی عہد شکن) آپ ان کا ذکر فرما چکے ہیں (کہ یہ اصحاب جمل ہیں)، اور مارقین نہروان والے ہیں (یعنی وہ خارجی ہیں جو بمقام نہروان فوج حیدری کے ہاتھ سے مارے گئے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت ہے کہ حضرت علی نے یمن سے کچھ سونا بھیجا جسے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے چار آدمیوں کو بانٹ دیا۔ وہ یہ ہیں۔ اقرع بن حابس حنظلی، عیینہ بن بدر فزاری، زید طائی، علقمہ بن علاثہ عامری، اس پر کچھ لوگوں کو شکوہ ہوا کہ نجد کے بااثر لوگوں کو آپ نے عطا فرمایا اور ہم لوگوں کو چھوڑ دیا۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا "میں ان لوگوں کی تالیف کر رہا ہوں"۔ اب ایک آدمی آیا جس کی داڑھی گھنی تھی۔ رخسار ابھرے تھے۔ آنکھیں دھنسی تھیں

= محمد بن سلیمان فاسی مغربی نے جمع الفوائد (ج ۲ ص ۲۸۷-۲۷۹) میں ان سے متعلق حدیثوں کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ دونوں کتابیں راقم السطور کے پیش نظر ہیں۔ مؤرخین نے ان کے حالات شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں۔ کتب فقہ کے باب السیر میں بھی ان کے احوال مذکور ہیں۔ علامہ امام عبداللہ بن یوسف زیلعی نے نصب الرایہ ج ۳ ص ۴۶۲ میں حضرت ابن عباس اور خوارج کا وہ اہم تاریخی مکالمہ پورا درج کر دیا ہے، جس میں آپ نے خوارج کی تمام غلط فہمیوں کا ازالہ فرمایا ہے راقم السطور نے اس کا ترجمہ اس فٹ نوٹ میں درج کیا تھا، لیکن چونکہ نوٹ طویل ہو گیا تھا لہٰذا اب اسے نکال دیا ہے۔ اس مکالمہ کا یہ اثر ہوا کہ دو ہزار خوارج تائب ہو گئے تھے۔ ۱۲ کوثر۔

اور پیشانی اٹھی ہوئی تھی اور اس نے کہا: "اے محمد اللہ سے ڈرو۔" آپ نے فرمایا: "اگر میں ہی اللہ کی نافرمانی کروں تو پھر اس کی اطاعت کون کرے گا؟ آسمان والا تو مجھے امین فرما رہا ہے اور تم لوگ مجھے امین نہیں مانتے؟ اس گفتگو کے بعد وہ شخص واپس گیا اور حاضرین میں سے ایک شخص نے اس کو مار ڈالنے کی اجازت مانگی، اس پر آپ نے فرمایا:-

۲۔ ان من ضئضئ هذا اقوما يقرؤن القرآن لا يجاوز حناجرهم يقتلون اهل الاسلام و يدعون اهل الاوثان، يمرقون من الاسلام كما يمرق السهم من الرمية، لئن ادركتهم لاقتلنهم قتل عاد (صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۰-۳۴۱)	۲۔ اس شخص کے ابنائے جنس میں ایسے لوگ ہوں گے جو قرآن بکثرت پڑھیں گے لیکن ان کے گلے سے نیچے نہ اترے گا۔ یہ لوگ مسلمانوں کو قتل کریں گے۔ اور بت پرستوں کو چھوڑ دیں گے۔ یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کو زخمی کر کے نکل جاتا ہے اگر میں انھیں پاؤں گا تو اس طرح ان کو ڈالوں گا جیسے قوم عاد مار ڈالی گئی (کہ نام و نشان بھی نہ رہا)

یہ لوگ نماز و روزہ اور تلاوت قرآن میں بہت آگے ہوں گے مگر ایمان سے محروم ہوں گے

حضرت ابو سعید خدری سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم لوگوں کو کچھ تقسیم فرما رہے تھے کہ ذوالخویصرہ آیا جو بنی تمیم کا ایک آدمی تھا، اس نے کہا "یا رسول اللہ تقسیم میں انصاف سے کام لیجئے" آپ نے فرمایا: "تیرا برا ہو، اگر میں انصاف نہ کروں گا تو کون کرے گا؟ اگر میں انصاف سے کام نہ لوں گا تو بڑا خسارہ اور نامرادی ہوگی"، اس پر عمر بن خطاب نے گذارش کی "یا رسول اللہ اجازت دیجئے کہ میں اس کی گردن اڑا دوں۔" آپ نے فرمایا:

۳۔ دعه فان له اصحابا يحقر احدكم صلواته مع صلاتهم و صيامه مع صيامهم ويقرؤن القرآن	۳۔ جانے دو اس کے رفقا ایسے ہیں جن کی نماز کے مقابلہ میں تم سے ہر شخص اپنی نماز کو حقیر سمجھے گا اور ان کے روزہ کے مقابلہ میں اپنے روزہ کو ناچیز

لا يجاوز تراقيهم يمرقون من
الاسلام كما يمرق السهم من الرمية
ينظر الى نصله فلا يوجد فيه
شئی ثم ينظر الى رصافه فلا
يوجد فيه شئ، ثم ينظر الى
نضيه فلا يوجد فيه شئ
(وهو القدح) ثم ينظر الى قذذه
فلا يوجد فيه شئ،
سبق الفرث والدم آيتهم رجل
اسود احدى عضديه مثل
ثدی المرأة ومثل البضعة تدردر
يخرجون على حين فرقة من الناس
قال ابو سعيد: فاشهد انی سمعت
هذا من رسول الله صلى الله عليه
وسلم واشهد ان علی بن ابی طالب
قاتلهم وانا معه فامر
بذالك الرجل فالتمس، فوجد
فاتی به حتى نظرت اليه على
نعت رسول الله صلى الله عليه
وسلم الذی نعت۔

سمجھے گا۔ یہ لوگ قرآن (بکثرت) پڑھیں گے
لیکن ان کے گلے سے نیچے نہیں اترے گا۔ یہ لوگ
اسلام سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار
کو زخمی کرکے نکل جاتا ہے، کہ تیر کا پیکان دیکھا جائے
تو اس پر شکار کا کوئی جز نہیں۔ پیکان جہاں بٹھایا گیا
ہے اس کو دیکھا جائے تو وہاں بھی کچھ نہیں، تیر کی
لکڑی دیکھی جائے تو اس پر بھی کچھ نہیں۔ تیر میں جو
پر لگا ہے اس کو دیکھا جائے تو اس پر بھی کچھ نہیں
تیر تو شکار کے معدہ کی چیزوں سے اور خون سے
پار ہو کر نکل گیا۔ (سنو) ان لوگوں کی علامت یہ
ہے کہ ان میں ایک کالا آدمی ہوگا جس کے ایک بازو
پر عورت کی چھاتی کی طرح گوشت ہوگا۔ گوشت
کے ایسے ٹکڑے کی طرح ہوگا جو حرکت کرتا ہے۔ یہ لوگ
اس وقت خروج کریں گے جب کہ لوگوں میں تفرقہ
ہوگا۔ حضرت ابو سعید نے فرمایا ہے میں گواہی دیتا
ہوں کہ میں نے یہ حدیث رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم سے سنی ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ
علی ابن ابی طالب نے ان لوگوں سے قتال کیا
ہے، اور میں بھی آپ کے ساتھ تھا، آپ نے اس
علامت والے آدمی کو لانے کا حکم دیا۔ تلاش کرنے
پر ملا اور پیش کیا گیا۔ میں نے اس میں وہ علامت

خود دیکھی ہے، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی تھی۔

یہ لوگ بدترین مخلوق ہوں گے

اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں، انھیں میں حضرت ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ کی بھی روایت ہے، جو صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۳ میں مذکور ہے۔

۴۔ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان بعدی من امتی قوم یقرؤن القرآن لا یجاوز حلاقیمھم یخرجون من الدین کما یخرج السھم من الرمیۃ، ثم لا یعودون فیہ ھم شر الخلق والخلیقۃ۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے میرے بعد میری امت کے کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو قرآن (زیادہ) پڑھیں گے، مگر یہ ان کے گلے سے نیچے نہ اترے گا، یہ لوگ دین سے اس طرح نکل جائیں گے جیسے تیر شکار کو زخمی بنا کر نکل جاتا ہے، پھر دوبارہ یہ دین میں داخل نہ ہوں گے یہ بدترین خلائق اور بدترین صفات والے ہیں۔

ان سے قتال کرنا فرض ہے

ثبوت ہے اس سلسلہ کی حدیث ۲ جس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے، اگر میں ان کو پاؤں گا تو اس طرح مار ڈالوں گا جیسے قوم عاد مار ڈالی گئی۔ نیز صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے خوارج کے احوال بیان فرما کر ارشاد فرمایا ہے۔

فاذا لقیتموھم، فاقتلوھم فان فی قتلھم اجراً لمن قتلھم عند اللہ یوم القیامۃ۔

(صحیح مسلم ص ۳۴۲ ج ۱)

جب ان کا سامنا کرو تو انھیں مار ڈالنا کیونکہ جو لوگ انھیں قتل کریں گے ان کو قیامت کے روز اللہ کے حضور بڑا ثواب ملے گا۔

یہ ارشاد نبوی کہ انھیں قتل کرو، ایک ثبوت ہے کہ ان سے قتال کرنا فرض ہے اور قتال بغاۃ کی آیت مزید ثبوت ہے اور یہ ارشاد نبوی کہ میں انھیں پاؤں گا تو اس طرح مار ڈالوں گا جیسے قوم عاد مٹا دی گئی تھی ایک دلیل ناطق ہے کہ انھیں مٹا ڈالنا اللہ و رسول کی بہت بڑی منشا ہے۔ لہٰذا ان سے قتال کرنا حد درجہ ضروری ہے اور جو لوگ اس اہم کام کو پورا کریں گے وہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوارح کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ لوگ ہیں اصحاب مرتضوی کہ انھیں حضرات نے اس گروہ کو فنا کے گھاٹ اتار کر منشا نبوی پوری کی ہے۔

ان سے قتال کرنے میں بڑا ہی ثواب ہے

سنن ابی داؤد میں ایک حدیث ہے جس میں خوارج کے یہ صفات بیان ہوئے ہیں۔ (۱) یہ لوگ قرآن (بکثرت) پڑھیں گے لیکن قرآن کے گلے سے نیچے نہ اترے گا (۲) گفتار اچھی، کردار برا (۳) دین سے نکل جائیں گے پھر دین میں داخل ہوں گے۔ اس کے بعد حدیث میں یہ الفاظ بھی ہیں۔

۵۔ ھم شر الخلق والخلیقۃ طوبیٰ لمن قتلھم و قتلوہ (التاج الجامع ج ۵ ص ۳۱۴)	۵۔ یہ لوگ بدترین خلائق ہیں، اور بدترین صفات والے ہیں۔ انھیں جو لوگ قتل کریں گے یا ان کے ہاتھ سے قتل ہوں ان کو مبارکباد!

صحیح مسلم (ج ۱۔ ص ۳۴۲) میں ہے کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے (اپنی فوج سے) خوارج کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا۔ ان میں ناقص ہاتھ والا بھی ہوگا۔ پھر ارشاد فرمایا۔

۶۔ لولا ان تبطروا لحدثتکم بما وعد اللہ الذین یقتلونھم علیٰ لسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم	۶۔ اگر خیال نہ ہوتا کہ تم میں فخر پیدا ہو جائے تو میں تم کو بتاتا کہ اللہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی انھیں قتل کرنیوالوں کو کیسے اجر و ثواب دینے کا وعدہ فرمایا ہے۔

ایک روایت میں ہے کہ حضرت علی نے فرمایا۔

۷۔ لو یعلم الجیش الذین یصیبوھم	۷۔ جو فوج ان لوگوں کو آئے گی۔ اگر اسے یہ

ما قضیٰ لهم علی لسان نبیهم لا تکلوا عن العمل۔

(صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۳)

معلوم ہو جائے کہ اس فوج کو اس کے نبی کی زبانی کیا کچھ دینے کا فیصلہ فرمایا گیا ہے تو یہ اسی پر بھروسہ کر بیٹھے گی اور دیگر اعمال سے بے توجہ ہو جائے گی۔

ان کو وقت کی بہترین جماعت قتل کریگی

صحیح مسلم میں اس مضمون کی متعدد حدیثیں ہیں کہ خوارج کا ظہور اس وقت ہوگا جب مسلمانوں میں دو باہم مخالف گروہ ہوں گے۔ اور جو گروہ برسرحق ہوگا وہی خوارج کو قتل کرے گا۔ یلی قتلهم اولی الطائفتین بالحق (ج ۱۔ ص ۴۴۴)

جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے، ویسا ہی ہوا کہ ان کا ظہور اس زمانہ میں ہوا جب کہ مسلمانوں میں دو محاذی گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ حضرت علی کا گروہ ۔ اور امیر معاویہ کا گروہ۔ اور حضرت علی کے گروہ نے خارجیوں کو قتل کیا۔ حقیقت نے پکارا یہی ہے برسرحق جماعت، امام نووی نے بھی اس کی شرح میں فرمایا۔

فیه حجة لاهل السنة ان علیا کان مصیبا فی قتاله والآخرون بغاة (ج ۱ ص ۳۴۲)

اس میں اہل سنت کا ثبوت ہے کہ حضرت علی برسرحق تھے اور دوسرا گروہ (جو آپ سے لڑا وہ) باغی تھا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی سے عہد لیا تھا کہ خارجیوں سے قتال کرنا

مسند بزار اور معجم اوسط طبرانی میں حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے مروی ہے کہ:

۸۔ عهد الیّ رسول الله صلی الله علیه وسلم فی قتال الناکثین و القاسطین والمارقین[۱]،

۸۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے ناکثین، قاسطین اور مارقین سے قتال کرنے کا عہد لیا ہے۔

---

[۱] مجمع الزوائد (ج ۲ ص ۲۸۶) کوئٹہ

گذر چکا ہے کہ ناکثین کے معنی ہیں عہد شکن، یہ اصحاب جمل ہیں، قاسطین کے معنی ہیں ظالم، یہ امیر معاویہ کی جماعت ہے۔ مارقین کے معنی ہیں دین سے خارج۔ یہ نہروان کے خارجیوں کی جماعت ہے۔

جنگ نہروان

خارجیوں کا حال اس باب کے شروع میں لکھا جا چکا ہے کہ ان لوگوں نے اپنے ہم خیال لوگوں کے علاوہ تمام مسلمانوں کو کافر سمجھا اور ان کا خون مباح قرار دیا۔ اور اس سلسلہ میں بڑی بدامنی پیدا کی۔ جب ان کی جمعیت چھ ہزار ہو گئی تو امیر المومنین سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور آپ کی فوج سے جنگ کرنے کے لئے نہروان میں اکٹھا ہوئے ان کا امیر (بروایت صحیح مسلم ج ا ص ۳۴۲) عبداللہ بن وہب راسبی تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ ان لوگوں نے اس کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ پہلے حضرت علی کا ارادہ یہ تھا کہ اہل شام کو بغاوت کی سزا دینے کے لئے فوج کشی کی جائے لیکن خوارج کے قتل و غارت کی واردات کی بنا پر آپ نے اسے ملتوی فرما دیا۔ اور ان کی سرکوبی مقدم سمجھی کہ یہ خطرہ یقینی بن گیا تھا کہ اگر فوج حیدری شام کی مہم پر گئی تو عراق کو خالی پا کر یہ لوگ مسلمانوں کے بچوں کو بے دریغ قتل کریں گے۔ اور ان کے مال لوٹ لیں گے جس کا اظہار خود حیدر کرار نے بھی فرمایا ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے ایک حدیث سنائی جس میں خوارج کے احوال بتائے گئے ہیں کہ

(۱) یہ لوگ تلاوت بکثرت کریں گے (۲) نماز و روزہ کا اتنا اہتمام کرینگے کہ تم لوگوں سے کہیں زیادہ اہتمام ہوگا۔ (۳) با ایں ہمہ یہ لوگ اسلام سے نکل جائیں گے۔ اور جو فوج ان کو قتل کریگی اگر اسے معلوم ہو جائے کہ انھیں قتل کرنے میں کتنا ثواب ہے تو اسی عمل کو کافی سمجھے گی۔ اور دیگر اعمال خیر کی طرف اسے چنداں توجہ نہ رہے گی۔ (۵) ان کی ایک علامت یہ ہے کہ ان میں ایک ایسا شخص ہوگا کہ جس کا ایک ہاتھ کہنی سے نہ ہوگا، اور بازو پر عورت کی چھاتی کی طرح گوشت ہوگا۔

اس حدیث کو سنا کر آپ نے فرمایا :

"اگر تم لوگ ان کو چھوڑ کر معاویہ اور اہل شام کی طرف گئے تو یہ لوگ بڑی آزادی سے تمہارے بال بچوں کو قتل کریں گے اور مال و دولت لوٹ لیں گے۔

مجھے پورا یقین ہے کہ حدیث میں جن لوگوں کے احوال بتائے گئے ہیں وہ یہی ہیں۔ دیکھو ان لوگوں نے کتنے بے گناہ لوگوں کا خون بہایا ہے اور ان کے مال لوٹے ہیں۔ اللہ کا نام لے کر ان کے مقابلہ کے لئے چلو" [1]

حضرت علی کی فہمائش

کوفہ، بصرہ، انبار اور مدائن میں جتنے خارجی عقیدہ کے لوگ تھے سب نہروان میں یک جا ہو گئے کہ یہاں سے فوج حیدری پر حملہ کا انتظام کریں۔ جواب کے لئے شیر خدا کی فوج نہروان آپہنچی، قتال سے پہلے حضرت مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم نے ان کے پاس حضرت ابو ایوب انصاری اور حضرت قیس بن سعد انصاری رضی اللہ عنہما کو سمجھانے کے لئے بھیجا، لیکن خوارج اپنی ضد پر اڑے رہے۔ اب خود امیر المومنین ان کے پاس تشریف لے گئے۔ اور ان کے سامنے تقریر کی۔

"لوگو! میں نے پہلے ہی تم کو متنبہ کیا تھا کہ تحکیم محض ایک فریب ہے لیکن تمہیں لوگوں نے اس کو قبول کرنے پر اصرار کیا، جب مجھے لامحالہ منظور ہی کرنا پڑا تو میں نے اس شرط پر اسے منظور کیا کہ قرآن مجید نے جسے زندہ کیا ہے دونوں حکم اسے زندہ رکھیں اور قرآن مجید نے جسے مٹا دیا ہے حکم لوگ اسے ٹھکرا نہ کریں اور قرآن و سنت کے خلاف کوئی فیصلہ نہ کریں، لیکن دونوں حکم خواہش نفس کے پیچھے چلے اور قرآن و سنت کی مخالفت کی، لہٰذا ان کا فیصلہ باطل ہوا، اور میں نے اسے یکسر مسترد کر دیا۔ حکمین کا فیصلہ جو یکسر باطل ہے اسے ہم لوگ مانتے ہی کب ہیں؟ پھر تم لوگ حکمین سے مخالفت کرنے کے ساتھ ہم لوگوں کی مخالفت

---

[1] یہ حدیث اور یہ واقعات صحیح مسلم ج ۱ ص ۳۴۴ سے ماخوذ ہیں۔ ۱۲ کوثر

کیوں کرتے ہو؟

دیکھو میں تم لوگوں کو متنبہ کرتا ہوں کہ گمراہی اور قتل و غارت چھوڑ کر حق کی اطاعت کرو۔ ایسا نہ ہو کہ تم اس حالت میں قتل کئے جاؤ کہ تمہارے لئے اللہ کے سامنے کوئی سبیل نہ رہے۔"

اس کے جواب میں خوارج نے کہا۔

"جب ہم نے تحکیم کو منظور کیا تو کافر ہو گئے تھے، اب ہم نے اس سے توبہ کی، اگر آپ بھی ایسا ہی سمجھیں اور کریں تو ہم آپ کے ساتھ ہیں، ورنہ لڑنے کے لئے تیار ہو جائیے۔"

حضرت مرتضیٰ نے فرمایا:

"کسی معتبر آدمی کو ہمارے پاس گفتگو کے لئے بھیجو، اگر وہ قائل نہ کر سکا بلکہ قائل ہو گیا تو لوگوں کو اللہ سے ڈرنا چاہیئے۔"

خوارج نے عبداللہ بن الکواء کو بھیجا۔۔۔ بھلا شیر خدا کے دلائل ناطقہ اور براہین ساطعہ کے سامنے وہ کیا بولتا، لیکن با ایں ہمہ اس نے کہا کہ ہم لوگ اپنی رائے سے ہٹ نہیں سکتے۔

اب مزید گفت و شنید کی ضرورت نہ تھی، بس صرف اس کی ضرورت تھی کہ ان کی بغاوت اور قتل و غارت گری کے جواب میں فوج کو حکم دیا جائے، لیکن حضرت مرتضیٰ ہدایت کے خورشید تاباں ہیں آپ کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ اگر کچھ لوگ بھی باطل کا ساتھ چھوڑ دیں تو دین کا بڑا مقصد پورا ہو جائے گا۔ چنانچہ آپ نے آغاز جنگ سے پہلے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو امن کا جھنڈا دے کر اعلان کرا دیا کہ:

"جو شخص اس جھنڈے کے نیچے آ جائے یا میدان جنگ سے واپس چلا جائے اور خارجیوں کا ساتھ چھوڑ دے اسے امان ہے۔"

اس اعلان کے بعد ایک خارجی سردار فروہ بن نوفل اشجعی اپنے پانچ سو ساتھیوں کو لے کر اور

یہ کہکر واپس چلا گیا کہ "علی سے جنگ کرنے کی کوئی دلیل ہمارے پاس نہیں"۔ اور ایک جماعت کوفہ واپس گئی، ایک ہزار خارجی اپنی جماعت سے نکل کر شیر خدا کے جھنڈے کے نیچے آگئے۔ اب خوارج کی بہت تعداد گھٹ گئی، لیکن لڑنے اور جان پر کھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔

معرکۂ کارزار

حضرت مرتضیٰ نے اپنی فوج کو حکم دیا کہ جنگ کی ابتدا نہ کرنا، اسکی پوری تعمیل کی گئی۔ خوارج نے پہل کی اور نہایت زور شور کا حملہ کیا۔ فوج حیدری نے اتنا زبردست مقابلہ کیا کہ تمام خارجی موت کے گھاٹ اتر گئے۔ صحیح مسلم کی روایت ہے کہ اس معرکہ میں حضرت علی کے دو آدمی مارے گئے۔ (ج ا ص ۳۴۳)۔

وہ آدمی جس کے بازو پر عورت کی چھاتی کی طرح گوشت تھا۔

اختتام جنگ کے بعد حضرت علی نے فرمایا "اس ناقص ہاتھ والے کو لاؤ" لوگوں نے تلاش کیا اور نہ پاسکے تو خود حضرت علی بنفس نفیس کچھ مقتولوں کے پاس تشریف لائے، جنکی لاشیں ایک دوسرے پر پڑی تھیں، اور فرمایا۔ اوپر کی لاشوں کو ہٹاؤ، بالکل نیچے اس کی لاش نکل پڑی، جس کا ہاتھ ناقص تھا (کہ کہنی سے نہ تھا) اور بازو پر عورت کی چھاتی طرح گوشت تھا۔ (صحیح مسلم ج ا۔ ص ۳۴۳) میں ہے کہ اس کو دیکھ کر آپ نے فرمایا۔ اللہ کی بات سچی، اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے پوری بات سنادی اور اس کی تبلیغ فرمادی۔

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ خوارج سے متعلق حدیث سنا کر فرماتے تھے۔

"میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے یہ حدیث سُنی ہے۔ اور میں گواہی دیتا ہوں کہ علی ابن ابی طالب نے ان سے قتال کیا ہے، اور میں بھی آپ کے ساتھ تھا۔ علی نے اس آدمی کو تلاش کرایا (جس کے متعلق حدیث میں ہے کہ اس کے بازو پر عورت کی چھاتی کی طرح گوشت ہوگا) اب یہ ہوا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو علامت بیان فرمائی تھی،

میں نے خود اپنی آنکھوں سے اسے دیکھ لیا۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۴۳)

بقیہ خوارج کا استیصال

جنگ نہروان نے خوارج کا ایک حد تک خاتمہ کر دیا لیکن ملک میں ان کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں رہ گئی تھیں جو لوٹ مار کرتی تھیں، ان کا ایک کام یہ بھی تھا کہ مجوسیوں، مرتدوں اور نومسلموں کو ورغلا کر بغاوت کرا دیتیں۔ رامہرمز کی پہاڑیاں ان کا مرکز تھیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت معقل بن قیس رضی اللہ عنہ کو ان کی سرکوبی کے لیے رامہرمز روانہ فرمایا۔ انہوں نے ان کو چن چن کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔ اور ملک ان کے شر و فساد سے پاک ہو گیا۔ مرتد مارے گئے، نومسلموں نے توبہ کی، ذمیوں نے بغاوت چھوڑی، اور اطاعت کا عہد کیا۔ حضرت معقل بن قیس نے حسب ہدایت مرتضوی، ان کے ساتھ بڑے ہی لطف و کرم کا سلوک فرمایا۔ چنانچہ جب یہ رامہرمز سے روانہ ہوئے تو ان کے عدل و انصاف اور رعایا نوازی کو یاد کر کے بے اختیار ذمیوں کے آنسو نکل پڑے اور اپنی عورتوں اور بچوں کو لے کر دور تک ان کی مشایعت کی۔

امیر معاویہ کا جارحانہ اقدام

حضرت علی کی طرف سے مصر کے حاکم حضرت قیس بن سعد کے بعد حضرت محمد بن ابی بکر تھے۔ مصر میں ایک مقام خربتا تھا جس میں امیر معاویہ کے آدمی معاویہ بن خدیج اور بسر بن ابی ارطاۃ پہلے سے مقیم تھے یہ لوگ حضرت علی کے شدید مخالف تھے اور بڑے جنگی تجربہ کار بھی تھے۔ ان کے اشارہ پر خربتا والوں نے بغاوت کر دی۔ حضرت علی نے حضرت اشتر نخعی کو مدد کے لئے بھیجا جو نہایت ہی بہادر اور بڑے ہی متقی اور دین دار تھے۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ:

"امیر معاویہ نے راستہ میں زہر دلوا کر اشتر نخعی کا کام تمام کرا دیا[1] اور عمرو بن العاص کی ماتحتی میں ایک بڑی فوج مصر روانہ کی اور اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا

---

[1] اسے حاجی معین الدین احمد ندوی مرحوم نے بھی خلفائے راشدین ص ۱۷۰ میں لکھا ہے۔ ۱۲ کوثر

بلکہ اس کے بعد ایک زبردست فوج لے کر خود بھی روانہ ہوئے اور مصر پہونچ
حضرت محمد بن ابی بکر کی فوج کو اس طرح گھیر لیا کہ حضرت محمد بن ابی بکر کے
ساتھی یا تو جان سے مارے گئے یا جان بچا کر بھاگ کھڑے ہوئے حضرت
محمد بن ابی بکر نے بھی ایک کھنڈر میں پناہ لی، لیکن عمرو بن العاص کے
جاسوسوں نے ڈھونڈھ نکالا، اور معاویہ بن خدیج نے نہایت بے رحمی کے
ساتھ قتل کر کے لاش کو جہاں تک بن پڑا ایک مردہ گدھے کے پیٹ میں
ٹھونس کر جلا دیا۔

یہ ہے ملوکیت کے تسلط کا نتیجہ کہ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے فرزند دلبند سیدنا محمد رضی اللہ عنہ کی لاش مطہر کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیا گیا۔ بڑا فرق ہے خلافت راشدہ اور ملوکیت میں! اس طرز عمل سے تمام مصر پر امیر معاویہ کی ہیبت بیٹھ گئی۔ اور مصر ان کی ملوکیت کے قبضہ میں آگیا۔ انہوں نے اس کی حکومت عمرو بن عاص کو حوالہ کر دی کہ اسی کے معاہدہ پر عمرو ابن عاص نے امیر معاویہ کا ساتھ دیا تھا۔ حضرت علی مصر کے واگذاشت کرنے کے اہتمام میں تھے کہ دفعتاً ان کی شہادت ہو گئی۔

مصر پر قبضہ کرنے کے بعد امیر معاویہ نے حجاز، عراق، جزیرہ اور یمن وغیرہ میں چھاپہ مار دستے پھیلا دیئے۔ وہ ان مقامات میں لوٹ مار کر کے بدامنی پیدا کر دیتے اور حضرت علی کی مشکلات میں اضافہ کرتے رہتے، لیکن جب حضرت علی کی فوج سرکوبی کے لئے پہنچ جاتی تو یہ بھاگ کھڑے ہوتے اس لوٹ مار سے کرمان اور فارس کے مجوسیوں کو بھی جسارت ہوئی اور انہوں نے بھی بغاوت کر دی لیکن حضرت علی نے ان کی مہم پر زیاد کو بھیج کر بغاوت کا استیصال کرا دیا۔ بغاوت فرو ہونے کے بعد حضرت علی نے ایرانیوں کے ساتھ اس لطف و عنایت کا سلوک کیا کہ ایران کا ایک ایک شخص احسان مندی کے جذبہ سے لبریز ہو کر پکار اٹھا کہ امیر المومنین علی کے طرز حکومت نے نوشیروانی طرز حکومت اور نوشیروانی عدل و انصاف کی یاد بھلا دی۔

مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر امیر معاویہ کا جارحانہ اقدام

امیر معاویہ نے حضرت علیؓ کو گونا گوں مشکلات میں مبتلا پاکر ۴۰ھ میں مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ پر قبضہ کرنے کے لئے بسر بن ابی ارطاۃ کو تین ہزار فوج کے ساتھ بھیجا، یہ شخص اپنے زمانہ کا مشہور سفاک تھا۔ گو محدثین کے اصول پر یہ بھی صحابی ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں: "لہ صحبۃ" [1] یعنی اس کی صحبت نبوی کا شرف حاصل ہے۔ لیکن با ایں ہمہ محدثین کے نہایت بلند پایہ امام حضرت یحییٰ بن معین فرماتے ہیں۔

یسر بن ابی ارطاۃ رجل سوء [2] — بسر بن ابی ارطاۃ بہت برا آدمی ہے۔

اس وقت حضرت علیؓ کی طرف سے حضرت ابوایوب انصاری نے حرم مدینہ کے احترام کے خیال سے مقابلہ کرنا مناسب نہ سمجھا اور اپنا جانشین چھوڑ کر حضرت علیؓ سے مشورہ کے لئے کوفہ روانہ ہو گئے۔ اس نے حضرت موصوف کے تقویٰ سے ناجائز فائدہ اٹھایا۔ اور حرم مدینہ میں صحابہ کرام اور ان کی مقدس اولاد کو قتل کیا۔ اور کئی بزرگوں کے مکانات ڈھا دیئے۔ غرض بڑی سفاکی کا سلوک کیا اور اس سے اپنی ہیبت بٹھا کر صحابہ کرام کو گرفتار کرنا شروع کیا کہ امیر معاویہ کی بیعت کرو ورنہ جان ماری جائے گی۔ اس طرح جبرًا و قہرًا بیعت لیکر مکہ معظمہ گیا۔ وہاں بھی بزور بیعت لی، پھر یمن گیا، وہاں بڑی سفاکی سے کام لیا۔ حضرت عبیداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے دو صغیر السن بچوں کو ذبح کر ڈالا [3] اور کئی متعدد لوگوں کو بے قصور قتل کر کے بزور امیر معاویہ کی بیعت لی۔

امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو ان واقعات کی خبر ہوئی تو آپ نے حضرت جاریہ بن قدامہ اور حضرت وہب بن مسعود رضی اللہ عنہما کو چار ہزار کی جمعیت کے ساتھ بسر کی سرکوبی کے لئے بھیجا،

---

[1] لیکن علمائے اصول کے نقطۂ نظر سے صحابی نہیں، کہ وہ محض اتنی بات پر کسی کو صحابی نہیں مانتے کہ اس شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی ہے۔ مزید تفصیل کتاب کے شروع میں حاشیہ میں موجود ہے۔ ۱۲ کوثر [2] کتاب الجرح والتعدیل امام ابن ابی حاتم ج ۱ ص ۴۲۴۔ کوثر [3] الجرح والتعدیل ج ۱ ص ۴۲۱۔ کوثر۔

بُسراِن کی آمد کی خبر سن کر بھاگ نکلا ۔ اور فوج حیدری نے یمن ، مکّہ ، اور مدینہ منورہ میں امن قائم کیا ۔ اور حضرت علی کی دوبارہ بیعت لی ۔ اس طرح ان مقدس مقامات کا نظام درست ہوا ۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی شہادت

مسئلہ تحکیم کو خارجیوں نے کفر قرار دیا تھا ۔ اور اس کی بنا پر دونوں حکموں کو نیز حضرت علی اور امیر معاویہ اور ان کے حامیوں کو کافر سمجھے تھے ۔ پہلے تو انہوں نے فوج اکٹھا کی کہ جو لوگ ان کے عقیدہ کے خلاف ہیں ان کو موت کے گھاٹ اتار دیں لیکن جب نہروان میں تمام اہل نہروان کا خاتمہ ہو گیا اور ادھر مزمیں جوان کا اڈہ تھا وہ بھی مٹ گیا تو باقی ماندہ خارجیوں نے اپنے اپنے طور پر اپنی جگہ کارروائی سوچی ان میں تین خارجیوں عبداللہ بن ملجم برک بن عبداللہ اور عمرو بن بکر نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہمارے نقطۂ نظر کے خلاف تین بڑی طاقتیں ہیں ۔ علی ابن طالب ، معاویہ بن ابی سفیان اور عمرو بن عاص ان تینوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیے ۔[1]

عبدالرحمٰن بن ملجم حضرت علی کا بڑا ہی شدید دشمن تھا ۔ اور اس کی قسمت میں اس امت کا سب سے بدترین شقی ہونا مقدر تھا ۔ اس نے سیدنا حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ کے قتل کا بیڑا اٹھایا اور برک بن عبداللہ نے امیر معاویہ کو مارنے کا ، اور عمرو بن بکر نے عمرو بن عاص کے قتل کرنے کا ، تینوں نے ایک ہی دن ۱۷ رمضان ۴۰ھ کی فجر کو اپنا اپنا منصوبہ پورا کرنے کی تاریخ مقرر کی ، امیر معاویہ اور عمرو بن عاص تو بچ گئے ۔ اور حضرت علی درجۂ شہادت پر فائز ہو گئے ۔ تفصیل یہ ہے ۔

ابن ملجم بڑا ہی بدنصیب انسان تھا ۔ حدیث میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا

" اگلوں میں سب سے بڑا شقی کون تھا ؟ "

---

[1] مجمع الفوائد ج ۲ ص ۲۱۳ بحوالہ مصنف ابن ابی شیبہ ۔ ۱۲ کوثر

حضرت علی نے گذارش کی: یارسول اللہ وہ شخص سب سے بڑا شقی تھا جس نے اللہ کی اونٹنی کو مار ڈالا:

حضور نے فرمایا: صحیح ہے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ پچھلی امت میں سب سے بڑا شقی کون ہے؟
حضرت علی نے گذارش کی: یارسول اللہ مجھے اس کا علم نہیں۔
حضور نے فرمایا:

الذی یضرب علی ھذہ واشار الی یافوخہ (مجمع الفوائد ۲/۲۱۲)
پچھلی امت میں سب سے بڑا شقی وہ ہے جو تمہارے سر پر تلوار کی ضرب (کاری) لگائے گا۔

شقی ابن ملجم نے یہ ضرب لگائی اور اس تاریخ سے لے کر قیامت تک کے انسانوں میں سب سے بڑا شقی ثابت ہو گیا۔

یہ لعین اپنا ناپاک منصوبہ پورا کرنے کے لئے کوفہ آیا راستہ میں قطام نامی ایک نہایت حسین و جمیل عورت کو دیکھ کر عاشق ہو گیا اور نکاح کا پیغام دیا۔ اس کے گھر والے معرکۂ نہروان میں مارے گئے۔ خارجیہ ہونے کے پہلے ہی سے اس کو حضرت علی سے دشمنی تھی، اب اور بڑھ گئی اس نے ابن ملجم کو جواب دیا کہ علی کو مار ڈالو یہی میرا مہر ہے، ابن ملجم نے کہا کہ اسی لئے تو ہم چلے ہیں اب ابن ملجم کے ناپاک ارادہ میں اور جوش پیدا ہو گیا۔

حضرت علی علیہ السلام کو غالباً اس کا علم ہو گیا تھا کہ اب ہماری شہادت کا زمانہ قریب آگیا۔ عبادت الٰہی بہت زیادہ بڑھا دی۔ رات رات بھر نماز و مناجات میں گذارتے ۱۷ رمضان المبارک کی مقدس رات لقائے الٰہی کے شدید اشتیاق میں بسر فرمائی۔ یہ عجیب مقدس رات ہے، اسی شب میں غار حرا میں قرآن مجید نازل ہوا۔ اس طرح نزول قرآن کے سال میں یہ رات شب قدر تھی۔ کیا تعجب کہ ۴۰ھ کی سترھویں شب بھی شب قدر ہی ہو۔ اس کی صبح صادق نمودار ہوتے ہی امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم مسجد کو روانہ ہوئے راستے میں لوگوں کو نماز کے لئے بیدار فرماتے گئے۔ مسجد میں تشریف لائے تو ابن ملجم کو جگایا جو یہیں

آکر اپنا منصوبہ پورا کرنے کے لئے سو یا تھا۔ امام ابن جریر طبری کی روایت ہے کہ جب علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ نے بحالِ نماز سجدہ میں سر رکھا تو شقی ابن ملجم نے سر مبارک پر تلوار کی نہایت کاری ضرب لگائی۔ زخم اتنا شدید تھا کہ زندگی کی امید منقطع ہوگئی۔ مصلیوں پر گویا قیامت ٹوٹ پڑی، ابن ملجم بھاگ رہا تھا، مگر گرفتار ہوگیا جعد بن ہبیرہ نے نماز پڑھائی، نماز کے بعد ابن ملجم کو آپ کے سامنے پیش کیا گیا۔ طبقات ابن سعد (ج ۳ ص ۱۲۴) کی روایت ہے کہ حضرت مرتضیٰ نے اس سے چند سوالات کرنے کے بعد حکم دیا کہ اسے آرام سے رکھا جائے۔

مصنف ابن شیبہ میں ہے کہ آپ نے لوگوں سے فرمایا اگر میں اس زخم سے جاں بر ہوگیا تو جو مناسب ہوگا کروں گا۔ اور اگر میرا خاتمہ ہوگیا تو قصاص میں اس کو قتل کر دینا (جیسا کہ قرآن مجید میں حکم ہے) اور اس کا مثلہ نہ کرنا۔ (جمع الفوائد ج ۲ ص ۲۱۲)

شقی ابن ملجم نے کئی روز تک تلوار زہر میں بجھا کر آپ کو زخمی کیا تھا، آپ کی حالت برابر نازک ہوتی گئی، امام حسن، اور امام حسین اور حضرت محمد بن حنفیہ وغیرہ کو نہایت مفید نصیحتیں فرمائیں، جن میں باہمی اتحاد و اتفاق، عبادت الٰہی، اطاعت ربانی اور دنیا سے بے رغبتی پر بہت زور دیا تھا۔ اور حضرت محمد حنفیہ اور اپنے دوسرے صاجزادوں کو تاکید فرمائی کہ حسن و حسین کے ادب و احترام اور اطاعت و فرماں برداری میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کرنا کہ یہ دونوں تم لوگوں کے بڑے بھائی بھی ہیں اور رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نہایت محبوب نواسے بھی ہیں اور امام حسن اور امام حسین سے فرمایا کہ محمد بن حنفیہ اور دوسرے بھائیوں کا لحاظ رکھنا اور تمام امت کی خیر خواہی کرتے رہنا۔ اسی طرح اور مسلمانوں کو بھی مفید نصیحتیں فرمائیں۔

حضرت جندب بن عبداللہ نے عرض کی، امیر المومنین ہم لوگ آپ کے بعد آپ کے خلف اکبر امام حسن کے ہاتھ پر بیعت کریں۔ آپ نے فرمایا: اس بارے میں تم لوگ جو مناسب سمجھو کرو، میں خود کوئی حکم دینا نہیں چاہتا۔

زخمی ہونے کے بعد آپ کا مشغلہ صرف ذکر الٰہی اور اولاد مطہر اور عام امت کو مفید نصیحتیں

کرتا تھا، اور رشد و ہدایت کا سلسلہ برابر جاری تھا۔ بالآخر ۲۱ رمضان المبارک سنہ ۴۰ھ کو اللہ و رسول کا یہ محبوب اعظم اپنے رب سے جا ملا۔ فَرَوْحٌ وَّرَیْحَانٌ وَّجَنَّةُ نَعِیْمٍ ۝ رضی اللہ تعالی عنہ۔

حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام نے غسل دیا۔ امام حسن نے نماز جنازہ پڑھائی اور اس جانِ ایمان، روح انسانیت اور آفتاب ہدایت کو کوفہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ عمر شریف ترسٹھ سال کی تھی، مدت خلافت چار سال نو مہینے۔

فضل و کمال کی جامعیت و ہمہ گیری

سیرِ مرتضوی کے متعدد ابواب بہت ہی اہم ہیں مثلاً (۱) آپ کی بے نظیر سیرت اقدس (۲) علوم دین یعنی تفسیر، حدیث، فقہ، عرفان و احسان کی ایسی جامعیت جس کی مثال نہیں۔ اور ان علوم میں آپ کی امامت کبری (۳) تعلیم قرآن اور اس کی نشر و اشاعت میں آپ کی وہ توجہ جس نے قرأت کے ائمۂ سبعہ[1] کے اساتذہ تیار کر دیئے۔ (۴) جہاد میں آپ کا مقام اعلی (۵) اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں آپ کے مساعی جمیلہ (۶) خلافت راشدہ کے خصوصیات زندہ رکھنے اور اس کو منہاج نبوت پر چلانے میں آپ کی حیرت انگیز جد و جہد جس نے سب کو بتایا کہ ملوکیت کی بے پناہ طاقتوں اور کارستانیوں کے مقابلہ میں دینی سیاست کو کس طرح منہاج نبوت پر چلانا چاہیئے۔ (۷) ان کے علاوہ آپ کے روحانی فیوض و برکات جن کی بناپر تمام سلاسل تصوف و روحانیت کے سرچشمہ آپ ہیں۔ ان تمام مباحث پر بہت کچھ لکھنے

---

[1] قرأت کے ائمۂ سبعہ یہ سات امام ہیں جس سے تمام دنیا کو قرآن مجید ملا۔ (۱) امام ابن کثیر مکی (۲) امام نافع مدنی (۳) امام ابن عامر شامی (۴) امام ابو عمرو بن علاء بصری (۵ و ۶ و ۷) امام عاصم، امام حمزہ، امام کسائی کوفی۔ ۱۲ کوثر۔

کی ضرورت ہے لیکن چونکہ کتاب کافی ضخیم ہو چکی ہے اور اہل بیت اطہار کے عقیدت مندوں کا جوش عقیدت یہی چاہتا ہے کہ کتاب جلد از جلد چھپ کر ان کی نگاہوں کو نور اور دل کو سرور بخشے لہٰذا سردست ان ابواب پر مفصل لکھنے کے بجائے دیگر آل کسا پر قلم اٹھانا ضروری ہو گیا تاکہ کتاب جلد مکمل ہو کر شائع ہو جائے اور عقیدتمندوں کے تقاضے پورے ہوں۔ با ایں ہمہ ان پر بھی کچھ نہ کچھ لکھنا ضروری ہے گو مجمل اشارے ہی ہوں، لیکن دین کے اتنے ہمہ گیر اور وسیع الذیل مباحث کو چند اجمالی اشاروں میں ادا کرنا حد درجہ دشوار ہے۔ مولف کو اس دشواری کا حل یہی نظر آیا، کہ چند احادیث اور اکابر کے چند اقوال جن سے حیات مرتضوی کے ان گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ نیز آپ کے چند اسمائے گرامی جو فضائل مرتضوی کے مبسوط مباحث کے عنوان کی حیثیت رکھتے ہیں ان کو مختصر توضیح کے ساتھ پیش کر دیا جائے۔

چند احادیث جن سے اندازہ لگتا ہے کہ ذات مرتضوی کتنی بلند پایہ اور کیسی جامع الفضائل شخصیت ہے

حضرت علی مولائے کائنات ہیں

تیس سے زائد صحابۂ کرام سے مروی ہے، اور مسند احمد، سنن نسائی، ترمذی، ابن ماجہ، مستدرک حاکم، معجم طبرانی وغیرہ میں یہ روایت ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من کنت مولاہ فعلی مولاہ

میں جس کا مولا ہوں اسکے مولا علی بھی ہیں۔

حضرت علی حق کا محور ہیں

سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۳ باب مناقب علی) میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہ ترتیب حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان کو یہ دعا دی کہ اللہ ان پر رحم فرمائے، پھر حضرت علی کو یہ دعا دی

اور یہ بھی دعا دی۔

اللّٰھم ادر الحق معہ حیث دار — یا اللہ جدھر علی جائیں اسی طرف حق کو بھی گھما دے۔

اس حدیث کی تشریح اس فصل میں کی جا چکی ہے، جس کا عنوان ہے "حضرت علی کا ساتھ دینے اور آپ کی مدد کرنے کی چند حدیثیں"۔

اس مضمون کی دو حدیثیں اور ہیں۔

الحق مع ذی الحق یعنی علیا، (کنز العمال ج ۶ ص، ۱۵۷ ص) — ۱۔ حق تو حق والے کے ساتھ یعنی علی کے ساتھ رہے گا۔

تکون بین الناس فرقۃ واختلاف فیکون ھذا واصحابہ علی الحق یعنی علیا۔ (کنز العمال ص ۱۵۷/۶ طب) — ۲۔ لوگوں میں افتراق اور اختلاف ہوگا اس وقت یہ (حضرت علی کی طرف اشارہ فرمایا) اور اس کے رفقا حق پر ہوں گے۔

حضرت علی کو حضور سے وہی نسبت ہے جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ سے تھی

صحیح مسلم اور سنن ترمذی میں حضرت سعد بن ابی وقاص سے نیز سنن ترمذی وسنن ابن ماجہ میں حضرت جابر سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا ہے۔

انت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبی بعدی (مسلم ص ۲۷۸/۲، ترمذی ص ۲۱۴/۲) — اے علی تم کو میری طرف سے وہی مقام حاصل ہے جو موسیٰ کی طرف سے ہارون کو حاصل تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔

حضرت علی باب علم وحکمت ہیں

سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴ میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

انا دار الحکمۃ وعلی بابھا — میں حکمت کا گھر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں

ایک روایت اس طرح بھی آئی ہے۔

انامدينة العلم وعلى بابها فمن اراد العلم فليات الباب (كنز العمال ص ۱۵۲ عن عد طب ک)[1]

میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہیں جس کو علم مطلوب ہو وہ اس کے دروازہ پر حاضر ہو۔

حضرت علی اللہ و رسول کے محبوب اعظم ہیں

خیبر جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے بھی فتح نہ ہوسکا تو آپ نے فرمایا جیسا کہ صحیح مسلم میں حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے۔

لاعطين هذه الراية رجلا يفتح الله على يديه يحب الله ورسوله ويحبه الله ورسوله (ج ۲ ص ۲۷۹)

اب میں یہ جھنڈا اس کو دوں گا جس کے ہاتھ سے اللہ فتح دے گا۔ یہ اللہ اور رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول کا محبوب ہے۔

صحابہ کرام نے یہ رات اس سوچ بچار میں کاٹی کہ دیکھئے کل کس خوش نصیب کو جھنڈا مرحمت ہوتا ہے، لیکن صبح ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: علی کہاں ہیں؟ لوگوں نے عرض کی یارسول اللہ ان کی آنکھوں میں درد ہے۔ آپ نے فرمایا ان کو لیتے آؤ۔ جب حاضر ہوئے تو آپ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگا کر دعا فرمائی، فوراً تمام شکایتیں کافور ہوگئیں پھر ان کو جھنڈا مرحمت فرمایا۔ اور آپ کے ہاتھ سے خیبر فتح ہوگیا۔

سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳ میں حضرت انس سے مروی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پرندے کا گوشت آیا تو آپ نے یہ دعا مانگی۔

اللهم ائتني باحب خلقك اليك

یا اللہ میرے پاس اس کو بھیج دے جو تیری

---

[1] حافظ ابن جوزی نے اس حدیث کو موضوع کہہ دیا ہے لیکن یہ ان کا تشدد ہے، درحقیقت یہ حدیث حسن ہے جیسا کہ امام سیوطی نے تاریخ الخلفاء ص ۱۲۰ میں تصریح فرمائی ہے۔ ۱۲ کوثر

يأكل معي هذا الطير [1]

مخلوق میں تیرا سب سے زیادہ محبوب ہے تاکہ وہ میرے ساتھ اس پرند کا گوشت کھائے

حضرت انس کا بیان ہے کہ اس دعا کا مانگنا تھا کہ حضرت علی آئے آپ کے ساتھ یہ گوشت تناول فرمایا۔

صحابۂ کرام میں سیدنا ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ حضور کے بڑے ہی محبوب تھے، مگر حدیث میں ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت علی سے اور بھی زیادہ محبت رکھتے تھے حافظ ابن حجر فتح الباری ج ۷ ص ۱۷ باب فضل ابی بکر) میں لکھتے ہیں:۔

اخرج احمد وابو داؤد والنسائی بسند صحیح عن النعمان بن بشیر قال استاذن ابوبکر علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسمع صوت عائشۃ عالیا وھی تقول واللہ لقد علمت ان علیا احب الیک من ابی (الحدیث)

احمد، ابو داؤد اور نسائی نے صحیح سند سے نعمان بن بشیر کی روایت لکھی ہے کہ ابوبکر نے (اندر آنے کی) نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی اس وقت انہوں نے عائشہ کی اونچی آواز سنی وہ یہ کہہ رہی تھیں کہ خدا کی قسم میں جانتی ہوں کہ آپ کے نزدیک علی میرے والد سے زیادہ محبوب ہیں

اس محبت کا یہ عالم تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو ایک فوج کے ساتھ بھیجا۔ وقفہ ہوا تو آپ کو ان کے دیکھنے کا اتنا شدید اشتیاق پیدا ہوا کہ دونوں دست مبارک اٹھا کر یہ دعا مانگتے تھے:

---

[1] سراج الدین قزوینی نے اس حدیث کو موضوع سمجھا ہے لیکن یہ صحیح نہیں چنانچہ علامہ صلاح الدین علائی نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ یہ اتنی سندوں سے مروی ہے کہ درجۂ حسن پر پہونچ گئی ہے (قوت المغتذی مع سنن الترمذی ج ۲ ص ۲۱۵)

اللّٰھم لا تمتنی حتی ترینی علیا — یا اللہ جب تک میں علی کو نہ دیکھ لوں مجھ کو دنیا سے نہ اٹھانا۔

(ترمذی ج ۲ ص ۲۱۵)

حضرت علی کی محبت ایمان کی علامت ہے اور ان سے بغض رکھنا نفاق کی علامت ہے

سنن ترمذی و نسائی و ابن ماجہ میں ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی سے فرمایا۔

لا یحبک الا مومن ولا یبغضک الا منافق (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۲) — اے علی تم سے وہی محبت رکھے گا جو مومن ہے اور تم سے وہی بغض رکھے گا جو منافق ہے۔

اسی بنا پر صحابۂ کرام منافقین کو اس طرح پہچان لیا کرتے تھے کہ ان کو حضرت علی سے بغض ہے۔ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

انا کنا لنعرف المنافقین نحن معشر الانصار ببغضھم علی ابن ابی طالب (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۳) — بالیقین ہم لوگ خصوصًا انصار منافقین کو بغض علی کی بنا پر پہچان لیا کرتے تھے

اسی لئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کی محبت پر بہت زور دیا ہے حتّٰی کہ ارشاد فرمایا ہے:

من احب علیا فقد احبنی و من احبنی فقد احب اللّٰہ و من ابغضہ فقد ابغضنی، و من ابغضنی فقد ابغض اللّٰہ (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۸) — جس نے علی سے محبت رکھی اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے مجھ سے محبت رکھی اس نے اللہ سے محبت رکھی اور جس نے علی سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا اور جس نے مجھ سے بغض رکھا اس نے اللہ سے بغض رکھا۔

بعض معاملات ایسے ہیں کہ اگر حضرت علی سے کئے گئے تو گویا حضورؐ سے کئے گئے

انھیں میں محبت اور بغض بھی ہیں

جیسا کہ ابھی حدیث پیش کی گئی ہے، انھیں میں ایک معاملہ یہ بھی ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو مولیٰ مانا تو حضرت علی کو بھی اپنا مولا مانو: حدیث گذر چکی ہے:

من کنت مولاہ فعلی مولاہ — میں جس کا مولا ہوں علی بھی اس کے مولا ہیں۔

ایک معاملہ یہ بھی ہے جس نے حضرت علی کو گالی دی گویا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا۔

من سب علیا فقد سبنی، ومن سبنی فقد سب اللہ (کنز العمال ج ۶ ص ۴۰۵ بحوالہ مسند احمد و مستدرک) — جس نے علی کو گالی دی اس نے مجھے گالی دی اور جس نے مجھے گالی دی اس نے اللہ کو گالی دی۔

ایک معاملہ یہ بھی ہے کہ جس نے حضرت علی کو ایذا دی اس نے رسول خدا صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کو ایذا دی، مسند احمد، تاریخ کبیر امام بخاری، مستدرک حاکم میں ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من آذی علیا فقد آذانی (کنز العمال ص ۱۵۲) — جس نے علی کو ایذا دی اس نے مجھے ایذا دی۔

الدر المنثور ج ۵ ص ۲۲۰ میں ہے کہ ایک شامی نے حضرت ابن عباس کے سامنے حضرت علی کو گالی دی تو حضرت موصوف نے اس کو کنکریاں پھینک ماریں اور فرمایا۔

یا عدو اللہ آذیت رسول اللہ، — یعنی اے دشمن خدا تو نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا پہنچائی

پھر یہ آیت پڑھی ــ

اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ — جو لوگ اللہ و رسول کو ایذا دیتے ہیں اللہ نے ان پر دنیا میں بھی لعنت کی ہے اور آخرت میں بھی

انھیں میں اطاعت و نافرمانی کا معاملہ بھی ہے جس نے حضرت علی کی اطاعت کی اس نے

نے حضور کی اطاعت کی، اور جس نے حضرت علی کی نافرمانی کی اس نے حضور کی نافرمانی کی۔ مستدرک میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی فقد عصی اللہ، ومن اطاع علیا فقد اطاعنی، و من عصیٰ علیا فقد عصانی۔ (کنز العمال ص ۱۵۶ ج ۶)	جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے علی کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے علی کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

ایک معاملہ یہ ہے کہ حضرت علی کو چھوڑ دیا اس نے رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ دیا۔ معجم کبیر طبرانی میں حضرت ابوذر غفاری و حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من فارقک یا علی فقد فارقنی ومن فارقنی فقد فارق اللہ (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۶)	اے علی جس نے تم کو چھوڑ دیا اس نے مجھ کو چھوڑ دیا اور جس نے مجھ کو چھوڑ دیا اس نے اللہ کو چھوڑ دیا۔

حضرت علی قرآن کے ساتھ اور قرآن حضرت علی کے ساتھ

معجم اوسط و کبیر میں حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

علی مع القرآن والقرآن مع علی ولا یفترقان حتیٰ یردا علی الحوض (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۳)	علی قرآن کے ساتھ ہیں اور قرآن علی کے ساتھ ہے۔ یہ دونوں کبھی جدا نہ ہوں گے، حتیٰ کہ دونوں ایک ساتھ حوض کوثر پر میرے پاس آئیں گے۔

قرآن میں قرآن مجید کے تمام علوم و حقائق تمام معارف و بصائر اور تمام اسرار و حکم بھی ہیں، نیز تمام قرآنی تزکیۂ نفوس کی تعلیمات و ارشادات بھی ہیں۔ حدیث بالا کی بنا پر

حضرت علی ان تمام امور حقانی کے ساتھ ہیں اور یہ تمام امور حقانی ان کے ساتھ ہیں، اس کا محصل یہ ہے کہ مولا علی علیہ السلام قرآن مجید کے تمام علوم وحقائق اور بصائر ومعارف کے سرچشمہ ہیں، اور قرآنی تزکیہ نفوس کے لئے تمام سلاسل تصوف کے شیخ اعظم اور مرشد اکبر ہیں۔ حدیث بالا سے یہ حقیقت بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن کا سیاسی نظام بھی حضرت علی کے ساتھ ہے، اس کا ثبوت خلافت مرتضوی کا پورا عہد راشد ہے۔ حتیٰ کہ اہل سنت کا مسلم عقیدہ ہو گیا ہے کہ آپ کے عہد خلافت میں جتنے بھی سیاسی معاملے پیش آئے ہیں ان سب میں حق آپ ہی کی طرف تھا، اور جو لوگ آپ کے مخالف تھے وہ اس میں حق پر نہ تھے۔

اکابر کے چند اقوال جن سے اندازہ لگتا ہے کہ ذات مرتضوی کتنی بلند پایہ ہے اور کیسی جامع الفضائل شخصیت ہے

کیسے بہترین فضائل ہیں یہ تین عظمتیں!؟

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا ارشاد ہے:

لقد اعطی علی ثلٰث خصال لان یکون لی خصلة منها احب الیَّ من اعطی حمر النعم، فسئل ما هی؟ قال تزوجه ابنته فاطمة، وسکناه المسجد، لا یحل لی فیه ما یحل له، والرایة یوم خیبر۔ (احمد وابو یعلی واللفظ له)

علی کو تین ایسے خصائل ملے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک نضیلت بھی مجھے ملتی تو یہ دولت مجھ کو سرخ اونٹ سے بڑھ کر محبوب دولت ہوتی آپ سے پوچھا گیا وہ کون سے تین فضائل ہیں؟ آپ نے فرمایا (۱) فاطمہ بنت رسول اللہ سے علی کی شادی (۲) مسجد علی کی سکونت کہ ان کے لئے مسجد میں وہ صورت جائز ہے جو میرے لئے جائز نہیں۔ (۳) اور خیبر میں ان کو جھنڈے کا ملنا۔

اور اس طرح سب نے جان لیا کہ تمام حاضرین میں حضرت علی کو یہ فضیلت حاصل ہے کہ خصوصیت کے ساتھ اللہ و رسول کے محبوب ہیں۔

یہ تین فضیلتیں کتنی عظیم الشان ہیں

صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۷۸) اور سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴ میں ہے:

امر معاویۃ بن ابی سفیان سعدا، فقال: ما منعک ان تسب ابا تراب؟	معاویہ بن ابی سفیان نے سعد بن ابی وقاص کو حکم دیا (کہ علی کو گالی دو) پھر یہ کہا تم ابو تراب کو گالی کیوں نہیں دیتے؟

اس پر حضرت سعد نے فرمایا: مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تین باتیں یاد آرہی ہیں جن کی وجہ سے میں کبھی حضرت علی کو گالی نہیں دے سکتا۔ اگر ان میں سے ایک بات بھی مجھے حاصل ہوتی تو اس دولت کو سرخ اونٹ سے بھی بڑھ کر دولت سمجھتا۔" یعنی تمام — دنیا کی دولت سے بڑھ کر سمجھتا۔ پھر وہ تین باتیں بیان فرمائیں جو حضرت علی کی نہایت عظیم الشان فضیلتیں ہیں۔ وہ تینوں درج ذیل ہیں۔

فضیلت اوّل ۔ ایک غزوہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو ساتھ لے جانے کے بجائے اپنی جگہ مدینہ میں چھوڑ دیا۔ حضرت علی نے گذارش کی یا رسول آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑ کر تشریف لے جا رہے ہیں آپ نے فرمایا۔

اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ الا انہ لا نبیَّ بعدی۔	اے علی کیا تم اس پر راضی نہیں کہ تم کو میری طرف سے وہی مقام حاصل ہے جو موسیٰ کی طرف سے ہارون کو حاصل تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں!

حضرت سعد فرماتے ہیں کہ اگر یہ نعمت مجھے ملتی تو میرے لئے تمام دنیا سے بڑھ کر دولت تھی

فضیلت دوم ۔ غزوۂ خیبر میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہ سے حضرت علی کی شادی بڑی اہم فضیلت ہے یہ فضیلت اگر مجھے ملتی تو میں اس دولت کو تمام دنیا سے بڑھ کر محبوب دولت سمجھتا،

درحقیقت بڑے ہی اعلیٰ درجہ کی فضیلت ہے کیونکہ حضرت فاطمہ تمام عورتوں سے افضل ہیں، نیز یہ رشتہ اتنا اہم اور مقدس ہے کہ اس کی بدولت حضرت علی تمام ذریات رسول کے منبع ہیں کہ آپ ہی سے نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ شجرۂ طیبہ ظہور میں آیا جو تمام فیوض و برکات کا نخل طوبیٰ ہے جس کی شاخیں اور برگ و بار حسنین کریمین، ائمۂ اہل بیت حضرت غوث الاعظم، حضرت خواجۂ اجمیر اور لاکھوں، کروڑوں ائمۂ ایمان و روحانیت ہیں صلی اللہ علی النبی وعلیہم اجمعین۔

۲۔ حضرت عمر یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت علی کو ایک فضیلت یہ بھی ملی ہے کہ بحالِ جنابت حضرت علی کو مسجد سے گذرنے کا حق ہے۔ مجھے یہ حق نہیں، اگر یہ شرف مجھے ملتا تو میں اس دولت کو تمام دنیا سے بڑھ کر دولت سمجھتا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی یہ فضیلت حدیث میں بیان فرمائی گئی ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔

یاعلی لا یحل لاحد ان یجنب	اے علی تمہارے سوا کسی کو بحال جنابت
فی ھذا المسجد غیرک ،	اس مسجد سے گذرنا جائز ہی نہیں۔

(سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۴)

۳۔ حضرت عمر یہ بھی بتاتے ہیں کہ حضرت علی کو ایک فضیلت یہ بھی ملی ہے کہ فتح خیبر کا جھنڈا حضرت علی کو ملا ہے۔ اگر یہ شرف مجھے ملتا تو میں اس دولت کو تمام دنیا سے بڑھ کر دولت سمجھتا۔

گذر چکا ہے کہ خیبر میں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا کل میں یہ جھنڈا اس کو دوں گا جو اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول کا محبوب ہے تمام صحابہ اس شرف کے حاصل کرنے کے آرزومند تھے حتی کہ حضرت عمر بھی، لیکن یہ اعزاز حضرت علی کو عنایت ہوا۔

لاعطین الرایۃ رجلا یحب اللہ و رسولہ ویحبہ اللہ ورسولہ — اب میں اس کو جھنڈا دوں گا جو اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول کا محبوب ہے

اس ارشاد نبوی کی بنا پر ہم لوگ اس نعمت کے بڑے آرزومند تھے، لیکن آپ نے فرمایا علی کو بلاؤ ان کو آشوب چشم کی شکایت تھی، غرض وہ اسی حالت میں آئے۔ آپ نے ان کی آنکھوں میں لعاب دہن لگا دیا، اور انھیں جھنڈا عنایت فرمایا۔ پھر اللہ نے ان کے ہاتھ سے خیبر کو فتح کرایا۔

حضرت سعد فرماتے ہیں اگر یہ شرف مجھے ملتا تو میرے لئے تمام دنیا کی دولت سے بڑھ کر تھا۔

فضیلت سوم - ایک آیت ہے۔ قُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ الخ

جس کا مفہوم یہ ہے کہ اے نبی آپ ان عیسائیوں سے کہہ دیجئے کہ آؤ ہم بھی اپنے بیٹے بیٹی اور خاص الخاص رشتہ دار کو بلالیں اور تم بھی اپنے بیٹے بیٹی اور خاص الخاص رشتہ دار کو بلالو پھر ہم خشوع کے ساتھ اللہ سے دعا کریں اور مباہلہ کریں، کہ جو جھوٹا ہے اس پر لعنت ہو۔

اس آیت کا نام آیت مباہلہ ہے اس کا مفصل بیان ایک مستقل فصل میں گذر چکا ہے۔

حضرت سعد فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نزول کے موقع پر نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علی، فاطمہ، حسن اور حسین کو طلب فرما کر اللہ سے کہا۔

اللّٰھم ھولاء اھلی — یا اللہ میرے اہل و عیال یہ ہیں۔

حضرت سعد کے نزدیک حضرت علی کی یہ فضیلت بھی اتنی عظیم الشان ہے کہ فرماتے ہیں کہ اگر یہ شرف مجھے ملتا تو میں اس کو تمام دنیا کی دولت سے بڑھ کر سمجھتا۔

قرآن مجید میں صحابہ کو کئی جگہ عتاب فرمایا گیا ہے لیکن حضرت علی کا ذکر خیر ہی ہوا ہے

حافظ امام طبرانی نے معجم کبیر میں، امام ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں، اور امام ابونعیم نے حلیۃ الاولیا میں حضرت ابن عباس کا ارشاد نقل فرمایا ہے کہ:

مَا انزل اللّٰہ یا ایُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا الاّ وعلی امیرھا وشریفہا، و لقد عاتب اللّٰہ اصحاب محمد فی غیر مکان وماذکر علیا الا بخیر

اللہ نے جہاں بھی یا ایہا الذین آمنوا فرمایا ہے، یعنی اے ایمان والو وہاں ایمان والوں کے افسر اور امیر حضرت علی ہیں۔ اور اللہ نے کئی مقام پر صحابہ کو عتاب فرمایا ہے لیکن علی کا ذکر خیر ہی فرمایا ہے۔

حضرت علی کے بارے میں جتنی آیتیں نازل ہوئی ہیں اتنی کسی کے بھی بارے میں نازل نہیں ہوئیں

امام ابن عساکر، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد روایت کرتے ہیں کہ

ما نزل فی احد من کتاب اللّٰہ تعالیٰ ما نزل فی علی۔

کسی کے متعلق قرآن میں اتنی آیتیں نازل نہیں ہوئی ہیں جتنی علی کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔

حافظ ابن عساکر نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت ابن عباس کا ارشاد ہے:

نزلت فی علی ثلثمائۃ آیۃ

علی کے بارے میں تین سو آیتیں نازل ہوئی ہیں۔

حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے حضرت علی نے اسلام قبول کیا

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا ارشاد مروی ہے کہ:

کان علی رضی اللّٰہ عنہ اول من اسلم من الناس بعد خدیجۃ[1]

حضرت خدیجہ کے بعد سب سے پہلے حضرت علی نے اسلام قبول کیا ہے۔

---

[1] منتقی الاخبار مع نیل الاوطار ج ۵ ص ۱۶۸ - ۲۶۹، حافظ ابن عبدالبر الاستیعاب میں لکھتے ہیں، حضرت سلمان، حضرت ابوذر، داؤد، حضرت مقداد، حضرت خباب، حضرت جابر، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت زید بن ارقم فرماتے ہیں سب سے پہلے حضرت علی نے اسلام قبول کیا ہے (تدریب الراوی ص ۴۰۹) کوثر۔

محققین کے نزدیک یہی قول قابل ترجیح ہے، حافظ ابن حجر جو علوم حدیث اور علم اسماء الرجال کے عدیم المثال محقق ہیں۔ تقریب التہذیب صفحہ ۲۷۲ میں اس قول کو قابل ترجیح لکھتے ہیں۔

امت محمدیہ میں سب سے پہلے نمازی حضرت علی ہیں

سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۵) میں حضرت ابن عباس کا ارشاد مروی ہے۔

اول من صلی علی

(امت میں) سب سے پہلے نمازی علی ہیں۔

علم میں کسی کو آپ پر سبقت حاصل نہیں

حضرت علی کے وصال کے دوسرے روز امام حسن علیہ السلام نے جو خطبہ دیا ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ اس میں آپ نے فرمایا:

لقد فارقکم رجل بالامس لم یسبقه الاولون بعلم، ولم یدرکه الآخرون وکان رسول اللہ صلی اللہ علیه وسلم یبعثه بالرایة جبریل عن یمینه ومیکائیل عن شماله حتی یفتح له۔

(صفة الصفوة ج ۱ ص ۱۲۱)

کل ایک ایسی شخصیت تم سے رخصت ہوئی ہے کہ اگلے لوگ اس سے علم میں آگے نہ ہو سکے۔ اور پچھلے لوگ اس کو پا نہیں سکتے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب انھیں جھنڈا دے کر جہاد پر روانہ فرماتے تو جبریل ان کے داہنے جانب ہوتے اور میکائیل بائیں جانب، پھر وہ فتحیاب ہو جاتے۔

امام حسن علیہ السلام کا یہ ارشاد کہ "اگلے لوگ علم میں حضرت علی سے آگے نہ بڑھ سکے، اور پچھلے لوگ انھیں نہ پا سکیں گے" اس سے اندازہ لگایئے کہ آپ کا علمی پایہ کتنا بلند ہے۔ علمائے ملت نے آپ کی اس علمی رفعت کا ہمیشہ اعتراف کیا ہے اور کیوں نہ ہو آپ ہی تو باب العلوم ہیں۔

حضرت مسروق نہایت بلند پایہ تابعی اور شیخ المحدثین ہیں، حافظ ابن صلاح اپنے

مقدمہ صفحہ ۸۴ میں ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

وجدت علم اصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم انتہی الی ستۃ: عمرؓ وعلیؓ وابیؓ وزیدؓ وابی الدرداء وعبد اللہ بن مسعودؓ، ثم انتہی علم ہولاء الستۃ الی اثنین: علی وعبد اللہ۔	میں نے یہی پایا کہ تمام صحابہ کا علم چھ شخصوں کے اندر آ گیا ہے، وہ یہ ہیں۔ عمرؓ، علیؓ، ابی بن کعبؓ زید بن ثابتؓ، ابو درداءؓ اور ابن مسعودؓ، پھر ان چھ صحابہ کا علم دو شخصوں کے اندر موجود ہے۔ وہ ہیں، علی اور عبد اللہ بن مسعود۔

حضرت مسروق یہاں آکر خاموش ہو جاتے ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حضرت عبد اللہ بن مسعود کے پاس بھی جتنا علم کا ذخیرہ ہے وہ سب حضرت علی کے پاس موجود ہے، کیوں کہ حضرت علی باب علم ہیں۔

حضرت علی صفات اعلیٰ سے لبریز ہیں

امام حاکم اور امام طبرانی کی روایت ہے کہ حضرت ابن عباس سے حضرت علی کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے فرمایا:-

ملئ عزما وحزما وعلما ونجدۃ	حضرت علی عزم صادق، ہوشمندی، علم اور شجاعت سے لبریز ہیں۔
(تاریخ الخلفا ص ۸۶)	

سیرت مرتضوی کا ایک مختصر اور جامع بیان

حضرت ضرار بن ضمرہ رضی اللہ عنہ نے امیر معاویہ کی فرمائش پر حضرت علی کے اوصاف بیان کئے ہیں، جو اگرچہ بہت مختصر ہیں مگر آپ کی سیرت کے بہت سے پہلو اس میں آ گئے ہم ذیل میں اسے درج کرتے ہیں۔

● وہ کمالات کے انتہائی درجے پر تھے۔ ● ان کی حصول کمال والی قوتیں بہت مضبوط تھیں ● ان کی باتیں قول فیصل تھیں ● ان کا فیصلہ حق وانصاف کا فیصلہ تھا ● ان کے ہر جانب علم کا

چشمہ بہتا تھا • ان کے ہر طرف حکمت ہی کی باتیں تھیں • ان کو دنیا اور دنیا کی زیب و زینت سے وحشت ہوتی • اللہ سے راز و نیاز کے لئے انھیں رات کی تاریکیوں سے بڑی انسیت تھی۔

• وہ خوف الٰہی کی وجہ سے بڑے اشکبار رہتے • فکر و مراقبہ میں بہت دیر تک رہا کرتے اور اپنے نفس کو خطاب فرمایا کرتے تھے • موٹا جھوٹا لباس اور روکھا پھیکا کھانا ہی آپ نے اختیار فرمایا تھا • آپ ہم لوگوں کے پاس برتر بن کر نہیں رہتے تھے، جب آپ سے ہم کچھ پوچھتے، آپ اس کا جواب دیتے، جب آپ کے پاس حاضر ہوتے پہلے خود کلام فرماتے، اور جب آپ کو مدعو کرتے تو دعوت قبول فرمالیتے • باوجودیکہ آپ نے ہم لوگوں کو اتنا قریب کر لیا تھا لیکن پھر بھی دل میں آپ کی ہیبت اتنی تھی کہ ہم لوگ گفتگو کی جسارت نہیں کرتے تھے • آپ دینداروں کی عظمت بڑھاتے • مسکینوں سے محبت فرماتے، • مضبوط آدمی اپنی طاقت کے برتے پر کسی باطل کی ہوس نہیں باندھ سکتا تھا۔ • اور کمزور آدمی آپ کے حق و انصاف کی بنا پر داد رسی سے کبھی مایوس نہ ہوتا۔

• میں گواہی دیتا ہوں کہ میں نے بعض مواقع پر دیکھا ہے کہ جب رات کا اندھیرا ہر طرف چھا گیا اور تارے ڈوبنے لگے تو آپ نماز کے لئے اس عالم میں کھڑے ہوئے ہیں کہ دست مبارک سے داڑھی پکڑے اس طرح بے قرار ہیں جیسے سانپ کا ڈنسا ہوا آدمی بے قرار ہو۔ اور بڑے غم و اندوہ کے ساتھ روتے جا رہے ہیں، اس وقت میرے کانوں میں آپ کی یہ آواز آرہی تھی "اے دنیا کیا تم میرے سامنے آراستہ ہو کر آنا چاہتی ہے؟ دور! دور! کسی اور کو دھوکہ دے، میں تجھے تین طلاقیں دے چکا، میں تیری طرف متوجہ نہیں ہو سکتا، تیری عمر بہت کم ہے، تیری زندگی حقیر ہے، تیرے خطرات بہت بڑے ہیں، آہ! زاد راہ بہت کم! سفر بہت طویل! اور راستہ نہایت سنسان اور وحشتناک ہے!"

اس گفتگو کو سنکر امیر معاویہ کا پورا دربار رونے لگا۔ [1] اور لوگوں کی آواز گلوگیر ہو گئی امیر معاویہ

---

[1] غالباً یہ احساس ہوا ہو گا کہ افسوس ہم لوگوں نے ایسے بہترین آدمی کی بغاوت کی، اس سے جنگ کی اس کی خلافت راشدہ کی مخالفت میں کیسے کیسے افعال کا ارتکاب کیا۔ ۱۲ کوثر

بھی اشکبار ہو گئے، اور بول اٹھے: "ابوالحسن (یہ حضرت علی کی کنیت ہے) پر اللہ کی رحمت ہو اللہ کی قسم وہ یقیناً ایسے ہی تھے"۔

اس کے بعد انہوں نے حضرت ضرار سے پوچھا: "ان کی وفات سے تمہارے غم واندوہ کا کیا حال ہے؟" حضرت ضرار نے فرمایا: "میرا غم واندوہ اس سے کم نہیں جس کا بچہ اس کی گود میں ذبح کر دیا جائے اور اس کے آنسو تھمتے ہی نہ ہوں"۔ (صفۃ الصفوۃ ج ۱ ص ۱۲۲)

حضرت علی کے چار اسمائے گرامی

جو کمالات مرتضوی کے مبسوط مباحث کے قدرتی عنوان ہیں

(۱) علی (۲) مرتضیٰ (۳) حیدر (۴) ابوتراب

اسم پاک علی کی تشریح

علی کے معنی ہیں بہت بلند اور بہت برتر اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ اتنا بلند و برتر جس کی بلندی و برتری فوق الادراک ہو۔

آپ علی ہیں یعنی آپ کی بلندی و برتری فوق الادراک ہے۔ غور کرو۔

- آپ کا علمی مقام کتنا بلند ہے؟!
- آپ کا عرفان کتنا رفیع الشان ہے؟!
- آپ کا یقین کتنا اونچا ہے؟! آپ کا ارشاد ہے:

لو کشف الغطاء لما ازددت یقیناً جس کا مفہوم یہ ہے کہ غیبی امور پر یقین اس درجہ کا ہے جس میں کسی اضافہ کی گنجائش ہی نہیں، حتیٰ کہ تمام پردہائے غیب اٹھا دیئے جائیں۔ اور قلبی مشاہدہ کے بجائے عینی مشاہدہ بھی ہونے لگے، جب بھی میرے یقین میں کسی اضافہ

کی گنجائش نہیں، یہ ہے آپ کے یقین کا مقام بلند! پھر یہ بھی دیکھو کہ :

- آپ کے سلسلۂ اولاد میں کتنی رفعتیں ہیں ؟!

کیا کسی کی بھی اولاد اتنی عالی مقام ہے ؟

کیا کسی کے فرزند حسن وحسین جیسے ہیں؟ جو رسول کے لخت جگر اور جوانانِ جنت کے سردار ہوں ۔

کیا کسی کا بھی سلسلۂ اولاد اتنا عالیشان ہے ؟ جس میں شروع سے لے کر قیامت تک برابر اولیاء اللہ بلکہ اولیاء اللہ کے امام ہوتے جائیں ۔

کیا یہ مسلم حقیقت نہیں کہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام سے لے کر امام مہدی کے زمانہ تک جو قرب قیامت کا زمانہ ہے برابر آل نبی اور اولاد علی کا وجود رہا ہے اور رہے گا۔ اور اب تک یہی حضرات ولایت کے امام رہے ہیں اور ان کی ولایت امام مہدی تک مسلسل رہے گی۔

- پھر اس پر بھی دھیان دو کہ :

آپ سے اولیاء کے جو سلسلے جاری ہوئے ہیں وہ ایمان وعرفان اور سلوک احسان کے کتنے بلند درجہ پر فائز ہیں؟!

قادری، چشتی، سہروردی، شاذلی، رفاعی، مدینی، نقشبندی، نیز ان کے علاوہ سلوک وتصوف کے اور بھی متعدد سلسلے ہیں، جن کے ذریعے اطراف عالم میں اسلام کی تبلیغ ہوئی۔ کروڑوں آدمی مسلمان ہوئے۔ اور بیشمار لوگوں نے فسق وفجور سے توبہ کی اور نہایت بلند پایہ متقی اور اعلیٰ درجہ کے صالحین وابرار بن گئے ۔

یہ تمام سلسلے نور کی نہریں ہیں جن کا منبع علی مرتضیٰ علیہ السلام کی ذات قدسی صفات ہے۔ اسی لئے ان تمام سلسلوں کو سلاسل علیہ کہتے ہیں۔ اور ان سے وابستہ بزرگوں کو صوفیہ علیہ کہا جاتا ہے، یعنی سلاسل تصوف اور صوفی دونوں حضرت علی سے وابستہ ہیں اس طرح یہ لفظ علیہ بنتا ہے کیونکہ ان کا انتساب حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے ہے۔ یہ محض راقم السطور ہی کی بات نہیں بلکہ سند دستا

کے بے نظیر مفسر ملکہ اپنے زمانہ میں دنیائے اسلام کے مفسر اعظم حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ اپنی عدیم المثال تفسیر "تفسیر مظہری ج ۵ ص ۳۸) میں لفظ صوفیہ علیہ کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں :

وصفنا الصوفية بالعلية لعلوهم	ہم نے صوفیہ کی صفت میں لفظ علیہ کہا ہے
درجة لاستنادهم الى علي رضي	کیوں کہ ان کا درجہ بہت عالی ہے جس کی وجہ
الله عنه فانه قطب هذا المقام ،	یہ ہے کہ ان کو حضرت علی سے انتساب ہے کیونکہ
(الاشارة الى المقام المسمى بفناء	حضرت علی ہی اس مقام (یعنی فنائے قلب کے
القلب عند الصوفية ، کوثر)	مقام کے) قطب ہیں۔ (یہی مقام حاصل تصوف ہے)

اسی لئے کہا جاتا ہے کہ حضرت علی تمام صوفیہ کرام کے روحانی باپ ہیں، حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب پانی پتی قدس سرہٗ تفسیر مظہری (ج ۴ ص ۱۹۹) میں فرماتے ہیں :

علي رضي الله عنه ابو الصوفية اجمعين	علی رضی اللہ عنہ تمام صوفیوں کے باپ ہیں۔

● آپ کی رفعت کی ایک نمود یہ بھی ہے کہ آپ کو آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جوانی میں بھی اپنے دوش مبارک پر سوار کیا ہے۔ یہ فتح مکہ کا واقعہ ہے۔ (اس کے علاوہ مکی زندگی میں آپ کو دوش مبارک پر سوار کیا ہے، تاکہ کعبہ کی چھت سے ہبل نامی بت کو اکھیڑ کر پھینک دیں۔ اللہ اکبر! حضرت علی دوش مبارک پر سوار! دوش مبارک تو عرش اعظم سے کہیں بڑھ کر عالی شان ہے۔ صفة الصفوة ج ۱ ص ۱۲۰ میں مسند احمد کے حوالہ سے منقول ہے کہ حضرت علی فرماتے ہیں "میں اور رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کعبہ میں پہونچے، آپ میرے کندھے پر سوار ہوئے لیکن کمزور پاکر اتر گئے اور مجھے اپنے کندھے پر سوار کیا، اس طرح میں کعبہ کی چھت پر چڑھ گیا۔ وہاں تانبے کا ایک بت نصب تھا۔ میں نے چاروں طرف سے اسے ہلا کر اکھیڑا پھر آپ کے حکم سے زمین پر پٹک دیا۔ اور وہ چکنا چور ہو گیا حضرت علی فرماتے ہیں جب میں دوش مبارک پر سوار ہوا اس وقت مجھے احساس ہو رہا تھا کہ اگر میں چاہوں تو افق آسمان کو چھو لوں۔

یہ سب رفعتیں جو آپ نے پڑھیں ــــــ غور کیجئے ان سے حضرت علی کی کتنی عالی شان برتری کا ظہور ہوتا ہے۔ آپ کی اس قسم کی برتریوں کے تمام اطراف و جوانب کو یکجا کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے۔ اگر کہنا ہو کہ حضرت مرتضیٰ ان تمام برتریوں کے حامل ہیں تو اس کا مختصر سے مختصر عنوان (ہیڈنگ) یہی ہے کہ آپ علی ہیں اس طرح یہ اسم پاک کمالاتِ مرتضوی کے بیانات کا ایک مختصر قدرتی عنوان ہے۔

اسم پاک مرتضیٰ کی تشریح

مرتضیٰ کے معنی ہیں پسندیدہ اور منتخب شخصیت نیز وہ شخص جس سے اللہ و رسول راضی ہیں۔ آپ کی شان مرتضوی کے ان مظاہر کو ملاحظہ فرمائیے۔

۱۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں:

" اللہ نے کئی جگہ صحابہ کو عتاب فرمایا ہے، لیکن علی کا ذکر خیر ہی فرمایا ہے۔" (متن اوپر گذر چکا ہے)

۲۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ کو راضی رکھنے کا اہتمام فرماتے تھے۔ چنانچہ غزوہ تبوک کے موقع پر جب حضور آپ کو مدینہ میں چھوڑ کر تشریف لے جا رہے تھے تو آپ کو کچھ ملال ہوا کہ یہیں عورتوں اور بچوں کے پاس رہنا پڑا اور جہاد میں جانے سے رکنا پڑا۔ اس پر حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم آپ سے فرماتے ہیں:

یا علی اما ترضیٰ ان تکون منی بمنزلة ھارون من موسیٰ۔[۱]

یا علی کیا تم اس پر راضی نہیں ہو کہ مجھ سے تم کو وہی نسبت حاصل ہے جو نسبت موسیٰ سے ہارون کو حاصل تھی۔

۳۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم بے حد منتخب شخصیت ہیں، حافظ خطیب بغدادی نے بسند صحیح روایت لکھی ہے کہ جب حضرت فاطمہ کی حضرت علی سے شادی ہوئی تو حضرت فاطمہ نے حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے عرض کی۔ یا رسول اللہ آپ نے میری شادی ایک فقیر آدمی سے کر دی

[۱] کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۲ بحوالہ حم ق ت ک ع۔ ۱۲ کوثر۔

اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا:

اماترضین ان اللہ اختار من اھل الارض رجلین: احدھما ابوک، والآخر زوجک[1]،	کیا تم راضی نہیں کہ اللہ نے اہل زمین میں سے دو شخصوں کو منتخب فرمایا. ایک تمہارے والد ہیں دوسرے تمہارے شوہر۔

سبحان اللہ یہ ہے حضرت علی کی ایک شان ارتضا۔

۴۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ اللہ کے ایسے برگزیدہ ہیں کہ تنزیل قرآن سے پہلے تو تمام عرب شرک اور رسوم جاہلیت میں مبتلا تھے، مگر اس دور میں بھی اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہر طرح کے کفر و شرک اور رسوم جاہلیت سے محفوظ رکھا ہے۔ اس کے لئے یہ انتظام فرمایا کہ آپ کو حضور اکرم صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کی کفالت میں رکھ دیا۔ اس طرح آپ کی تربیت شروع ہی سے دامن نبوی میں ہوئی ہے اور آپ تمام لغویات سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ اور آپ پر ہر دور میں رضوان الٰہی کی نظر رہی ہے ایسا ہی شخص بہمہ وجوہ مرتضیٰ ہے اور یہ ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی ایک شان ارتضا۔

۵۔ بعثت نبوی کے چوتھے سال آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بنی ہاشم کو کھانے پر مدعو فرمایا لوگ کھانا کھا چکے تو آپ نے فرمایا: وہ چیز لے کر آیا ہوں جو دین و دنیا دونوں کی کفیل ہے۔ اس بارِ گراں کے اٹھانے میں کون میرا ساتھ دے گا؟ مجلس میں سناٹا تھا کہ حضرت علی کھڑے ہو گئے کہ "میں ہر طرح آپ کا ساتھ دوں گا" آپ نے فرمایا "علی تم میرے بھائی اور وارث ہو"۔ (یعنی میرے علوم کے وارث ہو)

غور کیجیے حضور صلے اللہ علیہ و آلہ وسلم کا دست و بازو بننے کے لئے اللہ نے پورے بنی ہاشم میں صرف حضرت علی ہی کا انتخاب فرمایا ہے۔ یہی ہے شان ارتضا۔

۶۔ شب ہجرت میں کفار نے کاشانۂ نبوی کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا ہے۔ منصوبہ بنا چکے ہیں کہ صبح ہوتے ہی گھر میں گھس کر ایک ساتھ آپ پر تلواریں برسا کر معاذ اللہ آپ کا خاتمہ کر دیں اس وقت بستر نبوی پر لیٹنا اپنی جان کی قربانی پیش کرنا ہے۔ اس بڑے کام کے لئے اللہ نے صرف

[1] کنز العمال ج ۶، ص ۱۵۳۔ مولف کنز العمال نے لکھا ہے "سند حسن"۔ ۱۲ کرشر

حضرت علی کا انتخاب فرمایا ہے۔ چنانچہ بحکم نبوی آپ اس پر لیٹے۔ اس پر رضوان الہٰی کا وہ عالم ہوا کہ اللہ نے حضرت جبریل اور حضرت میکائیل سے فرمایا کہ علی میرے نبی پر اپنی جان قربان کر رہے ہیں۔ تم دونوں جاؤ اور ان کی حفاظت کرو۔ اکلیل شرح مدارک میں ہے (ج ۴ ص ۱۱۸) کہ یہ دونوں فرشتے اترے، رات بھر حضرت جبریل حضرت علی کے سرہانے رہے اور حضرت میکائیل پائینتی۔ اور دونوں فرشتے حضرت علی کو مبارکباد دے رہے تھے: "اے ابن ابی طالب آفریں! آفریں! اللہ تمہاری ذات پر فخر کرتا ہے۔"

اللہ نے اس شرف عظیم کے لئے حضرت علی ہی کا انتخاب فرمایا ہے، یہ ہے آپ کی ایک شان ارتضا۔

۷۔ دنیا میں نسل رسول حضرت علی ہی سے جاری ہوئی اس طرح اللہ تعالیٰ نے اولاد رسول کا پدر معظم حضرت علی ہی کو بنایا۔ اور اس درجۂ علیا کے لئے آپ ہی کا انتخاب فرمایا۔ یہ ہے ایک شان ارتضا کہ آپ ہی ہیں ابو الائمہ۔ اور آپ ہی ہیں وہ نخل طوبیٰ جس کی شاخیں حسنین کریمین اور تمام اولاد رسول۔

۸۔ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دو دو صحابہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا تو حضرت علی کو کسی کا بھائی نہیں بنایا۔ اس پر حضرت علی کو اپنی بے کسی کا صدمہ ہوا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا اظہار کیا۔ آپ نے فرمایا:

انت اخی فی الدنیا والآخرۃ[1]	تم دنیا اور آخرت میں میرے بھائی ہو۔

مسند احمد میں یہ الفاظ بھی ہیں کہ آپ نے فرمایا۔

ما اخرتك الا لنفسی، وانت منی بمنزلۃ ھارون من موسیٰ، غیر انہ لا نبی بعدی، وانت اخی ووارثی قال ما ارث منك یا رسول اللہ؟ قال: ما ورث الانبیاء من قبلی، قال،	میں نے تم کو اپنا بھائی بنانے کے لئے چھوڑ رکھا تھا، تم کو مجھ سے وہی نسبت ہے جو نسبت موسیٰ کو ہارون سے تھی، لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں۔ اور تم میرے بھائی اور میرے وارث ہو۔ علی نے کہا: یا رسول اللہ آپ کی وراثت کیا ہے؟ فرمایا وہی جو

[1] سنن ترمذی و مستدرک کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۳-۱۵۴ کوثر

ما ورث الا نبیاء من قبلک ؟ قال: کتاب ربہم وسنۃ نبیھم وانت معی فی قصری فی الجنۃ، مع فاطمۃ ابنتی، و انت اخی ورفیقی۔

(کنزالعمال ج ۶ ص ۳۹۰)

مجھ سے پہلے کے انبیاء کی وراثت ہے۔ علی نے پوچھا۔ ان انبیا کی وراثت کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا: ان کے رب کی کتاب اور ان کے نبی کی سُنّت، اور اے علی جنت میں تم میرے ساتھ میرے محل میں میری لڑکی فاطمہ کے ساتھ ہوگے اور تم میرے بھائی اور میرے رفیق ہو۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قرب واختصاص کے لئے اللہ نے حضرت علی ہی کو منتخب فرمایا ہے ۔ یہ ہے آپ کی ایک شان ارتضا۔

۹۔ غزوہ خیبر میں حضرت علی ہی کو اللہ و رسول کے محبوب ہونے کے اعزاز سے مشرف فرمایا گیا، یہ ہے آپ کی ایک شان ارتضا۔

۱۰۔ اگر یہ سوال ہو کہ وہ کون شخصیت ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرابت قریبہ کے ساتھ آپ کے داماد ہونے کا بھی شرف حاصل ہے ۔ نیز علم قرآن وسنت اور فقہ اسلام میں درجہ علیا بھی حاصل ہے ؟ غرض ایسی جامعیت کبریٰ کے لئے اللہ نے کس کا انتخاب فرمایا ہے ؟ تو جواب صرف ایک ہے وہ یہ ہے کہ ایسی شخصیت صرف حضرت علی کی ذات گرامی ہے، یہ ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی ایک شان ارتضا !

آپ کی یہ جامعیت صحابۂ کرام کی نگاہ میں ہمیشہ رہی ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی اس کا بڑا لحاظ تھا، بلکہ آپ تو اس کو محسوس فرمایا کرتے تھے کہ حضرت علی کی یہ جامعیت ایسی ہے جس کی بنا پر لوگ خلافت کے لئے ان کا انتخاب کریں تو کچھ بعید نہیں۔ چنانچہ جب آپ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور زندگی کی اُمید ختم ہوگئی تو آپ نے حضرت علی، حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمن بن عوف، حضرت زبیرؓ اور حضرت سعد کو بلوا کر ضروری وصیتیں کیں ۔ اس سلسلہ میں حضرت علی سے جو گفتگو کی ہے وہ یہ ہے ۔

یا علی لعل ہولاء القوم یعلمون لک

اے علی غالباً یہ قوم (مہاجرین وانصار) آپ

حقك وقرابتك من رسول الله صلى الله عليه وسلم وصهرك وما آتاك الله من الفقه والعلم (فتح الباری ج ۷، ص ۴۹ مطبع خیریہ مصر ۱۳۲۵ھ)

کا حق اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی قرابت نیز اللہ نے آپ کو جو علم اور فقاہت عطا فرمائی ہے اس کو سمجھیں یعنی ان باتوں کو ملحوظ رکھ کر آپ کو خلیفہ بنائیں۔

اسم پاک حیدر کی تشریح

حیدر کے معنی ہیں شیر، یہ حضرت کرم اللہ وجہہ الکریم کا بہت مشہور لقب ہے، واقعی آپ جہاد کے حیدر اور اللہ کے شیر ہیں، وہ تمام غزوات جس میں آپ نے شرکت فرمائی ہے، اپنی اپنی جگہ شاہد ناطق ہیں کہ آپ اللہ کے شیر ہیں۔ آپ ہی ہیں وہ اسد اللہ جن کا جہادی کارنامہ سب پر بھاری ہے۔

بدر جو اسلام کا سب سے پہلا اور سب سے اہم غزوہ ہے اس میں لشکر کفار کے پہلے بہادر ین کو صرف آپ اور حضرت حمزہ نے موت کے گھاٹ اتارا، احد میں کفار کی بڑی یورش کو آپ ہی نے توڑا حنین کے نہایت زبردست کفار کی زیادہ تر صفیں آپ ہی نے درہم برہم کیں اور انھیں پسپا کیا خندق میں جب عمرو بن ود نے مبارزطلبی کی تو چونکہ یہ ایک ہزار بہادروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ کسی نے مقابلہ کی ہمت نہیں کی، صرف اللہ کے شیر حیدر کرار نے اس کا مقابلہ کیا۔ اور ایک ہی وار میں موت کے لقمہ بنا دیا۔ غزوۂ خیبر میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی کامیاب نہ ہو سکے تو حیدر کرار ہی اللہ و رسول کے محبوب بن کر شان حیدری کے ساتھ نبرد آزما ہوئے کہ وہ مرحب جو یہود کی سب سے بڑی قوت تھا، جس کی بہادری کا سکہ تمام عرب پر بیٹھا تھا؛ اور ایک ہزار بہادروں کے برابر مانا جاتا تھا۔ ہاں وہی مرحب وہی اسلحہ میں ڈوبا ہوا مرحب آپ کے ایک ہی وار سے خاک و خون میں لوٹ کر ہمیشہ کے لئے دنیا سے رخصت ہو گیا اور عرب میں یہود کی قوت بے جان ہو گئی۔

حضرت علی اللہ کے ایسے شیر ہیں کہ صنادید عرب کی سرکش اور جبار طاقتوں کو سب سے زیادہ آپ ہی نے موت کے گھاٹ اتارا۔ اور یہود کی ملعون قوتوں کو آپ ہی نے عرب میں بے جان بنایا۔

آپ کا یہ احسان مسلمانوں کی گردنوں پر ہمیشہ رہے گا۔

جس طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کفار اور یہود کے معرکوں میں اللہ کے شیر ہیں، اسی طرح ناکثین، قاسطین اور مارقین کے معرکوں میں بھی شیر خدا ہیں۔ ان کے علاوہ جہاد نفس کے ہر معرکہ میں بھی آپ شیر ہیں۔ اسکی تفصیل بہت طولانی ہے کہ اس میں تصوف کے تمام مقامات و احوال اور تمام منازل سلوک آجاتے ہیں۔

اسم پاک ابوتراب کی تشریح

ابوتراب کا لفظی ترجمہ ہے مٹی کا باپ، مٹی کی نہایت اہم قدرتی صفت یہ ہے کہ اربعہ عناصر میں صرف مٹی ہے جو نور کو اپنے اندر جذب کرتی ہے، باقی عناصر ایسے نہیں، جائزہ لے لیجئے، پانی برس رہا ہے اس پر ٹارچ وغیرہ سے لائٹ پھینکئے، پانی کا سینہ نور کو اپنے اندر جذب نہ کرسکے گا۔ لائٹ یکسر پاس ہو جائے گی، پانی کی طرح آگ اور ہوا پر بھی لائٹ پھینکئے ان کے سینے بھی نور کو اپنے اندر جذب نہ کرسکیں گے لائٹ یکسر پاس ہو جائے گی۔ آپ نے جائزہ لے لیا کہ اربعہ عناصر میں آگ پانی اور ہوا نور کو اپنے اندر جذب کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ اب رہ گئی خاک، بس یہی وہ عنصر ہے جو نور کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ مٹی کی دیوار کھڑی ہے آپ اس پر لائٹ پھینکئے۔ مٹی نور کو اپنے سینے میں جذب کرے گی اور باہر جانے نہ دے گی۔

غرض اربعہ عناصر میں مٹی ہی وہ عنصر عظیم ہے جو نور کو اپنے اندر جذب کرلیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ کے خلیفہ حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے ہیں کہ خلیفہ خدا کا سینہ انوار الٰہی کا حامل ہونا چاہئے اور ایسا ہونا چاہیئے کہ جن انوار کا نزول ہو سب کو اپنے اندر جذب کرسکے۔

مٹی کی یہ فطری اور قدرتی صفت آپ نے سمجھ لی کہ وہ جاذب انوار ہے۔ اب سنئے کہ اللہ کے بندگان خاص یعنی اولیاء اللہ مٹی ہی کی طرح نہایت خاکسار ہوتے ہیں، درحقیقت یہ خاک صفت ہیں۔ اور مٹی بن گئے ہیں اس لئے ان کے قلوب جاذب انوار ہو گئے ہیں۔ ایسے بزرگوں کے امام و مقتدا اور مرشد اعظم اور روحانی باپ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم ہیں اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ

و آلہ وسلم نے آپ کو ابوتراب فرمایا ہے جس کا لفظی ترجمہ ہے مٹی کا باپ، یہاں تراب یعنی مٹی سے مراد عنصر خاک نہیں کہ عنصر خاک کے باپ ہونے کے کوئی معنی ہی نہیں بلکہ اس سے اولیائے کاملین کی طرف اشارہ ہے جو تراب صفت اور نہایت خاکسار ہیں۔ اس طرح مٹی بن کر جاذب انوار ہوگئے ہیں، یہی حضرات ہیں ارباب فنا یقیناً ان قدوسیوں کے روحانی باپ حضرت علی ہیں کہ کوئی ولی آپ کے توسط کے بغیر درجۂ ولایت پر نہ فائز ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس پر مفصل بحث حدیث ثقلین کی شرح میں گذر چکی۔

اسم پاک ابوتراب کی یہ تشریح راقم السطور کی طبعزاد نہیں ہے بلکہ حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ کے پیر مرشد، ولی کامل، عارف اکمل حضرت خواجہ محمد باقی عرف خواجہ باقی باللہ رضی اللہ عنہ کے کلام مقدس سے ماخوذ ہے، امام وقت محدث ہند شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ نے اپنی ایک بلند پایہ کتاب شرح سفر السعادہ میں اس پر بڑی عارفانہ بحث فرمائی ہے، اس سلسلے میں حضرت خواجہ باقی باللہ قدس سرہٗ کے کلمات طیبات بھی نقل کئے ہیں۔ پوری بحث پڑھنے کے قابل ہے۔ پہلے حضرت شیخ نے اس حدیث کا فارسی ترجمہ لکھا ہے، جس سے علم ہوتا ہے کہ آپ ابوتراب کے خطاب سے کب نوازے گئے ہیں۔ ہم اس حدیث کا ترجمہ صحیح مسلم کی روایت سامنے رکھ کر کرتے ہیں۔ صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۸۰ میں حضرت سہل بن سعد سے مروی ہے کہ:

(ایک روز) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لائے وہاں حضرت علی نہ تھے، فرمایا: تمہارے ابن العم (یعنی علی) کہاں ہیں؟ انہوں نے کہا میرے ان کے درمیان ایک بات ہوئی ہے ——— جس سے مجھے صدمہ ہوا، اس پر وہ گھر سے نکلے اور یہاں قیلولہ نہیں کیا۔

اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک آدمی سے فرمایا:

دیکھو علی کہاں ہیں؟ اس شخص نے واپس آکر عرض کی۔ یارسول اللہ وہ مسجد میں سو رہے ہیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں حضرت

علی کے پاس تشریف لائے، اور ملاحظہ فرمایا کہ کروٹ لیٹے ہیں، چادر بدن سے سرک گئی ہے اور پیٹھ پر مٹی لگ گئی ہے۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مٹی پونچھ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں: "ابو تراب اٹھو! ابو تراب اٹھو!" (قم ابا تراب!، قم ابا تراب!)

حضرت محدث دہلوی فرماتے ہیں:

" حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے مخالفین اور معاندین حضرت علی کو ابو تراب ہی کہتے تھے۔ اور اپنے خیال باطل میں سمجھتے تھے کہ اس لفظ میں ان کی بڑی تنقیص و تحقیر ہے، حالانکہ اس میں بدرجہ کمال تعظیم و تکریم ہے۔ بعض صوفی محققین نے اس نام (پاک) میں دقیق اشارات کئے ہیں۔ اور بلیغ معانی بیان فرمائے ہیں جو حضرت علی کے کمال مرتبت اور حد درجہ فضیلت پر دلالت کرتے ہیں۔

ان کے نزدیک لفظ "تراب" سے اہل توحید و فنا کی طرف اشارہ ہے پس لفظ ابو تراب کا حاصل یہ نکلا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گروہ فقرا، ارباب فنا اور اہل کمال حضرات کے مقتدا امام اور مرجع ہیں چنانچہ مشائخ طریقت کے جو سلسلے ہیں ان کی آخری کڑی حضرت علی کی ذات گرامی ہے۔"

لہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک مروانی جو مدینہ کا حاکم تھا اس نے حضرت سہل بن سعد کو حکم دیا کہ "علی کو گالی دو"۔ حضرت سہل نے انکار کیا اس نے کہا کہ "گالی نہیں دیتے تو لعنت بھیجو، اور لفظ ابو تراب بھی کہو" اس پر حضرت سہل نے فرمایا۔ "حضرت علی کو ابو تراب سے بڑھ کر اپنا کوئی اور نام محبوب نہ تھا۔ اور جب کوئی شخص آپ کو ابو تراب کہتا تو آپ بہت خوش ہوتے"۔ مروانی حاکم نے کہا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ علی کا نام ابو تراب کیسے پڑا؟ اس پر حضرت سہل نے وہ سب بیان فرمایا جو متن کتاب میں مذکور ہے۔ ۱۲ کوثر

اس مضمون کو جناب حقائق مآب صاحب اسرار و انوار جمال الدین خواجہ محمد باقی قدس سرہٗ نے نظم کر دیا ہے۔ حضرت محدث دہلوی نظم کو درج کرتے ہیں۔ راقم السطور ہر شعر کے نیچے اس کا مفہوم بھی لکھتا ہے۔

• مضمون ابوتراب گویم من حاصل ایں خطاب گویم

ترجمہ: — میں لفظ ابوتراب کا مضمون اور اس کا خطاب حاصل بیان کر رہا ہوں

• خاک اند جماعتے کہ مردند ہستی بخدائے خود سپردند

" — ایک جماعت خاک کی طرح ہے جس کا نفس مردہ ہے۔ ان لوگوں نے اپنی ہستی یکسر اللہ کے حوالہ کر دی ہے۔

• از سطوت نور در شکستہ در آب بقا فرونشستہ

" — نور کے غلبہ سے ان کا نفس شکستہ ہو چکا ہے، یہ لوگ آب بقا میں جا بیٹھے ہیں

• گردے نہ پشت پائے ایشاں در دو کف پائے خود چہ امکاں

" — اس لئے ان کے پشت قدم پر دنیا کی ذرا بھی گرد نہیں۔ پھر ان کے تلوؤں پر گرد جمنے کا کیا امکان جب کہ وہ آب بقا میں بیٹھے ہیں۔

• سرحلقۂ خاکیاں علی بود سرسلسلۂ جہاں علی بود

" — ان خاکیوں کے حلقہ کے سردار علی تھے اور دنیا جہاں کے سلسلۂ اولیا کے سردار علی تھے۔

• زاں بحر دو نہر بند بکشود یک سو حسن و حبیب و داؤد

" — اس بحر ولایت سے دو نہریں نکلی ہیں، ایک طرف وہ نہر طریقت ہے جس کا سلسلہ یہ ہے۔ حسن بصری حبیب عجمی، داؤد طائی۔

• معروف و سری، جنید بغداد کز دے طرق کثیرہ بکشاد

" — معروف کرخی، سری سقطی، جنید بغدادی اور جنید بغدادی سے بہت سے راستے نکلے ہیں۔

• یک سوئے دگر لطیفۂ پاک مستور بزیر پردۂ خاک

ترجمہ ــــ دوسری طرف وہ نہر طریقت ہے جو لطیفہ پاک ہے، یعنی پاک اور مطہر ذریت رسول ہے۔
اور یہ لطیف و مقدس جوہر پردۂ خاک میں مستور رہے (یعنی اس پر فنائیت کا بعید غلبہ ہے)

• سبطین رسول و زین عباد ۔۔۔ پس باقر و صادق نکو زاد

" ــــ یہ ہیں رسول کے دونوں نواسے (امام حسن اور حسین) اور امام زین العابدین اور امام باقر اور امام جعفر صادق (علی جدھم وعلیہم الصلوٰۃ والسلام)

• این سلسلۂ طلائے ناب است ۔۔۔ این خانہ تمام آفتاب است

" ــــ یہ اولاد رسول والا سلسلہ خالص سونے کی کڑیوں کا سلسلہ ہے، اس گھر کا ہر شخص آفتاب ہے۔

• معنے ابوتراب این است ۔۔۔ تفسیر اشارت این چنین است

" ــــ لفظ ابوتراب کا مفہوم یہ ہے، اس لفظ کے ذریعہ جو اشارہ کیا گیا ہے اسکی تفسیر یہی ہے۔

اس کلام کا ماحصل

یہ ہے کہ سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کو جو ابوتراب کا عظیم و جلیل خطاب ملا ہے اس کا مفہوم یہ ہے کہ علی، تراب کے باپ ہیں، یعنی ان اولیاء اللہ کے روحانی باپ ہیں جن کا نفس مردہ ہے۔ اور وہ مقام تسلیم و تفویض پر فائز ہیں۔ ان میں نور کا ایسا غلبہ ہے کہ نفس بالکل شکستہ ہو گیا ہے، فنا فی اللہ اور بقا باللہ ان کا مقام ہے، ایسے اولیائے کاملین کے مقتدا، مرجع اور منبع حضرت علی ہیں چنانچہ ان حضرات کے تمام سلسلوں کی آخری کڑی آپ ہی ہیں۔

براہ راست حضرت علی سے دو سلسلۂ طریقت چلے ہیں جن کی شاخیں بعد میں بڑھتی گئیں ایک سلسلہ آپ کے ایک مرید و خلیفہ امام حسن بصری سے چلا ہے۔ ان کے مرید و خلیفہ حضرت حبیب عجمی ہیں، ان کے حضرت داؤد طائی، ان کے حضرت معروف کرخی، ان کے حضرت سری سقطی، ان کے حضرت جنید بغدادی، اور حضرت جنید بغدادی سے بہت سے سلاسل طریقت نکلے ہیں۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم سے دوسرا سلسلۂ طریقت آپ کی اولاد اطہار سے

ہوا ہے جس کی کڑیاں یہ ہیں: حضرت امام حسن، حضرت امام حسین، حضرت امام زین العابدین حضرت امام محمد باقر، حضرت امام جعفر صادق (علیٰ جدہم وعلیہم الصلوٰۃ والسلام)۔

طریقت کے اس سلسلۂ مقدس کو سلسلۃ الذہب کہتے ہیں، کہ اس کی ہر کڑی معدن نبوی کا ہوتا ہے۔

خواجہ باقی باللہ نے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کے بعد کی کڑیوں کو بیان نہیں فرمایا ہے، وہ بھی سن لیجیے۔ حضرت امام جعفر صادق کے بعد امام موسیٰ کاظم ہیں پھر امام علی رضا جو شیخ عرفان وطریقت خواجہ معروف کرخی کے پیر شیخ ہیں۔ موصوف آپ ہی کے دست حق پرست پر مسلمان ہوئے ہیں اور آپ سے بیحد فیض پایا ہے۔

حضرت علی سے لیکر امام علی رضا تک تمام حضرات ائمۂ اہل بیت ہیں۔ ان کے سلسلہ کو سلوک وتصوف میں سلسلۃ الذہب کہتے ہیں۔ یہ سلسلۂ سند بے حد متبرک اور بافیض ہے، جیسا کہ سنن ابن ماجہ صفحہ ۸ سے ظاہر ہے چنانچہ اس میں ہے کہ امام ابن ماجہ کے شیخ الشیخ ابوالصلت ہروی اسی سند سے پہلے ایک حدیث روایت کرتے ہیں کہ:

> ہم سے حدیث بیان کی علیؑ ابن موسیٰ رضا نے، وہ روایت کرتے ہیں اپنے والد موسیٰؑ (کاظم) سے وہ اپنے والد جعفرؑ (صادق) سے وہ اپنے والد محمدؑ (باقر) سے وہ اپنے والد علیؑ (زین العابدین) سے وہ اپنے والد حسینؑ وہ اپنے والد علیؓ ابن ابی طالب سے انہوں نے فرمایا مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

الایمان معرفۃ بالقلب وقول باللسان، وعمل بالارکان[1]	ایمان یہ ہے کہ دل سے ایمان کی باتیں پہچانو (یعنی یقین کرو) اور زبان سے اقرار بھی کرو اور اپنے اعضا سے عمل بھی کرو۔

---

[1] اس حدیث کو ابن جوزی نے موضوع کہا ہے مگر محققین ان کے موضوع کہنے کا اعتبار نہیں کرتے، ابن جوزی سے

ابو الصلت مذکور اس حدیث کو بیان کرنے کے بعد اس کی مذکورہ بالا سند کی عظمت ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں۔

لو قرئ هذا الاسناد على مجنون لبرأ [۱] (ابن ماجہ ص ۸)	اگر یہ سند کسی پر پڑھ دی جائے تو شفا ہو جائے۔

= نے ابو الصلت کو نا قابل اعتبار کہا ہے۔ مگر یہ صحیح نہیں، کہ امام یحییٰ بن معین نے ان کو ثقہ اور معتبر مانا ہے اور تصریح کی ہے کہ یہ جھوٹ بولنے والوں میں نہیں اور اکابر نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ ۱۲ کوثر

[۱] بعض ناواقف ابو الصلت کے اس قول کو یہ کہہ کر بے وزن بتاتے ہیں کہ ابو الصلت رافضی ہے۔ درحقیقت ابو الصلت پر شدید الزام و بہتان ہے اور ثبوت میں علامہ ذہبی کی میزان الاعتدال کی یہ عبارت نقل کرتا ہے۔

رجل صالح الا انه شيعي	ابو الصلت ایک صالح آدمی ہیں لیکن شیعی ہیں

بہت بڑا مغالطہ ہے کیوں کہ سلف اور محدثین کی اصطلاح میں شیعہ اور رافضی میں بڑا فرق ہے۔ چنانچہ

● شیعہ ان مہاجرین و انصار کو بھی کہا گیا ہے جو امیر المومنین سیدنا علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے انصار و معاون تھے اور آپ کا ساتھ دے کر باغیوں سے قتال کیا ہے، ان کو شیعانِ علی کہا جاتا تھا۔

آپ نے جنگ صفین میں جو قتال فرمایا ہے اس میں آپ کے ساتھی آٹھ سو بیعۃ الرضوان والے صحابہ کرام تھے جو بعد کے تمام صحابہ سے افضل ہیں۔ ان میں سے تقریباً تین سو حضرات نے جنگ صفین میں جام شہادت نوش فرمایا۔ یہ سب حضرات شیعان علی ہیں اور اہل سنت کے مقتدا ہیں۔ شاہ عبد العزیز صاحب تحفہ اثنا عشریہ صفحہ ۷ میں ان کو شیعہ اولیٰ لکھتے ہیں۔ اور بڑی تعریف کرتے ہیں۔

● ان صحابہ کرام کے علاوہ وہ اکابر بھی شیعان علی اور شیعہ اولیٰ ہیں، جو قتال بغاۃ میں آپ کے ساتھ تھے۔ شاہ صاحب تحفہ ۵ میں لکھتے ہیں کہ ان کی روش بھی وہی ہے جو امیر المومنین سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی ہے کہ اصحاب کبار اور ازواج مطہرات کے حقوق سمجھتے ہیں۔ اور مانحن فیہ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ان کو شیعہ اولیٰ اور شیعہ مخلصین کے نام سے یاد کیا جاتا ہے اور یہ لوگ اہل سنت و جماعت کے پیشوا ہیں۔ =

ضمیمہ باب

تفضیل خلفائے راشدین

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارتحال کے بعد امت پر جو سب سے بڑی ذمہ داری آئی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام کو اصلی شکل میں قائم رکھو۔ اور اس کی حمایت و بقا کے لئے جو جو امور ضروری ہیں انھیں انجام دو، وہ صحابۂ کرام جو تربیت نبوی کے سانچے میں پوری طرح ڈھل چکے تھے۔ انہوں نے اس ذمہ داری کے تمام فرائض کو نہایت حسن وخوبی سے انجام دیا ہے۔

ان میں خلفائے راشدین کو یہ خصوصیت حاصل ہے کہ ان کی ذات سے ایک حاکمانہ نظام

= ● بریلوی مکتب فکر کے جلیل القدر مقتدا علامہ احمد رضا خاں بریلوی نے فتاویٰ رضویہ جلد ۲ صفحہ ۹۰ (مطبوعہ کتب خانہ سمنانی اندرکوٹ میرٹھ) میں لکھا ہے۔

"سلف میں جو تمام خلفائے کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حسن عقیدت رکھتا اور حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ تعالیٰ وجہہ الکریم کو افضل جانتا شیعی کہا جاتا۔ بلکہ جو صرف امیر المومنین پر حضرت عثمان پر تفضیل دیتا اسے بھی شیعی کہتے۔ حالانکہ یہ مسلک بعض علمائے اہل سنت کا تھا۔ اسی بنا پر متعدد ائمہ کو فنہ کو شیعہ کہا گیا ہے۔ بلکہ محض غلبۂ محبت اہل بیت کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کو شیعیت سے تعبیر کرتے، حالاں کہ یہ محض سنت ہے۔"

فاضل بریلوی کا یہ قول ان کا اپنا قول نہیں ہے، بلکہ ایک ایسی بات ہے جس سے علمائے اہل حدیث اور علمائے دیوبند کو بھی اتفاق ہے۔ اس بنا پر ابوالصلت کو شیعی کہنا ان کے قول مذکورہ سنن ابن ماجہ کو بے وزن =

قائم ہو گیا تھا جس سے اسلام کو اصلی شکل میں قائم رکھنے اور اس کی حیات و بقا کے فرائض و مہمات پورے کرنے کی تمام سہولتیں صحابۂ کرام کو مل گئی تھیں۔ یہ خصوصیت خلفائے راشدین کا اصلی امتیازی شرف ہے۔

علمائے اہل سنت جو خلفائے راشدین کو افضل امت کہتے ہیں اس کا ماحصل یہی ہے کہ ان حضرات کے حاکمانہ نظام سے (جس کی تشکیل میں صحابہ کی ہیئت اجتماعیہ، ان کا شوریٰ اور ان کی فعال قوتیں بھی شامل ہیں) اسلام کو اصلی شکل میں قائم رکھنے اور اسکی حیات و بقا کے فرائض و مہمات انجام دینے کی تمام سہولتیں صحابۂ کرام کو مل گئی تھیں۔ خلفائے راشدین اپنے اس حاکمانہ نظام ہی کی بنا پر تمام امت پر افضلیت رکھتے ہیں۔

ان میں اول حضرت ابوبکر صدیق ہیں، پھر حضرت عمر فاروق، پھر حضرت عثمان غنی پھر حضرت مولیٰ علی رضی اللہ عنہ عنہم اجمعین، یہ حضرات اپنی اس حاکمانہ خدمت میں اسی ترتیب سے افضل ہیں اور ان کی بترتیب افضلیت اسی حاکمانہ خدمت میں ہے۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ دیگر فضائل دینی میں بھی اسی ترتیب سے یہ افضل ہیں۔ چنانچہ قبول اسلام کی سابقیت میدان جہاد میں اعدائے دین کا مقابلہ اور

= نہیں بنا سکتا۔ امام عبدالحق محدث دہلوی شرح سفر السعادۃ ص۵۰۶ میں رقم طراز ہیں جس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"ابوالصلت شیعی ہیں لیکن صدوق ہیں۔ یعنی بڑے ہی سچے ہیں (امام) ابن معین نے ان کو نہایت معتبر کہا ہے۔ (امام) سفیان ابن عیینہ اور ان کے ہم پایہ لوگوں کی صحبت میں رہ چکے ہیں۔ زہد و تقشف کی صفت سے متصف تھے، مذاہب باطلہ، قدریہ وجبریہ وغیرہ کی تردید کرتے تھے، ابوبکر و عمر کے ذکر کی تقدیم کرتے اور اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر اچھے الفاظ میں کرتے تھے۔"

اب اندازہ لگایئے کہ ابوالصلت کس قسم کے شیعی ہیں؟ کیا انہیں رافضی کہنا تہمت تراشی نہیں؟ اور کیا اس قسم کے شیعہ بڑے بڑے اکابر اہل سنت نہیں ہیں؟ بخاری و مسلم کے تیس سے زیادہ راوی ایسے ہیں جنہیں اصطلاح قدما میں شیعی کہا جاتا ہے۔ حافظ محمد بن طاہر مقدسی کی شروط الائمۃ الخمسہ اور امام سیوطی کی تدریب الراوی میں یہ قول منقول ہے کہ کتاب مسلم ملآن من الشیعۃ یعنی مسلم کی کتاب شیعہ راویوں سے بھری ہے۔ اب غور کیجئے کہ کسی روایت کو یہ کہہ کر گرا دینا کہ یہ شیعہ کی روایت ہے کتنا غلط کام ہے؟ ۱۲ کوثر

جاں بازی، وفورِ علم، قوتِ اجتہاد، وطن سے نکل کر اسلام کی تبلیغ و اشاعت جیسے اہم دینی امور کے بارے میں کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے کہ ان باتوں میں بھی خلفائے راشدین اسی ترتیب سے افضل ہیں جس ترتیب سے وہ خلیفہ ہوئے ہیں۔

اس کے علاوہ متعدد فضائل ہیں جو حضرت عمر میں ہیں۔ حضرت ابوبکر میں نہیں، متعدد فضائل ہیں جو حضرت عثمان میں ہیں، حضرت ابوبکر و عمر میں نہیں۔ اور متعدد فضائل ہیں جو حضرت علی میں ہیں اور حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت عثمان میں نہیں ہیں۔ پھر کون کہہ سکتا ہے؟ کہ تمام دینی فضائل میں حضرت ابوبکر افضل ہیں، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی۔

ماحصل یہ ہے کہ خلفائے راشدین میں کوئی بھی بزرگ ایک ایک فضیلت اور دینی کمال میں دوسروں سے افضل نہیں بلکہ کسی خوبی میں کوئی بزرگ افضل ہیں، کسی میں کوئی اور۔ خلفائے راشدین کی یہ ترتیب افضلیت صرف اس بات میں ہے کہ امورِ خلافت کی خدمت میں وہ اسی ترتیب سے افضل ہیں، جس ترتیب سے یہ خدمت ان کو تفویض ہوئی ہے کہ بیش رو کی برتری ایک حقیقت ہے۔ واضح ہو کہ جس ترتیب سے یہ حضرات خلیفہ ہوئے ہیں اسی ترتیب سے ان کا خلیفہ ہونا ضروری تھا کہ دینی مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ ایسا نہ ہوتا تو فتنے کھڑے ہو جاتے جیسا کہ عہدِ مرتضوی میں ہوا ہے۔

اس بیان و تفصیل سے تین نکات پیدا ہوتے ہیں۔

۱۔ خلفائے راشدین جس ترتیب سے خلیفہ ہوئے ہیں دینی مصلحت اسی ترتیب میں ہے

۲۔ خلفائے راشدین کی یہ ترتیب افضلیت امرِ خلافت میں ہے۔

۳۔ ان کی بہ ترتیب افضلیت کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حضرات تمام دینی فضل و کمال میں اسی ترتیب سے افضل ہیں۔

یہ جو کہا گیا ہے کہ "خلفائے راشدین کی بہ ترتیب افضلیت امرِ خلافت میں ہے"، اس کی تعبیر اکابر نے متعدد الفاظ سے کی ہے، متکلمین جو عموماً فلسفیانہ الفاظ میں گفتگو کرتے ہیں۔ انہوں نے اس کے لئے منطقی لفظ اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ ان کی بہ ترتیب افضلیت، افضلیت

کلیہ ہے، لیکن اس لفظ سے ہر شخص ان کا مفہوم نہیں سمجھ سکتا۔ صحابۂ کرام نے اس کو اس قسم کے الفاظ سے ادا کیا ہے کہ ان کی یہ ترتیب افضلیت امرِ خلافت میں ہے۔ حافظ ابن حجر فتح الباری ج ۷ ص ۱۱ میں حضرت ابن عمر کا قول نقل کرتے ہیں ـــ

انکم تعلمون انا کنا نقول علیٰ عہد رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ابوبکر و عمر و عثمان یعنی فی الخلافۃ:	تم لوگ جانتے ہو کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کہا کرتے تھے، ابوبکر اور عمر اور عثمان، یعنی باب خلافت میں (بہتر) ابوبکر ہیں، پھر عمر پھر عثمان ۔

اس کے محاذی ایک اور روایت بھی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں :

کنا نحدث ان افضل اھل المدینۃ علی بن ابی طالب ؓ	ہم لوگ گفتگو کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں سب سے افضل علی بن ابی طالب ہیں ۔

یہ سند بزار کی روایت۔ فتح الباری (ج ۷، ص ۴۷) میں ہے کہ اس کے رواۃ معتبر ہیں ـــ (رجاله موثوقون)

ان دونوں روایتوں کو ملحوظ رکھنے سے یہ مطلب نکلتا ہے کہ امر خلافت میں تو خلفائے ثلاثہ افضل ہیں جیسا کہ حضرت ابن عمر کے قول سے ظاہر ہے اور امر خلافت کے علاوہ کچھ خاص صفات کی جامعیت میں حضرت علی افضل ہیں۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھو تو حضرت ابن مسعود کا قول بھی صحیح ہے۔ حضرت علی میں خاص خاص صفات کی جامعیت کا اظہار حضرت عمر، حضرت سعد بن ابی وقاص اور حضرت ابن عمر کے کلام سے بھی ہوتا ہے۔

۱۔ حضرت عمر فرماتے ہیں: علی کو تین فضائل ایسے ملے ہیں کہ اگر ان میں سے ایک فضیلت بھی مجھے ملی ہوتی تو یہ دولت مجھے سرخ اونٹ سے بڑھ کر محبوب دولت ہوتی۔ وہ تین فضائل یہ ہیں (۱) فاطمہ بنت رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی حضرت علی سے شادی۔ (۲) علی کو مسجد میں بحالِ جنابت آنا جانا جائز ہے، مگر ہم لوگوں کے لئے جائز نہیں (۳) جنگ خیبر میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا، یہ جھنڈا

میں اس کو دوں گا جو اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول کو محبوب ہے۔ اور یہ جھنڈا علی کو مرحمت فرمایا۔" (مسند احمد و مسند ابو یعلی)

(۲) ۔ حضرت ابن عمر فرماتے ہیں۔ علی ابن ابی طالب کو تین ایسی فضیلتیں ملی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک فضیلت بھی مجھے ملی ہوتی تو یہ دولت مجھے سرخ اونٹ سے بڑھ کر محبوب دولت ہوتی وہ تین فضائل یہ ہیں ۔

(ا) نبی صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی (حضرت فاطمہ) سے ان کی شادی کر دی جن سے اولاد ہوئی ۔

(ب) مسجد میں جتنے لوگوں کے دروازے تھے حضور نے سب بند کرا دیئے۔ صرف علی کا دروازہ رہنے دیا۔

(ج) حضور نے جنگ خیبر میں آپ کو جھنڈا عطا فرمایا۔ (فتح الباری ج ۷ ص ۱۱ بحوالہ مسند احمد)۔

۳ ۔ حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں: علی میں تین باتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بات بھی مجھ میں ہوتی تو یہ دولت مجھے سرخ اونٹ سے بڑھ کر محبوب ہوتی۔ (ایک بات یہ ہے کہ) رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے علی سے فرمایا ہے: تم کو مجھ سے وہی نسبت حاصل ہے جو نسبت ہارون کو موسیٰ سے حاصل تھی۔ (دوسری بات یہ ہے کہ) خیبر میں آپ نے فرمایا تھا: "میں اس کو جھنڈا دوں گا جو اللہ و رسول سے محبت رکھتا ہے۔ اور اللہ و رسول کا محبوب ہے" پھر آپ نے یہ جھنڈا علی کو دیا اور انکے ہاتھ سے خیبر فتح ہوا۔ (تیسری بات یہ ہے کہ) جب یہ آیت اتری نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کو بلا کر فرمایا اَللّٰهُمَّ هٰٓؤُلَآءِ اهلی یعنی یا اللہ یہ لوگ میرے اہل ہیں۔" (صحیح مسلم باختصار ج ۲ ص ۲۷۸)

نوٹ : بایں ہمہ حضرت علی کے ہوتے ہوئے حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان کو خلیفہ بنانا بالکل صحیح ہے کہ وقت کا تقاضا بلکہ دینی مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ نیز سینیر کا انتخاب بڑی قابل قدر چیز ہے۔ نماز کی امامت کے لئے بھی سینیر کو ترجیح دی جاتی ہے۔

انتخاب خلفاء کی اس ترتیب سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اگلے خلیفہ میں صلاحیت زیادہ ہے اور بعد

کے خلیفہ میں کم ہے کیوں کہ حدیث بتاتی ہے کہ خلافت کی قوت حضرت عمر میں حضرت ابوبکر سے زیادہ تھی۔ (صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۷-۵۱۹) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بینما انا نائم رائیتنی علی قلیب علیہا دلو، فنزعت فیہا ماشاء اللہ ثم اخذہا ابن ابی قحافہ فنزع منہا ذنوبا او ذنوبین وفی نزعہ ضعف واللہ یغفر لہ ضعفہ ثم استحالت غربا، ناخذہا ابن الخطاب فلم ار عبقریا من الناس ینزع نزع عمر حتی ضرب الناس بعطن۔

میں سویا ہوا تھا کہ خواب میں یہ دیکھا کہ میں ایک کنویں پر ہوں، وہاں ایک ڈول ہے؛ میں نے اتنے ڈول پانی کھینچا جتنا اللہ کو منظور ہے۔ پھر ابو قحافہ کے بیٹے (ابوبکر) نے ڈول اٹھالیا، اور ایک یا دو ڈول پانی کھینچا، ان کے پانی کھینچنے میں کچھ کمزوری تھی، اللہ ان کی کمزوری کو بخشے، پھر ڈول بڑا ہو گیا۔ اب اسے خطاب کے بیٹے (عمر) نے اٹھالیا، میں نے کسی ماہر کو عمر کی طرح ڈول کھینچتے ہوئے نہیں دیکھا۔ انہوں نے یہاں تک پانی کھینچا کہ لوگوں نے اپنے اونٹوں کو پانی پلا کر ٹھکانے کی جگہ بٹھا دیا۔

مسئلہ تفضیل میں نقطۂ اعتدال

اس باب میں اعتدال کا راستہ وہ ہے جو اکابر اہل سنت نے اختیار فرمایا ہے کہ:
حضرات خلفائے ثلاثہ حضرت علی سے ہر بات میں افضل نہیں، بلکہ اس بات میں افضل ہیں کہ ان تینوں حضرات سے کثرت ثواب کے کام زیادہ ہوئے ہیں اور ان کی خلافت سے فائدہ زیادہ پہنچا ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ کسی بات میں بھی حضرت علی افضل نہیں بلکہ ایسے امور بھی ہیں کہ جن میں حضرت علی افضل ہیں۔ مثلاً (۱) آپ کو حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کی ایسی قرابت خاصہ حاصل ہے کہ

حضور کی ذریت طاہرہ کے پدر بزرگوار آپ ہی ہیں۔ (۲) آپ کو حضور سے وہ نسبت حاصل ہے جو حضرت ہارون کو حضرت موسیٰ سے حاصل تھی۔ (۳) حضور نے خیبر میں آپ کو جھنڈا عنایت فرماکر امت کو یہ روشنی عطا فرمائی ہے کہ حاضرین میں آپ ہی اللہ و رسول کے محب اور محبوب ہونے کی صفت میں ممتاز ہیں، (۴) مشرکین عرب اور یہود کی بڑی طاقتوں کا خاتمہ زیادہ تر آپ ہی نے کیا۔

اہل سنت کو یہ تمام باتیں تسلیم ہیں اور ان کے علاوہ کچھ اور امور میں بھی حضرت علی کی افضلیت تسلیم ہے۔ بایں ہمہ وہ عام طور سے کہتے ہیں کہ "امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر ہیں، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان، پھر حضرت علی۔"

اس کا ایک مطلب یہ ہے کہ یہ حضرات امر خلافت میں اسی ترتیب سے افضل ہیں، اس پر مفصل بحث اوپر لکھی جاچکی ہے اور یہ مطلب بھی ہے۔ یہ حضرات کثرت ثواب کے کاموں میں بھی اسی تفصیل سے افضل ہیں۔ اور ان کی خلافت سے حسب ترتیب فائدہ پہونچا ہے۔ خلافت صدیقی سے اسلام اور مسلمانوں کو بہت ہی زیادہ فائدہ پہونچا۔ اس کے بعد خلافت فاروقی سے، پھر خلافت عثمانی سے، پھر خلافت مرتضوی سے۔

علمائے اہل سنت نے تصریح فرمائی ہے کہ: "ہم لوگ جو یہ کہتے ہیں کہ امت میں سب سے افضل حضرت ابوبکر ہیں، پھر حضرت عمر، پھر حضرت عثمان، پھر حضرت علی تو اس افضلیت سے ہماری مراد کثرت ثواب ہے، حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی تکمیل الایمان[1] صفحہ ۸۴ میں خلفائے اربعہ کی یہ ترتیب افضلیت لکھ کر فرماتے ہیں۔

مراد از افضلیت اکثریت ثواب است عنداللہ — افضلیت سے مراد یہ ہے کہ اللہ کے یہاں ثواب بیشتر ہے۔

شرح مواقف[2] صـ ۷۴۲، میں ہے:

---

[1] تکمیل الایمان عقائد اہل سنت کی نہایت بلند پایہ کتاب ہے بڑی سنجیدگی اور سلامت روی کی حامل کتاب ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] شرح مواقف اہل سنت اور سنی علم کلام کی مرکزی کتاب ہے اور بعد کی تمام کلامی کتابوں کا مأخذ ہے۔ اس فن پر شرح مقاصد اور شرح مواقف جیسی جامع اور ہمہ گیر کتاب آج تک نہ ہوسکی۔ ۱۲ کوثر

مرجع الافضلية التي نحن بصددها	وہ افضلیت جس پر ہم گفتگو کر رہے ہیں، اس کا
هي كثرت الثواب والكرامة عند الله،	مرجع اللہ کے یہاں ثواب اور بزرگی کی کثرت ہے۔

مسئلہ تفضیل میں نہایت ہی متوازن اور معتدل بات جو کہی جا سکتی ہے وہ یہی ہے کہ حضرات خلفائے ثلاثہ حضرت علی سے اس بات میں افضل ہیں کہ ثواب کے کام ان سے نسبتاً زیادہ ہوئے ہیں یہ مطلب نہیں کہ ہر بات میں یہ حضرت علی سے افضل ہیں، کیوں کہ بعض امور میں حضرت علی کی افضلیت مسلم ہے۔

اگر اس متوازن بات کو اختیار کر لیا جائے، تو نہ حضرات خلفائے ثلاثہ کی شان گرامی کی تنقیص ہوتی ہے اور نہ حضرت علی کی شان عالی گرانے کا ارتکاب ہوگا۔ یہی ہے ادب کا راستہ اور یہی ہے اس باب میں نقطۂ اعتدال اگر اس کو ملحوظ رکھا جائے تو مسئلہ تفضیل میں صحابۂ کرام اور دیگر اکابر کے جو اقوال باہم متعارض نظر آتے ہیں، ان میں بآسانی تطبیق دی جا سکتی ہے۔ مثلاً حضرت ابن عمر کا قول ہے:

كنا نخير بين الناس في زمان	ہم لوگ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں بعض
رسول الله صلى الله عليه وسلم	لوگوں کو بعض لوگوں سے بہتر قرار دیتے تھے، چنانچہ
فنخير ابا بكر، ثم عمر، ثم عثمان.	ابوبکر کو بہتر کہتے پھر عمر کو پھر عثمان کو۔

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۶)

اس کے موازی حضرت ابن مسعود کا قول ہے کہ: "ہم لوگ گفتگو کرتے تھے کہ اہل مدینہ میں سب سے افضل علی ابن ابی طالب ہیں"۔ (مسند بزار) از فتح الباری ج ۷ ص ۴۲) عربی متن اوپر لکھا جا چکا ہے)

امام ابن عبد البر استیعاب میں لکھتے ہیں کہ:

"حضرت سلمان فارسی، حضرت ابو درداء، حضرت مقداد، حضرت خباب، حضرت جابر، حضرت ابوسعید خدری اور حضرت زید بن ارقم کا قول ہے کہ (حضرت خدیجہ کے بعد) سب سے پہلے علی نے اسلام قبول کیا، لیکن ابوطالب کی وجہ سے اپنے اسلام کو مخفی رکھا تھا، یہ صحابۂ کرام حضرت علی کو دوسرے لوگوں سے افضل کہتے ہیں"۔

حضرت ابن عمر اور ان مذکورہ صحابہ کے اقوال میں اس طرح تطبیق دی جا سکتی ہے کہ:

حضرات خلفائے ثلاثہ اعمال ثواب کی کثرت میں افضل ہیں اور حضرت علی مخصوص مناقب و فضائل میں افضل ہیں۔

اس نقطۂ اعتدال کو سامنے رکھ کر اس سلسلے کے اور مسائل بھی سلجھائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً تکمیل الایمان صفحہ ۹۴ میں ہے کہ قصیدۂ امالیہ کی شرح میں بعض فقہائے محدثین کا قول منقول ہے کہ:

افضلیت خلفائے اربعہ مخصوص است بما عدا اولاد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم،	خلفائے اربعہ کی فضیلت اولاد رسول کے علاوہ باقی اور لوگوں پر ہے۔

اس کا بہترین مفہوم یہ ہے کہ خلفائے اربعہ کی افضلیت ہر بات میں نہیں ہے، ایک خاص افضلیت اولاد رسول کو بھی حاصل ہے۔ وہ یہ ہے کہ ان میں جزویت نبوی ہے اور اس کے لحاظ سے وہ سب سے افضل ہیں، باقی کار ثواب کی کثرت میں خلفائے اربعہ ہی افضل ہیں۔

حضرت امام مالک کا ارشاد ہے:

لا افضل علی بضعۃ النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم احداً (تکمیل الایمان صفحہ ۹۴)	جو ذات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا جگر پارہ ہے میں اس سے کسی کو افضل نہیں سمجھتا۔

اس میں اشارہ ہے حضرت فاطمہ کی طرف کہ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی شان میں فرمایا ہے:

فاطمہ بضعۃ منی

فاطمہ میری جگر پارہ ہے۔

اس قول کے بارے میں بھی یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ حضرت فاطمہ (سلام اللہ علیہا) اس باب میں سب سے افضل ہیں کہ وہ حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی لخت جگر ہیں مگر باقی کار ثواب کی کثرت میں خلفائے اربعہ افضل ہیں۔

شیخ دہلوی تکمیل الایمان صفحہ ۹۴ میں لکھتے ہیں۔

شیخ جلال الدین سیوطی در کتاب	شیخ جلال الدین سیوطی کتاب خصائص میں

خصائص از علم الدین عراقی نقل کردہ است کہ فاطمہ و برادر او ابراہیم بالاتفاق افضل اند از خلفائے اربعہ۔

(حافظ) علم الدین عراقی کا قول نقل کرتے ہیں کہ حضرت فاطمہ اور ان کے بھائی ابراہیم بالاتفاق خلفائے اربعہ سے افضل ہیں۔

اس کا مفہوم بھی یہی ہے کہ حضرت فاطمہ اور حضرت ابراہیم (فرزند رسول صلی اللہ علیہ وسلم) اس باب میں خلفائے اربعہ سے افضل ہیں کہ ان کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لخت جگر ہونے کا شرف حاصل ہے، باقی کار ثواب کی کثرت میں حضرات خلفائے اربعہ افضل ہیں

حضرت شیخ دہلوی ان اقوال کو نقل کرنے کے بعد مذکورہ بالا تشریح و توجیہہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

شک نیست کہ اولاد پیغمبر اجزائے اویند و ایں شرفے و شانے ہست کہ در ذات شیخین نیست و ہیچ کس را دریں جا توقف و انکار نخواہد بود، و باوجود آں ثواب شیخین اکثر، و نفع ایشان در اسلام و اہل آں اوفر (تکمیل الایمان صفحہ ۹۹)

اس میں شک نہیں کہ اولاد رسول، رسول کے اجزا ہیں، اور یہ ایسا شرف اور ایسی شان ہے جو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر میں نہیں، اور یہاں کسی کو توقف اور انکار کی جگہ نہیں ہے لیکن باایں ہمہ شیخین کے اعمال ثواب زیادہ ہیں۔ اور ان سے اسلام اور مسلمانوں کو زیادہ نفع پہونچا ہے۔

کیا ترتیب خلافت کی طرح ترتیب افضلیت بھی یقینی ہے؟

خلافت کی ترتیب تو یقینی ہے کہ خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق ہیں، پھر عمر فاروق، پھر عثمان غنی، پھر علی مرتضی رضی اللہ عنہم اجمعین، لیکن کیا یہ بھی یقینی ہے کہ یہ حضرات اسی ترتیب سے افضل بھی ہیں؟ یا ان کی یہ ترتیب افضلیت یقینی کے بجائے ظنی ہے؟

کتب کلامیہ میں تصریح ہے کہ ان حضرات کی یہ ترتیب افضلیت یقینی نہیں بلکہ ظنی ہے، بلکہ مواقف میں یہاں تک ہے:

ان الافضلیۃ لا مطمع فیہا فی الجزم والیقین (صـ۷۴۷)	افضلیت کے بارے میں جزم و یقین کی کوئی امید ہی نہیں۔

اس پر دلیل پیش کی ہے کہ دونوں فریق، یعنی خلفائے ثلاثہ کی افضلیت کے قائل فریق اور حضرت علی کی افضلیت کے قائل فریق نے اپنے اپنے ثبوت میں جو نصوص پیش کئے ہیں وہ باہم متعارض ہیں اور ایسے دلائل سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یقینی نہیں ہوتی، جیسا کہ انصاف پسند آدمی پر روشن ہے (علی مالا یخفی علی منصف)

شرح مواقف میں اس کی تشریح کرتے ہوئے جو لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے۔

افضلیت کے نصوص یا تو احاد[1] ہیں، جو یقینی نہیں ہوتے، یا ظنی الدلالۃ[2] ہیں، یہ بھی یقینی نہیں ہوتے۔ مزید برآں باہم متعارض بھی ہیں۔ پھر انھیں یقینی کیسے کہا جا سکتا ہے۔

نیز کسی نے ثواب کے کام دوسروں سے زیادہ کئے ہیں، تو اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ ان سے یقیناً افضل ہے۔ یعنی اس کو یقیناً ان سے زیادہ ثواب ملے گا، کیوں کہ ثواب تو محض اللہ کا فضل و کرم ہے جس کو چاہے دے جس کو چاہے نہ دے۔

---

[1] احاد ان حدیثوں کو کہتے ہیں جن کے راوی ایک یا دو یا دو سے زیادہ ہوں لیکن متواتر اور مشہور حدیث کے راویوں سے کم ہوں، حسامی میں ہے۔ وخبر الواحد وھو الذی یرویہ الواحد او اثنان فصاعدا، بعد ان یکون دون المشہور والمتواتر (تحقیق شرح حسامی ص ۱۰۳) منار میں بھی ایسا ہی ہے (نور الانوار ص ۱۷۰) اور کتابوں میں بھی ایسا ہی ہے۔ احاد حدیثیں ظنی ہیں یقینی نہیں۔ اصول سرخسی ج۱ ص ۳۲۰ میں ہے خبر الواحد العدل حجۃ للعمل بہ فی امر الدین ولا یثبت بہ علم الیقین۔ عملیات میں احاد کو اس لئے لیا جاتا ہے کہ عملیات میں ظنیات کو بھی لیتے ہیں لیکن عقائد میں یقینی ثبوت ہی کو لیتے ہیں کیونکہ یہاں یقین مطلوب ہے۔ شرح مواقف صـ۳۴، کوثر

[2] نص کا جو مفہوم یقینی ہے۔ اسے قطعی الدلالۃ کہتے ہیں اور جو مفہوم یقینی نہیں، بلکہ ظنی ہے اس کو ظنی الدلالۃ کہتے ہیں۔ ۱۲۔ کوثر

باایں ہمہ چونکہ سلف یہ کہتے ہیں کہ "افضل ابوبکر ہیں، پھر عمرؓ، پھر عثمان، پھر علی"
اور سلف کے ساتھ ہمارا جو حسن ظن ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم یہ سمجھیں کہ انہوں نے اس کے
متعلق کوئی بات سمجھی ہے ورنہ اس پر اتفاق نہیں کرتے۔ لہٰذا ان کا اتباع ہمارے لئے ناگزیر ہے
لیکن حق کیا ہے، یہ اللہ کے حوالہ کریں۔ وتفویض ماھو الحق الی اللّٰہ (شرح مواقف ص ۴۴۴)
لب لباب یہ ہے کہ یہ ترتیب افضلیت یقینی نہیں، بلکہ محض اس بنا پر ہم اس کے قائل ہیں کہ
سلف ایسا کہتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ ہمیں جو حسن ظن ہے اس کی بنا پر ہمیں بھی یہی کہنا چاہئے یعنی
اس مسئلہ کی بنیاد یقین پر نہیں بلکہ حسن ظن پر ہے۔ نیز افضلیت سے مراد اعمال ثواب کی
اکثریت ہے۔

مسئلہ تفضیل کی بنیاد و مخرج

اس کی بنیاد اس مسئلہ پر ہے کہ افضل کے ہوتے ہوئے غیر افضل کی خلافت صحیح ہے
یا نہیں، جو سنی فقہاء یہ کہتے ہیں کہ افضل کے ہوتے ہوئے غیر افضل کی خلافت صحیح نہیں، ان کو یہ
کہنا ضروری ہے کہ سب سے افضل حضرت ابوبکر صدیق ہیں، پھر حضرت عمرؓ، پھر حضرت عثمان پھر حضرت علی۔
امام الحرمین نے کتاب الارشاد میں اس پر جامع بحث کی ہے جسے شیخ عبدالحق محدث
دہلوی نے تکمیل الایمان صفحہ ۵۰ میں بہ عبارت فارسی نقل کیا ہے، ہم اس کا ماحصل پیش کرتے ہیں
اور آخر میں حضرت شیخ کی عبارت حاشیہ میں درج کرینگے۔ ماحصل ملاحظہ ہو۔
مسئلہ تفضیل کی بنیاد اس پر ہے کہ افضل کے ہوتے ہوئے غیر افضل کی امامت وخلافت
جائز نہیں، مگر اکثر اہل سنت وجماعت کا مسلک یہ ہے کہ اگرچہ امام وخلیفہ افضل آدمی ہی کو بنانا
چاہئے، لیکن اگر ایسے کو خلیفہ بنانے میں جنگ وجدال اور فتنہ وفساد کا احتمال ہے تو غیر افضل
کو خلیفہ بنانا بالکل درست اور جائز ہے بہ شرطیکہ امامت وخلافت کی اہلیت رکھتا ہو۔
یعنی اس میں امامت وخلافت کے صفات وشرائط موجود ہوں، مثلاً قریشی ہو، حلال و
حرام کا علم رکھتا ہو، دین کے مہمات ومصالح کا واقف کار ہو۔ ورع وتقویٰ اور عدالت

کا حامل ہو، بہادر ہو، آرام طلب اور ناتجربہ کار نہ ہو[1] کہ مہمات کو انجام نہ دے سکے۔

امام الحرمین اس کے بعد فرماتے ہیں:

میرے نزدیک افضل کو امام بنانا قطعی اور یقینی مسئلہ نہیں ہے، کیوں کہ اخبار احاد کے سوا کوئی دلیل اس پر نہیں اور وہ بھی امامت کبریٰ یعنی خلافت کے بارے میں نہیں ہے، بلکہ امامت صغریٰ یعنی امامت نماز کے بارے میں ہے۔ چنانچہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ "یؤمکم اقرأکم"۔ یعنی نماز کا امام ایسا شخص ہو جو قرآن کو سب سے بہتر پڑھنے والا اور احکام دین کا زیادہ جاننے والا ہو۔ چونکہ یہ حدیث احاد ہے لہٰذا موجب یقین نہیں۔

لہٰذا صحیح بات یہی ہے کہ امامت و خلافت کے لئے افضلیت شرط نہیں ہے۔ اس لئے کسی کا امام و خلیفہ ہونا اس کے افضل ہونے کا ثبوت نہیں۔ امامت نماز والی حدیث کے علاوہ (جو احاد ہے یعنی یقینی نہیں ہے نیز خلافت سے متعلق بھی نہیں ہے) کوئی قطعی دلیل ہمارے پاس نہیں، جو دلالت کرتی ہو کہ بعض خلیفہ بعض خلیفہ سے افضل ہیں کیوں کہ عقل اس کے ادراک سے قاصر ہے اور جو حدیثیں خلفاء کے فضائل میں آئی ہیں وہ باہم متعارض ہیں۔ لہٰذا توقف اور سکوت کے سوا کیا ہو سکتا ہے؟

---

[1] امام الحرمین نے خلافت کے تمام شرائط نہیں بیان کئے ہیں۔ بطور مثال چند شرائط ذکر کر دیئے۔ خلیفہ کا تقرر صرف اقامت دین کے لئے ہے اور اسی لئے اس کا تقرر کرنا چاہیے۔ اقامت دین میں ارکان[1] اسلام کو قائم رکھنا بھی ہے اور امر[2] بالمعروف و نہی عن المنکر کو جاری رکھنا بھی۔ عدلیہ[3] (انفصال، قضایا، رفع مظالم، حدود و تعزیرات) کا اہتمام اور نفاذ بھی۔ کفار[4] یا مفسدوں اور باغیوں سے قتال و جہاد کا انتظام بھی۔ علوم[5] دینیہ کا احیاء بھی اور یہ سب کام نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نیابت میں اور آپ کے طریقہ پر کیا جائے۔ بس اس طرح اقامت دین کرنے (یعنی ان پانچ امور کے انتظام کرنے) کی ریاست عامہ کو خلافت کہتے ہیں۔ اور جو شخص آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے طریقہ پر ان کاموں کو انجام دے، وہی خلیفہ ہے۔ اس پر مفصل بحث انشاء اللہ امام حسین کے حالات میں آئے گی۔ ۱۲ کوثر

لیکن ظن غالب یہ ہے کہ حضرت ابوبکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے افضل ہیں۔ ان کے بعد حضرت عمرؓ اور حضرت عثمان کے بارے میں ایک طرح کا ظن نہیں بلکہ متعارض ہے۔ لوگوں نے حضرت علی سے روایت کی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ "رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد بہترین شخص ابوبکر و عمر ہیں"

"اس کے بعد اللہ بہتر جانتا ہے کہ افضل کون ہے" (امام الحرمین کی عبارت کا ترجمہ ختم ہوا۔

چونکہ خلفائے ثلاثہ کی تفضیل کا مسئلہ یقینی نہیں، بلکہ ظنی ہے۔ اس لئے اس کو لے کر مباحثہ و مجادلہ کرنا اور امت میں فتنہ اٹھانا کسی طرح مناسب نہیں۔ مسلمان بہت سے اختلافات میں مبتلا ہیں جن کی وجہ سے امت بہت سی پریشانیوں میں گھری ہے۔ اب اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کرنا بے حد تباہ کن ہے۔ اور ذرا ذرا سی بات میں فتوے بازی کرنا بے حد مضر ہے۔ سلف ایسے مسائل میں رواداری سے کام لیتے تھے۔ امام یحییٰ بن معین فرماتے ہیں:

ے چنانچہ امام مالک فرماتے ہیں: دین کے جن پیشواؤں کو میں نے پایا ہے ان میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ علی اور عثمان میں سے کسی کو ایک دوسرے سے افضل کہتے ہوں۔ (تکمیل الایمان ص ۹۴) حافظ ابن حجر فتح الباری ج ۷ ص ۱۳ میں لکھتے ہیں "بعض سلف حضرت علی کو حضرت عثمان سے افضل کہتے ہیں، جن لوگوں نے یہ کہا ہے ان میں سفیان ثوری بھی ہیں۔ کہا گیا ہے کہ انہوں نے اس سے رجوع کر لیا ہے۔ اور تفضیل علی بر عثمان کے قائلین میں امام ابوبکر بن خزیمہ بھی ہیں۔ ان سے پہلے اور ان کے بعد ایک جماعت بھی اس کی قائل ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ حضرت عثمان اور حضرت علی میں سے کسی کو دوسرے پر فضیلت نہ دی جائے۔ امام مالک نے مدونہ میں بھی یہی کہا ہے۔ اور اس باب میں ایک جماعت نے ان کی پیروی کی ہے۔ ان میں (امام) یحییٰ بن سعید قطان بھی ہیں۔ اور متاخرین میں ابن حزم بھی ہیں" مقدمہ ابن صلاح صفحہ ۱۴۹ میں ہے: وقدم اهل الكوفة من اهل السنة عليا على عثمانؓ وبه قال بعض السلف۔ یعنی کوفہ کے اہل سنت نے حضرت علی کو حضرت عثمان سے افضل کہا ہے۔ اور بعض سلف نے بھی یہی کہا ہے۔ ۱۲ کوثر

من قال ابوبکر و عمر و عثمان و علی وعرف لعلی سابقیتہ و فضلہ فھو صاحب سنۃ

(فتح الباری ۷، ص ۱۳)

جو شخص حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، اور حضرت علی (رضی اللہ عنہم) کا قائل ہے اور حضرت علی کی سابقیت اور فضل کو پہچانتا ہے وہ اہل سنت ہے۔

متن تکمیل الایمان

جو امام الحرمین کی کتاب الارشاد کا ترجمہ ہے۔

بنائے مسئلہ تفضیل بریں است کہ امامت مفضول باوجود فاضل جائز نہ باشد، و معظم اہل سنت وجماعت برآنند کہ امام افضل باید لیکن اگر نصب وے موجب ہرج و مرج و ہیجان فتنہ و فساد گردد نصب مفضول بر تقدیر اہلیت واستحقاق او مر امامت را باستجماع صفات و شرائط آں از قرشیت، و علم بحلال و حرام، و مصالح و مہام دین اسلام و ورع و عدالت و شہادت و کفایت جائز باشد۔ و می گوید کہ نزد من مسئلہ اولیت یعنی اولیت نصب افضل قطعی نیست و جز اخبار احاد کہ در غیر ایں امامت کبریٰ کہ سخن ما دراں است یعنی امامت نماز کہ امامت صغراش می گویند وارد شدہ است، ایں است مثل قول آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم "لیؤمکم اقرأکم" یعنی باید کہ امام در نماز کسے شود کہ قرآن خواندہ تر و بعلم فقہ داناتر باشد، و ایں خود بقطع نمی رساند۔ پس صحیح آں است کہ در امامت و خلافت افضلیت شرط نیست، پس امامت را دلیل نتواند بود، و نزد ما دلیلے نیست کہ قاطع بود و دلالت کند بر تفضیل بعضے ائمہ بر بعضے، چہ عقل را بدرک آں راہ نیست، و اخبارے کہ در فضائل ایشاں در دریافتہ متعارض اند، پس جز توقف و سکوت سبیلے نہ باشد، ولیکن غالب بر ظن چناں آید کہ ابوبکر افضل خلائق است بعد از رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم و بعد از وے عمرؓ، و ظنون در علی و عثمان متعارض است، و می گوید کہ از علی نیز روایت کردہ اند کہ فرمودہ است کہ بہترین مردم بعد از پیغامبر ابوبکر و عمرؓ و بعد ازاں خدا دانا تر است بآنکہ بہتر کیست۔

(تکمیل الایمان صفحہ ۵۰ - ۵۱، مطبع احمدی سہارنپور)

فضائل جگر پارۂ رسول

سیّدۂ عالم حضرت فاطمہ زہرا

صلوات اللہ وسلامہ علیٰ ابیہا وعلیہا

یہ علوئے شان!

کہ

حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں

فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے

جس نے اس کو ناراض کیا اس نے مجھ کو ناراض کیا

فاطمة بضعة مني، من اغضبها
فقد اغضبني

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۶ - ۵۳۲)

یہ ہیں سیّدۃ النساء!

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا سے فرمایا ہے

کیا تم اس سے خوش نہیں ہو کہ تم جنت کی عورتوں کی سردار ہو

اما ترضی ان تکونی سیّدۃ نساء اهل الجنۃ

(صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۱۲)

حیاتِ سیدہ کا ایک باب

نام لقب اور نسب فاطمہ نام، زہرا اور سیّدۃ النساء لقب، حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سب سے چھوٹی اور سب سے چہیتی صاحبزادی تھیں۔ استیعاب میں ہے کہ ۱ھ بعثت نبوی میں پیدا ہوئیں۔ آپ کی والدہ ماجدہ ام المومنین حضرت خدیجہ صدیقہ عظمیٰ ہیں رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔

معصوم بچپن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عدیم المثال تربیت نے حضرت سیدہ کو فضل و کمال کا ایسا مرقع بنا دیا تھا جس کی مثال عالم نسوانی میں نہیں، بچپن ہی سے آپ اللہ کے ذکر و عبادت میں رہا کرتی تھیں اور زبان و دعا میں بڑا اثر آ گیا تھا۔

ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حرم کعبہ میں نماز پڑھ رہے تھے رؤسائے قریش ابوجہل اور امیہ بن خلف وغیرہ سب موجود تھے۔ عقبہ بن ابی معیط نے اونٹ کی اوجھڑی لاکر عین نماز کی حالت میں آپ کی گردن میں ڈال دی قریش مارے خوشی کے ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے۔ کسی نے جاکر حضرت فاطمہ کو خبر کی۔ اس وقت وہ صرف پانچ سال کی تھیں، لیکن بیتاب ہو کر دوڑی آئیں اور اوجھڑی ہٹا کر عقبہ بن ابن ابی معیط کو سخت سست کہا۔ اور بد دعا دی جو پڑ گئی چنانچہ وہ کفر کی حالت میں مارا گیا۔

شادی ذی الحجہ ۲ھ صحیح روایت کی بنا پر حضرت سیّدہ کی ولادت بعثت نبوی

کے پہلے سال ہوئی اس کے رو سے ۲ھ میں آپ پندرہ سال کی ہوئیں اور شادی کے پیغام آنے لگے۔ سنن نسائی (ج ۲ ص ۶۹ باب نکاح الابکار) میں ہے کہ حضرت ابوبکر و حضرت عمر نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا "انہا صغیرۃ" یعنی یہ بہت کمسن ہے۔ پھر حضرت علی نے درخواست کی، اور آپ نے ان سے شادی کر دی (کنز العمال ج ۶ ص ۲۹۳) میں ہے کہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کو جب آپ نے جواب دیدیا تو حضرت عمر نے حضرت علی سے کہا: آپ پیغام دیجئے، اس کے لئے آپ بہت مناسب ہیں۔ آپ نے درخواست کی جو منظور ہو گئی۔

اس سلسلہ میں حضور نے حضرت علی سے فرمایا؟ تمہارے پاس مہر دینے کو کیا ہے؟ بولے: ایک اونٹ اور زرہ۔ آپ نے فرمایا کہ زرہ کافی ہے، اسے ۴۸۰ درم میں بیچا، اور قیمت لاکر حضور کے سامنے پیش کر دی آپ نے حضرت بلال کو حکم دیا کہ بازار سے خوشبو لائیں اور حضرت فاطمہ سے آپ کا نکاح کر دیا۔ ۴۸۰ درم مہر باندھا۔ یعنی سوا سو روپئے یہی ہے مہر فاطمی۔ مسند احمد و طبرانی کبیر میں ہے کہ شادی کے بعد آپ نے حضرت فاطمہ سے فرمایا۔

اما ترضین انی زوجتک اقدم امتی سلما واکثرھم علما واعظمھم حلما،	کیا تم کو اس سے شادکامی نہ ہوگی؟ کہ میں نے تمہاری شادی اس سے کی ہے جو میری امت میں پہلا مسلمان ہے، سب سے زیادہ علم والا ہے۔ اور حلم و تحمل میں سب سے بڑھ کر ہے۔
(کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۳)	

شہنشاہ کونین نے خاتونِ جنت کو جو جہیز دیا وہ بان کی چارپائی، چمڑے کا گدا جس کے اندر روئی کے بجائے کھجور کے پتے تھے۔ ایک چھاگل، ایک مشک، دو چکیاں اور مٹی کے دو گھڑے۔ یہ عجیب بات ہے کہ یہی چیزیں عمر بھر ان کی رفیق رہیں، اور حضرت علی جو فقر و قناعت کے تاجدار تھے اس میں کچھ بھی اضافہ نہ کر سکے۔ (ماخوذ از سیرت النبی)

صحیح ابن حبان میں ہے کہ شادی کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلے حضرت فاطمہ

کے لئے ان الفاظ میں دعا فرمائی۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطَانِ الرَّجِیْمِ	یا اللہ میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے محفوظ رہنے کے لئے تیری پناہ میں دیتا ہوں۔

پھر حضرت علی کے لئے بھی یہی دعا فرمائی۔ (متن میں مؤنث ضمیر کے بجائے مذکر ضمیر ہے) اس دعا کا اثر تھا کہ یہ حضرات ایک گونہ معصوم تھے، اس پر مفصل بحث ایک فصل میں گذر چکی ہے جس کا عنوان ہے "اہل بیت اطہار۔۔۔ معصومیت سے قریب تر ہیں"۔

رخصتی کے بعد

حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ شادی کے بعد گھر کی ضرورت ہوئی حضرت حارثہ بن نعمان انصاری رضی اللہ عنہ نے اپنا ایک مکان نذر کیا۔ حضرت سیدہ رخصت ہو کر جب اس میں آئیں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔ دروازہ پر کھڑے ہو کر اجازت مانگی۔ پھر اندر تشریف لے گئے اور پانی منگوایا۔ دونوں ہاتھ اس میں ڈال کر دعا پڑھی اور حضرت علی کے سینے اور بازوؤں پر چھڑکا پھر حضرت فاطمہ کو بلایا۔ وہ شرم سے لڑکھڑاتی آئیں ان پر بھی پانی چھڑکا اور فرمایا میں نے اپنے خاندان کے سب سے افضل آدمی سے تمہارا نکاح کیا ہے۔ حافظ خطیب بغدادی نے المتفق والمفترق میں لکھا ہے کہ آپ نے حضرت فاطمہ سے فرمایا:

زوجتک خیر اھلی اعلمھم علما وافضلھم حلما، واولھم سلما، (کنز العمال ج ۶ ص ۱۵۳)	میں نے تمہاری شادی اپنے خاندان کے بہترین آدمی سے کی ہے جو ان میں علم اور حلم میں سب سے زیادہ اور بہتر ہے اور ان میں اولین مسلمان ہے۔

غزوۂ احد میں

اس غزوہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دندان مبارک شہید ہو گئے تھے اور عبداللہ بن قمیہ کے وار سے چہرۂ اقدس پر مغفر کی دو کڑیاں چبھ کر رہ گئی تھیں جو مشکل سے نکلیں۔ حضرت عبداللہ بن جبیر جو شکل وصورت میں حضور سے کچھ مشابہ تھے اور علم بردار تھے۔ ابن قمیہ نے ان کو شہید کر دیا

اور غل مچ گیا کہ آپ نے شہادت پائی۔ یہ خبر مدینہ میں پہونچی تو جو حضرات وہاں تھے نہایت بیتابی کے ساتھ دوڑے ہوئے آئے۔ حضرت فاطمہ علیہا السلام نے آکر دیکھا تو ابھی تک چہرۂ مبارک سے خون جاری ہے۔ حضرت علی ڈھال میں پانی لائے۔ جناب سیدہ دھوتی جاتی تھیں، لیکن خون نہیں تھمتا تھا۔ بالآخر چٹائی کا ایک ٹکڑا جلاکر زخم پر رکھ دیا۔ خون فوراً تھم گیا۔

حسنین کریمین کی ولادت

سن ہجری کے تیسرے سال رمضان المبارک میں سیدنا امام حسن علیہ السلام کی ولادت ہوئی اور سن ہجری کے چوتھے سال ماہ شعبان میں سیدنا امام حسین علیہ السلام کی۔

ارتحال نبوی

اس روایت کی بنا پر کہ حضرت سیدہ علیہا السلام بعثت نبوی کے پہلے سال پیدا ہوئی ہیں۔ ارتحال نبوی کے وقت آپ تیئیس سال کی تھیں۔ ارتحال سے ایک روز پہلے حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سیدہ کو بلاکر کان میں کچھ باتیں کیں وہ رونے لگیں پھر بلاکر کان میں کچھ کہا تو ہنس پڑیں۔ پہلی مرتبہ آپ نے فرمایا تھا۔ اس مرض میں میری وفات ہوگی اس پر سیدہ رونے لگی تھیں اور دوسری مرتبہ بلاکر یہ فرمایا تھا کہ میرے خاندان میں تمہیں سب سے پہلے آکر مجھ سے ملوگی اس پر وہ ہنس پڑیں۔ یہ روایت صحیح بخاری جلد ۱ کے صفحہ ۵۲۷ و ۵۳۲ میں عروہ سے مروی ہے۔ (وہ حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں)

اور صفحہ ۵۱۲ میں مسروق سے مروی ہے۔ (وہ بھی حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں) مسروق کی روایت میں کچھ اضافہ بھی ہے۔ حافظ ابن حجر وغیرہ نے مسروق ہی کی روایت کو ترجیح دی ہے اس میں اضافہ یہ ہے کہ دوسری مرتبہ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ کے کان میں یہ فرمایا تھا:

اما ترضین ان تکونی سیدۃ نساء اھل الجنۃ او نساء المؤمنین	کیا تم کو اس سے مسرت نہ ہوگی ؟ کہ جنت والی عورتوں کی سردار تم ہو۔ یا یہ فرمایا، مومن عورتوں کی سردار تم ہو۔

ارتحال نبوی کا اثر حضرت سیدہ پر

ارتحال نبوی وہ صدمۂ جانکاہ ہے کہ تمام مسلمانوں کی نگاہوں میں دنیا تاریک ہوگئی تھی۔ (جیسا کہ مشکوٰۃ صفحہ ۵۴۷ میں ہے) لیکن حضرت سیدہ کو سب سے زیادہ صدمہ ہوا۔ چنانچہ آپ کی زبان پاک سے غم واندوہ کے وہ کلمات نکلے کہ پتھر کا کلیجہ پانی ہو جائے فرماتی ہیں:

یا ابتاہ اجاب ربا دعاہ	ہائے ابا اللہ نے آپ کو بلایا اور آپ
یا ابتاہ من جنۃ الفردوس	(ہم کو چھوڑ کر) چلے گئے۔ ابا آپ تو فردوس
ماواہ، یا ابتاہ الی جبریل	بریں میں مقیم ہوگئے (اور ہم یہیں ہیں)۔
ننعاہ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۴۱	ابا (یہ دن دیکھنا پڑا کہ) جبریل کو ہم آپ
باب مرض النبی صلی اللہ علیہ وسلم ووفاتہ)	کے ارتحال کی خبر سنا رہے ہیں اور ان کے
	سامنے رو رہے ہیں۔

آپ کے غم واندوہ کا یہ عالم تھا کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تجہیز و تکفین کے بعد جب حضور کے خادم خاص حضرت انس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

یا انس! اطابت انفسکم ان	اے انس کیا تم لوگوں کے دلوں نے رسول اللہ صلی اللہ
تحثوا علی رسول اللہ التراب	علیہ وسلم پر مٹی ڈالنا گوارا کر لیا؟

اس عالم میں آپ کی زبان سے مرثیہ کا یہ شعر بھی نکل پڑا۔

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا ... صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

ترجمہ:- مجھ پر ایسی سخت مصیبتیں پڑی ہیں کہ اگر روز روشن پر پڑتیں تو بھی اندھیرا ہو جاتا۔

کیسے دل دوز کلمات ہیں؟ کہ کلیجہ پھٹ رہا ہے آپ کے غم واندوہ کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس حادثۂ جان کاہ کے بعد جب تک آپ زندہ رہیں کبھی تبسم نہیں فرمایا۔ (اسد الغابہ ج ۵ ص ۵۲۴)

یہ صدمۂ جاں کاہ آپ کے قلب حزیں پر ایسا پڑا کہ بیمار پڑ گئیں اور اسی میں وفات پائی۔

وفات سیدہ اور تجہیز و تکفین

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے ارتحال کے چھ مہینے بعد ۳ ماہ رمضان المبارک ۱۱ھ یوم چہار شنبہ کو جنت کو سدھاریں۔ اور اپنے والد مقدس سے جا ملیں اس وقت عمر شریف ۲۳ تا ۲۹ سال تھی، حسنین پاک، حضرت ام کلثوم، حضرت رقیہ، حضرت زینب اور حضرت علی پر قیامت ٹوٹ پڑی۔

چونکہ حضرت سیدہ میں شرم و حیا بے حد تھی۔ اس لئے وفات سے کچھ روز پہلے حضرت اسماء بنت عمیس سے فرمایا "مرد اور عورت سب کا جنازہ کھلا لے جاتے ہیں، یہ مجھے ناپسند ہے، کہ کھلے جنازہ میں عورتوں کی بے پردگی ہوتی ہے"۔

حضرت اسماء نے اس پر حضرت سیدہ سے عرض کیا "جگر گوشۂ رسول! میں نے ملک حبش میں ایک طریقہ دیکھا ہے جس سے عورتوں کے جنازہ کا پردہ ہو جاتا ہے۔ آپ فرمائیں تو میں اسے پیش کر دوں"۔

اب انھوں نے کھجور کی کچھ شاخیں منگوائیں اور ان پر کپڑا تانا جس سے پردہ کی صورت پیدا ہو گئی۔ حضرت سیدہ نے اسے بے حد پسند فرمایا اور آپ کے جنازہ پر ایسا ہی پردہ کیا گیا۔ آج تک عورتوں کے جنازہ پر پردہ کا جو التزام کیا جاتا ہے۔ اس کی ابتدا حضرت سیدہ ہی کی تجویز سے ہوئی ہے۔

اکمال فی اسماء الرجال میں ہے کہ "حضرت سیدہ رات میں دفن ہوئیں، اور نماز جنازہ حضرت عباس نے پڑھائی"۔ راقم السطور اس سے استدلال کرتا ہے کہ ہمارے شہر میں جو عام طور پر دستور ہے کہ جنازہ پڑھنے کے لئے خاندان کے بزرگ سے اجازت طلب کی جاتی ہے وہ اپنی جگہ ایک صحیح دستور ہے کیونکہ حضرت علی نے حضرت سیدہ کا جنازہ حضرت

عباس سے اسی لئے پڑھوایا کہ وہی بنی ہاشم میں سب سے معمر اور حضور صلے اللہ علیہ وسلم اور حضرت علی کے چچا تھے. یعنی اس باب میں خاندان کے سب سے معمر بزرگ کی بزرگ داشت کرنی چاہیئے۔

حضرت فاطمہ کی قبر کہاں ہے؟ اس میں کئی اقوال ہیں مشہور قول یہ ہے کہ آپ جنت البقیع میں دفن ہوئیں۔ اور آپ کے پہلو میں حضرت امام حسن علیہ السلام کی قبر ہے اور وہیں حضرت عباس، حضرت امام محمد باقر اور امام جعفر کی بھی قبریں ہیں. ایک قول یہ ہے کہ دار عقیل میں دفن ہوئیں. ایک قول یہ ہے کہ مسجد فاطمہ میں آپ کا مزار ہے جو بقیع میں ہے. ایک قول یہ ہے کہ روضۂ نبوی میں آپ کا مزار ہے۔ ایک قول یہ ہے کہ روضۂ نبوی کے پیچھے آپ کا مزار انور ہے۔ ملا علی قاری نے المسلك المتقسط شرح لباب المناسک صفحہ ۳۴۱ میں لکھا ہے کہ لوگوں کا جو معمول ہو گیا ہے کہ روضۂ نبوی کی زیارت کے بعد یہ روضۂ اطہر کے پیچھے حضرت فاطمہ کی زیارت کے لئے جاتے ہیں، تو اس میں کوئی حرج نہیں کیوں کہ کہا گیا ہے کہ وہاں حضرت فاطمہ کی قبر ہے ملا صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں : قول اظہر یہی ہے (وھوالاظھر) یعنی اس قول کو وہ قوی ترین قول قرار دیتے ہیں۔

اولاد امجاد حضرت فاطمہ علیہا السلام کو چھ اولادیں ہوئیں (۱) امام حسن (۲) امام حسین (۳) حضرت محسن (۴) حضرت ام کلثوم (۵) حضرت زینب (۶) حضرت رقیہ، یہ آخری نام عام طور پر مذکور نہیں، لیکن اکمال وغیرہ میں ہے. حضرت محسن بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔ حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین علیہما السلام تاریخ اسلام کی سب سے اہم شخصیتوں میں ہیں. اور تمام مسلمانوں پر ان کا بہت بڑا احسان ہے چونکہ حضرت زینب اور حضرت ام کلثوم واقعۂ کربلا میں تھیں اس لئے ان کو بھی بہت بڑی شہرت حاصل ہے۔ اور انھوں نے تمام خواتین اسلام کو یہ درس عظیم دیا ہے کہ خاندان بھر کے لٹ جانے پر بھی کس صبر و تحمل سے کام لینا چاہیئے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے پناہ مصیبت

پر جس صبر و تحمل سے حضرت زینب، حضرت ام کلثوم اور دیگر خواتین خاندان رسالت نے کام لیا ہے اس کی مثال پوری تاریخ انسانی میں نہیں، اور صبر و تحمل کا یہ عملی درس ضبط نفس کی سب سے اونچی تعلیم ہے۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادیوں میں حضرت فاطمہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ حضور کی نسل پاک آپ ہی سے باقی ہے۔

سیرت سیدہ | یہی نہیں کہ حضرت فاطمہ علیہا السلام کا حلیہ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے ملتا جلتا تھا بلکہ تو بو سب آپ ہی کی تھی، سنن ترمذی میں حضرت عائشہ کا قول ہے:

مارأیت احدا اشبہ سمتا و دلا وھدیا برسول اللہ فی قیامہا، وقعودھا، من فاطمۃ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (ج ۲ ص ۲۲۷)	میں نے طور وطریق، حسن اخلاق اور سیرت مستقیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ جس قدر آپ کی صاحبزادی (حضرت) فاطمہ کو پایا اس قدر مشابہ کسی کو بھی نہیں پایا۔

روایت میں سمتاً، دلاً اور ہدیاً کے الفاظ ہیں جن کا ترجمہ علی الترتیب طور وطریق حسن واخلاق اور سیرت مستقیم ہے[1]۔ ان باتوں میں حضرت سیدہ حضور سے بے حد مشابہ تھیں۔

---

[1] علامہ زمخشری نعت حدیث کی نہایت معیاری کتاب الفائق صفحہ ۴۔۳۰ میں لکھتے ہیں۔

ما احسن سمتہ، ای طریقتہ التی ینتہجھا فی تحریر الخیر والتزیّ بزی الصالحین۔ والھدی السیرۃ السویۃ، آگے چل کر لکھتے ہیں۔ والدل حسن الشمائل

فن عربیت میں علامہ زمخشری کی امامت سب کو تسلیم ہے حتی کہ علامہ شامی بھی آپ کو امام لکھتے ہیں۔ رد المحتار ج ۱ ص ۶۳ سطر ۱ میں رقم طراز ہیں۔ وقد الغز فی ذالک الامام الزمخشری۔

علامہ عینی تو اتنے معترف ہیں کہ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۸ ص ۱۸۴ میں فرماتے ہیں ـــــ

اور کیوں نہ ہوں وہ بضعۃ الرسول ہیں یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود اقدس کا ایک جزو ہیں، جس کا مفہوم یہ ہے کہ آپ کا جگر گوشہ ہیں۔ اسی لئے تو امام مالک کا قول ہے کہ "میں بضعۃ الرسول سے افضل کسی کو بھی نہیں کہتا"

اخلاق میں سچائی اور راست بازی کا درجہ سب سے اونچا ہے۔ اس میں کوئی بھی حضرت سیدہ کا ہم پایہ نہ تھا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔

ما رأیت احدا کان اصدق لھجۃ من فاطمۃ الا ان یکون الذی ولدھا صلی اللہ علیہ وسلم (الاستیعاب ج ۲ ص ۷۷۲)	میں نے (حضرت) فاطمہ سے زیادہ کسی کو صادق الکلام نہیں دیکھا، البتہ ان کے والد صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

حضرت عائشہ نے اپنے ان دونوں اقوال میں حضرت سیدہ کی سیرت پاک کا جو نقشہ پیش فرمایا ہے اس سے بڑھ کر کسی سیرت کا تصور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس بیان پر کسی اضافہ کی گنجائش ہی نہیں۔ لہٰذا یہ فصل یہیں ختم کی جاتی ہے۔

رسول اعظم کی نگاہوں میں حضرت سیدہ کی قدر و منزلت اور آپ کی محبت

حضرت سیدہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ کھڑے ہو جاتے ....

.... اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے، اور حضرت سیدہ کا بھی یہی معمول تھا۔ چنانچہ جب حضور ان کے یہاں تشریف لے جاتے تو وہ بھی کھڑی ہو جاتیں .... اور اپنی جگہ سے ہٹ کر وہاں آپ کو بٹھاتیں (سنن ترمذی فضائل فاطمہ ج ۲ ص ۲۲۷ و

= وقد سمعت الاساتذۃ الکبار من علماء العرب والعجم ان من رد علی الزمخشری فی غیر الاعتقادیات فھو رد علیہ۔ ۱۲ کوثر

سنن ابی داؤد ج ۲ ص ۲۵۳)

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا کہ جب آپ سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت سیدہ کے پاس جاتے، اور جب واپس تشریف لاتے تو سب سے پہلے حضرت سیدہ سے ملاقات فرماتے۔

عموماً میاں بیوی میں کبھی کوئی رنجش کی بات ہو ہی جاتی ہے۔ اگر کبھی حضرت علی اور حضرت سیدہ میں کوئی بات ہو گئی تو فوراً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تعلقات میں حلاوت پیدا کرنے کی کوشش فرماتے۔ ایک بار حضرت علی اور حضرت سیّدہ میں کچھ بات ہو گئی۔ آپ تشریف لائے اور صفائی کرادی اور بڑی خوشی کے عالم میں واپس ہوئے صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ آپ تشریف لے گئے تھے تو درحالت نفی اور اب اس قدر خوش کیوں ہیں؟ فرمایا "میں نے ان دو شخصوں میں صفائی کرادی ہے جو مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہیں"؟

محض دو ایک بار شکر رنجی کے بعد ان حضرات میں پھر کبھی شکوہ شکایت کی کوئی بات نہیں ہوئی۔ حضرت علی نے جیسا کہ ایک بار فرمایا تھا کہ "اب میں تمہارے خلافِ مزاج کوئی بات نہ کروں گا" ویسا ہی آخر تک عمل کیا

حضرت فاطمہ اور حضرت علی حضور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب تھے سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۲۷ باب فضل فاطمہ) میں ہے کہ ایک شخص نے حضرت عائشہ سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سب سے زیادہ محبوب کون تھا؟ فرمایا "فاطمہ کے شوہر، میں یقین کے ساتھ جانتی ہوں کہ وہ بہت زیادہ روزے رکھا کرتے تھے، اور نمازیں بھی بہت زیادہ پڑھتے تھے۔

حضرت سیدہ کی ایک اہم خصوصیت حضرت خاتون جنت کا ایک اہم شرف یہ ہے کہ گو اسلام نے بیک وقت چار عورتوں کو نکاح میں رکھنے کی اجازت دی ہے لیکن حضرت فاطمہ پر سوکن رکھنا ممنوع ہے کہ اس سے ان کو ایذا ہوگی، جو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایذا کا سبب ہے صحیح بخاری و مسلم و سنن ابی داؤد و ترمذی و نسائی میں ہے کہ

رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تقریر کرتے ہوئے فرمایا۔

ان بنی ہشام بن المغیرۃ استاذنونی ان ینکحوا ابنتہم علی ابن ابی طالب فلا آذن لہم، ثم لا آذن لہم ثم لا آذن لہم الا ان یحب ابن ابی طالب ان یطلق ابنتی، وینکح ابنتہم، فانما ابنتی بضعۃ منی یریبنی ما ارابہا ویوذینی ما آذاہا۔

(از صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۹۰ و ترمذی ج ۲ ص ۲۲۶)

بنی ہشام بن مغیرہ (یعنی ابوجہل کے خاندان والوں) نے علی سے اپنی بیٹی کی شادی کرنے کی بجہ سے اجازت مانگی ہے، میں ان کو اجازت نہ دوں گا، نہ دوں گا، نہ دوں گا۔ ہاں اگر علی یہ چاہیں کہ میری بیٹی کو طلاق دیں اور ان لوگوں کی بیٹی سے شادی کریں تو کرلیں کیوں کہ میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جو چیز اسے بری لگے گی مجھے بھی بری لگے جس سے اس کو ایذا ہوگی، مجھے بھی ایذا ہوگی۔

امام نووی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں :۔

قال العلماء: فی ہذا الحدیث تحریم ایذاء النبی صلی اللہ علیہ وسلم بکل حال وعلی کل وجہ وان تولد ذالک الایذاء مما کان اصلہ مباحا وھو حی،

علما نے کہا ہے: اس حدیث میں یہ حقیقت ہے کہ کوئی بھی حال ہو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ایذا دینا حرام ہے۔ چاہے کسی شکل میں ہو۔ اگرچہ کسی مباح فعل ہی سے ایذا کا ظہور ہوا اور آپ تو بحال حیات ہیں۔

سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کی یہ شان قابل لحاظ ہے کہ گو اس زمانہ میں عرب کئی کئی بیویاں رکھتے تھے اور یہ ان کا عام دستور تھا، مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشاد یا لا پر آپ نے اس مضبوطی سے عمل کیا کہ جب تک حضرت سیدہ حیات رہیں دل میں دوسری شادی کا خیال تک نہیں آیا۔

حضرت سیدہ پر حضرت علی کی اس خوبی کا بڑا اثر تھا چنانچہ وصیت فرمائی کہ آپ میرے بعد امامہ بنت ابوالعاص سے شادی کر لیجئے گا، امامہ حضرت سیدہ کی نہایت چہیتی بھانجی اور آپ کی بڑی بہن حضرت زینب کی صاحبزادی تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنی اس نواسی کو بہت پیار فرماتے تھے۔ حضرت امامہ کے والد حضرت ابوالعاص نے حضرت زبیر کو وصیت فرمائی تھی کہ میری امامہ کی شادی حضرت علی سے کر دیجئے گا۔ حضرت زبیر نے اس پر عمل کیا اسطرح حضرت سیدہ کی وصیت پر بھی عمل ہو گیا۔ یہ وصیت پر وصیت اس لئے ہے کہ حضرت سیدہ اور حضرت ابوالعاص حضرت علی کے معاملات زوجیت سے بے حد خوش تھے۔ اور ان سے زیادہ مناسب کوئی شوہر ان کی نگاہ میں نہ تھا۔

پیغمبرانہ زندگی کا بہترین مظہر

امام سفیان بن عیینہ جو حدیث کے نہایت بلند پایہ امام ہیں اور امام بخاری وغیرہ کے شیخ الشیوخ ہیں، فرماتے ہیں:

لان علیا رضی اللہ عنہ کان ازھد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔	علی رضی اللہ عنہ صحابۂ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں سب سے بڑے زاہد تھے۔

(عوارف المعارف علی احیاء العلوم ج ۲ ص ۲۱۳)

اس سے سیدنا حضرت علی کے زہد و ورع کا تصور کرو، اور حضرت سیدہ علیہا السلام کا زہد و ورع بھی پیغمبرانہ زندگی کا کامل ترین مظہر تھا۔ خود رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقدس تربیت نے ان دونوں حضرات کو اس سانچے میں ڈھال دیا تھا۔

جیسے زہد و قناعت کی وجہ سے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو متواتر کئی کئی فاقے ہو جاتے، اسی طرح حضرت علی اور حضرت فاطمہ کو بھی ہو جاتے تھے۔ ایک بار آپ ایک صحابی کے یہاں تشریف لے گئے۔ انہوں نے بکری ذبح کی اور دعوت کا انتظام کیا۔ کھانا سامنے آیا تو آپ نے ایک روٹی پر تھوڑا سا گوشت رکھ کر فرمایا فاطمہ کو بھجوا دو، کئی روز سے اس کو کھانا نصیب نہیں ہوا

ہے۔ (صحیح مسلم ج ۲ ص ۱۵۰ باختصار)

حضرت فاطمہ کا زہد و قناعت اور فقر و ورع حد درجہ موثر ہے اور اس سے دل پر بڑا گہرا اثر پڑتا ہے اس کا نہایت مختصر بیان ایک فاضل کے الفاظ میں یہ ہے:

حضرت سیدہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبوب ترین اولاد تھیں اور اسلام نے رہبانیت کا قلع قمع کر دیا تھا، اور فتوحات کی کثرت مدینہ منورہ میں مال و زر کے خزانے لٹا رہی تھی، لیکن جانتے ہو کہ اس میں جگر گوشۂ رسول کا کتنا حصہ تھا؟ اس کا جواب سننے سے پہلے آنکھوں کو اشکبار ہو جانا چاہیئے۔

سیدۂ عالم کی گھریلو زندگی یہ تھی کہ چکی پیستے پیستے ہاتھوں میں چھالے پڑ جاتے تھے، گھر کے تمام کام خود انجام دیتی تھیں۔ کپڑے کی اتنی کمی تھی کہ جھاڑو دینے اور چولھے کے پاس بیٹھنے سے کپڑے دھوئیں سے سیاہ ہو جاتے تھے، لیکن جب انہوں نے ایک بار آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ تکلیف بیان فرمائی اور مال غنیمت میں سے کچھ طلب فرمایا تو ارشاد ہوا۔ "جان پدر بدر کے یتیم تم سے پہلے اس کے مستحق ہیں"۔ اس کے بعد حضرت سیدہ کے زہد و ورع اور فقر و قناعت کا معیار حد درجہ بلند ہو گیا۔

ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت سیدہ کے پاس تشریف لائے، دیکھا کہ ناداری سے اس قدر چھوٹا دوپٹہ اوڑھا ہے کہ سر ڈھانکتی ہیں تو پاؤں کھل جاتے ہیں اور پاؤں چھپاتی ہیں تو سر برہنہ رہ جاتا ہے۔ ؎

الیسی کٹی ہے آلِ پیمبر کی زندگی [1]

یہ ماجرا ہے دخترِ خیر الانام کا (علامہ شبلی)

---

[1] یہ مصرع دراصل اس طرح تھا "یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی" ترمیم کمترین نے کی ہے۔ ۱۲ کوثر

آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس کا ہمیشہ اہتمام تھا کہ آپ کی ذریت طاہرہ تکلفات دنیا سے بے تعلق رہے۔ ایک بار آپ کسی غزوہ سے تشریف لائے۔ حضرت سیدہ نے خیر مقدم میں دروازے پر پردے لگا دیئے تھے۔ حضور حسب معمول حضرت سیدہ کے یہاں تشریف لائے مگر اس دنیوی تکلف کو دیکھ کر واپس چلے گئے۔ حضرت سیدہ کو حضور کی ناپسندیدگی کا علم ہوا تو دروازہ سے پردہ کا کپڑا اتار کر چاک کر ڈالا، اس سے آپ کی ناراضگی دور ہوئی اور فرمایا :۔

"میں نہیں چاہتا کہ میرے اہل بیت زخارف دنیا سے تعلق رکھیں۔"

مناقبِ سیّدہ کی چند احادیث کی مختصر تشریح

حضرت سیّدہ تمام مومن عورتوں کی سردار ہیں

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے ارتحال کے وقت حضرت سیدہ سے فرمایا ہے:

اما ترضین ان تکونی سیدۃ نساء اھل الجنہ، اونساء المؤمنین	کیا تم اس سے شادکام نہیں ہو کہ تم جنتی عورتوں کی سردار ہو، یا یہ فرمایا۔ تمام مومن عورتوں کی سردار ہو۔
(بخاری ج ۱ ص ۵۱۲)	

مستدرک کی روایت بڑی واضح ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں:

الا ترضین ان تکونی سیدۃ نساء العالمین، وسیدۃ نساء المؤمنین وسیدۃ نساء ھذہ الامۃ	کیا تم اس سے شادکام نہیں ہو؟ کہ تم تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہو، تمام مومن عورتوں کی سردار ہو اور اس امت کی عورتوں کی بھی سردار ہو۔
(خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۲۶۵)	

حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی سیّدۃ نساء العالمین کی شرح میں فرماتے ہیں۔

بدانکہ ایں حدیث دلالت دار د بر فضل فاطمہ بر تمامہ نساء مومنات حتی ازمریم وآسیہ، وخدیجہ، وعائشہ ہمچنیں گفتہ است سیوطی۔	اس کو جان لو کہ یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ حضرت فاطمہ کو تمام مومن عورتوں پر فضیلت حاصل ہے حتیٰ کہ مریم وآسیہ، اور خدیجہ وعائشہ پر بھی۔ ایسا ہی کہا ہے

(اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۶۸۴)　　　　　(امام اسیوطیؒ نے

حضرت شیخ محدث دہلوی نے جو فرمایا ہے، وہی صحیح ہے، واقعی حضرت سیدہ اور نوا در حضرت مریم سے بھی افضل ہیں، جن کو بعض لوگوں نے نبی تک مانا ہے، حالانکہ وہ نبی نہ تھیں یہ ضرور ہے کہ فرشتہ ان کے پاس آکر خود اُن کے متعلق کچھ دینی ہدایات دے گیا ہے مگر اتنے سے کوئی نبی نہیں ہوتا۔ نبی تو وہ ہے جس پر امت کی ہدایت اور تبلیغ کی وحی ہوئی ہو، مگر اس سے اتنا تو یقینی ہے کہ حضرت مریم میں بڑی امتیازی شان ہے لیکن حضرت سیدہ فاطمہ ان سے

لہ اس سلسلہ میں حضرت شیخ نے اور بھی مفید باتیں لکھی ہیں، جن کا ماحصل یہ ہے۔

بعض حدیثوں میں ہے کہ (حضرت) فاطمہ زہراؓ کو تمام عورتوں پر فضیلت ہے، مگر حضرت مریم کو مستثنیٰ کر دیا گیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ اس امت میں فاطمہ ایسی ہیں کہ جیسی مریم اپنی امت میں تھیں یعنی حضرت فاطمہ اس امت کی تمام عورتوں میں اسی طرح سب سے افضل ہیں جیسے حضرت مریم اپنے عہد کی تمام عورتوں میں سب سے افضل تھیں ـــ ان حدیثوں سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ کو تمام عورتوں سے افضل ہیں مگر حضرت مریم سے افضل نہیں ہیں، لیکن اوپر کی حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ بلا استثنا تمام عورتوں سے افضل ہیں۔

اس اختلاف کو حضرت شیخ جس طرح حل فرماتے ہیں اس کا خلاصہ تعبیر میں ذراسی تبدیلی واضافہ کے بعد یہ ہے:

فضائل و مراتب میں ترقی ہوا کرتی ہے۔ حضرت سیدہ پہلے اس درجہ پر تھیں کہ حضرت مریم کو چھوڑ کر باقی تمام عورتوں سے افضل تھیں۔ اس وقت حسب اطلاع ربانی حضور نے یہ فرمایا کہ فاطمہ مریم کو چھوڑ کر تمام عورتوں سے افضل ہیں۔ آخر میں حضرت فاطمہ اس درجہ پر فائز ہوئیں کہ حضرت مریم سے بھی افضل ہو گئیں اس وقت آپ نے حسب اطلاع ربانی حضرت فاطمہ سے یہ فرمایا "کیا تم اس پر شاد کام نہیں ہو کہ تم تمام عالم کی عورتوں سے افضل ہو" واضح ہو کہ یہ فضیلت آخر میں حاصل ہوئی ہے۔ چنانچہ حضرت سیدہ کے ارتحال سے محض چھ ماہ پہلے اس روز آپ کو یہ بشارت ملی ہے جس کے ایک ہی دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رحلت فرمائی ہے۔ ۱۲ کوثر

بھی افضل ہیں۔ ثبوت ہے وہ حدیث جس میں بلا استثنا حضرت فاطمہ زہرا کو تمام عالم کی عورتوں کا سردار فرمایا گیا ہے۔ اس حدیث کی بنا پر حضرت سیدہ حضرت مریم سے بھی افضل ہیں۔ اور اس میں بحث کی کوئی گنجائش نہیں کہ حضرت سیدہ افضل ہیں یا حضرت خدیجہؓ یا حضرت عائشہؓ نیز حقائق بھی بول رہے ہیں کہ حضرت سیدہ ہی افضل ہیں۔ اور محققین نے بھی یہی کہا ہے۔ امام سیوطی نے مباحث کا جائزہ لینے کے بعد تصریح کر دی کہ:

"صحیح تر بات یہی ہے کہ حضرت فاطمہ حضرت عائشہ سے افضل ہیں"۔ (حاشیہ بخاری ج ۱ ص ۵۳۲ و اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۶۸۴)

امام سبکی نے کتنی صحیح اور متوازن بات فرمائی ہے:۔

نختار وندین الله به ان فاطمه افضل، ثم امها خدیجه ثم عائشة [1]

ہم اسی بات کو اختیار کرتے ہیں اور ہمارا دین یہی ہے کہ حضرت فاطمہ افضل ہیں، ان کے بعد ان کی والدہ ماجدہ حضرت خدیجہ، ان کے بعد حضرت عائشہ۔

پوری تاریخ انسانی میں صرف چار عورتیں کمالات کے اس درجہ پر فائز ہیں جس کے آگے عورت کے لئے کوئی درجہ ہی نہیں۔ ان میں ایک حضرت سیّدہ ہیں۔

یوں تو دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر عورتیں ہیں لیکن کمالات انسانی کا سب سے اونچا مقام وہ ہے جس کے بعد صرف نبوت کا درجہ ہے اس مقام پر پوری تاریخ انسانی میں صرف چار عورتیں فائز ہیں۔ (۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ حضرت مریم صدیقہ عظمیٰ۔ (۲)

---

[1] حاشیہ بخاری ج ۱۔ ص ۵۳۲۔ اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۵۸۵ میں امام سبکی کا یہ قول بزبان فارسی درج ہے۔ ۱۲ کوثر۔

فرعون کی بیوی حضرت آسیہ صدیقۂ عظمیٰ (۳) ام المومنین حضرت خدیجہ صدیقۂ کبریٰ (۴) سیّدۂ عالم، صدیقۂ کائنات، بضعۃ الرسول حضرت فاطمہ زہرا (رضی اللہ عنھن) سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۲۹ میں ہے:

حسبك من نساء العالمين مريم بنت عمران، وخديجة بنت خويلد، وفاطمة بنت محمد، وآسية امرأة فرعون	(اقتدا کے لئے) تمام دنیا کی عورتوں میں مریم، خدیجہ، فاطمہ اور آسیہ کافی ہیں۔

اس میں اشارہ ہے کہ بس یہی چار عورتیں اعلیٰ درجہ کے کمالات زہد و ورع، انابت الی اللہ، دنیا کے بجائے آخرت کے اہتمام اور تقرب الٰہی میں سب سے ممتاز ہیں۔ شارحین حدیث نے بھی اس کی شرح میں کچھ ایسا ہی لکھا ہے۔ مرقات میں ہے۔

يكفيك من نساء العالمين الواصلة الى مراتب الكاملين فى الاقتداء بهن وذكر مناقبهن وزهدهن فى الدنيا واقبالهن فى العقبٰى (حاشیہ ترمذی ص ۲۲۹)	یہ چار عورتیں جو کاملین کے درجہ پر فائز ہیں بس کافی ہے کہ انھیں کی اقتدا کرو۔ ان کے مناقب و محاسن کو یاد کرتے رہو اور اس کو بھی کہ دنیا کے بجائے آخرت ہی کی طرف ان کا رجحان و اہتمام ہے۔

انھیں خوبیوں کی بنا پر تمام جنتی عورتوں میں انھیں چار کو حدیث میں سب سے افضل فرمایا گیا ہے۔ مستدرک میں ہے۔

افضل نساء اهل الجنة، خديجة وفاطمه ومريم وآسيه[1] (التاج الجامع ص ۳۴۹)	جنتی عورتوں میں سب سے افضل چار عورتیں ہیں، خدیجہ، فاطمہ، مریم اور آسیہ

ان چار عورتوں میں برتری حضرت سیدہ بضعۃ الرسول (صلی اللہ علیہ وعلیہا) ہی کو حاصل

---

[1] یہ حدیث مسند احمد میں بھی ہے (خصائص کبریٰ، سیوطی ج ۲ ص ۲۶۵) کوثر

ہے، جیسا کہ گذشتہ فصل میں لکھا گیا ہے۔

یہ کتنی بڑی فضیلت ہے کہ حضرت سیدہ بضعۃ الرسول ہیں

جس کی بنا پر آپ بے حد مقرب الٰہی ہیں، علمائے طریقت نے تقرب الٰہی کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔ (۱) قرب الفرائض (۲) قرب النوافل۔ (۳) قرب الوجود۔ اول و دوم کا ذکر ایک حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔

ما تقرب الیّ عبد بشیٔ احبّ الیّ مما افترضت علیه، وما یزال عبدی یتقرب الیّ بالنوافل حتیٰ احببته، فاذا احببته فکنت سمعه الذی یسمع به، وبصره الذی یبصر به، ویده التی یبطش بها، ورجله التی یمشی بها وان سألنی لاعطینه، ولئن استعاذنی لاعیذنه۔

(مشکوٰۃ ص ۱۹۷ بحوالہ بخاری)

میرے کسی بندہ نے کسی ایسی چیز سے میرا تقرب حاصل نہیں کیا جو میرے مقرر کئے ہوئے فرائض سے بڑھ کر مجھے محبوب ہو، میرا بندہ نوافل کے ذریعہ مسلسل میرا تقرب حاصل کرتا رہیگا تو میں اس سے محبت کرنے لگوں گا اور جب اس سے محبت کروں گا تو یہ بات نصیب ہوجائے گی کہ اب میرا نور اس کا کان[1] ہے جس سے وہ سنتا ہے میرا نور اسکی نظر ہے جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میرا نور اس کا ہاتھ ہے جس سے وہ پکڑتا ہے اور (لیتا) ہے اور میرا نور اس کا قدم ہے جس سے وہ گامزن ہوتا ہے۔ اگر یہ بندہ مجھ سے کچھ بھی مانگے تو میں اسے ضرور دوں گا اور اگر میری پناہ کا طلبگار ہے تو میں اسے اپنی پناہ میں رکھوں گا۔

---

[1] لفظی ترجمہ یہ ہے "میں اس کا کان بن جاتا ہوں، اس کی نظر بن جاتا ہوں" اسی طرح باقی دو اعضاء کے لئے بھی یہی تعبیر ہے، لیکن لفظی ترجمہ مراد نہیں ہے اس کا ایک مفہوم وہ ہے جو راقم السطور نے ترجمہ میں پیش کیا ہے۔ ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ نوافل پر مواظبت کرنے سے وہ قرب الٰہی نصیب ہوجاتا ہے کہ بندہ کے اعمال رضائے الٰہی میں فنا ہوجاتے ہیں=

اس حدیث میں قربِ فرائض کا اشارۃً وضمناً اور قربِ نوافل کا صراحتہً ذکر ہے، ان دونوں کی تشریح حسبِ ذیل ہے۔

۱۔ اللہ کے مقرر کردہ فرائض کو حسنِ نیت، اخلاص اور حسن وخوبی سے ادا کیا جاتا ہے، تو ایک خاص تقرب نصیب ہوتا ہے اسی کا نام ہے **قربِ فرائض**۔

۲۔ فرائض کے علاوہ نفلی کام بھی حسنِ نیت، اخلاص اور حسن وخوبی سے کئے جائیں تو قربِ محبت نصیب ہوتا ہے اسی کا نام ہے **قربِ نوافل**۔

قربِ فرائض اور قربِ نوافل کے علاوہ ایک اور تقرب ہے جسے قربِ وجود کہتے ہیں۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ کا وجود ہی قربِ الٰہی کا حامل ہے کہ اس کا خمیر اور طینت نہایت پاکیزہ، اس کا جوہر نہایت مقدس اور اس کی ذات میں پیغمبر کا جزو موجود ہے۔ ایسا شخص اللہ کا ایسا محبوب اور مقرب بندہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ ایسے نہیں ہوسکتے کیونکہ اس میں جزویتِ نبوی ہے۔

= حتیٰ کہ وہ وہی دیکھتا ہے اور سنتا ہے جس کے دیکھنے اور سننے میں اللہ کی خوشنودی ہے اور وہی چیز ہاتھ میں لیتا ہے اور ہاتھ وہی کام کرتا ہے جس میں اللہ کی مرضی ہے، نیز وہیں قدم اٹھاتا ہے جہاں جانے میں رضائے الٰہی ہے۔ پھر یہ باتیں اس طرح ظہور میں آتی ہیں کہ یہ افعال رضائے الٰہی کا پورا ظل ہیں حتیٰ کہ اگر بالفرض خود باری تعالیٰ بلا واسطہ ان افعال کو صادر فرماتا تو یہ بالکل وہی ہوتے کچھ فرق نہ ہوتا۔

میری مرضی ان کی مرضی ایک ہے   مطلب ومقصود یعنی ایک ہے

یہی حقیقت ہے قربِ نوافل کی اور اسی کو فنا وبقا کہتے ہیں۔ قربِ نوافل کے ان دونوں پہلوؤں پر حضور غوثِ اعظم سیدنا وشیخنا شیخ عبدالقادر جیلانی، محبوبِ سبحانی رضی اللہ عنہ نے فتوح الغیب شریف کے مقالہ ۶ میں بڑی ایمان افروز روشنی ڈالی ہے۔ اور اس کی شرح صفحہ ۴۲ میں شیخ محدث دہلوی نے بڑے دل آویز حقایق بیان کئے ہیں۔ یہ حاشیہ زیادہ تر فتوح الغیب اور اس کی شرح سے ماخوذ ہے۔ ۱۲ کوثر۔

حدیث میں جو حضرت سیدہ کے متعلق فرمایا گیا ہے :

فاطمۃ بضعۃ منی ، من اغضبہا فقد اغضبنی[1]	فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے جس نے اسے ناراض کیا اس نے مجھے ناراض کیا ۔

اس میں یہی حقیقت ہے کہ اس میں جزویت نبوی ہے اور اسی کا نام ہے قرب وجود جس کو یہ شرف بخشا گیا اس کا ہم پایہ کون ہو سکتا ہے ۔؟ اسی لئے تو امام مالک نے فرمایا ہے ۔

لا افضل علی بضعۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم احدًا	میں بضعۃ الرسول سے افضل کسی کو نہیں کہتا

اور اسی بنا پر شیخ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات (ج ۴ ص ۶۸۴) میں لکھتے ہیں ۔

ہا ہیچ کس بحسب شرف ذات وطہارت طینت وپاکی جوہر بفاطمہ وحسنین نرسد	کوئی شخص شرف ذات ، طینت وخمیر کی پاکیزگی اور جوہر کی تطہیر میں حضرت فاطمہ اور حضرات حسنین کے درجہ پر نہیں پہنچ سکتا ۔

اس بنا پر حضرت سیدہ کا سب سے بڑا شرف اور سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ وہ بضعۃ الرسول ہیں ، اس کا ترجمہ لوگوں نے جگر پارہ اور جگر گوشہ کیا ہے ۔ شیخ عبدالحق محدث دہلوی گوشت پارۂ رسول کہتے ہیں ۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۶۸۵)

حضرت سیدہ علیہا السلام کی اس فضیلت پر علامۂ ہند حضرت علامہ غلام علی آزاد بڑی عقیدت سے فرماتے ہیں ۔

دی یکے گفت دختر صدیق | بہتر از دخت سید البشر است
مصرعۂ در جواب او گفتم | رشتۂ دیگر رگ جگر دگر است

ترجمہ : کل رات ایک شخص نے کہا ، " حضرت ابوبکر صدیق کی صاحبزادی (حضرت عائشہ)

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۵۲۶ و ۲۳۲ ۔ کوثر

رسول خدا سیدالبشر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی صاجزادی (حضرت فاطمہ) سے بہتر ہیں "

میں نے اس کے جواب میں ایک مصرع کہا: رشتہ دیگر رگ جگر دگراست. یعنی رشتہ شے دیگر ہے اور رگِ جگر کچھ اور ہے.

حضرت سیدہ علیہا السلام کو جس طرح بہترین اور اعلیٰ ترین قرب وجود کا شرف حاصل ہے اسی طرح بہترین قرب فرائض اور اعلیٰ ترین قرب نوافل کے فضائل سے بھی اللہ نے آپ کو نوازا ہے. یہ حقیقت ہے کہ تینوں تقرب کی بہترین جامعیت آپ ہی میں ہے. اس میں اللہ کی بے شمار مصلحتیں ہیں. ایک مصلحت یہ ہے کہ حسنین علیہما السلام جن سے ذریت طاہرہ اور بہترین اولیائے امت کا سلسلہ جاری ہے اور جو قرب فرائض و قرب نوافل کے امام ہیں ان کی تربیت کے لئے ایسی ہی جامع الفضائل ۔ مادر مہربان کی گود چاہیئے. حضرت سیدہ کا زہد و ورع انابت الی اللہ، شفقت، خلق، ایثار، صبر وتحمل، کثرت عبادت، دنیا کے بجائے آخرت کا اہتمام اور تقرب الٰہی کے اعمال میں دن رات مشغولیت اور ایسے ہی بکثرت محاسن و فضائل. شواہد حقہ اور دلائل ناطقہ ہیں کہ آپ قرب فرائض اور قرب نوافل کے اس مقام پر فائز ہیں جس کی مثال پیش کرنے سے پوری تاریخ نسوانی درماندہ ہے۔

اللہ کا درود وسلام ہو رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اور آپ کی فاطمہ زہرا سیدۂ عالم پر۔

فضائلِ امامِ حسن

علیہ السّلام

جس کو امام حسن علیہ السلام سے محبت ہے اس پر اللہ کا پیار!

حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
نے
حضرت امام حسن علیہ السلام
کو
گلے لگا کر
یہ دعا مانگی ہے

اللّٰھُمَّ انی احبہ فاحبہ واحب من یحبہ

(صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۸۲ - باب فضائل الحسن والحسین)

یا اللہ میں اس کو پیار کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما۔ اور جو اس سے محبت رکھے اس سے بھی محبت فرما

حیاتِ امام حسن علیہ السلام کا ایک باب

نام ونسب

آپ کا نام نامی حسن مشہور عالم ہے اور خود رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رکھا ہے، ابو محمدؑ کنیت ہے اور سیدُ شباب اہل الجنۃ اور ریحانۃ النبی لقب ہے، والد ماجد حضرت علی، اور والدہ ماجدہ بضعۃ الرسول سیدۂ عالم حضرت فاطمہ زہرا ہیں یعنی آپ کے نانا شہنشاہِ کونین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

ولادت

سنہ ۳ھ ماہ مبارک رمضان شریف میں آپ کی ولادت ہوئی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بشارت دی گئی۔ آپ فوراً تشریف لائے، بچہ کو منگوا کر داہنے کان میں اذان کہی اور بائیں کان میں تکبیر اور کچھ اس پیغمبرانہ انداز سے کہی کہ اذان و تکبیر کے کلمات امام حسن کے پوری زندگی کے محور بن گئے۔ اور اسی محور پر آپ کے تمام اعمال زندگی گردش کرتے رہے ہیں۔

امام حسن عہد نبوی میں

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان دونوں مقدسوں کو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جتنا پیار کرتے اور ان سے جتنی محبت کرتے وہ محبت کا آخری مقام ہے۔ آپ نے بڑے پیار سے ان دونوں شہزادوں کی پرورش فرمائی اور اپنی پیغمبرانہ تربیت کے اعجاز سے ان کو فضائل انسانی کے اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا کہ تمام جوانان فردوس ان کے زیر سایہ رہ کر اپنی ایمانی تکمیل کرتے ہیں اور اسی راہ سے درجہ کمال پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ تمام جوانانِ فردوس کے امام اور سردار ہیں۔

یہ نتیجہ ہے سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے نظیر تربیت کا !

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین کی معمولی سے معمولی تکلیف سے بے چین ہوجاتے اور بغیر ان کو دیکھے چین نہ آتا ان کو دیکھنے کے لئے روزانہ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے جاتے، انھیں اکثر دوش مبارک پر سوار کرتے۔

آپ سجدہ میں ہوتے کہ امام حسن یا امام حسین پشت مبارک پر سوار ہوجاتے جب تک یہ سوار رہتے آپ سجدہ سے سر نہ اٹھاتے کہ مبادا گر نہ پڑیں۔

ارتحال نبوی کے وقت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات کے زمانہ میں حضرت حسن علیہ السلام ۷ سال اور تقریباً چھ ماہ کے تھے اور امام حسین علیہ السلام ۶ سال اور تقریباً ۷ ماہ کے تھے۔ اس زمانہ کے آخری لمحات میں حسنین پاک کے معصوم دلوں کے اندر غم واندوہ کا جو طوفان برپا تھا، اس کا بیان مورخ کے قلم وزبان کی طاقت سے باہر ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اپنے ان ایام میں اپنے ان بے حد محبوب نواسوں کا حد درجہ لحاظ فرماتے تھے۔ امام طبرانی اپنی معجم میں، حافظ ابن حجر اصابہ اور تہذیب التہذیب میں، نیز متعدد محدثین اپنی اپنی تالیفات میں لکھتے ہیں کہ :

> حضرت فاطمہ زہرا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مرض وفات میں حسن اور حسین کو لے کر آئیں۔ اور کہا "یا رسول اپنے ان دونوں بچوں کو اپنی وراثت (یعنی وراثت نبوت عطا فرمایئے۔"

آپ نے فرمایا۔

> حسن کو اپنی ہیئت اور سرداری دی،
> اور حسین کو اپنی بہادری اور فیاضی دی۔

علامہ زرقانی نے بھی شرح مواہب لدنیہ (ج ۳ ص ۲۳۶) میں حافظ ابن مندہ اور حافظ

ابو نعیم کے حوالے سے اس واقعہ کو نقل کیا ہے لیکن اس میں ہیئت کے بجائے ہیبت ہے الفاظ یہ ہیں :

اما الحسن فلہ ھیبتی وسوددی — حسن کو میری ہیبت اور سرداری ہے

واما الحسین فلہ جرأتی وجودی — اور حسین کو شجاعت اور فیاضی ہے

ارتحال نبوی سے حسنین پاک پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا ۔

عہد صدیقی میں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت صرف دو سال ہے جس میں آپ نے حسنین کریمین علیہما السلام کے حقوق پیغمبرزادگی کا پورا لحاظ رکھا ہے، حتیٰ کہ اور لوگوں سے بھی فرماتے تھے، ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھنا۔ اس سلسلے میں آپ کا یہ جملہ مشہور ہے جو صحیح بخاری میں بھی ہے۔

ارقبوا محمداً فی اھل بیتہ — اہل بیت کے معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس ولحاظ رکھنا۔

(ج ا ص ۵۲۶ و ۵۳۰)

ایک روز حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت امام حسن علیہ السلام کو جوش محبت میں اپنے کندھے پر سوار کر لیا۔ اور اسی عالم محبت میں یہ شعر موزوں کیا، جو آپ کی زبان پر بے ساختہ جاری ہو گیا۔

بابی شبیہ بالنبی — لیس شبیہ بعلی

ترجمہ : میرے باپ کی قسم یہ تو نبی کے مشابہ ہیں، علی کے مشابہ نہیں ہیں۔

عہد فاروقی میں

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا دور خلافت دس سال چھ ماہ تک رہا۔ اس عہد کے وسط میں سیدنا حضرت امام حسن اور سیدنا حضرت امام حسین علیہما السلام پورے جوان ہو چکے تھے، پورا عہد فاروقی امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کی تعلیم و تربیت کا عہد شباب تھا۔ اس دور میں ان دونوں مقدسوں

نے اپنے والد بزرگوار سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم سے قرآن وسنت اور ان کے معارف وحقائق کی مکمل تعلیم حاصل کی اور آپ کی مقدس وروحانی تربیت سے جس کی بنیاد خود رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ڈال چکے تھے، امت کے یہ دو نوشہزادے قرآن حکیم کے سانچے میں ڈھل کر حدیث ثقلین کے پورے مصداق بن گئے کہ جو شخص قرآن مجید اور ان دونوں اماموں اور ان کے والد بزرگوار سے وابستہ ہو جائے وہ کبھی غلط راستے پر پڑ ہی نہیں سکتا، کیونکہ قرآن مجید سے ان کا رابطہ ایسا لاینفک ہے کہ نہ یہ کبھی قرآن سے جدا نہ قرآن ان سے الگ جیسا کہ حدیث ثقلین کا بیان ہے۔ یعنی جہاں ان کا دامن تھا، قرآن مجید کا عروۃ وثقیٰ ہاتھ میں آ ہی گیا اور کیوں نہ ہو، ایک طرف یہ دونوں حضرات خمیر نبوی سے بنے تھے اور تمام کمالات وفضائل کا جوہر اس جامعیت اور اعلیٰ ترین صلاحیت کے ساتھ ان میں ودیعت تھا ہی جیسا کہ خمیر نبوی کا تقاضا ہے۔ دوسری طرف حضرت علی جیسے باب علم وحکمت تمام شفقت پدری کے ساتھ ان کی تعلیم فرما رہے ہیں اور نبی اعظم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان کی بے نظیر تربیت کی جو بنیاد رکھی تھی دن رات اس کی تکمیل کرا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے یہ دونوں لال علم نبوی اور کمالات رشد وہدایت کے اس مقام بلند پر فائز ہو گئے کہ خود علم وکمال پکار اٹھے:

> یہ ہیں سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے لال۔ اور بجز خصوصیات نبوت آپ کے تمام کمالات کے وارث۔

خلافت کے لئے شروع میں جو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کا انتخاب نہ ہوا اس کی متعدد مصلحتوں میں سے ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ آپ کو حسنین عظیمین کی تعلیم وتربیت کا پورا موقع مل گیا اسی طرح اور بھی متعدد قابل جوہروں کو اپنی تعلیم وتربیت کی آغوش عاطفت میں لے کر یکتائے روزگار بنانے کے مواقع مل گئے۔

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرات حسنین علیہما السلام کا بے حد لحاظ کرتے تھے چنانچہ

ان کا وظیفہ تمام صحابہ کے فرزندوں سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ بدری صحابہ کے فرزندوں کا وظیفہ دو دو ہزار تھا مگر حضرات حسنین کا وظیفہ پانچ ہزار تھا۔

عہدِ عثمانی میں اس دور میں امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کا شباب نہایت پختہ ہو چکا تھا۔ اب ان دونوں حضرات نے جہاد میں بھی حصہ لیا۔

چنانچہ ۳۰ھ میں طبرستان کے جہاد میں ان دونوں مقدسوں نے بھی شرکت فرمائی

بلوائیوں نے جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا محاصرہ کر لیا تھا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم نے حسنین علیہما السلام کو حضرت امیر المومنین کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ ان دونوں شاہزادوں نے دروازہ پر کھڑے ہو کر بلوائیوں کو اندر گھسنے سے روکا۔ جدھر نبی کے یہ دونوں لال تھے، ادھر سے کوئی بھی اندر نہ گھس سکا۔ سب ناکام ہو گئے۔ اب دوسری طرف سے دو بدبختوں نے اندر جا کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ اگر حضرات حسنین کی طرح بنی امیہ وغیرہ کے نوجوان بھی مکان کے ہر طرف ہوتے تو یقیناً بلوائی ناکام رہتے۔

معرکہ جمل میں معرکہ جمل کے سلسلہ میں سیدنا امام حسن علیہ السلام نے دین و ملت اور حفاظت خلافت کی نہایت شاندار خدمت انجام دی ہے

چنانچہ حضرت عمار بن یاسر کے ہمراہ کوفہ پہنچ کر جامع مسجد میں بغاوت کے دفاع پر نہایت موثر تقریر فرمائی جس نے امیر المومنین کے تعاون کے لئے دلوں کو گرما دیا اور حضرت عمار بن یاسر نے بھی تقریر فرمائی۔ یہ جملے بڑے موثر تھے: لوگو! فرمان الٰہی ہے۔

أَطِيعُوا اللّٰهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ	اطاعت کرو اللہ کی اور اطاعت کرو رسول کی
وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ج	اور اپنے اولی الامر (یعنی امیر المومنین کی

"لوگو عائشہ یقیناً زوجۂ رسول ہیں لیکن اس معاملہ میں اللہ تمہارا امتحان لینا چاہتا ہے کہ تم عائشہ کی اطاعت کرتے ہو کہ اللہ کی"

غرض سیدنا امام حسن اور سیدنا عمار بن یاسر رضی اللہ عنہما کی تقریروں کا اتنا اثر ہوا کہ

دس ہزار کی جمعیت امیرالمومنین کا تعاون کرنے کے لئے کھڑی ہوگئی، اور یہ جاں باز بہادر مقام ذی قار میں امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ الکریم کی فوج میں شامل ہوگئے۔

معرکہ جمل میں فوج حیدری کے میمنہ کے افسر سیدنا امام حسن علیہ السلام تھے اور میسرہ کے سیدنا امام حسین علیہ السلام۔

معرکہ صفین میں اسمیں بھی آپ نے شجاعت حیدری کے جوہر دکھائے اس معرکہ میں التوائے جنگ کا جو معاہدہ نامہ لکھا گیا تھا اس پر گواہ کی حیثیت سے آپ اور امام حسین کے بھی دستخط ہیں۔

معرکہ نہروان اس معرکہ میں بھی آپ نے بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا تھا۔

شیر خدا کی شہادت اور وصیت ۴۰ھ میں حضرت علی کی شہادت شقی ابن ملجم کی ضرب کاری سے ہوئی۔ شہادت سے پہلے شیر خدا نے حضرات حسنین اور دیگر اہل بیت نیز تمام مسلمانوں کو جو وصیت کی ہے وہ نہایت قیمتی ہے، اس پر سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہما السلام عمر بھر کاربند رہے۔ وصیت کے چند اجزا یہ ہیں۔

(۱) اللہ سے ہمیشہ ڈرنا (۲) دنیا تم کو کتنا ہی چاہے مگر اس سے ہمیشہ بے تعلق رہنا (۳) جو چیز ہاتھ سے جاتی رہے اس کا صدمہ اور فکر نہ کرنا۔ (۴) کار خیر ہمیشہ کرنا (۵) ظالم کا مقابلہ اور مظلوم کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جانا (۶) میرے قصاص میں صرف میرا قاتل قتل کیا جائے کسی اور کو ہرگز نہ قتل کیا جائے۔

خلافت حسنی حضرت شیر خدا سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کی شہادت کے بعد انصار و مہاجرین اور عمائد اسلام نے سیدنا امام حسن علیہ السلام کو خلیفہ منتخب کیا۔

آپ کا پہلا خطبۂ خلافت آپ کا یہ خطبہ نہایت اہم ہے۔ اس میں آپ نے نہایت

مفید باتوں کی تعلیم دی ہے اور یہ بھی فرمایا ہے کہ :

لوگو! کل تم سے ایسے شخص رخصت ہوئے ہیں کہ نہ اگلے ان سے بڑھ سکے، نہ پچھلے ان کا مقام پا سکیں گے۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جھنڈا دیکر غزوات میں روانہ فرماتے تھے۔ وہ کسی معرکہ سے ناکام نہیں لوٹے۔ جبریل و میکائیل ان کے جلو میں دائیں بائیں رہا کرتے تھے۔ مفاد اسلام کے لئے ان کو ایک غلام خریدنا تھا اس کے واسطے اپنے مقررہ وظیفے میں سے پس انداز کرتے ہوئے سات سو درہم، (تقریباً ۱۷۵ روپئے) جمع کئے تھے۔ اس کے علاوہ سونے چاندی کا ایک حبہ بھی انھوں نے نہیں چھوڑا۔

امام عالی مقام کے اس خطبہ کے بعد عام بیعت شروع ہوگئی۔ تمام دنیا میں آپ ہی خلیفۂ راشد تھے، امیر معاویہ محض ایک بادشاہ تھے، خلیفۂ راشد نہ تھے کہ کوئی بھی خلفائے راشدین میں ان کو شمار نہیں کرتا۔

امیر معاویہ کا حملہ اور صلح

امیر معاویہ شہادت عثمان کے بعد ہی سے تمام عالم اسلامی پر حکومت کرنے کا منصوبہ باندھا کرتے تھے لیکن سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے زمانہ میں ان کا منصوبہ کسی طرح پورا نہ ہو سکا۔ اب انھوں نے دیکھا کہ علی تو گذر گئے جن کی شجاعت کے سامنے کوئی ٹھہر نہ سکا۔ حسن سب کچھ ہوں مگر علی تو نہیں۔ اگر حملہ کرکے ان کو شکست دیدی تو پورے عالم اسلامی پر حکومت ہو جائے گی۔ اس کے پیش نظر انہوں نے نبی کے لال سیدنا امام حسن علیہ السلام پر فوج کشی کر دی۔ افسوس انہوں نے اس کا کچھ بھی خیال نہیں کیا کہ فرزند رسول جو رسول کے لخت جگر اور رسول کی جگہ پر ہیں، ان پر حملہ اور فوج کشی کرنا کیسا ہے؟ اور ان کی اولاد اس سے کیا اثر لے گی؟

امیر معاویہ نے پہلے عبداللہ بن عامر بن کریز کو حملہ کے لئے بھیجا۔ یہ شخص انبار پہنچا

پھر امیر معاویہ بھی فوج لے کر پہونچ گئے اور حضرت امام علیہ السلام کی طرف سے انبار کے حاکم حضرت قیس بن عامر کا محاصرہ کر لیا۔ اس کے بعد مدائن میں سیدنا امام حسن علیہ السلام کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس وقت حضرت امام کی خلافت کے چھ مہینے ہو رہے تھے۔ اس طرح خلافت راشدہ کی مدت جو تیس سال ہے ختم ہو رہی تھی، کیوں کہ عہد مرتضوی تک ۲۹ سال چھ ماہ ہو گئے تھے۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

الخلافة بعدی ثلاثون سنة ثم تکون ملکا عضوضا[1]۔ (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۲۸۵ ـ بحوالہ احمد ترمذی و ابو داؤد)	خلافت (نبوت) تیس سال تک رہے گی اسکے بعد کاٹ کھانے والی بادشاہت ہوگی یعنی اس کے ظلم و ستم سے لوگ مامون نہ رہیں گے۔" (اشعۃ اللمعات ج ۴ ص ۲۸۵)

---

[1] مشکوٰۃ مطبوعہ اصح المطابع دہلی میں عضوض کا لفظ نہیں ہے لیکن مشکوٰۃ کی شرح اشعۃ اللمعات جو حامل المتن ہے اس میں موجود ہے، ترمذی شائع کردہ امین کمپنی اردو بازار دہلی اور ابوداؤد شائع کردہ مطبع مجیدی میں بھی یہ لفظ نہیں ہے۔

متعدد کتب حدیث میں "ملک عضوض" کا لفظ موجود ہے، امام بیہقی اور امام ابونعیم اصفہانی حضرت عبداللہ بن الجراح اور حضرت معاذ بن جبل سے روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔ ان ھذا الامر بدأ نبوۃ ورحمۃ، ثم یکون خلافۃ ورحمۃ، ثم کائن ملکا عضوضا ثم کائن عتوا وجبریۃ وفسادا فی الامۃ یستحلون الفروج والخمور والحریر ویبصرون علی ذالک ویرزقون ابدا حتی یلقوا اللہ۔ (خصائص کبری ص ۱۱۶/۲)۔

امام بیہقی حضرت حذیفہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: انکم فی النبوۃ ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اذا شاء، ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ تکون ماشاء اللہ ان تکون ثم یرفعھا اذا شاء ثم یکون ملک عضوض ثم تکون جبریۃ ماشاء اللہ ان تکون، ثم یرفعھا اذا شاء ثم تکون خلافۃ علی منہاج النبوۃ، ۱۲ کوثر

حضرت امام حسن علیہ السلام کے لئے اب ناگزیر تھا کہ چھ ماہ تک خلافت کرنے کے بعد مسند خلافت چھوڑ دیں کہ چھ ماہ کے بعد خلافت نبوت نہ رہے گی بلکہ کٹ کھنی بادشاہت ہو جائے گی۔ لہٰذا آپ نے مسند خلافت چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ امیر معاویہ سے جنھوں نے ملک لینے کے لئے آپ پر فوج کشی کی ہے صلح کی گفتگو کریں تاکہ امیر معاویہ امام حسن علیہ السلام کی مقرر کردہ شرائط کے پابند بنائے جا سکیں اور ان کی پابندی کی بنا پر بہت حد تک ان کی حکومت کو غلط روی سے روکنے کے لئے ضابطہ کی بریک لگ سکے۔

امام صاحب کو مسند خلافت چھوڑنے سے پہلے اسلام اور امت کی فلاح کے لئے ایسا کرنا بے حد ضروری تھا، اس کی صورت یہی تھی کہ صلح نامہ مرتب ہو اور اس میں اس قسم کی شرطیں رکھ دی جائیں، گو خلافت سے دست بردار ہو کر صلح کرنے میں امام حسن علیہ السلام کے وقار کو بڑی ٹھیس لگ رہی تھی مگر آپ کے سامنے صلح حدیبیہ[1] کا نمونہ موجود

---

[1] صلح حدیبیہ ۶ھ کا واقعہ ہے۔ حدیبیہ مکہ معظمہ سے ایک منزل پر ایک گاؤں ہے حضور نے ۶ھ میں عمرہ کا ارادہ فرمایا۔ اور اس کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہوئے چودہ سو صحابہ بھی ہمرکاب ہوئے۔ قربانی کے اونٹ بھی ساتھ لے لئے تاکہ قریش کو کچھ اور خیال نہ ہو لیکن قریش نے قبائل عرب کو ملا کر محاذ قائم کر لیا تاکہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو مکہ میں آنے نہ دیا جائے گا۔ چند نیک مزاج لوگوں نے آپ کو اطلاع دی کہ آپ کو روکنے کے لئے قریش کی فوجوں کا سیلاب آ رہا ہے۔ آپ نے ان کے ذریعہ قریش کو کہلا بھیجا کہ ہم عمرہ کی غرض سے آئے ہیں۔ لڑنا مقصود نہیں بہتر ہے کہ قریش ایک معین مدت تک کے لئے ہم سے صلح کا معاہدہ کر لیں قریش کی طرف سے عروہ بن مسعود ثقفی بات کرنے آئے، لیکن کچھ طے نہ کر سکے۔ پھر قریش نے سہیل بن عمرو کو بھیجا بالآخر ذیل کی شرطوں پر صلح ہوئی۔

(۱) مسلمان اس سال واپس جائیں (۲) اگلے سال عمرہ ادا کرنے کے لئے آئیں۔ اور صرف تین دن رہ کر واپس جائیں (۳) ہتھیار لگا کر نہ آئیں، صرف تلوار ساتھ میں لائیں وہ بھی نیام میں اور نیام بھی تھیلے میں (۴) جو مسلمان مکہ میں رہتے ہیں ان میں سے کسی کو بھی اپنے ہمراہ نہ لے جائیں۔ (۵) ان میں سے اگر کوئی مسلمان مدینہ ==

تھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار مکہ سے ایسی صلح کر لی جس میں حضرت عمر جیسے دیدہ ور کو بھی نظر آرہا تھا کہ اس سے مسلمانوں کا وقار گر رہا ہے کہ کس قدر دب گئے ہیں نیز حدیبیہ میں جتنے صحابہ تھے سب کو اس کا ملال تھا۔ چنانچہ جب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے صلح نامہ کی بنا پر یہ اعلان فرمایا کہ جس عمرہ کے لئے ہم لوگ آئے ہیں اب وہ عمرہ ادا نہ کریں، بلکہ احرام کھول دیں اور قربانی کر کے مدینہ واپس چلیں۔ آئندہ سال اسی عمرہ کی قضا کریں گے۔ پھر تین بار آپ نے حکم دیا کہ عمرہ کا احرام اتار دو اور قربانی کر ڈالو مگر صحابہ اس صلح سے اتنے شکستہ دل تھے کہ تین بار حکم دینے کے باوجود کسی نے بھی عمل نہیں کیا اس سے آپ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ اور ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے اس کا شکوہ کیا۔ انہوں نے عرض کی: آپ کسی سے کچھ نہ فرمائیں بلکہ قربانی کے لئے نکلیں، قربانی کریں، اور

= جائے تو اس کو واپس کر دیں۔ اسی طرح مکہ کے غیر مسلم کو بھی، لیکن اگر کوئی مسلمان مکہ چلا آئے تو اہل مکہ اسے واپس نہ کریں گے۔ (۶) قبائل عرب کو اختیار ہوگا کہ فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں معاہدہ میں شریک ہو جائیں۔

یہ شرطیں بظاہر مسلمانوں کے سخت خلاف تھیں اور ان کو بڑا ملال ہوا۔ ابھی معاہدہ قلمبند نہیں ہوا تھا کہ حضرت ابو جندل جنکو اہل مکہ نے مسلمان ہونے کی بنا پر اتنا مارا تھا کہ بدن پر جا بجا زخم ہو گئے تھے۔ عین اسی وقت کافروں کی قید سے کسی طرح بھاگ کر زنجیر پہنے آئے اور آتے ہی گر پڑے سہیل نے کہا۔ محمد! ابو جندل کو شرائط صلح کے مطابق ہمیں حوالہ کر دو آپ نے اسے منظور فرمایا۔ حضرت ابو جندل نے پیٹھ پر سے کپڑا ہٹا کر مار کے زخم دکھائے اور کہا۔ برادرانِ اسلام کیا پھر مجھے اسی حالت میں دیکھنا چاہتے ہو؟ اور کافروں کے ہاتھ میں مجھے دے دو گے؟ کہ وہ مجھ پر ظلم کرتے رہیں۔ تمام مسلمان بے چین ہو گئے۔ حضرت عمر اس قدر بے قابو ہو گئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کہا۔ کیا ہم حق پر نہیں۔؟ آپ نے فرمایا ہم حق پر ہیں۔ پھر حضرت عمر نے کہا۔ پھر دین میں یہ ذلت ہم گوارا کیوں کریں؟ لیکن بعد میں ان کو اپنی اس جسارت پر سخت ندامت ہوئی، اور اس کے کفارہ میں خیرات کرتے، نمازیں پڑھتے، روزے رکھتے اور غلام آزاد کرتے رہے۔ (حاشیہ بخاری صفحہ ۳۸۰)

احرام اتارنے کے لئے بال منڈوائیں۔ آپ نے ایسا ہی کیا۔ اب تمام لوگوں کو یقین ہو گیا کہ اس فیصلہ میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ سب نے اٹھ کر قربانی کی اور احرام اتارا۔

امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے جو صلح کی ہے وہ صلح حدیبیہ کے قائم کئے ہوئے خطوط پر ہے اور جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حدیبیہ میں کفار مکہ سے جو صلح کی ہے وہ اس کا ثبوت نہیں کہ کفار کو برحق مان لیا گیا۔ اسی طرح امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے جو صلح کی ہے وہ اس کا ثبوت نہیں کہ امیر معاویہ حق پر ہیں۔ اور ان کی حکومت راشدہ ہے صلح تو ہمیشہ مفاد کے مدنظر ہوتی ہے۔ اس صلح میں بھی امام علیہ السلام کو بڑے بڑے مفاد ہی مدنظر ہیں اور ہر مفکر دیکھ رہا ہے کہ اس میں بہت بڑے بڑے فوائد ہیں۔ مثلاً

(۱) اب خلافت راشدہ کی مدت ختم ہو رہی ہے لہٰذا فرزند رسول کو مسند خلافت چھوڑ دینا چاہیئے کہ اب جو حکمرانی کرے گا وہ خلیفہ نہ ہو گا بلکہ کاٹ کھانے والی حکومت کا بادشاہ ہو گا۔ امیر معاویہ جو فوج لے کر حکومت چھیننے آئے ہیں اگر وہ ایسے بادشاہ بنتے ہیں تو دنیا پر روشن ہو جائے گا کہ وہ خلیفۂ راشد نہیں لہٰذا ان کے احکام اور ان کے روش کو خلیفۂ راشد کے احکام اور روش نہ سمجھا جائے گا۔ اور ان چیزوں کو دین کی باتوں میں شامل نہ کیا جائے گا۔ اس طرح دین میں غلط آمیزش نہ ہو سکے گی اور دین وملت کا مضبوط تحفظ ہو جائے گا کہ آئندہ بھی کسی بادشاہ کے طریق جہاں بانی کو اسلام کا آئین حکومت نہ مانا جائے گا۔

(۲) صورت حال ایسی ہی ہے کہ فرزند رسول کو مسند خلافت چھوڑ دینی چاہیئے لیکن یونہی چھوڑنا مناسب نہیں بلکہ ایسا ہونا چاہیئے کہ امیر معاویہ جو حکومت چھیننے آئے ہیں ان کو کچھ شرطوں کا پابند بنا کر حکومت حوالہ کر دینی چاہیئے۔ اور صلح نامہ میں یہ شرطیں نہایت صاف اور واضح الفاظ میں درج ہوں اور اس پر عمائد کے دستخط بھی ہوں۔ یہ سب باتیں اس لئے ناگزیر ہیں کہ امیر معاویہ کی حکومت ان شرطوں پر عمل کرنے کے لئے کم از کم اس لئے مجبور رہو جائے کہ عہد شکنی تمام عرب کے نزدیک بھی بدترین عیب ہیں

شمار کی جاتی ہے۔ اس طرح ان شرائط کی پابندی کی وجہ سے امیر معاویہ کی مطلق العنان ہوکر پبلک کے ساتھ جبر و تشدد کا برتاؤ کرے۔ اس سے امید ہے کہ گو خلافت راشدہ کا عدل و انصاف اور دین پروری تو اس بادشاہت سے ہو ہی نہیں سکتی۔ کیوں کہ حدیث نے اس کو کٹ کھنی حکومت کہا ہے۔ لیکن عہد نامہ کا کچھ تو لحاظ کرنا ہی پڑے گا۔ لہٰذا صلح نامہ بیحد ضروری ہے جو صلح پر موقوف ہے۔

(۳) امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ سے اس نوع کی جو صلح کی ہے اس کا ایک بڑا فائدہ یہ بھی ہے کہ امیر معاویہ نے جو فوج کشی کی ہے اگر صلح نہ کی جائے تو اس سے مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹیں گے۔ اب اگر صلح کر لی جاتی ہے تو یہ خون ریزی نہ ہوگی (لہٰذا مسند خلافت چھوڑ کر صلح کرنا ہی مناسب ہے، کہ خلافت راشدہ کی مدت دو ایک روز میں ختم ہو جائے گی۔ پھر اس مسند پر فرزند رسول کیوں رہے۔ کیوں کہ اب جو اس پر رہے گا، وہ کٹ کھنی حکومت والا بادشاہ ہوگا) ایسی حالت میں حکومت کو چھوڑ کر صلح کر لینے سے مسلمانوں پر بہت بڑا احسان ہوگا ان کی گردنوں پر احسان! ان کے خون اور ان کے بال بچوں پر! کہ دو لڑنے والی فوجیں قتال سے رک جائیں گی۔ اور ان میں صلح ہو جائے گی۔

جو شخص تمام امت پر اتنا بڑا احسان کرے وہ تمام امت کا محسن، امام اور سردار ہے حدیث پاک نے بھی ایسا ہی کہا ہے۔ حضرت ابو بکر کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم منبر پر تشریف فرما تھے اور حسن آپ کے پہلو میں تھے۔ آپ ایک بار لوگوں پر نظر ڈالتے اور ایک بار حسن پر، اور میں نے خود سنا ہے کہ آپ اس وقت فرما رہے تھے:

ان ابنی ھذا سید یصلح اللہ علی یدیہ فئتین عظیمتین [۱]	میرا یہ فرزند سردار ہے، اللہ اس کے ہاتھ سے دو بڑی جماعتوں میں صلح کرا دے گا۔

---

[۱] سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۸ مطبوعہ مجیدی میں عظیمتین نہیں ہے لیکن التاج میں ترمذی کے حوالہ سے یہ لفظ موجود ہے۔ شاید نسخوں کا اختلاف ہو۔ یہ حدیث صحیح بخاری ج ا ص ۵۳۰ میں بھی ہے لیکن اس میں لفظ "لعل" بھی ہے جو

سردار لفظ سید کا ترجمہ ہے۔ سید اور سردار — اس کو کہتے ہیں، جو لوگوں میں اعلیٰ اور فائق ہو۔

شرائط صلح سیدنا امام حسن علیہ السلام نے جن شرائط پر امیر معاویہ سے صلح کی ہے ان میں سے کچھ حسب ذیل ہیں :

۱۔ امیر معاویہ کو قرآن و سنت کے اصول پر حکومت کرنی ہو گی۔

۲۔ علی پر سبّ و لعن کو بند کرنا ہو گا۔

۳۔ محض بغض و کینہ کی وجہ سے کسی عراقی کو پکڑا نہ جائے۔

۴۔ بلا استثناء سب کو امان دی جائے۔

۵۔ اہواز کا پورا خراج حسن کے لئے مخصوص رہے گا۔ امیر معاویہ اس میں کوئی تصرف نہیں کر سکتے۔

۶۔ دو لاکھ سالانہ حسین کے لئے مخصوص ہو گا۔

۷۔ حسن اور حسین پر امیر معاویہ کی حکومت نہ رہے گی۔

۸۔ امیر معاویہ کے بعد حکومت حسن ابن علی کے حوالہ ہو جائے گی۔

۹۔ وظائف میں بنی ہاشم کو بنی امیہ پر ترجیح دی جائے گی۔

ف : صلح نامہ کی یہ دفعات کہ اہواز کا خراج حسن کو حوالہ کیا جائے گا اور حسین کو ۲۰ لاکھ درہم سالانہ دیئے جائیں گے۔ ان کو محض اس لئے رکھا گیا تھا کہ حسنین کریمین بہت سے ناداروں اور غریب شریفوں کی مدد فرمایا کرتے تھے اور خلافت حسنی کے زمانہ میں اس امداد کے علاوہ دینی امور کی مالی امداد علی الخصوص انھیں حضرات سے متعلق ہو گئی تھی اور محض اللہ کے لئے جیسی امداد یہ محبان خدا و رسول کرتے تھے اب ویسی دوسروں سے کہاں ہو سکتی تھی۔ اس قسم کی

= عدم اذعان کو بتایا ہے اور کون کہہ سکتا ہے کہ نبی جو پیشین گوئی فرمائیں اس میں خود ان کو اذعان و یقین نہ ہو۔ لہٰذا راقم نے ترمذی کی روایت کو بخاری کی روایت پر ترجیح دی ہے۔ ۱۲ کوثر

امداد بے حد ضروری تھی جس کا سلسلہ قائم رکھنے کے لئے مذکورہ بالا دونوں دفعات ناگزیر تھیں کہ ان کے بغیر بہت سے دینی کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو جاتی اور بہت سے باغیرت خدام دین اور بہت سے باعزت غریب و نادار صالحین جو حکومت کے آگے دست طلب پھیلا ہی نہیں سکتے تھے وہ بڑی مشکلوں میں مبتلا ہو جاتے۔

نوٹ : تاریخوں میں شرائط صلح کی دفعات میں اختلاف ہے اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ بعض مؤرخین ہر بات کو لکھنا ضروری یا مناسب نہیں سمجھتے اور بعض مؤرخین استیعاب کی کوشش کرتے ہیں۔ علامہ ابو حنیفہ احمد بن داؤد دینوری نے الاخبار الطوال ص ۲۲۰ میں لکھا ہے کہ امام حسن نے یہ شرطیں لکھی تھیں۔

(۱) محض بغض و کینہ کی وجہ سے کسی عراقی کو نہ پکڑا جائے۔ (۲) بلا استثنا ہر کالے گورے کو امان دی جائے۔ (۳) لوگوں کی لغزشوں پر گرفت نہ کی جائے (۴) اہواز کا پورا خراج حسن بن علی کے لئے مسلّم رہے گا (۵) حسن کے بھائی حسین کے پاس سالانہ بیس لاکھ درم بھیجے جائیں گے (۶) وظائف میں بنی ہاشم کو بنی امیہ پر ترجیح دی جائے گی۔

لیکن امام ابن جریر نے لکھا ہے ۴۱ھ میں امام حسن علیہ السلام نے امیر معاویہ کے پاس شرائط صلح لکھ کر بھیجے، اس سے پہلے امیر معاویہ نے آپ کے پاس ایک سادہ کاغذ بھیجا جس کے نیچے اپنی مہر ثبت کی تھی اور ایک رقعہ لکھ دیا تھا کہ "اس قرطاس ابیض میں جو شرطیں آپ چاہیں لکھ دیں مجھے منظور ہیں۔ اور ان شرطوں کی بنا پر آپ خلافت چھوڑ دیں"۔ حسن علیہ السلام نے قرطاس ابیض میں وہ شرطیں بھی تحریر فرمائیں جو پہلے آپ نے نہیں لکھی تھیں۔ یہ شرائط ان سے دوگونہ تھے. لیکن امیر معاویہ نے ان پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ اور ان میں سے کسی شرط پر کبھی عمل نہیں کیا۔ (الحسین ج ۱ ص ۵۵ باختصار) ـ

علامہ دینوری نے صلح کی جو شرطیں لکھی ہیں کیا امیر معاویہ نے ان پر بھی عمل نہیں کیا؟

مورّخین کے بیانات دونوں طرح کے ہیں لیکن اس میں کسی کا اختلاف نہیں کہ امیر معاویہ نے حضرت حُجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرایا، حالاں کہ ان کو قتل کرانا معاہدہ کے خلاف تھا۔ حضرت حُجر بن عدی نہایت بلند پایہ اور متقی صحابی تھے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر جو اسلام کا ایک اہم فرض ہے اس کو پوری طرح انجام دیتے تھے۔ اس لئے ان کے قتل کیے جانے پر تمام صحابہ کو بڑی تکلیف ہوئی۔ ان کے قتل کا واقعہ یہ ہے کہ امیر معاویہ کا گورنر زیاد جس کو امیر معاویہ نے غلط طور پر اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دے لیا تھا۔ یہ بڑا ظالم اور فاسق گورنر تھا اور جمعہ کے خطبہ میں سیدنا حضرت علی کرم اللہ وجہہ کو گالیاں دیا کرتا اور لعن کرتا۔ دین دار لوگ خون کا گھونٹ پی کر رہ جایا کرتے لیکن حضرت حُجر جیسے صحابی جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں پیش پیش رہا کرتے تھے۔ وہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے کھڑے ہو گئے اور اس فعل بد سے زیاد کو روکا۔ زیاد نے ان کو اور ان کے گیارہ مقدس ساتھیوں کو گرفتار اور قید کر کے امیر معاویہ کے پاس بھیج دیا۔ اور ان بزرگوں کی بے بنیاد شکایتیں بھی لکھ بھیجیں۔ ان میں ایک شکایت یہ بھی تھی کہ یہ لوگ ابوتراب (علی) کے اعوان و انصار ہیں اور ان پر رحمت بھیجتے ہیں۔

اس طرح زیاد نے ان لوگوں کو ملزم ٹھہرا کر لوگوں کی شہادتیں بھی لکھوائی تھیں۔ اور انھیں بھی امیر معاویہ کے پاس بھیج دیا تھا، ان شہادتوں میں ایک گواہی قاضی شریح کی بھی ثبت کی گئی تھی جو بالکل غلط تھی۔ قاضی شریح کو علم ہوا تو انھوں نے امیر معاویہ کے پاس لکھا:

> "میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس حُجر بن عدی کے خلاف جو شہادتیں بھیجی گئی ہیں ان میں ایک میری شہادت بھی ہے۔ میری اصلی شہادت حُجر بن عدی کے متعلق یہ ہے کہ حُجر ان لوگوں میں ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں، زکواۃ دیتے

ہیں، ہمیشہ حج و عمرہ کرتے رہتے ہیں، نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں ان کا خون کرنا اور مال لینا حرام ہے۔"

حضرت عائشہ کو اطلاع ہوئی تو انھوں نے امیر معاویہ کو حضرت حجر بن عدی اور ان کے ساتھیوں کے قتل سے روکنے کا خط لکھا۔

حضرت حجر بن عدی اور ان کے ساتھی جب امیر معاویہ کے پاس پابہ زنجیر بھیجے گئے تو انہوں نے ان بزرگوں کو قتل کرنے کا حکم دیدیا۔ قتل سے پہلے جلادوں نے ان کو سنایا کہ :

"ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ تم علی سے برأت کرو اور ان پر لعنت بھیجو تو تمھیں چھوڑ دیا جائے گا ورنہ قتل کر دیا جائے گا۔"

ان بزرگوں نے جب اس بدترین فعل کے ارتکاب سے انکار فرمایا اور حضرت حجر بن عدی رضی اللہ عنہ نے یہ بھی فرمایا کہ "میں زبان سے وہ بات نہیں نکال سکتا جو رب کو ناراض کرے" تو ان پاکبازوں کو مقام عذرا میں قتل کر دیا گیا (عذرا دمشق کا ایک گاؤں ہے) حضرت حجر کے ایک ساتھی حضرت عبدالرحمٰن بن حسان رضی اللہ عنہ کو امیر معاویہ نے زیاد کے پاس واپس بھیج دیا اور لکھا کہ "اس کو بدترین طریقہ سے قتل کرو۔" زیاد نے یہ شقاوت دکھائی کہ اس مردِ مومن کو بمقام قسّ الناطف زندہ دفن کر دیا۔

حضرت حجرؓ اور ان کے پاکباز ساتھیوں کے اس مظلومانہ قتل پر تمام صالحین تڑپ اٹھے، ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو بھی بے حد صدمہ ہوا۔ اس کے بعد جب امیر معاویہ مدینہ منورہ آئے اور ام المومنین حضرت عائشہ کے دروازے پر بھی آئے تو ام المومنین نے فرمایا :

"معاویہ تم نے حجر بن عدی جیسے متقی کو مار ڈالا اور تمہیں اللہ کا ذرا خوف نہ ہوا۔"

امام بیہقی اور امام ابن عساکر کا بیان ہے کہ حضرت عائشہ نے امیر معاویہ سے فرمایا :

"تم نے مقام عذرا کے مقتولین حجرؓ اور ان کے ساتھیوں کو کیوں قتل کیا؟" امیر معاویہ نے کہا۔

"میں نے ان کے قتل کرنے میں امت کی بہتری سمجھی اور ان کے زندہ رہنے میں امت کی خرابی سمجھی۔"

حضرت عائشہ نے فرمایا۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے:

سیقتل بعذراناس یغضب اللہ لہم واھل السماء ۔ (خصائص کبریٰ ص ۱۴۱/۲)

مقام عذرا میں کچھ ایسے لوگوں کو قتل کیا جائے گا جن کے قتل کرنے کی وجہ سے اللہ کا اور آسمان والوں کا غضب اترے گا۔

امام الاولیاء حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے۔

معاویہ کے چار افعال ایسے ہیں کہ جو بھی انکا ارتکاب کرے گا اس کے لئے مہلک ہی ہیں۔

● ایک عمل امیر معاویہ کا امت پر تلوار اٹھانا اور بلا شوریٰ خلیفہ بن جانا، حالانکہ امت میں بڑے بڑے صحابہ موجود تھے۔ (جنکے مشورہ اور انتخاب ہی سے خلیفہ کا تقرر ہونا تھا) ● دوسرا عمل امیر معاویہ کا اپنے بیٹے یزید کو اپنا ولی عہد بنانا ہے، حالانکہ وہ شرابی اور نشہ باز تھا۔ ریشمی لباس پہنتا اور طنبور بجاتا تھا ● تیسرا فعل سمیہ کے بیٹے زیاد[1] کو اپنے باپ ابوسفیان کا بیٹا قرار دینا ہے۔

---

[1] زیاد بڑا مدبر، حکمرانی میں ہوشیار، بڑا سیاسی لکچرار اور فوجی لیڈر تھا۔ پہلے حضرت علی کا بڑا حامی اور امیر معاویہ کا شدید مخالف تھا اس وقت اسلامی احکام کا بڑا پابند تھا۔ اور اسلامی نظم وانتظام کی بڑی اچھی خدمت انجام دیتا تھا۔ چنانچہ اس کی سیاسی قابلیت اور انتظامی صلاحیت مسلم ہوگئی تھی۔ اور عرب کا بڑا سیاسی مان لیا گیا تھا۔ اس لئے امیر معاویہ نے حضرت علی کے زمانہ میں ہی اسے ملانے کی کوشش کی تھی، لیکن اس وقت ناکام رہے۔ حضرت علی کے بعد اس کو اپنانے کی راہ نکالی۔ چنانچہ دعویٰ کیا کہ یہ میرے باپ ابوسفیان کا بیٹا ہے، حالانکہ اس کی ماں طائف کے ایک شخص کی لونڈی تھی۔ اور ابوسفیان کی نہ بیوی تھی نہ لونڈی ایسی صورت میں زیاد ابوسفیان کا بیٹا کیسے ہو سکتا ہے؟ لیکن امیر معاویہ نے اس کو ابوسفیان کا بیٹا اور اپنا بھائی بنا کر اپنا لیا۔ اس نے بھی دیکھا کہ خلیفہ وقت کے بھائی بننے میں ہر طرح کی سیاسی کامیابی ہے اب تو حکومت کے پورے اسٹاف پر اپنا بڑا اثر رہے گا۔ اور بڑے چین سے کٹے گی۔

لیکن زیاد کا یہ عجیب وغریب نسب اسلامی اصول کے بالکل خلاف ہے اسی لئے امام حسن بصری نے اپنے قول مذکورہ متن میں اسے بڑا مہلک بنایا ہے اور صحابہ کرام نے بھی اسے بہت برا سمجھا ہے۔ انہوں نے زیاد کو ابوسفیان کا بیٹا مانا ہی نہیں۔

حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا صاف حکم موجود ہے کہ اولاد اسی کی ہے جس کے بستر پر پیدا ہوا اور زانی کے لئے پتھر ہے ● چوتھا فعل امیر معاویہ کا حضرت حجر اور ان کے ساتھیوں کو بلا قصور قتل کر دینا ہے[1] (ابن اثیر ج ۳ ص ۲۴۲)

خلافت سے دست برداری کا اعلان

صلح نامہ پر امیر معاویہ کے دستخط ہو جانے کے بعد سیدنا امام حسن علیہ السلام خلافت سے دست بردار ہو گئے۔ عمرو بن عاص نے امیر معاویہ سے کہا کہ حسن سے دست برداری کا اعلان کرا لینا ضروری ہے تاکہ لوگ خود ان کی زبان سے سن لیں۔ امیر معاویہ نے کہا اس کی ضرورت نہیں۔ مگر ابن عاص نے زیادہ اصرار کیا تو سیدنا امام حسن علیہ السلام سے کہا آپ مجمع عام میں دست برداری کا اعلان کر دیں۔ اس پر حضرت امام عالی مقام نے جن الفاظ

---

[1] گویہ چاروں افعال سخت مذموم ہیں لیکن ان کی بنا پر یا کسی اور وجہ سے امیر معاویہ پر سب ولعن کرنا بھی سخت مذموم ہے کیونکہ محدثین نے صحابی کی جو تعریف کی ہے اس کے نقطۂ نظر سے وہ صحابی ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ علمائے اصول نے صحابی کی جو تعریف کی ہے کیا اس کے رو سے وہ صحابی ہیں؟

محدثین نے صحابی کی جو تعریف کی ہے اس کی ایک تعبیر یہ ہے کہ جس نے مسلمان ہونے کی حالت میں ایک لحظہ بھی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت پائی وہ صحابی ہے۔ امام عبدالعزیز بخاری نے تحقیق شرح حسامی ص ۱۶۶ میں لکھا ہے کہ یہ عام اصحاب حدیث اور بعض اصحاب شافعی کا قول ہے۔

علمائے اصول نے صحابی کی یہ تعریف کی ہے کہ صحابی وہ شخص ہے جو طویل زمانہ تک نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت میں آپ کا اتباع کرنے اور آپ سے (اسلامی احکام اور ایمانی واخلاقی تربیت) حاصل کرنے کے طریقے پر رہا ہو اور اس طرح آپ کے ساتھ اس کی مجالست بکثرت رہی ہو (مقدمہ ابن صلاح وعینی شرح بخاری) تحقیق امام عبدالعزیز میں بھی قریب قریب ایسا ہی ہے۔ اسی میں یہ بھی ہے کہ یہ جمہور علمائے اصول کا قول ہے۔ یہ بات شرح تحریر علامہ حلبی میں بھی ہے، اس میں کچھ اضافہ بھی ہے، چنانچہ موصوف لکھتے ہیں۔ جمہور علمائے اصول کے نزدیک صحابی وہ شخص ہے جو =

میں اعلان فرمایا ہے وہ ایک تقریر ہے جس کے یہ پرزے بڑے اہم ہیں:

" دانائیوں میں سب سے بہتر دانائی تقویٰ ہے اور سب سے بڑا نکماپن بداعمالیاں ہیں، لوگو! یہ امر (یعنی خلافت) جو ہمارے اور معاویہ کے درمیان نزاعی بات ہے یا تو ہم اس کے حقدار ہیں (جیسا کہ ہم لوگ سمجھتے ہیں) یا معاویہ اس کے حقدار ہیں (جیسا کہ ان کا خیال ہے) دونوں صورتوں میں امت کی بھلائی اور خیر اندیشی کے لئے اور تم لوگوں کی خون ریزی روکنے کے واسطے میں اس سے دست بردار ہوتا ہوں۔

اور اے معاویہ! یہ خلافت تمہارے لئے فتنہ اور چند روزہ سرمایہ ہے۔"

یہ سن کر امیر معاویہ نے کہا "بس کیجئے اتنا کافی ہے" اور عمرو بن عاص سے کہا "تم مجھے یہی سنوانا چاہتے تھے۔

امام حسن علیہ السلام کی دست برداری کا واقعہ ۴۱ھ میں ہوا ہے۔ اس کے بعد آپ صرف آٹھ سال دنیا میں رہے کیوں کہ صحیح روایت کے رو سے ۴۹ھ میں آپ کی شہادت ہوئی ہے۔

خلافت سے دست برداری کے بعد

خلافت سے دست برداری کے بعد سیدنا امام حسن علیہ السلام مع حضرت امام حسین علیہ السلام و

= رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں آپ کا اتباع کرتے ہوئے اتنی طویل مدت تک رہا ہے جتنی مدت کسی کی صحبت میں رہنے سے یہ کہنا صادق آجاتا ہے کہ یہ شخص فلاں کا صحبت یافتہ ہے (یعنی اسکی صحبت کے اثرات اس میں آگئے ہیں اور اس کی سیرت و کردار کا رنگ اس پر چڑھ گیا ہے) اس مدت کی کوئی تحدید نہیں کی جا سکتی۔

اس تعریف کا ماحصل یہ ہے کہ صحابی وہ شخص ہے جو طویل عرصہ تک صحبت نبوی میں رہ کر سنت نبوی کا متبع ہوگیا ہو۔ آپ کی تعلیمات کا واقف کار ہوا اور آپ کی تربیت کو اپنے اندر جذب کر چکا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص پیکر رشد و ہدایت ہے۔ حدیث میں ایسے ہی بزرگوں کی شان میں ہے کہ "میرے صحابہ ستاروں کے مثل ہیں۔ ان میں سے جس کی بھی اقتدا کروگے ہدایت یاب ہوگے۔"

صحابیت کی یہ شان انھیں شخصیتوں میں ہے جن کی زندگی۔ خلاف تقویٰ افعال سے پاک و منزہ ہے۔ ۱۲ کوثر

دیگر اکابر مدینہ منورہ چلے آئے اور اپنے نانا جان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جوار اقدس میں آخر تک مقیم رہے۔ اس زمانہ میں آپ بعض اوقات بڑی تنگی و عسرت سے بسر فرماتے تھے۔ امام بیہقی اور امام ابن عساکر کی روایت ہے کہ ایک بار امیر معاویہ نے مقررہ رقم آپ کے پاس نہیں بھیجی جس سے آپ کو بڑی تنگ دستی پیش آئی آپ کو خیال ہوا کہ معاویہ کو مقررہ رقم بھیجنے کا خط لکھیں قلم دوات طلب فرمائی لیکن لکھنے سے دل رک گیا۔ رات کو خواب میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہوئی۔ آپ نے فرمایا "حسن کیا حال ہے؟" عرض کی "نانا جان خیریت ہے لیکن مقررہ رقم نہ آنے سے تکلیف ہے"۔ آپ نے فرمایا "کیا تم نے قلم دوات طلب کیا تھا کہ ایک مخلوق کے پاس اپنی حاجت کیلئے خط لکھو"۔ عرض کی ہاں یا رسول اللہ، آپ نے فرمایا یہ دعا پڑھو:

اَللّٰهُمَّ اقْذِفْ فِیْ قَلْبِیْ رَجَاءَكَ	یا اللہ میرے دل میں اپنی ہی امید اور بھروسہ رکھ
وَاقْطَعْ رَجَائِیْ عَمَّنْ سِوَاكَ	اور دوسروں کی امید اور بھروسہ کاٹ دے
حَتّٰی لَا اَرْجُوْ اَحَدًا غَیْرَكَ اَللّٰهُمَّ	تاکہ میں تیرے سوا کسی سے امید اور بھروسہ نہ رکھوں
وَمَا ضَعُفَتْ عَنْهُ قُوَّتِیْ وَقَصُرَ عَنْهُ	اور یا اللہ مجھے خصوصیت کے ساتھ وہ یقین عطا
عَمَلِیْ وَلَمْ تَنْتَهِ اِلَیْهِ رَغْبَتِیْ	فرما جو تو نے اگلوں اور پچھلوں میں کسی کو عطا کیا
وَلَمْ تَبْلُغْهُ مَسْأَلَتِیْ وَلَمْ یَجْرِ عَلٰی	ہو، جس کے حاصل کرنے میں میری طاقت کمزور
لِسَانِیْ مِمَّا اَعْطَیْتَ اَحَدًا مِنَ	پڑ گئی ہو اور میرا عمل قاصر ثابت ہوا ہو، جس
الْاَوَّلِیْنَ وَالْاٰخِرِیْنَ مِنَ الْیَقِیْنِ	تک میری رغبت کی رسائی نہ ہوئی ہو اور جسے میں
فَخُصَّنِیْ بِهٖ یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْنَ ○	مانگ نہ سکا اور میری زبان پر جس کا ذکر نہ آسکا۔

اس دعا کا یہ اثر ہوا کہ حضرت امام علیہ السلام فرماتے ہیں، ایک ہفتہ بھی نہیں گذرا تھا کہ معاویہ نے اس سے زائد رقم بھیجی اس پر امام عالی مقام نے ان الفاظ میں اللہ کا شکر ادا کیا۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَا یَنْسٰی مَنْ ذَكَرَهٗ	اللہ کا شکر ہے جو اپنے یاد کرنے والے کو نہیں بھولتا
وَلَا یُخَیِّبُ مَنْ دَعَاهُ۔	اور جو اس سے دعا کرتا ہے اسے ناکام نہیں چھوڑتا۔

اس کے بعد حضرت امام نے پھر خواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت کی۔ حضور نے احوال پوچھے۔ امام نے ماجرا سُنایا۔ حضور نے فرمایا۔

"اے فرزند جو شخص اللہ ہی سے امید رکھتا ہے اور مخلوق سے امید نہیں رکھتا۔ اس کا معاملہ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۳۵)

نوٹ : امید ہے کہ جو پریشان حال اس دعا کو پڑھتا رہے گا۔ اس کی پریشانی انشاء اللہ بہت جلد دور ہو جائے گی۔

انتباہ : بنی امیہ نے حسنین کریمین کا وقار گرانے کی جو جو کوششیں کی ہیں ان سے ہر اہل بصیرت باخبر ہے، ان میں سے ایک نہایت ناپاک پروپیگنڈا یہ بھی ہے کہ معاذ اللہ یہ دونوں حضرات اپنا وظیفہ لینے کے لئے ہر سال مدینہ منورہ سے شام میں جا کر امیر معاویہ کے دربار میں حاضری دیا کرتے تھے، توبہ، معاذ اللہ! غور کرو، اللہ اور رسول کے ان بہترین محبوبوں کو ٹکڑ گداؤں کی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ حسنین کریمین کی کتنی بڑی تذلیل ہے؟ اور اس پر بھی توجہ دو کہ اس کے پردہ میں خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وقار اعظم کو بھی ٹھیس لگائی جارہی ہے لیکن ان بے حسوں کو احساس نہیں۔

ہر اہل ایمان کا ایمان اور ضمیر پکار رہا ہے، کہ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا کہ رسول کے لال اور نبی کے لخت جگر سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہما السلام اپنا وظیفہ لینے کے لئے امیر معاویہ کے پاس جائیں۔ غور کرو اوپر لکھی ہوئی تاریخی حقیقت پر کہ امیر معاویہ کو حسب معاہدہ جو رقم سیدنا امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرنی ضروری تھی جب انہوں نے ایک سال پیش نہیں کی اور اس سے امام عالی مقام کو بڑی تنگ دستی ہو گئی تو امام عالی مقام نے امیر معاویہ کے پاس محض یاد دہانی کا رقعہ لکھنا چاہا لیکن طبیعت اقدس نے اتنا بھی گوارا نہیں کیا اور خود آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے خواب میں اس سے منع فرما دیا اور تنگ دستی دور ہونے کی دعا تعلیم فرمانے پر اکتفا کی، جس میں اللہ سے اس توکل و بے نیازی کی طلب ہے جس سے آگے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔

بتاؤ توکل واستغنا میں حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسے اعلیٰ ترین جانشین جن کی ذات پر خود توکل واستغنا کو فخر و ناز ہے، بھلا وہ کسی کے دروازہ پر مال وزر لینے کے لئے حاضری دیں گے؟ محال اور بالکل محال۔

یہ ہو سکتا ہے کہ حسنین عظیمین امیر معاویہ کو اس قسم کی ہدایت دینے کے لئے شام تشریف لے گئے ہوں کہ "قرآن وسنت کی روشنی میں چلو، تمہاری فلاں فلاں باتیں دین کے لئے مضر ہیں۔ ان کو چھوڑ دو، اپنے عاملوں کو ظلم وستم سے روکو، وغیرہ وغیرہ۔

اس قسم کی ہدایت دینا امر بالمعروف[1] اور نہی عن المنکر ہے، جو اسلام کا بہت اہم فریضہ ہے۔ سیاسی خلافت سے دست بردار ہو جانے کے بعد سیدنا امام حسن علیہ السلام روحانی خلافت فرما رہے تھے۔ وہ بے وابستگان دامن کے نفوس کا تزکیہ اور امت کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر، حدیث میں ہے:

من امر بالمعروف ونهى عن المنكر فهو خليفة الله فى ارضه وخليفة رسوله وخليفة كتابه (تفسیر مدارک ج ۱ ص ۱۳۶)	جو شخص امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرتا ہے وہ زمین پر اللہ کا خلیفہ ہے اور اس کے رسول کا خلیفہ ہے اور اس کی کتاب کا خلیفہ ہے۔

خلافت رسول کا سب سے اہم کام دین کی حفاظت ہے۔

دین کا تحفظ ظاہری طور وطریق سے بھی کرنا ضروری ہے، وہ یہ ہے کہ شعائر دین کا خوب تحفظ کیا جائے اور دین کا تحفظ باطنی طور پر بھی کرنا نہایت اہم

---

[1] معروف سے مراد اللہ کی اطاعت کے کام ہیں، ان کاموں کا حکم دینا واجب ہے۔ اس حکم دینے کو امر بالمعروف کہتے ہیں، منکر سے مراد ہے اللہ کی نافرمانی کے کام، ان کاموں سے روکنا واجب ہے۔ اس روکنے کو نہی عن المنکر کہتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض کفایہ ہے۔ (مدارک ج ۱ ص ۱۳۵ ودیگر کتب تفسیر وفقہ) قرآن وحدیث میں ان کی بڑی تاکید آئی ہے۔ ۱۲ کوثر

ہے۔ وہ یہ ہے کہ دین جس ایمانی روح کو بیدار کرنا چاہتا ہے اس کو زندہ اور بیدار رکھا جائے تاکہ فسق و فجور سے نفرت اور گھن پیدا ہو جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تربیت پاک نے مخلصین میں یہ جوہر پیدا کر دیا تھا۔ قرآن مجید کا ارشاد ہے کہ ایسے ہی لوگ راشد ہیں۔ سورۂ حجرات (پ ۲۶، رکوع ۱، آیت ۷) میں ہے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝	اور جان رکھو کہ تم لوگوں میں اللہ کے رسول موجود ہیں۔ اگر وہ بہت سی باتوں میں تمہارا قول مان لیں تو تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ گے لیکن (حقیقت تو یہ ہے کہ) اللہ نے ایمان تمہیں محبوب بنا دیا اور تمہارے دلوں میں اسے آراستہ کر دیا۔ اور کفر اور فسق اور عدول حکمی سے تم کو گھن پیدا کر دی۔ ایسے ہی لوگ راشد ہیں۔

حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین نے ان دونوں طریقوں سے دین کی حفاظت فرمائی ہے۔ حضرات خلفائے ثلاثہ (حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمانؓ) رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں شعار اسلام کا تحفظ اور کفار کے حملہ سے اسلام کو جو خطرہ تھا اس کا سدِّباب بہت اہم تھا۔ اس لئے ان بزرگوں نے اس راہ سے دین کے تحفظ کا کام زیادہ کیا۔ اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے عہد خلافت سے پہلے دولت کی فراوانی سے دین کی روح میں جو اضمحلال پیدا ہو گیا تھا اس کا مداوا نہایت ضروری تھا اور اس کے مضر اثرات سے دین کی حفاظت حد درجہ ضروری ہو گئی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس باطنی حفاظت پر زیادہ توجہ فرمائی۔

اس بنا پر حضرات خلفائے ثلاثہ کے کارناموں میں گو دین کا باطنی تحفظ بھی ہے لیکن دین کے ظاہری تحفظ کا زیادہ اہتمام نظر آتا ہے اور حضرت علی مرتضیٰ کی سیرت اقدس میں دین کا

ظاہری تحفظ بھی ہے لیکن دین کے باطنی تحفظ پر زیادہ توجہ نظر آتی ہے۔ اسی لئے حضرات صوفیۂ کرام کی زبان میں آپ اسلام کے پہلے قطب الارشاد ہیں، جیسا کہ تفسیر مظہری (ج ۲ ص ۹۹) میں ہے۔

آپ کے بعد امام حسن علیہ السلام نے دین کے باطنی تحفظ کا بہترین اہتمام فرمایا۔ صورتحال یہ تھی کہ لوگ عہدہ اور حکومت کے جائز و ناجائز ہر طرح کے کام کیا کرتے تھے۔ ضرورت تھی کہ لوگوں میں اللہ سے لگن پیدا کی جائے۔ معمولی عہدہ کیا چیز ہے۔ وقت کی سب سے بڑی حکومت اور اس کے اعزاز کو بھی اللہ کی محبت اور دین و ملت کے تحفظ پر قربان کر دیا جائے۔ آپ نے اس پر عمل فرما کر مسلمانوں کو بہترین درس دیا، جس کی نظیر پوری تاریخ اسلام میں ایک بھی نہیں اس سے امت کو یہ روشنی ملی کہ اللہ اور دین، اور امت کے مفاد کے لئے بڑے سے بڑے اعزاز کو بھی قربان کر دینا چاہیئے۔ یہ فنائے نفس دین کی جان ہے جس سے روح ایمانی زندہ رہتی ہے اور ہر کام میں رضائے الٰہی مطلوب رہا کرتی ہے۔ امام حسن کے بعد امام حسین علیہما السلام نے فنائے نفس کا وہ بہترین درس دیا جس سے آج تک ایمانی تعلیم وارشاد کی روح زندہ ہے آپ کے بعد تمام ائمۂ اہل بیت فنائے نفس کی عملی تعلیم دیتے رہے۔ اور اس باب میں ان حضرات کو امتیازی خصوصیت حاصل ہے، اسی لئے بعض اکابر فنائے نفس کو نسبت اہلبیت فرماتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب القول الجمیل فصل ۷ کے شروع میں بتاتے ہیں کہ نسبت سے مراد اللہ تعالیٰ سے انتساب ارتباط اور لگاؤ ہے جسے نور اور سکینہ بھی کہتے ہیں۔ نسبت کی ماہیت وہ (ایمانی و روحانی) کیفیت ہے جو نفس ناطقہ (یعنی روح) میں جاری وساری ہو جاتی ہے۔ یہ چیز تشبّہ بالملائکہ[۱] اور تطلّع الی الجبروت کے باب میں سے ہے۔ شاہ صاحب نے

---

[۱] تشبّہ بالملائکہ کا مفہوم یہ ہے کہ فرشتوں سے مشابہت ہو گئی ہے کہ حمد و تسبیح، تقدیس و تہلیل، رکوع، سجود اور عجز و نیاز ہی سے تعلق رہتا ہے ___ اور تطلّع الی الجبروت کا مفہوم یہ ہے کہ عالم جبروت کا بغور مشاہدہ ہونے لگتا ہے =

اس کے بعد نسبت کے چند اقسام لکھے ہیں۔ اس سلسلہ میں رقم طراز ہیں :

ومنہا نسبۃ کسر النفس والتبریٔ عن حظوظہا، وکان سیدی الوالد یسمیہا نسبۃ اھل البیت	اور نسبت کی ایک قسم نفس شکنی اور لذات نفس سے بیزاری ہے، میرے والد مرشد اس نسبت کو نسبت اہل بیت فرمایا کرتے تھے۔

= اور جذب و طلب کا عالم رہتا ہے۔

علمائے طریقت اور عارفانِ حق نے راہ سلوک کی چار منزلیں بتائی ہیں، جن کے نام یہ ہیں۔ ناسوت، ملکوت، جبروت، لاہوت۔

۱۔ ناسوت مادی عالم ہے جس کو عالم نفس بھی کہتے ہیں۔ یہ عالم مادی اجسام کی تکوین و تولید اور ان کی حیات و بقا کے اسباب و ذرائع کی کائنات ہے۔ یہاں کی چیزوں کی طبیعی خاصیات و اثرات اور ان کے اسباب و علل کے جاننے اور ان سے کام لینے کا نام سائنس ہے، اور ان کے اندر اللہ کی جو حکمتیں، مصلحتیں اور صناعیاں ہیں ان کے جاننے اور مشاہدہ کرنے کا نام عرفان حق ہے۔ اگر انسان کو عالم ناسوت کی چیزوں اور ان کے مادی اسباب و علل ہی سے تعلق ہے تو وہ مادیات میں پھنسا رہے گا۔ اور اس کا مطمع نظر دنیا پرستی، تن پرستی، نفس پرستی اور نفسانی خواہشات و لذات ہی رہیں گی یہ بڑی خطرناک منزل ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ ناسوت کی منزل بڑی کٹھن ہے جو تزکیۂ نفس کے بعد ہی طے ہوتی ہے، کہ نفس کے اوصاف ذمیمہ یکسر زائل ہو جائیں۔ اس کے بعد آگے کی منزل آتی ہے وہ ہے عالم ملکوت۔

۲۔ عالم ملکوت قلب کی منزل ہے یہاں قلب کے اصلی جوہر اُبھر آتے ہیں۔ یہ ہیں ملائکہ کے صفات، یعنی حمد و تسبیح تقدیس و تہلیل، رکوع و سجود، اور عجز و نیاز ہی سے واسطہ رہتا ہے۔ سالک جب اس منزل سے آگے بڑھتا ہے تو عالم جبروت آتا ہے۔

۳۔ عالم جبروت روح کا مقام ہے۔ یہاں روح کے اصلی اوصاف یعنی عشق الٰہی، جذب و طلب، شوق و ذوق، وجد و کیف، وارفتگی اور ربودگی کا غلبہ ہوتا ہے۔ یہ وہ اوصاف ہیں جن سے اللہ کا تقرب خاص نصیب ہوتا ہے اس کے بعد عالم لاہوت ہے۔

=

یہ بات حقیقت سے دور ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے بہت سی عورتوں کو طلاق دی ہے

تاریخ بہت سی صحیح اور غلط روایتوں کا مجموعہ ہے، جب بھی ضرورت پڑی ہے ان روایتوں کے رطب و یابس کی پردہ دری کی گئی ہے۔ جو روایتیں عام حالات کے مطابق ہوتی ہیں ان پر نقد و تبصرہ کی ضرورت نہیں پڑتی، لیکن جو روایتیں فطرت کے خلاف ہوتی ہیں فلسفۂ تاریخ ان کو قبول نہیں کرتا۔ انھیں میں وہ روایات بھی ہیں جو نوع انسانی کی برگزیدہ اور نہایت مقدس ہستیوں کے تقدس و عظمت کو پامال کر رہی ہیں۔ فلسفۂ تاریخ ان کو یہ کہہ کر بالکل ساقط الاعتبار قرار دے گا کہ یہ روایتیں ان پاکیزہ صفات اور اعلیٰ کردار انسانوں کی فطرت کے خلاف ہیں۔ درحقیقت ایسی روایتیں ان قدسیوں کی سراپا نزاہت زندگی میں ان نقوش کو بھرنا چاہتی ہیں جو ان کی سیرت کے نقوش ہو ہی نہیں سکتے۔ قصہ سازوں نے انبیاء علیہم السلام اور ائمۂ دین کی قدوسی سیرت میں بھی اس قسم کی روایتیں سنائی ہیں، مگر عقل و دانش نے ان تمام روایتوں کو یکسر غلط قرار دیا ہے، کیونکہ اکابر کی زندگی کے واقعات تو ایسے ہو ہی نہیں سکتے۔

اسی قسم کی ایک غلط روایت یہ بھی ہے کہ امام حسن علیہ السلام نے نوے عورتوں کو طلاق دی ہے۔ درحقیقت یہ بنی امیہ کا ناپاک پروپیگنڈہ ہے، جس کا مقصد آپ کی روز افزوں عزت و وقار کو گرانا اور اپنی سیاسی طاقت کو مضبوط کرنا ہے۔ اس روایت کو فلسفۂ تاریخ کی کسوٹی پر جانچو اور دیکھو کہ امام حسن علیہ السلام جیسا بے نفس انسان جس نے اپنی بے نفسی کی بنا پر اتنی بڑی حکومت

ــــ ۴ ـ عالم لاہوت "نظر رحمانی" کا مقام ہے جس کو لامکان بھی کہا گیا ہے۔ یہاں خودی سے رہائی ہو جاتی ہے اور فنائے تمام نصیب ہوتی ہے۔ مفتاح العاشقین ملفوظات حضرت خواجہ نصیر الدین چراغ دہلی قدس سرہٗ اور الدر المنظوم ملفوظات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سید جلال الدین بخاری قدس سرہٗ میں بھی یہ معارف مذکور ہیں۔ کچھ اس میں کچھ اس میں جن کو راقم السطور نے یکجا کر دیا ہے۔ اور تشریح کا اضافہ کیا ہے۔ ۱۲ کوثر

کو چھوڑ دیا ہے اور اس کے تمام حرکات و سکنات فنائے نفس اور بے نفسی کے بہترین نقوش ہیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ اس کی زندگی اس طرح کٹی ہو کہ شادی پر شادی کرتا جا رہا ہو اور نئی شادی کے لئے طلاق پر طلاق دیتا جا رہا ہو؟ یہ روایت امام حسن علیہ السلام کی پاکیزہ فطرت کے خلاف ہے، اگر نور کی فطرت ظلمت کے خلاف ہے، صداقت کی فطرت جھوٹ کے خلاف ہے، اور شرافت کی فطرت دنائت کے خلاف ہے، تو یقیناً یہ روایت بھی امام علیہ السلام کی پاکیزہ فطرت اور پاکیزہ زندگی کے یکسر خلاف ہے، بے نفس کو نفس پرست بنانا جھوٹ ہے، غلط ہے، بہتان ہے۔ اور افترا ہے جو ذات پاک نبی کے خمیر سے بنی ہے وہ ہر دنائت اور نفس پرستی سے پاک ہے۔ اور جو روایت اس کے خلاف ہے، وہ بدباطن انسانوں کی افترا سازی ہے جسے فلسفۂ تاریخ ایک سیکنڈ کے لئے بھی تسلیم نہیں کر سکتا۔ فلسفۂ تاریخ کے علاوہ قرآن مجید بھی تعلیم دے رہا ہے کہ جو بات کسی پاکیزہ زندگی کا واقعہ ہو ہی نہیں سکتی اگر کوئی اسے سنائے تو سننے کے ساتھ ہی کہہ دو۔

هٰذَا اِفْكٌ مُّبِيْنٌ ۝ (سورۂ نور ع ۲) یہ صریح تہمت ہے۔

هٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيْمٌ ۝ (") یہ بہت بڑا بہتان ہے۔

قرآن مجید کی اس ہدایت کی بنا پر مذکورہ بالا غلط روایت کو ہم صریح تہمت اور بہتان عظیم کہنے پر مجبور ہیں۔

ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ امام عالی مقام نے دو ایک عورتوں کو طلاق دے دی ہو جس کی وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ امام علیہ السلام کے سامنے اپنی والدہ ماجدہ خاتون جنت بضعۃ الرسول سیدۂ عالم حضرت فاطمہ زہرا کی سیرت پاک ہے، امام صاحب نے جس عورت کو حبالۂ نکاح میں لیا اسے حضرت سیدہ کی سیرت پر چلانے کی کوشش کی اگر وہ اس سانچے میں ڈھل نہ سکی اور امام علیہ السلام کی ایسی برگزیدہ شریک زندگی نہ بن سکی جیسی چاہیئے۔ ایسی صورت میں وہ خاندان نبوت کا رکن کیسے رہ سکتی ہے؟ لہٰذا طلاق دینی ہی چاہیئے۔ پس ایسی ہی ناگزیر

صورت میں امام حسن علیہ السلام نے طلاق دی ہے۔ اور اس میں خاندان نبوت کے وقار کا تحفظ ملحوظ ہے جو نہایت ضروری ہے۔

امام حسن علیہ السلام نے ایسی ہی دو ایک عورتوں کو طلاق دی ہے جو تمام تر اعلیٰ کردار کی تشکیل کے تحت ہوئی ہے۔ دشمنان اہل بیت نے اس سے پروپیگنڈا کھڑا کیا، کہ ان کا کام ہی یہی ہے اکائی کو دہائی اور دہائی کو سیکڑہ بنانا پروپیگنڈے کا عام شیوہ ہے۔ اور اسی کا نام ہے سیاسی پروپیگنڈا کا کمال! لیکن پروپیگنڈا پروپیگنڈا ہی رہے گا۔

وَيَوْمَ تَقُومُ السَّاعَةُ يَوْمَئِذٍ يَخْسَرُ الْمُبْطِلُونَ ۝ (پ ۲۵ الجاثیہ ع ۲)

جس دن قیامت قائم ہوگی اس دن اہل باطل بڑے خسارہ میں پڑیں گے۔

امام حسن کی روحانی خلافت سے امت نے بہت فوائد حاصل کئے

آپ نے نیابت رسول کے منصب سے امت کی بڑی اہم رہنمائی فرمائی ہے۔ آپ کی باطنی رہنمائی کے بیان کے لئے ضخیم کتاب بھی ناکافی ہے۔ ہندوستان کا وہ عظیم البرکت روحانی سلسلہ جس سے حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی جیسے ولی کامل اور یگانۂ روزگار قطب الارشاد منسلک ہیں۔ اور جو حضرت خواجہ ناصر عندلیب دہلوی قدس سرہٗ کے ذریعہ فیض بخش عالم ہوا ہے، وہ تمام تر حضرت امام حسن علیہ السلام کی روحانی تعلیم و ارشاد کا سلسلہ ہے جس نے لاکھوں دلوں کو منور کیا اور آج تک اس کا فیض جاری ہے۔ اس کے ایمان افروز معارف و بصائر دیکھنے ہوں تو حضرت خواجہ میر درد قدس سرہٗ کی کتاب قیم کا مطالعہ کیا جائے جس کا نام علم الکتاب ہے۔

باطنی ارشاد و ہدایت کے علاوہ ظاہری شریعت کی رہنمائی میں بھی آپ کا درجہ بہت بلند ہے۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں جو جماعت علم و افتا کے منصب پر فائز تھی ان میں ایک نمایاں شخصیت آپ کی ذات گرامی بھی تھی۔ (اعلام الموقعین ج ۱ ص ۱۲)

اس سلسلہ میں وہ ائمۂ دین بھی آپ کی طرف رجوع کیا کرتے تھے جو امام الائمہ اور نہایت بلند پایہ

محدث، مفسر اور فقیہہ ہوئے ہیں۔ اور امام حسن و حسین کے زمانہ میں بھی ان کا علمی پایہ بہت بلند تھا۔ مثلاً حضرت امام حسن بصری (جو تفسیر، حدیث، فقہ اور ارشاد و تصوف کے بہترین جامع ہیں۔ اور اس جامعیت میں عدیم المثال ہیں) اس رجوع کی بڑی وجہ یہ ہے کہ مشکل ترین مسائل جن کے حل کرنے سے ائمہ فن بھی درماندہ ہیں۔ امام حسن علیہ السلام ان کی اس طرح گرہ کشائی فرماتے تھے کہ قلوب پکار اٹھتے، علم و عرفان کا آفتاب ان کے گھر سے نکلا ہے ان حضرات کے سینے علوم نبوت کے مخزن اور ان کے قلوب بصائر الٰہیہ کے منبع ہیں۔

مسئلہ تقدیر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ ہے، امام حسن بصری قدس سرہٗ نے اس کو سمجھنے کے لئے سیدنا امام حسن علیہ السلام کی خدمت میں عریضہ بھیجا، حضرت امام نے جو جواب تحریر فرمایا ہے قرآن و حدیث کے بعد پورے اسلامی لٹریچر میں اس کی نظیر نہیں۔ امام علیہ السلام تحریر فرماتے ہیں:

من لم یومن بقضاء اللّٰہ وقدرہٖ	جو شخص قضاء و قدر اور اس کے خیر و شر پر ایمان
وخیرہٖ وشرہٖ فقد کفر، ومن	نہیں رکھتا وہ کفر کا مرتکب ہے، اور جس نے
حمل ذنبہ علیٰ ربہ فقد فجر،	اپنے گناہ کو اللہ پر رکھا اس نے دین کو پھاڑ
وان اللّٰہ لایطاع استکراھا	ڈالا، اللہ کی اطاعت جبراً نہیں کی جاتی
ولا یعصی بغلبۃ، لانہٗ تعالیٰ	(کہ اطاعت کرنے پر کوئی مجبور محض نہیں) اور
مالک لما ملکھم وقادر علیٰ	اس کی نافرمانی غلبہ پا جانے کی بنا پر نہیں کی جاتی،
ما اقدرھم، فان عملوا	(کہ اس پر کون غالب ؟) اللہ نے جو ملکیت دی ہے اس
بالطاعۃ لم یحُل بینھم	کا مالک بھی وہی ہے اور جو قدرت بخشی ہے اس پر بھی
وبین ما عملوا: وان	وہی قادر ہے، اگر لوگ اطاعت کر رہے ہیں تو
عملوا بالمعصیۃ فلو	اللہ تعالیٰ ان کے اور اطاعت کے درمیان حائل نہیں
شاء لحال بینھم وبین ما	ہے (کہ کرنے نہ دے گا) اور اگر گناہ کا کام کرنا چاہیں اور
عملوا، فان لم یفعل فلیس	اس کو منظور ہو کہ نہ کرنے دے تو بیچ میں حائل ہو جائے گا۔

هوالذی جبرھم علی[1] ذالک، ولوجبراللہ الخلق علی الطاعۃ لا سقط عنھم الثواب، ولوجبرھم علی المعصیۃ لاسقط عنھم العقاب، ولواھملھم کان عجزا فی القدرۃ ولکن لہ فیھم المشیئۃ غیبھا عنھم فان عملوا بالطاعۃ فلہ المنۃ علیھم، وان عملوا بالمعصیۃ فلہ الحجۃ علیھم[2] والسلام

اگر بیچ میں حائل نہیں ہوا تو گناہ پر مجبور کہاں کیا؟ اگر اللہ تعالیٰ مخلوقات کو اطاعت پر مجبور کرتا تو ثواب ساقط ہو جاتا اور اگر گناہ پر مجبور کرتا تو عذاب ساقط ہو جاتا اور اگر ان کو مطلقاً آزاد چھوڑ دیتا (کہ کنٹرول ہی نہ رکھتا) تو رب قدرت رکھنے میں درماندگی ظاہر ہوتی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ سب میں اسی کی مشیت کار فرما ہے جو نگاہوں سے اوجھل ہے اب اگر لوگ اطاعت کر رہے ہیں تو یہ اس کے احسان کی کرم فرمائی ہے اور اگر گناہ کر رہے ہیں تو حجۃ الٰہی قائم ہے (کہ اپنے اختیار عمل کو غلط کیوں استعمال کیا؟ اور عدول حکمی کیوں کی)۔

---

[1] مرقاۃ شرح مشکوٰۃ ج ۱ ص ۵۹ مطبع وکٹوریہ پریس ملتان۔ ۱۲ کوثر

[2] ائمۂ دین نے مسئلہ تقدیر میں عموماً ائمۂ اہل بیت ہی کی طرف رجوع کیا ہے۔ ہمارے امام ہمام حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اس مسئلہ میں ایسا ہی کیا ہے، چنانچہ آپ نے سیدنا امام جعفر صادق علیہ السلام سے اس کا حل طلب کیا۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

یاابن رسول اللہ ھل فوض الامرالی العباد؟ فقال: اللہ اجل من ان یفوض الربوبیۃ الی العباد، فقلت ھل جبرھم علی ذالک؟ فقال: اللہ اعدل

اے فرزند رسول اللہ کیا اللہ تعالیٰ نے امور کو بندوں کے حوالہ کر دیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اللہ اس سے بلند و برتر ہے کہ خدائی بندوں کو حوالہ کر دے میں نے کہا، کیا اللہ نے بندوں کو مجبور بنا رکھا ہے، فرمایا اللہ عادل ہے پھر مجبور اور بے بس کیوں کرے؟ میں نے کہا =

تقدیر کے جتنے بھی مباحث ہیں اس مکتوب اقدس میں سب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اگر شرح کر دی جائے تو ایک مستقل کتاب ہو جائے۔ البتہ اس کے پہلے جملے کی شرح سن لیجیے جس میں تقدیر کے خیر و شر کا ذکر ہے۔ اس ذکر سے "تجدد پسند" لوگوں کو بڑی وحشت ہوتی ہے، لیکن یہ قلّت فہم کا نتیجہ ہے کہ اگر فہم سلیم سے کام لیا جائے تو نظر آنے لگے کہ تقدیر کے خیر و شر کا عقیدہ فلسفہ اور سائنس کا بھی فارمولا ہے۔ تفصیل یہ ہے:

ہر چیز میں علت و معلول کا اصول کارفرما ہے جس کا صحیح علم حاصل کرنا سائنس کا سنگ بنیاد ہے، سورج نکلتا ہے تو دن ہوتا ہے۔ اندھیرے میں چراغ جلاؤ اجالا ہو جائے گا۔ کپڑے پر سیاہی گر سی اور دھبہ لگا۔ اس قسم کے ہزاروں واقعات تمہاری نظر سے گذرے ہیں۔ یہ تمام واقعات نتائج ہیں جو ایک دوسری چیز سے پیدا ہوئے ہیں، فلسفہ اور سائنس ان نتائج کو معلول کہتے ہیں اور جن سے یہ پیدا ہوئے ہیں ان کا نام علت[1] رکھا ہے۔ یعنی علت وہ چیز ہے جس سے کوئی دوسری

= ان یجبرھم علی ذالک۔ فقلت کیف ذالک؟ فقال: بین بین لاجبر ولا تفویض (تحفہ اثنا عشریہ ص ۲۷۴)

پھر کیا صورت ہے؟ فرمایا: نہ مجبور کرتا ہے نہ سپرد کرتا ہے۔ معاملہ بین بین ہے۔

امام صادق علیہ السلام کا مطلب یہ ہے کہ بندہ بعض امور میں مجبور ہے، بعض امور میں اسے اختیار بخشا گیا ہے۔ مثلاً اس میں مجبور ہے کہ آنکھ سے دیکھ ہی سکتا ہے سن نہیں سکتا، لیکن اللہ نے اس کا اختیار دیا ہے کہ آنکھ سے جس نظر آنے والی چیز کو چاہے دیکھ لے۔ اسی طرح ہر عضو کے مخصوص وظائف ہیں جن کے کرنے کا اسے اختیار بخشا گیا ہے، لیکن جو امور ان کے علاوہ ہیں بندہ ان میں مجبور ہے۔ ۱۲ کوثر

[1] اس میں شبہ نہیں کہ علت میں ایک قوت ہے، جس سے معلول کو وجود ہوتا ہے، مگر یہ قوت علت کی ذاتی قوت نہیں بلکہ خدا کی طرف سے ہے اور خدا کی پیدا کردہ ہے۔ امام غزالی اور متکلمین اسلام نے اس کو تفصیل بیان کیا ہے اور یورپ کے اہل نظر فلاسفہ مالبرانش وغیرہ بھی یہی کہتے ہیں۔ جو لوگ علت ہی کی قوت کے قائل ہیں وہ بڑے زبردست =

چیز وجود میں آئے، یہی دوسری چیز معلول ہے۔

ہر شخص کو خیر اور شر دونوں سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ تقدیر میں خیر بھی ہے اور شر بھی، دونوں میں بھی علت اور معلول کا سلسلہ قائم ہے، یعنی تقدیر خیر اسباب خیر کے ساتھ مقرر ہوئی ہے اور تقدیر شر اسباب شر کے ساتھ مقرر ہوئی ہے۔ صورت یہ ہے کہ اگر انسان اسباب خیر کو اکٹھا کرے گا تو خیر کا ظہور ہوگا۔ اور اسباب شر کو اکٹھا کرے گا تو شر کا ظہور ہوگا۔ اس طرح تقدیر اسباب کے ساتھ مقدر ہوئی ہے۔ لہٰذا حصول خیر کے لئے خیر کے اسباب فراہم کرنے ضروری ہیں تقدیر کا عقیدہ یہ نہیں کہتا کہ اسباب سے کام نہ لو، جو ہونا ہے وہ خود ہو جائیگا ولی کبیر مخدوم الملک حضرت مخدوم شرف الدین یحییٰ منیری قدس سرہٗ نے بھی اس مسئلہ کو اسی پیرایہ میں سمجھایا ہے۔ آپ کے سہ صدی مکتوبات (مطبوعہ مطبع اسلامی لاہور) صفحہ ۹۸ میں ہے:

"تقدیر کو ماننے کی شرط یہ نہیں ہے کہ کھیت بونے کے بعد سینچا نہ جائے اور پانی نہ دیا جائے اور کہا جائے کہ اگر تقدیر میں اگنا ہے تو پودا خود بخود اگے گا۔"

اس کے بعد حضرت موصوف فرماتے ہیں:

وانکہ تقدیر بخیر کردہ است تقدیر — اللہ نے جو تقدیر خیر مقدر فرمائی ہے تو

= مغالطہ میں پڑے ہیں کہ قوت کو دیکھا اور خالق قوت تک نظر پہنچی؟ یہ ہے کوتاہ نظری۔ اگر تنگ نظری چھوڑ دیں تو پکار اٹھیں گے کہ قوت کا بھی خالق ہے جس کے تصرف اور قبضۂ قدرت میں تمام کائنات اور تمام تکوینات ہیں۔ اس مقام پر پہنچ کر آدمی علت کا پرستار نہیں رہ سکتا۔ اور علتی نہیں کہا جا سکتا، جس کے متعلق رومی حقیقت شناس نے کہا ہے۔

"ہر چہ گیرد علتی علت شود"

علت و معلول پر راقم السطور نے اپنی کتاب معیار حکمت میں شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے، جو چھپ چکی ہے اور الٰہ آباد بورڈ کے درجہ عالم کی نصابی کتاب ہے۔ ۱۲ کوثر

بہ سبب کردہ است، وآنکہ تقدیر بشر کردہ است تقدیر بسبب کردہ است۔

اسباب خیر کے ساتھ مقدر فرمائی ہے اور جو تقدیر شر مقدر فرمائی ہے تو اسباب شر کے ساتھ مقدر فرمائی ہے۔

اسی بنا پر اہل سنت کا مسلّم عقیدہ ہے کہ انسان اپنے افعال کا خالق نہیں بلکہ کاسب ہے یعنی فعل کے اسباب فراہم کرتا ہے جن کو اللہ نے یہ قوت دی ہے کہ ان کے فراہم ہو جانے سے فعل کا وجود ہوتا ہے۔ عالم خلق میں جتنی چیزیں ہیں سب کی تکوین اسی طرح ہوتی ہے تمام کائنات اور تمام تکوینات اسباب و علل کے نتائج ہیں۔ اور اسباب و علل کی اس تاثیر کا خالق خداوند قدوس ہے

خالق خلق لاشریک لہٗ

وحدہٗ لاالٰہ الّا ہو۔

امام حسن علیہ السلام کی شہادت

ابن سعد لکھتے ہیں کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے خواب دیکھا کہ آپ کی دونوں آنکھوں کے درمیان قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ٥ لکھا ہے۔ مشہور تابعی و معبّر حضرت سعید بن مسیب نے اس خواب کو سُن کر کہا "اب جلد ہی آپ کا وصال ہوگا" ہُوا بھی ایسا ہی چنانچہ اس کے چند روز بعد آپ نے رحلت فرمائی۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۴)

یوں تو آپ کو کئی بار زہر دیا گیا، لیکن ۵۰ھ میں ایسا زہر ہلاہل دیا گیا کہ کلیجے کے ٹکڑے کٹ کٹ کر گرنے لگے۔ کس نے زہر دیا؟ لوگوں کا خیال ہے کہ آپ کی بیوی جعدہ بنت اشعث نے یہ جرم کیا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یزید نے زہر دلوایا۔ کوئی امیر معاویہ کا نام لیتا ہے، لیکن یہ محض قیاس ہے، جس کو صحیح ماننے کا کوئی قطعی ثبوت نہیں، اللہ اعلم کس نے یہ ناپاک حرکت کی۔ سیدنا امام حسین علیہ السلام نے باصرار پوچھا کہ بھائی جان آپ کو کس نے زہر دیا ہے؟ مگر صبر و تحمل کے اس تاجدار نے نام نہیں بتایا اور فرمایا "میں جس کو اس فعل کا مرتکب سمجھتا ہوں، اگر واقعی وہی اس کا مرتکب ہے تو اللہ بہتر بدلہ لینے والا ہے۔ اور اگر وہ مرتکب نہیں ہے تو میں نہیں چاہتا

کہ کوئی بے قصور رہا خو ذہو۔"

زہر دیئے جانے کے تیسرے دن بعد آپ کی شہادت ہوئی۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ شہادت کے سنہ اور تاریخ میں بڑا اختلاف ہے غالباً ۲۹ صفر ۴۹ھ زیادہ صحیح ہے۔ عمر ۴۷ سال تھی

شہادت سے پہلے آپ نے اہل بیت اطہار کو وصیت فرمائی اور امام حسین علیہ السلام سے یہ بھی فرمایا کہ" مجھے نانا جان کے پہلو میں دفن کیا جائے، لیکن اندیشہ ہے کہ بنی امیہ ایسا کرنے نہ دیں گے۔ اگر ان کی مزاحمت سے فتنہ کا ڈر ہو تو عام مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کر دینا۔"

آپ کا اندیشہ صحیح نکلا چنانچہ مروان اور بنی امیہ اور ان کے حامیوں نے مزاحمت کی کہ ہم حسن کو یہاں دفن ہونے نہ دیں گے۔ ظلم کی حد یہ ہے کہ رسول کے محبوب نواسے کو رسول کے پہلو میں دفن کرنے سے بزور شمشیر روکا جاتا ہے۔ حضرت ابوہریرہ وغیرہ نے سیدنا امام حسین علیہ السلام سے عرض کی کہ فتنے سے بچنے کے لئے اپنے برادر معظم کی وصیت کے مطابق بقیع میں دفن کیجئے۔ آپ نے وصیت کا لحاظ فرمایا اور اس تاجدار صبر و تحمل اور اس جانشین رسول اعظم کو جنت البقیع میں دفن کیا گیا۔

نور کی بارش ہے محشر تک مزار پاک پر

اندوہِ عظیم | سیدنا امام حسن علیہ السلام کی رحلت کوئی معمولی واقعہ نہ تھا۔ رسول کی ایک بڑی نشانی اٹھ گئی۔ دنیا اس ذات پاک سے محروم ہو گئی جو رسول کی شبیہ اعظم ہے، صورت بھی رسول کی سیرت بھی رسول کی، مدینہ میں گھر گھر ماتم تھا۔ بازار اور دکانیں بند ہو گئیں۔ گلیوں میں سناٹا چھا گیا۔ حضرت ابوہریرہ مسجد میں آہ و زاری کر رہے تھے اور پکار پکار کر کہتے تھے" لوگو آج خوب رو لو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا محبوب دنیا سے اٹھ گیا۔"

جنازہ میں اتنا ہجوم تھا کہ اس سے پہلے مدینہ میں اتنا ہجوم دیکھا نہیں گیا۔ جتنی کہ اگر سوئی بھی پھینکی جاتی تو ہجوم کی کثرت کی وجہ سے زمین پر نہ گرتی۔

بنی امیہ اور ان کے حامیوں کا حال

سیدنا امام حسن علیہ السلام کی شہادت سے تمام عالم اسلامی غم واندوہ میں ڈوب گیا لیکن بنی امیہ اور ان کے حامیوں میں خوشی تھی اس سلسلہ میں اہل بیت اطہار کے بعض دشمنوں نے ایسی دریدہ دہنی کی ہے جس سے ہر مسلمان تڑپ اٹھتا ہے، امام ابوداؤد کی روایت ہے:

مقدام[1] بن معدی کرب اور عمرو بن اسود اور ایک اسدی (یعنی بنی اسد کا ایک شخص) یہ تینوں معاویہ بن ابی سفیان کے پاس گئے۔ معاویہ نے مقدام سے کہا: تمہیں خبر ہے (کہ نہیں؟) کہ حسن بن علی کا انتقال ہو گیا۔ مقدام نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا، (معاویہ نے کہا): کیا تم اس کو مصیبت سمجھتے ہو؟ مقدام نے جواب دیا۔ میں اسے کیوں نہ مصیبت سمجھوں؟ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گود میں لے کر فرمایا تھا "یہ (بچہ) مجھ سے (شباہت رکھتا) ہے، اور حسین علی سے" اس پر اس اسدی نے (معاویہ کو خوش کرنے کے لئے خوشامد سے کہا:

جمرۃ اطفأ اللہ — یہ ایک چنگاری تھی جس کو اللہ نے بجھا دیا۔

(حضرت مقدام کو طیش آیا کہ اس نے ایسی بدتمیزی کی اور معاویہ نے اس کی بدتمیزی اور دریدہ دہنی پر ڈانٹا بھی نہیں چنانچہ) مقدام نے (معاویہ سے) کہا۔ آج میں یہاں سے بلا ایسی بات کہے نہ ٹلوں گا جس سے تم تلملا اٹھو، اور تمہیں بہت برا لگے پھر کہا۔ اے معاویہ اگر میں سچ بات کہوں تو تصدیق کرنا اور غلط بولوں تو تکذیب کر دینا۔ معاویہ نے کہا: ایسا ہی کروں گا۔ اب مقدام نے کہا۔ میں

---

[1] حضرت مقدام بن معدی کرب بنی کندہ کے ایک فرد ہیں اور صحابی ہیں۔ آپ نے شام میں سکونت اختیار فرمائی تھی۔ آپ سے متعدد حضرات نے حدیث کی روایت حاصل کی ہے انھیں میں امام شعبی بھی ہیں ملاحظہ ہو الجرح والتعدیل ج ۳ ص ۳۰۲ کوثر۔

تم کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ کیا تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد سنا ہے ؟ کہ آپ نے سونے کی چیز پہننے سے (مردوں کو) منع فرمایا ہے۔ معاویہ نے کہا۔ ہاں سُنا ہے۔ مقدام نے کہا۔ تم کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ کیا تم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد معلوم ہے ؟ آپ نے ریشمی لباس پہننے سے (مردوں کو) منع فرمایا ہے۔ معاویہ نے کہا۔ ہاں معلوم ہے۔ مقدام نے کہا میں تم کو اللہ کی قسم دلاتا ہوں کہ کیا تم کو آپ کا یہ ارشاد معلوم ہے ؟ کہ آپ نے درندوں کی کھال پہننے اور اس پر چڑھنے (یعنی اس کے فرش پر بیٹھنے اور سواری پر رکھ کر اس پر سوار ہونے) سے منع کیا ہے۔ معاویہ نے کہا۔ ہاں معلوم ہے۔

اب مقدام نے کہا: اے معاویہ! اللہ کی قسم یہ سب چیزیں میں تمہارے گھر میں دیکھ رہا ہوں۔

معاویہ نے کہا: میں پہلے ہی سمجھ گیا تھا کہ میں تم سے نجات نہیں پا سکتا۔

(اس روایت کے راوی) خالد کہتے ہیں کہ: معاویہ نے مقدام کو اتنا مال، دینے کا حکم دیا جتنا عمرو بن اسود اور اس اسدی شخص کو نہیں دیا۔ (یعنی حضرت مقدام کو اور عمرو بن اسود کو اور اس اسدی شخص کو بھی مال دے کر نوازا، جس نے سیدنا امام حسن علیہ السلام کی شان پاک میں ایسی بدتمیزی اور دریدہ دہنی کی تھی، لیکن حضرت مقدام کو زیادہ دیا۔ اور ان کے بیٹے کا حصہ دوسو پانے والوں میں مقرر کیا۔

مقدام کو جتنا کچھ ملا تھا، انھوں نے اپنے ساتھیوں کو بانٹ دیا اور اسدی کو جتنا ملا تھا اس نے کسی کو بھی نہیں دیا۔ یہ خبر معاویہ تک پہنچی تو معاویہ نے کہا: مقدام سخی آدمی ہیں اور اسدی ممسک ہے کہ اپنی چیز کو

اچھی طرح بچا کر رکھ لیا۔[1]

سیدنا امام حسن علیہ السلام کی شان اقدس میں اس اسدی نے جو دریدہ دہنی کی ہے وہ اس کا ثبوت ہے کہ یہ شخص اہل بیت اطہار کا شدید دشمن ہے۔ اور کون نہیں جانتا کہ ان کا دشمن اللہ و رسول کا دشمن ہے۔ اگر یہ شخص جہنمی اور ناری نہ ہوتا تو سیدنا امام حسن علیہ السلام کو چنگاری یعنی فتنے کی آگ کہہ کر اپنا ایمان نہ بیچتا۔ اور کیا تعجب ہے کہ وہ پہلے سے ایمان بیچ چکا ہو۔ ایمان ہی تو سب کچھ ہے جو اہل بیت اطہار کی محبت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔

اللہ پاک اہل بیت اطہار کی محبت میں ہم کو زندہ رکھے، اسی پر ہمارا خاتمہ ہو اور انھیں قدوسیوں کے ساتھ ہمارا حشر ہو۔ آمین یارب العالمین۔

---

[1] سنن ابی داود ج ۲ باب فی جلود النمر ص ۲۱۴ مطبع مجیدی کانپور سنہ ۱۹۵۵ء۔

حسنین عظیمین علیہما السلام

یہ دو گلِ شادابِ رسولِ عربی ہیں

سیدنا امام حسن و سیدنا امام حسین علیہما السلام کے بعض انفرادی فضائل کے علاوہ اکثر فضائل مشترک ہیں اس لئے پہلے ان دونوں قدسیوں کے کچھ مشترک فضائل درج کئے جاتے ہیں۔ اس کے بعد سیدنا امام حسن علیہ السلام کے کچھ انفرادی فضائل پیش کئے جائیں گے پھر فضائل امام حسین علیہ السلام کا باب لکھا جائے گا۔

محبوبیت اسلام کے یہ دونوں شہزادے اللہ و رسول کے بے حد محبوب ہیں۔ حافظ طبرانی اور حافظ ابو نعیم کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے:

الحسن والحسین من احبهما احبته ومن احبته احبه الله، ومن احبه الله ادخله جنات النعیم، ومن ابغضهما اوبغی علیهما ابغضته ومن ابغضته ابغضه الله، ومن ابغضه الله ادخله نار جهنم وله عذاب مقیم۔

(کنز العمال ج ۶ ص ۲۲)

حسن اور حسین سے جو شخص محبت رکھے گا اس سے میں محبت رکھوں گا اور جس سے میں محبت رکھوں گا اس سے اللہ محبت فرمائے گا۔ اور جس سے اللہ محبت فرمائے گا اس کو جنت نعیم میں داخل کرے گا اور جو شخص ان سے بغض رکھے گا اس کا میں دشمن ہوں اور جس کا میں دشمن ہوں اللہ بھی اس کا دشمن، اور جس کا اللہ دشمن ہے، اسے وہ جہنم میں داخل فرمائے گا۔ اور اس کو ہمیشہ عذاب ہوگا۔

• مسند احمد، سنن ابن ماجہ، اور مستدرک میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من احب الحسن والحسین فقد احبنی، والبغضہما فقد البغضنی۔ (کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۰)	جس نے حسن اور حسین سے محبت رکھی اس نے مجھ سے محبت رکھی اور جس نے ان سے بغض رکھا اس نے مجھ سے بغض رکھا۔

• آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس زمانہ میں جب کہ یہ دونوں حضرات گود میں رہتے تھے، یہ دعا فرمائی ہے۔

ھذان ابنای وابنا بنتی، اللھم انی احبہما فاحبہما واحبّ من یحبہما۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۸ وابن حبان، کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۰)	یہ دونوں میرے فرزند ہیں اور میری بیٹی کے فرزند ہیں۔ یا اللہ میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان سے محبت فرما اور جو شخص ان سے محبت رکھے اس سے بھی محبت فرما۔

• ان کی اور ان کے والدین ماجدین کی محبوبیت کا یہ عالم ہے کہ جو شخص ان حضرات سے محبت رکھے گا وہ قیامت کے دن حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ رہے گا۔ حدیث میں ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

من احبنی واحب ھذین وابا ھما وامھما کان معی فی درجتی یوم القیامۃ (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۵ ومسند احمد، کنز العمال ج ۲ ص ۲۱۶)	جو شخص مجھ سے محبت رکھے گا اور میرے حسن و حسین سے اور ان کے والدین سے وہ قیامت کے دن میرے ہمراہ میرے درجہ میں رہے گا۔

• حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم فرط محبت سے حسنین پاک کو گلے سے لگا کر سونگھا کرتے اور فرماتے تھے میرے خاندان میں مجھے سب سے زیادہ محبوب یہی ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگوں نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا۔ اہل بیت میں آپ کا سب سے

زیادہ محبوب کون ہے؟ آپ نے فرمایا حسن اور حسین اسی روایت میں ہے کہ آپ حضرت فاطمہ سے فرمایا کرتے تھے:

ادعی لی ابنیّ فیشمھما ویضمھما الیه (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۸) — میرے دونوں بچوں کو لاؤ پھر ان کو سونگھتے اور گلے لگایا کرتے۔

نبی کے دو گلِ خنداں

صحیح ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۸) میں ہے کہ ایک عراقی نے حضرت ابن عمر سے کپڑے میں مچھر کا خون لگ جانے کا مسئلہ پوچھا۔ انہوں نے کہا۔ اسے دیکھو یہ مچھر کے خون کا مسئلہ پوچھتا ہے حالانکہ ان لوگوں نے فرزند رسول کا قتل کیا ہے اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے۔

ھما ریحانتیّ من الدنیا — یہ دونوں (حسن وحسین) دنیا میں میرے دو پھول ہیں۔

جوانانِ جنت کے سردار

مسند احمد و ترمذی میں حضرت ابوسعید خدری سے مروی ہے معجم کبیر طبرانی میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ سے معجم اوسط میں حضرت اسامہ اور حضرت براء سے اور دیگر کتب حدیث میں دیگر صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین سے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنة (کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۰) — حسن و حسین جوانان جنت کے سردار ہیں۔

وراثت نبوی

حضرت سیدۂ عالم خاتون جنت سلام اللہ علی ابیہا وعلیہا حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مرض وفات میں سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہما السلام کو حضور کے سامنے لا کر گذارش کرتی ہیں "یا رسول اللہ یہ دونوں آپ کے بچے ہیں، آپ ان کو اپنی وراثت عطا فرمائیے۔ آپ نے فرمایا:

اما الحسن فلہ ھیئتی و سو ددی، حسن کو اپنی ہیئت اور سرداری،
واما الحسین فلہ جرائتی وجودی اور حسین کو اپنی بہادری اور سخاوت
(کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۱ طبع حیدرآباد) بخشی۔

ان خوبیوں کے علاوہ امام حسن اور امام حسین علیہما السلام ان تمام فضائل میں بھی وراثت مصطفےٰ ہیں (صلی اللہ علیہ وسلم) جن کی بنا پر اکابر ملت وارث نبوی[1] کہے جاتے ہیں۔ ان میں حسنین پاک کو یہ مزید خصوصیت اور شرف حاصل ہے کہ چونکہ خمیر نبوی اور طینت مصطفوی سے ان کی تکوین ہوئی ہے اس لئے علم نبوت، حکمت ربانی، محفوظیت اور باطنی قطبیت میں یہ امام الائمہ ہیں۔ شاہ ولی اللہ صاحب التفہیمات الالٰہیہ ج ۲ ص ۱۴) میں لکھتے ہیں۔

فوارثہ الذین اخذ و الحکمۃ والعصمۃ، والقطبیۃ الباطنۃ ھم اھل بیتہ وخاصتہ، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وہ وارث جنھوں نے آپ سے حکمت، عصمت اور باطنی قطبیت اخذ کی ہے وہ آپ کے اہل بیت اور آپ کے مخصوص اقربا ہیں۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ خمیر نبوی کے اثر سے اعلیٰ کمالات ان کی فطرت میں ودیعت

---

[1] وارثان نبوی وہ مقدس حضرات ہیں جو ایمان و عرفان اور استقامت دین میں بے حد راسخ القدم ہیں، جن کو قرآن مجید الراسخون فی العلم فرماتا ہے، حدیث نے الراسخون فی العلم کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے :

من برت یمینہ وصدق لسانہ واستقام قلبہ ومن عف بطنہ و فرجہ فذالک من الراسخین فی العلم (الدر المنثور ج ۲ ص ۷)، جس کی قسم پوری ہو کے رہے اور زبان صادق البیان ہو اور دل مستقیم ہو، اور شکم (لقمۂ حرام سے) اور عضو تولید (فعل حرام سے) عفیف رہے وہ شخص الراسخین فی العلم لوگوں میں ہے۔

غالبًا یہ الراسخون فی العلم کی علامتیں ہیں، جیسا کہ روح المعانی ج ۳ ص ۸۳ میں ہے)

ہیں جو چیزیں اوروں کو سالہاسال مجاہدہ اور ریاضت سے بھی حاصل نہیں ہوتیں وہ سب ان کا فطری جوہر ہیں، جیسے سورج سے نور کی شعاعوں کا نکلنا سورج کا فطری جوہر ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط۔

امام حسن علیہ السلام کے مخصوص فضائل

مع دیگر مناقب

سر سے سینہ تک شبیہ رسول

سیّدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم فرماتے ہیں: حسن: سر سے سینہ تک رسول خدا سے بہت زیادہ مشابہ تھے، اور حسین: سینہ سے نیچے تک بہت زیادہ مشابہ تھے۔ (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹) یعنی یوں تو یہ دونوں حضرات حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم شکل تھے۔ لیکن امام حسن سر سے سینہ تک زیادہ مشابہ تھے اور امام حسین باقی حصہ میں زیادہ مشابہ تھے۔

صلح و آشتی کا پیکر جمیل

امام حسن علیہ السلام کی ایک بڑی فضیلت یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کے متعلق یہ پیشین گوئی فرمائی ہے:

ان ابنی ھذا سید یصلح اللہ علی یدیہ بین فئتین (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۸)

میرا یہ فرزند سردار ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ سے دو بڑے گروہوں میں صلح کرائے گا۔

امیر معاویہ سے صلح کے وقت آپ کی اس فضیلت عظیم کا ظہور ہوا، تفصیل گزر چکی ہے۔

بہترین سوار سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹ میں ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسن ابن علی کو کندھے پر سوار کئے ہوئے تھے کہ ایک شخص نے کہا: "میاں صاحبزادے بہترین سواری ہے۔" آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اور سوار بھی کتنا اچھا ہے۔ (ونعم الراکب ھو)

دنیاوی جاہ وحشم سے بے نیازی مسلمانوں کے شوریٰ نے آپ کو تخت خلافت کا مسند نشین بنایا تھا، چالیس ہزار نفوس نے آپ کے دست مبارک پر جاں بازی کی بیعت کی تھی۔ اور آپ کے ایک اشارہ پر سر کٹانے کے لئے تیار تھے۔ حجاز، یمن، عراق، خراسان، اور ایران کے آپ نہایت محبوب حکمراں تھے، لیکن آپ نے انسانوں کے خون بچانے کی خاطر اتنی عظیم الشان سلطنت چھوڑ کر جاہ وحشم سے بے نیازی کا وہ ثبوت دیا ہے جو تاریخ انسانی کا ایک معجزہ ہے۔ مزید تفصیل خلافت سے دست برداری کے باب میں گذر چکی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس بے نفسی اور جاہ وحشم سے کنارہ کشی میں آپ کی ایک بھی مثال نہیں۔

فیاضی گذر چکا ہے کہ "سیدنا امام حسن علیہ السلام کو حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہادری اور سخاوت عطا ہوئی ہے" لیکن امام حسن علیہ السلام کی فیاضی کی بھی مثال شاذ ونادر ہی ملے گی۔ دومرتبہ اپنی پوری دولت اور تمام سامان ومتاع راہ خدا میں دے دیا۔ اور تین بار اپنے کل مال وسامان کا آدھا حصہ خیرات کر دیا۔ تنصیف کا اتنا اہتمام فرمایا کہ جوتے میں بھی تنصیف کر دی۔ (تاریخ الخلفا ص ۱۲۳)

ایک روز ایک آدمی دس ہزار درم کی دعا مانگ رہا تھا۔ آپ نے سُن لیا۔ اور گھر جا کر دس ہزار درم اس کے گھر بھجوا دیئے۔

صبر وتحمل مروان امیر معاویہ کی طرف سے مدینہ کا حاکم تھا اور ہر جمعہ کو منبر پر چڑھ کر سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کو سب وشتم ولعن

کرتا۔ سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین علیہما السلام اپنے کانوں سے سنتے اور اس انتہائی تکلیف دہ ظلم و طغیان کو بھی برداشت کرتے۔ ایک لفظ بھی نہ بولتے۔ مروان نے جب یہ دیکھا کہ یہ لوگ تو کچھ بولتے ہی نہیں تو ایک روز ایک آدمی کو بھیجا کہ حسن کے گھر جا کر علی اور حسن کو گالیاں دے۔ اس نے ایسا ہی کیا، امام عالی مقام نے فرمایا: "مروان سے جا کر کہہ دو کہ تم نے جیسا کچھ کہا ہے، میں اس کے جواب میں کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے اور تمہیں دونوں کو اللہ کے سامنے جانا ہے (وہاں ہر معاملہ پیش ہوگا) تم نے جو کچھ کہا ہے اگر وہ سچ ہے تو اللہ اس کا صلہ دے گا۔ اور اگر جھوٹ ہے تو اللہ اس کا شدید ترین بدلہ دے گا۔

آپ کا یہ ضبط و تحمل اپنی مثال نہیں رکھتا، اور آپ کی یہ روش ضبط و تحمل کا لاثانی معجزہ ہے امام حسن علیہ السلام کی طرح امام حسین علیہ السلام کی سیرت بھی یہی ہے اور درحقیقت یہ دونوں حضرات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے صبر و تحمل کی مجسم یادگار اور بہترین نمونے ہیں اور کیوں نہ ہو۔ یہ دونوں محبوبان حق جس طرح حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم شکل ہیں، اسی طرح حضور کی سیرت پاک کی ایک ایک ادا کی شعاعیں بھی ان سے نکلتی ہیں۔ البتہ خصوصیات نبوی کا معاملہ الگ ہے۔ باقی صورت بھی وہی سیرت بھی وہی۔

لوگوں کی حاجت روائی

سیدنا امام حسن علیہ السلام غریبوں، ناداروں، یتیموں اور بیواؤں کی خبر گیری کا بڑا اہتمام فرماتے اور لوگوں کی حاجت روائی سب کام چھوڑ کر کرتے۔ ایک بار آپ اور امام حسین علیہما السلام اعتکاف میں تھے کہ ایک شخص حضرت امام حسن کے پاس اپنی کوئی ضرورت لے کر گیا۔ آپ نے اعتکاف سے نکل کر اس کی ضرورت پوری کر دی۔ لوگوں نے کہا۔ حسین نے تو اعتکاف کا عذر پیش کیا اور آپ نے اعتکاف کا لحاظ نہیں کیا۔ آپ نے فرمایا اللہ کی راہ میں کسی بھائی کی حاجت روائی کرنا میرے نزدیک مہینہ کے اعتکاف سے بہتر ہے[1]۔"

---

[1] اعتکاف پر حاجت روائی خلق کی فضیلت میں یہ نہایت متوازن ارشاد ہے۔ اس کی مزید فضیلت و اہمیت میں =

آپ کے نمایاں ترین اوصاف

آپ کی حیات طیبہ میں جو چیزیں زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں وہ یہ ہیں: عبادت کی کثرت، عدیم المثال بے نفسی اور مخلوق کی حاجت روائی اور یہی خوبیاں ایمان اور انسانیت کبریٰ کے بنیادی اوصاف ہیں۔

غور کرو ● دشمنوں کے سب و شتم اور لعن جیسے انتہائی تکلیف دہ ظلم و ستم اور ان کے ہر طرح کے مظالم پر آپ کا عدیم المثال صبر و تحمل کتنی اعلیٰ درجہ کی بے نفسی ہے۔ نیز مسلمانوں کی خوں ریزی روکنے کے لئے اتنی بڑی سلطنت اپنے حریف کو دے دینا کیسی عدیم المثال بے نفسی کا کارنامہ ہے ● اہواز کا جو خراج آپ کے لئے مخصوص تھا اس کو غریبوں، ناداروں یتیموں، بیواؤں اور حاجت مندوں کی مدد میں صرف کر دینا، نیز لوگوں کی حاجت روائی اس اہتمام سے کرنا کہ اعتکاف کا گوشۂ عزلت چھوڑ کر پہلے اس کو انجام دینا مخلوق کی حاجت روائی کا کتنا اونچا مقام ہے ● اور آپ کی عبادت کا یہ عالم تھا کہ اس خیر القرون میں بھی حضرت امام حسین علیہ السلام کے علاوہ آپ کا کوئی ہم پایہ نہ تھا۔ یہ آپ کے ذوق عبادت کا کتنا اونچا معیار ہے۔

جو نفوس قدسیہ اولیاء اللہ میں سب سے بلند و برتر ہیں۔ ان کے سب سے اہم صفات دو ہیں۔
(۱) عبادت حق میں بے حد یکسوئی (۲) مخلوقات کے معاملہ میں بے نفسی۔

= حافظ عظیم الدین منذری نے الترغیب والترہیب ج ۲ ص ۵۰ میں حضرت ابن عباس کے اعتکاف اور اس سے متعلق ایک حدیث ان کی سند سے بحوالہ طبرانی و بیہقی نقل کی ہے کہ "جو شخص کسی بھائی کی حاجت روائی میں گامزن ہوگا اس کا یہ عمل دس سال کے اعتکاف سے بہتر ہے، حالانکہ جس نے ایک دن بھی اللہ کی رضا و خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اعتکاف کیا ہے اللہ کی رحمت سے اس کے اور جہنم کے درمیان تین خندقیں ہوں گی۔ ایک خندق سے دوسری خندق تک اتنا فاصلہ رہے گا جتنا مشرق اور مغرب کے درمیان ہے" لیکن یہ حدیث صحیح نہیں۔ امام بیہقی نے اسے ضعیف کہا ہے۔ (اتحاف علامہ ابن حجر مکی ص ۱۵۵) ہاں ہم نظر انداز نہ کی جائے گی، کہ فضائل اعمال میں ضعیف حدیث کو لیا جاتا ہے۔ ۱۲ کوثر

درحقیقت یہی دو باتیں تمام کمالات و فضائل کی روح رواں ہیں اور انھیں دو باتوں کی تکمیل میں لگے رہنا تصوف کا حاصل ہے۔ اولیاء اللہ کے سرخیل سیدنا غوث اعظم، حضور شیخ عبدالقادر جیلانی محبوب سبحانی رضی اللہ عنہ فتوح الغیب شریف میں فرماتے ہیں (جو خالص اسلامی تصوف کی سب سے بہتر اور سب سے اعلیٰ کتاب ہے اور قرآن و حدیث کے بعد کمال عرفان و ایمان و احسان کی بہترین اور جامع ترین تعلیمات کا بہترین مجموعہ ہے)

کن مع اللہ کان لا خلق ومع الخلق کان لا نفس فان کنت مع اللہ بلا خلق وجدت، وعن الکل فنیت وان کنت مع الخلق بلا نفس عدلت، واتقیت ومن التبعات سلمت۔

(فتوح الغیب مطبوعہ مع شرح حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی ص ۴۰۲)

اللہ کے ساتھ اس طرح رہو کہ گویا مخلوق کا وجود ہی نہیں۔ (یعنی انتہائی حضوری اور یک سوئی رہے) اور مخلوق کے ساتھ اس طرح رہو کہ گویا نفس ہے ہی نہیں (یعنی انتہائی بے نفسی رہے) اگر اللہ کے ساتھ اس طرح رہوگے کہ گویا مخلوق ہے ہی نہیں تو اللہ مل جائے گا اور "فنائے ہمہ" میسر ہو جائے گی اور اگر مخلوقات کے ساتھ اس طرح رہوگے کہ نفس ہے ہی نہیں، تو عدل و تقویٰ پر عمل پیرا ہو جاؤگے اور انجام بد سے محفوظ رہوگے۔

یہ دونوں صفات جس اعلیٰ پیمانے پر حضرت امام حسن اور امام حسین میں پائے جاتے ہیں خود اہل بیت میں بھی ان کے والدین ماجدین کے علاوہ اس کی نظیر نہیں ملتی۔

فضائلِ امام حسین علیہ السلام

جس کو امام حسین علیہ السلام سے محبّت رہے
اس پر اللہ کا پیار رہے

سنن ترمذی میں ہے کہ
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا

حسین منی، وانا من حسین، احب اللہ من احب حسینا۔

حسین میرے ہیں اور میں حسین کا ہوں[1]، جو شخص حسین سے محبت رکھے گا اللہ تعالیٰ اس کو پیار فرمائے گا۔

(سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹)

[1] ایک ترجمہ یہ بھی ہے حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں۔ کتاب میں اس کی تشریح کی جائے گی ۱۲ کوثر

امام حسین علیہ السلام کی محبوبیت عظمیٰ

پنجتن پاک علیہم السلام اللہ کے بے حد محبوب ہیں، یہ تو سب جانتے ہیں کہ حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم تمام کائنات میں اللہ کے محبوب اعظم ہیں بقیہ پنجتن پاک کی محبوبیت پر بھی متعدد حدیثیں ہیں، جو فضائل اہل بیت کے باب میں گذریں ۔

نیز حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن، اور امام حسین علیہم السلام کی محبوبیت پر بھی فرداً فرداً مستقل حدیثیں ہیں ۔

اس باب میں سیدنا امام حسین علیہ السلام کی محبوبیت عظمیٰ کی حدیث ملاحظہ ہو۔

سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۹) میں حضرت یعلی بن مرۃ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔

حسین منی وانا من حسین، احب اللہ من احب حسینا،	حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں، جو شخص حسین سے محبت رکھے گا اللہ اس سے محبت کرے گا ۔
حسین سبط من الاسباط	حسین امتوں میں سے ایک امت ہیں ۔

اس حدیث میں یہ تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں ۔

۱۔ حسین مجھ سے ہیں، میں حسین سے ہوں ۔

۲۔ جو شخص حسین سے محبت رکھے اللہ اس سے محبت کرے گا ۔

۳۔ حسین امتوں میں سے ایک امت ہیں ۔

ہر ایک کی شرح ملاحظہ ہو۔

۱۔ ارشادِ رسول: حسین مجھ سے ہیں، اور میں حسین سے ہوں

اس کا ایک مفہوم وہ ہے جو اکابر نے بیان فرمایا ہے۔ مرقات شرح مشکوٰۃ میں قاضی کے حوالہ سے مرقوم ہے۔

کانہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم علم بنور الوحی ما سیحدث بینہ وبین القوم فخصہ بالذکر، وبین انھما کالشئی الواحد فی وجوب المحبۃ، وحرمۃ التعرض، والمحاربۃ واکد ذالک بقولہ، احب اللہ من احب حسینا فان محبتہ محبۃ الرسول، ومحبۃ الرسول محبۃ اللہ۔

گویا یہ بات ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نور وحی سے معلوم فرمالیا ہے کہ حسین اور قوم کے درمیان کیا حادثہ رونما ہوگا۔ لہٰذا خصوصیت کے ساتھ آپ کا ذکر فرمایا کہ حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں، فرمادیا کہ نبی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) اور حسین دونوں اس معاملہ میں شئے واحد کی طرح ہیں کہ دونوں سے محبت واجب، دونوں کی مخالفت حرام، دونوں سے جنگ کرنا حرام۔

اور اس حقیقت کی تاکید اس ارشاد سے فرمادی ہے کہ "جو حسین سے محبت رکھے گا اللہ اس سے محبت فرمائے گا" کیوں کہ ان کی محبت رسول کی محبت، اور رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے۔

ان الفاظ کو بار بار پڑھو اور سوچو کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام کا درجہ کتنا بلند ہے؟ اس عبارت کا یہ جملہ کتنا اہم ہے کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حسین دونوں اس معاملہ میں شئے واحد کی طرح ہیں کہ دونوں سے محبت واجب ہے، دونوں کی مخالفت حرام، اور دونوں سے جنگ کرنا حرام"!!

پھر یہ جملہ بھی کتنا اہم ہے کہ:

"ان کی محبت رسول کی محبت، اور رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے۔"

اس کی مزید تشریح ذیل کی حدیثوں نے فرمائی ہے:

۱۔ من احب الحسن والحسین فقد احبّنی، ومن ابغضہما فقد ابغضنی (مسند احمد ترمذی، ابن ماجہ، عن ابی ہریرہ)

جس نے حسن اور حسین سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی، اور جس نے ان دونوں سے بغض رکھا، اس نے مجھ سے بغض رکھا۔ (کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۰ تقطیع کلاں بحوالہ احمد و ترمذی و ابن ماجہ)

معجم کبیر طبرانی میں حضرت سلمان فارسی سے روایت ہے، اور حافظ ابونعیم نے حضرت سلمان اور حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

الحسن والحسین من احبہما احببتہ ومن احببتہ احبہ اللہ ومن احبہ اللہ ادخلہ جنات النعیم، ومن ابغضہما او بغی علیہما ابغضتہ ومن ابغضتہ ابغضہ اللہ، ومن ابغضہ اللہ ادخلہ اللہ نار جہنم ولہ عذاب مقیم۔ (کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۱ تقطیع کلاں)

جو شخص حسن اور حسین سے محبت رکھے گا میں اس سے محبت رکھوں گا اور میں جس سے محبت رکھوں گا اللہ اس سے محبت رکھے گا اور اللہ جس سے محبت رکھے گا اسے جنت نعیم میں داخل فرمائے گا۔ اور جو حسن و حسین سے بغض رکھے میں اس کا دشمن ہوں، اور میں جس کا دشمن ہوں اللہ اس کا دشمن ہے، اور جس کا اللہ دشمن ہے اللہ اسے نار جہنم میں داخل فرمائے گا۔ اور اس کے لئے ہمیشہ رہنے والا عذاب ہے۔

نوٹ: ارشاد نبوی: "حسین مجھ سے ہیں اور میں حسین سے ہوں۔" اس میں یہ جملہ تو بالکل

واضح ہے کہ "حسین مجھ سے ہیں"۔ ظاہر ہے کہ آپ کا وجود حضور ہی سے ہے کہ آپ کے نواسے ہیں لیکن یہ جملہ "میں حسین سے ہوں" بڑی گہری حقیقت کا حامل ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ حسین سے میرے دین کا وہ نظام ہوگا کہ ظالم کے احکام خلیفۂ رسول کے احکام کی جگہ لے کر دین کے احکام نہ بن سکیں گے۔

یزید کی حکومت سے جو نظام باطل قائم ہو گیا تھا کہ فاسق و فاجر ظالم و طاغی کو خلافت رسول کی مسند پر بٹھا دیا گیا، پھر جبر و تسلط تلوار اور حکومت کے زور سے مجبور کیا گیا کہ اسے خلیفۂ رسول مانو۔ جس نے زبان کھولی اس کے سر پر تلوار! حالات کیا تھے؟ اور اس کے خطرناک نتائج کیا تھے؟ اس کو فرزند رسول سیدنا امام حسین علیٰ جدہ و علیہ السلام کی بصیرت نے جیسا دیکھا تھا (کہ وہ خون رسول سے پیدا ہوئی تھی) ویسا اور کون دیکھ سکتا ہے؟ آپ نے پوری روشنی میں دیکھا کہ وقت کا طاغوت جبر و تسلط زور و تشدد، تلوار اور حکومت سے خلافت رسول کی مسند پر بیٹھ گیا ہے۔ فاسقانہ اور ظالمانہ حکومت کا زور ہے اب اس کے احکام خلیفۂ رسول کے احکام کی حیثیت حاصل کریں گے۔ اس طرح فسق و فجور، ظلم و عدوان، باطل و ضلالت کے احکام خلیفۂ رسول کے احکام بن کر دین کا عنصر بن جائیں گے۔ اس طرح ہر آنے والا خلیفہ خلافت رسول کی مسند پر بیٹھ کر اپنے فاسقانہ اور ظالمانہ احکام کو دین کا عنصر بناتا جائے گا۔ رفتہ رفتہ دنیا قرآن و حدیث کے نظام حکمرانی اور نظام دینی کو یکسر بھول جائے گی یا ان کو طرح طرح کی تاویلات سے یکسر مسخ کر دے گی۔ یہ خطرہ اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے کہ اسلام کا نظام دینی ہی یکسر تباہ ہو جائے گا۔

اس خطرہ کو سب سے پہلے کس نے مٹایا؟ اور اس کو مٹا کر قیامت تک کے لئے نظام دینی کو ہمیشہ کے لئے کس نے محفوظ کر دیا؟ کس نے اپنی جان کو جو اس وقت سے لیکر قیامت تک کے لئے ہر جان سے زیادہ قیمتی ہے، اور اپنے کلیجہ کے ٹکڑوں کو اور اپنے اعوان و انصار کو جو اس وقت معرکۂ حق و باطل میں سب سے بڑھ کر دین حق کے معین و مددگار تھے

غرض ان سب کو اللہ کی راہ میں قربان کر کے کس نے تمام دنیا کو بتایا کہ حکومت کو سمجھ لو جو یکسر ظالمانہ اور فاسقانہ ہے۔ کیا یہ خلافتِ رسول ہے؟ یا ظلم و عدوان اور فسق و فجور کی قہرمانی شہنشاہیت؟
اب دنیا کو خلیفۂ وقت کے سمجھنے کے لئے پوری روشنی مل گئی، وہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی ہے کہ:

یزید کی حکومت اللہ کے کیسے کیسے پیاروں کو قتل کر رہی ہے؟ بہترین انسانوں کو، خاندان نبوت کے چشم و چراغ کو، نبی زادوں کو، فاطمہ کے کلیجوں کو، خود نبی کے لخت جگر کو جو عالم غیب میں نبی کے بدن کا ٹکڑا ہیں، جن کی ذرا سی تکلیف بھی نبی کو گوارا نہ تھی، ہاں امام حسین کو پنجتن پاک کی آخری ذات پاک کو شبیہہ رسول حضرت علی اکبر کو، معصوم اور شیر خوار فرزند رسول حضرت علی اصغر کو، ایک دو نہیں ۷۲، اللہ والوں کو۔
ان سب کو بلا جرم و قصور بن میں گھیر کر پیاسا رکھ کر طرح طرح کی تکلیفیں دے کر تیروں سے تلواروں سے اور بھالوں سے زخمی بنا کر انتہائی سنگ دلی سے ذبح کر ڈالا اور لاشوں پر گھوڑے دوڑا دیئے۔

کیا ایسی ہی فرعونی حکومت اسلامی حکومت کہی جا سکتی ہے؟ کیا اس کا فرماں روا رسول کا خلیفہ کہا جا سکتا ہے؟ کیا اس کے احکام خلیفۂ رسول کے احکام ہو سکتے ہیں؟

نہیں! ہرگز نہیں! واللہ ہرگز نہیں!!

بس فیصلہ کر لو کہ اس کے احکام خلیفۂ رسول کے احکام نہیں، بلکہ طاغوت کے احکام ہیں، فرعون وقت کے احکام ہیں۔ یہ فرعونی احکام اسلامی نظام حکمرانی اور دینی نظام سے اتنے ہی مختلف ہیں جس قدر نور و ظلمت میں اختلاف ہے اور موسیٰ اور فرعون میں اختلاف ہے۔ سب نے جان لیا کہ یزید کے جابرانہ احکام اسلام کو مٹانے والے احکام ہیں۔ انھیں احکام اسلام کے دفتر میں ایک سیکنڈ کے لئے بھی جگہ نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح نظام دین ہمیشہ

سکے لئے نظام باطل کی آمیزش اور تصرفات سے محفوظ ہوگیا۔

اس کو اس طرح کس نے محفوظ کر دیا ؟

صرف فرزند رسول سیدنا امام حسین علی جدہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے!

ہاں "تحفظ دین کا یہ نظام آپ سے ہے" آپ کے طرز عمل سے ہے۔ آپ کی عدیم المثال قربانیوں سے ہے، یہی وہ حقیقت عظمٰی ہے جسے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قدوسی جملہ میں بیان فرمایا ہے کہ:

"میں حسین سے ہوں"

یعنی میرے دین کا تحفظ اور میرے دین کا نظام حسین سے ہے۔

شاہ است حسینؑ بادشاہ است حسینؑ ‏ ‏ ‏ دین است حسینؑ دین پناہ است حسینؑ

سر داد نہ داد دست بر دست یزید ‏ ‏ ‏ حقا کہ بنائے لاالہ است حسینؑ

۲۔ ارشاد رسول کہ :-
جو شخص حسین سے محبت رکھے گا
اللہ اس سے محبت فرمائے گا

کسی محبوب ربانی کی محبوبیت کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ یہ ذات مقدس اللہ کی اس قدر محبوب ہے کہ جو اس سے محبت رکھے وہ بھی اللہ کا محبوب ہے یہ محبوبیت عظمٰی مستقل طور پر تمام کائنات میں حضور حبیب خدا سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مقام اعلٰی ہے۔ اور آپ کے اہل بیت اطہار، امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم، حضرت فاطمہ زہرا، امیر المومنین حضرت امام حسن مجتبٰی، سید الشہداء امام حسین مقتدا سلام اللہ علیہم اجمعین حضور کے اس مقام اعلٰی کے وارث ہیں، متعدد حدیثوں میں اس کو صراحت کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔ مثلاً

۱۔ خیبر میں جب سیدنا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی کامیابی نہ ہو سکی تو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک شام کو ارشاد فرمایا؛

لاعطین الرایۃ غدًا رجلا ‏ ‏ ‏ کل میں اس کو جھنڈا دوں گا جس کے ہاتھ پر

يفتح الله على يديه يحب الله ورسوله و يحبه الله ورسوله (بخاری و مسلم)

اللہ فتح دیگا وہ اللہ اور رسول سے محبت رکھتا ہے اور اللہ و رسول بھی اس سے محبت رکھتے ہیں۔

یہ رات نہایت امید و انتظار کی تھی، امتیازی شان والے صحابۂ کبار نے اس آرزو اور تمنا میں کاٹی کہ کاش اللہ و رسول کے محبوب ہونے کا شرف ہمیں حاصل ہو جاتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی اسی تمنا کا جوش تھا۔ صبح ہوئی تو مجاہدانہ امتیاز والے صحابہ بے چین تھے کہ حضور کی نگاہ کرم ہم پر پڑ جاتی، لیکن حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو بلا کر نوازا۔ اور فتح خیبر کا جھنڈا انھیں کو دے کر محبوب خدا اور محبوب رسول ہونے کی سند بخشی، جس محبوبیت کی تمناسب کو تھی سب نے دیکھا کہ اس کا تاج علی مرتضیٰ کے سر پر ہے۔

۲- حضرت فاطمہ زہرا صلوٰت اللہ وسلامہٗ علیٰ ابیہا وعلیہا پر اللہ و رسول کا جو پیار ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔ ان کی شان اعلیٰ تو یہ ہے کہ خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

فاطمة بضعةٌ مِنّیْ

فاطمہ میرے بدن کا ٹکڑا ہے۔

(مشکوٰۃ ص ۵۶۸ بحوالہ صحیحین)

۳- امام حسن علیہ السلام کی شان میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے

اللّٰهُمَّ انی احبه فاحبه واحب من یحبه۔ (مشکوٰۃ ۵۶۹ بحوالہ البخاری و مسلم)

یا اللہ میں اس سے محبت رکھتا ہوں تو بھی اس سے محبت فرما، اور جو اس سے محبت رکھے اس سے بھی محبت فرما۔

۴- یہی دعا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امام حسین علیہ السلام کے لئے بھی فرمائی ہے۔ سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۸) میں ہے۔

هذان ابنای وابنا ابنتی اللّٰھم انی احبھما فاحبھما واحب من یحبھما۔

یہ دونوں میرے بیٹے ہیں، میری بیٹی کے فرزند ہیں، یا اللہ میں ان دونوں سے محبت رکھتا ہوں تو بھی ان دونوں سے محبت فرما اور جو ان دونوں سے محبت رکھے اس سے بھی محبت فرما۔

اسی مقام محبوبیت عظمیٰ کا بیان حدیث باب کے اس جملہ میں بھی ہے۔

احب اللّٰہ من احب حسینا (ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹)

جو شخص حسین سے محبت رکھے گا اللہ اس سے محبت فرمائے گا۔

اس حدیث کا ایک ترجمہ یہ بھی ہے۔

"میری دعا ہے کہ جو شخص حسین سے محبت رکھے گا اللہ اس سے محبت فرمائے گا۔"

سبحان اللہ وہ کتنا بڑا خوش نصیب ہے جس کے لئے محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایسی محبوبیت کی دعا فرمائیں۔

۳۔ حسین امتوں میں سے ایک امت ہیں

حدیث باب کے دو جملوں کی تشریح آپ نے ملاحظہ فرمائی، اب اس کے تیسرے جملہ "حسین امتوں میں سے ایک امت ہیں" کی تشریح ملاحظہ ہو۔ یہ جملہ اس متن کا ترجمہ ہے

"حسین سبط من الاسباط"

اس کا ایک مطلب یہ بیان کیا گیا ہے کہ "حسین میرے نواسوں میں سے ایک نواسا ہے"۔ یہ مطلب گو حرف بہ حرف صحیح ہے لیکن اتنا بدیہی ہے کہ اس کے بتانے اور صراحت کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے، اس لئے اس مطلب کو عام طور پر نہیں لیا جاتا۔

اس کا ایک مطلب یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ حسین ایسے درختوں میں سے ایک درخت ہیں جن کی شاخیں بہت سی ہیں یعنی ان کی نسل بہت بڑھے گی۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ: حسین امتوں میں سے ایک امت ہیں جیسا کہ لمعات شرح مشکوٰۃ میں ہے اور بہت صحیح لکھا ہے علامہ منصور علی ناصف نے التاج الجامع للاصول (ج ۳ ص ۳۵۹) کے حاشیہ میں جو اس حدیث پر ہے کہ:

یہاں (یعنی اس حدیث میں) سبط سے مراد یہ ہے کہ "حسین رضی اللہ عنہ اپنے اخلاق و اعمال کے رو سے دنیا میں ایک صالح امت کی طرح ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کے بارے میں فرمایا ہے کہ "ابراہیم ایک امت ہیں"۔ اور آخرت میں حسین کی بعثت بڑی شان و شوکت اور جاہ و منزلت کے ساتھ ہو گی جیسے کوئی عظیم الشان امت ہو۔[۱]"

حقیقت یہی ہے کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام اپنی جگہ ایک عظیم الشان امت ہیں اور آپ کا بے نظیر کارنامہ ایک جلیل القدر امت کا کارنامہ ہے کہ اعلیٰ درجہ کی ایمانی عزیمت والی جماعت عظمیٰ بھی اسے انجام نہیں دے سکتی۔ یہ عدیم المثال کارنامہ ثبوت ناطق ہے کہ آپ اپنی جگہ ایک جلیل القدر امت ہیں، آپ کا کام تنہا ایک شخص انجام دے ہی نہیں سکتا۔ اسے بڑے بلند پایہ اور بڑے عزم و عزیمت والی پوری امت بھی انجام دینے سے قاصر ہے، اسی لئے جو آپ کے نقش قدم پر گامزن ہے وہ اپنے زمانہ کا مجاہد اعظم اور سب سے بڑا انسان ہے۔

آپ کی یہ شان بلند و برتر اس کمال کا مظہر ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ذات پاک میں نظر آتا ہے۔ اور جن کی بنا پر اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

---

[۱] موصوف کے الفاظ یہ ہیں: السبط: ولد الولد، والجماعۃ، والمراد ھنا ان الحسین رضی اللہ عنہ فی اخلاقہ واعمالہ الصالحۃ فی دنیا لاکامۃ صالحۃ، کقولہ تعالیٰ "اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ كَانَ اُمَّةً قَانِتًا لِّلّٰهِ حَنِيْفًا ۭ وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ" ویبعث الحسین فی الآخرۃ لہ شان وجاہ عظیم کامۃ ذات شان عظیم۔ ۱۲ کوثر

إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا ط (النحل پ ۱۴ ع ۲۱)

حقیقت یہ ہے کہ ابراہیم اپنی جگہ ایک امت تھے، اللہ کے سامنے اس طرح جھکے تھے کہ ہر باطل سے کنارہ کش تھے۔

جو بجائے خود ایک امت ہے درحقیقت وہی امام ہے

جو شخص بلند کردار، اعلیٰ سیرت اور بہترین اخلاق کا ایسا جامع ہے کہ بجائے خود ایک امت ہے، وہ سب کا پیشوا، مقتدا اور امام ہوتا ہے۔ اسی لئے ارشادِ الٰہی "ابراہیم ایک امت تھے"۔ (إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً) اس کا مطلب یہ ہے کہ ابراہیم امام تھے، جیسا کہ ائمۂ تفسیر نے صراحت کی ہے۔

امام ابن منذر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول روایت کرتے ہیں:

ان ابراهيم كان امة قال كان اماما فى الخير (الدر المنثور ص ۱۳۴ ج ۴)۔

"ابراہیم ایک امت تھے" ابن عباس نے (اس کی تفسیر میں) کہا ہے۔ وہ اچھے امور میں امام تھے۔

امام ابن جریر اور امام ابن ابی حاتم نے اس آیت کی تفسیر میں مشہور تابعی مفسر حضرت قتادہ کا قول روایت کیا ہے کہ:

ان ابراهيم كان امة قال كان امام هدى يقتدى به۔ (الدر المنثور ص ۱۳۴ ج ۴)

ابراہیم ایک امت تھے، قتادہ نے (اس کی تفسیر میں کہا) وہ امام ہدایت تھے کہ ان کی اقتدا کی جائے۔

اسی تفصیل کی بنا پر سیدنا امام حسین علیہ السلام کو حدیث میں جو ایک امت فرمایا گیا ہے، قرآن مجید اور واقعات کی روشنی میں اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے اعلیٰ کردار و صفات کی بنا پر امام اور مقتدا ہیں۔

اسی بنا پر تو بے شمار اولیاء ربانی اور علمائے حقانی آپ کو امام کہا کرتے ہیں۔

حدیث ثقلین نے عترت رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا تعارف اس طرح فرمایا ہے کہ "قرآن اور عترت رسول کو تھامے رہو گے تو گمراہ نہیں ہو سکتے۔" اس میں یہ حقیقت بول رہی ہے کہ عترت رسول اس پایہ کے مقتدا اور امام ہیں کہ جو ان کو تھامے رہے گا وہ گمراہ ہو ہی نہیں سکتا یہ امامت کا کتنا اونچا تصور ہے۔ حدیث کی اس روشنی میں دیکھو تو پکار اٹھو گے کہ علی مرتضیٰ امام ہیں، حسن مجتبیٰ امام ہیں اور حسین اعظم امام، پھر ابنائے کریمین کی وہ ذریات طیبات بھی امام جو قرآن سے اس طرح وابستہ ہیں کہ قرآن اور یہ ہمیشہ ایک ساتھ ہیں (جیسا کہ حدیث ثقلین میں ہے) قرآن مجید سے اس ارتباط کا اثر ہے کہ ان کی سیرت طیبہ، اخلاق حسنہ اور صفات علیا انسانیت کا شہ کار ہیں، روحانیت کی جان ہیں۔ سیرت محمدی کا ظلِ کامل ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ مقتدائے قلوب، پیشوائے نفوس اور ائمۂ رشد وہدیٰ ہیں۔ اور اسی بنا پر یہ حضرات قطب الارشاد ہیں۔ اور انھیں کے توسط سے مقام ولایت تک رسائی ہوتی ہے جیسا کہ حضرت قاضی ثناء اللہ کی تفسیر مبارک کا بیان اوپر گذر چکا ہے اور مجدد صاحب سرہندی قدس سرہٗ نے بھی اس کو بیان فرمایا ہے۔

ابھی بیان کیا جا چکا ہے کہ حدیث ثقلین میں یہ حقیقت بول رہی ہے کہ عترت اہلبیت وہ مقتدائے عالم، پیشوائے امت اور ائمۂ رشد وہدیٰ ہیں کہ جو ان سے وابستہ رہے گا وہ گمراہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اس کے پیش نظر یہ حقیقت اس سلسلے کا حرف آخر ہے کہ

کوئی بھی اہل ایمان ہو اسے حدیث ثقلین کی بنا پر عترت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو امام اور مقتدا ماننا لازمی اور ناگزیر ہے کہ اسکے بغیر کوئی چارہ ہی نہیں۔

ایک اہم حقیقت اہل سنت خصوصاً صوفیۂ کرام ائمۂ اہل بیت کو جو امام کہتے ہیں اس کا مفہوم یہ ہے کہ یہ حضرات راہ ہدایت کے مقتدا اور پیشوا ہیں انھیں کے نقش قدم پر چل کر ولایت کی منزل اور ولایت کی راہ طے ہوتی ہے، اور انھیں کے

توسط سے ولی درجۂ ولایت پر فائز ہوتا ہے۔ اس حقیقت کو جیسا کہ بار بار لکھا جاچکا ہے حضرت مجدد سرہندی قدس سرہٗ اور دیگر اکابر نے بیان فرمایا ہے۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ راہِ ولایت کو طے کرنا' فنائے نفس اور فنائے قلب کی تکمیل ہے[1]۔ اور یہ فنائیت عترت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فطرت ہے کیونکہ وہ بنص قرآنی پاک

[1] فنائے نفس کی حقیقت یہ ہے کہ نفس میں پاکیزگی[1]' اور بلندی[2] آجائے۔

۱۔ پاکیزگی یہ ہے کہ نفس کا جس طرح شرک جلی سے پاک ہونا ضروری ہے اسی طرح شرک خفی یعنی ریا' نام و نمود اور شہرت سے بھی یکسر پاک ہوجائے' نیز حسد' کینہ' کبر و نخوت' جاہ پرستی' بخل اور خواہشات نفس جو معصیت ہیں ان سے بھی نفس پاک و صاف ہو جائے۔

۲۔ نفس کی بلندی یہ ہے کہ خواہشات نفس اور پست ہمتی کے بجائے رضائے الٰہی کے حصول میں لگ جائے اور دنیوی فوائد کے بجائے انھیں فوائد کو ملحوظ رکھے جن میں کوئی بھی منفعت عاجلہ ہو یا نہ ہو مگر قرآن و حدیث نے انھیں مومن کا نقطۂ نظر قرار دیا ہے۔

نفس میں جب پاکیزگی اور بلندی پوری طرح پیدا ہو جاتی ہے تو اسے "فنائے نفس" کہتے ہیں

اور فنائے قلب سے مراد یہ ہے کہ قلب میں ذکر الٰہی[1] اور محبت الٰہی[2] راسخ ہو جائے۔

۱۔ محبت الٰہی کا یہ عالم ہو کہ دل — اس سے پوری طرح لبریز ہو جائے کہ بس اللہ ہی سے لگن ہے اسکی محبت میں جان و مال اور اپنے اہل و عیال سب کو قربان کرنا پڑے تو بے تامل پوری عزیمت کے ساتھ اس پر عمل کرے اور اسی کے لئے دوستی ہو اور اسی کے لئے دشمنی۔

۲۔ ذکر الٰہی کا یہ عالم ہو کہ دل اللہ کی یاد میں ڈوبا رہے اور ذکر دوام قلب کی صفت دائمہ بن جائے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی دل اللہ سے غافل نہ رہے۔

ذکر الٰہی اور محبت الٰہی جب اس طرح دل میں راسخ ہو جاتے ہیں تو ایک فنائیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی کا نام فنائے قلب ہے۔

الغرض فنائے نفس اور فنائے قلب کی تکمیل ہی کا نام راہ ولایت کو طے کرنا ہے۔ چونکہ عترت رسول بنص قرآنی مطہر ہیں' اس لئے فطرۃً ان کے نفوس اور قلوب مطہر ہیں۔ اس لئے وہ اس راستہ کے امام ہیں۔ ۱۲ کوثر

و مطہر ہیں، اور طینت رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا خمیر ہے جیسا کہ حدیث میں مذکور ہے۔ اسی بنا پر وہ اس راہ کے امام ہیں اور انھیں کی بے نفسی اور فنائے نفس و فنائے قلب کی راہ پر چل کر ولایت اور روحانیت کی منزل طے ہوتی ہے۔ اسی لئے راہ ولایت میں ان کو مقتدا اور امام مان کر ان کے نقش قدم پر چل کر، اور ان کے توسط سے فیض یاب ہو کر ہر ولی ولایت کے درجہ پر فائز ہوتا ہے۔ کوئی بھی ولی ہو بقول حضرت شیخ مجدد سرہندی قدس سرہٗ حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم اور حسنین کریمین اور ان کی ذریات طیبہ کے ائمۂ اطہار کے توسط کے بغیر ولی نہیں ہو سکتا، کہ یہی حضرات اس راہ کے قطب الارشاد اور امام ہیں۔

یہ ملحوظ رکھنا چاہیئے کہ ان حضرات کی امامت امور باطنی و روحانی میں ہے، ائمۂ مجتہدین کی امامت امور ظاہری میں ہے جنکی بنیاد نصوص پر قیاس کرنا اور فکر و نظر سے کام لینا ہے، اور یہ علم ظاہر ہے، البتہ ائمۂ مجتہدین اپنے اجتہادات میں جس پاکیزہ نفسی سے کام لے رہے ہیں وہ امر باطنی ہے، اور ائمۂ اہل بیت کا فیض ہے، چنانچہ امام ابو حنیفہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہما نے حضرت امام باقر اور حضرت امام جعفر صادق علیہما السلام سے بہت کچھ اکتساب کیا ہے اور فیض پایا ہے، اور ان دونوں حضرات سے امام محمد نے، ان سے امام شافعی نے اور ان سے امام احمد نے فیض ظاہر و باطن حاصل کیا ہے۔ اس کے علاوہ ائمۂ اہل بیت سے حصول فیض کے اور بھی ذرائع ان ائمۂ مجتہدین کو حاصل ہیں۔

ایک اہم فرق گذشتہ فصل سے یہ حقیقت اچھی طرح منکشف ہو جاتی ہے کہ اہل سنت خصوصاً صوفیہ کرام ائمۂ اہل بیت کو جو امام مانتے اور کہتے ہیں اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ حضرات راہ ہدایت کے مقتدا اور راہ ولایت کے پیشوا ہیں۔

ان بزرگوں کو امام کہنے کا ایک مفہوم اور بھی ڈھونڈا جاتا ہے جو سرتاپا غلط ہے اور کہا جاتا ہے کہ بعض شیعہ فرقے ائمۂ اہل بیت کو امام کہنے کا یہی مفہوم لیتے ہیں، واللہ اعلم، یہ مفہوم مراد لیتے ہیں یا نہیں؟ بہرحال یہ ڈھونڈا ہوا مفہوم اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ امامت کا مقام نبوت کے مقام سے اعلیٰ ہے اور ائمۂ اہل بیت اس درجہ پر فائز ہیں ۔ ظاہر ہے کہ یہ مفہوم روح اسلام کے بالکل خلاف ہے۔

ائمۂ اہل بیت کو امام کہنے کا یہ مفہوم، اور اکابر اہل سنت خصوصاً صوفیہ کرام نے ان بزرگوں کو امام کہنے کا جو مفہوم بیان کیا ہے ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

امامت کا یہ مفہوم (کہ یہ نبوت سے بھی بالاتر ہے) حد درجہ باطل ہے، کوئی بھی سنی اس معنی میں کسی عترت رسول کو نہ امام کہتا ہے نہ کبھی کہہ سکتا ہے بلکہ کسی سنی کے حاشیۂ خیال میں بھی یہ مفہوم نہیں۔

اب یہ تلقین کہ عترت رسول کو امام کہنا شیعوں کا اتباع ہے، سراپا غلط ہے۔ کون سنی ان کو اس معنی میں امام کہتا ہے؟ (کہ امام نبی سے بالاتر ہے) سنی حضرات شیعوں کی اتباع میں ان کو امام قطعاً نہیں کہتے۔ بلکہ حدیث ثقلین وغیرہ کی بنا پر امام کہتے ہیں۔ اس لئے ان بزرگوں کو امام کہنے سے روکنا یکسر باطل ہے کہ حدیث ثقلین وغیرہ کو پس پشت ڈالنا ہے۔

حقیقت میں ان کو امام کہنے سے روکنا خارجیت کا شعار ہے اور ان حضرات کو امام کہنے پر بحث وکلام کرنا کہ لوگ ان کو امام نہ کہیں خارجیت کا اہم پروگرام ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ ان پیشوایان امت کو کوئی پیشوا نہ مانے اور اس طرح ان کا احترام دلوں سے مٹا دیا جائے لیکن یہ ناممکن ہے، بھلا اس احترام کا تاج ان کے سر سے کون اتار سکتا ہے؟

سمجھنے کی بات ہے کہ ائمۂ مجتہدین کو امام کہو، حدیث، تفسیر اور فقہ کے مقتدا بزرگوں کو امام کہو، حد یہ ہے کہ ہر مسجد کے پیش نماز کو امام کہو تو خارجیت کو کوئی اعتراض نہیں لیکن ائمۂ اہل بیت کو امام کہو جن کی امامت کا اعلان حدیث ثقلین کر رہی ہے تو خارجیت پکارنے لگتی ہے کہ یہ کیا غضب کیا؟ ان کو کیوں امام کہدیا؟

بسوخت عقل زحیرت کہ ایں چہ بوالعجبی است

اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے؟ کہ ان کا احترام و توقیر بے حد ناپسند ہے حالانکہ ان پاک و مطہر ہستیوں کا ادب و احترام اور توقیر و تعظیم واجب ہے اور ان کا ملحوظ نہ رکھنا حرام ہے، جسکی تصریح اس فصل میں گذر چکی کہ "عترت رسول کے ساتھ ناروا سلوک کرنے والا ملعون ہے"۔ اور تشریح اس سے متصل فصل میں گذر چکی ہے۔

امام حسین جسم رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک ٹکڑا ہیں

صدیقۂ کبیرہ والدۂ ابن عباس کا مشاہدہ
مع تشریح نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

(از مشکوٰۃ صفحہ ۵۷۲)

جسمِ رسولؐ کا ایک ٹکڑا

مشکوٰۃ شریف میں دلائل النبوۃ، امام بیہقی کے حوالہ سے مروی ہے کہ حضرت ام الفضل جو حضرت ابن عباس کی والدۂ ماجدہ ہیں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں آکر عرض کرتی ہیں

یا رسول اللہ کل میں نے ایک بڑا ناگوار خواب دیکھا ہے، آپ نے فرمایا۔

وہ کیا؟ —— وہ کہتی ہیں: بہت ہی ناگوار خواب ہے —— آپ نے فرمایا۔

آخر وہ کیا ہے؟ —— وہ کہتی ہیں۔

میں نے ایسا دیکھا کہ: آپ کے جسم کا ایک ٹکڑا کاٹ کر میری گود میں رکھ دیا گیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

"تم نے بڑا اچھا خواب دیکھا ہے۔ انشاء اللہ فاطمہ کو ایک لڑکا پیدا ہوگا اور وہ تمہاری گود میں دیا جائے گا۔"[1]

—— ام فضل کہتی ہیں۔

"حسین پیدا ہوئے اور میری گود میں دیئے گئے، جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا۔"

---

[1] الفاظ یہ ہیں۔ "رأیت خیرًا تلد فاطمة ان شاء الله غلامًا یکون فی حجرك" (قالت) "فولدت فاطمة الحسین فکان فی حجری کما قال رسول الله صلی الله علیه وسلم"۔ ۱۲ کوثر

ایک روز کی بات ہے کہ میں آپ کی خدمت میں حسین کو لے کر آئی، اور انھیں آپ کی گود میں دے دیا۔ اب دیکھ رہی ہوں کہ آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہے۔ میں نے کہا۔ "یا نبی اللہ آپ پر میرے ماں باپ قربان (آپ کو کون سا صدمہ ہے؟")

آپ نے فرمایا میرے پاس جبریل علیہ السلام آئے اور خبر دی کہ میرے اس بیٹے کو میری امت قتل کریگی۔

حضرت ام الفضل کا بیان ہے۔ میں نے حسین کی طرف اشارہ کر کے کہا: اس کو؟

آپ نے فرمایا: ہاں۔

نوٹ :- یہ حدیث بتاتی ہے کہ عالم غیب میں حضرت امام حسین علیہ السلام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم پاک کا ایک ٹکڑا ہیں اور اسی لئے آپ ان کو اپنا بیٹا بھی فرمایا کرتے تھے۔

یہ امام حسین علیہ السلام کی کتنی بڑی فضیلت ہے؟ اس میں اس کی طرف اشارہ ہے کہ حسین کے ساتھ جو معاملہ کروگے وہ درحقیقت نبی کے ساتھ ہوگا، اسی لئے امام مظلوم کو ایذا دینا سخت حرام ہے، اور آپ پر تلوار اٹھانا خود نبی علیہ الصلواۃ والسلام پر اٹھانا ہے۔ ظالموں نے میدان کربلا میں جو کچھ کیا ہے نگاہ بصیرت سے دیکھو تو یہ سب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیا ہے۔ اسی لئے یہ ظالم یقیناً کافر ہیں اور اسی لئے بے شمار علماء حقانی۔۔ اور اولیائے ربانی نے ان کو کافر کہا ہے۔ اسی طرح وہ بھی کافر ہے جس نے آپ کو شہید کرنے کے لئے فوج بھیجی اور قتل کرنے کا آرڈر دیا۔ ابن زیاد، اور یزید!

امام حسین علیہ السلام میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فیاضی اور شجاعت

★ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد :-

اما الحسین فلہ جرأتی وجودی، — حسین کو میری شجاعت اور میری فیاضی بخشی گئی۔

(معجم کبیر طبرانی، وابن مندہ، عن فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا)

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے امام حسن کو اپنی ہیبت اور سرداری بخشی

اور

امام حسین کو اپنی شجاعت اور فیاضی عطا فرمائی

امام طبرانی و دیگر محدثین روایت کرتے ہیں اور حافظ ابن حجر بھی اسے تہذیب التہذیب میں بذکر امام حسین لکھتے ہیں کہ :

> حضرت سیدہ فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا حضور کے مرض وفات میں حسن اور حسین کو لے کر آئیں اور گزارش کی، یا رسول اللہ یہ دونوں آپ کے بچے ہیں آپ ان کو اپنی کوئی وراثت عطا فرمایئے۔

آپ نے فرمایا :

"حسن کو اپنی ہیبت اور سرداری دی"

اور "حسین کو اپنی بہادری اور فیاضی دی"[1]

امام حسین علیہ السلام کی سخاوت اور بہادری دونوں حیرت انگیز ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آپ کی فیاضی | ایک آدمی دس ہزار درہم کا مقروض تھا، اس نے آپ سے سوال لگایا

---

[1] الفاظ یہ ہیں۔ اما الحسن فلہ ہیبتی وسوددی، واما الحسین فلہ جرأتی وجودی۔ اور حافظ ابو القاسم ابن عساکر دمشقی (م ۵۷۱ھ) کی روایت میں ہے۔ اما الحسن فقد نحلتہ حلمی وھیبتی واما الحسین فقد نحلتہ نجدتی وجودی (کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۱) کوثر

آپ نے بیس ہزار دیئے اور ارشاد فرمایا۔ دس ہزار درہم سے قرض ادا کر دو، باقی دس ہزار سے اپنی پریشان حالی دور کرو۔

۲۔ حضرت اسامہ بن زید جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے ہی چہیتے تھے، ان کے انتقال کا وقت قریب آیا تو بڑے فکرمند تھے کہ ساٹھ ہزار درم کے مقروض تھے، آخر بےچین ہو کر پکار اٹھے "ہائے رنج و غم" حضرت امام حسین علیہ السلام عیادت کے لئے تشریف لائے تھے، آپ نے فرمایا۔

اسامہ! کون سا غم ہے؟

گذارش کی: ساٹھ ہزار درم کا مقروض ہوں۔

امام نے فرمایا: یہ قرض میں نے اپنے اوپر لے لیا۔

حضرت اسامہ نے کہا: ڈر ہے کہ ادائیگی کے پہلے نہ مر جاؤں۔

امام نے اسی وقت ساٹھ ہزار قرض ادا فرما دیا۔

۳۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ میں حسین کے پاس موجود تھا، اتنے میں ایک لونڈی نے سلام کرتے ہوئے پھولوں کا ایک گلدستہ پیش کیا۔ آپ نے فرمایا۔

" اللہ کے واسطے تو آزاد ہے "۔ حضرت انس کی زبان سے نکلا: ایک لونڈی سلام کے ساتھ گلدستہ پیش کرتی ہے۔ اور آپ اتنی ہی بات پر اسے آزاد کر رہے ہیں؟

آپ نے فرمایا: اللہ نے ہم لوگوں کو اسی قسم کی تربیت فرمائی ہے، وہ فرماتا ہے:

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا	جب تم لوگوں کو سلام کا تحفہ پیش کیا جائے تو اس سے بہتر تحفۂ سلام پیش کرو یا وہی پیش کرو۔

(سورۂ نساء پ ۵، رکوع ۸ آیت ۸۶)

" فرمایا اس سے بہتر تحفہ یہ ہے کہ اسے آزاد کر دیا جائے۔"

۴۔ تاریخ ابن عساکر (ج ۴ ص ۳۲۳-۳۲۴) میں ہے کہ:

"امام حسین اللہ کی راہ میں بہت زیادہ خیرات کرتے تھے، کوئی سائل آپ کے دروازہ سے ناکام واپس نہیں گیا۔"

ایک بار ایک سائل مدینہ کی گلیوں میں پھرتا ہوا آپ کے آستانہ پر آیا۔ آپ نماز میں مشغول تھے، فارغ ہونے کے بعد سائل کی طرف متوجہ ہوئے، اس کے چہرہ پر فقر و فاقہ کے آثار نظر آئے، قنبر کو آواز دی، وہ حاضر ہوئے، فرمایا: میرے اخراجات میں کتنا باقی رہ گیا ہے؟ عرض کی دو سو درہم ہیں جو اہل بیت کو دینے کے لئے رہ گئے ہیں۔ ارشاد ہوا:
اہل بیت سے زیادہ مستحق آگیا ہے، پھر اسی وقت دو سو درہم منگا کر سائل کو دے دیئے۔ اور معذرت فرمائی کہ اس وقت یہی موجود ہے۔
سائل منت پذیری کے جذبہ سے لبریز ہو کر یہ اشعار پڑھنے لگا۔

مطھرون نقیات جیوبھم　　تجری الصلوٰۃ علیھم اینما ذکروا

ترجمہ: یہ حضرات پاک و مطہر ہیں جہاں بھی ان کا ذکر ہوتا ہے ان پر درود بھیجا جاتا ہے۔

وانتم انتم الاعلون عندکم　　علم الکتاب وماجاءت بہ السور

ترجمہ: آپ حضرات ہاں آپ ہی حضرات سب سے بلند و برتر ہیں۔ آپ ہی لوگوں کے پاس قرآن مجید کا علم ہے۔
آپ کی فیاضی کے اور بھی واقعات ہیں اور بکثرت ہیں۔

یہ سب حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد مقدس کی تفسیر ہیں کہ:
"میں نے حسین کو اپنی سخاوت اور شجاعت عطا کی۔"

آپ کی شجاعت | عہد اول کے بہادروں کی شجاعت سے تاریخ اسلام کے صفحے بھرے

---

[1] عقد اللآل فی مناقب الآل علامہ احمد بن سلیمان کرانی کو شیعہ حضرات دیکھیں کہ امام حسین حضرت اسامہ سے کیسی محبت فرماتے ہیں۔ ۱۲ کوثر

[2] لواعج الاشجان ص ۱۳ مولفہ سید محسن کو شیعہ حضرات دیکھیں کہ امام حسین اور حضرت انس میں کتنا خلا ملا ہے۔ ۱۲ کوثر

پڑے ہیں جنہوں نے میدان کارزار میں اپنا ریکارڈ قائم کر دیا ہے۔ لیکن اگر یہ سوال اٹھایا جائے کہ اسلام کا وہ کون سا بہادر ہے جو تین روز کا پیاسا ہو، اس کا شیر دل فرزند، اسکے لڑکے، بچے، بھائی، بھتیجے عزیز و اقارب جتنے اس کے ساتھ ہیں سب ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیئے گئے ہوں۔ اس کا چھ مہینے کا بچہ بھی اس کی گود میں تیر کا نشانہ بنا دیا گیا ہو اور تڑپ کر باپ کے گلے سے لپٹ کر جان دیدی ہو۔ ہزاروں ہزار فوج چاروں طرف سے اسے نرغے میں لئے ہوئے ہر طرف سے تیر برسا رہی ہو، بھالے چلا رہی ہو، تلواریں مار رہی ہو، حملوں اور ہر طرح کی مصیبتوں کا طوفان ہو، اور ایسا کہ بڑے سے بڑا رستم بھی ہمت چھوڑ بیٹھے، لیکن یہ مرد حق پوری اولوالعزمیوں کے ساتھ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح جما کھڑا ہو، پہاڑ بھی ہو تو ہل جائے، مگر اس کے قدم میں ذرا بھی لغزش نہیں، بتاؤ ایسا بہادر، ایسا اولوالعزم اور ایسا عدیم المثال ثابت قدم انسان کون ہے؟

اس سوال کے جواب میں صرف ایک آواز بلند ہو سکتی ہے، وہ یہ ہے کہ پوری تاریخ اسلام میں صرف سیدنا امام حسین علیہ السلام ہی ایسے بہادر ہیں۔

یہ تفسیر ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد مقدس کی۔

"میں نے حسین کو اپنی بہادری عطا کی"

درحقیقت سیدنا امام حسین علیہ السلام کی اولوالعزمی اور بہادری حضور اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عدیم المثال شجاعت اور بہادری کا مظہر اعظم ہے، اسی لئے پوری تاریخ اسلام میں اس کی ایک بھی مثال نہیں۔ جب رسول اعظم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی فرماتے ہیں:

"میں نے حسین کو اپنی بہادری عطا کی"

تو اس بہادری کی مثال کہاں مل سکتی ہے؟

پیغمبرانہ شجاعت کے بعد تمام دنیا میں بہادری کا یہ اعلیٰ ترین نمونہ ہے۔

اور اس میں سیدنا امام مظلوم کی عزیمت جو قیام حق کی جان ہے اس کی یاد مردہ دلوں اور

مردہ قوموں کو بھی بلند ہمت، مستقل مزاج اور ثابت قدمی کا پہاڑ بنا دیتی ہے جس کے سامنے آپ کی یہ عزیمت اور اولوالعزمی ہے وہ مصائب اور مشکلات کے طوفان میں کبھی ہمت نہیں ہار سکتا آج ملت اسلامیہ جو ہر طرف سے طوفان حوادث میں گھری ہے، اس کو اپنی حیات اور بقا کے لئے جس ثابت قدمی اور اولوالعزمی کی ضرورت ہے، سیرت حسینی اس کا بہترین سبق دیتی ہے اور دل میں مستقل مزاجی اور عزم و ہمت کی روح بھی پھونکتی ہے، جس قوم کی نگاہوں میں امام حسین کی بہادری، بلند ہمتی، عالی ظرفی، مستقل مزاجی اور ردِ عمل ہے وہ کبھی ذلت کی موت مر ہی نہیں سکتی۔ اس کے افراد ملت کی حیات کے لئے موت کا خیر مقدم کرتے ہیں اور شہید ملت بن کر خود بھی حیات جاوداں پاتے ہیں۔ اور ملت میں حیات ابدی کی روح پھونکتے ہیں۔ زندگی ہے ان کی عزیمت میں! زندگی ہے ان کی مستقل مزاجی میں! زندگی ہے ان کے جوشِ عمل میں! ہاں یہی ہے عزت کی زندگی! اور ابدی زندگی۔

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ○	جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ہیں ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ یہ تو زندہ ہیں، لیکن تم لوگ ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے۔
(بقرہ آیت ۱۵۴)	

اللہ نے حضرت یحییٰ علیہ السّلام کے خون کا بدلہ ستّر ہزار سے لیا۔

اور اس کا وعدہ ہے کہ اے محمدؐ تمہارے نواسے کے خون کا بدلہ ستّر ہزار کے دونا سے لوں گا!

حدیث رسول ہے کہ

اوحی اللہ الی الی قتلت بیحیٰی بن زکریا سبعین الفا و الی قاتل یا بن بنتك سبعین الفا و سبعین الفا۔

(مستدرک عن ابن عباس)

اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ میں نے یحییٰ بن زکریا کے خون کا بدلہ ستر ہزار سے لیا کہ اتنے قتل ہوئے اور تمہارے نواسے کے خون کا بدلہ ستر ہزار اور ستر ہزار سے لوں گا کہ اتنی تعداد میں قتل ہوں گے۔

شہادت حسین تاریخ انسانی کا بہت بڑا حادثہ ہے

حضرت یحییٰ علیہ السلام کی شہادت حکومت وقت کا ظلم عظیم ہے، جس کا انتقام غضب الٰہی نے ستر ہزار یہود سے لیا۔ اور امام حسین علیہ السلام کی شہادت بھی حکومت وقت کا ظلم عظیم ہے اور چونکہ ظالموں کو اس کا پورا علم ہے کہ حسین محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لخت جگر ہیں۔ اس پر بھی ان بدبختوں نے امام حسین علیہ السلام کو شہید کر دیا۔ لہٰذا جرم کی نوعیت بڑھ گئی اسی لئے حضرت یحییٰ کے خون کا بدلہ قدرت الٰہی نے ستر ہزار یہود سے لیا، تو امام حسین علیہ السلام کے خون کا بدلہ ستر ہزار کے دونا یعنی ایک لاکھ چالیس ہزار سے لیا۔

مستدرک حاکم (ج ۲ ص ۱۷۸) میں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اوحی اللہ الی انی قتلت بیحیی بن زکریا سبعین الفا، وانی قاتل با بن بنتك سبعین الفا و سبعین الفا،	اللہ نے میرے پاس وحی بھیجی ہے کہ میں نے یحییٰ بن زکریا کے خون کا بدلہ ستر ہزار سے لیا کر اتنے قتل ہوئے اور تمہارے نواسے کے خون کا بدلہ ستر ہزار اور ستر ہزار لوگوں سے لوں گا۔ کہ اتنی تعداد میں قتل ہوں گے۔

حافظ ذہبی نے اس روایت کو علی شرط مسلم تسلیم کیا ہے اور یہ متعدد طریقوں سے مروی بھی ہے۔ مورخ اسلام علامہ سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی (ج ۳ ص ۱۷۰) میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں "یہ اطلاع حرف بحرف صحیح ہوئی، امام موصوف کی شہادت کے بعد

مختار کے ہاتھوں قاتلین حسین سے اسی قدر انتقام لیا گیا ۔"

ایک اہم نکتہ امام مظلوم علیہ السلام کے خون کا بدلہ اللہ نے ایک لاکھ چالیس ہزار لوگوں سے لیا۔ ظاہر ہے کہ یہ سب قاتلین امام نہ تھے، لیکن ان سے بدلہ لینے کی وجہ یہ ہے کہ سب قاتلین امام کے حامی تھے۔ اور ان کے اس ملعون فعل کو بُرا نہیں سمجھتے تھے۔ اس لئے وہ سب قاتلین امام کے زمرہ میں لے لئے گئے۔ یہاں سے یہ ہدایت ملتی ہے کہ جو لوگ امام مظلوم کے خلاف ہیں، یزید اور اسکے اعوان و انصار کو اچھا سمجھتے ہیں۔ وہ سب اللہ کے نزدیک قاتلین امام کے زمرہ میں ہیں۔ اگر یہاں نہیں تو وہاں انتقام الٰہی کی پکڑ میں آئیں گے۔ اور اللہ کی پکڑ بہت سخت ہے :

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ۝ (سورہ البروج، ۱۲) بیشک تمہارے رب کی پکڑ بہت ہی سخت ہے۔

جس نے اللہ کے پیاروں کو قتل کیا تو وہ قاتل ہے ہی، جس نے قاتل کی اس روش کو اچھا سمجھا وہ بھی قاتل کے زمرہ میں آگیا۔ مثلاً اگلے زمانہ کے یہود نے بعض انبیا (حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ وغیرہ) کو قتل کیا۔ چونکہ عہدِ محمدی کے یہود اس فعل کو اچھا سمجھتے تھے، اس لئے قرآن مجید نے ان لوگوں کو بھی قاتلین انبیا کے زمرہ میں رکھا ہے۔ چنانچہ ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے :-

فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ۝ (البقرہ آیت ۸۷) تم لوگ انبیا کے ایک گروہ کی تکذیب کرتے رہے اور ایک گروہ کو قتل کرتے رہے

امام حسین علیہ السلام کے تمام قاتل اللہ کی نگاہ میں اتنے بدبخت ہیں کہ ان میں سے ایک ایک شقی نہایت بری موت مرا ہے۔ اور بعض کو قبر میں ڈالنے سے پہلے ہی عالم غیب کا عذاب اس طرح شروع ہو گیا کہ ہر نگاہ نے دیکھ لیا۔ سنن ترمذی (ج ۲ ص ۲۱۹) میں ہے کہ :-

جب ابن زیاد اور اس کے ہمراہیوں کے سر کاٹ کر لائے گئے اور تلے اوپر رکھ دیئے گئے تو لوگ دیکھ رہے تھے کہ ناگہاں ایک سانپ آیا لوگ پکارنے لگے، سانپ آیا سانپ، اور تمام سروں کے بیچ

سے گذرتا ہوا عبیداللہ بن زیاد کے نتھنے میں گھس گیا، تھوڑی دیر بعد نکلا، اور غائب ہو گیا لیکن پھر آیا، اور لوگ کہنے لگے آیا، آیا" یہ واقعہ اسی طرح دو بار یا تین بار ظہور میں آیا (کہ سانپ آکر ابن زیاد کے نتھنے میں گھس گیا، تھوڑی دیر کے بعد نکل کر غائب ہو گیا، پھر نمودار ہوا، اور حسب سابق اپنا کام کیا۔)

عبرت کی بات تھی۔ سب کو عبرت ہوئی کہ مرنے کے بعد جو عذاب پیش آنے والا ہے وہ مخلوق کی نگاہوں سے چھپا دیا جاتا ہے، لیکن بعض قاتلان امام کا عذاب کھول کر دکھا دیا گیا کہ سب کی آنکھیں کھل جائیں اور ڈریں کہ امام مظلوم کا دشمن بڑا ہی شقی ہے۔ لہٰذا آپ کی عداوت سے لوگ پناہ مانگیں۔

جن بدبختوں نے امام مظلوم اور شہدائے کربلا کو شہید کیا ہے وہ شدید ترین غضب الٰہی کے مستحق ہیں۔ ابن سعد حضرت عائشہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :۔

ان جبریل ارانی التربة	جبریل نے مجھے وہ خاک دکھائی ہے جس پر
التی یقتل علیها الحسین	حسین کو قتل کیا جائے گا، جو شخص حسین
فاشتد غضب الله علی	کا خون بہائے گا اس پر اللہ کا غضب بہت
من یسفك دمه ، فیا	شدید ہو گا۔ اے عائشہ مجھے اس کی قسم
عائشة والذی نفسی بیده	ہے جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ قتلِ
انه لیحزننی فمن هذا	حسین سے مجھے بہت غم واندوہ ہو گا۔[1]
من امتی یقتل حسینا بعدی	میری امت میں وہ کون شخص ہو گا جو میرے
(کنز العمال ج ۶ ص ۲۲۲)	بعد حسین کو قتل کرے گا۔

امام مظلوم کے قتل سے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتنی تکلیف پہنچی ہو گی؟ اس کا

---

[1] یہ ترجمہ بھی ہو سکتا ہے :۔ یہ (قتل حسین کی) بات مجھے بہت صدمہ اور تکلیف پہنچا رہی ہے۔ ۱۲ کوثر

اندازہ قیاس سے باہر ہے. یہ حدیث بتا رہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ اس سے مجھے بہت زیادہ صدمہ اور تکلیف ہو گی۔ حضور پر اس کا اتنا شدید اثر تھا جب اس ہونے والے واقعہ کو بیان فرماتے تو آنکھیں اشکبار ہو جاتیں. اس مضمون کی چند حدیثیں اس فصل میں گذر چکی ہیں، جس کا عنوان ہے "عترت رسول کو ایذا دینا حرام ہے"۔

مشکوٰۃ شریف (صفحہ ۵۷۲) میں مسند احمد اور دلائل النبوۃ بیہقی کے حوالہ سے ہے کہ:

حضرت ابن عباس فرماتے ہیں: میں ایک روز دوپہر کو سویا تھا کہ خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس عالم میں دیکھا کہ بال بکھرے ہیں، جسم پاک پر غبار پڑے ہیں اور آپ کے ہاتھ میں ایک شیشی ہے جس میں خون بھرا ہے۔ میں نے عرض کی:

یارسول آپ پر میرے ماں باپ قربان، شیشی میں یہ کیا ہے؟

آپ نے فرمایا "یہ حسین اور ان کے ساتھیوں کا خون ہے جسے میں آج اب تک اٹھا تا رہا۔"

حضرت ابن عباس نے اس وقت (اور تاریخ) کو نوٹ کر لیا. ان کا بیان ہے کہ اسی (تاریخ اور) وقت میں حسین کو قتل کیا گیا تھا۔[1]

اندازہ لگاؤ کہ واقعات کربلا خصوصاً امام مظلوم علیہ السلام کی شہادت کا واقعہ کتنا جگر خراش اور دل دوز حادثہ ہے کہ جب بھی حضور پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کی اطلاع دی ہے تو آنکھیں اشکبار ہو گئی ہیں. اور جب یہ حادثہ ظہور میں آیا تو عالم غیب میں آپ بے حد پر ملال اور رنج و اندوہ سے بھرے نظر آئے، بال بکھرے ہیں. جسم پر غبار پڑے ہیں۔ غور کرو کہ امام مظلوم علیہ السلام کے دشمنوں اور

---

[1] اس روایت کا متن یہ ہے:۔ عن ابن عباس انہ قال: رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فیما یری النائم ذات یوم لنصف النہار اشعث اغبر بیدہ قارورۃ فیہا دم فقلت بابی انت وامی ما ھذا؟ قال: ھذا دم الحسین واصحابہ لم ازل التقطہ منذ الیوم۔ فحصی ذالک الوقت فاجد قتل ذالک الوقت ۔ ۱۲ کوثر

قاتلوں نے حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو کتنی شدید ایذا پہنچائی ہے ؟!

جن بدبختوں نے حبیب خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو ایذا پہنچائی ہے ان کا انجام کیا ہے ؟

- دنیا میں بھی لعنت !
- آخرت میں بھی لعنت !
- اور عذاب مہین !

سورہ احزاب (پ ۲۲ ع ۴۳) میں ہے :

اِنَّ الَّذِيْنَ يُؤْذُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَاَعَدَّ لَهُمْ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

جو لوگ اللہ اور رسول کو ایذا دیتے ہیں یقین مانو کہ اللہ نے دنیا میں بھی ان پر لعنت کی ہے اور آخرت میں بھی لعنت کرے گا۔ اور ان کے لئے اہانت کرنے والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

قرآن مجید میں یزید پر لعنت ہے، اور ان تمام بدبختوں پر بھی لعنت ہے جنھوں نے آپ کو قتل کیا یا اس سلسلے میں کوئی کارروائی کی ہے

جن بدبختوں نے امام شہید مظلوم سیدنا امام حسین علی جدہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو قتل کیا اور جن لعینوں نے قتل کرنے کا آرڈر دیا یا انتظام کیا یا کرایا۔ یعنی شمر ابن سنان، خولی، عمر ابن سعد، ابن زیاد بدنہاد اور یزید پلید یہ سب کے سب آیت مذکورہ بالا کے رد سے ملعون ہیں۔ آیت پاک کا فیصلہ ہے کہ ان سب پر

- دنیا میں بھی اللہ کی لعنت ہے !
- اور آخرت میں بھی اللہ کی لعنت !
- اور ان کے لئے بڑا ہی رسوا کن عذاب پہلے ہی سے تیار ہے۔

کیا یزید نے قتل حسین کا حکم دیا تھا؟

بیشک دیا تھا، ابن زیاد کے پاس اس کا بڑا سخت آرڈر بھیجا تھا، اتنا تو عام مؤرخین لکھتے ہیں جیسے امام سیوطی نے تاریخ الخلفاء (صفحہ ۱۴۴) میں لکھا ہے کہ:

بعث اهل العراق الى الحسين الرسل والكتب يدعونه اليهم فخرج من مكة الى العراق في ذي الحجّة ومعه طائفة من اهل بيته رجالاً ونساءً وصبياناً، فكتب يزيد الى والى العراق عبيد الله بن زياد بقتاله۔	اہل عراق نے حسین کے پاس آدمی بھی بھیجے اور خطوط بھی کہ یہاں تشریف لائیے۔ لہٰذا آپ ذی الحجہ میں مکہ سے عراق روانہ ہوئے، آپ کے ہمراہ آپ کے اہل بیت کی ایک جماعت بھی تھی، جن میں مرد بھی تھے عورتیں اور بچے بھی۔ اس پر یزید نے عراق کے حاکم عبید اللہ بن زیاد کے پاس خط لکھا کہ حسین سے قتال کرو۔

ایک موقع پر خود ابن زیاد نے تصریح کی ہے کہ:۔

"یزید نے اسے قتل حسین کا آرڈر دیا تھا" (تاریخ کامل ابن اثیر ج ۴ ص ۵۹)

تفصیل یہ ہے کہ یزید کے مرنے کے بعد جب ابن زیاد نے عراق پر بنی امیہ کا اقتدار مٹتا ہوا دیکھا تو بنی ازد کے سو سواروں کی حمایت میں عراق سے شام کا رخ کیا، راستہ میں ایک جگہ اسے گہری سوچ میں پا کر رفیق سفر نے پوچھا، کیا سوچ رہے ہو؟ ابن زیاد نے کہا ایک سوچ ہے۔ رفیق سفر نے کہا، "میں بتاؤں، کیا سوچ رہے ہو" ابن زیاد نے کہا۔ بولو۔ اس نے کہا یہی سوچ رہے ہو کہ کاش میں حسین کو قتل نہ کراتا تو یہ خطرہ سامنے نہ آتا"

ابن زیاد نے کہا، (کیا کہیں؟!)

"یزید نے قتل حسین کا آرڈر بھیجا تھا"

اور یہ بھی کہا تھا کہ اگر تو اس کام کو نہ کرے گا تو خود تجھی کو قتل کرادوں گا"

امام مظلوم کی شہادت کے بعد یزید نے جو کچھ کیا ہے وہ خود ثبوت ناطق ہے کہ یزید نے آپ کے قتل کا آرڈر دیا تھا۔ مؤرخین کا بیان ہے کہ :

جب یزید کے سامنے امام علیہ السلام کا سر مبارک رکھا گیا تو اس نے یہ اشعار پڑھے :

الیٰ قومنا ان ینصفونا فانصفت　　　قواضب فی ایماننا تقطر الدما

ترجمہ :- ہماری قوم نے ہمارے بارے میں انصاف سے کام نہیں لیا لہٰذا ان تلواروں نے انصاف کیا جو ہمارے ہاتھوں میں ہیں اور خون بہا رہی ہیں۔

۲۔ نفلق[ع] ھاما من رجال اعزۃ　　　علینا وھم کانوا اعق وا ظلما[ل]

ترجمہ : ہم ان لوگوں کی کھوپڑیاں چاک کرتے ہیں جو ہمارے نزدیک معزز ہیں۔ ہم ایسا اس لئے کرتے ہیں کہ یہ لوگ بڑے نافرمان اور ظالم تھے۔

امام ابن جریر طبری اور مورخ ابن اثیر اپنی اپنی تاریخوں میں لکھتے ہیں کہ :

"جب امام حسین علیہ السلام کا سر یزید کے سامنے پیش کیا گیا تو ابن زیاد کی کارروائیوں سے بہت خوش ہوا اور بہت انعام و اکرام سے نوازا۔ لیکن کچھ دنوں بعد جب اسے پتہ چلا کہ قتل حسین کی وجہ سے پبلک یزید سے سخت ناراض ہے اور لعنت بھیجتی ہے تو حسین کے قتل پر پچھتانے لگا۔ اور کہنے لگا اگر ہم کچھ تحمل سے کام لیتے اور حسین کو اپنے محل میں رکھتے، ان کی باتوں پر عمل کرتے تو کیا برا تھا، گو اس میں اپنی حکومت کی کمزوری ہوتی۔ لیکن حقوق رسول کا پاس اور آپ کی قرابت کا لحاظ تو ہو جاتا۔ مرجانہ کے بیٹے (ابن زیاد) پر لعنت ہو اس نے حسین کی ایک بات بھی نہ مانی اور قتل کرا کے رہا۔ اور مجھکو

ل ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں اس واقعہ کو لکھا ہے اور یہ شعر نقل کیا ہے۔ ۱۲ کوثر

ع بعض روایتوں میں نفلق ھاما کے بجائے "یفلقن ھاما" ہے۔ ۱۲ کوثر

مبغوض مسلمین بنا دیا۔ سب کے دلوں میں میری عداوت کے بیج بو دیئے
ہر نیک و بد مجھ سے بغض رکھنے لگا۔ میں نے حسین کو جو قتل کرایا ہے لوگ
اسے بہت بڑی بات سمجھتے ہیں ۔"

لیجئے یزید خود بول رہا ہے کہ اس نے حسین کو قتل کرایا ہے۔ تعجب ہے کہ یزید کے حامی اب بھی یزید کو قتل حسین سے مبرا ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن واقعات پر کتنے پردے ڈالیں گے ؟
علامہ ذہبی جو تاریخ اسلام کے بڑے محقق اور بلند پایہ مبصر ہیں "تاریخ النبلاء" میں یزید کے معائب بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یزید نے اپنی سلطنت میں پہلا کام یہی کیا کہ حسین کو قتل کرایا۔ الفاظ یہ ہیں :

افتتح دولته بقتل الشهيد الحسين رضی الله عنه، و واختتمها بوقعة الحرة فمقته الناس (الروض الباسم صفحہ ۳۶)	اس نے اپنی سلطنت کا افتتاح حسین شہید رضی اللہ عنہ کے قتل کرانے سے کیا، اور اختتام جنگ حرہ پر کر دیا۔ ان اسباب کی بنا پر لوگ اس کے بڑے ہی دشمن ہو گئے۔

حدیث نے بھی اس خلیفۂ وقت کو قتل حسین کا ایک مجرم قرار دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں :

اوہ لفراخ آل محمد من خليفة يستخلف عتريف مترف، يقتل خلفی وخلف الخلف ۔ (ابن عساکر و ابن اثیر و مجمع بحار الانوار وغیرہ)	آہ آل محمد کے بچو! یہ آہ اس خلیفہ کی وجہ سے ہے جو (یوں ہی) خلیفہ بنایا جائے گا وہ خبیث شیطان ہوگا، دولت پاکر سرکش ہو جائے گا میری اولاد کو اور اولاد کی اولاد کو قتل کرے گا۔

ان حقائق کی بنا پر اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں کہ یزید نے قتل حسین کا آرڈر دیا تھا۔ اور حق و انصاف کی عدالت میں یزید قاتل حسین ہے اور اس بنا پر حدیث نے بھی اسے قاتل حسین قرار دیا ہے اب اس کے ملعون ہونے میں کیا شک ؟ اسی بنا پر حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ سے ان کے صاحبزادے عبداللہ نے یزید پر لعنت کے بارے میں استفسار

کیا تو حضرت موصوف نے فرمایا:۔

"بھلا اس شخص پر کیوں نہ لعنت کی جائے جس پر اللہ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے"

اس پر صاحبزادے عبداللہ نے کہا " مجھے کتاب الٰہی میں یزید پر لعنت نہیں ملی"

حضرت امام نے فرمایا، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:۔

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ	تم لوگوں سے یہ بعید نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ
تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْٓا	تو زمین پر فساد مچاؤ۔ اور اپنے رشتوں کو توڑ
اَرْحَامَكُمْ ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ	ڈالو، یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے
لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى	پھر ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا
اَبْصَارَهُمْ ۝ (سورۂ محمدؐ پ ۲۶ ع ۵)	کر دیا ہے۔

اس کی تلاوت کے بعد حضرت موصوف نے فرمایا:

"یزید نے جو کچھ کیا ہے بھلا اس سے بڑھ کر بھی کوئی فساد اور رشتہ توڑنا ہو سکتا ہے"[۱]

امام صاحب اس کتاب الٰہی سے کتنا مضبوط ثبوت دیتے ہیں کہ یزید ملعون ہے۔ اس نے اپنے رشتہ کو توڑا۔ امام حسین علیہ السلام اس کے رشتہ دار تھے، لیکن کس بیدردی سے انہیں قتل کرایا اور زمین پر فساد مچایا کہ کربلا کی زمین خون سے رنگین کرادی اور اس کے بعد مدینہ منورہ میں تین روز قتل عام کرا دیا۔ ظالم نے کیسے مقدس رشتہ کو کاٹا ہے، اس رشتہ کو جو تمام دنیا میں سب سے زیادہ مقدس اور قابل لحاظ رشتہ ہے اور کیسا فساد مچایا ہے کہ نبی کا باغ بھی جلا ڈالا اور نبی کا مدینہ بھی لوٹ لیا۔ نتائج کے لحاظ سے ایسا سنگین فساد قیامت تک نہیں ہو سکتا۔ ایسے مجرم کو قرآن مجید کھلے الفاظ میں ملعون کہتا ہے، اور فرماتا ہے، ایسے لوگوں پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے

---

[۱] تفسیر روح المعانی ج ۲۶ ص ۶۵ مطبوعہ طباعۃ منیریہ مصر۔ ۱۲ کوثر

کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا۔

نوٹ : یزید کے حامیوں کی ایک سیاست یہ بھی ہے کہ وہ اس قسم کا چرچا کیا کرتے تھے کہ فلاں امام یزید کے حامی ہیں، یزید کی تعریف کرتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ چنانچہ امام احمد کے متعلق بھی یہ افواہ اڑادی تھی کہ امام احمد یزید سے محبت رکھتے ہیں۔ اور ان کے خاندان کے لوگ محبان یزید ہیں۔ یہ بات یہاں تک بڑھی کہ امام احمد کے دوسرے صاحبزادے حضرت صالح کو امام صاحب سے کہنا پڑا:

یا ابت یزعم بعض الناس انا نحب یزید بن معاویہ۔

ابا جان! بعض لوگ ہم لوگوں کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (بھی) یزید بن معاویہ سے محبت رکھتے ہیں۔

اس پر امام احمد نے جو فرمایا۔ ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں:۔

یا بنی هل یسوغ لمن یومن باللہ ان یحب یزید ولم لا یلعن رجلا لعنه الله فی کتابه قلت: یا ابت این لعن اللہ یزید فی کتابه قال بحیث قال: فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَ تُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ ٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ ٥

"میرے فرزند! جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ یزید سے محبت رکھے؟ بھلا ایسے شخص پر وہ لعنت کیوں نہ کرے؟ جس پر خود اللہ نے اپنی کتاب میں لعنت کی ہے"

صاحبزادے نے کہا: "ابا جان اللہ نے اپنی کتاب میں یزید پر کہاں لعنت کی ہے؟"

امام احمد نے فرمایا" اس ارشاد میں" فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْا اَرْحَامَكُمْ ٥ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰٓى اَبْصَارَهُمْ۔

(تفسیر مظہری ج ۸ ص ۴۳۴ بحوالہ معتمد الاصول قاضی ابو یعلی)

(ان آیتوں کا ترجمہ بھی اوپر گذر رہا ہے)

ایک اہم بصیرت جیسے امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ قرآن مجید سے ثابت فرماتے ہیں کہ یزید پر اللہ کی لعنت ہے اسی طرح بعض ارباب بصیرت مثلاً حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ جو نہایت بلند پایہ مفسر، بے نظیر محدث اعلیٰ منزلت فقیہہ، بڑے باخدا درویش اور عارف ربانی ہیں۔ قرآن مجید کی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ یزید کافر ہے۔ آیت یہ ہے :-

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا	اے نبی کیا آپ نے ان لوگوں کا شاہدہ نہیں
نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا وَّاَحَلُّوْا	کیا؟ جنہوں نے اللہ کی نعمت (پاکر شکر) کے
قَوْمَهُمْ دَارَ الْبَوَارِ ۙ جَهَنَّمَ ۚ	بدلہ کفر و ناشکری اختیار کی اور اپنی قوم کو
يَصْلَوْنَهَا ۗ وَبِئْسَ الْقَرَارُ ۲۹	تباہی کے گھر یعنی جہنم میں لا اتارا، یہ بہت
(سورۂ ابراہیم پ ۱۳ ع ۱۶)	ہی بُرا ٹھکانا ہے۔

حضرت قاضی صاحب لکھتے ہیں، صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عباس کا قول ہے کہ "یہ لوگ کفار قریش ہیں"۔ آگے چل کر لکھتے ہیں :

> ابن مردویہ حضرت ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ: انہوں نے حضرت عمرؓ سے پوچھا: امیرالمومنین اس آیت اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ بَدَّلُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ كُفْرًا ۔ میں کون لوگ مراد ہیں؟ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ قریش کے دو فاجر خاندان والے مراد ہیں۔ یہ ہیں بنو مغیرہ اور بنو امیہ۔ بنو مغیرہ کی کافی سرکوبی تم لوگ غزوۂ بدر میں کر چکے۔ البتہ بنو امیہ ایک زمانہ تک مال و متاع پاتے رہیں گے[1]

ابن جریرؒ، ابن منذرؒ، ابن ابی حاتم (اپنی تصانیف میں) طبرانی معجم اوسط میں حاکم مستدرک

---

[1] حضرت عمرؓ کا یہ قول امام بخاری نے تاریخ میں نیز ابن جریر اور ابن منذر نے بھی نقل کیا ہے۔ ملاحظہ ہو، تفسیر الدر المنثور ج ۴ ص ۸۴ ـ

اور ابن مردویہ (اپنی کتاب میں) متعدد سندوں سے اسی طرح کا قول حضرت علی سے بھی روایت کرتے ہیں[1]۔

حضرت قاضی صاحب قدس سرہٗ حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کا یہ قول نقل کر کے فرماتے ہیں:

- بنو امیہ کفر و ناشکری کے باوجود مال و متاع پاتے رہے۔ حتیٰ کہ ابوسفیان معاویہ اور عمرو بن عاص نے اسلام قبول کیا۔ اس کے بعد یزید اور اس کے ساتھیوں نے اللہ کی دی ہوئی نعمت پا کر شکر کے بدلے کفر و ناشکری کی اور آل نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کو لے کر کھڑے ہوئے اور حسین رضی اللہ عنہ کو بڑے ظلم کے ساتھ شہید کیا،

اور یزید تو دین محمدی کا منکر ہے اور کافر ہے اور یہ کفر یہاں تک ہے کہ حسین رضی اللہ عنہ کو قتل کرانے کے بعد اس نے ایسے اشعار پڑھے ہیں جن کا مضمون یہ ہے "میرے بزرگان خاندان کہاں ہیں؟ وہ دیکھ لیں کہ میں نے آل احمد اور بنی ہاشم سے ان کا انتقام لے لیا"

ان اشعار میں آخری شعر یہ ہے (جو ابن زبعری نے بحالِ کفر غزوۂ احد میں مسلمانوں کی شکست اور قریش کی بہیمانہ حرکات مثلاً حضرت حمزہ کا کلیجہ چبانے پر خوشی مناتے ہوئے کہا ہے):

---

[1] تفسیر الدر المنثور میں اس کے الفاظ یہ ہیں: اخرج ابن جریر و ابن المنذر و ابن ابی حاتم والطبرانی فی الاوسط و ابن مردویہ الحاکم وصححہ من طرق عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فی قولہ: الم تر الی الذین بدلوا نعمۃ اللہ کفرا قال: ھما الافجران من قریش، بنو امیۃ و بنو المغیرۃ: فاما بنو المغیرۃ فقطع اللہ دابرھم یوم بدر واما بنو امیۃ فمتعوا الیٰ حین۔ ۱۲ کوثر

لست من جُندُبٍ ان لم انتقم　　　من بنی احمد ما کان فعل

ترجمہ :۔ احمد نے (بدر میں ہمارے بڑوں کے ساتھ) جو کیا ہے اگر آل احمد سے میں اس کا بدلہ نہ لیتا تو میں جندب کی نسل سے نہ ہوتا۔

یزید نے شراب کو حلال قرار دیا ہے، اس پر اس کے اشعار ہیں۔
(قاضی صاحب نے یہ اشعار نقل کئے ہیں) آخری شعر یہ ہے :

فان حرمت یومًا علیٰ دین احمد　　　فخذ ھا علیٰ دین المسیح بن مریم

(تفسیر مظہری ج ۵ ص ۲۷۴)

یزید کے اس شعر کا ترجمہ یہ ہے۔ وہ کہتا ہے :
"اگر شراب کسی روز دین محمدی میں حرام ہوگئی ہے تو مسیح ابن مریم کے دین میں اسے پیو" (یعنی عیسائی بن جاؤ اور خوب پیو۔"

قاضی صاحب قدس سرہٗ یزید کے اس شعر کو درج کرنے کے بعد فرماتے ہیں :

ان لوگوں نے منبروں پر آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو گالی دی، اور اس گمراہی کے ساتھ ہزار مہینوں تک مال ومتاع سے بہرہ اندوز ہوتے رہے اس کے بعد اللہ نے ان سے ایسا انتقام لیا کہ خاندان یزید میں ایک بھی باقی نہ رہا۔ [1]

---

[1] حضرت قاضی صاحب کے اس ارشاد کا عربی متن یہ ہے :

قلت : اما بنوامیۃ فمتعوا الیٰ حین، حتیٰ اسلم ابو سفیان و معاویۃ وعمرو بن العاص وغیرھم، ثم کفر یزید ومن معہ بما انعم اللہ علیھم، وانتصبوا بعداوۃ اٰل النبی صلی اللہ علیہ وسلم وقتلوا حسینا رضی اللہ عنہ ظلما، وکفر یزید بدین محمد صلی اللہ =

یزید پر لعنت کی تفصیل

اوپر آپ نے تین آیتیں پڑھیں: ایک سورۂ احزاب کی، ایک سورۂ محمدؐ کی ایک سورۂ ابراہیم کی۔

(۱) سورۂ احزاب کی آیت مذکورہ سے ثابت ہے کہ اہل بیت کرام کو ایذا دینے والا ملعون ہے۔ اور اس کی بناء پر حضرت قاضی ثناء اللہ صاحب قدس سرہٗ نے اپنے ایک مکتوب میں جو کلمات طیبات کے ساتھ چھپ چکا ہے ثابت کیا ہے کہ یزید پر قرآن مجید میں لعنت ہے اس کے علاوہ اور بھی آیتیں ثبوت میں پیش کی ہیں۔

(۲) سورۂ محمدؐ کی مذکورہ آیت سے ثابت ہے کہ بنی امیہ حکومت پاکر رشتہ کاٹیں گے۔ رشتہ کاٹنے کی بدترین مثال یہ ہے کہ یزید نے فرزند رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو قتل کرایا۔ یہ آیت کہتی ہے کہ ایسے پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس کی بناء پر حضرت امام احمد بن حنبل وغیرہ نے فرمایا ہے کہ یزید پر قرآن مجید میں لعنت ہے۔

(۳) سورۂ ابراہیم کی آیت سے ثابت ہے کہ بنی امیہ نے نعمت پاکر شکر کے بجائے کفر و

= علیہ وسلم، حتی انشد ابیات حین قتل حسینا رضی اللہ مضمونہا این اشیاخی بنظرون انتقامی یاآل محمد وبنی ھاشم واخر الابیات۔

ولست من جندب ان لم انتقم | من بنی احمد ما کان فعل

وایضًا احل الخمر، وقال:

مدام کذھب فی اناء کفضۃ | وساق کبدر مع مدام کانجم
. . . . | ومشرقہا الساقی ومغربہا فمی
فان حرمت یوما علی دین احمد | فخذھا علی دین المسیح بن مریم

وسبوا آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم علی المنابر فمتعو بھذہ الضلالۃ الف شہر فانتقم اللہ منہ، حتی لم یبق منھم احد (تفسیر مظہری ص ۲۷۱/۵) کوثر

ناشکری کی اور اپنے آدمیوں کو جہنم میں ڈالا۔ کربلائے معلیٰ، مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ کی لڑائیاں جو یزیدی حکومت نے کی ہیں وہ بتارہی ہیں کہ یزید بنی امیہ کا ایسا ہی شخص ہے جس نے حکومت پاکر شکر الٰہی کے بجائے کفر اور ناشکری کی، جیسا کہ مفسر کبیر حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی قدس سرہٗ نے فرمایا ہے اور صاف الفاظ میں صراحت کی ہے کہ یزید کافر ہے۔

ان آیات کے علاوہ گذشتہ صفحات میں متعدد حدیثیں بھی پیش کی گئی ہیں، جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ارشاد رسول اکرم صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے رو سے بھی یزید پر لعنت ہے اور وہ ملعون ہے۔

اس قسم کی آیتوں اور حدیثوں کی بنا پر بکثرت علماء حقانی اور اولیائے ربانی نے یزید کو ملعون کہا اور لکھا ہے۔ تیرھویں صدی میں دنیائے اسلام کے سب سے بڑے مفسر علامہ شہاب سید محمود آلوسی بغدادی (م ۱۲۷۰ھ) اپنی عدیم المثال تفسیر روح المعانی ج ۲۶ ص ۶۶ میں لکھتے ہیں:

"علماء کی ایک جماعت نے بالکل صاف صاف الفاظ میں یزید پر لعنت بھیجی ہے انھیں میں ناصر سنت حافظ ابن جوزی بھی ہیں۔ ان سے پہلے قاضی ابو یعلی نے صاف الفاظ میں یزید پر لعنت بھیجی ہے۔ علامہ تفتازانی کا قول ہے "ہم یزید کے معاملہ میں کوئی توقف نہیں کرتے، بلکہ ہمیں اس کے کہنے میں بھی کوئی تامل نہیں کہ اس کو ایمان ہی نہ تھا، یزید پر بھی اللہ کی لعنت اور اس کے حامیوں اور مددگاروں پر بھی" حافظ جلال الدین سیوطی نے بھی کھلے الفاظ میں یزید پر لعنت بھیجی ہے۔ تاریخ ابن الوردی اور کتاب الوافی بالوفیات میں ہے کہ جب شہدائے کربلا کے سر اور اہل بیت کی عورتیں قید کر کے یزید کے پاس لائی جارہی تھیں تو یزید انھیں دیکھنے کے لئے کوہ جیرون کی گھاٹی تک پہنچا وہاں یہ دیکھا کہ علی و حسین کی مستورات اور بچے (جو قید میں جکڑے ہوئے ہیں)

اور مقتولوں کے سر گھاٹی پر نظر آ رہے ہیں۔ یزید نے یہ دیکھا ہی تھا کہ ایک کوا بولنے لگا۔ اس پر یزید یہ اشعار پڑھنے لگا۔

لما بدت تلك الحمول واشرفت　　　تلك الرؤس علیٰ شفا جیرون

ترجمہ: جب کوہ جیرون کے کنارے پر (اسیران کربلا) کی سواریاں نظر آئیں اور مقتولوں کے سر نظر آئے

نعب الغراب فقلت قل اولا تقل　　　فقد اقتضیت من الرسول دیونی

ترجمہ: تو کوا بولا، اس پر میں نے کہا۔ بول یا نہ بول، میں نے رسول سے اپنا قرض چکوا لیا۔

اس میں یزید نے یہ مطلب ادا کیا ہے کہ رسول نے غزوہ بدر میں یزید کے نانا عتبہ اور اس کے ماموں[1] خالد ولد عتبہ وغیرہ کو جو قتل کرایا ہے، اس کے بدلے میں رسول کی اولاد کو اس نے قتل کرایا اور رسول سے پورا بدلہ لے لیا (ظاہر ہے کہ یہ کھلا ہوا کفر ہے۔ جب یہ صحیح روایت ہے تو یزید اپنی اس (بکواس سے) کافر ہو گیا۔

اسی طرح ان اشعار کو پڑھ کر بھی وہ کافر ہو گیا جو عبداللہ بن زبعری نے قبول اسلام سے پہلے (غزوۂ احد میں حضرت حمزہ وغیرہ کی شہادت پر خوشی مناتے ہوئے) کہے تھے۔ ان میں ایک شعر یہ بھی ہے جسے یزید نے پڑھا تھا:

لست من جندب ان لم انتقم　　　من بنی احمد ما کان فعل

ترجمہ: احمد نے (بدر میں ہمارے بڑوں کے قتل کرانے کا) جو کام کیا ہے اگر احمد کی اولاد سے میں اس کا بدلہ نہ لوں تو میں جندب کی نسل سے نہیں ہے[2]

(نوٹ: یزید نے یہ اشعار شہدائے کربلا کے مقدس سروں کو دیکھ کر بڑی خوشی کے عالم میں پڑھے تھے

---

[1] یزید کے نانا اور ماموں سے مراد اس کے والد کے نانا اور ماموں ہیں کیوں کہ عتبہ یزید کی داوی ہندہ کا باپ تھا جو غزوہ بدر میں اپنے بیٹوں کے ساتھ مارا گیا۔ عتبہ نے حضرت حمزہ پر وار کیا اور ولید نے حضرت علی پر۔ اور یہ دونوں دشمنانِ خدا اللہ کے ان دونوں شیروں کے ہاتھوں مارے گئے۔ [2] تفسیر روح المعانی کی عبارت ختم ہو گئی۔ ۱۲ کوثر

اور بڑا مسرور تھا کہ اولادِ رسول کو قتل کرا کے نبی سے بدلہ لے لیا۔ ۱۲ کوثر)

مفسر آلوسی اس کے بعد یزید کے بارے میں لوگوں کے اقوال نقل کرتے ہیں پھر فرماتے ہیں:

وانا اقول: الذی یغلب علی الظن ان الخبیث لم یکن مصدقا برسالۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم و ان مجموع ما فعل مع اھل حرم اللہ تعالٰی وحرم نبیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام و عترتہ الطیبین الطاھرین فی الحیوٰۃ و بعد الممات وما صدر عنہ من المخازی لیس باضعف دلالۃ علی عدم تصدیقہ من القاء ورقۃ من المصحف الشریف فی قذر ولا اظن ان امرہ کان خافیا علی اجلۃ المسلمین اذ ذاک ولکن کانوا مغلوبین مقھورین، لم یسعھم الا الصبر لیقضی اللہ امرا کان مفعولا	میرا قول ہے: ظن غالب یہ ہے کہ خبیث یزید نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت کی تصدیق کرنے والا تھا ہی نہیں، اس نے حرم مکہ والوں کے ساتھ جو کیا اور حرم مدینہ والوں کے ساتھ جو کیا نیز رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذریت طیبہ مطہرہ کے ساتھ ان کی زندگی میں اور ان کے ارتحال کے بعد جو کچھ کیا ہے نیز اس سے اور بھی جو ذلیل حرکتیں صادر ہوئی ہیں وہ سب ثبوت اور دلیل ہیں کہ یزید کو ایمان تھا ہی نہیں یہ سب باتیں اس کے عدم ایمان اور تصدیق نہ ہونے کا ایسا ہی ثبوت ہیں جیسے کوئی خبیث قرآن شریف کا کوئی ورق گندگی میں ڈال دے جیسے اس کا یہ فعل ثبوت ہے کہ اس کو ایمان و تصدیق نہیں اور اس کا یہ فعل عدم ایمان کا بہت قوی ثبوت ہے۔ اسی طرح یزید کے وہ سب کام اس کے عدم ایمان و تصدیق کے قوی ثبوت ہیں کمزور نہیں۔
	میرا یہ خیال نہیں کہ یزید کا یہ معاملہ اس زمانے کے اکابر سے پوشیدہ تھا بلکہ سب پہ روشن تھا لیکن یہ لوگ مغلوب اور بے بس تھے

بجز صبر کے انہیں کوئی قدرت نہ تھی ۔ یہ حالت اس لئے
تھی کہ اللہ نے جو طے فرما دیا ہے وہ پورا ہو جائے ۔

اس تشریح کے بعد یہ مسئلہ بالکل واضح ہو جاتا ہے کہ یزید کافر ہے، ملعون ہے اور لعنت کا مستحق ہے ۔

راقم السطور نے اوپر قرآن وحدیث کے جو حوالے پیش کئے ہیں کہ (قرآن مجید میں بھی یزید پر لعنت اور حدیث پاک میں بھی لعنت ہے) اس کے بعد اس کو ملعون کہنے میں کسی تامل کی گنجائش نہیں مفسر آلوسی بڑے ایمانی جوش میں فرماتے ہیں :

وانا اذهب الى جواز لعن مثله على التعيين و لو لم يتصور ان يكون له مثل من الفاسقين، والظاهر انه لم يتب، واحتمال توبته اضعف من ايمانه، ويلحق به ابن زياد وابن سعد وجماعته فلعنة الله عز وجل عليهم اجمعين، وعلى انصارهم و اعوانهم وشيعتهم ومن مال اليهم الى يوم الدين ما دمعت عين على ابى عبد الله الحسين ـ

میرا مسلک ہے کہ یزید جیسے لوگوں پر علی التعیین (یعنی نام لے کر) لعنت کہنا جائز ہے ۔ اگرچہ یزید جیسے کسی فاسق آدمی کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ۔ یہ بات کھلی ہوئی ہے کہ اس نے اپنی حرکتوں سے توبہ نہیں کی ہے ۔ یزید کے مومن ہونے کا احتمال جتنا کمزور (اور بے جان) ہے اس سے زیادہ اس کے توبہ کر لینے کا احتمال کمزور (اور بے جان) ہے ۔ یزید کے ساتھ لعنت میں ابن زیاد اور ابن سعد اور اس کی جماعت بھی شامل ہیں ۔ ان سب پر اللہ کی لعنت ہو، ان کے حامیوں اور مددگاروں پر بھی، ان کی پارٹی پر بھی اور جن جن لوگوں کا (ان ملعونوں کی طرف) میلان ہے ان سب پر بھی، ہاں ان سب پر اللہ کی لعنت ہو قیامت تک جب تک آنکھیں حسین پر آنسو بہاتی رہیں ۔

اس کے بعد مفسر آلوسی فرماتے ہیں کہ مجھے شاعر عصر عبدالباقی آفندی عمری موصلی کا یہ شعر بہت پسند ہے۔

یزید علی لعنی عریض جنابہ   فاغدو بہ طول المدی العن اللعنا

شعر کا مفہوم یہ ہے، لعنت کے باب میں یزید کا صحن اتنا وسیع ہے کہ جتنی لعنت بھیجو سب کو وہاں جگہ مل جائے گی لہٰذا میں عمر بھر اس پر لعنت بھیجوں گا۔

ایمان کی پکار وہی ہے جو مفسر آلوسی کہتے ہیں۔ لوگوں کی قیل وقال نہ سنئے۔ خود اپنے دل سے پوچھیئے، جس ظالم نے نبی کے لال کو ذبح کرایا ہے۔ آپ کی ایمانی فطرت اور آپ کا ایمانی ضمیر اسے کیا کہتا ہے؟ ظالم مردود اور ملعون کہتا ہے یا نہیں؟ واقعات کربلا پر غور کیجئے۔

آل رسول کو ساحل فرات پر چاروں طرف سے فوجی گھیرے میں لے لیا جاتا ہے، پھر ہر طرف سے گھیر کر پانی بند کر دیا گیا۔ ننھے ننھے معصوم رسول زادوں کو پیاسا مارا گیا۔ علی اکبر سر سے پیر تک محبوب خدا صلے اللہ علیہ وسلم کی صورت ہیں۔ ظالموں نے اس شبیہہ رسول کو بھی خاک وخون میں ملا دیا۔ چھ مہینے کے علی اصغر پر بھی ترس نہ آیا۔ اس بے زبان پیاسے اور ننھے معصوم کو بھی مار ڈالا، پنجتن کی آخری ذات تمام روئے زمین پر نبی اور علی کی آخری نشانی، اس وقت اللہ کے سب سے بڑے محبوب، ارشد مجسم، پیکر تقویٰ، نور ہدایت، عظمت حرم، روح تعلق علی کے فرزند، فاطمہ کے لخت جگر، نبی کے لال سیدنا امام حسین علی جدہ وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو تیروں کی بوچھار، بھالوں کے حملے اور تلواروں کے وار سے بے حد زخمی بنا کر فرش زمین پر گرایا۔ شمر لعین نے سینۂ اطہر پر چڑھ کر انتہائی سنگ دلی سے ذبح کر ڈالا۔ ظالموں نے حضور امام علیہ السلام پر تین دن تک پانی بند کر دیا تھا، اور حضور کو مع اہل وعیال اور اعوان وانصار کو تین روز تک پیاسا رکھ کر شہید کیا۔ امام پاک کی آنکھوں کے سامنے نبی زادوں کو، اہلبیت کے پیاروں کو، اور اہل بیت کے جاں نثاروں کو انتہائی سنگ دلی سے مار ڈالا۔

ان شیطانوں نے اتنے ہی پر بس نہیں کیا، بلکہ اللہ کے ان بے حد پیاروں کو شہید

کرنے کے بعد ان کی مقدس و مطہر لاشوں پر گھوڑے دوڑائے۔

آسماں را حق بود گر خوں ببارد بر زمیں

یہ وہ دل خراش واقعات ہیں کہ اگر تمام جنات و انسان، آسمان کے تمام فرشتے، زمین کی تمام مخلوقات، فضا کے تمام پرندے۔ پانی کی تمام مچھلیاں، بلکہ تمام کائنات قیامت تک روئے تو بھی کم ہے۔[1]

● اس دل خراش حادثہ پر غور کیجئے، اور اپنے دل سے پوچھئے کہ یزیدی حکومت نے امام حسین پر اور نبی زادوں پر ایسے ایسے مظالم ڈھا کر اسلام پر اور رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنا بڑا ظلم کیا ہے؟ کیا اب بھی یزید ملعون نہیں؟ کیا ابن زیاد کا یہ بیان نہیں ہے؟ کہ اگر میں حسین کو قتل نہ کراتا تو یزید مجھے قتل کرا دیتا، کیا ابن زیاد نے یہ نہیں کہا ہے؟ کہ میرے پاس یزید کا تحریری فرمان موجود ہے کہ حسین کو زندہ نہ چھوڑنا۔ کیا راوی نے یہ حدیث نہیں سنائی ہے کہ؟ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

● آہ آل محمد کے بچو! یہ آہ اس خلیفہ کی وجہ سے جس کو بس خلیفہ بنا دیا جائے گا وہ خبیث شیطان ہوگا اور دولت پا کر سرکش ہو جائے گا۔ میری اولاد کو اور ان کی اولاد کو قتل کرے گا۔

کیا اب بھی یزید قتل حسین کا مجرم نہیں؟ اور کیا اب بھی وہ لعین و مردود نہیں کیا اب بھی وہ خبیث و شیطان نہیں؟ اگر اس پر بھی وہ ملعون نہیں تو ملعون کسے کہتے ہیں؟

---

[1] یہ ایمانی اور فطری تاثر راقم السطور ہی کا نہیں ہے، ہر زمانہ کے بے شمار اہل ایمان، بے شمار علمائے حقانی اور بے شمار اللہ والوں کا بھی ایسا تاثر ہے، اور جب تک دل میں مظلوموں کی ہمدردی، انسانیت کا جذبہ، نبی کا عشق آل رسول کی محبت رہے گی، اس قسم کے تاثر کا چشمہ ابلتا رہے گا۔

واقعات کربلا کچھ ایسے ہی دل خراش ہیں کہ مسلم تو مسلم غیر مسلم بھی سن کر بے تاب ہو جاتے ہیں اور ان

● سورۂ احزاب کی آیت ۵۷ نے بتایا ہے (جو اوپر لکھی جا چکی ہے) کہ :

" جو لوگ اللہ اور رسول کو ایذا دیتے ہیں ان پر اللہ نے دنیا میں بھی لعنت کی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لئے عذاب مہین ہے "

یزید نے سیدنا امام حسین علیہ السلام کو حد درجہ ایذا پہونچا کر محبوب خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کتنی شدید ایذا پہونچائی ہے۔ کیا اب بھی وہ ملعون نہیں ؟

● سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی آیت ۲۲-۲۳ نے بتایا ہے (جو اوپر لکھی جا چکی ہے) کہ لوگو! تم سے بعید نہیں کہ اگر تم حاکم ہو جاؤ تو زمین پر فساد مچاؤ اور اپنے رشتہ کو توڑ ڈالو ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور ان کے کانوں کو بہرا اور آنکھوں کو اندھا کر دیا ہے۔ (کہ نہ حق سنیں نہ دیکھیں)

کیا یزید نے کربلا معلی، مدینہ منورہ، اور مکہ معظمہ میں اپنی فوج کے ذریعہ فساد نہیں مچایا؟ اور کیا سیدنا امام حسین علیہ السلام کو قتل کرا کے رشتہ نہیں کاٹا؟ کیا اب بھی یزید ملعون نہیں ؟

لوگوں کی قیل وقال نہ سنو، یہ دیکھو قرآن مجید کیا فرماتا ہے اور پھر یہ دیکھو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا فرماتے ہیں :

= کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگتے ہیں ان دل خراش واقعات پر اظہار غم انسانی احساس کی اصلی فطرت ہے۔ علمائے بریلی کے علاوہ اکابر دیوبند بھی اس پر آنسو بہا رہے ہیں چنانچہ ان سب کے مشہور عالم حکیم الامت مفتی اشرف علی صاحب ایک فتوی میں لکھتے ہیں :

فی الحقیقت واقعۂ جانکاہ جناب سید الشہداء رضی اللہ عنہ وعن احبائہ وسخط علی قاتلیہ واعدائہ اس قابل ہے کہ اگر تمام زمین وآسمان، حور وملک، جن وانس اور جمادات ونباتات قیامت تک یہ کہہ کر رو ئیں گے۔ صبت علی مصائب لو انہا صبت علی الایام صرن لیالیا تو بھی تھوڑا ہے۔ (فتاویٰ اشرفیہ ج ۴ ص ۶۰)

• کیا حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی یہ حدیث نہیں ہے کہ؟
چھ قسم کے آدمیوں پر میں نے لعنت کی ہے اور اللہ نے بھی لعنت کی ہے۔
(حدیث حاشیہ میں پڑھو)[1]

پھر ان چھ اقسام کے لوگوں کی جو علامتیں بتائی ہیں کیا وہ یزید میں بدرجۂ اولیٰ نہیں؟ کیا اب بھی وہ ملعون نہیں؟

• اس حدیث نے بتایا ہے کہ ان چھ ملعونوں میں وہ بھی ہے جو لوگوں کو دبا کر اور طاقت سے تسلط حاصل کرے، کیا یزید نے اسی طرح تسلط حاصل نہیں کیا ہے؟ کیا اب بھی یزید ملعون نہیں؟

• اس حدیث نے بتلایا ہے کہ ان چھ ملعونوں میں وہ بھی ہے جو حرم کعبہ کی بے حرمتی کرے۔ کیا یزید نے حضرت عبداللہ بن زبیر سے جنگ کے لئے مکہ معظمہ میں فوج نہیں بھیجی؟ اور کیا اس جنگ سے کعبہ کے غلاف میں آگ نہیں لگی؟ کیا اس سے کعبہ شریف کی چھت نہیں جلی؟ اور کیا اس جنگ میں عین حرم کعبہ کے اندر مسلمانوں کو ذبح نہیں کیا گیا؟ سو چو یہ حرم الٰہی کی کتنی بڑی توہین ہے۔ کیا اب بھی یزید ملعون نہیں؟

• اس حدیث نے بتایا کہ ان چھ ملعونوں میں وہ بھی ہے جو عترت رسول کے ساتھ ایسا سلوک

---

[1] ستة لعنتهم ولعنهم الله وكل نبي مجاب، الزائد في كتاب الله، والمكذب بقدر الله، والمتسلط بالجبروت ليعز من اذل الله ويذل من اعزه الله والمستحل لحرم الله، والمستحل من عترتي ما حرم الله والتارك لسنتي (مشکوٰۃ ص ۲۲) ترجمہ یہ ہے: چھ قسم کے آدمیوں پر میں نے لعنت بھیجی ہے اور اللہ نے بھی لعنت بھیجی ہے۔ وہ یہ ہیں: (۱) قرآن میں اضافہ کرنے والے (۲) منکرین تقدیر (۳) جبر و طاقت سے تسلط حاصل کرنے والا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ نے جس کو ذلت کے درجہ پر رکھا ہے اسے یہ شخص عزت سے نوازے گا۔ اور جسے اللہ نے معزز بنایا ہے اسے یہ شخص ذلیل کرے گا۔ (۴) حرم الٰہی کی توہین کرنے والا (۵) میری عترت کے ساتھ اس فعل کو روا رکھنے والا جسے اللہ نے حرام کیا ہے۔ (۶) میری سنت کا تارک ـــــ ۱۲ کوثر

کرے جسے اللہ نے حرام کر دیا ہے، کیا یزید نے امام حسین علیہ السلام اور دیگر عترت رسول کے ساتھ انتہائی ظالمانہ سلوک نہیں کیا؟ کیا اب بھی یزید ملعون نہیں؟

● اس حدیث نے بتایا کہ: ان چھ ملعونوں میں وہ بھی ہے جو سنت کا تارک ہے۔ کیا یزید نے سنت رسول کے بجائے اپنی فرعونی سیاست کو رواج نہیں دیا؟ کیا اب بھی یزید ملعون نہیں؟

● کیا رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا ہے؟

"یا اللہ جو شخص مدینہ والوں پر ظلم کرے اور ان کو دہشت زدہ کرے تو اس کو خوف (اور ظلم) کی سزا دے، اور اس پر اللہ کی اور فرشتوں کی اور تمام انسانوں کی لعنت! نہ اس کا کوئی فریضہ قبول ہوگا اور نہ کوئی نفلی عمل [1]"

● کیا یزید نے مدینہ والوں کو کچلنے کے لئے ایک جرار فوج نہیں بھیجی؟ جس نے مدینہ مقدسہ کی سخت بے حرمتی کی، ہزاروں صحابہ کو شہید کیا حتی کہ وہ اصحاب حدیبیہ جن کے متعلق قرآن نے فرما دیا ہے کہ اللہ ان سے بہت خوش ہے ان میں سے اس وقت جتنے بھی موجود تھے ان یزیدیوں کے ہاتھ سے سب کے سب شہید ہو گئے [2]۔ پھر ان یزیدی درندوں نے سیکڑوں کنواریوں کی عصمت دری کی مسجد نبوی میں گھوڑے باندھ کر ان کے بول و براز سے اس مسجد پاک کی بدترین بے حرمتی کی [3]

---

[1] متن حدیث یہ ہے: اللھم من اظلم اھل المدینۃ واخافھم فاخفہ، وعلیہ لعنۃ اللہ والملائکۃ والناس اجمعین۔ ولا یقبل منہ صرف ولا عدل (المنذری ج ۲ ص ۲۳۲ بحوالہ معجم کبیر واوسط طبرانی باسناد جید)

[2] جلیل الشان تابعی حضرت سعید بن مسیب کا بیان ہے: ثم وقعت الفتنۃ الثانیۃ فلم یبق من اصحاب الحدیبیۃ احد۔ ترجمہ: پھر جنگ حرہ کا فتنہ اٹھا۔ اور ایسا کچھ ہوا کہ اصحاب حدیبیہ میں ایک بھی باقی نہیں بچا۔ ۱۲ کوثر

[3] یزیدی فوج کی اس توہین مدینہ والی جنگ کو جنگ حرہ کہتے ہیں۔ اس کا مزید بیان آگے ایک فصل میں آئے گا جس کا عنوان ہے "مدینہ منورہ میں بنی امیہ کی مخالفت"۔ ۱۲ کوثر

ذرا حدیث بالا پڑھ کر بتاؤ، کیا اب بھی یزید ملعون نہیں؟

یہ مت دیکھو کہ کبھی یزید نے یہ نیکی کی ہے اور وہ نیکی کی ہے، حدیث بتاتی ہے کہ "جو شخص مدینہ والوں پر ظلم کرے گا اس پر اللہ کی لعنت اور فرشتوں کی بھی اور تمام انسانوں کی بھی لعنت! نہ اس کا کوئی فریضہ قبول ہوگا نہ کوئی نفلی عمل"۔

اب بتاؤ یزید لعین شقاوت و بدبختی کے کس مقام پر کھڑا ہے؟ ہاں یہ لعنت کا مقام ہے، حدیث پکارتی ہے:

اس پر اللہ کی لعنت! فرشتوں کی لعنت! تمام انسانوں کی لعنت!

نہ اس کا کوئی فریضہ قبول! نہ اس کا کوئی نفلی عمل قبول!

کتنا ملعون ہے یزید؟ اور کتنا شقی ہے یزید؟! —— علامہ تفتازانی کا یہ جملہ بے اختیار یاد آرہا ہے:

لعنۃ اللہ علیہ وعلی انصارہ واعوانہ - (شرح عقائد ص ۱۱۷)۔	یزید پر اللہ کی لعنت، اور اس کے مددگاروں اور حامیوں پر بھی اللہ کی لعنت ۔

یزید کے متعلق علامہ ذہبی کا تاریخی بیان

حافظ حدیث، مورخ اسلام علم اسماء الرجال کے محقق و مجتہد علامہ ذہبی تاریخ النبلاء میں لکھتے ہیں:

یزید بن معاویۃ کان ناصبیا فظا، غلیظا، جلفا، یتناول المسکر، ویفعل المنکر، افتتح دولتہ بقتل الشہید الحسین رضی اللہ عنہ واختتمہا بوقعۃ الحرۃ ۔	یزید بن معاویہ ناصبی تھا، اور بڑا کج خلق سنگ دل اور اجڈ تھا۔ شراب پیتا تھا اور برے افعال کرتا تھا۔ اپنی حکومت کی ابتداء حسین شہید رضی اللہ عنہ کے قتل کرانے سے کی اور انتہا جنگ حرہ پر کردی۔

ان اسباب کی بنا پر لوگ اس سے برتے

ففتنة الناس . ولم يبارك في عمره وخرج عليه غير واحد بعد الحسين رضي الله عنه كاهل المدينة ۔

ہی دشمن ہو گئے، اور حسین رضی اللہ عنہ کے بعد کئی شخص اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے ۔ مثلاً باشندگان مدینہ وغیرہ ۔

(الروض الباسم ج ۲ ص ۳۶)

علامہ ذہبی اس کے بعد مسند ابویعلی کے حوالہ سے یہ حدیث نقل کرتے ہیں :

لا يزال امر امتي قائما حتى يثلمه رجل من بني امية يقال له يزيد ۔

میری امت کا معاملہ اپنی جگہ پر برابر قائم رہے گا حتی کہ بنی امیہ کا ایک شخص جسے یزید کہا جائے گا وہ اس میں رخنہ پیدا کرے گا ۔

یزید کے متعلق امام بیہقی کا ایک تاریخی بیان کہ امام حسین کے سر مبارک کو شام میں سولی دی گئی ہے

امام بیہقی نے بسند لکھا ہے کہ جب شام میں حسین علیہ السلام کے سر کو سولی دی گئی تو حضرت خالد بن عفراء رضی اللہ عنہ جو بڑے پایہ کے تابعی ہیں غم واندوہ کی وجہ سے کہیں نامعلوم جگہ چلے گئے، ان کے تلامذہ نے ایک مہینہ کی تلاش کے بعد پایا اور چپکے چلے جانے کی وجہ پوچھی، موصوف نے فرمایا کیا تم لوگ دیکھتے نہیں کہ کتنی بڑی مصیبت آئی ہے ۔ پھر یہ اشعار پڑھے ۔

لہ الروض الباسم بڑی محققانہ اور بلند پایہ کتاب ہے، زیدی شیعہ نے اہل سنت اور کتب حدیث پر جو اعتراضات کئے ہیں اس کتاب میں ان کا بڑا ہی معقول اور مدلل جواب دیا گیا ہے ۔ اس سلسلہ میں بہت سی تفسیری، حدیثی، تاریخی، علمی، ادبی اور تاریخی جواہر پارے آگئے ہیں ۔ اس نوعیت کی اور کوئی معیاری کتاب شاید ہی ہو ۔ اس کے مصنف محدث کبیر وحافظ حدیث علامہ محمد بن ابراہیم وزیر یمنی متوفی ۸۴۰ھ ہیں جو بڑے متبحر اور دقیق النظر ہیں ۔ آپ کی ایک اور بلند پایہ کتاب تنقیح الانظار فی علوم الآثار وتوضیح الافکار ہے ۔ اس کا قلمی نسخہ حضرت الاستاذ مولانا حیدر حسن خاں محدث قدس سرہٗ کے پاس تھا ۔ اب یہ کتاب مصر میں چھپ گئی ہے ۔ ۱۲ کوثر

جاؤا براسك يا ابن بنت محمد — متزملا بدمائه تزميلا

ترجمہ: اے رسول کے نواسے لوگ آپ کا سر (کاٹ کر) لائے ہیں جس پر خون کی چادر چڑھی ہوئی ہے۔

فكان مابك يا ابن بنت محمد — قتلوا جهارا عامدين رسولا

ترجمہ: اے رسول اللہ کے نواسے گویا ان لوگوں نے آپ کو قتل کر کے رسول کو علانیہ اور قصداً قتل کیا ہے۔

قتلوك عطشانا ولم يترقبوا — في قتلك التنزيل والتاويلا

ترجمہ: ان لوگوں نے آپ کو تشنہ لب شہید کیا، اور آپ کو قتل کرنے میں قرآن اور مفہوم قرآن کا بھی پاس اور لحاظ نہیں کیا۔

ويكبرون بان قتلت وانما — قتلوا بك التكبير والتهليلا

ترجمہ: یہ لوگ آپ کو قتل کرنے کی خوشی میں تکبیر کی آواز بلند کر رہے ہیں، حالاں کہ ان لوگوں نے آپ کو شہید کر کے تکبیر اور تہلیل کو مار ڈالا۔ (الروض الباسم ج ۲ ص ۳۹)

نوٹ :۔ اس بلند پایہ تابعی کا ایمانی تاثر ملاحظہ ہو، فرماتے ہیں کہ "اے فرزند رسول ظالموں نے آپ کو جو قتل کیا ہے تو اس فعل سے اللہ اکبر اور لا الٰہ الا اللہ کے گلے پر تلوار چلا دی۔" اور آپ کو قتل کرنے میں ان کا مقصد یہ تھا کہ گویا رسول کو قتل کر رہے ہیں۔ یزید کے ظلم و ستم اور فسق و فجور کے واقعات اکابر نے بکثرت بیان فرمائے ہیں۔ صحابہ نے بھی، تابعین نے بھی اور اماموں نے بھی۔

امام کیا ہراسی امام الحرمین کے منتخب شاگردوں میں ہیں، شیخ الشافعیہ ہیں۔ امام غزالی کے معاصر اور استاد بھائی ہیں۔ بڑے پایہ کے فقیہ اور محدث ہیں۔ بعض علمی شعبہ میں امام غزالی سے آگے ہیں۔ ان کا قول ہے کہ ائمہ سلف نے یزید کی خرابیاں اور ان کا حکم کبھی کھلے الفاظ میں بیان کئے ہیں کبھی اشارۃً تاریخ ابن خلکان میں موصوف کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے:

اما قول السلف فيه فلاحمد	یزید کے بارے میں ائمہ سلف کے قول کا بیان
قولان:۔ تلويح وتصريح، ولمالك	یہ ہے کہ (امام) احمد کے اس بارے میں دو قول
قولان:۔ تلويح وتصريح ولابي	ہیں، ایک صاف الفاظ میں دوسرا اشارۃً

حنیفۃ قولان : تلویح و تصریح، ولنا قول واحد تصریح دون تلویح، کیف لا یکون کذالک وھو اللاعب بالنرد، والمتصید بالفھود ومدمن الخمر و شعرہ فی الخمر معلوم۔

(امام) مالک کے بھی دو قول ہیں صراحتہً اور اور اشارۃً (امام) ابو حنیفہ کے بھی دو قول ہیں، صراحتہً اور اشارۃً، اور ہم لوگوں کا (یعنی شافعیہ کا) صرف ایک قول ہے وہ صراحتہً ہے اشارۃً نہیں۔ اور اسے صراحتہً کیوں نہ کہا جائے؟ یہ تو نرد کھیلتا تھا۔ اور چیتوں سے شکار کھیلنے کا شغلہ رکھتا تھا، اور پکا شرابی تھا۔ شراب کے بارے میں اس کے اشعار مشہور ہیں۔

یہ کلام ایک ثبوت ہے کہ یزید کے بارے میں چاروں ائمۂ مجتہدین میں سے ایک بھی خاموش نہیں، یزید کی فرعونی اور شیطانی حرکت کی بنا پر اس کو جو کہنا چاہیے وہ ہر امام نے کہا ہے۔ شافعی مذہب نے صریح الفاظ میں کہا ہے۔ کبھی اشارہ اور کنایہ سے کام نہیں لیا ہے باقی امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد نے کبھی صریح الفاظ میں کہا ہے، کبھی اشارہ اور کنایہ میں، یہ اشارہ اور کنایہ بتا رہا ہے کہ ایسی سخت باتیں کہی ہیں جو ہمیشہ اور سب کے سامنے نہیں کہی جا سکتیں، گذر چکا ہے کہ امام احمد نے فرمایا ہے کہ "ہم یزید پر لعنت کیوں نہ کریں جب کہ اس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں لعنت کی ہے"۔ مگر یہ اپنے صاحبزادوں سے فرمایا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یزید پر ایسا سخت لفظ بڑے خاص لوگوں کے سامنے کہا جاتا تھا۔ باقی اور موقع پر ایسا لفظ کہنا ہوتا تو اشارہ وکنایہ سے کام لیا جاتا تھا۔ چونکہ امام شافعی نے کھلے الفاظ میں کہا ہے اور کبھی اشارہ وکنایہ سے کام نہیں لیا، اسی لئے انھیں رافضی کہدیا گیا تھا، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اور اماموں نے اشارہ کنایہ میں کیوں کہا ہے، امام شافعی کو اسلئے بھی رافضی کہا گیا ہے کہ وہ اہل بیت کی محبت کا بہت اظہار فرماتے تھے۔ آخر بد باطنوں کے رافضی کہنے پر امام موصوف کو کہنا پڑا :

ان کان رفضا حب آل محمدٍ فلیشھد الثقلان انی رافض

ترجمہ: اگر آلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی محبت رافضیت ہے تو جن وانس گواہ رہیں کہ میں رافضی ہوں۔

یہ کون کہہ رہا ہے؟ حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ۔

یعنی اس زمانے میں بھی ایسے بدباطن لوگ تھے کہ امام شافعی جیسے امام اہلسنّت کو بھی رافضی کہہ دیا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ محبِ اہلبیت ہیں۔ جب خارجیت نوازوں اور ناصبیت کے نقیبوں نے امام شافعی کو محض اس بنا پر رافضی تک کہہ دیا کہ محبِ اہل بیت کون ہے؟ اور یزید کو اتنا برا کیوں کہتا ہے تو پھر اوروں پر نہ جانے کتنا کرم ہوگا۔

یزید اتنا مبغوض کیوں ہے؟

دنیا میں کروڑوں، اربوں فاسق وفاجر اور ملحد وکافر ہیں لیکن کسی کو نام بنام کوئی بھی ملعون کہتا ہے؟ مگر کیا بات ہے کہ یزید برابر ملعون کہا جارہا ہے۔ پہلی صدی سے آج تک اس کا سلسلہ جاری ہے اور اس پر اتنی لعنتیں بھیجی گئی ہیں کہ شاید ہی کوئی نظیر ہو، اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اس نے جو کیا ہے وہ کسی نے نہیں کیا۔ نبی کے لال سیدنا امام حسین علیہ السلام اور اہل بیت کے نونہالوں کو کس بے دردی اور سنگ دلی سے قتل کرایا ہے۔ پھر اس کی حکومت نے ان شہیدوں کے سروں کو نیزوں پر چڑھا کر اور نبی زادیوں کو بیڑیوں میں جکڑ کر اور اونٹوں پر بٹھا کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک شہر شہر گھمایا۔

اولادِ رسول پر اس انتہائی ظلم وستم کا نتیجہ یہ ہوا کہ

یزید اور اس کی حکومت سے مسلمانوں کو بے حد نفرت ہوگئی۔ قرآن مجید کے دانائے راز بزرگوں نے آیات قرآنی پڑھ کر بتایا کہ ان آیتوں کی رو سے یزید ملعون ہے۔ (اس قسم کی کچھ اوپر لکھی جاچکی ہیں)۔

راویانِ حدیث نے حدیثیں پڑھ کر سنائیں کہ یزید کتنا برا ہے؟ اسے حدیثوں کی روشنی میں دیکھ تو اس سلسلے امین الامۃ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ عنہ کے تلامذہ کو روایت نے یہ حدیث سنائی کہ رسول اللہ

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا :

لا یزال امر امتی قائما بالقسط حتیٰ یثلمہ رجل من بنی امیۃ یقال لہ یزید ۔ (بزار و ابویعلی جمع الفوائد صـ۳۶۴)	میری امت کا معاملہ برابر اپنی جگہ پر قائم رہیگا حتیٰ کہ بنی امیہ کا ایک شخص ہوگا جسے یزید کہا جائے گا، وہ اس میں رخنہ پیدا کرے گا ۔

یہ حدیث حافظ ذہبی کی النبلاء میں، امام سیوطی کی تاریخ الخلفاء میں، اور علامہ ابن حجر کی الصواعق المحرقہ میں بھی ہے ۔

مشہور زاہد صحابی حضرت ابو درداء رضی اللہ عنہ کے تلامذہ روایت نے یہ حدیث سنائی :

اول من یبدل سنتی رجل من بنی امیۃ یقال لہ یزید (مسند رویانی)	پہلا وہ شخص جو میری سنت اور طور وطریق کو بدل ڈالے گا وہ بنی امیہ کا ایک آدمی ہوگا جسے یزید کہا جائے گا ۔

امام سیوطی نے تاریخ الخلفاء صفحہ ۱۴۶ میں اس سے پہلے کی حدیث پر تو یہ تبصرہ کیا ہے کہ اس کی سند ضعیف ہے، مگر اس حدیث پر تبصرہ نہیں کیا ہے، چونکہ یہ حدیث پہلی حدیث کی تائید کرتی ہے ۔ لہٰذا دونوں قابل اعتماد ہیں ۔

سید العلماء حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے تلامذہ روایت نے یہ حدیث سنائی ہے[1]

اوہ لفراخ آل محمد من خلیفۃ یستخلف عتریف مترف یقتل خلفی وخلف الخلف ۔	آہ آل محمد کے بچو! یہ آہ اس خلیفہ کی وجہ سے ہے جو (یوں ہی) خلیفہ بنایا جائے گا ۔ وہ خبیث شیطان ہوگا ۔ اور دولت پاکر سرکش ہو جائے گا میری اولاد کو اور اولاد کی اولاد کو قتل کرے گا ۔

حافظ ابن اثیر نے نہایہ میں اور محدث طاہر پٹنی نے مجمع بحار الانوار میں اس حدیث کو نقل کرنے کے بعد لفظ

---

[1] یہ حدیث حضرت سلمہ بن اکوع سے بھی مروی ہے ۔ بروایت حافظ ابن عساکر (کنز العمال ج ۶ ص ۲۰۰ تقطیع کلاں) کوثر

عتریف کی ایک تشریح یہ کی ہے ۔ یہ لفظ عفریت کا مقلوب ہے اور معنی ہیں خبیث شیطان ۔ اس معنی کو علامہ زمخشری نے بھی الفائق ج ۲ صفحہ ۵۶ میں درج کیا ہے ۔ اور لکھا ہے کہ اس حدیث کا یہ مطلب بیان کیا گیا ہے کہ یزید نے امام حسین کے ساتھ جو کیا ہے نیز حرہ کی جنگ میں مہاجرین و انصار کی اولاد کے ساتھ جو کیا ہے اس حدیث میں اس کا ذکر ہے ۔

حافظ ابن اثیر اور محدث طاہر پٹنی نے تصریح کی ہے ۔ یہ مطلب امام خطابی نے بیان کیا ہے ۔

لمحات فکریہ

اس حدیث نے یزید کو عتریف کہا ہے جس کا ایک مفہوم ہے بڑا ظالم ، اور دوسرا مفہوم ہے خبیث ، شیطان اور دونوں صحیح ہیں ۔ لہٰذا اس حدیث نے یزید کو بڑا ظالم بھی کہا ہے اور خبیث شیطان بھی ۔

غور کرو ! واقعہ کربلا یزید کے ظلم و عدوان اور اس کی خبیث شیطنت کا کتنا بڑا ثبوت ہے ؟ اس واقعہ میں یزید کا وہ انتہائی ظلم و شیطنت ہے جس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں نہیں ۔

قیام حق اور احیائے ملت کیلئے امام حسین کی بے نظیر عزیمت و قربانی کے حیات آفریں اثرات ، اور آپ کی محبوبیت

کربلا کے دل دوز اور دل خراش حادثہ نے دنیا ہلا دی مسلمانوں کے دلوں پر ایسی چوٹ لگی جس کی کوئی مثال ہی نہیں ، آنکھوں سے اتنے آنسو بہے کہ جتنے پہلے کبھی بہے نہ تھے ، ہر آہ کی دل خراشی نے اور ہر آنسو کے ایک ایک قطرہ نے یزید سے اتنی نفرت بڑھا دی جتنی ہونی چاہیئے ۔

اس کے ساتھ امام مظلوم علیہ السلام کی طرف دلوں کی کشش روز بروز بڑھتی ہی گئی کہ

یہ ہیں مسلمانوں کے امام !

یہ ہیں قیوم حق !

چنانچہ قیام حق کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا ۔

دینی فراست نے پہلے ہی روز دیکھ لیا تھا کہ یزید جیسا فاسق و فاجر ظالم و طاغی آئین اسلام کے بجائے جاہلی طور و طریق کا دلدادہ اگر خلیفہ ہو جائے گا تو نتیجہ کیا ہوگا ؟

- نظام اسلامی کے بجائے نظام ملوکیت کی جڑیں بے حد مضبوط ہو جائیں گی۔
- اسلامی احکام کے بجائے ملوکیت کے احکام پر تمام عالم اسلامی کو اس طرح مجبور کیا جائے گا کہ جو بھی چون و چرا کرے گا اسے موت کی سزا دی جائے گی۔
- احکام عبادت میں بھی طاغوت کی شہنشاہی کی جگہ نکالی جائے گی۔ جمعہ کے خطبہ میں اہل بیت پر لعن طعن تو کیا ہی جاتا ہے، خلیفۂ وقت کی مدح سرائی اور اس کے لئے فداکاری پر اتنا زور بھی دیا جائے گا کہ جو بھی اس کے فاسقانہ اور ظالمانہ احکام کے خلاف لب کشائی کرے گا اسے شریعت کا باغی قرار دیکر قتل بھی کیا جائے گا اور قتل کی وجہ جواز نکالنے کی چال بھی چلی جائیگی۔
- ارباب حکومت میں فسق و فجور عام ہوگا، حکومت کے اسٹاف میں انھیں لوگوں کو جگہ ملے گی جو نہایت فاسق و فاجر اور ظالم ہوں گے، کہ خلافت ضالہ کا مقصد انھیں سے پورا ہو سکتا ہے۔
- رعایا کے ایمانی ضمیر کو کچلا جائے گا۔
- کلمۂ حق بلند کرنے والوں کی گردنیں تلوار کی دھار پر ہوں گی۔
- نماز کا امام اعظم وہی خلیفۂ فاجر ہوگا جس کی وجہ سے نماز سے بے پروائی عام ہوگی، امام کی طرح رعایا کے قلوب بھی خشوع و خضوع سے محروم ہو جائیں گے۔ اللہ کی عبادت میں نہ ذوق رہے گا نہ حضوری، اس طرح نماز کی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ اور عبادت کے بے ذوق ہو جانے کی وجہ سے اس میں وہ کشش ہی نہ رہے گی جس کی بنا پر اسے دنیا پر ترجیح دی جا سکے لہٰذا دنیا کی طرف کشش بڑھتی ہی جائے گی اور خواہشات نفس کو پورا کرنے میں زیادہ سے زیادہ انہماک رہا کرے گا۔ زندگی جب اس منزل پر آجائے گی تو صلاح و تقوی کے بجائے فسق و فجور کی طرف قدم اٹھیں گے۔
- زکوٰۃ جسے حکومت وصول کرتی ہے وہ اس لئے بھی وصول کی جائے گی کہ حکومت کی

دولت و ثروت میں اضافہ کیا جائے اور یہ رقم بھی خلیفہ فاجر کی خواہشات نفس پوری کرنے کی مد میں کام آسکے۔

- اسلامی بیت المال جسے ناجائز طور پر خرچ کرنا بدترین جرم ہے، خلیفہ فاجر اسے اپنی ملکیت بنائے گا۔ عیش و عشرت، شراب و سرود، فسق و فجور اور بہت سے حرام کاموں میں اسے صرف کیا جائے گا اور اس کے ذریعہ بہت سے لوگوں کا ایمان خریدا جائے گا۔
- دولت کے اس ذخیرہ سے فاجر اور ظالم فوجوں کو خوب نوازا جائے گا۔
- پھر اس کی طاقت کے بل بوتے پر بے محابا ظلم کیا جائے گا۔

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ حق کو چھوڑ کر باطل کو اختیار کیا جائے گا۔ امام مظلوم علیہ السلام نے کربلا میں اپنے جاں نثاروں کے سامنے جو خطبہ دیا ہے اس میں اسے بیان فرمایا ہے۔ اس خطبہ کا ایک جملہ یہ ہے:

ترون ان الحق لا یعمل بہ	دیکھتے ہی ہو کہ حق پر عمل نہیں کیا جاتا اور باطل
والباطل لا یتناھی عنہ۔	کو چھوڑا ہی نہیں جاتا۔

- کربلا کے راستہ میں ایک مقام بیضہ ہے وہاں آپ نے اپنے اور حر کے ساتھیوں کے سامنے ایک بہت اہم خطبہ دیا ہے اس کا ترجمہ یہ ہے:

"حمد[1] و صلوٰۃ کے بعد: لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جس نے

---

[1] اس خطبہ کی عربی عبارت یہ ہے۔ فحمد اللہ واثنیٰ علیہ۔ ثم قال: ایھا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال: من رایٔ سلطانا جائرا مستحلا لحرم اللہ، ناکثا لعھد اللہ، مخالفا لسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان فلم یغیر علیہ بفعل او قول کان حقا علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ الا! وان ھؤلاء قد لزموا طاعۃ الشیطان وترکوا طاعۃ الرحمٰن، واظھروا الفساد وعطلوا الحدود واستاثروا بالفیٔ، واحلوا حرام اللہ، وحرموا حلالہ "

ایسے بادشاہ کو دیکھا جو ظالم ہے۔ خدا کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال ٹھہرا لیا ہے
خدا کے عہد کو توڑتا ہے، سنت رسول کا مخالف ہے، خدا کے بندوں پر گناہ اور
عدوان کے ساتھ حکومت کرتا ہے، لیکن دیکھنے والے کو اس پر عملاً و قولاً
غیرت نہ آئی تو اللہ کو یہ حق ہے کہ بادشاہ کے ساتھ اس کو بھی جہنم میں ڈال دے"

"میں تم لوگوں کو آگاہ کرتا ہوں کہ ان لوگوں نے (بنی امیہ) شیطان کی
اطاعت قبول کرلی ہے، اور رحمٰن کی اطاعت چھوڑ دی ہے، خدا کی زمین
پر فتنہ و فساد پھیلا رکھا ہے، حدود الٰہی پر عمل کرنا چھوڑ دیا ہے۔ مال غنیمت
میں اپنوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال
کی ہوئی چیزوں کو حرام کر دیا ہے۔" (طبری، ص ۳۰۰)

● حالات یہ ہیں کہ وقت کا طاغوت، شیطان کا ہم نوا ہے، نظام باطل قائم ہو چکا ہے، عدوان اور جبر و تشدد کی پوری مشینری کلمۂ حق بولنے والے کے لئے محض ایک اشارہ کی منتظر ہے۔ سب کو احساس ہے کہ جو بھی کلمۂ حق بولے گا یا نظام حق کے لئے کھڑا ہوگا۔ اس کی جان و مال اور اہل و عیال سب کو کچل دیا جائے گا۔

لیسے عالم میں جو مرد حق نظام دین و حق کی حیات و بقا کے لئے طاغوت کے سامنے کھڑا ہو جائے اور اپنی جان و مال کو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو، اپنے عزیزوں کو اللہ کی راہ میں قربان کرنے کے لئے میدان میں آجائے وہی ہے اپنے زمانہ کا مجاہد اعظم، اور وہی ہے سب سے آگے اس راستے پر چلنے والا جس کے تصور ہی سے سینوں میں دل بیٹھے جاتے ہیں اور موت سامنے کھڑی نظر آتی ہے، لیکن یہی ہے نیام حق کا واحد راستہ، جس پر چلنے والا قیوم حق ہے۔ محبوب رب ہے، یکتائے روزگار ہے، اور یہی ہے اپنے وقت کا امام!

ادا کرے جو لہو سے زکوٰۃ سجدہ کی
وہ سرفروش مجاہد امام ہوتا ہے

یہ فرزند رسول ہی کا قلب و جگر ہے کہ وقت کے طاغوت کے مقابلہ میں، اور اس کے خلاف سر بکف ہو کر نظام دین قائم کرنے کے لئے عین اس وقت کھڑے ہو گئے جب کہ پوری دنیائے اسلام میں آپ کے سوا ایک متنفس بھی اس کی جرأت نہ کر سکا۔ یہ عزیمت کبریٰ اور یہ درجۂ امامت آپ ہی کا حصہ تھا اور آپ نے یہ فریضہ سب کچھ قربان کر کے ادا فرمایا ہے، اب آپ کے بعد جن جن ارباب عزیمت نے اس راہ میں قدم اٹھایا ہے، سب آپ ہی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں، آپ ہیں امام، اور یہ سب ہیں آپ کے پیچھے چلنے والے مقتدی، اور آپ کے نقوش قدم سے ہدایت حاصل کرنے والے راہ رو۔

اگر امام حسین علیہ السلام اس عزیمت کے ساتھ میدان میں نہ آتے تو یزید خلافت رسول کا مسند نشین ہی مانا جاتا، اس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اگلے خلفاء کے احکام کی طرح اس کے احکام کو بھی دینی حیثیت دیدی جاتی اور اس کے فاسقانہ اور فرعونی احکام خلیفۂ رسول کے احکام مانے جاتے، اس طرح دینی نظام یکسر درہم برہم ہو جاتا۔ اس کے بعد ہر خلیفہ کے احکام کو بھی یہی درجہ دیا جاتا پھر نتیجہ کیا ہوتا؟ الامان والحفیظ! یا تو قرآن و حدیث کے احکام کی حکمرانی اور نظام دینی کو یکسر دنیا بھول جاتی یا ان کو طرح طرح کی تاویلات سے یکسر مسخ کر دیا جاتا۔ یہ خطرہ اسلام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔!

امام حسین علیہ السلام کی عدیم المثال بصیرت نے جو نبی کے خون سے پیدا ہوئی ہے، پہلے ہی روز اس خطرہ کو پوری روشنی میں دیکھ لیا تھا۔ اور اسلام کو اس سے بچانے کے لئے جس اعلیٰ ترین عزم و عزیمت کی ضرورت تھی اسی عزم و عزیمت کو لے کر آپ کھڑے ہوئے، جن جن مصائب کو جھیلنا لازمی اور ناگزیر تھا سب کو پوری اولوالعزمی سے جھیلا اور جن جن اعلیٰ قربانیوں کے پیش کرنے کی ضرورت تھی سب کو پیش کیا۔ اور اس طرح کہ تمام دنیا نے دیکھ لیا کہ یہ ہیں سیدنا رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرزند جن کے عزم و عزیمت اور قربانیوں نے دین کو خطرہ سے بچا لیا، اور سب کو نظر آنے لگا کہ یزید خلیفۂ رسول نہیں، ظالم ہے، ملعون ہے۔ خبیث شیطان ہے اور اس کے احکام

فرعونی احکام ہیں، خلیفۂ رسول کے احکام قطعاً نہیں۔ اس طرح احکام اسلامی کے دفعات میں حکومت کے فرعونی احکام کے آجانے کا خطرہ یکسر مٹ گیا۔ اور دین اور نظام دین کو ابدی زندگی مل گئی۔

حیاتِ ملّتِ قرآں عزیمتِ شبیر
اسی سے قائم و زندہ نظام اسلامی

امام مظلوم کی شہادت کے بعد آپ کی مزید محبوبیت اور مسلمانوں کے تاثرات

یہ وہ حقائق ہیں جن کی بنا پر آپ مسلمانوں کے دلوں میں اترے ہوئے ہیں۔ آپ کی شہادت ہوتے ہی مسلمانوں کے دلوں میں آپ سے بے حد گرویدگی پیدا ہوگئی اور اسی وقت سے دماغوں میں یہ تصورات بار بار ابھرنے لگے کہ:۔

حسین فرزند رسول ہونے کے ساتھ

۱۔ بے حد مظلوم ہیں۔

۲۔ کتنی دردناک اور دلخراش ہے آپ کی شہادت ؟!

۳۔ کتنی بلند ہے آپ کی اولوالعزمی ؟!

۴۔ سر دے دیا جھکے نہ حکومت کے سامنے!

۵۔ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ سلطان جور کے مقابلہ میں کلمۂ حق اٹھایا جائے۔

۶۔ امام حسین ہی نے اس زمانہ میں ایسا کیا۔

۷۔ امام حسین ہی ہیں اس زمانہ کے مجاہد اعظم !!

۸۔ ان کی سرفروشی اور عظیم ترین قربانی نے امت کو وہ روشنی عطا فرمائی کہ ہر شخص کو نظر آنے لگا کہ۔

۹۔ خلیفۂ وقت خلیفۂ رسول قطعاً نہیں، ظالم ہے، فاسق ہے، فرعون وقت ہے۔

۱۰۔ اس کے احکام خلیفۂ رسول کے احکام قطعاً نہیں، ظلم و فسق و فجور کے احکام ہیں۔ فرعونِ وقت کے فرامین ہیں۔

۱۱۔ تمام دنیا کو یہ روشنی سب سے پہلے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے نورِ نظر سیدنا امام حسین علیہ السلام ہی نے عطا فرمائی ہے۔

۱۲۔ پھر کیوں نہ آپ کو زیادہ سے زیادہ مانا جائے؟ کیوں نہ اپنی جان سے بڑھ کر آپ کی محبت کی جائے؟

۱۳۔ کیوں نہ آپ کی زیادہ سے زیادہ توقیر و تعظیم کی جائے؟

۱۴۔ یہ ہیں ثقلین کے وہ فردِ جلیل کہ جو ان سے وابستہ رہے گا، گمراہ ہو ہی نہیں سکتا۔

۱۵۔ ان کے بارے میں رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم امت کو کیا وصیت فرما گئے ہیں؟

۱۶۔ ان کے حقوق کا لحاظ رکھنے میں اللہ سے ڈرنے کی امت کو کیسی تاکید پر تاکید فرمائی ہے اور امت نے ان کے ساتھ کیا کیا؟ اور اب ہمیں کیا کرنا چاہیے؟

۱۷۔ اب ہمیں یہی کرنا ہوگا کہ ان کی حیات طیبہ سے روشنی حاصل کرتے رہیں۔ ان کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے رہیں۔

۱۸۔ ان کی محبت اور ان کی ذریات طیبہ کی محبت سے لبریز رہیں۔

۱۹۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان پر ظلم کرنے والوں کو ملعون فرمایا ہے۔ ان ظالموں سے بے حد نفرت کرنا ہمارے ایمان کا بہت ہی اہم تقاضا ہے۔

یہ ہیں وہ انقلاب آفریں تصورات جو کربلا کے حادثۂ عظمیٰ کے بعد قدرتاً مسلمانوں کے دلوں اور دماغوں میں شب و روز اٹھتے اور ابھرتے تھے۔

انقلاب عظیم

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی طاغوتی اور فرعونی حکومت کے خلاف مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور عراق میں نفرت کی آگ بھڑک اٹھی اور بڑا ہی شدید انقلاب برپا ہوا۔

مکہ معظمہ میں بنی امیہ کی مخالفت

مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ ابن زبیر رضی اللہ عنہ یزید کے سخت مخالف تھے، اب مخالفت نے اور شدت اختیار کر لی۔ انھوں نے طاقت بڑھانی شروع کر دی اور کھلے الفاظ میں دنیا کو بتانا شروع کیا

کہ یزید نہ خلیفہ ہے نہ خلافت کے لائق ہے ۔

اہل حجاز و تہامہ کو اپنی بیعت کی دعوت دی حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت محمد بن حنفیہ کے علاوہ ——— تمام ذی اثر لوگوں نے ان کی بیعت کرلی ۔ اور مدینہ والوں نے تمام اموی عمال کو مدینہ سے نکال دیا[1]۔

یزید کی فرعونیت پھر طیش میں آئی ۔ اور ابن زبیر کے استیصال میں لگ گئی ۔

مدینہ منورہ میں بنی امیہ کی مخالفت

ابھی ابن زبیر کا معاملہ سامنے ہی تھا کہ اطلاع ملی کہ اہل مدینہ نے بیعت توڑ دی ،

ان میں مدینہ کے وہ صحابہ کرام اور تابعین عظام تھے جن پر تاریخ اسلام کو ناز ہے ۔ ان کے قائد حضرت حنظلہ غسیل الملائکہ کے نیک دل فرزند حضرت عبداللہ تھے ، جو صحابی بھی ہیں اور انصار کے زعیم بھی ، اہل مدینہ نے ان کے دست مبارک پر بیعت کی کہ ہم لوگوں نے یزید کی بیعت توڑ دی ۔ پھر ان بزرگوں نے یزید کے خلاف جہاد فرمایا ، جس کی وجہ خود حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہما نے ان الفاظ میں بیان فرمائی ہے :

واللہ ماخرجنا علی یزید حتی خفنا ان نرمی بالحجارۃ من السماء ، انہ[2] رجل ینکح امہات الاولاد والبنات والاخوات ویشرب الخمر ، ویدع الصلوٰۃ
(تاریخ الخلفاء ، ص ۱۴۶)

خدا کی قسم ہم لوگوں نے یزید کے خلاف اسی وقت خروج کیا ہے جب ہمیں یہ خوف پیدا ہو گیا کہ اگر ایسا نہیں کرتے تو ہم لوگوں پر آسمان سے پتھر برسیں گے ۔ یزید وہ شخص ہے کہ (اپنے باپ کی) ام ولد ، لونڈیوں سے نیز اپنی بیٹیوں اور بہنوں سے منھ کالا کرتا ہے شراب پیتا ہے اور نماز چھوڑ دیا کرتا ہے ۔

---

[1] اخبار الطوال ص ۲۶۴ ، [2] یہ عبارت پیش نظر نسخہ میں اس طرح چھپی ہے : ان رجلا ینکح امہات الاولاد غالباً یہ پریس کی غلطی ہے ۔ صحیح عبارت وہ ہے جو راقم نے لکھی ہے ۔ ۱۲ کوثر

یزید نے ان بزرگوں کے خلاف بھی پوری فرعونیت برتی اور ان کو قتل و غارت کرنے کے لئے مسلم بن عقبہ مری کی قیادت میں دس ہزار فوج مدینہ بھیجی، اور آرڈر دیا کہ تین روز تک مدینہ میں قتل عام کرنا اور مدینہ کو لوٹنا، اس سے فارغ ہو کر مکہ میں ابن زبیر کی سرکوبی کے لئے جانا اور قتل و غارت کا کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھنا۔

یہ ظالم فوج مدینہ میں بلائے عظیم بن کر آئی۔ مدینہ منورہ میں ایک جگہ کالے پتھر بکثرت ہیں، عربی میں ان کو حرہ کہتے ہیں، اہل مدینہ اور یزیدی فوج میں یہیں مقابلہ ہوا، اس لئے اس جنگ کو جنگ حرہ کہا جاتا ہے، اہل مدینہ نے تین روز تک بڑی بے جگری سے مقابلہ کیا مگر حکومت کی فوج بڑے ساز و اسلحہ سے تھی، اور بڑا سخت حملہ کیا جس میں مدینہ کے بہت سے صحابہ شہید ہوئے بڑے بڑے مہاجرین و انصار کام آئے۔ صلح حدیبیہ میں جو صحابہ کرام موجود تھے ان میں سے ایک بھی باقی نہ بچے۔ (مشکوٰۃ ص ۴۶۵)۔

بالآخر شامیوں نے مدینہ والوں کو شکست دی اور اس کے بعد تین روز تک یزیدی فوج مدینہ کو لوٹتی رہی اور تین روز تک مسجد نبوی میں نماز نہ ہو سکی۔ شامیوں نے مسجد الرسول میں منبر پاک کے پاس اور جنت کی کیاری میں گھوڑے باندھے اور ان کے بول و براز سے مسجد نبوی کی سخت بے حرمتی کی گئی۔ یزیدی فوج کے درندوں نے وہ وہ مظالم کئے کہ کافر فرنگ بھی نہ کرتا؛ گھروں میں گھس گھس کر زنا بالجبر کیا اور کئی سو کنواری لڑکیوں کی عصمت دری کی۔

یزید نے جب اپنی بہنوں اور لڑکیوں تک کو نہیں چھوڑا تو اس کی فوج سے اور کیا امید ہو سکتی ہے۔ چونکہ نبی کی بیٹیوں اور بہوؤں کا اللہ خود محافظ ہے اس لئے اللہ نے قدرتی انتظام فرما دیا کہ خود یزید نے فوج کو ہدایت کر دی تھی کہ حسین کے فرزند زین العابدین اور دیگر اہلبیت حسن و حسین سے کوئی تعرض نہ کرنا۔ اور یہ ہدایت اس بنا پر تھی کہ قتل امام حسین کی وجہ سے تمام پبلک یزید کی مخالف ہو گئی تھی۔ لہٰذا وہ چاہتا تھا کہ آل رسول کے ساتھ اب کوئی سختی نہ کی جائے ورنہ نتیجہ بہت ہی خطرناک ہوگا۔

مدینۃ الرسول کو لوٹنا اور تین روز تک قتل و غارت گری کا سلسلہ جاری رکھنا واقعہ کربلا کے بعد

یزید کا سب سے سیاہ کارنامہ ہے۔ معجم طبرانی میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا:

اَللّٰھُمَّ من ظلم اھل المدینۃ واخافھُمْ فاخفہ، وعلیہ لعنۃ اللہ وَالملائکۃ والناس اجمعین لایقبل منہ صرف ولا عدل۔	یا اللہ جو شخص اہل مدینہ پر ظلم کرے یا ان کو خوف زدہ کرے تو اس پر خوف نازل فرما، اور ایسے شخص پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی بھی اور تمام انسانوں کی بھی۔ اللہ تعالیٰ نہ اس کی کوئی فرض عبادت قبول کرے گا اور نہ کوئی نفل عبادت۔
(منذری ج ۲ ص ۲۳۲)	

علامہ آلوسی نے تفسیر روح المعانی ج ۲۶ ص ۷۵ میں لکھا ہے کہ اس حدیث کی بنا پر بھی یزید ملعون ہے۔

تین روز تک مدینہ میں اس ظلم و تشدد اور بہیمیت کے بعد یزیدی سپہ سالار نے اعلان کیا کہ جو شخص بیعت نہ کرے گا وہ قتل کر دیا جائے گا۔ اور بیعت اس طرح کرنی ہوگی کہ "ہم یزید کے غلام ہیں، چاہے بیچ ڈالے، چاہے آزاد کرے"

اس پر ایک مردِ مومن نے کہا۔ "ہم اس شرط پر بیعت کرتے ہیں کہ قرآن اور سنت رسول کے مطابق حکم چلایا جائے گا"

اس کے سنتے ہی فوراً اس مردِ مومن کی گردن اڑا دی گئی۔[۱]

یہ ہے یزیدی حکومت، اس کی فرعونیت، اور قرآن و سنت سے اس کی بیگانگی!

مکہ معظمہ میں یزیدی فوج کی روانگی

مدینہ منورہ کو تاراج کرنے کے بعد یزید کی یہ فوج ابن زبیر کے مقابلہ کے لئے مکہ معظمہ روانہ ہوگئی۔ فوج کا سپہ سالار مسلم بن عقبہ راستہ ہی میں مر گیا۔ مرنے سے پہلے حصین بن نمیر کو اپنا قائم مقام بنا گیا۔

---

[۱] اس کو حافظ ابن حزم نے سیرۃ نبویہ کے آخر میں ذکر کیا ہے۔ اور حافظ ابن حزم کے بارے میں حافظ ذہبی نے لکھا ہے کہ ان پر بنی امیہ کی جانب داری کا دھبہ لگا ہے۔ (الروض الباسم ج ۲ ص ۳۶ - ۳۷) جب ایسے شخص نے اسے لکھا ہے تو حقیقت کتنی اہم ہے؟! ——— کوثر۔

تھا۔ ابن نمیر نے مکہ پہونچ کر حرم کا (جہاں ابن زبیر پناہ گزیں تھے) محاصرہ کرلیا اور منجنیق سے سنگ باری اور آتش باری شروع کردی۔ بیت اللہ پر بھی سنگ باری اور آتش باری ہوئی۔ کعبہ شریف کی عمارت کو نقصان پہونچا۔ غلاف کعبہ جل گیا۔ اور کعبہ شریف کی چھت بھی جل گئی۔ ابھی محاصرہ جاری ہی تھا کہ یزید مرکر جہنم رسید ہؤا۔ ابن نمیر نے یہ خبر سُن کر محاصرہ اٹھا لیا اور ابن زبیر سے صلح کرلی۔

سطور بالا میں اس کا بیان ہے کہ واقعات کربلا کے بعد یزید سے مسلمانوں کو سخت نفرت اور بیزاری پیدا ہوگئی تھی۔ اس سلسلہ میں مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں یزید کے خلاف جو انقلاب اٹھا اس کا یہ بہت مختصر بیان ہے۔

توابین کا قیام

لیکن عراق میں قیام توابین کے نام سے بڑا زبردست انقلاب اٹھا، کربلا کا قیامت خیز حادثہ ۶۱ھ میں ہوا، اس کے بعد کوفہ والوں کو احساس ہوا کہ ہم لوگوں نے بڑا ظلم اور بڑی غداری کی۔ خطوط لکھ لکھ کر فرزند رسول کو بلایا لیکن جب تشریف لائے تو کچھ بھی مدد نہیں کی۔ اور گھروں میں بیٹھ کر جان کی خیر منائی۔ اب اس کا کفارہ یہی ہے کہ امام مظلوم کے قاتلین سے بدلہ لیں یا اس راہ میں قربان ہوجائیں۔ ۶۱ھ میں اس تحریک نے پوشیدہ طور پر اسلحہ کی فراہمی اور خفیہ دعوت شروع کی۔ ۶۴ھ میں جب کہ ابن زبیر کی حکومت حجاز اور عراق میں تھی اور مروان کی سلطنت شام میں، اہل کوفہ نے اموی حاکم کو اپنے یہاں سے نکال کر ابن زبیر کی خلافت تسلیم کرلی تھی۔ اس وقت توابین کی جماعت میدان کارزار میں آئی۔ اس کے قائد اور روح رواں ایک جلیل القدر صحابی حضرت سلیمان بن صرد تھے۔ جو نہایت زاہد و عابد اور مقتدائے متقین تھے۔ آپ نے توابین کی فوج باقاعدہ مرتب فرمائی اور اپنے چار نائبین مقرر فرمائے۔ حبیب بن نجبہ فزاری، عبداللہ بن سعد ابن نفیل ازدی، عبداللہ بن وال تیمی، رفاعہ بن شداد بجلی۔ یہ حالات تھے کہ عبیداللہ بن زیاد شام سے فوج لے کر کوفہ پر قبضہ کے ارادہ سے روانہ ہوا۔ فوج کا ایک دستہ پہلے روانہ کرچکا تھا عین الوردہ ایک مقام ہے وہاں یہ دستہ پہنچا، تو توابین سے مقابلہ ہؤا۔ توابین چار ہزار تھے پہلے فتح یاب ہوئے لیکن شامی کمک یکے بعد دیگرے آتی گئی، ان کی مجموعی تعداد تقریبًا ۳۰ ہزار ہوگئی

توابین تیس ہزار کے مقابلہ میں بہت کم ہونے کے باوجود خوب جم کر لڑے، کہ اس راہ میں جان دینا سعادت عظمیٰ تھی، حضرت سلیمان بن صرد رضی اللہ عنہ شہید ہوئے۔ اس وقت ان کی عمر شریف ترانوے سال کی تھی۔ آپ کے اور رفقا بھی شہید ہوئے، اس پر عرب کے شاعر اعشیٰ ہمدانی نے نہایت پرزور مرثیہ لکھا ہے، جو بڑا ہی موثر اور انقلاب آفریں ہے۔ اسی لئے اس زمانہ میں اس کا چرچہ ممنوع تھا۔ اعشیٰ ان بزرگوں کی شہادت کا تذکرہ کرنے کے بعد کہتا ہے کہ ان حضرات نے مقتول ہونے سے بھی پہلے ایک ایسی جماعت کا قیام کر لیا ہے جس کے افراد شیر اور مردان کارزار ہیں۔ شعر یہ ہے:

دما قتلوا حتی اثاروا عصابۃ　　محلین ثوراً کاللیوث الضواہب

حضرت سلیمان بن صرد اور ان کے چار نائبین (مسیب بن نجبہ فزاری، عبداللہ بن سعد بن نفیل ازدی۔ عبداللہ بن دال تیمی۔ اور رفاعہ بن شداد بجلی) کی شہادت کے بعد توابین کا کوئی قائد نہ رہا مگر جماعت میں امام کے قاتلین سے بدلہ لینے کی روح زندہ تھی۔

مختار ثقفی اور امام مظلوم کا انتقام

اس زمانہ میں مختار ثقفی بڑا عالی دماغ، بلند حوصلہ اور بڑی سیاسی سوجھ بوجھ کا آدمی تھا یہ بنی امیہ کا بھی مخالف تھا۔ اور ابن زبیر کا بھی، کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اہل بیت کا ولی وحامی تھا۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ اہل بیت کا بھی دشمن تھا، مگر دیکھا کہ اہل بیت کی طرف عام رجحان ہے اور واقعات کربلا نے مسلمانوں کو بے حد متاثر کیا۔ ان کی طرف دلوں کی کشش بڑھ گئی۔ اور توابین کی جماعت نے اس میں روح پھونک دی ہے۔ اس لئے اپنی سیاسی کامیابی کے واسطے اہل بیت کی حمایت میں کھڑا ہو گیا، اور توابین کی جماعت کو ساتھ لے کر انتقام حسین کی دعوت بڑے پیمانہ پر پھیلائی۔

بہر حال کچھ ہو اس نے امام شہید علیہ السلام کے قاتلوں سے پورا پورا انتقام لیا اور ایک لاکھ چالیس ہزار دشمنان امام کو قتل کر کے مسلمانوں کے کلیجے ٹھنڈے کئے۔

سب سے پہلے اس نے اپنی قوت بڑھائی، انتقام حسین کے نام پر کافی لوگ اس کے ساتھ ہو گئے۔ توابین کی جماعت پہلے ہی سے ساتھ تھی۔ حضرت علی کے سپہ سالار اشتر نخعی جو بڑے مردمیدان اور ذی اثر

انھیں کی طرح ان کے صاحبزادے ابراہیم بھی بڑے بہادر اور معزز تھے۔ یہ بھی مختار کی جماعت میں شامل ہو گئے۔ کوفہ میں ان کا کافی اقتدار اور اثر تھا۔ اس وقت کوفہ میں حضرت ابن زبیر کی طرف سے جو حاکم تھا وہ عاقبت اندیش نہ تھا، ابراہیم سے الجھ گیا اور گرفتار کرنے کے لئے کچھ آدمی بھیج دیئے مختار کی جماعت ان کی مدد کے لئے کھڑی ہو گئی اور حاکم کوفہ مقابلہ کی تاب نہ لا سکا۔ مختار سے امان طلب کی۔ مختار نے ایک لاکھ نقد لے کر جان بخشی کی اور کوفہ پر بلکہ بجز بصرہ پورے عراق پر مختار کا قبضہ ہو گیا۔ اس نے اعلان کرا دیا کہ قاتلان حسین کے علاوہ جو شخص اپنا دروازہ بند کر لے اسے امان ہے پھر کوفہ میں جتنے بھی قاتلان امام تھے، سب کی گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اور قتل کئے گئے۔ بعض لعینوں نے بصرہ میں مصعب بن زبیر کے پاس پناہ لی۔ معصب نے بڑی غلطی کی کہ ان کو پناہ دی۔ لیکن اللہ کی پکڑ سے ایک بھی نہ بچا۔

مختار کی بڑھتی ہوئی طاقت سے حضرت ابن زبیر اور بنی امیہ دونوں کو خطرہ ہو گیا۔

حاکم بنی امیہ (دشمن خدا شقی ازلی) عبید اللہ بن زیاد نے مختار کے عامل موصل پر فوج کشی کر دی مختار نے مقابلہ میں ابراہیم بن اشتر کو بھیجا، یہ ۲۱ ذی الحجہ ۶۶ھ کو موصل کی نہر خازر کے کنارے پہونچے رات بھر فوجی تیاری اور ذکر الٰہی میں بسر کی صبح کو نماز پڑھا کر فوج کے سامنے انتقام حسین پر بڑی پر زور تقریر کی۔ تھوڑی دیر کے بعد ابراہیم اور ابن زیاد دونوں کی فوجیں صف آرا ہو گئیں۔ ابن زیاد کی فوج بہت زیادہ تھی۔ لڑائی کا سلسلہ کئی روز تک جاری رہا لیکن کب تک؟ گو ابن زیاد کی فوج بہت تھی مگر اشتر نخعی جیسے یکتائے روزگار سپہ سالار کے جانشین حضرت ابراہیم سے مقابلہ تھا ایک دن ابراہیم کی فوج کے ہر دستہ نے جس کی مجموعی تعداد بیس ہزار تھی اس زور شور سے حملہ کیا کہ دشمن کے قدم اکھڑ گئے۔ بے شمار مارے گئے، جو بھاگے ان کا تعاقب ہوا۔ دشمن دریا میں ڈوب ڈوب کر مرے، ڈوبنے والوں کی تعداد مقتولوں سے بڑھ گئی۔

ابن زیاد خود ابراہیم بن اشتر کے ہاتھ سے مارا گیا۔ اس کا سر کاٹ کر کوفہ میں مختار کے پاس بھیج دیا گیا۔ اور اسکی لاش کو آگ میں جلا دیا گیا۔

یہ عجیب اتفاق ہے کہ جس روز ابن زیاد مارا گیا، وہ بھی محرم کی دسویں تاریخ تھی۔ اس

کی تصریح مورّخین کے علاوہ امام بخاری نے بھی تاریخ صغیر صفحہ ۶۵ (طبع ہند) میں کی ہے۔ استیعاب ج ا ص ۱۴۸ میں بھی ایسا ہی ہے۔ امام بخاری اسے ۶۶ھ کا واقعہ بتاتے ہیں لیکن ابن کثیر لکھتے ہیں کہ صحیح بات یہ ہے کہ ۶۷ھ میں یہ واقعہ ہوا ہے۔

مختار نے ابن زیاد کا سر حضرت محمد بن حنفیہ فرزند علی مرتضیٰ اور امام زین العابدین کے پاس بھیجدیا۔ حضرت امام نے سجدۂ شکر کیا اور اللہ کی حمد و ثنا کی۔

ابن قتیبہ نے معارف میں لکھا ہے کہ "ابن زیاد کی کوئی اولاد نہ رہی"

اور اس طرح اس مردود کی نسل ختم ہو گئی جیسے فرعون کی۔ حضرت ابوالاسود دئلی کے اشعار ہیں:

اقول ذالک من جزع و وجد — ازال اللہ ملک بنی زیاد

وابعدھم بما غدروا وخانوا — کما بعدت ثمود وقوم عاد

ترجمہ:- میں بڑے غم واندوہ میں یہ دعا مانگ رہا ہوں کہ اللہ بنی زیاد کی حکومت تباہ کر دے۔ انہوں نے جو غداری اور جو خیانت کی ہے اللہ اس کے عوض میں ان پر اسی طرح لعنت بھیجے جیسے قوم ثمود اور قوم عاد پر بھیجی ہے۔

مختار کے جوانوں نے ابن سعد، شمر، ابن سنان، خولی اور امام مظلوم کے تمام قاتلوں کو چن چن کر قتل کیا، جو جان بچا کر بھاگا وہ اللہ کے ناگہانی عذاب میں مرا۔ غرض ان لعینوں میں ایک بھی زندہ نہیں بچا۔ مختار اور اس کی فوج کے ہاتھ سے ایک لاکھ چالیس ہزار دشمنان دین قتل ہوئے۔

حدیث قدسی کا بیان ہے یعنی خود اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ:

"(اے محمد) میں نے یحییٰ بن ذکریا کے خون کا بدلہ ستّر ہزار سے لیا اور تمہارے نواسے کے خون کا بدلہ ستّر ہزار کے دونا سے لوں گا۔ یعنی ایک لاکھ چالیس ہزار سے لوں گا۔"

دنیا نے دیکھ لیا کہ مختار انتقام الٰہی کی تلوار بن کر اٹھا اور ایک لاکھ چالیس ہزار دشمنان دین کو قتل کر کے دم لیا، حدیث قدسی نے جو کچھ فرمایا تھا سب نے اسے حرف بحرف دیکھ لیا۔

حیاتِ امام حسینؑ علیہ السّلام کا ایک باب

نام و نسب آپ کا نام نامی حسین ہے جو مشہور آفاق ہے اور خود رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے رکھا ہے۔ ابوعبداللہ آپ کی کنیت ہے اور سید شباب اھل الجنۃ، اور ریحانۃ النبی لقب، آپ کے والدین کریمین حضرت علی مرتضیٰ اور حضرت سیدۃ النساء فاطمہ زہراؑ ہیں۔ یعنی آپ کے نانا سلطان انبیاء رحمت کونین سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم ہیں۔

ولادت گذر چکا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت ام الفضل نے خواب دیکھا تھا کہ ان کی گود میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا کاٹ کر رکھ دیا گیا۔ ان کو بڑی تشویش ہوئی حضور نے خواب سنکر فرمایا۔ بڑا اچھا خواب ہے۔ انشاءاللہ فاطمہ کو ایک لڑکا پیدا ہوگا وہ تمہاری گود میں دیا جائے گا۔ (مشکوٰۃ)

اس خواب کی تعبیر ۵ شعبان سنہ ۴ھ میں ظاہر ہوئی کہ اسی تاریخ میں سیدنا امام حسین علیہ السلام کی ولادت ہوئی جو عالم غیب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسم اطہر کا ایک ٹکڑا ہیں۔ اور آپ کو سب سے پہلے حضرت ام الفضل نے اپنی گود میں اٹھایا۔

ولادت مقدس کی خبر سن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ داہنے کان میں اذان کی اور بائیں میں تکبیر، اور اس پیغمبرانہ انداز میں کہی کہ ان مقدس کلمات کی نورانی لہریں نومولود بچہ کے رگ و ریشہ میں پیوست ہوگئیں اور یہ اسی کا اثر تھا کہ ؎

ہرگز نہ جھکے وقت کے طاغوت کے آگے
شبیر ہیں اک کلمہ توحید کی تفسیر

حضور نے ساتویں دن آپ کا عقیقہ کیا[1] اور حسین نام رکھا۔

عہدِ نبوی میں

امام حسن اور امام حسین علیہما السلام کو یہ شرف حاصل ہے کہ ان دونوں مقدسوں کو حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جتنا پیار کرتے اور ان سے جتنی محبت فرماتے وہ محبت کا آخری مقام ہے۔ آپ نے بڑے پیار سے ان دونوں شہزادوں کی پرورش کی اور اپنی پیغمبرانہ تربیت کے اعجاز سے ان کو فضائل انسانی کے اس درجۂ کمال پر پہنچا دیا کہ تمام جوانان فردوس ان کے زیر سایہ رہ کر اپنی ایمانی تکمیل کرتے ہیں۔ اور اسی راہ سے درجۂ کمال پر فائز ہوتے ہیں۔ اس طرح یہ تمام جوانان فردوس کے امام اور سردار ہیں۔ یہ نتیجہ ہے سید الانبیاء صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے نظیر تربیت کا۔

حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم سیدنا امام حسن اور سیدنا امام حسین کی معمولی سے معمولی تکلیف سے بے قرار ہو جاتے۔ اور بلا ان کو دیکھے چین نہ آتا۔ ان کو دیکھنے کے لئے روزانہ حضرت فاطمہ کے گھر تشریف لے جاتے۔ انھیں اکثر دوش مبارک پر سوار کرتے۔

آپ سجدہ میں ہوتے کہ امام حسین پشت مبارک پر سوار ہو جاتے، جب تک یہ سوار رہتے آپ سجدہ سے سر نہ اٹھاتے کہ مبادا یہ گر نہ پڑیں۔

نوٹ: اس فصل سے لیکر شیر خدا کی شہادت تک کے واقعات سیدنا امام حسن علیہ السلام کے احوال میں لکھے جا چکے ہیں، لیکن سیدنا امام حسین کے احوال میں بھی ان کا ذکر کرنا ضروری ہے۔ اسطرح

---

[1] سنن ابو داؤد (ج ۲ ص ۳۶) میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے ایک مینڈھا حسن کے عقیقہ میں ذبح کیا تھا۔ اور ایک مینڈھا حسین کے عقیقہ میں۔ اور سنن نسائی (ج ۲ ص ۱۸۸) میں ہے کہ آپ نے حسن کے عقیقہ میں بھی دو مینڈھے ذبح کئے تھے۔ اور حسین کے عقیقہ میں بھی دو۔ اس کی توجیہ یہ کی گئی ہے کہ ایک مینڈھا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذبح کیا تھا اور ایک مینڈھا حضرت علی سے ذبح کرایا تھا۔ اس طرح ایک کہنا بھی صحیح ہے جیسا کہ سنن ابو داؤد میں ہے۔ اور دو کہنا بھی صحیح ہے جیسا کہ سنن نسائی میں ہے۔ ۱۲ کوثر

تکرار ناگزیر ہو گئی کہ اس کے بغیر سیدنا امام حسین کے احوال کا بیان بالکل تشنہ رہ جائے گا۔

ارتحالِ نبوی کے وقت

حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مرض وفات کے ایام میں حسنین کریمین کے معصوم دلوں میں غم واندوہ کا جو طوفان برپا تھا اس کا بیان زبان وقلم سے باہر ہے، اور حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی اپنے ایام علالت میں ان کا بے حد لحاظ فرماتے تھے۔ سیدنا امام حسین علیہ السلام کے حالات میں گذر چکا ہے کہ حضرت خاتون جنت سیدۂ عالم فاطمہ زہرا علیہا السلام حضور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے مرض وفات میں حسنین پاک کو لے کر آئیں اور عرض کی۔

" یا رسول اللہ یہ دونوں آپ کے بچے ہیں آپ ان کو اپنی وراثت (یعنی وراثت نبوت) عطا فرمایئے "

آپ نے فرمایا :

حسن کو اپنی ہیبت اور سرداری دی۔

اور حسین کو اپنی بہادری اور فیاضی بخشی۔

ارتحال نبوی سے حسنین کریمین پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا، اس وقت امام حسن علیہ السلام کی عمر شریف آٹھ سال کی تھی اور امام حسین علیہ السلام کی عمر گرامی سات سال کی۔

عہد صدیقی میں

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت صرف دو سال ہے جس میں آپ نے حسنین کریمین علیہما السلام کے حقوق پیغمبر زادگی کا پورا لحاظ رکھا ہے، حتیٰ کہ اور لوگوں سے بھی فرماتے تھے، ان کے حقوق کا پورا پورا لحاظ رکھنا۔ اس سلسلہ میں آپ کا یہ جملہ مشہور ہے، جو صحیح بخاری میں بھی ہے:

ارقبوا محمداً فی اہل بیتہ — اہل بیت کے معاملہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پاس و لحاظ رکھنا۔

(ج ۱ ص ۵۲۶)

عہد فاروقی میں

اس وقت امام حسن کی طرح امام حسین علیہما السلام کا بھی عہد طفولیت اپنی

آخری منزلیں طے کر رہا تھا اور چند سالوں میں عہد شباب آگیا۔ اس پوری مدت میں ان دونوں معصوموں نے اپنے والد بزرگوار سیدنا علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ سے قرآن و حدیث کی تعلیم حاصل کی ایک طرف یہ دونوں حضرات خمیر نبوی سے بنے ہی تھے اور تمام کمالات و فضائل کا جوہر نہایت جامعیت اور اعلیٰ ترین صلاحیت کے ساتھ ان میں ودیعت تھا ہی جیسا کہ خمیر نبوی کا تقاضا ہے۔ دوسری طرف حضرت علی جیسے باب علم و حکمت تمام شفقت پدری کے ساتھ اس کی تعلیم فرما رہے ہیں اور نبی اعظم صلے اللہ علیہ وسلم نے ان کی بے نظیر تربیت کی جو بنیاد رکھی تھی اس کی تکمیل دن رات کرا رہے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نبی کے یہ دونوں لال علم نبوی اور کمالات رشد و ہدایت اس مقام بلند پر فائز ہو گئے کہ خود علم و کمال پکار اٹھے "یہ ہیں سیدنا محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لال اور بجز وحی و نبوت آپ کے تمام کمالات کے وارث"۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ اپنے عہد میں بھی امام حسین علیہ السلام کا بے حد لحاظ فرماتے تھے حافظ ابن حجر تہذیب اور اصابہ میں بضمن حالات حسین لکھتے ہیں:

> ایک مرتبہ عمر منبر نبوی پر خطبہ دے رہے تھے کہ حسین نے کہا میرے باپ (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم) کے منبر پر سے اتر و، اور اپنے باپ کے منبر پر جاؤ۔ عمر بولے میرے باپ کا تو کوئی منبر ہی نہ تھا اور انھیں منبر پر اپنے پاس بٹھا لیا۔ خطبہ کے بعد اپنے ساتھ گھر لے گئے۔ راستہ میں پوچھا آپ کو یہ کس نے سکھایا تھا؟ جواب دیا: کسی نے نہیں، عمر نے کہا: کبھی کبھی میرے گھر تشریف لایا کیجئے۔ اس کی بنا پر حسین ایک روز عمر کے گھر پہونچے اس وقت یہ تنہائی میں معاویہ سے کچھ گفتگو کر رہے تھے اور ابن عمر دروازہ پر کھڑے تھے (سمجھا کہ تنہائی کی باتیں ہیں) اس لئے ابن عمر کے پاس تھوڑی دیر کھڑے رہنے کے بعد واپس چلے گئے۔
>
> عمر نے ایک روز کہا: آپ میرے گھر نہیں آئے؟ حسین نے کہا:

میں گیا تھا، آپ تنہائی میں معاویہ سے کچھ گفتگو کر رہے تھے اور آپ کے صاحبزادے دروازہ پر کھڑے تھے۔ (میں نے محسوس کیا کہ تنہائی کی باتیں ہیں) لہٰذا آپ کے صاحبزادے کے پاس تھوڑی دیر کھڑے رہنے کے بعد واپس چلا آیا۔

عمر نے کہا: آپ کو ابن عمر کے پاس کھڑے رہنے کی کیا ضرورت؟ خدا کی قسم میرے سر پر جو کچھ بھی ہے، وہ اللہ کے بعد آپ ہی لوگوں کا عطیہ ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے ان الفاظ پر غور کرو، ان کے دل میں امام حسین کی کتنی قدر و منزلت ہے اور منت پذیری کے کیسے پُر خلوص الفاظ میں اس کا ذکر فرماتے ہیں۔ کیا اس میں اس کی تعلیم نہیں کہ جب حضرت عمر امام حسین کی اتنی تکریم کرتے ہیں اور منت پذیری کے الفاظ سے اس کا اظہار فرماتے ہیں تو ہم لوگوں کو بدرجہ اولیٰ ان کا احسان مند بن کر خوب تعظیم و تکریم کرنی چاہیئے۔

حضرت عمر نے حسنین کریمین کا وظیفہ تمام صحابہ کے لڑکوں سے زیادہ مقرر کیا تھا۔ بدری صحابہ کے فرزندوں کا وظیفہ دو دو ہزار تھا، مگر حسنین کریمین کا وظیفہ پانچ ہزار تھا۔

عہد عثمانی میں

حضرت امام حسین علیہ السلام حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے عہدِ خلافت میں پورے جوان ہو چکے تھے، سب سے پہلے اسی زمانہ میں آپ جہاد کے لئے نکلے۔ چنانچہ ۳۰ھ میں طبرستان کے جہاد میں شرکت فرمائی۔

جب بلوائیوں نے حضرت عثمانؓ کے مکان کا محاصرہ کر لیا تھا تو حضرت علیؓ نے حسنین کریمین کو حضرت عثمان کی حفاظت کے لئے بھیجا۔ ان دونوں شاہزادوں نے دروازہ پر کھڑے ہو کر بلوائیوں کو اندر گھسنے سے روکا۔ جدھر یہ دونوں شاہزادے تھے ادھر سے کوئی بھی اندر نہ گھس سکا، سب ناکام ہو گئے۔ اب دوسری طرف سے دو بدبختوں نے اندر جا کر امیر المومنین رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ اگر حسنین کریمین کی طرح بنی امیہ وغیرہ کے نوجوان بھی ہر طرف ہوتے تو یقیناً بلوائی ناکام رہتے۔

جنگ جمل میں اس جنگ کا مفصل بیان حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے حالات میں گذرا، اس میں امام حسن کی طرح امام حسین نے بھی بڑا مجاہدانہ کام انجام دیا ہے، چنانچہ میمنہ پر امام حسن افسر تھے میسرہ پر امام حسین، مقدمۃ الجیش پر حضرت ابن عباس، شہسواروں کے افسر حضرت عمار بن یاسر تھے۔ پیادوں کے افسر حضرت محمد بن ابی بکر اور فوج کے علمبردار حضرت محمد بن حنفیہ تھے۔

جنگ صفین میں اس میں بھی آپ نے شجاعت حیدری کے جوہر دکھائے ہیں۔ صفین میں التوائے جنگ کا جو معاہدہ نامہ تحریر ہوا ہے۔ اس پر گواہ کی حیثیت سے آپ اور امام حسن کے بھی دستخط ہیں۔

جنگ نہروان میں حیدر کرار نے بمقام نہروان خارجیوں سے جو جہاد کیا ہے۔ اس میں حضرات حسنین کریمین نے بھی بڑی سرگرمی سے حصّہ لیا ہے۔

شیر خدا کی شہادت و وصیت شقی ابن ملجم نے حیدر کرار پر نہایت کاری حملہ کیا تھا۔ جس سے ۲۱ رمضان ۴۰ھ میں آپ کی شہادت ہوگئی۔ شہادت سے پہلے آپ نے حضرات حسنین کو نہایت قیمتی وصیت کی ہے، جس کے چند اجزا امام حسن علیہ السلام کے حالات میں درج کئے جا چکے ہیں۔ ان دونوں شاہزادوں نے اس وصیت کو اپنی زندگی کا ایک اہم دستور العمل بنایا ہے۔

عہد معاویہ میں امام حسین علیہ السلام امیر معاویہ سے صلح کرنے کے شدید مخالف تھے، لیکن حضرت امام حسن علیہ السلام اس کا عزم مصمم کر چکے تھے بالآخر آپ کو خاموش ہو جانا پڑا، اور صلح ہوگئی۔ گو آپ امیر معاویہ کی امارت کو باطل سمجھتے تھے لیکن ان کی امارت کی بنا پر دینی کاموں کو معطل کر دینے کے روادار نہ تھے۔ اس سلسلے میں دو اہم مسائل ہیں جن پر بہت سے لوگوں کی نگاہ نہیں پڑتی، جو لوگ بڑے بلند پایہ مفکر اسلام ہیں اور نہایت اعلیٰ درجہ کی فقہی بصیرت رکھتے ہیں۔ انھیں کی نظران دونوں نکات کی تہ تک پہونچتی ہے۔ اور اس میں حضرت امام حسین علیہ السلام تمام مفکرین ملت کے مقتدا ہیں۔

ان دونوں مسائل کا بیان حسب ذیل ہے :

۱ - صاحب جور کی خلافت صحیح نہیں، کیونکہ خلیفہ کے لئے عدالت ایک اہم اور لازمی شرط ہے۔ اگر کوئی ایسا شخص جبر و تسلط کی راہ سے خلافت کی مسند پر بیٹھ جائے تو لوگوں پر اس کی اطاعت ضروری نہیں۔ امام ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن ج ۱ ص ۸۰ میں لکھا ہے کہ "امام ابوحنیفہ کا مسلک یہی ہے۔"

۲ - صاحبِ جور خلیفہ واجب الاطاعۃ تو قطعاً نہیں لیکن اگر وہ ملک پر قابض و متصرف ہو جائے تو اس کی وجہ سے مسلمانوں کے اجتماعی کام معطل نہ ہو جائیں گے۔ لہٰذا اگر شرعی طور سے ان کی انجام دہی کی صورت نکل آئے تو اسے اختیار کیا جائے گا۔

ا - اگر سلطان جور کسی ایسے شخص کو قاضی بنا دے جو اس درجہ کا دین دار و متقی ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف فیصلہ نہ کرے گا، تو ایسا قاضی مسلمانوں کے معاشرتی۔ معاشی۔ دیوانی اور فوجداری معاملات میں جو فیصلہ کرے گا وہ نافذ ہوگا۔ اور واجب الاطاعۃ مانا جائے گا۔ صرف وہ صورت مستثنیٰ ہے جس میں بتقاضائے بشریت چوک ہو گئی اور غلط فیصلہ ہو گیا۔

ب - نماز باجماعت اسلام کا ایک شعار ہے، خلیفۂ جور کے تسلط سے یہ معطل نہ ہوجائے گی لہٰذا کوئی بھی امام ہو اس کے پیچھے نماز پڑھی جائے گی خود خلیفۂ جور امامت کرے تو اس کے پیچھے بھی پڑھی جائے گی یہ اس لئے کہ جماعت نہ معطل ہو جائے۔

ج - جہاد سے اسلام کی حیات و بقا وابستہ ہے، خلیفۂ جور کے تسلط سے یہ معطل نہ ہوجائے گا۔ لہٰذا مسلمانوں کا جو بھی سپہ سالار ہو اگر وہ کافروں سے جہاد کے لئے روانہ ہو تو اس کا ساتھ دیکر جہاد کرنا ہوگا۔ اگر خود خلیفۂ جور جہاد کے لئے اٹھا ہے تو اس کا بھی ساتھ دیکر جہاد کرنا ہوگا۔ ورنہ جہاد معطل ہو جائے گا۔ اور مسلمانوں کی اسلامی زندگی خطرہ میں پڑ جائے گی۔

ان اہم ترین حقائق کی بنا پر سیدنا امام[1] حسین علیہ السلام نے امیر معاویہ کو خلیفۂ جور مانتے ہوئے

---

[1] فقہائے اسلام کا بیان بھی ایسا ہی ہے۔ چنانچہ ہدایہ اخیرین کتاب ادب القاضی (ص ۱۳۴) میں ہے : ==

بھی ان کے زمانے کے جہاد میں شرکت فرمائی ہے چنانچہ ۴۹ھ میں قسطنطنیہ کی جو جنگ ہوئی ہے بعض مورخین نے لکھا ہے کہ اس میں آپ نے بھی حصہ لیا تھا۔

معرکۂ قسطنطنیہ ۴۹ھ میں قسطنطنیہ پر مسلمانوں کا پہلا حملہ ہوا۔ اس میں اسلامی فوج کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید کے شیر دل صاحبزادے حضرت عبدالرحمٰن تھے جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ہے۔ تفصیل آگے آتی ہے۔

= ثم یجوز التقلد من السلطان الجائر کما یجوز من العادل، لان الصحابة تقلدوا من معاویة والحق بید علی رضی اللہ عنه فی نوبته ۔

پھر سلطان جور کی طرف سے بھی قاضی کا عہدہ قبول کرنا جائز ہے جیسا کہ سلطان عادل کی طرف سے جائز ہے، کیونکہ صحابہ نے معاویہ کی طرف سے اسے قبول کیا ہے۔ حالانکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں حق حضرت علی کے ہاتھ میں تھا۔

اس کی شرح فتح القدیر میں ہے کہ ھذا التصریح بجور معاویة فلکن فی خس وجه لا فی اقضیته

ترجمہ :۔ یہ تصریح ہے کہ معاویہ صاحب جور تھے لیکن اپنے خروج میں صاحب جور تھے۔ (رعایا کے) جو فیصلے کرتے تھے اس میں نہیں۔ بہر حال کچھ بھی ہو، امام حسین علیہ السلام ان کو خلیفہ جور مانتے تھے۔ اس کی وجہ یہ بھی کہ انہوں نے خلیفہ بننے کے لئے جائز ناجائز ہر طرح کے ذرائع اختیار کئے تھے۔ اسی لئے وہ خلیفہ راشد نہیں، اور خلفائے راشدین میں انھیں کوئی بھی شمار نہیں کرتا، بلکہ حدیث کے رو سے وہ کٹ کھنی حکومت کے بادشاہ ہیں، جو اکابر اور فقہائے کرام ان کو سلطان جور مانتے ہیں ان کا ایک ماخذ وہ حدیث بھی ہے جس میں تصریح ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو ناکثین، مارقین اور قاسطین سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے۔ ناکثین کے معنی ہیں عہد شکن۔ یہ اصحاب جمل ہیں۔ مارقین کے معنی ہیں دین سے خارج۔ یہ نہروان کے خارجی ہیں۔ قاسطین کے معنی ہیں ظالم۔ یہ امیر معاویہ کی جماعت ہے اس حدیث کو فقہائے ملت نے بھی پیش فرمایا ہے۔ چنانچہ امام سرخسی نے اسے مبسوط کے باب الخوارج (ج ۱۰ ص ۱۲۴) میں پیش کیا ہے۔ ۱۲ کوثر

ایک غلطی کا ازالہ

جنگ قسطنطنیہ دو بار ہوئی ہے۔ پہلی جنگ ۴۹ھ میں ہوئی ہے اس کے سپہ سالار حضرت خالد کے صاحبزادے حضرت عبد الرحمٰن تھے۔ دوسری جنگ ۵۲ھ میں ہوئی ہے اس وقت یزید سپہ سالار تھا۔

چونکہ بعض لوگوں نے اتنا ہی لکھا ہے کہ جنگ قسطنطنیہ کا سپہ سالار یزید تھا اور تفصیل نہیں لکھی ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ یہ نہیں جانتے کہ یزید پہلی جنگ قسطنطنیہ میں سپہ سالار تھا یا دوسری میں۔ اس سے آگے بڑھ کر یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ چونکہ جنگ قسطنطنیہ میں شرکت کرنے والوں کو حضور نے مغفور فرمایا ہے۔ اس لئے یزید بھی . . . . ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ! ایک غلطی سے دوسری غلطی پیدا ہو گئی، جو نہایت خطرناک ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ پہلی جنگ قسطنطنیہ جو ۴۹ھ میں ہوئی تھی، اس میں یزید گیا ہی نہ تھا۔ اس کے سپہ سالار ہونے کے کیا معنی؟ تاریخ کامل میں ہے کہ امیر معاویہ نے اس کو بھی جانے کا حکم دیا تھا لیکن اس نے بیماری کا بہانہ کر دیا جو مان لیا گیا۔[1]

دوسری جنگ قسطنطنیہ جو ۵۲ھ میں ہوئی تھی اس میں البتہ یزید گیا تھا۔ اور اس کا سپہ سالار بھی تھا۔

قسطنطنیہ کی دونوں جنگوں میں بڑے بڑے صحابہ کرام نے شرکت فرمائی تھی۔ میزبان رسول حضرت ایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے دونوں جنگوں میں حصہ لیا تھا اور قسطنطنیہ ہی میں آپ کا وصال ہوا۔ مزار اقدس سے آج تک فیض و برکت حاصل کی جاتی ہے۔

پہلی جنگ قسطنطنیہ کا سپہ سالار یزید تو قطعاً نہ تھا، کیوں کہ وہ اس میں گیا ہی نہ تھا، لیکن لوگوں کا یہ کہنا بھی غالباً صحیح نہیں کہ اس کا سپہ سالار سفیان بن عوف تھا، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس کے سپہ سالار حضرت خالد کے صاحبزادے حضرت عبد الرحمٰن تھے۔

سنن ابی داؤد (ج ۱ ص ۳۴۰) میں ابو عمران اسلم کا بیان ہے کہ :

غزونا من المدینۃ نرید القسطنطنیۃ ہم لوگ مدینہ منورہ سے غزوہ قسطنطنیہ کے ارادہ

[1] تاریخ کامل ج ۳ ص ۱۹۷

وعلى الجماعة عبد الرحمٰن بن
خالد بن الوليد، والروم ملصقو
ظهورهم بحائط المدينة،
فحمل رجل على العدو، فقال
الناس: مه مه لا اله الا الله
يلقي بيديه الى التهلكة،
فقال ابو ايوب انما نزلت
هذه الآية فينا معشر الانصار
لما نصر الله تعالى نبيه صلى الله
عليه وسلم واظهر الاسلام
قلنا: هلم نقيم في اموالنا ونصلحها
فانزل الله عز وجل: وَأَنْفِقُوا فِي
سَبِيلِ اللهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ
إِلَى التَّهْلُكَةِ ج فالالقاء بالأيدي
الى التهلكة ان نقيم في اموالنا
ونصلحها وندع الجهاد، قال ابو
عمران فلم يزل ابو ايوب يجاهد
في سبيل الله عز وجل
حتى دفن بالقسطنطنية

سے چلے۔ غزوہ کرنے والی جماعت کے سپہ سالار عبد الرحمٰن بن خالد بن ولید تھے اور رومی لوگ شہر قسطنطنیہ کی فصیل کی طرف پشت کئے ہوئے تھے۔ ایک شخص نے بڑھ کر دشمنوں پر حملہ کیا۔ لوگوں نے کہا۔ لا الٰہ الا اللہ، رکو رکو! یہ شخص اپنا ہاتھ ہلاکت میں ڈال رہا ہے۔ اس پر حضرت ابو ایوب انصاری نے فرمایا۔ ہلاکت میں ہاتھ ڈالنے کی ممانعت والی آیت ہم انصار کے بارے میں نازل ہوئی ہے اللہ نے جب اپنے نبی کی مدد فرمائی اور اسلام کو غلبہ عطا فرمایا تو ہم لوگوں نے کہا۔ چلو اب ہم لوگ اپنی مالیات میں لگیں۔ اور اسے ٹھیک کریں۔ اس پر اللہ نے آیت نازل فرمائی۔ (آیت کا ترجمہ) "اور اپنے ہاتھ ہلاکت میں نہ ڈالو" لہٰذا ہاتھوں کو ہلاکت میں ڈالنا یہ ہے کہ جہاد چھوڑ کر اپنی مالیات میں لگ جائیں۔ اور ان کو ٹھیک کرنے میں مشغول ہو جائیں۔

ابو عمران کا قول ہے اسی بنا پر حضرت ابو ایوب جہاد میں ہمیشہ رہتے تھے حتیٰ کہ قسطنطنیہ میں وصال ہوا اور وہیں دفن ہوئے۔

ایک حدیث | صحیح بخاری (ج ۱ ص ۴۱۰) باب ما قیل فی قتال الروم) میں ایک حدیث

ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

أَوَّلُ جَيْشٍ مِنْ أُمَّتِي يَغْزُوْنَ	میری امت کی پہلی فوج جو مدینۂ قیصر
مَدِيْنَةَ قَيْصَرَ مَغْفُوْرٌ لَهُمْ	میں جہاد کرے گی وہ مغفور ہے ۔

مدینۂ قیصر سے کیا مراد ہے ؟ شارحین نے لکھا ہے کہ اس سے قسطنطنیہ مراد ہے، لیکن حدیث میں اس کی کوئی تصریح ہے ۔ مدینۂ قیصر کے معنی ہیں قیصر کا شہر، قیصر کے قلمرو کا کوئی بھی شہر ہو اسے مدینۂ قیصر کہا جائے گا ۔ چونکہ قیصر کے قلمرو میں سب سے پہلا غزوہ موتہ کا غزوہ ہے جو ۸ھ میں ہوا ہے ۔ حدیث بالا کی بشارت کے مصداق اسی غزوہ کے مجاہدین کرام ہیں ۔ موتہ شام کا ایک ممتاز مقام تھا جو قیصر کی قلمرو میں شامل تھا، یہ ضرور ہے کہ شام کا فرماں روا غسانی تھا لیکن قیصر کے گورنر کی حیثیت سے حکمرانی کرتا تھا ۔

جمادی الاولیٰ ۸ھ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے موتہ کی مہم پر فوج بھیجی تھی سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ کو بنایا تھا ۔ اور ارشاد فرمایا تھا، زید شہید ہو جائیں تو جعفر سپہ سالار ہیں، یہ بھی شہید ہو جائیں تو زید بن رواحہ ۔ بالآخر یکے بعد دیگرے ان تینوں حضرات نے جام شہادت نوش فرمایا ۔ اب حضرت خالد بن ولید نے فوج کی قیادت سنبھالی، اور فوج کو بچا کر واپس لائے ۔

حدیث میں جو آیا ہے کہ قیصر کے شہر میں جو پہلی فوج جہاد کرے گی وہ مغفور ہے ۔ ناچیز کے نزدیک وہ فوج انھیں مجاہدین اسلام کی ہے جنھوں نے موتہ میں جہاد کیا ہے، کیونکہ موتہ قیصر کے قلمرو میں ہے ۔ اور قیصر کا شہر ہے اور قیصر کے قلمرو میں سب سے پہلا غزوہ یہی ہے ۔

اگر کوئی صاحب کمترین کے اس نقطۂ نظر سے متفق نہیں ہیں اور قیصر کے شہر کے معنی قسطنطنیہ ہی لیتے ہیں کیوں کہ محدثین کا ارشاد ہے کہ اس سے قسطنطنیہ مراد ہے تو ان کو اس کا بھی لحاظ رکھنا چاہیے کہ محدثین کی بات ہی لینا ہے تو اس حدیث کی شرح میں محدثین کرام جو فرماتے ہیں اس کو بھی لیں کہ انصاف یہی ہے ۔ محدثین کا بیان ہے کہ :

۱ - غزوہ قسطنطنیہ دو مرتبہ ہوا ہے۔ پہلی بار ۴۹ھ میں اور دوسری بار ۵۲ھ میں۔ یزید پہلے غزوہ میں شریک نہ تھا، بلکہ دوسرے غزوہ میں گیا تھا۔ محدث جلیل علامہ عینی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری (ج ۶ ص ۶۴۹) میں لکھتے ہیں:

الاصح ان یزید بن معاویۃ غزا القسطنطنیۃ سنۃ اثنتین وخمسین[۱]۔	نہایت صحیح بات یہ ہے کہ یزید بن معاویہ نے ۵۲ھ میں قسطنطنیہ میں جنگ کی۔

یہ بیان جو ملتا ہے کہ یزید قسطنطنیہ کے غزوہ میں سپہ سالار تھا تو اس سے واضح ہو گیا کہ یہ ۵۲ھ کی جنگ قسطنطنیہ تھی، جو قسطنطنیہ کی دوسری جنگ ہے اور پہلی جنگ ۴۹ھ میں ہوئی تھی جس میں یزید نہیں گیا تھا پھر اس کا سپہ سالار کیسے ہوگا، بلکہ اس کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید کے شیر دل صاحبزادے حضرت عبد الرحمٰن تھے، جیسا کہ سنن ابی داؤد میں ہے (عبارت اوپر لکھی جا چکی ہے) مغفور ہونے کی بشارت اس فوج کو ہے جو قسطنطنیہ میں پہلی بار جہاد کرے، اور یزید اس فوج میں نہیں گیا۔ لہٰذا اس حدیث کی بنا پر اسے مغفور کہنے کی جسارت کیسے کی جا سکتی ہے؟

۲ - اگر یزید قسطنطنیہ کی پہلی مہم میں ہوتا جب بھی اس حدیث کے رو سے اس کو مغفور کہنا صحیح نہیں، محدثین کرام فرماتے ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر فتح الباری (ج ۶ ص ۶۵) میں حافظ عینی عمدۃ القاری (ج ۶ ص ۶۴۹) میں لکھتے ہیں۔

لا یختلف اهل العلم ان قوله صلی اللہ علیہ وسلم "مغفور لهم" مشروط بان یکونوا من اهل المغفرۃ۔	اس میں علماء کا اختلاف نہیں (یعنی اس میں اجماع ہے) کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قسطنطنیہ کی پہلی مہم کی فوج کو جو مغفور فرمایا ہے تو اس میں یہ شرط لگی ہے کہ اگر یہ لوگ مغفرت کے اہل ہوں گے تب مغفور ہیں[۲]۔

---

[۱] صحیح بخاری باب غزوۃ موتہ۔ ۱۲ کوثر

[۲] علامہ احمد بن محمد قسطلانی نے بھی ارشاد الباری شرح صحیح بخاری (ج ۵ ص ۸۴ - ۸۵) میں ایسا ہی ==

علامہ عینی اور حافظ ابن حجر اس کے بعد ان الفاظ سے مزید وضاحت بھی کرتے ہیں کہ:

فدل علی ان المراد مغفور لمن وجد شرط المغفرۃ فیہ	اب دلالت ہو گئی کہ ارشاد نبوی کی مراد یہ ہے کہ اس فوج میں جس کے اندر مغفرت کی شرط پائی جائیگی وہی مغفور ہے۔

لہٰذا اس فوج کے ایک ایک فرد کو مغفور کہنا صحیح نہیں، صرف وہ شخص مغفور ہے جو اس قابل ہے اور یزید اس قابل ہی نہیں کیونکہ یزید سے ایسے فعل کا ارتکاب ہوا ہے جس کی بنا پر نہ اس کا کوئی عمل فرض قبول ہے اور نہ کوئی نفلی عمل، حدیث میں ہے کہ جو شخص مدینہ والوں پر ظلم کرے اور خوف زدہ کرے، یا اللہ تو بھی اسے خوف زدہ کر، ایسے شخص پر اللہ، فرشتے اور تمام انسانوں کی لعنت ہے نہ اس کا کوئی عمل فرض قبول ہوگا اور نہ کوئی نفلی عمل۔ (المنذری ج ۲ ص ۲۰۲ بحوالہ معجم کبیر و اوسط باسناد جید)

۳۔ ایسے متعدد اعمال ہیں جنکے کرنے والے کو قرآن و حدیث میں مغفور فرمایا گیا ہے۔ اب اگر کسی نے مغفرت والا کوئی عمل کیا ہے تو ہمیشہ کے لئے اسکو مغفور کہنے کے بجائے یہ بھی دیکھو کہ بعد میں اس سے کوئی ایسا فعل تو نہیں ہوا ہے جس کی بنا پر وہ ملعون ہو گیا۔ اگر لعنت والا فعل بعد میں ہوا ہے تو اب وہ ملعون ہے مغفور نہیں۔

علمائے دین کا اتفاق ہے کہ جس نے امام حسین علیہ السلام کو شہید کیا، اور جس نے آپ کو قتل کرنے کا حکم دیا۔ اور جس نے اس فعل کو صحیح کام قرار دیا اور جو اس حرکت پر خوش ہوا یہ سب کے سب ملعون

= لکھا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

لاخلاف ان قولہ علیہ الصلوٰۃ والسلام مغفور لھم مشروط بکونہ من اھل المغفرۃ۔	اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب انھیں مغفور فرمایا ہے تو اس میں یہ شرط لگی ہوئی ہے کہ یہ لوگ مغفرت کے اہل ہوں گے تب مغفور ہونگے

ہیں اور ان کو ملعون کہنا جائز ہے جیسا کہ امام قسطلانی نے شرح بخاری ج ۵ ص ۸۴-۸۵ میں نقل فرمایا ہے اور یہ تاریخی حقیقت ہے کہ یزید نے قتل امام حسین کا آرڈر دیا تھا۔ امام سیوطی تاریخ الخلفاء ص ۴۴ میں لکھتے ہیں:

"یزید نے عبیداللہ ابن زیاد کو اپنے ایک خط میں حکم دیا تھا کہ حسین سے قتال کرو۔"

ایک موقع پر خود ابن زیاد نے تصریح کی ہے کہ "یزید نے اسے قتل حسین کا آرڈر دیا تھا۔"[1]

اس بنا پر یزید کے ملعون ہونے میں کیا شبہ ہے؟

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یزید نے مدینہ منورہ میں قتل عام کرایا۔ اور حرم مدینہ اور مسجد نبوی کی سخت توہین کرائی۔ حدیث سے ثابت ہے کہ جو شخص ایسی حرکت کرے وہ ملعون ہے۔ اب یزید ملعون نہیں تو اور کیا ہے؟ نیز یزید نے حرم مکہ میں خون کرایا، اور اس کی فوج اس کے حکم سے مکہ معظمہ میں لڑنے گئی تھی۔ اس نے حرم مکہ کی سخت توہین کی اور آگ بھی لگائی جس سے کعبہ شریف کا غلاف جل گیا۔ اور چھت بھی جل گئی جو لکڑی کی تھی۔ ایسے افعال کرنے والے اور کرانے والے سب ملعون ہیں۔ اب یزید ملعون نہیں تو اور کیا ہے؟

ایک اہم حقیقت

اسے ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے کہ کسی فعل سے کوئی شخص مغفور ہو گیا، تو یہ بھی دیکھو کہ اس نے بعد میں کوئی ایسا فعل تو نہیں کیا کہ مغفرت کے دائرے سے نکل گیا۔ مثلاً معاذاللہ مرتد ہو گیا یا لعنت کا مستحق ہو گیا۔

یزید کی ولی عہدی

امیر معاویہ کی حکومت سے خلافت راشدہ کا خاتمہ ہو گیا تھا اور ملوکیت قائم ہو گئی تھی۔ اب ان کے بعد قیام خلافت کی یہی صورت تھی کہ امیر معاویہ آیندہ کے لئے خلیفہ کا تقرر مسلمانوں کے شوریٰ پر چھوڑ دیتے اور اگر اپنی زندگی ہی میں اس معاملہ کو طے کرنا تھا تو اہل علم اور ارباب رشد و تقویٰ کو جمع کرکے انھیں خلیفہ کے انتخاب کا آزاد حق دیتے، لیکن انہوں نے خوف و طمع کے ذرائع سے اپنے بیٹے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے کر آیندہ کے لئے بھی خلافت راشدہ کا قیام مشکل کر دیا۔

---

[1] تاریخ کامل ج ۴ ص ۵۹

یزید کی ولی عہدی کی اسکیم امیر کوفہ مغیرہ بن شعبہ نے پیش کی۔ مورخ ابن اثیر وغیرہ کا بیان ہے کہ امیر معاویہ انھیں کوفہ کی گورنری سے برطرف کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے دمشق پہونچ کر یزید سے کہا: "میری سمجھ میں نہیں آتا کہ امیر المومنین تمہارے لئے بیعت لینے کی طرف کیوں توجہ نہیں کرتے؟ جب کہ بڑے بڑے صحابہ اب موجود بھی نہیں" یزید نے امیر معاویہ سے اس کا تذکرہ کیا۔ انہوں نے امیر مغیرہ سے پوچھا، امیر مغیرہ نے کہا۔ امیر المومنین عثمان کے بعد کیسے کیسے معرکے ہوئے۔ اب بہتر یہی ہے کہ اپنی زندگی ہی میں لوگوں سے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے لیجئے تاکہ آئندہ کوئی اختلاف نہ ہو" امیر معاویہ نے کہا یہ کام کیسے انجام پائے گا؟ اور اس کی انجام دہی کا کون ذمہ لے گا؟ امیر مغیرہ نے کہا: اہل کوفہ کا ذمہ دار میں ہوں اور اہل بصرہ کو زیاد سنبھال لیں گے۔ اس کے بعد کوئی مخالفت کرنے والا نہیں ہے۔
(تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۴۹)

امیر مغیرہ کی یہ اسکیم امیر معاویہ کے دل میں اتر گئی اور اس کے لئے طمع اور خوف کے ذرائع سے با اثر لوگوں پر اثر ڈالنا شروع کیا۔ بالآخر یزید کو ولی عہد بنا کے رہے جس سے ملوکیت اپنے تمام شاہی جبر و تسلط اور تمام قہرمانیوں کے ساتھ مسلمانوں پر مسلط ہو گئی۔ اور مسلمانوں کے نظام حکومت میں وہ خرابیاں پیدا ہو گئیں جن کا مداوا آج تک نہ ہو سکا، گو یزید کی ولی عہدی کے تمام مراحل امیر معاویہ کے شاہی اقتدار نے طے کئے ہیں لیکن اس کی اسکیم امیر مغیرہ بن شعبہ ہی نے پیش کی ہے۔ اس معاملہ میں ان کی حیثیت وہی ہے جو امیر معاویہ کو خلیفہ بنانے میں عمرو بن عاص کی تھی۔ اسی لئے امام حسن بصری جو تفسیر حدیث فقہ اور تصوف کے امام الائمہ ہیں۔ عمرو بن عاص اور امیر مغیرہ بن شعبہ کے بارے میں فرماتے ہیں "ان دو شخصوں نے امت کا کام خراب کر ڈالا" (فتح الباری) اس روایت کو متعدد محدثین اور مورخین نے بھی بیان کیا ہے۔ حافظ سیوطی نے بھی تاریخ الخلفاء ص ۱۴۴ میں اسے درج کیا ہے اور تفصیل بھی کی ہے۔ عمرو بن عاص نے امت کا کام جو خراب کیا ہے اس کی تفصیل میں اختصار سے کام لیا ہے۔ اور مغیرہ بن شعبہ نے امت کا کام جو خراب کیا ہے اس کی تفصیل میں فرماتے ہیں کہ:

مغیرہ بن شعبہ معاویہ کی طرف سے کوفہ کے عامل تھے۔ انھیں معاویہ نے ایک خط لکھا کہ اس خط کو

پڑھ کر اپنے کو معزول سمجھو، اور میرے پاس حاضر ہو جاؤ۔" مغیرہ نے حاضری میں تاخیر کی۔ معاویہ نے سبب پوچھا، مغیرہ نے جواب دیا میں ایک معاملہ کی تمہید میں لگا ہوا تھا۔ معاویہ نے کہا کون سا معاملہ؟ مغیرہ نے کہا آپ کے بعد یزید کی بیعت کا معاملہ۔ معاویہ نے کہا کیا تم نے ایسا کیا ہے؟ اچھا تو جاؤ اپنے منصب پر قائم رہو۔ اور اپنا کام کرو، مغیرہ نے باہر نکل کر اپنے ساتھیوں سے کہا میں نے معاویہ کا پیر ایسی گمراہی کی رکاب میں ڈال دیا ہے کہ قیامت تک نہ نکلے گا۔"

طمع اور خوف کی طاقت سے ہر طرف یزید کی ولی عہدی کی بیعت لے لی گئی، لیکن مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے لوگ اس پر آمادہ نہیں ہوئے کہ یزید جیسے شخص کو خلیفہ مان لیں۔ باپ کے بعد اس کا بیٹا بادشاہ! خواہ وہ کتنا ہی نالائق ہو۔ کھلی ہوئی شاہ پرستی ہے، جسے مرکز اسلام بآسانی قبول نہیں کر سکتا کہ لوگوں میں یہ ایمانی احساس زندہ تھا کہ امت کے بہترین نفوس حضرت امام حسین حضرت ابن عمر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر وغیرہ کی موجودگی میں یزید جیسا فاسق شخص کو خلیفہ بنانا اسلام کے دینی نظام کو یکسر تباہ کرنا ہے۔

امیر معاویہ نے مروان کو لکھا کہ یزید کے لئے مدینہ میں ولی عہدی کی بیعت لو، اس نے حضرت امام حسین، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر، حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر کے سامنے یہ مسئلہ پیش کیا کہ "امیر المومنین معاویہ نے اپنے بعد اپنے صاحبزادہ یزید کو خلافت کے لئے نامزد کیا ہے اور مجھے حکم دیا ہے کہ میں آپ لوگوں سے یزید کی ولی عہدی کی بیعت لوں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ "یہ ابوبکر و عمر کی سنت ہے۔"

حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر نے کھڑے ہو کر جواب دیا:

"یہ قیصر و کسریٰ کی سنت ہے، ابوبکر و عمر نے اپنی اولاد کو خلیفہ نہیں بنایا ہے۔ اور اپنے خاندان کے کسی شخص کو یہ عہدہ نہیں دیا ہے۔"

(تاریخ الخلفاء سیوطی ص ۱۳۷)

ان بزرگوں میں سے ہر شخص نے یزید کی ولی عہدی کو نہایت غلط اقدام سمجھا۔ امیر معاویہ کو

اطلاع دی گئی تو جیسا کہ ابن اثیر نے تاریخ کامل ج ۳ ص ۲۱۶ میں لکھا ہے، امیر معاویہ ایک ہزار سوار لے کر مدینہ منورہ پہونچے۔ اور سیدنا امام حسین علیہ السلام نیز حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت عبدالرحمٰن بن ابی بکر رضی اللہ عنہم سے نہایت تلخ گفتگو کی۔ حضرت امام عالی مقام اور حضرت ابن زبیر کو قتل کی دھمکی بھی دی[1] لیکن یہ حضرات یزید کی ولی عہدی کی بیعت پر کسی طرح راضی نہ ہوئے۔

پھر حج کے موقع پر مکہ معظمہ میں بھی امیر معاویہ نے یزید کی بیعت پر زور دیا اور یہاں تلخ گفتگو کے بجائے انعام و اکرام سے ان کو ہموار کرنا چاہا، مگر ان بزرگوں کا تقویٰ یزید جیسے فاسق و فاجر کی ولی عہدی کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ امیر معاویہ نے یہاں تک کہا کہ آپ لوگ یزید کو خلیفہ کا لقب دے دیجئے، باقی حاکموں کی تقرری اور معزولی اور خراج کی وصولی اور اس کی تقسیم آپ ہی لوگ کریں گے۔

حضرت عبداللہ بن زبیر نے ان بزرگوں کی طرف سے جواب دیا:

"آپ یا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ اختیار کیجئے، حضور نے کسی کو خلیفہ مقرر نہیں کیا، آپ بھی مقرر نہ کیجئے۔ یا ابوبکر کا طریقہ لیجئے۔ انہوں نے ایسے شخص کو ولی عہد بنایا جو ان کے خاندان کا نہ تھا۔ یا عمر کا طریقہ اختیار کیجئے۔ انہوں نے چھ آدمیوں کو منتخب کر دیا کہ یہ لوگ اپنے میں سے کسی کو منتخب کر لیں۔ ان چھ آدمیوں میں عمر کے لڑکے یا ان کے خاندان کا ایک آدمی بھی نہ تھا۔ ان تین طریقوں کے

---

[1] ابن اثیر کا بیان یہ ہے کہ امیر معاویہ مدینہ کے قریب پہونچے تو حسین ابن علی سے ملاقات ہوئی۔ امیر معاویہ نے دیکھتے ہی کہا۔ "لا مرحبا و لا اھلا بُدنة یترقرق دمھا واللہ مھریقُہٗ" یعنی تم کو مرحبا نہیں، تم ایک ایسے اونٹ ہو جس کا خون بہایا جائے گا، اللہ اس خون کو بہائے، حضرت امام حسین نے فرمایا "ایسی بات نہ بولو، بخدا میں ایسی بات کا مستحق نہیں" امیر معاویہ نے کہا: "کیوں نہیں مستحق ہو؟ بلکہ اس سے بدتر بات کے مستحق ہو۔"

(الحسین تالیف علامہ جلال حسینی ج ۱ ص ۸۳)

علاوہ کسی اور صورت کو ہم لوگ مان نہیں سکتے۔

غرض ان لوگوں نے کسی طرح یزید کی ولی عہدی تسلیم نہیں کی لیکن جیسا کہ ابن اثیر نے لکھا ہے امیر معاویہ نے مکہ والوں کے سامنے ایک مجمع میں تقریر کرتے ہوئے کہا:

"یہ لوگ (یعنی حسین ابن علی، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیرؓ اور عبدالرحمٰن) مسلمانوں کے سردار اور ان میں چیدہ نفوس ہیں جن کے مشورہ کے بغیر کوئی بات طے نہیں پا سکتی اور انہوں نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کر لی ہے، اب آپ لوگ بھی بیعت کر لیجئے[1]" (الحسین ج ۱ ص ۸۵)

اس کے بعد اہل مکہ نے بیعت کر لی۔ غرض امیر معاویہ نے یزید کی بیعت لے کر نظام خلافت کا خاتمہ کر دیا۔ یہ وہ حقیقت ہے کہ مولانا شاہ معین الدین احمد صاحب ندوی نے بھی اسے سیرۃ الصحابہ ج ۶ ص ۱۰ میں لکھ دیا ہے، حالانکہ انہوں نے متعدد باتوں میں امیر معاویہ کو مبرا دکھانے کی پوری پوری کوشش کی ہے۔

---

[1] اس سلسلہ میں علامہ ابن اثیر نے یہ بھی لکھا ہے جیسا کہ الحسین ج ۱ ص ۸۴ میں ہے کہ:—

"امیر معاویہ نے ان لوگوں (حضرت امام حسین، حضرت ابن زبیرؓ، حضرت ابن عمرؓ، حضرت عبدالرحمٰن) سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میں ایک تقریر کروں گا، اگر تم میں سے کوئی بھی اس کی تکذیب کا ایک لفظ بھی بولے گا تو منہ سے دوسرا لفظ نکلنے کے پہلے ہی اس کا سر اڑا دیا جائے گا" اور جلسہ میں ان حضرات کے سروں پر دو دو فوجیوں کو تعینات کر دیا تھا، بموجب الحکم تلوارلے کر ان کے سروں پر کھڑے تھے۔ امیر معاویہ نے ان کو حکم دیا تھا کہ ان میں سے جو بھی زبان سے ایک حرف نکالے فوراً اس کا سر قلم کر دینا"

اب انہوں نے مذکورہ بالا تقریر کی۔ اور ان بزرگوں میں سے کسی نے بھی تکذیب نہیں کی۔ اس کے بعد اہل مکہ نے یزید کی ولی عہدی کی بیعت کی۔ امیر معاویہ کی روانگی کے بعد اہل مکہ نے ان چاروں حضرات سے کہا۔ آپ لوگ تو کہتے تھے کہ ہم بیعت نہ کریں گے، پھر کیسے کر لی؟ انھوں نے جواب دیا ہم نے بیعت نہیں کی۔ کہا گیا۔ پھر آپ لوگوں نے معاویہ کی تکذیب کیوں نہیں کی؟ جواب دیا (سرزمین مکہ میں) "قتل و خونریزی کا ڈر تھا" واللہ اعلم یہ روایت کہاں تک صحیح ہے؟ ممکن ہے کہ واقعہ کچھ اور ہو۔ ۱۲ کوثر

یزید کی تخت نشینی

یہ مسلمانوں کے لئے بہت بڑی بلا اور اسلام کے لئے بہت ہی بڑی مصیبت تھی کہ یزید جیسا شرابی، نشہ باز، فاسق اور فاجر خلافت رسول کی مسند پر بٹھا دیا گیا۔ یہ واقعہ ۶۰ھ کا ہے جس کی بنا پر یہ سنہ فتنۂ عظیم کا سرچشمہ ہے اور اسی لئے حدیث میں اس سنہ سے پناہ مانگنے کی ہدایت فرمائی گئی ہے۔ امام احمد اور امام بزار بسند صحیح حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں اور ابوہریرہ ان مخصوص صحابۂ کرام میں ہیں جنھیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے مستقبل سے باخبر کر دیا تھا۔ روایت کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

تعوذوا باللہ من راس الستین، ومن امارۃ الصبیان، فلا تذهب الدنیا حتی تصیر للکع بن اللکع (خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۳۹)	۶۰ھ کے شروع ہونے سے اور لڑکوں کی حکومت سے پناہ مانگا کرو، اور دنیا ختم نہ ہو گی جب تک اس پر کمینہ زادہ شخص حکمراں نہ ہولے جو خود بھی کمینہ ہے۔

امام بیہقی کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ مدینہ کے بازار میں یہ کہا کرتے تھے:

اللّٰھم لا تدرکنی سنۃ ستین ویحکم تمسکوا بصدغی معاویۃ اللّٰھم لا تدرکنی امارۃ الصبیان (خصائص کبریٰ ج ۲ ـ ۱۳۹)	یا اللہ میں ۶۰ھ کا زمانہ نہ پاؤں، لوگو! تم پر افسوس! تم لوگ معاویہ کی دونوں کنپٹیوں کو پکڑ لو، خدایا میں لڑکوں کی حکومت کا زمانہ نہ پاؤں۔

اللہ نے ان کی دعا قبول کی اور ۵۹ھ میں ان کا انتقال ہوا۔

امام حاکم حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

ویل للعرب من شر قد اقترب علی راس ستین، تصیر الامانۃ غنیمۃ، والصدقۃ غرامۃ،	عربوں پر افسوس اس مصیبت سے جو ۶۰ھ کے شروع میں آئے گی، امانت، لوٹ کا مال اور صدقہ وخیرات، جرمانہ سمجھا جائے گا اور

والشهادة بالمعرفة، والحکم بالهوی (خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۱۳۶) | گواہی پہچان سے دی جائے گی۔ اور فیصلے نفسانی خواہشوں کے تحت کئے جائیں گے۔

اسی ۶۰ھ میں یزید کی حکومت قائم ہوئی، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو کچھ فرمایا تھا تمام دنیا نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا کہ:

۱۔ حکومت کے آدمیوں میں رشوت، خیانت اور بد دیانتی عام ہو گئی، حتیٰ کہ امانت کو مال غنیمت سمجھا جانے لگا۔

۲۔ مالدار لوگ جو عموماً حکومت کے اعوان و انصار تھے ان کی طبیعتیں خدا ترسی اور نیکی سے اتنی دور ہو گئیں کہ صدقہ و خیرات کو تاوان و جرمانہ سمجھنے لگے۔

۳۔ گواہی اسکے حق میں دی جانے لگی جس کے متعلق سمجھ لیا گیا کہ اگر اس کے موافق گواہی نہ دیں گے تو خطرہ ہے۔ مثلاً یہ حکومت کا آدمی ہے یا حکومت کے آدمیوں سے تعلق رکھتا ہے۔

۴۔ دین و شریعت پر فیصلہ کے بجائے ہوا و ہوس اور نفسانی خواہشات سے فیصلے کئے جانے لگے۔

یہ سب باتیں یزیدی حکومت کے خصوصیات اور مخصوص صفات ہیں۔ تاریخ کی شہادت ہے کہ دین کی جو باتیں حکومت سے تعلق رکھتی ہیں ان میں اسلام کے آئین و دستور اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مقرر کردہ طریقے کو بدل ڈالا گیا۔ اور خود حدیث کا اعلان بھی یہی ہے چنانچہ امام ابن ابی شیبہ حافظ ابو یعلیٰ اور امام بیہقی حضرت مسیح الامتہ سیدنا ابو ذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

ان اول من یبدل سنتی رجل من بنی امیة (خصائص ص ۱۳۹ ج ۲) | پہلا شخص جو میرے طریقہ کو بدل ڈالے گا وہ بنی امیہ کا ایک آدمی ہو گا۔

امام بیہقی اس روایت کو لکھ کر فرماتے ہیں "ایسا لگتا ہے کہ یہ شخص یزید بن معاویہ ہے"۔

یزید نے دین کا طریقہ جو بدلا ہے اس کی تفصیل بڑی طویل ہے، اس کی بے ایمانی اور الحاد کی بنا پر

سیدنا امام حسین علیہ السلام اس کے خلاف کھڑے ہوگئے۔ اور میدان کربلا میں جب آپ نے فرمایا تھا کہ "لوگو! مجھے چھوڑ دو میں کسی امن کی جگہ چلا جاؤں"۔ جواب دیا گیا "تم اپنے بنی عم (یعنی یزید) کی حکومت کیوں نہیں تسلیم کر لیتے؟" اس کے جواب میں آپ نے یہ ایمان افروز کلمات فرمائے:

معاذاللہ انی عذت بربی وربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب۔ (البدایہ والنہایہ، ابن کثیر ج ۸ ص ۱۷۹)	ایسی بات سے خدا کی پناہ، میں اپنے اور تمہارے رب کی پناہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے ہر ایسے متکبر سے پناہ میں رکھے جو قیامت پر ایمان نہیں رکھتا۔

نوٹ:۔ ابن کثیر شیخ ابن تیمیہ کے مخصوص تلامذہ میں ہیں، اور بڑے تیمیائی ہیں۔ اسی لئے جابجا یزید کی حمایت کی ہے، لیکن حضرت امام حسین علیہ السلام کا یہ ارشاد گرامی اتنا مستند ہے کہ اسے انھوں نے بھی نقل کیا ہے۔

سیدنا امام حسین علیہ السلام کی طرح آپ کی صاحبزادی حضرت سکینہ (سلام اللہ علی آبائہا و علیہا) نے بھی یزید کو ملحد فرمایا ہے۔ تاریخ کامل ج ۴ ص ۸۷ میں ہے:

وکانت سکینة تقول: ما رأیت کافرا باللہ خیرا من یزید بن معاویة۔	میں نے اللہ کے کسی منکر کو یزید سے بہتر (اسیران کربلا کے ساتھ سلوک کرنے والا) نہیں دیکھا۔

یزید کے فسق و فجور کو تمام مؤرخین نے بیان کیا ہے۔ علامہ بلاذری انساب الاشراف ج ۴ ص ۱ میں لکھتے ہیں:

کان یزید بن معاویة اول من اظہر شرب الخمور والاستھتار بالغناء، والصید، واتخاذ القیان والغلمان، والتفکہ بما یضحک	یزید بن معاویہ وہ پہلا شخص ہے جس نے علی الاعلان یہ سب کام کئے، شراب نوشی، گانے سے بے حد شغف، شکار بازی، گانے والی لونڈیوں کو اور لونڈوں کو رکھنا، ایسی مزاح بازی جس سے خوش حال

به المترفون من الفهادود — بے راہ لوگ خوب ہنستے ہیں جتلاً بندروں
والمعاقرة بالکلاب والدیکة — اور کتوں، اور مرغوں کے قہقہات۔

ایسے شخص کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مسند خلافت پر بٹھانا خلافت کی شدید ترین توہین ہے۔ ظاہر ہے کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام اسے کسی طرح گوارا نہیں کر سکتے تھے۔ چنانچہ آپ مع اولاد و دیگر اہل بیت دین حق کی حفاظت میں شہید ہو گئے، مگر یزید کی بیعت گوارا نہ فرمائی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسلام میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ اور دین حق بنی امیہ کی ناپاک بدعتوں سے پاک صاف رہا۔ امام حسین علیہ السلام اس باب میں سب کے امام ہیں۔ اور ان کا یہ احسان تمام مسلمانوں کی گردن پر ہے کہ آپ کے جہاد کربلا اور آپ کی عظیم ترین قربانیوں کی بدولت مسلمانوں کو دین اصلی شکل میں مل سکا۔ ورنہ بعد کے مسلمان جس چیز کو دین کے نام سے پاتے اس میں بنو امیہ کی ناپاک بدعتیں بکثرت ہوتیں، حتیٰ کہ نماز بھی اصلی شکل میں نہ مل سکتی کیوں کہ بنی امیہ نے نماز کی تکبیروں کو چھوڑ دیا تھا اور مشہور کر دیا تھا کہ حضرت عثمان نے بھی انھیں چھوڑ دیا تھا، حالاں کہ یہ صحیح نہیں، حاشیہ صحیح بخاری (ج ۱ ص ۱۰۸) میں جو لکھا ہے وہ قابل تنقید ہے۔

ایک تاریخی بیان کی ضرورت

حضرت امام حسین علیہ السلام کی شہادت حیات انسانی کا وہ زہرہ گداز سانحہ ہے کہ تاریخ انسانی کا سب سے بڑا حزنیہ بن گیا۔ آپ نے میدان کربلا میں حریت و آزادی، صبر و عزیمت احیائے ملت اور راہ حق میں پہاڑ سے بھی زیادہ ثابت قدمی کے جو آثار و نقوش ثبت فرمائے ہیں اور ان میں ہر مذہب و ملت کے انسانوں کے لئے زندگی کی لافانی تعلیمات ہیں ضرورت ہے کہ حضرت امام حسین علیہ السلام اور آپ کے ساتھ شہید ہونے والے فدویوں کی شہادت اور کربلا کے دیگر حالات کو شرح و بسط سے بیان کیا جائے، کہ تمام دنیا کو حریت و عزیمت اور ثابت قدمی کی روح زندہ کرنے کے لئے اس تاریخی بیان کی

بے حد ضرورت ہے ۔ یہ بیان بڑی تفصیل کا طالب ہے ۔ اس لئے اس کتاب میں اس کو ضمناً لکھنے کے بجائے ایک مستقل تصنیف کی ضرورت ہے ۔ اگر اللہ نے توفیق بخشی تو انشاء اللہ اس پر مستقل تصنیف پیش کرنے کی سعادت کا حصول بھی ہو جائے گا ۔

والسلام

کوثر ندوی، قادری

ضمیمۂ باب

۱۔ امام

لفظ امام کی تشریح امام کے معنی ہیں پیشوا اور رہنما کے، ائمۂ لغت کا بیان ہے:

الامام الّذی یقتدیٰ بہٖ[1] — امام وہ ہے جس کی اقتدا اور پیروی کی جائے۔

امام کا کام یہ ہے کہ منزل مقصود تک پہونچائے۔ اس بنا پر انسان کے علاوہ ان چیزوں کو بھی امام کہتے ہیں جن کی بدولت منزل مقصود تک رسائی ہوتی ہے۔ قرآن مجید نے کھلے راستے کو اور کتاب ربانی کو اسی بنا پر امام فرمایا ہے۔

قوم شعیب اور قوم لوط علیہما السلام کی بستیاں کھلے راستے پر تھیں۔ قرآن مجید اس راستے کو امام فرماتا ہے:

وَاِنَّهُمَا لَبِاِمَامٍ مُّبِيْنٍ ○ (الحجر، آیت ۷۹) — یہ دونوں بستیاں امام مبین یعنی کھلے راستے پر تھیں۔

تورات شریف بنی اسرائیل کے لئے دستور یزدانی اور شریعت ربّانی ہے جو انھیں راہ ہدایت پر چلا رہی ہے اسی لئے قرآن مجید اسے بنی اسرائیل کا امام قرار دیتا ہے۔ سورۂ ہود آیت ۱۷۔ اور سورۂ احقاف آیت ۱۲ میں ہے:

---

[1] یہ مفہوم عربی لغت کی تمام کتابوں میں ہے۔ راقم نے مختار الصحاح کی عبارت نقل کی ہے کہ بہت مختصر ہے۔ ۱۲ کوثر

وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ؕ	اور اس (قرآن) سے پہلے موسیٰ کی کتاب امام[1] اور رحمت تھی ۔

امام ہدایت اور امام ضلالت

چوں کہ جس انسان کی پیروی اور اقتدا کی جائے عربی میں اسے امام کہتے ہیں، اس لئے پیروی کرنے والوں کو دیکھئے تو امام دو طرح کے ہیں ایک وہ جس کو صالحین نے اپنا مقتدا مانا ہے، ایسا شخص امام ہدایت ہے ۔ ایک وہ جس کو اہل ضلالت وکفر نے اپنا پیشوا مانا ہے، ایسا شخص امام کفر وضلالت ہے ۔ قرآن مجید میں دونوں طرح کے اماموں کا ذکر موجود ہے ۔

امام ہدایت کا بیان متعدد آیتوں میں ہے ۔ ایک آیت درج ذیل ہے جس میں بنی اسرائیل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا گیا ہے :

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ۝ (السجدہ آیت ۲۴ پ ۲۱)	ہم نے ان لوگوں میں ایسے امام بنائے ہیں جو ہمارے حکم کی بنا پر ہدایت کرتے تھے (یہ اس وقت ہوا) جبکہ ان لوگوں نے نفس پر قابو پایا اور صبر سے کام لیا اور یہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے ۔

---

[1] توراۃ کو بنی اسرائیل کا امام اس لئے فرمایا ہے کہ یہ ان کا مؤتم یعنی دینی دستور العمل ہے جس کی پیروی کرنا ان کے لئے ضروری ہے ۔ تفسیر ابن جریر ج ۲ ص ۱۸ میں ہے ۔ اماما لبنی اسرائیل یاتمون به ۔ کشاف ج ۲ ص ۴۸۵ اور مدارک ج ۲ ص ۱۴۰ میں ہے : کتابا مؤتما به فی الدین قدوة فیه نیز کشاف ج ۳ ص ۱۰۳ و تفسیر کبیر ج ۱ ص ۷۰ میں ہے "اماما" قدوة یؤتم به فی دین الله وشرائعه کما یؤتم بالامام تفسیر بیضاوی ص ۱۸ میں ہے : کتابا موتما به فی الدین ۔ تفسیر خازن ج ۳ ص ۲۲۴ میں ہے : کان اماما لهم یرجعون الیه فی امور الدین والاحکام والشرائع ۔ ۱۲ کوثر

امام ضلالت کا بیان قرآن مجید میں اس اسلوب سے بھی ہے کہ یہ ائمۂ کفر ہیں۔ اور اس اسلوب سے بھی ہے کہ یہ ائمہ جہنم کے داعی ہیں۔ تفصیل یہ ہے :

۱۔ مشرکین مکہ جن کے متعلق سورۂ براءت نازل ہوئی ہے۔ قرآن مجید انھیں ائمۂ کفر فرماتا ہے، ارشاد ہے :

وَاِنْ نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝	اور اگر یہ لوگ اپنی قسموں کو (معاہدہ کی حلف کو) توڑ ڈالیں تو کفر کے ان اماموں سے جنگ کرو، امید رکھو کہ یہ لوگ ایسا ہی کرنے سے اپنی حرکتوں سے باز آئیں گے۔

(سورۂ توبہ آیت ۱۲)

جو گمراہ خلفاء[1] و سلاطین پبلک کو غلط راستے پر ڈال رہے ہیں اور اس طرح گمراہی پھیل رہی ہے، حدیث میں انھیں ائمۂ مضلّین فرمایا گیا ہے۔ یعنی گمراہ کن امام۔ ابوداؤد و ترمذی کی روایت کی بنا پر ایسے سلاطین امت کے لئے بے حد خطرناک ہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے :

انما اخاف علی امتی الائمۃ المضلین ، (مشکوٰۃ ۴۶۳)	مجھے اپنی امت کے معاملہ میں سب سے زیادہ ڈر گمراہ کن اماموں کا لگا ہے۔

۲۔ فرعون اور اس کا لشکر جو ملک میں بلا استحقاق اپنی بڑائی جما رہے ہے۔ پبلک پر ظلم و ستم کرتے تھے، بے عنوانی عام تھی، پبلک بھی ان کی پیروی میں غلط راستے پر گامزن تھی۔ اس طرح یہ مفسدین پبلک کے امام ضلالت تھے، جن کے راستہ پر لوگ چل کر گمراہی کے غار میں گرتے جاتے تھے۔ قرآن مجید نے بتایا ہے کہ یہ ایسے ائمۂ ضلالت ہیں جو جہنم کے داعی ہیں۔ سورۂ قصص (آیت ۳۹ تا ۴۱ پ۲۰) میں ہے :

---

[1] گمراہ خلفا سے مراد یزید، مروان، عبدالملک اور ولید وغیرہ ہیں۔ ۱۲ کوثر

وَاسْتَكْبَرَ هُوَ وَجُنُوْدُهٗ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اِلَيْنَا لَا يُرْجَعُوْنَ ○ فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ ج فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ○ وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ لَا يُنْصَرُوْنَ ○ وَاَتْبَعْنٰهُمْ فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً ج وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ هُمْ مِّنَ الْمَقْبُوْحِيْنَ ○

اور وہ (یعنی فرعون) اور اس کے لشکر ملک میں بلا استحقاق بڑے بنے تھے۔ اور خیال کرلیا تھا کہ ہمارے پاس انھیں جانا نہیں ہے۔ پھر تو ہم نے اس کو اور اس کے لشکر کو اپنی گرفت میں لے کر دریا میں ڈال دیا۔ اب فکر و نظر سے کام لو کہ ان ظالموں کا انجام کیسا ہوا! ؟ اور ہم نے ان لوگوں کو جہنم کی طرف بلانے والے امام قرار دیدیا۔ اور قیامت کے دن ان کی مدد نہ ہوگی۔ اور ہم نے اس دنیا میں بھی ان کے پیچھے لعنت لگادی اور یہ لوگ قیامت کے روز بھی بدترین احوال والوں میں رہینگے۔

یہ نہ سمجھئے کہ فرعون اور اس کے اعوان و انصار ہی کے لئے لعنت ہے، بلکہ فرعون صفت خلفاء[1] و سلاطین پر بھی لعنت ہے۔ ظالموں پر قرآن مجید میں کئی جگہ لعنت آئی ہے۔ سورۂ مومن آیت ۵۲ پ ۲۴ میں ہے:۔

يَوْمَ لَا يَنْفَعُ الظّٰلِمِيْنَ مَعْذِرَتُهُمْ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ ○

اس دن (یعنی قیامت کے دن) ظالموں کو ان کی معذرت فائدہ نہ دے گی، اور ان کے لیے لعنت ہے، اور ان کے لئے بہت برا گھر ہے۔

ظالم خلفا و سلاطین کے ظلم و ستم کا سرچشمہ آئین ربانی اور احکام قرآنی کے نفاذ و قیام کو چھوڑ دینا ہے، ایسا ہی کرنے سے یہ لوگ ائمۂ ضلالت ہوئے۔ پھر لعنت کے مستحق ہو گئے، امیر المومنین سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اعلان عام کے لئے منبر نبوی پر خطبہ دیتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

---

[1] فرعون صفت خلفا سے مراد یزید، مروان، عبد الملک اور ولید وغیرہ ہیں۔ ۱۲ کوثر

من ولی من امر امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم شیئا فلم یقم فیھم بکتاب اللہ تعالیٰ فعلیہ بھلۃ اللہ
(کنز العمال ج ۵ ص ۴۴۸ طبع جدید بحوالہ البغوی)

جو شخص امت محمدیہ کے امر کا فرماں روا ہو گیا، لیکن امت میں کتاب الٰہی کو قائم اور نافذ نہیں کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے۔

جب امت پر ظالم خلفاء و سلاطین کا تسلط ہو جائے تو امت کا فرض ہے کہ ان کو ظلم سے روکنے اور حق کی طرف موڑنے کی کوشش کرے، اگر لوگوں نے اس سے بے اعتنائی کی تو حدیث کی نگاہ میں ملعون ہیں۔

ایک روز رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل پر لعنت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

کلا واللہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر، ولتاخذن علی یدی الظالم ولتاطرنہ علی الحق اطرا او لتقصرنہ علی الحق قصرا او لیضربن اللہ بقلوب بعضکم علی بعض ثم لیلعننکم کما لعنھم
(مشکوٰۃ ص ۴۳۸)

ہاں سنو! اچھی باتوں کا ضرور حکم دینا اور برے کاموں سے ضرور روکنا اور ظالم کے دونوں ہاتھ ضرور پکڑ لینا، اور ظالم کو حق کی طرف ضرور موڑنا، حق سے تجاوز کرنے ہی نہ دینا، ورنہ اللہ کی قسم ہے کہ اللہ تمہارے دلوں کو ٹکرا دے گا، پھر تم پر لعنت کرے گا، جس طرح بنی اسرائیل پر لعنت کی ہے۔

ظلم کے انسداد کے لئے ظالم خلفاء و سلاطین کے مقابل کھڑے ہونا بڑا ہی عظیم جہاد ہے، اسی لئے جو مرد حق اس راہ میں شہید ہوا وہ سید الشہداء ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے:

سید الشھداء حمزۃ بن عبد المطلب ورجل قام الی امام جائر

سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور وہ شخص بھی سید الشہداء ہے جو ظالم امام

فامرہ ونہاہ فقتلہ (الترغیب منذری ج ۳ ص ۲۲۵ بحوالہ ترمذی وحاکم والجامع الصغیر ۲ - ۲۹) (خلیفہ) کے مقابل کھڑا ہوا اور اسے اچھے کام کا حکم دیا، اور برے کاموں سے روکا اس بنا پر امام ظالم نے اسے قتل کر دیا۔

تاریخ اسلام شاہد ہے کہ خلیفۂ ظالم، اس کے ظلم پرست حاکم اور اس کی سفاک و خونخوار فوج کے سامنے سیدنا امام حسین علیہ السلام نے جس بے نظیر عزیمت سے فریضۂ جہاد کو ادا فرمایا ہے اس کی مثال پوری تاریخ اسلام میں نہیں۔ اور اس باب میں وہ تمام مجاہدین عزیمت کے پیشوا اور امام ہیں، کہ آپ کے بعد اس راہ کے مجاہدین آپ ہی کی پیروی کرتے ہیں۔

آپ نے جہاد و عزیمت اور صبر و استقامت کے جو نمونے پیش فرمائے ہیں وہ تمام امت کے لئے اسوۂ عمل ہیں۔ کتنا صحیح کہا ہے حضرت زبیر کے فرزند مصعب نے عین اس وقت جب کہ عبدالملک بن مروان کے مقابلہ میں ان کی فوج نے غداری کی اور ان کا ساتھ چھوڑ دیا۔ اس وقت انھیں سیدنا امام حسین علیہ السلام کے جہاد و عزیمت کی یاد آئی اور بے ساختہ بول اٹھے:

ان الالٰی بالطفِ من آل ھاشم تآسوا، فسنوا للکرام التآسیا

ترجمہ: آلِ ہاشم کے جو لوگ کربلا میں (شہید ہوئے) ہیں انہوں نے بڑے استقلال اور ثابت قدمی سے کام لیا اور شریفوں کے لیے استقلال و ثابت قدمی کا راستہ قائم کر دیا۔

امام علیہ السلام کے اس کارنامۂ جہاد نے مصعب میں جواں مردی کا وہ جوہر پیدا کر دیا کہ اگرچہ فوج نے ساتھ چھوڑ دیا تھا، مگر وہ عبدالملک جیسے جبار کے سامنے نہیں جھکے۔ اور مردانہ وار لڑ کر جان دے دی۔ ان کے بھائی حضرت عبداللہ بن زبیر کے سامنے بھی امام علیہ السلام کی عزیمت و ثابت قدمی کے بے نظیر نمونے موجود تھے، جن کی راہنمائی میں انہوں نے حجاج جیسے فرعون کی فوج سے ایسا مردانہ وار مقابلہ کیا کہ اگرچہ ان کی فوج نے بھی ساتھ چھوڑ دیا تھا، مگر یہ اپنی بے کسی پر ہمت نہ ہارے اور جاں باز بہادروں کی طرح دشمنوں سے لڑ کر اپنے

اصول پر قربان ہو گئے۔ [1]

ایک دو نہیں لاکھوں کروڑوں انسان ہیں جنہوں نے راہ حق میں سیدنا امام حسین علیہ السلام کی عدیم المثال عزیمت کو نمونہ بنایا اور جوش حق سے لبریز ہو کر نہایت جواں مردی اور ثابت قدمی سے باطل کا مقابلہ کیا، حتیٰ کہ یا تو باطل کو کچل کر رکھ دیا یا راہ حق میں قربان ہو کر حیات جاوداں پائی۔ ایسے تمام مردان حق بہترین انسان ہیں۔ اور ان سب نے سیدنا امام حسینؑ کو اپنا امام مان کر شہادت کا مقام بلند حاصل کیا ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

امام حسین علیہ السلام تمام مسلمانوں کے امام ہیں

سطور بالا میں اس کا بیان تھا کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام ارباب

---

[1] حضرت عبداللہ بن زبیر نے بھی یزید کی بیعت نہیں کی تھی۔ انہوں نے امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد مکہ میں خلافت کا دعویٰ کیا۔ یزید نے ان کے مقابلہ میں فوج بھیجی جس نے حرم کعبہ میں سنگ باری اور آتش باری کی جس سے کعبہ میں آگ لگ گئی۔ اور اس کی چوبی چھت جل گئی۔ اسی اثناء میں یزید مر گیا۔ اور حضرت ابن زبیر کو حجاز، عراق یمن اور خراسان نے خلیفہ تسلیم کر لیا۔ لیکن شام میں بنی امیہ کا اثر تھا، ان لوگوں نے مروان کو خلیفہ بنایا۔ اس نے لڑ کر مصر پر قبضہ کر لیا۔ مروان کے بعد عبدالملک ابن مروان خلافت کا مدعی ہوا۔ اس نے حضرت ابن زبیر کی طاقت توڑنے اور ان کی خلافت پر قبضہ کرنے کے لئے عراق پر فوج کشی کی جو بہت ہی اہم صوبہ تھا۔ یہاں بصرہ میں ان کے بھائی مصعب بن زبیر عراق کے والی تھے۔ مصعب نے عبدالملک کا مقابلہ کیا، لیکن ان کی فوج نے ساتھ چھوڑ دیا اور یہ بہادری سے لڑ کر مارے گئے۔ عبدالملک نے مصعب کو قتل کرنے کے بعد عراق پر قبضہ کر لیا اور حضرت عبداللہ بن زبیر کی بڑی طاقت توڑ دی۔ پھر ان سے مقابلہ کے لئے ۷۲ھ میں حجاز بن یوسف ثقفی کو چالیس ہزار فوج کے ساتھ بھیجا۔ وہ حرم کعبہ میں قلعہ بند ہو گئے۔ حجاج نے ان کا محاصرہ کیا جو کئی مہینہ تک رہا۔ اس اثناء میں ان کی فوج نے ساتھ چھوڑ دیا۔ بالآخر ان کے لڑکوں نے بھی ساتھ چھوڑ دیا، لیکن حضرت ابن زبیر نے بڑی پامردی سے حجاج کا مقابلہ کیا۔ حجاج نے انہیں بھی بڑی بے دردی سے قتل کر ڈالا اور ان کی لاش سولی پر لٹکوا دی جو ہفتوں اسی طرح لٹکتی رہی۔ اور بنی امیہ کے ظلم و ستم کا ایک ذلیل نقشہ پیش کرتی رہی۔ ۱۲ کوثر

عزیمت اور اصحاب استقامت کے امام ہیں، جنہوں نے باطل کا مقابلہ پورے استقلال اور پامردی سے کیا اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ آپ صرف مجاہدین ہی کے امام ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ مجاہدین حق کے بھی امام ہیں۔ اور تمام متقین و صالحین کے بھی، بلکہ تمام مسلمانوں کے امام ہیں۔ کوفہ والوں کے خطوط کے جواب میں آپ نے مکتوب گرامی لکھتے ہوئے امام کی جو تشریح فرمائی ہے اس کے مکمل مصداق آپ ہیں۔ آپ تحریر فرماتے ہیں :-

فلعمری ما الامام الا العامل بالکتاب، القائم بالقسط، الدائن بالحق، الحابس نفسه علی ذات الله (الحسین ج ۲ ص ۱۴)	مجھے اپنی حیات کی قسم کہ امام تو وہ ہے جو کتاب الٰہی پر عامل ہو۔ انصاف کا قیوم ہو۔ حق کو پوری طرح ادا کرے۔ اور اپنے کو اللہ کے لئے وقف کر دے۔

اس باب کے شروع ہی میں بتایا جا چکا ہے کہ "امام پیشوا اور مقتدا کو کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے"۔ بھلا کون مسلمان ہے جس کو آپ کی اقتدا سے انکار ہے؟ جب کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میدان عرفات میں (جو مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع ہے) تمام صحابہ کرام کو اولاً اور تمام مسلمانوں کو ثانیاً یہ تعلیم فرما رہے ہیں :-

انی ترکت فیکم ما ان اخذتم به لن تضلوا، کتاب الله وعترتی اهل بیتی۔ (سنن ترمذی ج ۲ ص ۲۱۹)	لوگو! میں تمہارے پاس وہ (دو) چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں کہ اگر انھیں تھامے رہو گے تو گمراہ ہو ہی نہیں سکتے۔ (یہ دونوں) چیزیں ہیں، کتاب الٰہی اور میری عترت جو میرے اہل بیت ہیں۔

غور کرو! عترت رسول یعنی امام حسن و امام حسین اور ان کی مقدس اولاد اس پایہ کے امام ہیں کہ جو شخص ان سے وابستہ رہے گا اور ان کا راستہ پکڑے گا وہ کبھی گمراہ نہیں ہو سکتا۔

اب فیصلہ کرو کہ حضرات حسنین عظیمین کتنے جلیل القدر امام ہیں۔ اسی طرح ان کی مقدس اولاد جو ان کے اسوۂ حسنہ کی صحیح یادگار رہے وہ بھی امامت کے کس بلند مقام پر فائز ہے۔ اسی لئے تو تمام مسلمان

ان حضرات کو امام کہتے ہیں۔ اگر حدیث میں ان کے مرتبۂ علیا کا ذکر نہ ہوتا جب بھی یہ دلیل کافی تھی کہ تمام مسلمان انھیں امام کہتے ہیں۔ جن میں کروڑوں علمار حقانی اور اولیا و ربانی ہیں۔ لہٰذا اگر یہ کہا جائے کہ "امام حسن اور امام حسین کی امامت پر اجماع ہے" تو کوئی بے جا بات نہیں کیوں کہ لاتعداد مسلمان انھیں امام مانتے ہیں۔ عوام ہی کا ذکر نہیں، خواص امت بھی مانتے ہیں، جو اس پایہ کے ہیں کہ کسی بات پر ان کا متفق ہو جانا اجماع امت ہے۔

حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی، قادری، چشتی، سہروردی، نقش بندی، شیعہ، سنی، مقلد غیر مقلد، دیوبندی، بریلوی، غرض ہر مسلک و مشرب کے مسلمان ان حضرات کو امام مانتے ہیں، امت کا یہ اتفاق بڑی وزنی چیز ہے۔ حضرت ابن عباس وغیرہ سے مروی ہے کہ نبی صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے

لا یجمع اللہ امتی علی الضلالۃ ابداً[1] میری امت گمراہی پر کبھی متفق نہ ہوگی۔

نیز حضرات حسنین عظیمین کو امام کہنے اور لکھنے کا سلسلہ طویل صدیوں سے جاری ہے۔ یہ تعامل و توارث[2] ہزار سال پہلے سے چلا آرہا ہے[3] جو اپنی جگہ بڑی مضبوط دلیل ہے جیسا کہ حدیث بالا سے ظاہر ہے۔

---

[1] خصائص کبریٰ ج ۲ ص ۲۱۴ بحوالۂ حاکم، اس قسم کی حدیث سنن ترمذی میں بھی ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] تعامل و توارث بے حد وزنی چیز ہے، حتیٰ کہ اگر کسی فعل پر عہد رسالت سے تعامل و توارث ہے تو اس کا کرنا واجب ہے۔ فقہائے ملت نے اس کو صراحتاً بیان فرمایا ہے۔ محقق جلیل علامہ حلبی فرماتے ہیں: الثابت بالفعل المتوارث حینئذٍ تما یفید الوجوب (کبیری صفحہ ۲۵۶) امام سرخسی نے بھی مبسوط میں اسے ذکر فرمایا ہے، مزید تفصیل کے لئے اصول فقہ کی مبسوط کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔ ۱۲ کوثر

[3] حتیٰ کہ مولوی عبدالشکور صاحب لکھنوی جن کی تحریروں میں خارجی اثرات کا شکوہ کیا جاتا ہے وہ بھی حسنین عظیمین کو امام کہتے ہیں۔ چنانچہ ترجمہ ازالۃ الخفا مسمیٰ بکشف الغطاء میں کئی جگہ ان حضرات کو امام لکھا ہے۔ مثلاً صفحہ ۱۶ میں لکھا ہے "امام حسن صلح کر لینے کے بعد" صفحہ ۲۳۹ میں لکھا ہے "حضرت امام حسن" صفحہ ۳۱ میں لکھا ہے "شہادت امام حسین" صفحہ ۳۰۸ میں لکھا ہے "امام حسن اور امام حسین" ۱۲ کوثر

امام دین کے صفات

جو شخص امام دین ہے اس میں صفات ذیل ضروری ہیں:
(۱) ایمان و یقین میں کامل ہو (۲) بڑا عبادت گذار ہو (۳) صبر اور ضبط نفس سے متصف ہو۔ (۴) صلاح و تقویٰ کے بڑے اونچے درجے پر ہو (۵) ظلم سے مجتنب ہو (۶) دینداری میں آگے ہو (۷) ہادی و رہنما ہو۔

امام دین کے یہ تمام صفات قرآن مجید میں مذکور ہیں۔ تفصیل ملاحظہ ہو:

- سورۃ السجدہ (آیت ۲۴ - پارہ ۲۱) میں صالحین بنی اسرائیل کے متعلق ہے:

وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ ٥

اور ہم نے ان لوگوں میں ایسے امام بنائے ہیں جو ہمارے حکم کی بنا پر ہدایت کرتے تھے (یہ اس وقت ہوا) جبکہ ان لوگوں نے صبر سے کام لیا اور نفس پر قابو پایا اور یہ لوگ ہماری آیتوں پر یقین رکھتے تھے۔

اس آیت میں امام کے تین اوصاف مذکور ہیں (۱) ہادی ہونا اور رہنمائی کرنا (یَھْدُوْنَ) (۲) صبر اور ضبط نفس سے متصف ہونا (لَمَّا صَبَرُوْا) (۳) ایمان و یقین میں کامل ہونا (کَانُوْا بِاٰیٰتِنَا یُوْقِنُوْنَ)۔

- سورہ انبیاء آیت ۷۳ میں حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں ہے:

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ وَكَانُوْا لَنَا عٰبِدِيْنَ ٥

اور ہم نے ان لوگوں کو امام بنایا، یہ ہمارے حکم سے ہدایت کرتے تھے اور ہم نے ان کے پاس نیک کام کرنے، نماز قائم رکھنے اور زکوٰۃ دینے کا حکم بھیجا اور یہ لوگ ہمارے عبادت گذار تھے۔

اس آیت میں منصب امامت کے دو اوصاف مذکور ہیں (۱) ہادی ہونا اور ہدایت کرنا (یَھْدُوْنَ)

(۲) بڑا عبادت گزار ہونا (کَانُوْا لَنَا عَابِدِیْنَ م ۔

● سورۂ الفرقان آیت ۷۴ میں عبادالرحمٰن کے یہ صفات بھی بیان کئے گئے ہیں :

وَالَّذِیْنَ یَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا ھَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّیّٰتِنَا قُرَّۃَ اَعْیُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِیْنَ اِمَامًا ۝	اور یہ وہ لوگ بھی ہیں جو (اللہ سے) دعا مانگتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہمیں ہماری بیویوں سے اور ہماری اولاد سے آنکھوں کی ٹھنڈک عطا فرما اور ہمیں متقیوں کا امام بنا ۔

متقیوں کا امام وہی ہوگا جو صلاح و تقویٰ کے بڑے اونچے درجہ پر ہو اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو یہ آیت بتاتی ہے کہ امام کو بڑے اعلیٰ درجہ کا متقی ہونا چاہیئے ۔

● سورۂ بنی اسرائیل آیت ۷۱ میں ہے :

یَوْمَ نَدْعُوْا کُلَّ اُنَاسٍ م بِاِمَامِھِمْ	اس دن کا تصور کرو جس دن ہم تمام انسانوں کو ان کے اماموں کے ساتھ بلائیں گے ۔

اس آیت میں امام کی ایک تفسیر "مقدم فی الدین" کی گئی ہے، یعنی امام جس کے ساتھ لوگوں کو قیامت میں بلایا جائے گا ۔ یہ وہ ہے جو دینداری میں آگے ہو ۔ (ملاحظہ ہو کشاف ج ۲ ص ۶۸۲، بیضاوی ص۳۸۴، مدارک ج ۲ ص ۲۴۹ وغیرہ) اس بنا پر آیت سے مستفاد ہوتا ہے کہ امام دین کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ دینداری میں اوروں سے آگے ہو ۔ اور یہی ہونا بھی چاہیئے کیونکہ وہ داعی[1] ہے اور ہادی بھی ہے ۔

● سورۂ بقرہ آیت ۱۲۴ (پ ۱) میں تصریح ہے کہ ظالم شخص امام نہیں ہو سکتا ۔ ارشاد ہے :

---

[1] اس آیت کی تفسیر میں حضرت ابن عباس نے اس کی تصریح بھی کی ہے کہ امام وہ ہے جو داعی رہا ہو ان کے الفاظ یہ ہیں:

بامام زمانھم الذی دعاھم فی الدنیا (خازن و بغوی ج ۴ ص ۲۷۱)	سب لوگوں کو اپنے زمانہ کے اس امام کے ساتھ بلایا جائے گا جو دنیا میں ان کا داعی تھا ۔

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

اور جب ابراہیم کو ان کے رب نے چند باتوں میں آزمایا اور امتحان لیا تو انہوں نے ہر بات کو پورا کر دکھایا۔ اب اللہ نے کہا۔ میں تم کو انسانوں کا امام بنانے والا ہوں ابراہیم نے عرض کی اور میری اولاد کو بھی یہ منصب ملے گا؟ فرمایا ظالموں کو میرا عہد (یعنی عہدۂ امامت) نہیں ملے گا۔

یہ آیت ثبوت ہے کہ ظالم شخص عہدۂ امامت کے لائق نہیں، تابعی مفسر حضرت مجاہد اس کی تفسیر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

اما من کان منھم صالحا فاجعله امامایقتدی به واما من کان ظالما فلا۔ (ابن کثیر ج ۱ ص ۱۶۷)

تمہاری اولاد میں جو شخص صلاح وتقویٰ والا ہے اس کو امام بناؤں گا، لیکن جو شخص ظالم ہے اس کو امام نہ بناؤں گا۔

حضرت مجاہد نے اس کی تفسیر میں یہ بھی لکھا ہے:

لایکون امام ظالما (ابن جریر ص ۵۳۱)

کوئی ظالم شخص امام نہ ہوگا۔

مشہور تابعی مفسر حضرت عطا نے اس کی بھی تصریح کی ہے کہ ظالم کو امام بنانا ناقابل رد ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:۔

ابی ان یجعل فی ذریته ظالما اماما (ابن جریر ۱ — ۳۵۰)

ابراہیم کی ذریت میں کسی بھی ظالم کو امام بنانا اللہ نے پسند ہی نہیں کیا، بلکہ رد کر دیا۔

قاضی بیضاوی اپنی تفسیر (صفحہ ۸۰ مطبوعہ دار التعاون مکہ معظمہ) میں اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس آیت میں انتباہ ہے کہ:

قد یکون من ذریته ظلمة وانهم لا

حضرت ابراہیم کی اولاد میں ظالم لوگ بھی ہونگے

ینالون الامامۃ، لانہا امانۃ من اللہ تعالیٰ، وعھد، والظالم لا یصلح لہا وانما ینا لہا البررۃ الاتقیاء منہم وفیہ دلیل علیٰ عصمۃ الانبیاء من الکبائر قبل البعثۃ، وان الفاسق لا یصلح لہا۔	اور ان کو امامت کا منصب نہ ملے گا کیوں کہ امامت اللہ کی ایک امانت اور ایک عہد ہے اور ظالم اس کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔ امامت تو بس انھیں لوگوں کو ملے گی جو نیک اور متقی ہیں اور اس آیت میں اس کا ثبوت ہے کہ انبیاء بعثت کے پہلے بھی کبائر سے معصوم ہوتے ہیں[لے] اور اس کا بھی ثبوت ہے کہ فاسق آدمی امامت کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا۔

لمحات فکریہ

آپ نے قرآن مجید کی ان آیتوں کو پڑھ لیا جن میں امام کے صفات ذیل بیان فرمائے گئے ہیں (۱) ایمان ویقین میں کامل ہو۔ (۲) بڑا عبادت گذار ہو۔ (۳) صبر اور ضبط نفس سے متصف ہو (۴) صلاح وتقویٰ کے بڑے اونچے درجے پر ہو۔ (۵) ظلم سے مجتنب ہو۔ (۶) دینداری میں آگے ہو۔ (۷) ہادی ورہنما ہو۔

غور کیجئے یہ صفات کن بزرگوں میں پائے جاتے ہیں؟ جن حضرات میں یہ پائے جائیں یقیناً وہ امام ہیں، اور ان کی امامت میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کیونکہ امامت کے یہ اوصاف خود قرآن مجید نے بیان فرمائے ہیں۔

یقیناً ان صفات علیا کے حاملین خلفائے راشدین، اور حضرات حسنین شہیدین اور دیگر ائمۂ دین ہیں جن میں بقیہ ائمۂ اہل بیت بھی ہیں۔ لہٰذا یہ تمام حضرات بالیقین امام ہیں اور ان کی امامت پر قرآن مجید کے بتائے ہوئے صفات امامت شواہد عدل اور دلائل ناطقہ ہیں، جن کا ماننا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے۔ اور انکار کی کہیں گنجائش ہی نہیں۔

کوئی ظالم وفاسق امام نہیں ہوسکتا

قرآن مجید نے صاف فرمادیا ہے:۔

لے اور ایسی طرح صغائر سے بھی معصوم ہوتے ہیں، جیسا کہ محققین نے تصریح کی ہے۔ ۱۲ کوثر

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ○ یعنی ظالم لوگ عہدۂ امامت نہ پائیں گے۔

لہٰذا ظالم آدمی امام ہو ہی نہیں سکتا۔ ظالم بڑا وسیع لفظ ہے۔

وہ ظالم ہے جو لوگوں پر ظلم کرے۔

وہ بھی ظالم ہے جو احکام الٰہی پر ظلم کرے۔ یعنی فسق و فجور اختیار کرے۔

لہٰذا جس طرح لوگوں پر ظلم کرنے والا لوگوں کا امام نہیں ہو سکتا، اسی طرح فاسق بھی امام نہیں ہو سکتا اور اس کو مفسرین نے صراحتہً بیان بھی کیا ہے۔ مفسر بیضاوی کی عبارت ابھی آپ پڑھ چکے ہیں، کہ فاسق آدمی امامت کی صلاحیت نہیں رکھتا، جب ستمگر اور فاسق و فاجر امام نہیں تو بداہتہً واضح ہو گیا کہ امام وہی ہے جو نہ ظالم ہو، نہ فاسق بلکہ بڑا دین دار، بڑا عبادت گزار، بڑا پاکباز، بڑا خدا ترس، بڑا نیک کردار اور بڑا پرہیز گار ہو جس کے نقش قدم پر چل کر لوگ ہدایت کی منزل پر پہونچیں۔ اور فلاح و سعادت حاصل کریں، جو حضرات ان صفات کے حامل ہیں وہی ہیں امام۔ یہ کون لوگ ہیں جیسا کہ ابھی لکھا جا چکا ہے۔

● یہ ہیں حضرات خلفائے راشدین، حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم اجمعین، ان کی خلافت راشدہ دلیل ناطق ہے کہ یہ حضرات امام ہدایت ہیں۔

● اسی طرح امام ہدایت ہیں حضرات حسنین شہیدین علیہما السلام اور ان کی وہ ذریت طاہرہ جن سے وابستہ رہنے اور ان کی راہ پکڑنے کی حدیث ثقلین میں ہدایت فرمائی گئی ہے اور حدیث میں یہ بھی بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ قرآن مجید سے کبھی ہٹتے ہی نہیں لہٰذا نہ ان سے قرآن جدا نہ یہ قرآن سے جدا، اس طرح یہ لوگ قرآن مجید کے سانچے میں ڈھل گئے ہیں، حتیٰ کہ جو ان سے وابستہ ہو جائے اور ان کی راہ پکڑ لے وہ گمراہ ہو ہی نہیں سکتا، جیسا کہ حدیث میں صراحت ہے۔

● اسی طرح امام ہدایت وہ اکابر بھی ہیں جو اعلیٰ درجے کے صالحین اور متقین ہیں کہ صلاح و تقویٰ، حسن عبادت و حسن سیرت میں ممتاز زمانہ ہیں، جن کے نقش قدم پر چل کر ہدایت کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ ایسے حضرات ہر زمانہ میں ہوئے ہیں۔ اور ان شاء اللہ ہوتے رہیں گے۔ ان میں اہل بیت

اطہار بھی ہیں، صحابۂ اخیار بھی، تابعین ابرار بھی، ائمۂ مجتہدین بھی، بلند پایہ مفسرین، محدثین اور فقہا بھی اور اہل دل صوفیۂ کرام بھی جو شریعت اور طریقت دونوں کے پیشوا ہیں۔ اور وہ عادل و منصف فرماں روا بھی جو بڑے ہی خدا ترس اور پرہیز گار ہیں، حتیٰ کہ حکومت کے پورے اسٹاف اور رعایا کو صلاح و تقویٰ کے راستے پر چلا رہے ہیں۔

یزید نہ امام ہے نہ خلیفہ قرآن مجید کے اس ارشاد کے بعد کہ "ظالموں کو عہدہ امامت نہیں ملے گا" (لَا يَنَالُ عَهْدِي الظَّالِمِينَ) ظالم اور فاسق یزید نہ امام ہے نہ خلیفہ، اور اس کی خلافت ہی باطل ہے۔ جمہور علماء کا ارشاد ہے کہ فاسق کو امامت و خلافت کا منصب دینا جائز ہی نہیں۔ امام رازی تفسیر کبیر (ج ۴ ص ۴۶ مطبوعہ بہیہ مصر) میں فرماتے ہیں۔

قال الجمهور من الفقهاء والمتكلمين ان الفاسق حال فسقه لا يجوز عقد الامامة له	جمہور فقہاء و متکلمین کا قول ہے کہ کسی فاسق کے لئے بحال فسق امامت کا انعقاد جائز ہی نہیں۔

یزید کا ظلم و فسق مشہور عالم ہے، خود حدیث نے فیصلہ کر دیا ہے کہ یہ ظالم ہے۔ فتح مکہ کے موقع پر عثمان ابن طلحہ کو بیت اللہ کی کنجی دیتے ہوئے حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا۔

خذها خالدة تالدة لا ينزعها يا بني ابي طلحة منكم الا ظالم۔	اے ابو طلحہ کی اولاد کعبہ کی یہ کنجی اپنے ہاتھ میں لو، تم سے یہ کنجی کوئی بھی نہ چھینے گا مگر وہی چھینے گا جو ظالم ہوگا۔

وہ کون ظالم ہے؟ جس نے اس خاندان سے کعبہ کی کنجی چھینی ہے، یہ ظالم صرف یزید پلید ہے۔ چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ یزید ہی نے یہ کنجی ان سے چھینی ہے، اس طرح حدیث نے دکھا دیا کہ یزید ظالم ہے۔ اس حقیقت کو قاضی سلیمان منصور پوری نے بھی رحمۃ للعالمین ج ۳

ص ۲۰۰ میں لکھا ہے۔ موصوف حدیث بالا درج کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

"مؤرخین کا بیان ہے کہ یزید پلید نے ان سے یہ کلید چھین لی تھی۔ اس کے بعد یہ ۱۳۴۳ سال کا زمانہ شاہد صدق ہے کہ کسی اور شخص نے اللہ کے رسول کی زبان سے ظالم کہلانے کی جرأت نہیں کی۔"

چونکہ یزید بحالِ فسق خلیفہ بنایا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی خلافت جائز ہی نہیں، جمہور فقہا و متکلمین کا قول ہے کہ کسی کو بحال فسق خلیفہ بنانا جائز ہی نہیں، جیسا کہ تفسیر کبیر کے حوالہ سے اوپر لکھا جا چکا ہے، مسلک حنفی کے محقق علی الاطلاق علامہ کمال الدین ابن ہمام نے المسایرہ میں اس کی تصریح کی ہے کہ جس کو خلیفہ بنایا جائے اس کا عادل ہونا شرط ہے۔ اور یہ بھی تصریح ہے کہ عادل ہونے سے مراد یہ ہے کہ صاحب ورع ہو۔ (ملاحظہ ہو ردالمحتار علامہ شامی ج ا ص ۳۶۸)

امام ابوبکر جصاص رازی (متوفی ۳۷۰ھ) جو امام سرخسی سے بھی زیادہ وسیع العلم اور دقیق النظر ہیں، بلکہ ان کے استاد شمس الائمہ حلوانی سے بھی وہ احکام القرآن ج ا ص ۸۰ میں آیت کریمہ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِينَ ۝ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

---

[1] ورع اعلیٰ درجہ کے تقویٰ کو کہتے ہیں، ورع کے چار درجے ہیں (۱) حرام سے احتراز کرنا، جس کے بغیر کوئی گواہ بھی عادل نہیں مانا جا سکتا۔ (۲) شبہ باتوں سے احتراز کرنا (۳) اس حلال سے بھی اجتناب کرنا جس سے ارتکاب حرام کا خطرہ ہو (۴) سوائے خدا سے اعراض کرنا یہ ورع صدیقین کا ہے۔ اس پر مفصل بحث احیاء العلوم میں ہے جس کا خلاصہ ردالمحتار ج ا ص ۱۰ میں بھی ہے۔

[2] حضرت مولانا عبدالحی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ مقدمہ شرح الوقایہ ص ۸ میں لکھتے ہیں کہ جصاص رازی تو شمس الائمہ حلوانی، سرخسی، بزدوی اور قاضی خاں سے قدیم تر ہیں، ان سے زیادہ بلند پایہ ہیں، ان سے زیادہ وسیع العلم اور ان سے زیادہ دقیق نکتہ بیں ہیں۔ حضرت مولانا موصوف النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر ص ۸ میں امام جصاص رازی کے متعلق امام شمس الائمہ حلوانی کا قول نقل کرتے ہیں کہ: "جصاص رازی بہت بڑے شخص ہیں، علم دین میں بڑی شہرت رکھتے ہیں، ہم ان کی تقلید کرتے ہیں۔ اور ان کا قول لیتے ہیں۔ الفاظ یہ ہیں۔

"هو رجل كبير، معروف في العلم، وانا نقلده، ونأخذ بقوله"

افادت الآية ان شرط جميع من كان في محل الائتمام في امر الدين العدالة والصلاح۔

یہ آیت افادہ کررہی ہے کہ ہر وہ شخص جو دین میں مقتدا ہونے کے مقام پر ہو اس کے امام ہونے کے لئے عدالت اور صلاح وتقویٰ ضروری شرط ہے۔

چند سطروں کے بعد تحریر فرماتے ہیں۔

فثبت بهذه الآية بطلان امامة الفاسق، وانه لايكون خليفة، وان من نصب نفسه هذا المنصب وهو فاسق لايلزم الناس اتباعه ولا طاعته۔

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ فاسق کی امامت باطل ہے۔ اور فاسق آدمی خلیفہ ہی نہیں اور اگر وہ خود سے اس منصب کو لے لے تو لوگوں پر اس کی پیروی اور اطاعت کرنا لازم ہی نہیں۔

یہ تنہا امام جصاص ہی کا قول نہیں ہے بلکہ بلند پایہ مفکرین اسلام یہی کہتے ہیں، اور ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تو لاینال عهدی الظّٰلمین ۝ کی تفسیر میں یہاں تک فرماتے ہیں۔

ليس للظالم عهد وان عاهدته فانقضه،

(تفسیر ابن جریر ۱ — ۵۳۱
وتفسیر ابن کثیر ۱ — ۱۶۷)

ظالم (خلیفہ وحاکم) کی اطاعت کا معاہدہ معاہدہ ہی نہیں اگر تم نے ایسا معاہدہ کیا ہے تو اسے توڑ دو۔

اس کی تائید حدیث ذیل سے بھی ہوتی ہے۔

سيلي امركم بعدي رجال يعرفون ما

عنقریب تم لوگوں کے امور کے فرماں روا ایسے لوگ ہوں گے جو ان کاموں کو اچھا

تنکرون، وینکرون علیکم ما تعرفون، فلا طاعۃ لمن عصی اللہ تعالیٰ۔ (جمع الفوائد) - ۳۲۴ بحوالہ احمد و معجم کبیر طبرانی)

قرار دیں گے جنھیں تم (اہل ایمان) لوگ بُرا جانتے ہو، اور ان کاموں کو برا قرار دیں گے جنہیں تم (اہل ایمان) لوگ اچھا جانتے ہو. سنو! اس کی اطاعت کرنا ہی نہیں ہے جو اللہ کا نافرمان ہے

اس کی تائید ابن ماجہ کی ایک حدیث سے بھی ہوتی ہے جو انشاء اللہ اپنے موقع پر ذکر کی جائے گی۔

حدیث بالا سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کا قول مدلل ہو جاتا ہے کہ: "ظالم خلیفہ و حاکم کی اطاعت کا معاہدہ، معاہدہ ہی نہیں، بلکہ اکابر امت نے اس پر عمل بھی کیا، بلکہ ایسے معاہدہ کو ٹھکرا دیئے[1] پر مدینہ منورہ کے صحابہ عظام اور تابعین کبار کا باہمی اتفاق ہے جسے ان کا اجماع کہا جائے تو بے جا نہیں۔ اور ان کا اجماع بڑی وزنی چیز ہے، حتیٰ کہ امام مالک انھیں کے اجماع کو اجماع کہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جب مدینہ منورہ کے صحابہ عظام اور تابعین کبار کو یزید کے فسق و فجور کا علم ہوا تو ان بزرگوں نے اس کی بیعت توڑ دی۔ یزید نے اس کا یہ انتقام لیا کہ ان ابرار و صدیقین کو قتل و غارت کرنے کے لئے اپنی سفاک فوج بھیجدی۔ اور اس نے یزید کے آرڈر کے بموجب تین روز تک مدینہ اقدس میں قتل عام کیا۔ اور غارتگری کی۔ اس سفاک فوج کے مقابلہ میں بکثرت صحابہ و تابعین اپنی جان پر کھیل گئے۔ اور مدینہ منورہ کے مقام حرہ میں جہاں یہ مقابلہ ہوا تھا بکثرت انصار و مہاجرین اور تابعین و ابرار نے جام شہادت نوش فرمایا۔ اصحاب بدر جو گزر چکے تھے، ان کے بعد اصحاب حدیبیہ ہی تمام صحابہ میں افضل تھے۔ یزیدی فوج کے اس قتل و غارت میں یہ تمام اصحاب حدیبیہ شہید ہو گئے اور اس ایمانی اصول پر قربان ہو گئے کہ "ظالم خلیفہ و حاکم کی اطاعت کا معاہدہ معاہدہ ہی نہیں اگر ایسا معاہدہ کیا ہے تو اسے توڑ ڈالو"

---

[1] ملاحظہ ہو حضرت سعید بن مسیب کا قول جو مشکوٰۃ ص ۶۵ ۴ میں مذکور ہے۔ ۱۲ کوثر

ان بزرگوں نے جان دینا گوارا کر لیا مگر یزید جیسے فاسق و فاجر کی اطاعت کا معاہدہ قائم رکھنا گوارا نہ فرمایا۔ ان کے قائد معرکہ (سیدنا حنظلہ غسیل الملائکہ رضی اللہ عنہ کے شیر دل فرزند) حضرت عبداللہ شہید رضی اللہ عنہ کا یہ ارشاد یاد رکھنے کے قابل ہے۔

واللہ ماخرجنا علی یزید	اللہ کی قسم کہ ہم لوگوں نے یزید کے خلاف
حتی خفنا ان نرمی	اس وقت قدم اٹھایا ہے جب کہ ہمیں
بالحجارۃ من السماء	ڈر ہو گیا ہے کہ اگر ایسا نہیں کرتے تو آسمان
ان رجلا ینکح امہات[1]	سے ہم پر پتھر برسیں گے۔ یہ وہ شخص ہے کہ اپنے
الاولاد والبنات والاخوات	باپ کی ام الولد لونڈیوں سے اور اپنی بیٹیوں
ویشرب الخمر، ویدع الصلوٰۃ	اور بہنوں سے منہ کالا کرتا ہے۔ شراب
(تاریخ الخلفاء ص ۱۴۶)	پیتا ہے۔ نماز چھوڑ دیتا ہے۔

اس تفصیل کے بعد یہ حقیقت آفتاب نصف النہار بن جاتی ہے کہ: خلیفہ کا عادل ہونا شرط ہے یعنی یہ ضروری ہے کہ خلیفہ ایسے شخص کو بنایا جائے جو گناہ کبیرہ سے مجتنب ہو اور گناہ صغیرہ پر مصر نہ ہو، (کہ اسے بار بار کرے) اور فاسق و ظالم آدمی خلیفہ ہی نہیں، اگر کوئی فاسق و ظالم بزور شمشیر اور بجبر و تسلط سے خلیفہ بن جائے تو امت پر اس کی اطاعت لازم ہی نہیں، بلکہ موقع مل جائے تو اس کی اطاعت کا معاہدہ توڑ دیا جائے کہ یہ معاہدہ معاہدہ ہی نہیں۔ اس سلسلہ میں علامہ خویز منداد مالکی کا یہ قول یاد رکھنے کے لائق ہے جسے مفسر ابن کثیر نے لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

الظالم لا یصلح ان یکون	ظالم آدمی نہ خلیفہ ہونے کی صلاحیت
خلیفۃ ولا حاکما، ولا	رکھتا ہے، نہ حاکم ہونے، نہ مفتی

---

[1] غالباً یہاں لابیہ کا لفظ کتابت میں چھوٹ گیا ہے کہ اسکے بغیر عبارت بے معنی ہو جاتی ہے۔ ۱۲ کوثر

مفتیا، ولا شاھدا، ولا راویا | ہونے نہ گواہ ہونے، اور نہ راوی حدیث[1] ہونے کی ۔ (تفسیر ابن کثیر ص ۱۹۵/۱)

امام جصاص رازی نے احکام القرآن ج ۱ ص ۸۲ میں لکھا ہے کہ فاسق آدمی امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی خلیفہ نہیں ہو سکتا، کہ خلیفہ کا عادل ہونا شرط ہے۔ الفاظ یہ ہیں :

لا فرق عند ابی حنیفۃ بین القاضی وبین الخلیفۃ فی ان شرط کل واحد منھما العدالۃ، وان الفاسق لا یکون خلیفۃ ولا یکون حاکما | امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس باب میں خلیفہ اور قاضی میں کوئی فرق نہیں کہ دونوں کے لئے عادل ہونا شرط ہے۔ فاسق آدمی نہ خلیفہ ہو سکتا ہے، نہ حاکم (یعنی جج اور مجسٹریٹ)

اور بڑی تفصیل سے بتایا ہے کہ جو لوگ یہ گمان کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ فاسق کی خلافت کو جائز سمجھتے ہیں۔ ان کو غلط فہمی ہو گئی ہے (اہل علم اصل کتاب دیکھیں پوری بحث قابل دید اور بے حد مفید ہے۔

یزید کو امیر المومنین کہنا جرم ہے چونکہ یزید نہ خلیفہ ہے نہ امام اس لئے خلیفہ و امام کے لقب سے اس کا ذکر کرنا یعنی اسے امیر المومنین کہنا جرم ہے حتیٰ کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے (جن کا یہ پایہ ہے کہ تمام سلاطین بنی امیہ میں انہیں کو خلیفہ راشد مانا گیا ہے، انہوں نے) اس کو بہت بڑا جرم قرار دیا ہے۔ چنانچہ جب ان کے سامنے ایک شخص نے یزید کو امیر المومنین کہا تو آپ سخت برہم ہوئے، اور فرمایا " تو یزید کو امیر المومنین کہتا ہے"۔ پھر اس جرم پر اس کو یہ سزا دی کہ بیس کوڑے لگوائے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۱۴۶)

---

[1] اس بنا پر اس کی روایت کی ہوئی حدیثیں پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ۱۲ کوثر

اگر یزید خلیفہ ہے تو خلیفۂ ظالم اور امام ہے تو امام ضلالت

حقیقت میں امام دینی مقتدا کو کہتے ہیں اور چونکہ خلیفہ بھی دینی مقتدا ہوتا ہے اس لئے اس کو بھی امام کہتے ہیں۔ ایسے خلفا حضرات خلفائے راشدین ہیں رضی اللہ عنہم اجمعین کہ یہ حضرات اسلام کے دینی شعبے کے بھی مقتدا ہیں۔ اور سیاسی صیغے کے بھی ــــ

لیکن جو خلیفہ ظالم و فاسق ہے اسے ظالم و فاسق خلیفہ کہا جائے گا۔ اور وہ امام ضلالت ہے' اسے مطلق امام کہنا غلط ہے کہ اس سے مغالطہ ہوگا، کیوں کہ مطلق امام بڑے خدا ترس، بڑے پرہیزگار بڑے عبادت گذار اور بڑے دیندار کو کہتے ہیں، جس کے نقش قدم پر چل کر ہدایت کی منزلیں طے ہوتی ہیں۔ اس حقیقت کو امام جصاص رازی نے بھی احکام القرآن ج ۱ ص ۸۲ میں بیان کیا ہے اور قرآن مجید کی روشنی پیش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جو یہ فرمایا ہے:

اِنِّیْ جَاعِلُکَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ط — میں تم کو انسانوں کا امام بنانے والا ہوں۔

تو دیکھو یہاں مطلق امام کا لفظ ہے لیکن جب ائمۂ ضلالت کا ذکر فرمایا ہے تو لفظ امام کے ساتھ کوئی قید بھی ہے۔ مثلاً جہنم کی طرف بلانے والے امام، جیسا کہ اس آیت میں ہے۔

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً یَّدْعُوْنَ اِلَی النَّارِ ط — اور ہم نے فرعون اور اس کے لشکر کو جہنم کی طرف بلانے والے امام قرار دیا۔

ان حقائق کی بنا پر یزید جس کو واقعات' تاریخ اور حدیث سبھی ظالم کہتے ہیں۔ اگر خلیفہ ہے تو خلیفۂ ظالم' اور امام ہے تو امام ضلالت' اسی لئے حدیث[1] میں اسے خلیفہ عتریف فرمایا گیا ہے عتریف کے معنی ظالم کے ہیں۔ اور یہ عفریت کا مقلوب بھی ہے۔ عفریت نہایت سرکش شیطان کو کہتے ہیں حدیث یہ ہے:

---

[1] الفائق ج ۲ ص ۵۶ میں ہے: العتریف والعتریس الغاشم وقیل ھو قلب عفریت۔ نہایہ میں ہے۔ العتریف۔ الغاشم الظالم وقیل الداھی الخبیث' وقیل ھو قلب العفریت ایسا ہی مجمع بحار الانوار میں بھی ہے۔ ۱۲ کوثر

اوہ لفراخ آل محمد من خلیفۃ یستخلف عتریف مترف یقتل خلفی وخلف الخلف۔ (الروض الباسم ج ۲ ص ۳۵[1])

آہ آل محمد کے بچو، یہ آہ اس خلیفہ کی وجہ سے ہے جو یوں ہی خلیفہ بنا لیا جائے گا ظالم خلیفہ ہوگا، بڑا ہی شیطان، میری اولاد کو قتل کرے گا اور اولاد کی اولاد کو بھی

ظالم خلیفہ وامام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شفاعت سے محروم ہے معجم کبیر واوسط طبرانی میں حضرت ابو امامہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے

صنفان من امتی لم تنلھما شفاعتی امام ظلوم غشوم وکل غال مارق

میری امت میں دو قسم کے لوگ میری شفاعت سے محروم رہیں گے، وہ یہ ہیں۔ ظالم امام اور اونچا بننے والا خارجی۔

یزید نے آل رسول پر جو ظلم کیا ہے، اس کے پیدا ہونے کے پہلے ہی حضور نے اسے بیان فرمایا ہے اور بیان کرتے وقت آپ کے منھ سے آہ نکل گئی، کتنا دل دوز ہے یہ حادثہ؟ اور اس کی بنا پر یزید حضور کی نگاہ میں اتنا مبغوض ہے کہ ارشاد فرمایا:

یزید لا یبارك الله فی یزید[2]

اللہ یزید (کی عمر) میں برکت نہ دے۔

اور ایسا ہوا کہ اللہ نے اس کی عمر میں برکت نہیں دی، چنانچہ واقعہ کربلا کے بعد صرف تین سال زندہ رہا، اس پوری مدت میں مبغوض خلائق رہا اور معاصی ہی بٹورتا گیا۔ چنانچہ مدینہ منورہ میں تین روز تک قتل عام کرایا۔ اور مسجد نبوی کی سخت بے حرمتی کرائی۔ نیز مکہ معظمہ پر فوج کشی کرائی، فوج نے کعبہ شریف پر سنگ باری اور آتش باری کی، جس سے بیت اللہ کی چوبی چھت جل گئی۔ اور حرم شریف میں خوں ریزی بھی کی جس سے بیت اللہ کی حرمت کو یزیدی حکومت پر قربان کیا گیا۔

---

[1] یہ حدیث لغات حدیث کی کتابوں میں عام طور پر مذکور ہے۔ ملاحظہ ہو۔ الفائق، نہایہ ابن اثیر۔ مجمع بحار الانوار۔ کوثر

[2] الخصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۱۳۹ ۔ ۱۲ کوثر

حدیث کی بنا پر یزید پلید کی عمر اتنی نامبارک ہوئی کہ اپنی منحوس حکومت سے کچھ متمتع نہ ہو سکا عین جوانی میں جہنم واصل ہوا۔ علامہ ذہبی نے تاریخ النبلاء میں کتنا صحیح لکھا ہے کہ :

یزید بن معاویۃ کان ناصبیا	یزید بن معاویہ بڑا ناصبی، بڑا سنگدل، بڑا سخت
فظا غلیظا جلفا، یتناول المسکر	مزاج اور بڑا اجڈ تھا، نشہ باز بھی تھا، منکرات
ولیفعل المنکر، افتتح دولتہ بقتل	کا مرتکب تھا (امام) حسین شہید کے خون
الشہید الحسین رضی اللہ عنہ	سے اپنی حکومت کا افتتاح کیا اور جنگ
واختتمہا بوقعۃ الحرۃ، فمقتہ	حرہ پر اس کا اختتام کیا جس کی بنا پر مبغوض
الناس ولم یبارک فی عمرہ	ہو گیا اور اس کی عمر میں برکت نہیں ہوئی ۔

(الروض الباسم ج ۲ ص ۳۶)

امام سیوطی نے بھی تاریخ الخلفاء ص ۲۰۶ میں علامہ ذہبی کا یہ جملہ نقل کیا ہے لم یبارک اللہ فی عمرہ یعنی اللہ نے اس کی عمر میں برکت نہیں دی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے ہی فرما چکے تھے :

یزید لا یبارک اللہ فی یزید، اللہ یزید کی عمر میں برکت نہ دے۔

اس سے اندازہ لگاؤ کہ یزید اپنے ظلم وستم اور فسق و فجور کی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نگاہ میں کتنا مبغوض ہے۔ آپ نے یہ کلمات عین اس وقت فرمائے ہیں جب آپ کو اطلاع بخشی گئی ہے کہ آپ کے فرزند حسین کو قتل کیا جائے گا۔ آپ پر اس کا اتنا شدید اثر ہوا کہ آنکھیں اشکبار ہو گئیں اور زبان اقدس پر یہ کلمات جاری ہو گئے، "اللہ یزید کی عمر میں برکت نہ دے"۔ (ملاحظہ ہو خصائص الکبریٰ ج ۲ ص ۱۳۹)

حدیث کا فیصلہ ہے کہ ایسے ظالم خلیفہ پر جنت حرام ہے، یعنی وہ جنت میں نہ جائے گا۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت معقل بن یسار رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے

مامن وال یلی رعیۃ من المسلمین	جو فرمانروا مسلمانوں کے تحفظ کا والی ہوا اور

فیموت وھو غاش لھم الاحرم اللہ علیہ الجنۃ — مسلمانوں پر ظلم کرنے کی حالت میں مرا اس کے لئے اللہ نے جنت کا داخلہ حرام کر دیا۔

حدیث کا یہ فیصلہ بتا رہا ہے کہ یزید جہنمی ہے اور اللہ نے اس کے لئے جنت حرام کر دی ہے۔

صحیح بخاری میں انھیں حضرت معقل سے یہ بھی مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

مامن عبد یسترعیہ اللہ رعیۃ فلم یحطھا بنصیحۃ لم یجد رائحۃ الجنۃ۔ (مشکوٰۃ ص ۳۲۱) — جس بندہ کو اللہ نے رعایا کا راعی بنایا اور اس نے خیر خواہی سے خبر گیری نہ کی اور تحفظ نہ کیا ایسا شخص بہشت کی خوشبو بھی نہ سونگھنے گا (یعنی جنت سے بہت ہی دور رہے گا۔)

ان دونوں حدیثوں پر غور کرو، یزید علین اس وقت مرا ہے جبکہ اس نے مکہ معظمہ پر فوج کشی کرائی ہے۔ اور اس نے حدود حرم میں مسلمانوں کو قتل کیا ہے۔ سب کو معلوم ہے کہ ٹھیک اسی ظلم و ستم کے دوران میں وہ جہنم واصل ہوا۔ حدیث کا اعلان ہے کہ اللہ نے ایسے شخص کے لئے جنت کا داخلہ حرام کر دیا ہے۔

یزید نے آل رسول کی نہ کچھ خبر گیری کی، نہ تحفظ کیا، حتیٰ کہ اس کی فوج نے کربلا میں سیدنا امام حسین علیہ السلام اور ان کے جگر پاروں اور ان کے بھائیوں اور ان کے محبوں کو تین روز تک پیاسا رکھا اور نہایت سنگ دلی سے قتل کر ڈالا۔ حدیث کا اعلان ہے کہ جو فرماں روا لوگوں کی خبر گیری اور تحفظ نہ کرے وہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا۔ اب سوچو کہ یزید اللہ کا کتنا مبغوض اور کیسا مردود جہنمی ہے۔ ایسا جہنمی کہ جنت کی خوشبو بھی نہ سونگھے گا۔ اس کے شواہد متعدد حدیثوں میں ہیں۔ مسند احمد میں ہے کہ رسول خدا صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

من ولی من امر المسلمین شیئاً — جو شخص مسلمان کے کسی بھی امر کا والی اور فرماں روا

---

[1] مشکوٰۃ ص ۳۲۱۔ کوثر

فامر علیھم احدا محاباۃ	ہوا، بھر طرفداری کی بناپر کسی کو مسلمانوں
فعلیہ لعنۃ اللہ لا یقبل اللہ	کا حاکم بنا دیا تو اس پر اللہ کی لعنت ہے،
منہ صرفا ولا عدلا حتی یدخلہ	اللہ نہ اس کا کوئی فرض قبول فرمائے گا نہ کوئی
جھنم (جمع الفوائد ص۳۲۵ ج ۱)	نفلی نیکی، حتیٰ کہ اسے جہنم میں ڈالے گا۔

غور کرو یزید نے محض عصبیت سے، حتیٰ کہ جعلی رشتہ داری کی حمایت کی بناپر عبیداللہ بن زیاد جیسے خبیث شیطان اور بے حد ظالم وسفاک کو عراق کا گورنر بنا دیا اور سارے مسلمانوں کی گردن پر مسلط کر دیا۔ حدیث کی تصریح ہے کہ جس نے ایسا کیا اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ اس کا ہر عمل برباد ہو گیا۔ اور وہ جہنمی ہے۔

ظالم خلیفہ سے قتال کرنا منع بھی ہے اور فرض بھی ہے

انفرادی طور پر ظالم خلیفہ کے خلاف جنگی اقدام کا امکان ہی نہیں، ایسی صورت میں صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں، جن حدیثوں میں ظالم خلیفہ وامام کے خلاف اقدام کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ ان سے مراد یہ ہے کہ جب تک اس سے مقابلہ کرنے والی جماعت اور طاقت مہیا نہ ہو جائے، اس وقت تک جنگی اقدام نہ کیا جائے کہ جنگی اقدام کے لئے طاقت ناگزیر ہے اگر یہ بات حاصل نہیں تو ظالم کے ظلم کو صبر اور تحمل سے برداشت کرو اور نجات کی دعا مانگو۔ البتہ جو لوگ سمجھانے کی صلاحیت رکھتے ہیں، ان پر فرض ہے کہ سمجھا کر ظلم اور برائی سے روکنے کی امکانی حد تک کوشش کریں۔ اور جن لوگوں کو اللہ نے بیداری پیدا کرنے کی صلاحیت بخشی ہے ان کا فرض ہے کہ امت میں اقامت حق وعدل کا ایسا احساس پیدا کریں کہ اس فریضہ کی ادائیگی کے لئے ایک جماعت کھڑی ہو جائے اور اس کا حلقہ اتنا وسیع اور طاقت اتنی مضبوط ہو جائے کہ خلیفہ کو حق وعدل پر مجبور کر سکے۔ اور اگر اس کا امکان نہ ہو تو ظالم خلیفہ کو معزول کر سکے ایسی جماعت اگر ایسا کرنے کے لئے تیار ہو جائے تو اس کا ساتھ دینا افراد امت کا اہم ترین فرض ہے۔ اور اس کی قیادت قبول کرنا اس شخص پر فرض ہے جو اس کے لئے مناسب ترین شخصیت ہے اور بے حد ذی اثر بھی ہے اور پبلک اس کے لئے

پر زور دعوت بھی اسے دے رہی ہے۔ اگر اس نے اس قیادت کو قبول کرنے سے انکار کیا اور اقامت حق و عدل سے جان بچائی یعنی ایسی صورت میں جب کہ ظالم خلیفہ کے خلاف اقدام نہ کرنے کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر اس نے اپنی جان کی خیر منائی تو وقت کے اہم ترین فرض کو ٹھکرا دیا کیونکہ اب صالح انقلاب کیا جا سکتا ہے۔

- یہی وہ صورت ہے جب کہ ظالم خلیفہ سے جہاد کرنا فرض ہو جاتا ہے اور اسے قطعاً گوارا نہیں کیا جا سکتا کہ کوئی ظالم و فاسق آدمی خلافت رسول کی مسند پر بیٹھا رہے۔
- یہی وہ صورت ہے کہ جب ظالم خلیفہ کی خلافت توڑنے کے لئے کسی ایسے کو امام بنانا اور اس کی بیعت کرنا فرض ہے جو ایمان، صلاح و تقویٰ، اولوالعزمی اور اثر و اقتدار میں اوروں پر فائق ہو۔
- اور یہی وہ صورت ہے کہ جب ان صفات کے آدمی کو قیادت کی دعوت دی جائے تو اسے قبول کرنا اس کا فرض ہو جاتا ہے۔

امام حسین علیہ السلام اور اقامت حق و عدل کی امامت کی منظوری

ایسی ہی صورت میں سیدنا امام حسین علیہ السلام نے امامت حق و عدل کی وہ امامت قبول فرمائی جس کا ایک مقصد یہ ہے کہ ظالم خلافت کو مٹا کر خلافت حقہ و راشدہ قائم کی جائے اس کے لئے اہل عراق نے آپ کو ڈیڑھ سو دعوتی خطوط بھیجے اور لکھا کہ ایک لاکھ آدمی آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ جلد تشریف لا کر خلافت حقہ و راشدہ قائم فرمائیے۔ آپ کے سوا کسی کو ہم لوگ امام نہیں مان سکتے۔

اب اس قیادت کا قبول کرنا آپ کا فرض ہو گیا تھا۔ صرف ایک مرحلہ رہ گیا تھا اطمینان کر لیا جائے کہ یہ لوگ ثابت قدم رہیں گے یا نہیں۔ اس کی تحقیق کے لئے آپ نے اپنے چچیرے بھائی حضرت مسلم رضی اللہ عنہ کو کوفہ بھیجا اور کوفہ والوں کو لکھا کہ:

"تم لوگوں کے خطوط سے تمہاری خواہش معلوم ہوئی، میں اپنے بھائی مسلم

بن عقیل کو تحقیق حال کے لئے بھیجتا ہوں، اگر واقعی تم لوگ میری خلافت پر متفق ہو تو مسلم مجھے اطلاع دیں گے، اس کے بعد میں کوفہ آؤں گا۔"

حضرت مسلم کے کوفہ پہنچنے پر کوفہ والوں نے بڑی سرگرمی دکھائی۔ اور اٹھارہ ہزار آدمیوں نے بیعت کی۔ تیس ہزار بلکہ چالیس ہزار تک بیعت کرنے والوں کی تعداد بتائی گئی ہے۔ غالباً شروع میں ۱۸ ہزار تھے۔ حضرت مسلم نے امام علیہ السلام کو یہ رپورٹ تحریر کی، اور لکھا کہ حالات موافق ہیں آپ تشریف لایئے۔ اب آپ کا اقامت حق و عدل اور خلافت راشدہ و حقہ کے قیام کے لئے کوفہ تشریف لے جانا فرض ہو گیا، تاکہ دین کا نظام درست فرمائیں۔ سنت کو زندہ کر دیں۔ اسلامی معاشرہ اپنی صحیح لائن پر آ جائے۔ دین پر جو سیاسی تسلط ہو گیا تھا دین اس سے آزاد ہو جائے۔ امت مسلمہ فاسق و ظالم یزید اور اس کے گمراہ اسٹاف کے ظلم و عدوان کے پنجے سے چھوٹ جائے۔ محرمات الٰہی کو حرام ٹھہرانے والے الحاد کا قلع قمع ہو جائے۔ انھیں باتوں کے لئے آپ مکہ معظمہ سے کوفہ روانہ ہوئے۔ اس حقیقت کو خود آپ نے بیان فرمایا ہے، چنانچہ ورود کربلا سے پہلے مقام بیضہ میں حر کی فوج کے سامنے آپ نے جو خطبہ دیا ہے اس میں فرماتے ہیں :-

ایہا الناس ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ قال: من رأی سلطاناً جائراً مستحلاً لحرم اللہ، ناکثاً لعہد اللہ مخالفاً لسنۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعمل فی عباد اللہ بالاثم والعدوان، فلم یغیر ما علیہ بفعل ولا قول کان حقاً علی اللہ ان یدخلہ مدخلہ	لوگو! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو بادشاہ ظالم ہو محرمات الٰہی کو حلال ٹھہرانے والا ہے، اللہ کے عہد کو توڑنے والا ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا مخالف ہے اور بندگان خدا پر ظلم و عدوان کے ساتھ حکومت کرتا ہے، ایسے بادشاہ کو جس نے دیکھا اور قولاً و عملاً ان افعال کو مٹانے کی کوشش نہیں کی، تو اللہ کو حق ہے کہ اس شخص کو بھی اس بادشاہ کے ساتھ اس کے

اَلَا وَاِنَّ ھٰؤُلاءِ قد لزموا طاعۃ الشیطان وترکوا طاعۃ الرحمٰن، واظھروا الفساد، وعطلوا الحدود، واستأثروا بالفیٔ واحلوا حرام اللہ وحرموا حلالہ، وانا احق من غیری ۔

(الکامل ابن اثیر ۴ ـ ۴۰ و ۴۱)

مقام جہنم میں داخل کردے ۔

لوگو! خبردار ہوجاؤ کہ ان لوگوں نے شیطان کی اطاعت پکڑی اور رحمان کی اطاعت چھوڑ دی ملک میں فساد پھیلایا، حدود الٰہی کو معطل کردیا۔ مال غنیمت میں اپنا حصہ زیادہ لیتے ہیں۔ اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو حلال اور حلال کی ہوئی چیزوں کو حرام کردیا ہے اور مجھے ان کے منکرات مٹانے کا حق دوسروں سے زیادہ ہے۔

آپ[1] نے اس خطبہ میں پوری وضاحت سے روشنی ڈالی ہے کہ دین کا نظام اور اقامت حق و عدل بے حد اہم اور نہایت ضروری ہیں حتیٰ کہ ان کو نظر انداز کردینا جہنم میں جانے کا موجب ہے ۔

اس خطبہ سے اس کی بھی وضاحت ہوجاتی ہے کہ اس زمانہ میں بلکہ اس کے پہلے ہی سے یزید اور اس کے متبعین کا معمول زندگی یہ تھا ۔

۱ ۔ اللہ کی اطاعت سے واسطہ نہ تھا ۔

۲ ۔ شیطان کی اطاعت لازم کرلی گئی تھی ۔

۳ ۔ یہ لوگ فساد ہی کرتے تھے ۔

۴ ۔ حدود اسلامی اور احکام الٰہی کو معطل کردیا تھا ۔

۵ ۔ مال غنیمت کے شرعی مصارف کا نظام بگاڑ دیا تھا ۔ اور اس میں سے خود اتنا کچھ لے لیتے تھے جتنا لینے کا انھیں حق ہی نہ تھا ۔

۶ ۔ حلال و حرام کے شرعی حدود توڑ دیئے تھے ۔ چنانچہ جو چیزیں اور جو کام اللہ نے حرام کردیئے

---

[1] اس خطبہ میں آپ نے جو حدیث بیان فرمائی ہے اس کی تعلیم سیاست اسلامی کی روح رواں ہے ۔ ۱۲ کوثر

تھے انھیں حلال بنا لیا تھا اور جو چیزیں اور جو کام اللہ نے حلال کئے تھے انھیں حرام بنا لیا تھا۔

۷۔ اللہ نے (قرآن میں) مسلمانوں سے جو معاہدے لئے ہیں ان کی پابندی کتنی ضروری اور اہم ہے، لیکن ان لوگوں نے ان معاہدوں کو توڑ ڈالا اور ان کی کچھ پروا نہ کی۔

۸۔ بندگان خدا کے ساتھ ان کا معاملہ یہی تھا کہ ظلم اور زیادتی کرتے تھے۔

۹۔ سنّت رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کے لئے زندگی کا جو دستور العمل بنا دیا تھا اس کو انہوں نے یکسر نظر انداز کر دیا تھا۔ اس طرح ان کے یہاں عملاً سنت رسول کی کوئی حیثیت ہی نہ تھی چنانچہ سنت رسول ان کے یہاں متروک اور مردہ تھی۔

غور کرو دین کی کیسی پامالی ہو رہی تھی؟ کیا ایسی صورت میں امام علیہ السلام یزید کی خلافت کے سامنے سر جھکا دیتے؟ اور اس کی اطاعت کرتے؟ ہرگز نہیں۔ واللہ ہرگز نہیں! حضرت ابن مسعود کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

سیلی امورکم بعدی رجال یُطفِئونَ السنۃ، و یَعملُونَ بالبدعۃ، ویوخرون الصلوٰۃ عن مواقیتھا، قلت : یا رسول اللہ ان ادرکتھم کیف افعل؟ قال: تسئلنی یا ابن

عنقریب تم لوگوں کے امور کے فرماں روا ایسے لوگ ہوں گے جو سنت کو کنارے رکھ دیں گے اور بدعت[1] پر عمل کریں گے۔ نماز کا وقت گزر جانے کے بعد نماز پڑھیں گے (حضرت ابن مسعود کہتے ہیں کہ) میں نے گذارش کی یا رسول اللہ اگر میں ایسے لوگوں کا زمانہ پاؤں تو کس طرح عمل کروں؟ آپ

---

[1] بدعت کی تشریح خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ بدعت وہ کام ہے جس میں گمراہی ہے یعنی حق سے دوری ہے۔ اور وہ کام ہے جو اللہ و رسول کو پسند ہی نہیں۔ حدیث کے الفاظ یہ ہیں۔ من ابتدع بدعۃ ضلالۃ لا یرضاھا اللہ ورسولہ کان علیہ من الاثم مثل آثام من عمل بہا لا ینقص ذالک من اوزارھم شیئاً۔ (رواہ الترمذی وابن ماجہ مشکوٰۃ ص ۳۰ ومثلہ عند المنذری ج ۱ ص ۸۷)

امّ عبد کیف تعمل ؟ لا طاعة لمن عصی اللّٰہ
(جمع الفوائد ۱ - ۳۲۴)

نے فرمایا اے ابن مسعود تم پوچھتے ہو کہ کس طرح عمل کروں ؟ سنو! اللہ کی نافرمانی کرنے والے کی اطاعت ہی نہیں !

اب ظالم و فاسق یزید کو خلیفہ ماننے اور اس کی اطاعت کرنے کی کوئی بھی وجہ جواز نہیں۔ بلکہ ہزاروں مسلمان اگر اس کے خلاف محاذ قائم کرنے کے لئے تیار ہو جائیں، تو اور مسلمانوں کو ساتھ دینا فرض ہے۔ اور اگر یہ لوگ کسی ایسے شخص کو اپنا قائد و امام منتخب کریں جو قیادت و امامت کے لئے سب سے مناسب ترین شخصیت ہے اور بے حد ذی اثر بھی ہے تو اس کا فرض ہے کہ امامت و قیادت قبول کر کے خلافت حقہ و راشدہ قائم کرنے اور ظالم و فاسق یزید کی خلافت مٹانے کے لئے جہاد کرے۔ صحیح مسلم (ج ۱۔ ص ۵۲) میں ایک حدیث ہے جو انشاء اللہ جلد ہی مذکور ہو گی۔ اس سے یہ مستفاد ہوتا ہے کہ اس قسم کا جہاد اعلیٰ درجہ کے ایمان کا ثبوت ہے اور یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ اس قسم کے جہاد کے بغیر اقامت حق و عدل ہو ہی نہیں سکتی اس زمانہ میں اقامت عدل کے لئے خلیفۂ ظالم و فاسق کے خلاف جہاد کرنا وقت کا سب سے اہم فریضہ تھا جس کے لئے سیدنا امام حسین علیہ السلام نے وہ اولوالعزمی پیش کی ہے جس کی مثال پوری تاریخ اسلام میں نہیں، درحقیقت یہ اولوالعزمی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد گرامی کا مصداق جلیل ہے جو آپ نے اپنے ارتحال سے کچھ پیشتر فرمایا تھا کہ

"میں نے حسین کو اپنی شجاعت بخشی" (یہ حدیث مع حوالہ گذر چکی ہے)

ظالم و فاسق خلیفہ کے خلاف جہاد کرنا دیگر ائمہ کی طرح امام ابوحنیفہ کے نزدیک بھی اتنا اہم ہے کہ آپ اس کی نفلی حج سے ۵ یا ۷ گنا زیادہ ثواب والا کام فرماتے ہیں۔ چنانچہ جب حضرت نفس زکیہ (محمد بن عبداللہ بن حسن بن علی علیہ السلام) منصور عباسی کے ظلم و تعدی کے خلاف اٹھے اور ان کے بھائی حضرت ابراہیم نے عراق میں اس مہم کو شروع کیا تو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ان کا ساتھ دینے کی لوگوں کو ترغیب دیتے تھے۔ اور ان کا ساتھ دیکر خلیفۂ وقت کے خلاف خروج کرنے

کو نفلی حج سے ۵۰ یا ۷۰ گنا زیادہ ثواب کا کام قرار دیتے تھے[1]

بلکہ اس جہاد کو وہ کافروں سے جہاد کے مقابلہ میں زیادہ اہم سمجھتے تھے، کیونکہ فاسق و ظالم خلیفہ جو مسند رسول پر بیٹھ کر دین اور اس کے نظام کو تباہ کر رہا ہے اس کو اس جگہ سے ہٹا کر دین اور نظام ملت کو تباہی سے بچانے کی کوشش کرنا جہاد کفار سے کہیں افضل ہے۔

چنانچہ جب ابو اسحاق فزاری نے امام ابو حنیفہ سے شکایت کی کہ آپ نے میرے بھائی کو ابراہیم کے ساتھ خروج کرنے کا مشورہ دیا، جس کی بنا پر وہ جان سے مارا گیا، تو آپ نے فرمایا۔

"تو نے کفار سے جو جہاد کیا ہے اس سے بہتر تیرے بھائی کا خروج ہے جو اس نے ابراہیم کی معیت میں منصور کے خلاف کیا ہے"

امام ابوبکر جصاص نے اس کو ان مختصر الفاظ میں نقل کیا ہے۔

مخرج اخیك احب الی من مخرجك (احکام القرآن ج ۱ ص ۸۱)

تم نے (جہاد کے لئے) جو خروج کیا تھا اس کی نسبت تمہارے بھائی کا یہ خروج مجھے زیادہ پسند ہے۔

یہ واقعات شواہد عادلہ ہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ ظالم و فاسق خلیفہ کے خلاف اقدام و خروج کو نہایت ضروری سمجھتے تھے۔ اور آپ کا مذہب یہی ہے کہ ظالم خلیفہ سے قتال کرنا بہت ہی اہم ہے۔ امام ابوبکر جصاص رازی احکام القرآن ج ۱ ص ۸۱ میں لکھتے ہیں:

وکان مذهبه مشهورا فی قتال الظلمة وائمة الجور ولذالك قال الاوزاعی: احتملنا اباحنيفة کل شیٔ حتیٰ جاءنا بالسيف يعنی قتال الظلمة فلم نحتمله وکان

ظالم اشخاص اور خلفائے جور کے خلاف قتال کرنے میں آپ کا مذہب مشہور ہے۔ اسی لئے اوزاعی نے کہا ہے کہ ہم نے ابو حنیفہ کی ہر بات برداشت کی، لیکن جب وہ تلوار نکال لائے یعنی ظالموں سے قتال کو کہا تو ہم اسے برداشت نہ کر سکے۔

---

[1] مناقب الامام الاعظم کردری ۲۔ ۷۱ ومناقب الامام الاعظم موفق کی ۲: ۸۳ ۔ کوثر

من قولہ: وجوب الامر بالمعروف والنھی عن المنکر فرض بالقول فان لم یؤتمر لہ فبالسیف، علی ما روی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم۔

آپ کا قول ہے کہ نیکی کا حکم دینا اور بری بات سے روکنا واجب ہے اور فرض ہے کہ پہلے زبان سے یہ فریضہ ادا کیا جائے، اگر اسے نہیں مانا گیا تو تلوار سے کام لیا جائے جیسا نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

امام صاحب کا یہ نقطۂ نظر تمام تر قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے، مگر چونکہ اس میں جان کا ڈر ہے اس لئے جان کی خیر منانے والوں کو بڑا شاق گذرتا ہے، اور جو محدثین دوراندیش نہیں ہیں وہ ظالم خلیفہ سے قتال کو برا سمجھتے ہیں جس سے اس کو بڑا نقصان پہونچا۔ امام جصاص رازی آپ کے اس نقطۂ نظر کو تاریخی شواہد کے ساتھ پیش کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔

وھذا انما انکرہ علیہ اغمار اصحاب الحدیث الذین فقد بھم الامر بالمعروف والنھی عن المنکر حتی تغلب الظالمون علی امور الاسلام۔

(احکام القرآن ۱ - ۸۱)

یہ (یعنی ظالم خلیفہ سے قتال جسکے قائل امام ابوحنیفہ بھی ہیں) وہ بات ہے جس کو ناتجربہ کار علمائے حدیث نے برا سمجھا ہے اور انھیں کی وجہ سے اچھی بات کے حکم دینے اور بری بات سے روکنے کا فقدان ہوگیا۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ ظالم لوگ امور اسلام پر غالب ہوگئے۔ (اور من مانی کرتے ہیں)۔

ان محدثین پر حیرت ہے کہ انھوں نے ظالم خلیفہ سے قتال کرنے کو کیوں برا سمجھا، حالانکہ حدیث میں اس کی بڑی اہمیت بتائی گئی ہے۔ صحیح مسلم (ج ۱ ص ۵۲) میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:—

مامن نبی بعثہ اللہ تعالیٰ فی امۃ قبلی الا کان لہ من امتہ حواریون واصحاب یاخذون

مجھ سے پہلے بھی جس نبی کو اللہ نے کسی امت میں بھیجا ہے اس کے بھی حواری اور اصحاب تھے جو اس کی سنت کو لیتے تھے اور اس کے حکم کی پیروی

بسنته ویقتدون بامرہ، ثم انہا تخلف من بعدھم خلوف یقولون مالا یفعلون، و یفعلون مالا یومرون، فمن جاھدھم بیدہ فھو مومن، ومن جاھدھم بلسانہ فھو مومن ومن جاھدھم بقلبہ فھو مومن ولیس وراء ذالک من الایمان حبۃ خردل۔

کرتے تھے. پھر یہ بات ہے کہ اصحاب وحواری کے بعد ان کی جگہ ایسے لوگ ہوتے ہیں اور ہونگے جو ایسی بات بولیں گے جن پر ان کا عمل نہیں اور ان باتوں پر عمل کریں گے جن کا انھیں حکم نہیں دیا گیا ہے۔ ایسے لوگوں سے جو آدمی ہاتھ سے جہاد کرے وہ مومن ہے اور جو شخص زبان سے جہاد کرے وہ بھی مومن ہے اور جو آدمی دل سے جہاد کرے (یعنی دل سے بُرا مانے) وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان نہیں عہ

ظالم وفاسق خلیفہ سے جہاد کرنے پر اجماع

حدیث میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی اچھی بات کے حکم دینے اور بُرے کام سے روکنے) کی تین صورتیں بیان کی گئی ہیں (۱) ہاتھ سے کام لیا جائے، (۲) زبان سے سمجھا یا جائے۔ (۳) دل سے بُرا سمجھا جائے، ان میں اعلیٰ درجہ کی صورت یہ ہے کہ ہاتھ سے کام لیا جائے۔ یعنی زبانی فہمائش بے سود ہو جائے تو ہاتھ سے کام لیا جائے۔ اس کو حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے جس طور پر بیان فرمایا ہے، اسے سُنئے، امام جصاص رازی روایت کرتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کا قول ہے:

الامر بالمعروف والنہی عن المنکر فرض بالقول فان لم یوتمر لہ

پہلے زبان سے نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا فرض ہے اگر اسے نہیں قبول کیا گیا تو

عہ اس حدیث کی تشریح انشاء اللہ آگے آئے گی۔ ۱۲ کوثر

فبالسیف علی ماروی عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تلوار سے کام لیا جائے[1] جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔

آخری جملہ بتا رہا ہے کہ امام صاحب کے قول کا مأخذ حدیث نبوی ہے۔

اس حدیث پر سیدنا امام حسین علیہ السلام اور حضرت عبداللہ بن زبیر اور مدینہ کے ان تمام صحابہ وتابعین رضی اللہ عنہم نے عمل کیا ہے جو جنگ حرہ میں شریک ہوئے تھے۔ اور یزیدی حکومت سے قتال کیا تھا۔ اور چونکہ جنگ حرہ میں شریک ہونے والے صحابہ تابعین کا باہمی اتفاق ہے کہ اس ظالم خلیفہ کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے۔ اس لئے اس قتال کی مشروعیت پر ان کا متفقہ فیصلہ ہے۔ اور چونکہ آج تک کسی نے بھی ان کے اس اتفاق اور متفقہ قتال کو خلاف شرع نہیں کہا ہے۔ لہٰذا ظالم خلیفہ سے قتال پر امت کا اجماع ہو گیا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ظالم و فاسق خلیفہ کے خلاف جہاد و قتال پر امت کا اجماع ہے۔

اور اجماع کے خلاف کسی کا قول معتبر نہیں۔

ظالم و فاسق خلیفہ سے جہاد کرنا سب سے افضل جہاد ہے

جن خوبیوں کی بنا پر امت محمدیہ (علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام) کو بہترین امت فرمایا گیا ہے، ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر (یعنی نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا) بہت اہمیت رکھتے ہیں۔

---

[1] یہ صورت اس وقت ہے جبکہ ایک جمعیت ساتھ ہو۔ اسی لئے امام حسین علیہ السلام اس وقت تک یزید کی حکومت کے خلاف کھڑے نہیں ہوئے، جب تک عراق کی بڑی جماعت انقلاب کے لئے آمادہ نہیں ہو گئی۔ جب ان لوگوں نے اتنی مستعدی دکھائی کہ یزیدی حکومت کا تختہ الٹنے کے لئے ڈیڑھ سو خطوط بھیجے اور لکھا کہ ایک لاکھ آدمی اس کام کے لئے تیار ہیں تو امام علیہ السلام نے تحقیق حال کے لئے حضرت مسلم کو بھیجا انھوں نے جب خط لکھا کہ صورت حال موافق ہے۔ تب آپ اس کے لئے کھڑے ہوئے اور کوفہ روانہ ہوئے لیکن افسوس کہ اہل کوفہ نے غداری کی۔ ۱۲ کوثر۔

قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّۃٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰہِ، (آلِ عمران آیت ۱۱۰)

تم لوگ وہ بہترین امت ہو جسے لوگوں (کی اصلاح و ہدایت) کے لئے ظہور میں لایا گیا ہے، تم لوگ نیکی کا حکم دیتے ہو اور بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت کی تفسیر میں مفسر نسفی نے حدیث ذیل لکھی ہے۔

من امر بالمعروف ونھی عن المنکر فھو خلیفۃ اللہ فی ارضہ وخلیفۃ کتابہ وخلیفۃ رسولہ

جو شخص نیکی کا حکم دے اور بدی سے روکے وہ زمین پر اللہ کا، اس کی کتاب کا اور اللہ کے رسول کا خلیفہ ہے۔

اب اندازہ لگاؤ کہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر اسلام کی کتنی عظیم الشان خدمت ہے اور جو اسے انجام دے، درحقیقت وہی خلیفہ ہے، کہ خلافت کا ایک بڑا مقصد اس خدمت کو انجام دینا ہے۔ قرآن مجید (سورۃ الحج آیت ۴۱ میں) مسلمانوں کے یہ صفات بیان فرماتا ہے۔

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ ط

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انھیں زمین میں اقتدار بخشیں تو نماز قائم کریں گے، زکوٰۃ دیں گے، نیکی کا حکم دیں گے اور بدی سے روکیں گے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ایک صورت جہاد بن جاتی ہے وہ یہ ہے کہ ظالم خلیفہ کو نیکی کا حکم دیا جائے اور برائی سے روکا جائے، بلکہ یہ سب سے افضل جہاد ہے، مسند احمد، سنن نسائی سنن ابن ماجہ معجم کبیر طبرانی اور شعب الایمان بیہقی میں حدیث ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

افضل الجھاد کلمۃ حق عند سلطان

سب سے افضل جہاد ظالم حکمران

جائز (الجامع الصغیر ۱-۴۱) کے پاس حق بات بولنا ہے۔

اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ اسلام کا ایک بڑا مقصد انسانی معاشرہ سے برائیوں کو مٹانا اور بھلائیوں کا پھیلانا ہے، ہر مسلمان کا فرض ہے کہ بھلائی کو پھیلائے اور اس کی حمایت کرے نیز برائی کو مٹائے اور غلط اور مضر کام کئے جائیں تو ان کو روکنے کے لئے پوری کوشش صرف کر دے۔ اگر خود خلیفۂ وقت اور بادشاہ ناروا کام کر رہے ہیں تو اس کا اثر تمام ملک پر پڑے گا اور ڈر ہے کہ اگر اس کے روکنے کے لئے امکانی حد تک کوشش نہ کی جائے گی تو پورا اسلامی معاشرہ متاثر ہوتے ہوتے بہت سے کاموں اور باتوں میں اسلام کے خلاف روش اختیار کرے گا۔ اس کا انسداد بے حد ضروری ہے ورنہ اسلام عملاً متروک ہو جائے گا۔ لہٰذا خلیفہ و بادشاہ کے فسق و فجور ظلم و عدوان اور ان کے ناروا افعال کو روکنے کے لئے قدم اٹھانا وقت کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ اسی لئے حدیث نے اس کو سب سے افضل جہاد کہا ہے۔

خلیفہ و بادشاہ اگر راہ راست پر نہ آئیں تو فہمائش کے زبانی جہاد کے بجائے قتال والا جہاد ناگزیر ہے۔ یعنی خلیفہ کو تخت حکومت سے اتار دینا چاہئے۔ (یہ اس وقت ہے جبکہ ایسے اقتدار اور طاقت والی جماعت ساتھ ہو، بلکہ اس کی داعی ہو) ورنہ مسلم معاشرہ عملاً اسلام کا تارک ہو جائے گا۔ اسی لئے امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں۔

الامر بالمعروف والنهی عن المنكر فرض بالقول، فان لم يوتمر له فبالسيف، علی ماروی عن النبی صلی الله عليه وسلم (احکام القرآن جصاص ۱-۱۸)	پہلے زبان سے نیکی کا حکم دینا اور بدی سے روکنا فرض ہے، اگر اسے نہ مانا جائے تب تلوار سے کام لیا جائے[1] جیسا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت ہے۔

---

[1] یہ تسلط والی طاقت کے مقابلہ میں ہے، مثلاً خلیفہ و بادشاہ کے مقابلہ میں، اور تلوار سے کام لینے کا مقصد یہ ہے کہ اس کا تسلط توڑ دو اور تخت حکومت سے اتار دو، لیکن یہ صورت اسی وقت ہے جب کہ حکومت کا تختہ الٹنے والی جماعت اور طاقت موجود ہو۔ ۱۲ کوثر

اس قسم کی ایک حدیث سنن ابی داؤد (ج ۲ ص ۲۴۰) میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے :

كلا واللہ لتامرن بالمعروف ولتنهون عن المنكر، ولتاخذن على يد الظالم، ولتاطرنه على الحق اطرا، ولتقصرنه على الحق قصرا او ليضربن الله بقلوب بعضكم على بعض، ثم ليلعنكم كما لعنهم،	دھیان سے سنو! تم لوگ ضرور نیکی کا حکم دینا اور ضرور بدی سے روکنا اور ضرور ظالم کے ہاتھ پکڑ لینا، اور ضرور حق کی طرف ظالم کو موڑنا اور ضرور حق کے گھیرے میں اسے محدود کرنا، ورنہ قسم ہے کہ اللہ تعالیٰ تم لوگوں کے دل باہم ٹکرا دے گا اور اس کے بعد تم پر لعنت نازل کرے گا جیسا کہ یہود پر لعنت نازل کی ہے ۔

یہ نظریہ حد درجہ غلط ہے کہ "ظالم خلیفہ کچھ بھی کرے اس کے خلاف جہاد کا قدم نہیں اٹھانا چاہیے۔ اور صبر سے کام لے کر بیٹھ رہنا چاہیئے ۔ اگر کوئی جہادی اقدام کیا گیا تو یہ بغاوت ہے"۔ حدیث بالا پڑھو، کہاں یہ بات کہ ظالم و فاسق خلیفہ کے خلاف بھی جہاد کرنا بغاوت اور گناہ ہے ۔ اور کہاں حدیث کا یہ اعلان کہ جو شخص ایسے فاسق و ظالم کے خلاف اقدام نہ کریگا اس پر اللہ کی لعنت نازل ہو گی ۔ اب اس میں کیا شبہ کہ ظالم خلیفہ کے خلاف جہاد کرنے کو گناہ اور بغاوت سمجھنا اسلام کے خلاف نظریہ ہے ۔ حقیقت میں یہ تو اسلام کے نظام حق و عدل کی پامالی دیکھتے ہوئے بے حس بن جانے کا نظریہ ہے ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ مسلم معاشرہ میں خلیفہ و بادشاہ کے ذریعہ کوئی بگاڑ پیدا ہو جائے اور وعظ و پند و نصیحت اور فہمائش سے اس کا علاج نہ ہو سکے تو پھر اس کے علاج کی کوئی صورت ہی نہیں ۔ اور تخت خلافت الٹنے کی کارروائی ممنوع ہے ۔ کیا اندھیر ہے کہ صورت حال بگڑتی چلی جائے، مسلم معاشرہ بد سے بدتر ہوتا چلا جائے مگر انقلاب کی اجازت ہی نہیں، حتیٰ کہ جو چیز جہاد ہے وہ اس نظریہ کے رو سے گناہ اور بغاوت ہے ۔

اس بے حد مضر نظریہ نے دین کے ان خدام اور مجاہدین ملت کو باغی قرار دیا جنہوں نے ظالم خلیفہ کے ظلم و ستم اور فسق و عدوان کے خلاف جہاد کر کے نظام حق و عدل کو زندہ کرنے کی کوشش کی۔ اور اس راہ میں شہید ہو کر دین کی لاج رکھ لی۔ یہ ہیں دین کے محافظ، اللہ کے محبوب اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے وہ مجاہدین جن کی رگوں میں حمزہ کا جوش جہاد، حیدر کا خیبر شکن حوصلہ، اور خالد کی شان سیف اللہی کام کر رہی ہے۔ اگر ان کا یہ جہاد بغاوت ہے تو سن لو کہ اس بغاوت پر ہزاروں تہجد گذار دن کی عبادت قربان!

یہ بغاوت نہیں، جہاد ہے، ظلم کے خلاف جہاد، فسق و فجور کے خلاف جہاد، عدوان و طغیان کے خلاف جہاد، ظالم خلیفہ کے خلاف جہاد۔!

حدیث مذکورہ بتا رہی ہے کہ اگر ظالم کا ہاتھ نہ پکڑا جائے گا۔ اگر اسے حق کی طرف نہ موڑا جائے گا، اگر اسے حق کے گھیرے میں محدود نہ کیا جائے گا تو اچھوں کے قلوب بھی فاسقوں کے قلوب میں مل جائیں گے اور ایک دوسرے سے ٹکراتے رہیں گے۔ پھر اللہ کی لعنت نازل ہوگی۔ حدیث مذکور پڑھو اور بار بار پڑھو! اور قدر کرو ان اسلاف کرام کی جنھوں نے اس جہاد کے لئے قدم اٹھایا۔ اور اسلام کی لاج رکھ لی، ان تمام مجاہدین کے امام سیدنا امام حسین علیہ السلام ہیں اور آپ ہی اس راہ کے پہلے امام ہیں۔ باقی اس جہاد کے تمام مجاہدین آپ کے متبعین ہیں۔

ان بزرگوں نے ظالم خلیفہ سے جہاد اور خلافت حقہ راشدہ کا قیام بے حد ضروری سمجھا ہے۔ ایمانی جذبہ و عقل و ہوش ہوتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے؟ کہ یہ دونوں چیزیں ضروری نہیں، وہ لوگ بصیرت سے یکسر محروم ہیں جو ان مجاہدین کرام کے اس جہاد کو جو افضل ترین جہاد ہے بغاوت جیسے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور ان بہترین انسانوں کو گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ ان کی یہ قرارداد بہت بڑا ظلم ہے مجاہدین اسلام پر ظلم! بلند پایہ شہیدوں پر ظلم! حضرت سید الشہداء نبی کے لال، رسول کے لخت جگر، جنت کے سردار، سیدنا امام حسین علیہ السلام پر ظلم! اس ظلم کو ہر زمانہ کے ائمہ دین نے بے حد قابل نفرین سمجھا ہے۔ اہل حدیث اور مقلدین دونوں نے اس ظلم کا ارتکاب کرنے والوں کو گمراہ کہا ہے۔ اہلحدیث کے نہایت بلند پایہ محدث و مفسر و مورخ نواب صدیق حسن خاں (م ۱۳۰۷ھ) التاج المکلل

ص ۵۴۳ مطبوعہ شرف الدین کتبی و اولادہ) میں لکھتے ہیں کہ :

"حافظ ابو الحسن ہیثمی مؤرّخ ابن خلدون کو بہت زیادہ گراتے تھے، حافظ ابن حجر نے موصوف سے اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا: مجھے اطلاع ملی ہے کہ ابن خلدون نے سبط رسول حسین رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ کہا ہے: انہ قتل بسیف جدہ ۔ یعنی حسین تو اپنے نانا کی تلوار سے قتل کئے گئے (یعنی بغاوت میں مارے گئے۔) حافظ ہیثمی (جو حدیث کے نہایت بلند پایہ امام اور حافظ ابن حجر کے استاد ہیں) ابن خلدون کے اس قول کو پیش کرنے کے بعد ابن خلدون پر لعنت کرنے لگے۔ اس وقت آپ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔

حافظ ابن حجر کہتے ہیں، تاریخ ابن خلدون میں یہ جملہ نہیں ملتا، ابن خلدون نے اپنی تاریخ کے اس نسخہ میں یہ کہا ہوگا جس سے اس نے رجوع کرلیا ہے۔

نواب صدیق حسن صاحب چند سطروں کے بعد حافظ ابن حجر کا یہ جملہ بھی نقل کرتے ہیں کہ ابن خلدون اولاد علی سے منحرف تھا۔ نواب صاحب اس پیراگراف کو ان الفاظ پر ختم کرتے ہیں۔

واذا صح صدور تلك الكلمة عن صاحب الترجمه فهو ممن اضله الله على علم، وختم على سمعه وبصره

اگر یہ صحیح ہے کہ ابن خلدون نے یہ بات کہی ہے تو ابن خلدون ان لوگوں میں ہے جو اگرچہ اہل علم ہیں مگر اس کے باوجود اللہ نے انھیں ہدایت سے محروم رکھا ہے اور ان کے کان اور آنکھوں پر مہر لگادی ہے (کہ حق بات سننے اور دیکھنے سے محروم ہیں)۔

یہ ہے سیدنا امام حسین علیہ السلام کے جہاد اعظم کو بغاوت کہنے والے کے متعلق، حدیث کے ایک حافظ اور ایک جلیل القدر امام کا ایمانی تاثر! اور یہ ہے جماعت اہل حدیث کے نہایت

بلند پایہ عالم کا بصیرت بھرا تاثر ۔ اور یہی تاثر حضرات متقدین کے تمام اکابر کا بھی ہے اور کیوں نہ ہو، امام عالی مقام کا یہ جہاد وہ عدیم المثال جہاد ہے، جس نے اسلام کو زندہ کر دیا۔ قائد ملت، شیر اسلام، زعیم حریت مولانا محمد علی مرحوم مغفور نے کتنا صحیح فرمایا ہے۔

قتل حسین اصل میں مرگ یزید ہے

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

اگرچہ امام حسین علیہ السلام اس جہاد میں شہید ہو گئے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ آپ نے شہید ہو کر حیات جاوداں پائی اور یزید جیتے جی مر گیا اور ملعون خلائق ہو گیا، اس جہاد کربلا ہی کی بدولت امت نے دیکھ لیا کہ یزید اور اس کی حکومت نہایت ہی ملعون ہیں۔ پھر جو فسق و فجور اور ظلم و تعدی یزید پلید مسلم معاشرہ میں پھیلا رہا تھا اس سے تمام مسلمان سخت بیزار ہو گئے۔ اور اسلام جس خطرہ میں گھرا ہوا تھا جہاد کربلا نے اس خطرہ سے اسلام کو نکال دیا۔ یزید نے جن حدود اسلام اور سنت رسول کو مردہ کر دیا تھا جہاد کربلا نے انھیں زندہ کر دیا۔ سچ ہے :

اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

جب ظالم خلیفہ کا تشدد ہو تو عذاب الٰہی سے وہی بچے گا جو اس سے قولی یا فعلی یا قلبی جہاد کرے

ظالم آدمی جب خلیفہ ہوتا ہے تو پورے ملک پر اس کا تسلط ہوتا ہے اور بیت المال اس کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ جس سے بہت سے لوگوں کی روزیاں وابستہ ہوتی ہیں پھر تو ہر طرح کے ظلم و ستم اور ہر طرح کے فسق و فجور کے باوجود بھی حکومت کا عملہ اس کے چشم و ابرو کے اشارہ پر کام کرتا ہے اور اس کے حکم پر ہر طرح کے ظلم و ستم کرنے کو بھی اپنی ڈیوٹی سمجھتا ہے۔ ملک کا مالدار اور ذی اثر طبقہ ان کو اپنی جان و مال کے ڈر سے اس کا معاون بن کر پبلک میں اس کی اطاعت اور فرمانبرداری کا پرچار کرتا رہتا ہے۔ ایسی حالت میں اس کا ظلم پسند مزاج ان لوگوں کو برداشت ہی نہیں کر سکتا جو اس کی ناروا حرکتوں

پر اسے ٹوکیں بلکہ پبلک کو وہ اس وقت تک چھوڑے ہی گا نہیں جب تک اس کی تمام برائیوں اور اللہ کی بیحد نافرمانیوں اور بغاوتوں کے باوجود اس کو ظل اللہ نہ مانے۔

● کیا ایسے ظالم خلفا کو برداشت کر لیا جائے؟ اور نظام حق جو کچلا جا رہا ہے، اس کی حمایت کی ضرورت نہیں؟

● کیا اس ظالم کے خلاف کوئی تنظیم نہ کی جائے؟ اور اس کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا جائے؟ بلکہ اس کو فتنہ قرار دیا جائے؟ اور ہر حال میں جان کی خیر منائی جائے۔ اگرچہ احکام اسلام یکے بعد دیگرے کچلے جا رہے ہوں، اور سنت رسول یکے بعد دیگرے مردہ کی جا رہی ہو۔

وہ حدیث ایک بار پھر پڑھ لیجئے جس میں ہے کہ انبیاء کے حواری اور صحابہ ہوتے ہیں، جو ان کے طریقہ پر چلتے ہیں اور ان کی اقتدا کرتے ہیں، ان کے بعد کیا ہوتا ہے؟ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

ثم تخلف من بعدھم	ان کے بعد ناخلف لوگ ان کی جگہ ہوتے ہیں
خلوف یقولون مالا یفعلون	اور ہوں گے، جو ایسی باتیں بولیں گے جن پر
ویفعلون مالا یومرون،	ان کا عمل نہیں اور وہ کام کریں گے جس کا
فمن جاھدھم بیدہ فھو	انھیں حکم نہیں دیا گیا ہے، اب جو شخص
مومن، ومن جاھدھم بلسانہ	ہاتھ سے ان سے جہاد کرے گا۔ وہ مومن ہے
فھو مومن، ومن جاھدھم	اور جو زبان سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن
بقلبہ فھو مومن ولیس	ہے، اور جو دل سے جہاد کرے گا وہ بھی مومن
وراء ذالک من الایمان	ہے، اس کے بعد رائی کے دانہ کے برابر بھی
حبۃ خردل۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۵۲)	ایمان کا حصہ نہیں۔

یہ حدیث پوری وضاحت کے ساتھ بتاتی ہے کہ اچھوں کے بعد جب ناخلف لوگ آئیں گے جو ایسی بات بولتے ہیں جن پر عمل نہیں کرتے (اس کی بڑی واضح مثالیں خلافت صالحہ کے وعدے اور معاہدے ہیں جن پر ظالم خلفاء عمل نہیں کرتے) اور ایسے ایسے کام کرتے ہیں جن کا حکم نہیں دیا گیا ہے۔

(اس کی روشن مثالیں ملک اور رعایا پران قوانین و احکام کا نفاذ ہے جن کی شریعت میں گنجائش نہیں۔) سُن لو ایسے لوگوں کے خلاف جہاد کرنا ضروری ہے چنانچہ شریعت ان سے جہاد کرنے پر ترغیب دلاتی ہے کہ :

- جو شخص ان سے ہاتھ سے جہاد کرے گا وہ مومن ہے۔
- جو ان سے زبان سے جہاد کرے گا یعنی سمجھائے گا، ضرورت ہوئی تو کڑی تنقید کرے گا اور ان کی برائیوں کو بُرا کہے گا ایسا شخص بھی مومن ہے۔
- جو شخص دل سے ان سے جہاد کرے گا، یعنی ان کی حرکتوں کو دل سے بُرا مانے گا کہ اگر قدرت ہوئی تو ان کے خلاف زبان سے بھی کام لے گا۔ مزید قدرت ہوئی تو ہاتھ سے جہاد بھی کرے گا، ایسا شخص بھی مومن ہے۔
- لیکن یہ ایمان کا سب سے کم درجہ ہے، حتیٰ کہ اس کے بعد رائی کے دانے کے برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں۔

اس حدیث نے ایمان کے تین درجے بتائے ہیں، اعلیٰ درجہ ہاتھ سے جہاد ہے، اس کے بعد زبان سے جہاد، آخری درجہ دل میں جہاد، اس کے بعد ایمان کا کوئی درجہ ہی نہیں، رائی کے دانہ کے برابر بھی نہیں۔

اگر ظالم خلیفہ سے کوئی بھی آدمی جہاد نہ کرے تو نظام حق و عدل قائم ہی نہیں رہ سکتا۔ اس کے بعد تمام خرابیاں یکے بعد دیگرے پیدا ہوتی جائیں گی حکام کا ظلم بڑھتا ہی جائے گا۔ امت کا ذی اثر طبقہ کمزوروں پر اپنا اثر جمائے بیٹھا رہے گا۔ اور ستائے گا۔ عوام غلامی کی زندگی بسر کریں گے۔ ان کا احساس ضمیر مسخ ہو جائے گا۔ فسق و فجور اور ظلم و طغیان عام ہوں گے پبلک طرح طرح کے عذاب میں مبتلا ہوتی رہے گی۔ اور عذاب ہمہ گیر ہوگا۔ نگاہ نبوت نے ان تمام حقائق کو پہلے سے دیکھ لیا تھا۔ ارشاد نبوی ہے۔

اذا رأوا الظالم فلم یاخذوا علی یدیه اوشك ان یعمهم الله	لوگ جب ظالم کو (ظلم کرتے ہوئے) دیکھیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو اب کچھ دور نہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنا

بعقاب منہ[1] | وہ عذاب بھیجے جو ان سب کو لے لے۔

اس عذاب سے وہی بچے گا جو ظالم خلیفہ و بادشاہ سے جہاد کرے۔ حدیث میں ہے۔

تصیب امتی فی آخر الزمان من	اس دور کے آخر میں میری امت پر امت کے
سلطانھم شدائد لا ینجو منہ	بادشاہ کی طرف سے بڑی سختیاں ہوں گی اس پر جو
الا رجل عرف دین اللہ فجاھد	عذاب آئے گا اس سے وہی بچے گا جو دین کو سمجھے،
علیہ بلسانہ ویدہ وقلبہ	پھر دین کی بنا پر زبان اور ہاتھ اور دل سے جہاد
فذلک الذی سبقت لہ السوابق	کرے۔ یہی وہ شخص ہے جس کو دین میں سابق رہنے کی
(مشکوٰۃ باب الامر بالمعروف ص ۴۳۸)	خوبیاں پہلے ملیں (یعنی یہ شخص سابقین امت میں ہے)

اس حدیث میں جو یہ ارشاد ہے کہ "اس دور کے آخر میں بادشاہ کی طرف سے امت پر بڑی سختیاں ہوں گی تو اس سے بنی امیہ کا زمانہ مراد ہے کہ یزید، عبید اللہ بن زیاد اور حجاج وغیرہ نے اسی زمانہ میں امت پر وہ مظالم ڈھائے ہیں جس کی نظیر پوری تاریخ اسلام میں نہیں، اس حقیقت کو شارحین حدیث نے بھی بیان کیا ہے۔ ملاحظہ ہو اس حدیث پر مشکوٰۃ کا حاشیہ نمبر ۹ جو مرقات سے ماخوذ ہے۔

۲۔ سیدالشہداء

لفظ سیّد کی تشریح جو شخص مہمات کا انصرام کرتا ہے عربی میں اسے سید کہتے ہیں۔ چونکہ شوہر بیوی کے مہمات کو انجام دیتا ہے اسی لئے قرآن مجید نے شوہر کو بیوی کا سیّد (یعنی سربراہ اور مہمات کا کفیل) فرمایا ہے۔ (ملاحظہ ہو سورہ یوسف آیت[2] ۲۵)

---

[1] ترمذی ج ۲۔ ص ۳۹۔ ابوداؤد ج ۲۔ ص ۲۴۰۔ کوثر

[2] الفاظ یہ ہیں: وَأَلْفَيَا سَيِّدَهَا لَدَى الْبَابِ ط

اور چونکہ سردار اپنی قوم کے مہمات کا ذمہ دار اور کفیل ہوتا ہے اس لئے عرب اسے سید القوم کہتے ہیں۔ اس حقیقت کو امام راغب نے بھی مفردات میں بیان کیا ہے[۱]۔

قرآن حدیث میں سید اسے بھی فرمایا گیا ہے جو فضل و کمال میں قوم پر فائق ہو۔ علامہ زمخشری جو لغت اور عربیت کے امام ہیں حتیٰ کہ علامہ شامی بھی انھیں امام فرماتے ہیں) سورہ آل عمران کی آیت ۳۹ کی تفسیر میں لفظ سَیِّدًا[۲] کی تشریح ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

السید: الذی یسود قومه ای یفوقهم فی الشرف (کشاف ۱-۳۶۰)	سید وہ شخص ہے جو اپنی قوم پر سرداری کرے یعنی وہ فضل و کمال میں ان لوگوں پر فائق ہو۔

علامہ زمخشری کی یہ آواز بعد کے مفسرین کی زبان سے بھی ہم سنتے ہیں، مثلاً قاضی بیضاوی اور امام نسفی وغیرہ بھی ایسا ہی فرماتے ہیں (ملاحظہ ہو تفسیر بیضاوی ص ۷۴، تفسیر نسفی ج ۱ ص ۱۲۲)

سیّد کے صفات بالفاظ دیگر مہمات قوم کے انصرام کے ذمہ دار کے اوصاف یا قوم کے فائق تر آدمی کے صفات

صحابہ اور تابعین نے سورہ آل عمران کے لفظ "سَیِّدًا" کی جو تفسیر کی ہے وہ کہنے کو ایک ہے، لیکن درحقیقت وہ سید کے صفات کا بیان ہے، کسی بزرگ نے کسی صفت کو بیان کیا ہے کسی نے کسی دوسری صفت کو، اور ہر بیان اپنی جگہ صحیح ہے۔ ان سب کو یک جا کر دیا جائے تو سیّد کے اہم صفات کا علم ہو جاتا ہے۔ ان حضرات کی تفصیل حسب ذیل ہے۔

۱۔ سیّد (یعنی قوم کا فائق تر آدمی) وہ ہے جو علم، عبادت اور ورع[۳] میں فائق تر ہو (قتادہ تابعی)

---

[۱] الفاظ یہ ہیں: السید المتولی للسواد ای الجماعة الکثیرة وینسب الی ذالک فیقال: سید القوم

[۲] آیت کا جملہ یہ ہے۔ اَنَّ اللّٰهَ یُبَشِّرُكَ بِیَحْیٰی مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَیِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ ۝

[۳] ورع کی تشریح چند ورق پہلے اس فصل کے حاشیہ میں کی جا چکی ہے، جس کا عنوان ہے "یزید نہ امام ہے نہ خلیفہ"۔ ۱۲ کوثر

۲- سید وہ ہے جو اچھے اخلاق والا ہو۔ (ضحاک تابعی)

۳- سید وہ ہے جو اللہ کا اطاعت گزار ہو۔ (سعید بن جبیر تابعی)

۴- سید وہ ہے جو عالم فقیہ ہو (یعنی شریعت کے اسرار و حکم سمجھتا ہو۔ (سعید بن مسیّب تابعی)

۵- سید وہ ہے جو بڑا متحمل مزاج ہو کہ باتوں سے طیش میں نہ آئے۔ (عکرمہ تابعی)

۶- سید وہ ہے جو اللہ کے نزدیک معزز ہو (مجاہد تابعی)

۷- سید وہ ہے جو بڑا متقی ہو۔ (یہ تفسیر بھی ضحاک تابعی سے مروی ہے)

۸- متحمل مزاج اور متقی ہو (حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما)

امام بغوی نے معالم التنزیل (علی حاشیۃ تفسیر الخازن ج ا ص ۳۴۴) میں یہ تمام اقوال جمع کر دیئے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی درج کئے ہیں لیکن ان کے قائلین کے نام نہیں لکھے ہیں۔ ان میں دو اقوال بہت اہم ہیں جنہیں ہم نمبر سلسلہ قائم رکھتے ہوئے ذیل میں درج کرتے ہیں۔

۹- سید وہ ہے جو بڑا سخی ہو۔

۱۰- سید وہ ہے جو اچھے اوصاف میں اپنی قوم پر فائق ہو۔

حقیقت میں یہ آخری قول بڑا جامع ہے اس میں بقیہ تمام صفات آجاتے ہیں۔

اس بنا پر سید یعنی سردار وہ ہے جو اچھے اوصاف میں فائق اور ممتاز ہو۔ اس کی مختصر سے مختصر تعبیر وہ ہے جو علامہ زمخشری کے ان الفاظ میں ہے "سید (یعنی سردار) وہ ہے جو شرف میں لوگوں پر فائق ہو"۔

جو نفوس فضل و کمال کی برتری کے ساتھ شرف نسب میں بھی فائق ہیں ان کی سیادت و سرداری بڑی بلند پایہ ہے۔ حضرات حسنین علیہما السلام ایسے ہی قدسی نفوس ہیں، امام احمد امام ترمذی، ابن ماجہ، امام حاکم، امام عبدالرزاق، امام طبرانی کی روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

الحسن والحسین سید اشباب اھل الجنۃ (الجامع الصغیر ۱-۱۷۷) — حسن اور حسین جنت کے جوانوں کے سردار ہیں۔

امام حسین علیہ السلام سیّد الشہداء بھی ہیں، یعنی شہیدوں کے بھی سردار ہیں

حدیث سے ثابت ہے کہ سید الشہداء متعدد ہیں اس لئے یہ سمجھنا صحیح نہیں کہ صرف حضرت حمزہ سید الشہداء ہیں، کوئی اور نہیں۔ سید الشہداء کے معنی ہیں شہیدوں کا سردار، آپ سردار کا مفہوم ابھی پڑھ چکے ہیں کہ سردار وہ شخص ہے جو شرف میں دوسروں پر فائق ہو۔ اس بنا پر سیّد الشہداء وہ ہے جو اپنے شرف اور اپنی شہادت کی برتری میں اور شہیدوں پر فائق ہو۔ چونکہ سیّدنا حمزہ رضی اللہ عنہ اور سیدنا امام حسین علیہ السلام اپنے شرف اور علوِّ درجہ میں نیز اپنی شہادت کی برتری کی بنا پر دوسرے شہیدوں پر فوقیت رکھتے ہیں اس لئے یہ دونوں حضرات شہیدوں کے سردار ہیں اسی طرح کچھ اور حضرات بھی ہیں۔

سیّد الشہداء کے باب کی حدیثوں کو سامنے رکھنے سے یہ حقیقت منکشف ہو جاتی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین قسم کے شہیدوں کو سید الشہداء فرمایا ہے۔

۱۔ اس شہید کو سید الشہداء فرمایا ہے جس کو یہ تفوق حاصل ہے کہ قرابت نبوی کا شرف رکھتا ہے۔ اور اس کی شہادت کا درجہ اس میں بڑھ گیا ہے کہ اس کی نعش پر شدید مظالم ہوئے ہیں۔ مثلاً حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کہ آپ کی شہادت کے بعد آپ کی نعش مقدس پر بڑے مظالم ہوئے، امیر معاویہ کی ماں ہندہ نے آپ کا سینۂ اقدس چاک کر کے کلیجہ نکالا، اور اسے کاٹ کر چبایا۔ نیز آپ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرابت قریبہ بھی حاصل ہے۔ ان دونوں باتوں کی بنا پر آپ کو اور شہیدوں پر فوقیت حاصل ہے۔ اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آپ کو سید الشہداء فرمایا ہے جیسا کہ مستدرک اور مختار وغیرہ میں مروی ہے۔

سید الشہداء ہونے کے ان دونوں اسباب[1] کی بنا پر سیدنا امام حسین علیہ السلام بھی سید الشہداء ہیں۔ کہ آپ کی نعش مبارک پر بھی بڑے مظالم ہوئے۔ یزیدی درندوں نے ان پر گھوڑے دوڑا دوڑا کر ہڈیاں پسلیاں چور کر ڈالیں اور سر مبارک کو نیزہ پر چڑھا کر کربلا سے کوفہ اور کوفہ سے شام تک شہر شہر اور انکے مضافات میں گھمایا گیا۔ اور ایسے ایسے مظالم کئے کہ آج تک پورا عالم اسلامی اشک بار ہے۔

ایسی دردناک، دل دوز اور جگر خراش شہادت کے تفوق کے علاوہ آپ کو یہ اعزاز بھی حاصل ہے کہ قرابت نبوی کیا معنی آپ تو نبی کے لخت جگر ہیں۔ ان دونوں وجوہ کی بنا پر آپ کو تمام شہیدوں پر ایک فوقیت حاصل ہے۔ لہٰذا حضرت حمزہ کی طرح آپ بھی سید الشہداء ہیں۔

۲۔ حضور انور صلے اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اس شہید کو بھی سید الشہداء فرمایا ہے جو کئی گنا دشمنوں کے ہجوم کے باوجود ثابت قدم رہا نیز مشابہت نبوی کا شرف بھی رکھتا ہے کہ اس میں بڑی فوقیت ہے حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے بھائی حضرت جعفر رضی اللہ عنہ ایسے ہی شہید ہیں۔ چنانچہ آپ حضور صلی اللہ

---

[1] جس خوبی کی بنا پر مدح کی جائے اسے مدح کی علت کہیں گے۔ یہ خوبی کسی اور میں بھی پائی جائے تو وہ بھی مدح کا مستحق ہے۔

اہم علمی نکتہ: قرآن و حدیث میں جو مدح یا ذم، یا امر یا نہی وارد ہے یا کسی چیز کو حلال و حرام فرمایا گیا ہے۔ ان سب کو اصول فقہ کی اصطلاح میں حکم کہتے ہیں۔ اور ان کی علت کو علت الحکم یا مناط کہا جاتا ہے مناط کا علم بآسانی نہیں ہو جاتا اس کو تلاش کرنا پڑتا ہے۔ تلاش کر کے نکالنے کو تخریج مناط کہتے ہیں۔ مناط کا علم ہو جانے کے بعد تحقیق کرنی پڑتی ہے کہ مناط کی بنا پر جو بات لاگو ہوتی ہے وہ فلاں شخص یا فلاں چیز پر لاگو ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس تحقیق کا نام تحقیق مناط ہے۔ تخریج مناط یا تحقیق مناط پر قیاس فقہی کی بنیاد قائم ہے، جس میں اس تخریج و تحقیق کا ذوق پیدا ہو گیا اسے فقیہ النفس کہتے ہیں۔ ہر مفکر کو تخریج مناط اور تحقیق مناط سے کام لینا پڑتا ہے اور کام لینا بے حد ضروری ہے۔ استقرائی منطق کی بنیاد جن ستونوں پر کھڑی ہے اور جن پر سائنس کا دار و مدار ہے وہ ہیں ربط علیت، اور اس کے اکتشاف کے طریقے (یعنی مشاہدہ، تجربہ، افتراض اور اختیار) جن پر راقم السطور نے معیار حکمت میں مفصل بحث کی ہے درحقیقت یہ چیزیں تخریج مناط اور تحقیق مناط ہی کے مباحث ہیں۔ ۱۲ کوثر

علیہ وسلم سے مشابہت رکھتے تھے اور غزوۂ موتہ میں شہید ہوئے، جس میں مسلمان تین ہزار تھے۔ اور کفار ایک لاکھ[1]، لیکن جعفر رضی اللہ عنہ پامردی سے لڑے کہ تیروں، بھالوں، تلواروں کے نوّے[90] زخم تھے اور سب سامنے کی جانب۔ اس ثابت قدمی اور مشابہت نبوی کی بنا پر ان کو اور شہیدوں پر ایک فوقیت حاصل ہے۔ لہٰذا حضرت حمزہ کے علاوہ یہ بھی شہیدوں کے سردار ہیں۔ اسی بنا پر حدیث میں ان کو بھی سیدالشہداء فرمایا گیا ہے (امام سیوطی نے الجامع الصغیر ج ۲ ص ۲۹ میں اس حدیث کو حسن کہا ہے) الفاظ یہ ہیں۔

سید الشہداء جعفر بن ابی طالب — سیدالشہداء جعفر ابن ابی طالب ہیں۔

سیدالشہداء ہونے کے ان دونوں وجوہ کی بنا پر سیدنا امام حسین علیہ السلام بھی سیدالشہداء ہیں کہ میدان کربلا میں ہجوم اعدا کے باوجود بے نظیر ثابت قدمی دکھائی نیز آپ کو بےحد مشابہت نبوی کا شرف بھی حاصل ہے جس کی بنا پر آپ کو شہیدوں پر بڑی فوقیت ہے۔ ثابت قدمی کا نمونہ دیکھئے کہ میدان کربلا میں آپ مع اہل وعیال اور اصحاب کے کل ۷۲ نفوس ہیں اور مقابلہ میں یزیدی درندے ہزاروں ہزار ہیں تین دن سے پانی بھی بند ہے۔ اولاد، اعزہ اور رفقاء سب آنکھوں کے سامنے ذبح کر دیئے گئے۔ مصائب اور اعدا کا ہجوم ہے لیکن اس اولوالعزمی اور ثابت قدمی کے ساتھ شہید ہوئے ہیں کہ جواب نہیں۔

اب ذرا آپ کی مشابہت نبوی کا بیان سنئے۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ:

"حسین کا سر عبیداللہ بن زیاد کے پاس ایک طشت میں رکھا گیا، وہ اپنی چھڑی سے (آنکھوں کو اور ناک کو) کونچتا تھا اور آپ کے حسن پر کچھ بولا۔" اب حضرت انس نے کہا۔

کان اشبههم برسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (بخاری ۱-۵۲۰) — حسین تمام لوگوں سے بڑھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم شکل تھے[2]۔

---

[1] فتح الباری ج ۷ ص ۶۷ بروایت طبرانی۔ ۱۲ کوثر [2] سیدنا امام حسن علیہ السلام بھی حضور کے ہم شکل تھے اور آپ کے بعد امام حسین علیہ السلام مشابہت نبوی میں سب پر فائق تھے۔ حضرت انس کے کلام کا مطلب یہ ہے حسین اپنے زمانہ میں سب سے زیادہ حضور کے ہم شکل تھے۔ ۱۲ کوثر

۳۔ حضور اکرم صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس شہید کو بھی سید الشہداء فرمایا ہے جو اقامت حق وعدل کے لئے ظالم حکومت کے خلاف کھڑا ہو جائے اور اسکی بناپر حکومت اسے قتل کر ڈالے۔ امام حاکم مستدرک میں، امام ضیاء الدین محمد مقدسی مختارہ میں روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

سید الشہداء حمزۃ بن	سید الشہداء حمزہ بن عبد المطلب ہیں اور
عبد المطلب، ورجل قام	وہ شخص بھی سید الشہداء ہے جو ظالم امام
الی امام جائر فامرہ و	(خلیفہ) کے خلاف کھڑا ہوا۔ چنانچہ اسے اچھے
ونہاہ فقتلہ (منذری ا ص ۲۲۵	کام کا حکم دیا اور برے کام سے روکا۔ اس پر
والجامع الصغیر ۲ ص ۲۹)	اس ظالم نے اسے قتل کر دیا۔

اس حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضرت حمزہ کے علاوہ وہ آدمی بھی سید الشہداء ہے جو اقامت حق وعدل کے لئے ظالم خلیفہ کے خلاف کھڑا ہو جائے اور اسے قیام حق وعدل کی دعوت دے جس کی بنا پر ظالم خلیفہ اسے قتل کرا دے۔

غور کرو! یہ تو تمام تر سیّدنا امام حسین علیہ السلام کی روداد ہے، اب کیوں نہ آپ کو سید الشہداء کہا جائے؟ آپ نے یزید جیسے بدترین ظالم و فاسق کو قولاً و عملاً اس کی دعوت دی کہ "حق کو اختیار کر، بزور شمشیر بیعت لینے کو چھوڑ، بزور شمشیر خلیفہ بننا باطل ہے، امام اور خلیفہ تو وہ ہے جو کتاب الٰہی پر عامل ہو، انصاف کا قیوم ہو، حق کو پوری طرح ادا کرنے اور اپنے کو اللہ کے لئے وقف کر دے"۔ اس دعوت حق کو ٹھکرایا گیا۔ اور آپ کو قتل کیے جانے کے جتن سوچے جانے لگے۔ پہلے آپ کو عین حرم کعبہ میں حج کے موقع پر قتل کرنے کی اسکیم تیار کی گئی۔ آپ کو دراثت" جو فہم نبوی ملی تھی آپ نے اس کی روشنی میں دیکھ لیا کہ حج کے ایام میں مجھے عین حرم کعبہ میں قتل کرنے کی اسکیم مکمل ہو گئی ہے[1]، آپ نے

---

[1] چنانچہ جب عبد اللہ بن زبیر نے آپ کو عراق جانے سے روکنے کی کوشش کی اور زور دیا کہ آپ مکہ ہی میں رہیے۔ تو آپ نے =

اسے گوارا نہیں فرمایا کہ حرم شریف میں میرا خون ہو اور اس سے کعبہ کی بے حرمتی ہو۔ اس کی بنا پر مکہ معظمہ سے روانہ ہو جانے کا پروگرام آپ کے پیش نظر تھا ہی کہ اہل کوفہ کے پے در پے خطوط کی بنا پر کوفہ روانہ ہوئے۔ اور یزیدی درندوں نے میدان کربلا میں آپ کو مع اولاد و اعزہ و رفقاء انتہائی بے دردی سے ذبح کر ڈالا۔

یزید کی ظالم حکومت نے آپ کی دعوت حق اور اقامت حق و عدل کی بنا پر آپ کو شہید کر ڈالا حدیث نے فرمایا ایسا شخص سید الشہداء ہے۔ اسی لئے عام مسلمانوں کے علاوہ بے شمار اولیاء اللہ اور ہر مسلک کے مستند علما آپ کو سید الشہداء کہتے اور لکھتے ہیں، اس میں بریلوی اور دیوبندی اکابر کا بھی اختلاف نہیں، چنانچہ دیوبندی اکابر کے مقتدا و حکیم الامت فاضل اشرف علی تھانوی بھی آپ کو سید الشہداء لکھتے ہیں۔ آپ ایک فتویٰ میں رقم طراز ہیں:

"فی الحقیقت واقعہ جانکاہ جناب سید الشہداء حضرت امام حسین رضی اللہ[1] عنہ وعن احبارہٗ وسخط علی قاتلیہ واعدائہ، اس قابل ہے کہ اگر تمام زمین و آسمان و حور و ملک، و جن و انس، و جمادات و نباتات و حیوانات قیامت تک یہ کہہ کہہ کر روئیں

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبٌ لَوْ اَنَّہَا
صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

تو بھی تھوڑا ہے" (فتاویٰ اشرفیہ ج ۴ ص ۶۰ کتب خانہ رحیمیہ)

= فرمایا۔ میں اسے پسند نہیں کر سکتا کہ مجھے مکہ میں قتل کیا جائے (کیونکہ یہاں خون کرنا سخت حرام ہے اور اس سے اس مقدس زمین کی حرمت پامال ہوگی) بخدا اگر میں کسی بل والے سوراخ میں رہوں گا جب بھی یہ بنی امیہ مجھے نہ چھوڑیں گے اور وہاں سے بھی مجھے نکال کر اپنا کام کر گذریں گے۔ اللہ کی قسم یہ لوگ مجھ پر اسی طرح زیادتی اور نافرمانی کریں گے جس طرح یہود نے سنیچر کے باب میں زیادتی اور نافرمانی کی ہے۔ (تاریخ کامل ۴-۳۴) کوثر

[1] یہاں لفظ رضی اللہ عنہ بعد والے الفاظ و مضمون کی مناسبت سے ہے، ورنہ فاضل تھانوی نے تو حضرت امام جعفر صادق کو بھی علیہ السلام لکھا ہے۔ ملاحظہ ہو فتاویٰ اشرفیہ ج ۴ - ۴ ۱۳ اسی صفحہ میں ائمہ اہل بیت علیہم السلام کی عبارت بھی لکھی ہے۔ ۱۲ کوثر

خلاصۂ بحث

سید الشہداء تین قسم کے ہیں ۔

(۱) وہ شہید سید الشہداء ہے جس کو قرابت نبوی کا شرف حاصل ہے ۔ نیز اس کی شہادت اتنی بلند پایہ ہے کہ شہادت کے بعد اس کی نعش پر بھی شدید مظالم کئے گئے ہیں، مثلاً حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس اصول کی بنا پر سیدنا امام حسین علیہ السلام بھی سید الشہداء ہیں ۔

(۲) وہ شہید بھی سید الشہداء ہے جو اتنا اولوالعزم ہے کہ دشمنوں کی زبردست اکثریت کے باوجود ثابت قدم رہا، نیز وہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ہم شکل بھی ہے ۔ مثلاً حضرت جعفر، اس اصول کی بنا پر بھی سیدنا امام حسین علیہ السلام سید الشہداء ہیں ۔

(۳) وہ شہید بھی سید الشہداء ہے جو اقامت حق وعدل کے لئے ظالم خلیفہ کے خلاف کھڑا ہوا اور اس ظالم نے اسے قتل کرا دیا ۔ اس اصول پر بھی سیدنا امام حسین علیہ السلام سید الشہداء ہیں ۔

غرض جس پہلو سے بھی دیکھئے یہی نظر آئے گا کہ سیدنا امام حسین علیہ السلام سید الشہداء ہیں ۔

امام آپ ہیں اللہ کے شہیدوں کے
مرے امام مرے مقتدا سلام علیک

۳۔ سلام

لفظ سلام کی تشریح

سلام کے معنی سلامتی کے ہیں لیکن اس میں تکریم واعزاز بھی ملحوظ ہوتا ہے ۔

اللہ کا سلام

ربّ عالم کسی کو سلام فرمائے تو یہ بہت بڑا اعزاز ہے ۔ اور عام طور پر ایسے ہی برگزیدہ شخصیت کو علیہ السلام کہا جاتا ہے ۔ اسی پر ہے جمہور امت کا عمل [۱] ۔

---

[۱] جمہور جن میں بکثرت ادبائے ربانی اور علمائے حقانی بھی ہیں ۔ ان کا عمل اور رجحان بڑا وزنی ثبوت ہے کہ =

وہ بلند پایہ ہستیاں جن کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں سلام کہا ہے

یہ ہیں حضرات انبیاء کرام انتخاب الٰہی کے شاہکار اور حضرات آل یٰس علیہم السلام، انبیائے کرام کے متعلق سورۂ والصافات کے آخر میں ارشاد الٰہی ہے:

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

تمہارا رب جو عزت کا مالک ہے، وہ ان باتوں سے پاک ہے جنھیں یہ اہل شرک بیان کرتے ہیں، اور رسولوں پر سلام ہے اور سب حمد وثنا اللہ ہی کی ہے۔

اور آل یٰس کے متعلق اسی سورۃ میں ہے:

سَلٰمٌ عَلٰٓى اٰلِ يَاسِيْنَ ۝

آل یٰس کو سلام۔

یہ آیت دو طور پر نازل ہوئی ہے، ایک تو یہ جسے یہاں درج کیا گیا ہے، (یہ امام نافع مدنی امام ابن عامر شامی اور امام یعقوب بصری کی قراءت ہے اور متواتر[1] ہے جس کا انکار کفر ہے)۔

= یہ چیز بہتر ہے، اور اللہ کو پسند ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

مارآہ المسلمون حسنا فھو عند اللہ حسن

جس فعل یا بات کو مسلمان لوگ اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی بہتر ہے۔

اس قول کو متعدد ائمہ نے روایت کیا ہے، مثلاً امام احمد، امام ابوداؤد طیالسی، امام بزار، امام طبرانی، امام ابونعیم اصفہانی، امام بیہقی، اس پر مولانا عبدالحئی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے تحفۃ الاخیار فی احیاء سنۃ سید الابرار میں مفصل بحث فرمائی ہے۔ ۱۲ کوثر

[1] قراءت سبعہ متواترہ ہے (جمع الجوامع امام تاج الدین عبدالوہاب سبکی ج ۱ ص ۲۲۸) یعنی اس کے متواترہ ہونے میں اختلاف نہیں (منع الموانع اتقان ج ۱ ص ۸۳) بشرطیکہ ائمہ سبعہ سے روایت کرنے والے بحد تواتر ہوں =

اور اس طور پر بھی اس کا نزول ہوا ہے سَلَامٌ عَلٰی اٰلِ یَاسِیْن ٥ یہ امام ابو عمرو بن علاء بصری، امام ابن کثیر مکی، امام حمزہ کوفی، امام عاصم کوفی اور امام کسائی کوفی کی قرات ہے اور یہ بھی متواتر ہے اس کا بھی انکار کرنا کفر ہے۔

قرآن مجید کے لفظ آلِ یاسِیْن کی تفسیر

گو مفسرین نے "آلِ یاسِیْن" کی متعدد تفسیریں کی ہیں[1]، اور تفسیر میں ان کی عام روش یہی ہے، مگر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما جو تمام مفسرین کے امام ہیں وہ فرماتے ہیں کہ آلِ یَاسِیْن سے آل محمد صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں، تنویر المقیاس جو حضرت ابن عباس کے تفسیری اقوال کا مجموعہ ہے اور الدر المنثور کے حاشیہ پر بھی چھپا ہے۔ اس کی جلد ۴ صفحہ ۴۳۵ میں ہے

عَلٰی اٰلِ یَاسِیْن ٥ عَلٰی اٰلِ محمد — آل یٰس پر سلام، یعنی آل محمد پر سلام

= (امام ابو شامہ اتقان ج ۱ ص ۷۸)

قرأت سبعہ جسے سبعہ بھی کہتے ہیں وہ قرأت ہے جسے ان سات اماموں میں سے کوئی بھی روایت کرے جنھیں قراءت کے ائمہ سبعہ کہتے ہیں، ان کے نام یہ ہیں۔

(۱) امام ابن کثیر مکی، (۲) امام نافع مدنی، (۳) امام ابن عامر شامی، (۴) امام ابو عمرو بن علاء بصری، (۵) امام عاصم کوفی، (۶) امام حمزہ کوفی، (۷) امام کسائی کوفی۔

قراءت متواترہ بالیقین اللہ کی طرف سے نازل شدہ قرآن ہے (ابو شامہ اتقان ۱ — ۷۸)

لہٰذا سَلَامٌ عَلٰی اِلْ یَاسِیْن ٥ اور سَلَامٌ عَلٰی اِلْ یَاسِیْن ٥ دونوں قراءتوں کو بالیقین کلام الٰہی ماننا فرض ہے، کہ دونوں سبعہ اور متواترہ ہیں جن کا انکار کفر ہے اللہ اس سے بچائے۔ ۱۲ کوثر

[1] مثلاً (۱) آل یٰس سے آل محمد صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد ہیں، کہ یٰس آپ کا ایک نام پاک ہے۔ (۲) اس سے اہل قرآن یعنی قرآن مجید پر ایمان لانے والے لوگ مراد ہیں کہ یٰس قرآن کی ایک سورہ کا نام ہے۔ (۳) اس سے حضرت الیاس مراد ہیں۔ کیونکہ یٰس آپ کے والد کا نام ہے۔ (لیکن اس بات کا ثبوت مشکل ہے)۔

امام ابن ابی حاتم، امام طبرانی اور امام ابن مردویہ نے بھی حضرت ابن عباس سے یہی تفسیر نقل کی ہے۔ چونکہ یہ حضرت ابن عباس کی تفسیر ہے جو دیگر مفسرین کی تفسیروں کے مقابلہ میں قابل ترجیح ہے۔ اس لئے حافظ ابن کثیر نے "آل لیس" کی تفسیر میں صرف اسی کو لیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں:

سَلٰمٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِیْنَ ۝ یعنی آل لیس پر سلام۔ یعنی آلِ محمّد آلِ محمد (ابن کثیر ۔ ۴ ۔ ۲۰) پر سلام۔

ایک ریمارک پر تبصرہ

اس تفسیر کہ "آلِ یَاسِیْنَ" سے آل محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) مراد ہیں، یہ ریمارک کیا گیا ہے کہ آلِ یاسین سے حضرت الیاس ہی مراد ہیں، کوئی اور نہیں، کیونکہ پہلے سے انہیں کا ذکر ہو رہا ہے۔ اگر اس سے آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مراد لیں تو کلام بے ربط ہو جاتا ہے۔

لیکن یہ ریمارک مناسب نہیں کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کو غلط بتاتا ہے اور یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ کلام بے ربط ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت ابن عباس کی تفسیر صحیح ہے، اور ربط کلام کے خلاف بھی نہیں، اگر یہ نکتہ ملحوظ رکھا جائے کہ دو قرائتیں بمنزلہ دو آیتوں کے ہیں تو حضرت ابن عباس کی تفسیر پر ریمارک کی ضرورت ہی نہیں۔ تفصیل یہ ہے کہ تعدد قراءت کے جہاں متعدد اسرار ہیں وہاں ایک اہم حقیقت یہ بھی ہے کہ کسی آیت کی دو قرائتیں درحقیقت بمنزلہ دو آیتوں کے ہیں۔

- امام ابو اللیث[1] سمرقندی رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد ہے (جیسا کہ اتقان ج ۱ ص ۴۸ میں ہے)۔
  جب کسی آیت کی دو قرائتیں ہوں اور دونوں کی تفسیریں باہم متعارض ہوں تو

---

[1] آپ کا نام نصر بن محمد ہے ابو اللیث کنیت، امام الہدیٰ لقب، ۳۷۳ھ میں انتقال ہوا۔ نہایت بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ تھے۔ ایک لاکھ حدیثیں زبانی یاد تھیں۔ حدیثوں کا اتنا بڑا ذخیرہ سامنے رکھ کر بڑی معیاری تفسیر لکھی تھی، جس کی بڑی شہرت تھی۔ تفسیر حدیث اور فقہ کے امام ہونے کے علاوہ آپ بڑے عابد و زاہد اور بڑے متقی بھی تھے، جس کی بنا پر آپ کو امام الہدیٰ کہا جاتا تھا۔ آپ کے علم اور زہد و تقویٰ کا یہ اثر تھا کہ انتقال پر ایک مہینے تک سمرقند کی =

دونوں قراءتیں بمنزلہ دو آیات کے ہیں! ("تصیر القراءتین بمنزلۃ آیتین)

• امام ابُواللیث کے علاوہ اور اکابر نے بھی ایسا ہی فرمایا ہے، امام سیوطی ان کا قول نقل کرتے ہیں کہ:

تنوع القراٰن بمنزلۃ الاٰیات — متعدد قراءتیں بمنزلہ متعدد آیتوں کے ہیں۔

• اس اصول کو مجتہدین امت نے ملحوظ بھی رکھا ہے چنانچہ مختلف قراءتوں سے مختلف احکام کا استخراج فرمایا ہے، امام سیوطی اتقان ج ۱ ص ۸۴ میں فرماتے ہیں۔

باختلاف القراٰاٰت یظھر الاختلاف فی الاحکام — قراآت کے مختلف ہونے کی بنا پر مختلف احکام ظہور میں آتے ہیں۔

فقہائے حنفیہ اس ضابطہ کو بہت زیادہ ملحوظ رکھتے ہیں جیسا کہ ان کی تحقیقات سے ظاہر ہے اس کو قاسمی جماعت کے سب سے بڑے عالم شاہ انور صاحب کشمیری نے بھی بیان کیا ہے۔ انوارالباری ج ۸ ص ۲۶ میں شاہ صاحب موصوف کا قول ان الفاظ میں مذکور ہے۔

"حنفیہ کا اصول ہے کہ وہ متعدد قراءت کو متعدد مستقل آیات کے حکم میں رکھتے ہیں اور ان سے الگ الگ احکام نکالتے ہیں"

اس اصول کی بنا پر یہ قراءت سَلٰمٌ عَلٰی اٰلِ یَاسِیْنَ ٥ اور یہ قراءت سَلٰمٌ عَلٰی اِلْ یٰسِیْنَ ٥ بمنزلہ دو مستقل آیتوں کے ہیں۔ پہلی قراءت کی بنا پر حضرت الیاس پر سلام ہے اور دوسری قراءت کی بنا پر آل یٰس یعنی آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سلام ہے۔ دونوں کو مستقل مانئے۔ پھر

= دکانیں بند رہیں۔ مولانا عبدالحئی فرنگی محلی رحمۃ اللہ علیہ نے النافع الکبیر صفحہ ۱۰۹ میں لکھا ہے کہ جہاں تک معلوم ہو سکا فتاویٰ میں سب سے پہلے امام ابُواللیث سمرقندی نے کتاب لکھی ہے جس کا نام النوازل ہے۔ اس میں اپنے مشائخ اور ان سے پہلے کے مشائخ اور ان سے پہلے کے مشائخ کے فتاویٰ جمع کر دیئے ہیں اور اپنے مختارات بھی لکھے ہیں۔ آپ کی مشہور تصانیف میں تفسیر قرآن، شرح جامع صغیر النوازل، خزانۃ الفقہ، بستان العارفین اور تنبیہ الغافلین وغیرہ ہیں۔ ۱۲ کوثر۔ لہ اتقان ج ۱ ص ۸۴۔ کوثر

دونوں پر مستقل طور پر سلام ہے، درحقیقت آلِ یاسین ۵ والی قرات جملہ مستانفہ ہے، یعنی اس اشکال کا ازالہ ہے جو کسی دل میں پیدا ہو جائے کہ حضرت الیاس پر قرآن مجید میں سلام ہے اور اس سے پہلے اسی سورہ میں حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون پر اللہ نے نام بنام سلام کہا ہے یہ بہت بڑی فضیلت ہے۔ اگر پورے قرآن میں کہیں بھی حضور سید الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام لیکر اللہ کا سلام نہ ہو تو اس باب میں کس کی فضیلت نکلے گی؟ اس اشکال کا جواب یہ قراءت ہے۔

سَلَامٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِیْنَ ۵ آلِ یٰسٓ پر سلام،

یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف اور فضیلت و اعزاز کا یہ عالم ہے کہ آپ کی آل پر بھی اللہ کا سلام ہے۔

عَلٰی یَاسِیْنَ سَیِّدِنَا وَّ آلِہٖ
سَلَامُ اللّٰہِ مَا دَامَ السَّلَامُ

آلِ یٰسٓ کون لوگ ہیں؟

یہ آپ کی ذریات طاہرہ ہے اور حدیث کساء[۱] کی بنا پر حضرت علی بھی آلِ یٰسٓ میں شامل ہیں، اور حدیث مباہلہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی کو بھی اَھْلِیْ[۲] فرمایا ہے یعنی یہ میری آل ہیں، صحیح مسلم (ج ۲ ص ۲۷۸) میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ :-

---

۱ کساء کے معنی کمبل اور چادر کے ہیں۔ حدیث کساء اس حدیث کو کہتے ہیں جس میں مذکور ہے کہ آیت تطہیر نازل ہونے کے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین کو اپنی کملی میں لے کر فرمایا۔ ھٰؤُلَآءِ اھل بیتی، یعنی یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں۔ ۱۲ کوثر

۲ اَھْلِیْ وَ آلِیْ ایک چیز ہے۔ علمائے لغت نے تصریح کی آل کی لغوی حقیقت یہ ہے کہ یہ لفظ دراصل اھل ہے۔ اسی لئے اس کی تصغیر اُھَیْل آتی ہے۔ ۱۲ کوثر ـ

لما نزلت هذه الآية ندع ابناء نا و ابناء كم دعا رسول الله صلى الله عليه وسلم عليا و فاطمة و حسنا و حسينا فقال اللّٰهمّ هؤلاء اهلى ،

جب یہ آیت نازل ہوئی نَدْعُ اَبْنَاءَ نَا وَ اَبْنَاءَ کُمْ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی ، فاطمہ اور حسن و حسین کو بلا کر فرمایا یا اللہ یہ لوگ میرے آل ہیں (یہ ترجمہ بھی ہے : یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں اور دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں)

اس حدیث سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے کہ آلِ رسول بالفاظ دیگر آل یٰس یہ حضرات ہیں : حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن، امام حسین علیہم السّلام ، کیا ان حضرات کے علاوہ ان کی اولاد آل رسول نہیں ہیں ؟ یقیناً وہ بھی آل رسول ہیں لیکن وہی سادات کرام اس جلیل القدر عظمت کے مستحق ہیں ، جو تقویٰ میں اپنے اکابر کا نمونہ ہیں اور جو لوگ سید بنتے ہیں یا کہے جاتے ہیں لیکن ان کی زندگی تقویٰ اور خدا ترسی کی زندگی نہیں ہے انھیں خود سمجھنا چاہیے کہ آل رسول کی کیا یہی شان ہوتی ہے ؟[1]

سَلَامٌ عَلٰی آلِ یَاسِیْنَ کا تقاضا

جب خود اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں آلِ یٰس پر سلام بھیج کر اعزاز و تکریم سے نوازتا ہے تو اس کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ بھی ان پر سلام بھیج کر تکریم و توقیر کریں

---

[1] ایک ضعیف حدیث ہے :

آل محمد کل تقی (الجامع الصغیر طس ج ۲ - ص ۲)

آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر متقی ہے ۔

اس سے یہ استدلال کرنا غلط ہے کہ حسنین کریمین اور ان کے والدین عظیمین کی اس میں کوئی تخصیص نہیں، بلکہ ہر متقی آل رسول ہے !! درحقیقت یہ بعید مجرد استدلال ہے، کیونکہ اول تو یہ حدیث ضعیف ہے جس سے استدلال کرنا ہی بہت کمزور ہے اور =

اور جمہور امت کا اس پر عمل بھی ہے چنانچہ عام طور پر امام حسن علیہ السلام اور امام حسین علیہ السلام کہا اور لکھا جاتا ہے۔

عہد صحابہ میں آل یٰسین کو علیہ السلام

یہ خیال صحیح نہیں ہے کہ آل یٰسین کو علیہ السلام کہنا متاخرین کے زمانہ سے جاری ہوا ہے بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ حضرت امام عبدالحق محدث دہلوی لکھتے ہیں۔

متعارف در متقدمین تسلیم بود بر اہل بیت رسول از ذریت و ازواج مطہرہ،

ترجمہ: متقدمین میں اہل بیت رسول یعنی آپ کی ذریت اور ازواج مطہرہ کے لئے لفظ سلام کا استعمال متعارف تھا (یعنی عام طور پر مستعمل تھا) اشعۃ اللمعات ج ۱ ص ۴۰۵۔

کتب حدیث میں ملتا ہے کہ خود حضرات صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بھی آل یٰسین کو علیہ السلام کہا ہے۔ سطور ذیل ملاحظہ ہوں۔

۱۔ حضرت سعد نے انھیں علیہ السلام کہا ہے

امام طحاوی مشکل الآثار (ج ۲ ص ۳۳۲ مطبوعہ دائرۃ المعارف دکن) میں روایت کرتے ہیں کہ حضرت سعد بن ابی وقاص (جو عشرہ مبشرہ میں ہیں) ان کا قول ہے کہ

لما نزلت هذه الآية دعا رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم	جب یہ آیت (یعنی آیت تطہیر) نازل ہوئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے علی اور فاطمہ

= اگر اس کو لینا ہی ہے تو یہ معنی لیجئے کہ اولاد رسول میں جتنے بھی متقی ہیں وہ سب آل محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں، ماکیونکہ اگر یہ بات ہوتی کہ امت کا ہر متقی آل رسول ہے تو حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ یہ کیوں فرماتے کہ علی میں تین ایسی خوبیاں ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی مجھ میں ہوتی تو میرے نزدیک سرخ اونٹ جیسے بے بہا نعمت سے بڑھ کر ہوتی۔ پھر ان خوبیوں کو بیان فرمایا۔ ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ جب آیت مباہلہ نازل ہوئی تو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے علی فاطمہ حسن اور حسین کو بلا کر فرمایا یہ میرے اہل بیت ہیں یعنی میری آل ہیں (صحیح مسلم ج ۲ ص ۲۷۸) کوثر

علیا و فاطمة وحسنا وحسینا علیهم السلام، وقال اللّٰھم ھؤلاء اھل بیتی ۔

اور حسن اور حسین علیہم السلام کو بلایا اور فرمایا ۔ یا اللہ یہ لوگ میرے اہل بیت ہیں ۔

اس روایت میں حضرت سعد نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کو علیہم السلام کہا ہے ۔ درحقیقت سَلَامٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِین کے تقاضے پر عمل ہے ۔

۲ - ام المومنین حضرت ام سلمہ نے بھی انھیں علیہم السلام کہا ہے

مشکل الآثار کے مذکورہ بالا صفحہ میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا کا ارشاد ہے کہ

نزلت ھذہ الآیہ فی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، وعلی وفاطمة، وحسن وحسین علیھم السلام اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ٥

یہ آیت اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا ٥ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اور علی اور فاطمہ اور حسن اور حسین علیہم السلام کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔

اس روایت میں ام المومنین حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن، اور امام حسین کو علیہم السلام کہا ہے ۔ یہ درحقیقت سَلٰمٌ عَلٰٓی اٰلِ یَاسِیْنَ ٥ کے تقاضے پر عمل ہے ۔

۳ - حضرت سہل[1] بن سعد رضی اللہ عنہ نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی کو علیہما السلام کہا ہے

التاج الجامع للاصول فی احادیث الرسول صحیح احادیث و روایات کا بڑا بیش بہا مجموعہ

---

[1] مدینہ منورہ میں جو صحابہ قیام پذیر تھے ان میں سب سے آخر میں آپ ہی کا وصال ہوا ہے۔ صحیح بخاری باب ولا یبدین زینتھن الا لبعولتھن ۔ کوثر

ہے۔ اس کی جلد ۳۔ صفحہ ۲۳۲ میں ہے کہ حضرت سہل بن سعد رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

جاء رسول اللہ بیت فاطمۃ	رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم (حضرت)
فلم یجد علیا علیہما السلام	فاطمہ کے گھر تشریف لائے اور (حضرت) علی علیہما السلام
فقال: این ابن عمکِ ؟	کو موجود نہ پاکر فرمایا تمہارے ابن عم کہاں رہیں؟

آپ نے دیکھ لیا کہ اس جلیل القدر صحابی نے حضرت فاطمہ اور حضرت علی کو علیہما السلام کہا ہے۔ یہ در حقیقت سَلَامٌ عَلٰی اٰلِ یاسین ٥ کے تقاضے پر عمل ہے۔

حضرت سہل رضی اللہ عنہ نے اور مواقع پر بھی ایسا ہی کہا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ آپ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس زخم کے بارے میں دریافت کیا گیا، جس سے غزوۂ احد میں آپ زخمی ہوئے تھے تو آپ نے فرمایا۔

جُرِحَ وجہ النبی صلی اللہ علیہ	نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرۂ مبارک زخمی
وسلم، وکسرت رباعیتہ	کیا گیا، اور آپ کا دندان مبارک توڑا گیا،
وھشمت البیضۃ علی راسہ	اور آپ کے سر پر خود کو توڑ دیا گیا (اس عالم میں)
فکانت فاطمۃ علیہا السلام[1]	فاطمہ علیہا السلام آپ کا خون دھوتی تھیں اور
تغسل الدم وعلی رضی اللہ عنہ	علی رضی اللہ عنہ خون کو تھامے
یمسک،	ہوئے تھے۔

۴۔ حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے حضرت خاتون جنت کو علیہا السلام کہا ہے

صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری ج ۶ ص ۷۷ ا میں ہے کہ عبد اللہ ابن مسعود) رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں

بینا النبی صلی اللہ ساجد	اس اثنا میں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ

---

[1] صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری ج ۶ ص ۶۲ و ج ۹ ص ۲۷۴ ولفظہ یقاربہ ۔ ۱۲ کوثر

وحوله ناس من قريش من المشركين، اذ جاء عقبة بن ابی معیط بسلی جزور و قذفه علی ظهر النبی صلی الله علیه وسلم فلم یرفع راسه حتی جاءت فاطمة علیها السلام فاخذت من ظهره۔	میں تھے اور آپ کے آس پاس کچھ مشرکین قریش تھے کہ عقبہ بن ابی معیط اونٹنی کا بچہ دان لایا اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیٹھ پر بحالِ سجدہ رکھ دیا، آپ نے سر مبارک سجدہ سے نہیں اٹھایا حتیٰ کہ فاطمہ علیہا السلام آئیں اور آپ کی پشت (مبارک) سے اس کو ہٹایا۔

یہ روایت صحیح بخاری بر حاشیہ فتح الباری ج، ص ۱۱۴ میں بھی ہے، وہاں بھی فاطمۃ علیہا السلام ہے اور یہ بھی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

۵۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے بھی حضرت خاتون جنت کو علیہا السلام کہا ہے

صحیح بخاری بر حاشیہ فتح الباری ج۷، ص ۲۳۶ میں ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں:

ان فاطمة علیها السلام والعباس اتیا ابابکر یلتمسان میراثهما ارضه من فدك و سهمه من خیبر	فاطمہ علیہا السلام اور عباس ابوبکر کے پاس آئے۔ فدک میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جو زمین اور خیبر میں جو آپ کا حصہ تھا اس میں سے یہ دونوں اپنا ترکہ مانگ رہے تھے

اسی جلد کے صفحہ ۵۴۳ میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے۔

ان فاطمة علیها السلام بنت	کہ فاطمہ علیہا السلام دختر نبی صلی اللہ

لہ اسی جلد کے صفحہ ۵۶ میں بھی حضرت عائشہ سے یہ روایت ہے، اور وہاں بھی ان کا قول فاطمہ علیہا السلام موجود ہے۔ ہوا کوثر

النبی صلی اللہ علیہ وسلم ارسلت	علیہ وسلم نے ابوبکر کے پاس آدمی بھیجا کہ
الی ابی بکر تسألہ میراثہا من	وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت میں
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم	اپنا حصہ مانگ رہی تھیں ۔

۶ - حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ نے بھی حضرت فاطمہ کو علیہا السلام کہا ہے

صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری ج ۶ ص ۵۵۳ میں عمرۂ نبوی واقعہ ذی قعدہ کی روایت کے سلسلہ میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مدینہ روانہ ہونے لگے تو حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی چچا، چچا کہتی ہوئی آئیں۔

فتناولہا علی فاخذ بیدہا	تو ان کو علی نے لیا، اور ہاتھ تھام کر
وقال لفاطمۃ علیہا السلام	فاطمہ علیہا السلام سے کہا: اپنے چچا کی
دونک ابن عمک	لڑکی کو لے لو ۔

۷ - حضرت جحیفہ صحابی رضی اللہ عنہ نے حضرت علی اور امام حسن کو علیہما السلام کہا ہے

صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری ج ۶ ص ۴۶۳ میں ہے کہ حضرت ابوجحیفہ فرماتے ہیں ۔

رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم	میں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ہے
وکان الحسن بن علی علیہما السلام	اور حسن بن علی علیہما السلام آپ کے
یشبہہ ۔	ہم شکل تھے ۔

ایک دو نہیں سات سات صحابۂ کرام کے اقوال آپ نے ملاحظہ فرمائے کہ انھوں نے آل کِسَا (حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت امام حسن، اور حضرت امام حسین) کے نام کے ساتھ سلام کا لفظ استعمال فرمایا ہے ان میں ام المومنین حضرت عائشہ، ام المومنین حضرت ام سلمہ اور عشرہ مبشرہ کی ایک نامی شخصیت حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہم بھی ہیں۔

ان میں پانچ شواہد صحیح بخاری سے اخذ کئے گئے ہیں۔ اگر اس موضوع پر صحیح بخاری کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو اور شواہد بھی ملیں گے اور اگر دیگر کتب حدیث سے بھی شواہد اخذ کئے جائیں تو ایک کتاب ہو جائے اس سے انداز لگایئے کہ آلِ یٰس کے نام کے ساتھ سلام کا استعمال کتنا صحیح مسلک ہے اور کیوں نہ ہو خود قرآن مجید میں ہے

سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ ۝ آل یٰس کو سلام،

جو بات خود قرآن مجید سے ثابت ہے، اور صحابۂ کرام کا اس پر عمل بھی ہے نیز اس زمانہ سے آج تک علمائے حقانی، اولیائے ربانی اور جمہور امت کا اس پر تعامل جاری ہے، وہ کتنی مضبوط، مستحکم اور مدلل حقیقت ہے، یہ وہ حقیقت ہے جسے دیکھ کر ہر مسلمان پکار اٹھے گا کہ آلِ یٰس کے نام کے ساتھ سلام کا استعمال کرنا اقتضائے قرآنی پر عمل کرنا ہے، صحابۂ کرام کی پیروی ہے، کروڑوں اولیاء اللہ وعلمائے ربانی کی اقتدا ہے اور تعامل امت کی شاہراہ مستقیم پر چلنا ہے۔

اس توضیح حق کے بعد پھر کسی اور ثبوت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، لیکن علمی اضافہ کے لئے سطور ذیل بھی ملاحظہ فرمالیجئے۔

عہد تابعین میں آلِ یٰس کے نام کے ساتھ سلام کا استعمال

یوں تو بکثرت تابعین نے آل یٰس کے نام کے ساتھ سلام کا لفظ استعمال فرمایا ہے، لیکن بطور اختصار دو شواہد درج ذیل ہیں۔

۱۔ سنن ابی داؤد مطبوعہ قادری[۱] دہلی ج ۱ ص ۹۳ (باب الرجل یصلی عاقصا شعرہ) میں ہے کہ سعید اپنے والد حضرت ابُوسعید مقبری تابعی کا قول روایت کرتے ہیں۔

انہ رأی ابا رافع مولی النبی صلی اللہ علیہ وسلم مرحسن

کہ انھوں نے دیکھا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے آزاد کردہ غلام (حضرت) ابُورافع حسن بن علی[۲] علیہما السلام کے

---

[۱] مطبع قادری کے علاوہ اور مطابع کی سنن ابُوداؤد میں بھی حسن بن علی علیہما السلام کی عبارت موجود ہے =

بن علی علیہما السلام وھو یصلی قائماً، | پاس سے گذرے اس وقت وہ کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

۲۔ صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری ج ۶ ص ۱۱۹ میں امام زین العابدین کا بیان مروی ہے۔

اخبرنی علی ابن حسین ان حسین بن علی علیہما السلام اخبرہ، | مجھے خبر دی ہے علی بن حسین (زین العابدین) نے وہ کہتے ہیں مجھے خبر دی ہے حسین بن علی علیہما السلام نے

ف: امام زین العابدین کا نام آگیا تو یہ بات یاد آگئی کہ امام بخاری نے صحیح بخاری میں آپ کے نام کے ساتھ لفظ سلام لکھا ہے۔ چنانچہ آپ نے صحیح بخاری میں اس عنوان سے ایک باب قائم کیا ہے، باب لایتزوج اکثر من اربع، لقولہ تعالیٰ: مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ۔ اور اس کلام ربانی کی تفسیر میں امام علی بن حسین زین العابدین علیہ السلام کی تفسیر نقل فرمائی ہے اور آپ کا نام اس طرح لیا ہے۔

قال علی بن حسین علیہما السلام | علی بن حسین علیہما السلام نے کہا ہے۔

(صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری ج ۹ ص ۱۰۶)

صحیح بخاری میں آل لیٰس کے نام کیساتھ بیس سے زائد مقام پر لفظ سلام آیا ہے

= لیکن جدید مطبوعات ہند میں نہیں ہے۔ شائد اس کی وجہ یہ ہے کہ سنن ابی داؤد کے چار نسخے ہیں جن میں عبارت کی کمی بیشی پائی جاتی ہے۔ (۱) نسخہ ابن داسہ (۲) نسخہ ابن الاعرابی (۳) نسخہ لولوی (۴) نسخہ رملی۔ شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے اپنے ایک فتویٰ میں لکھا ہے کہ "در کتب قدیمہ حدیث اہل سنت خصوصاً ابو داؤد و صحیح بخاری بعد از ذکر حضرت علی و حضرات حسنین و حضرت فاطمہ و حضرت خدیجہ و حضرت عباس لفظ "علیہم السلام" مرقوم است"۔ اس سے ظاہر ہے کہ شاہ صاحب موصوف کے مطالعہ میں ابوداؤد کا جو نسخہ تھا اس میں "حسن ابن علی علیہما السلام" کا لفظ موجود تھا۔ ۱۲ کوثر

ان میں سے چند مقامات کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ ملاحظہ ہوں صحیح بخاری برحاشیہ فتح الباری کے صفحات ذیل ۔

جلد ۶ صفحہ ۶۲ - و - ۱۲۲ - و ۱۳۱ و ۱۳۲ و ۱۷۷ ان صفحات میں فاطمہ علیہا السلام کا لفظ ہے ۔

جلد ۶ صفحہ ۱۱۹ اس میں الحسین بن علی علیہما السلام کا لفظ ہے ۔

جلد ۶ صفحہ ۳۶۴ اس میں الحسن بن علی علیہما السلام کا لفظ ہے

جلد ۷ صفحہ ۵۳ و ۵۶ و ۱۱۴ و ۲۳۶ و ۳۴۵ و ۳۵۵ ان صفحات میں فاطمہ علیہا السلام کا لفظ ہے ۔

جلد ۹ صفحہ ۱۰۹ اس میں علی بن حسین علیہما السلام کا لفظ آیا ہے ۔

جلد ۹ صفحہ ۲۷۴ و ۳۰۷ ان صفحات میں فاطمۃ علیہا السلام کا لفظ آیا ہے ۔

جلد ۱۳ صفحہ ۲۴۴ اس میں بھی فاطمہ علیہا السلام کا لفظ آیا ہے ۔

جلد ۱۳ صفحہ ۳۴۷ اس میں حسین بن علی علیہما السلام کا لفظ ہے ۔

ایک اہم علمی حقیقت

اگر آپ صحیح بخاری مطبوعہ ہند میں آل بیت کے نام کے ساتھ ان تمام مقامات پر سلام مرقوم نہ پائیں تو اس سے یہ نتیجہ نہ نکالیے کہ صحیح بخاری میں یہ ہے ہی نہیں، اس سے آپ اتنا ہی کہہ سکتے ہیں کہ صحیح بخاری مطبوعہ ہند میں نہیں ہے، صحیح بخاری مطبوعہ ہند ہی کو ماننا اور دیگر مطابع کی صحیح بخاری کو پایہ اعتبار سے گرا دینا صریح ناانصافی ہے ۔

علمائے حدیث جانتے ہیں کہ امام بخاری کے جن تلامذہ نے ان سے صحیح بخاری اخذ کی ہے، پھر اس کی روایت واشاعت کا سلسلہ جاری کیا ہے، ان کی روایت کردہ صحیح بخاری کو ان کا نسخۂ بخاری کہا جاتا ہے۔ مثلاً (۱) نسخۂ فربری، یہ امام محمد بن یوسف فربری (م ۳۲۰ھ) کا نسخہ ہے۔ (۲) نسخۂ نسفی یہ امام ابراہیم بن معقل نسفی (م ۲۹۵ھ) کا نسخہ ہے۔ (۳) نسخۂ حموی، یہ امام حماد بن شاکر

نسوی (م ۳۱۱ھ) کا نسخہ ہے۔ (۴) نسخۂ بزدوی، یہ امام ابو طلحہ منصور بن محمد بزدوی (م ۳۲۹ھ) کا نسخہ ہے[1] صحیح بخاری کے یہ چار نسخے بہت مشہور ہیں۔ ان کے علاوہ اور بھی نسخے ہیں مثلاً نسخۂ کشمیہنی اور نسخۂ سرخسی وغیرہ۔

صحیح بخاری کے یہ نسخے متفق اللفظ نہیں ہیں بلکہ ان میں جابجا الفاظ کی کمی بیشی اور عبارتوں کے اختلافات پائے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ ہر نسخہ معتبر ہے۔ اس کی توجیہ یہی ہے کہ ہر نسخہ کی روایت امام بخاری سے ثابت ہے اور بخاری نے انھیں متعدد شکلوں میں روایت کیا ہے اسی وجہ یہ ہے کہ ہر صورت امام موصوف کے نزدیک صحیح اور معتبر ہے۔

غرض یہ حقیقت مسلم ہے کہ صحیح بخاری کے متعدد نسخوں میں الفاظ کی کمی بیشی اور عبارتوں کے اختلافات پائے جاتے ہیں، مگر سب معتبر ہیں۔ خود صحیح بخاری مطبوعۂ ہند کے ہر صفحہ میں نسخوں کے اختلاف کی نشان دہی کی گئی ہے اس بنا پر اگر بخاری کے کسی نسخہ میں آل الیس کے نام کے ساتھ سلام مرقوم ہے اور کسی نسخہ میں مرقوم نہیں تو یہ کہنا صحیح نہیں کہ بخاری میں اس نام کے ساتھ سلام نہیں ہے۔

صحیح بخاری مطبوعۂ ہند میں علی علیہ السلام

صحیح بخاری شائع کردہ مکتبہ رشیدیہ دہلی ج ۲ ص ۷۱۹ میں بسلسلہ تفسیر سورہ ذاریات مرقوم ہے۔

وَالذّٰرِیٰتِ قال علی ؑ الریاح

والذاریات علی نے کہا ہے۔ الذاریات کے معنی ہیں۔ ہوائیں۔

---

[1] امام فربری کا خیال تھا کہ اب صحیح بخاری روایت کرنے والوں میں میں ہی رہ گیا ہوں لیکن انھیں اس کا علم نہ تھا کہ ابھی ابو طلحہ بزدوی بھی زندہ ہیں۔ امام ابو طلحہ بزدوی کا انتقال امام فربری کے ۹ سال بعد ہوا ہے (ہدی الساری حافظ ابن حجر ج ۲ ص ۲۰۴) اس لحاظ سے امام ابو طلحہ بزدوی صحیح بخاری کے آخری راوی ہیں۔ ۱۲ کوثر

لفظ علی پر "ذ" کا ہندسہ لکھ کر حوض اور حاشیہ کی درمیانی پٹی میں علیہ السلام مرقوم ہے۔ یہ پٹی اس حقیقت کو بتانے کے لیے ہے کہ حوض کی جس عبارت پر ہندسہ لگا ہے اس کا ایک نسخہ اور ہے جو اس پٹی میں درج ہے۔ اس طرح بتا دیا گیا ہے کہ یہ عبارت ایک نسخہ میں اس طرح ہے:

قال علی علیہ السلام: الریاح — علی علیہ السلام نے کہا ہے کہ ذاریات کے معنی ہوا ہے۔

اگر استقصا کیا جائے تو خود بخاری مطبوعہ ہند کے اور مقامات پر بھی اطلاع ملے گی کہ یہاں بھی صحیح بخاری کے دوسرے نسخہ میں آل یٰس کے نام کے ساتھ لفظ سلام موجود ہے، لیکن کاموں کے ہجوم، وقت کی قلت، پے در پے امراض کے حملے اور شائقین مناقب اہل بیت کا پیہم اصرار کہ کتاب جلد سے جلد چھپ کر محبین اہل بیت کے دلوں کو سرور بخشے ان متعدد امور کی بنا پر استقصا کا موقع نہیں لَعَلَّ اللهَ يُحْدِثُ بَعْدَ ذٰلِكَ أَمْرًا ط۔

صحیح بخاری کے ایک ایسے ایڈیشن کی شدید علمی ضرورت ہے جس میں صحیح بخاری کے متعدد نسخوں کے اختلاف کو نسخہ کا نام لکھ کر بتایا جائے۔ اس کے آڈٹ کرنے کے لئے متعدد نسخوں کو فراہم کرنا ضروری[1] ہے اور یہ ایک شخص کا کام نہیں کہ اس میں بہت بڑے سرمائے اور بڑی کدوکاوش کی ضرورت ہے۔

---

[1] کہاں اہم دینی کتابوں کی اشاعت کے لئے اتنے اہتمام کی ضرورت ہے اور کہاں ہندوستانی مطابع کا یہ حال ہے کہ حدیث کی امہات کتب سنن ترمذی وغیرہ کی اشاعت میں بھی افسوسناک تغافل برت رہے ہیں، جس سے کتاب کی تحریف ہو رہی ہے۔ مثلاً سنن ترمذی ج ۲ ابواب الدعوات میں ایک دعا مذکور ہے۔ جو خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تعلیم فرمائی ہے۔ اس کے الفاظ یہ ہیں اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ وَاَتَوَجَّهُ اِلَيْكَ بِنَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ نَّبِيِّ الرَّحْمَةِ يَا مُحَمَّدُ اِنِّيْ اَتَوَجَّهُ بِكَ اِلٰى رَبِّيْ فِيْ حَاجَتِيْ هٰذِهٖ لِتُقْضٰى لِيْ اَللّٰهُمَّ شَفِّعْهُ فِيَّ۔ اس دعا میں جو یا محمد کا لفظ آیا ہے وہ سنن ترمذی، شائع کردہ امین کمپنی اردو بازار دہلی میں نہیں۔ اور مطبوعہ رحیمیہ دیوبند میں بھی نہیں، حالانکہ یہ بہت بڑی غلطی ہے، جو دیگر مطابع کی سنن ترمذی کے تقابل سے واضح ہو جاتی ہے۔

ائمۂ حدیث کی شروح بخاری سے بھی اس کا علم ہوتا ہے کہ صحیح بخاری میں آل یٰسین کے نام کے ساتھ لفظ سلام موجود ہے۔

صحیح بخاری میں ایک باب اس عنوان سے ہے: باب مناقب قرابة رسول الله صلی الله علیه وسلم ومنقبة فاطمه علیها السّلام۔

صحیح بخاری مطبوعہ رشیدیہ دہلی ج ا ص ۵۲۶ میں یہ باب بلا "ومنقبة فاطمة علیها السلام" مرقوم ہے۔ اور حوض کے اوپر نسخہ دکھایا گیا ہے، کہ ایک نسخہ میں یہ بھی ہے: " ومنقبة فاطمة بنت رسول الله صلی الله علیه وسلّم " لیکن اس میں بھی "علیہا السلام" نہیں ہے۔

با ایں ہمہ " ومنقبة فاطمة علیها السّلام " کی عبارت یقیناً صحیح بخاری کی عبارت ہے کیونکہ امام بدرالدین عینی عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ج ۷، ص ۶۳۷ میں اور امام شہاب الدین قسطلانی اپنی شرح بخاری ج ا ص ۹۷ میں صحیح بخاری کے اس باب کی عبارت نقل کرتے ہیں تو اس میں " ومنقبة فاطمة علیها السلام " بھی نقل کرتے ہیں۔ اس طرح ان دونوں بلند پایہ ائمۂ حدیث نے ہمیں بتایا ہے کہ اس موقع پر صحیح بخاری میں " ومنقبة فاطمة علیها السلام " کی عبارت موجود ہے۔

اگر مزید تفحص کیا جائے تو اور شواہد بھی دستیاب ہو جائیں گے۔

اور کتب دینیہ میں بھی آل یٰسین کے ذکر کے بعد لفظ علیہ السلام مذکور ہے

حدیث، تفسیر، فقہ، تصوف اور دیگر علوم دینیہ کی کتابوں میں آل یٰسین کے ذکر کے بعد ==== ہو جاتی ہے۔ اذکار نووی والحصن الحصین وعدۃ الحصن سے بھی واضح ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان تینوں کتابوں میں یہ دعا مع لفظ یا محمد سنن ترمذی سے منقول ہے۔ سنن ترمذی کے ان نسخوں میں اس دعا کی روایت میں اور غلطی بھی ہے۔ ۱۲ کوثر

اس کثرت سے لفظ سلام مذکور ہے کہ اکٹھا کر دیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ہو جائے۔ ابھی گذشتہ باب میں صحیح بخاری کے اٹھارہ مقامات کے صفحات پیش کئے گئے ہیں۔ جن میں آل یٰس کا نام مع سلام مذکور ہے، اگر تفحص کیا جائے تو اٹھارہ سے زیادہ بلکہ بیس سے بھی زیادہ ایسے مقامات ملیں گے۔ یہ تو صرف صحیح بخاری کا حال ہے۔ اب اگر حدیث و تفسیر، فقہ و دیگر علوم دینیہ کی کتابوں کے ایسے مقامات کی عبارتیں درج کی جائیں تو اندازہ لگائیے کہ کتاب کی ضخامت کتنی بڑھ جائیگی اختصار کے مدنظر اتنا لکھنا کافی ہے کہ تفسیر امام ابن جریر طبری، تفسیر امام رازی، تفسیر مظہری، احکام القرآن، امام جصاص رازی، فتح الباری، شرح صحیح بخاری، اشعۃ اللمعات امام عبدالحق محدث دہلوی وغیرہ میں جا بجا آل یٰس کے نام کے ساتھ سلام موجود ہے۔ مشکل الآثار امام طحاوی، سنن ابی داؤد، التاج الجامع للاصول[1] میں بھی ان کے نام کے ساتھ سلام مذکور ہے، شاہ ولی اللہ محدث دہلوی، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی تحریروں میں بھی ان قدسیوں کے نام کے ساتھ سلام موجود ہے، نہایت بلند پایہ اور مستند علماء اہل سنت کی بکثرت کتابوں میں اس کا ایک بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ چند حوالے ملاحظہ ہوں۔

---

[1] ان تینوں کتابوں کی عبارتیں اوپر لکھی جا چکی ہیں۔ مشکل الآثار ج ۱ ص ۵۱ میں ایک روایت اس موضوع پر بڑی اہم ہے جس کے خاص اجزا یہ ہیں ــــ "حضرت فاطمہ بنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہوئیں۔ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم عیادت کو تشریف لائے اور مزاج پرسی فرمائی"۔ حضرت فاطمہ نے کہا "یا رسول اللہ بڑی تکلیف ہے۔ مزید تکلیف یہ ہے کہ کھانے کو کچھ بھی نہیں"، اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رو پڑے اور فاطمہ علیہا السلام بھی رو پڑیں۔ متن یہ ہے: دبکت فاطمة علیها السلام ؛ اس روایت میں یہ بھی ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا۔ بیٹی صبر کرو۔ پھر یہ بھی فرمایا "کیا تم اس پر خوش نہیں ہوتیں کہ تم تمام عالم کی عورتوں کی سردار ہو اور اس کی قسم جس نے مجھ کو حق کے ساتھ بھیجا ہے۔ میں نے تمہاری شادی اس آدمی سے کی ہے جو دنیا میں بھی سردار ہے اور آخرت میں بھی سردار ہے، اس سے صرف منافق ہی بغض رکھے گا"۔ (ملخصاً) ۱۲ کوثر۔

امام ابوبکر جصاص رازی کی احکام القرآن میں علی علیہ السلام

امام ابوبکر جصاص رازی (متوفی ۳۷۰ھ) فقہ حنفی کے نہایت بلند پایہ امام ہیں۔ حتیٰ کہ امام سرخسی بلکہ ان کے جلیل القدر استاد امام شمس الائمہ حلوانی سے بھی ان کا پایہ بلند ہے۔ خود امام حلوانی آپ کے متعلق فرماتے ہیں۔

"یہ بہت بڑے شخص ہیں، ہم ان کی تقلید کرتے ہیں۔ اور ان کا قول لیتے ہیں"(النافع الکبیر ص۱۰) آپ فقہ کے علاوہ حدیث کے بھی امام ہیں، امام حاکم صاحب مستدرک نے آپ سے حدیث کی سماعت کی ہے، آپ کے حفظ حدیث کا یہ عالم ہے کہ سنن ابی داؤد، مصنف ابن ابی شیبہ مصنف عبدالرزاق اور مسند ابی داؤد طیالسی تقریباً از بر تھیں۔ آپ فن تفسیر کے بھی امام ہیں، احکام کی آیتوں کی تفسیر میں بعد کا کوئی بھی مفسر آپ کا ہم پایہ نہیں، اس کا ثبوت آپ کی مشہور عالم کتاب احکام القرآن ہے جو چھپ چکی ہے۔ راقم السطور کی نگاہوں سے اس کے دو ایڈیشن گذرے ہیں۔ مناقب اہل بیت کی تالیف کے سلسلہ میں مطبعۃ بہیۃ مصریہ کا ایڈیشن سامنے رہا ہے۔ (اس کتاب میں اسی ایڈیشن کے صفحات کا حوالہ ہے)۔

آپ نے احکام القرآن میں کئی جگہ سیدنا حضرت علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ الکریم کے نام کے ساتھ علیہ السلام — تحریر فرمایا ہے۔ چند حوالے درج ذیل ہیں۔

۱۔ امام موصوف اس مسئلہ کے سلسلہ میں کہ فاسق کی خلافت ناجائز ہے، تحریر فرماتے ہیں۔

لیکن ان کی طرف سے عہدہ قضا قبول کرنا جائز ہے اور یہ خلفا بیت المال سے جس کو رقم دیں، وہ قبول کر سکتا ہے۔ چنانچہ صحابہ اور تابعین بنی امیہ کی وہ رقم قبول کر لیتے تھے جو انھیں بیت المال سے دیتے تھے، کیونکہ بیت المال میں ان کا حق ہے۔ اس کے بعد لکھتے ہیں:

وقد کان الحسن وسعید بن جبیر والشعبی وسائر التابعین	حسن بصری سعید بن جبیر اور شعبی اور تمام تابعین ان ظالموں[1] کے ہاتھ سے اپنی

[1] ان ظالموں سے مراد خلفائے بنی امیہ ہیں جیسا کہ موصوف پہلے ذکر کر چکے ہیں، اس سلسلہ میں عبدالملک اور اس کے گورنر حجاج =

يأخذون أرزاقهم من أيدي هذه الظلمة، لا على أنهم كانوا يتولونهم، ويرون إمامتهم وإنما كانوا يأخذونها على أنها حقوق لهم في أيدي قوم فجرة وكيف يكون ذلك على وجه موالاتهم، وقد ضربوا وجه الحجاج بالسيف، وخرج عليه من القراء أربعة آلاف رجل هم خيار التابعين وفقهاؤهم فقاتلوه مع عبد الرحمن بن الأشعث بالأهواز ثم بالبصرة ثم بدير الجماجم من ناحية الفرات لقرب الكوفة، وهم خالعون لعبد الملك، لاعنون لهم، متبرؤن منهم،

روزی لیتے تھے، لیکن اس بنا پر نہیں کہ وہ ان ظالموں سے موالات رکھتے تھے اور ان کی خلافت و امامت کو صحیح سمجھتے تھے۔ وہ تو بس اس لئے اسے لیتے تھے کہ یہ ان کا حق ہے جو ان فاجر لوگوں کے دست تصرف میں ہے۔ بھلا یہ لینا موالات کے طور پر کیسے ہو سکتا ہے؟ جبکہ ان لوگوں نے حجاج کے مقابلہ میں تلوار چلائی اور قرآن خواں لوگوں میں سے چار ہزار نفوس نے اس کے مقابلہ میں خروج کیا۔ یہ لوگ تابعین کے بہترین نفوس اور ان کے فقہا تھے۔ ایسے بہترین لوگوں نے عبد الرحمن بن اشعث کا ساتھ دیکر حجاج (کی فوج) سے اہواز میں قتال کیا۔ پھر بصرہ میں، پھر کوفہ کے قریب فرات کے ساحلی مقام دیر جماجم میں اس وقت ان لوگوں نے عبد الملک کی بیعت

= کے نام لے کر فرماتے ہیں "لم یکن فی العرب ولا فی آل مروان اظلم ولا اکفر ولا افجر من عبد الملک، ولم یکن فی عماله اکفر ولا اظلم ولا افجر من الحجاج"۔ یعنی عرب میں اور آل مروان میں عبد الملک بن مروان سے بڑھ کر ظالم کافر اور فاسق کوئی نہ تھا۔ اور اس کے عاملین میں حجاج سے بڑھ کر ظالم اور فاجر کوئی نہ تھا۔ (احکام القرآن ج ۱ ص ۸۲)۔ ۱۲ کوثر

وكذلك كان سبيل من قبلهم مع معاويه حين تغلب على الامر بعد قتل علی علیه السلام وقد كان الحسن والحسين يأخذان العطاء، وكذلك من كان في ذالك العصر من الصحابة وهم غير متولين له، بل متبرؤن منه على السبيل التي كان عليها علی علیه السلام الى ان توفاه الله تعالى الى جنته ورضوانه، فليس اذاً في ولاية القضاء من قبلهم ولا اخذ العطاء منهم دلالة على توليتهم واعتقاد امامتهم،

(احکام القرآن ج ۱ ص ۸۲)

توڑ دی تھی)، اس پر لعنت کرتے تھے اور اس سے بیزاری ظاہر کرتے تھے۔

ایسی ہی روش (یعنی خلفا سے عطیہ لینا حالانکہ وہ ان سے سخت بیزار ہیں) اگلے لوگوں کی معاویہ کے ساتھ تھی جبکہ علی علیہ السلام کے حادثۂ قتل کے بعد معاویہ نے تغلب حاصل کر لیا تھا۔ حسن وحسین معاویہ کی دی ہوئی رقم لیتے تھے اسی طرح اس زمانے کے صحابہ کا بھی عمل تھا۔ حالانکہ یہ لوگ معاویہ سے موالات نہیں رکھتے تھے بلکہ اسی طرح معاویہ سے بیزار تھے، جس طرح علی علیہ السلام (زندگی بھر) بیزار تھے۔ حتیٰ کہ آپ کا وصال ہوا اور اللہ نے آپ کو اپنی جنت اور مقام رضوان میں داخل فرمایا

اس تفصیل سے ظاہر ہے کہ خلفائے جور کی طرف سے عہدۂ قضا قبول کرنا اور ان کی دی ہوئی رقم کو لینا اس کا ثبوت نہیں کہ یہ لوگ ان خلفا سے موالات رکھتے تھے اور ان کی خلافت کو برحق ماننے کا عقیدہ رکھتے تھے۔

اس عبارت میں امام جصاص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ الکریم کو دو جگہ علی علیہ السلام لکھا ہے (جس پر خط کھنچا ہوا ہے۔) آپ نے اور مقامات پر بھی علی علیہ السلام لکھا ہے۔ چنانچہ احکام القرآن ج ۱ ص ۵۷ میں لکھتے ہیں:

۲۔ عن علی بن ابی طالب علیه السلام

علی بن ابی طالب علیہ السلام سے مروی ہے

ان ھولاء العرافین کھان العجم فمن اتیٰ کاھنا یومن لہ بما یقول فھو بری مما أنزل علی محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام ۔

کہ یہ نجومی لوگ عجم کے کاہن ہیں ۔ (یعنی غیب دانی کا پیشہ کرنے والے ہیں) اور جو شخص کاہن کے پاس جا کر اس کی (غیب دانی کی) باتوں کو مان لے وہ اس سے الگ ہو گیا جس کو اللہ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا ہے ۔

۳۳ ۔ احکام القرآن ج ۱ ص ۱۴۶ میں ہے ۔

ان علیا علیہ السلام قال اذا سمعتم الیھود والنصاریٰ یھلون لغیر اللہ فلا تاکلوا واذا لم تسمعوھم فکلوا فان اللہ قد احل ذبائحھم ۔

علی علیہ السلام نے فرمایا ہے کہ جب یہود و نصاریٰ کو جانور ذبح کرتے وقت اللہ کے سوا کسی اور کا نام لیتے ہوئے سنو تو اس ذبیحہ کو نہ کھاؤ، اور جب غیر خدا کا نام لیتے ہوئے نہ سنو تب ان کا ذبیحہ کھاؤ کہ اللہ نے ان کا ذبیحہ حلال قرار دیا ہے ۔

اس موضوع کے پیش نظر احکام القرآن کا بالاستیعاب مطالعہ کیا جائے تو امید ہے کہ اس قسم کی عبارت اور بھی ملے گی ۔

فتح الباری شرح صحیح بخاری میں فاطمہ علیہا السلام

نویں صدی ہجری سے لے کر آج تک پوری دنیائے اسلام میں امام (ابو الفضل شہاب الدین احمد علی بن محمد معروف بہ) حافظ ابن حجر عسقلانی (متوفی ۸۵۲ھ) جیسا حافظ الحدیث و امام فن پیدا ہی نہیں ہوا۔ اسی لئے آپ کو حافظ الدنیا اور حافظ الشان کہتے ہیں۔ آپ کی فتح الباری اکثر اربابِ تحقیق کے نزدیک صحیح بخاری کی بہترین شرح ہے۔ اس میں جابجا آل یٰسٓ کے ذکر کے بعد سلام مذکور ہے، اس کی ساتویں جلد مطبوعہ خیریہ مصر میں ایک صفحہ کے فاصلہ سے دو جگہ حضرت فاطمہ کے لئے علیہا السلام مرقوم ہے ۔

۱۔ صفحہ ۶۷ کی آخری سطر میں لکھتے ہیں کہ امام احمد کے یہاں ابن ابی ملیکہ سے مروی ہے۔

کانت فاطمۃ علیہا السلام[1] ترقص الحسن و تقول :۔	فاطمہ علیہا السلام حسن کو اچھال اچھال کر کھلاتی تھیں اور فرماتی تھیں۔
ابنی شبیہ بالنبی،	میرا بچہ نبی کا ہم شکل ہے
لیس شبیھًا بعلی،	علی کا ہم شکل نہیں ہے

۲۔ صفحہ ۶۸ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک گونہ مشابہت رکھنے والے چند حضرات کے نام پیش کئے ہیں۔ وہ یہ ہیں (۱) حضرت امام حسن (۲) حضرت امام حسین (۳) حضرت جعفر طیار۔ (۴) حضرت قثم ابن عباس بن عبدالمطلب (۵) حضرت صائب (۶) حضرت ابوسفیان[2] بن حارث بن عبدالمطلب (۷) حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز (۸) حضرت عبداللہ بن جعفر طیار (۹) حضرت مسلم بن عقیل (۱۰) حضرت کابس بن ربیعہ۔

یہ فہرست مکمل نہیں ہے۔ چنانچہ اس میں حضرت علی اکبر شہید کربلا کا نام نہیں ہے، حالانکہ وہ حسنین طاہرین کے بعد بہت ہی زیادہ ہم شکل نبی تھے۔ ان ناموں کے لکھنے کے بعد لکھتے ہیں۔

ان فاطمۃ ابنتہ علیہا السلام کانت تشبہہ۔	آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت فاطمہ) علیہا السلام بھی (ایک گونہ) ہم شکل نبی تھیں۔

عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری میں فاطمہ علیہا السلام

نویں صدی ہجری میں حافظ ابن حجر کے بعد فن حدیث کے سب سے بڑے امام علامہ محمود بدرالدین عینی حنفی (متوفی ۸۵۵ھ) ہیں جو

---

[1] اس حوالہ سے ظاہر ہے کہ مسند احمد میں بھی فاطمہ علیہا السلام موجود ہے۔ ۱۲ کوثر

[2] یہ امیر معاویہ کے باپ نہیں ہیں بلکہ حضرت عبدالمطلب کے پوتے اور حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچیرے بھائی ہیں۔ ۱۲ کوثر

فقہی بصیرت اور وقت نظر میں حافظ ابن حجر سے آگے ہیں۔ آپ کی عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری بعض امور میں فتح الباری سے بھی آگے ہے۔ امام موصوف اس کی جلد ۷ صفحہ ۶۴۳ میں مناقب قرابت نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے باب میں صحیح بخاری کا عنوان ان الفاظ میں درج کرتے ہیں:

باب مناقب قرابة رسول الله صلى الله عليه وسلم ومنقبة فاطمة عليها السلام	قرابت رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مناقب اور فاطمہ علیہا السلام کی منقبت کا باب۔

ارشاد الساری شرح صحیح بخاری میں فاطمہ علیہا السلام

دسویں صدی ہجری میں امام سیوطی اور حافظ سخاوی کے بعد سب سے بڑے محدث علامہ شہاب الدین احمد بن محمد مشہور بہ علامہ قسطلانی متوفی ۹۲۳ھ ہیں۔ آپ کی ارشاد الساری شرح صحیح بخاری درحقیقت فتح الباری اور عمدۃ القاری کا بہترین خلاصہ ہے۔ اس کی جلد ۶ صفحہ ۹ مطبوعہ ہند میں بھی بعینہ وہی عبارت ہے جو اوپر عمدۃ القاری کے حوالہ سے نقل کی گئی ہے۔

اشعۃ اللمعات میں اہل کسا کو سلام

دسویں گیارہویں صدی ہجری میں پورے ہندوستان میں علوم نبوت، علوم قرآن وحدیث و فقہ و تصوف کے جامع اعظم اور امام اکبر حضرت علامہ امام شیخ عبد الحق محدث دہلوی قدس سرہٗ العزیز (متوفی ۱۰۵۲ھ) تھے آپ ہی نے سب سے پہلے ہندوستان کے ہر علاقہ میں علم حدیث کی اشاعت فرمائی۔ اس زمانہ میں شرفائے ہند عام طور فارسی سمجھتے اور اس میں اپنے علمی خیالات کا اظہار کرتے تھے۔ حضرت موصوف نے ان کو علم نبوت عطا فرمانے کے لئے فارسی میں مشکوٰۃ کی اتنی بلند پایہ شرح لکھی جس کا جواب آج تک نہ ہوسکا۔ اس کا نام اشعۃ اللمعات ہے۔ یہ کتاب فتح الباری شرح صحیح بخاری اور عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری پر بھی اس باب میں فوقیت رکھتی ہے کہ اس میں ظرف علوم نبوت کا بیان اور تشریح و تفصیل ہے۔ اور اس کا پڑھنے والا اپنے کو ایسا محسوس کرتا ہے کہ گویا دربار

نبوی میں حاضر رہے اور علوم نبوت کے لعل و جواہر سے دامن بھر رہا ہے۔

اشعۃ اللمعات میں حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کے اسمائے طیبہ کے بعد سلام کا ذکر کئی جگہ ہے ایک مقام پر ان چاروں حضرات کے نام لکھ کر سلام تحریر فرماتے ہیں۔ ملاحظہ ہو اشعۃ اللمعات جلد ۴ صفحہ ۶۸۱ کی عبارت ذیل:۔

باوجود شمول اہل بیت تمامۂ اولاد آنحضرت را علی و فاطمہ و حسن و حسین سلام اللہ علیہم اجمعین از میان ایشان ممیز اند بمزید فضل و کرامت و بر تعلق محبت و مودت ممتاز مخصوص از جنانکہ متبادر اند اطلاق اہل بیت ایشانند (باب مناقب اہل بیت)	باوجودیکہ اہل بیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام اولاد شامل ہیں لیکن علی، فاطمہ اور حسن و حسین سلام اللہ علیہم اجمعین ان تمام لوگوں میں مزید فضیلت و بزرگی کی وجہ سے امتیازی شان رکھتے ہیں۔ اور محبت و مودت نبوی کا جو تعلق ان سے ہے۔ اس کی بنا پر بھی ان میں یہ حضرات ممتاز اور مخصوص ہیں چنانچہ لفظ اہل بیت بولا جاتا ہے تو یہی لوگ سمجھے جاتے ہیں۔

اشعۃ اللمعات کی تصریح کہ قدیم زمانہ میں اہل بیت کیلئے سلام کا استعمال متعارف تھا

صلوٰۃ وسلام دونوں کو ملا کر غیر نبی کے لئے بالاستقلال استعمال کرنا جائز ہے یا نہیں؟ شیخ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ اس میں اختلاف ہے۔ جمہور نے اس کو اختیار کیا ہے کہ یہ (یعنی صلوٰۃ وسلام دونوں کو ملا کر بولنا) صرف انبیاء کے حق میں مخصوص ہے۔ غیر نبی کی اس میں شرکت نہیں۔ طیبی نے نقل کیا ہے کہ یہ خلاف اولی ہے بعض نے کہا ہے کہ حرام ہے یا مکروہ تحریمی ہے یا مکروہ تنزیہی ہے۔

یہ تو صلوٰۃ وسلام دونوں کو ملا کر استعمال کرنے کا معاملہ ہوا۔ صرف سلام نبی کے علاوہ کسی اور نام کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے یا نہیں؟ اس کی حقیقت حضرت شیخ محدث دہلوی

کی زبان سے سنئیے، اشعۃ اللمعات جلد اول صفحہ ۴۰۵ (مطبوعہ نول کشور لکھنؤ ۱۳۵۴ھ) میں ہے۔

متعارف در متقدمین تسلیم بود بر اہل بیت رسول و ذریت و ازواج مطہر؛ و در کتب قدیمہ از مشائخ اہل سنت و جماعت کتابت آں یافتہ می شود، و در متاخرین ترک آں متعارف شدہ است۔	اہل بیت رسول یعنی آپ کی ذریت اور ازواج مطہرہ کے لئے سلام کا استعمال متقدمین متعارف تھا۔ (یعنی عام طور پر مستعمل تھا) اور اہل سنت و جماعت کے مشائخ کی قدیم کتابوں میں اس کی تحریر بھی پائی جاتی ہے اور متاخرین میں اس کو چھوڑ دینا متعارف ہوا

غور کرو، متقدمین جو تفسیر، حدیث، فقہ و دیگر علوم دینیہ کے امام تھے۔ اس میں عام طور پر یہ رواج تھا کہ اہل بیت کے نام کے ساتھ لفظ سلام استعمال فرمایا کرتے تھے، یہ حضرات علم دین، زہد و تقویٰ، احتیاط اور ورع غرض ہر چیز میں متاخرین سے آگے تھے۔ اب ان کے متعارف عمل کو لیا جائے گا جو نص[1] قرآنی سلامٌ علیٰ آل یاسین ٥ کا اقتضا ہے۔ نیز صحابۂ کرام کے عمل سے مدلل بھی ہے یا متاخرین کے ترک کو لیا جائے گا؟ جو اقتضائے قرآنی کے بھی خلاف ہے، اور ان کا یہ ترک چلا بھی نہیں، چنانچہ خود حضرت محدث دہلوی کی روش بھی ان کے خلاف ہے جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ حضرت موصوف نے حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کے نام کے ساتھ سلام اللہ علیہم اجمعین تحریر فرمایا ہے۔ آپ کے بعد بھی علمائے اہل سنت اور اولیائے ربانی ان حضرات کے نام کے ساتھ لفظ سلام برابر استعمال فرماتے رہے ہیں جس کا سلسلہ آج تک جاری ہے اور انشاء اللہ ہمیشہ

---

[1] یعنی لفظ قرآنی **ف** جب صرف نص کہتے ہیں تو عام طور پر نص قرآنی مراد ہوتی ہے۔ اور قرائن کی بنا پر نص حدیث وغیرہ بھی مراد ہوتی ہے۔ علامہ عبد العلی بحر العلوم فتح الرحموت شرح مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں کہ "کتاب الہٰی، سنت رسول اور اجماع میں سے ہر ایک کو نص کہا جاتا ہے۔" (ص ۱۲۱) لیکن جب مطلق نص ہو اور نص حدیث و اجماع مراد لینے کا کوئی قرینہ نہ ہو تو نص قرآنی مراد ہوتی ہے۔ ۱۲ کوثر

جاری رہے گا کہ جو عمل اقتضائے قرآنی ہے اور صحابۂ کرام نیز لاکھوں بلکہ کروڑوں علمائے دین اور اولیائے ملت کا معمول ہے اس کو مٹانا محال ہے۔

تفسیر مظہری میں اہل کسا کو سلام

بارہویں صدی ہجری میں حضرت قاضی ثناءاللہ پانی پتی (متوفی ۱۲۲۵ھ) تفسیر، حدیث، فقہ اور تصوف کے نہایت جامع علامہ اور عارف کامل تھے۔ فن حدیث میں آپ کے تبحر کا یہ عالم تھا کہ شاہ عبدالعزیز صاحب آپ کو بیہقی وقت کہتے تھے۔ فقہ اور حدیث کی وسعت علمی اور دقت نظر کے اس مقام اعلیٰ پر فائز تھے کہ آپ کو طحاوی زمانہ کہا جائے تو بے جا نہیں۔ قرآنی حقائق و معارف میں آپ کا درجہ شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی سے آگے ہے جس کا ثبوت آپ کی تفسیر مظہری ہے۔ انصاف کی بات یہ ہے کہ یہ تفسیر، قرآنی حقائق و بصائر کو عرفان کی اتنی بلندی سے بیان کرتی ہے کہ تفسیر شیخ اکبر اور تفسیر مخدوم علی مہائمی مسمیٰ بہ تبصیر الرحمٰن کے بعد یہی کتاب درجہ پانے کی مستحق ہے، اس تفسیر میں احادیث اور فقہی نصوص کا بہت بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ آپ نے رد شیعہ میں بھی ایک کتاب لکھی ہے جس کا نام السیف المسلول ہے۔ خود تفسیر مظہری میں بھی جابجا شیعہ عقائد و نظریات کی تردید کی ہے۔ اب یہ تحقیق کہ ایسا سُنّی محقق، اور ایسا بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ بھی علی علیہ السلام لکھتا ہے۔ حوالے ملاحظہ ہوں۔

ا۔ حضرت قاضی صاحب موصوف تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۹۹ میں حدیث ثقلین اور اس کی ہم مضمون حدیث لکھ کر رقم طراز ہیں :-

قلتُ : اشار النبی صلی اللہ علیہ وسلم الی اھل البیت انھم اقطاب الارشاد فی الولات اولھم علی علیھم السلام، ثم ابناؤہ الی الحسن العسکری و	میں کہتا ہوں (ان احادیث میں) نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل بیت کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ یہ لوگ ولایت کے قطب الارشاد ہیں، ان میں پہلے قطب الارشاد علی علیہ السلام ہیں پھر آپ کے فرزندان گرامی حسن عسکری تک

آخرهم غوث الثقلین محی الدین عبد القادر الجیلی رضی اللہ عنہم اجمعین ۔

اور آخری قطب الارشاد غوث الثقلین محی الدین عبد القادر جیلانی رضی اللہ عنہم اجمعین ہیں ۔

۲ - تفسیر مذکور کی جلد ۲ صفحہ ۱۱۴ میں ہے :

کان قطب ارشاد کمالات الولایۃ علی علیہ السلام، ما بلغ احد من الامم السابقۃ درجۃ الاولیاء الا بتوسط روحہ رضی اللہ عنہ ثم کان بتلک المنصب الائمۃ الکرام ابنائہ الی الحسن العسکری وعبد القادر الجیلی ۔

کمالات ولایت کے قطب الارشاد علی علیہ السلام تھے، اگلی امتوں میں بھی کوئی شخص آپ کی روح کے توسط کے بغیر درجۂ ولایت پر پہونچا ہی نہیں، رضی اللہ تعالیٰ عنہ، پھر اس منصب پر آپ کے فرزندان گرامی یعنی ائمۂ اہل بیت ہوئے۔ (امام حسن عسکری اور حضرت شیخ) عبد القادر جیلانی تک ۔

فتاویٰ عزیزی میں اہل کسا پر سلام کا فتویٰ

تیرہویں صدی میں ہندوستان کے سب سے مشہور عالم اور سب کے مقتدا و مرجع حضرت شاہ عبد العزیز صاحب محدث دہلوی تھے۔ حدیث، تفسیر، فقہ اور تصوف میں یگانۂ روزگار تھے۔ سنہ ۱۲۳۹ھ میں انتقال فرمایا۔ اس وقت آپ کی عمر شریف ۸۰ سال تھی۔ تفسیر فتح العزیز، تحفہ اثنا عشریہ، اور فتاویٰ عزیزی آپ کی یادگار ہیں۔ تحفہ اثنا عشریہ رد شیعہ میں ہے، اس میں جابجا ائمۂ اہل بیت کے نام کے ساتھ سلام لکھا ہے۔ آپ نے اس پر فتویٰ بھی دیا ہے جو فتاویٰ عزیزی صفحہ ۸۰ میں موجود ہے۔ عبارت یہ ہے۔

صلوٰۃ بالاستقلال بر غیر انبیا واقع نیست، آرے علیہ السلام در حق امیر المومنین وحضرت سیدۃ النساء وجناب حسنین

غیر نبی پر مستقل طور سے صلوٰۃ کا لفظ واقع نہیں ہوا۔ البتہ علیہ السلام کا لفظ امیر المومنین حضرت علی، اور حضرت

و دیگر ائمۂ مذکور است، مذہب اہل سنت ہمیں است کہ لفظ صلوٰۃ بالاستقلال بر غیر انبیا درست نیست، و سلام بر غیر انبیاء تواں گفت و سندش آں است کہ در کتب قدیمۂ حدیث اہل سنت خصوصًا ابوداؤد و صحیح بخاری بعد از ذکر —— حضرت علی و حضرات حسنین، و حضرت فاطمہ و حضرت خدیجہ و حضرت عباس لفظ علیہ السلام مذکور است، آرے علمائے متقشفین ماوراء النہر ایں اطلاق را برائے تشبہ با شیعہ منع نوشتہ اند، اما تشبہ با بداں در امر خیر ممنوع نمی تواں شد، و برائے الزام مردم می تواں گفت کہ در اول کتاب اصول حنفیہ کہ اصول شاشی است در بعین

سیدۃ النساء (فاطمہ زہراؓ) اور حضرات حسنین اور دیگر ائمۂ اہل بیت کے حق میں مذکور ہے۔ اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ لفظ صلوٰۃ مستقل طور سے غیر نبی پر استعمال کرنا درست نہیں۔ اور لفظ سلام غیر نبی پر بولا جا سکتا ہے۔ اس کی سند یہ ہے کہ اہل سنت کی قدیم کتب حدیث میں خصوصًا سنن ابوداؤد اور صحیح بخاری میں حضرت علی، حضرات حسنین، حضرت فاطمہ۔ حضرت خدیجہ اور حضرت عباس کے ذکر کے بعد لفظ علیہ السلام مذکور ہے۔ ہاں ماوراء النہر کے متقشف علماء نے شیعہ سے تشبہ کی وجہ سے اس کو منع لکھ دیا ہے لیکن کسی اچھے کام میں برے لوگوں سے تشبہ کو منع نہیں کیا جا سکتا[1] اور بطور دلیل الزامی ان لوگوں سے

---

[1] یعنی اہل کتاب کے ساتھ بھی تشبہ کی ہر صورت مذموم نہیں، جیسا کہ فقہا نے تصریح کی ہے۔ الدر المختار میں اہل کتاب سے تشبہ کے ذکر پر لکھتے ہیں۔ فان التشبہ بھم لا یکرہ فی کل شئی بل فی المذموم فیما یقصد بہ التشبہ یعنی اہل کتاب سے ہر شئے میں تشبہ مکروہ نہیں، بلکہ برے کام میں ان سے تشبہ مکروہ ہے۔ اور جس تشبہ کا مقصد ان سے مشابہت پیدا کرنا مقصود ہو وہ مکروہ ہے۔ اس تحقیق کی تائید علامہ شامی نے بھی کی ہے (شامی ج ۱ ص ۴۱۹) اور عقل بھی یہی کہتی ہے کہ ایک فرقہ کے لوگوں کو دوسرے فرقے کے لوگوں سے بہت سی چیزوں میں تشبہ ہوا کرتا ہے =

خطبہ بعد از حمد و صلوٰۃ می گوید،
" والسلام علی ابی حنیفۃ واحبابہ" و
ظاہر است کہ رتبۂ ایں حضرات کہ
نامہائے ایشاں مرقوم شد کم از رتبۂ
امام اعظم نیست، پس نزد ایشاں ہم
اطلاق لفظ سلام بریں بزرگواران جائز
است و مع ہذا در حدیث شریف ہم
تجویز علیہ السلام بر غیر انبیاء
آمدہ، کہ فرمودہ اند، علیہ السلام
تحیۃ الموتیٰ بے تخصیص ، و ایں
حدیث در مشکوٰۃ شریف است
باید دید، و در قرآن مجید است
وَسَلٰمٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ

کہا جا سکتا ہے کہ اصول شاشی کے شروع میں
جو اصول حنفیہ کی کتاب ہے عین خطبہ میں حمد و
صلوٰۃ کے بعد لکھتے ہیں: " والسلام علی ابی
حنیفہ واحبابہ " یعنی ابو حنیفہ اور ان کے
احباب پر سلام۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ یہ
حضرات جن کے نام مرقوم ہوئے ان کا رتبہ
امام اعظم کے رتبہ سے کم نہیں۔ لہٰذا
ان علماء کے نزدیک بھی ان بزرگوں پر لفظ سلام
کا اطلاق جائز ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی ہے کہ حدیث
شریف میں غیر انبیاء کو علیہ السلام کو جائز قرار دیا گیا
ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہے "علیہ
السلام وفات پائے ہوئے لوگوں کو سلام ہے" اور
اس میں انبیاء کی تخصیص نہیں کی گئی ہے۔ یہ حدیث مشکوٰۃ

= کیا یہ سب مکروہ ہیں؟ یہ تو ہو ہی نہیں سکتا، بس وہی تشبہ مکروہ ہے جو برُے کام میں ہو۔ یا جس تشبہ کا مقصد ان لوگوں سے مشابہت پیدا کرنا ہو، لہٰذا جو تشبہ ان دونوں باتوں سے مبرا ہو مثلاً اہل سنت کا اہل کسا کے لئے لفظ سلام استعمال کرنا اس پر کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں۔ اور یہ گفتگو بطور تنزل ہے۔ ورنہ اس میں تو شیعہ سے تشبہ سرے سے ہے ہی نہیں کیونکہ جب شیعہ کا وجود بھی نہیں تھا اس وقت سے اہل کسا پر سلام کا استعمال ہے، یعنی عہد صحابہ سے، جیسا کہ اوپر صحیح بخاری وغیرہ کی متعدد روایتیں لکھی جا چکی ہیں۔ اب یہ شیعہ سے تشبہ ہے یا متعدد صحابہ کی پیروی ہے؟ اور وہ بھی ایسے کام میں جو نص قرآنی سَلٰمٌ عَلٰىٓ اِلْ یَاسِیْنَ ۝ کا اقتضا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہم لوگ مذکورہ نص قرآنی کے اقتضا کی بنا پر، نیز متعدد صحابہ کرام کی پیروی میں اصحاب کسا کے لئے لفظ علیہ السلام استعمال کرتے ہیں۔ ۱۲ کوثر

اصطفیٰ ہ بے تخصیص با نبیاء
پس بلا شبہ جائز باشد۔ (فتاوی
عزیزی بشکریہ المجیب ۱۱۲ مجریہ ربیع الاول
۱۳۹۰ھ مطابق مئی ۱۹۷۰ء)

شریف میں ہے اس میں دیکھ لینا چاہئے اور قرآن مجید
میں سَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی ہ موجود ہے
(ترجمہ یہ ہے ۔ اللہ کے برگزیدہ بندوں پر سلام) اسمیں
بھی انبیا کی تخصیص نہیں فرمائی گئی ہے لہٰذا سلام (جو
اصحاب کِسا کے لئے استعمال کیا جاتا ہے) بلا شبہ جائز ہے۔

بہت صحیح ہے یہ فتویٰ کہ سلام جو اصحاب کِسا یعنی حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کے نام کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے وہ بلا شبہ جائز ہے ۔ اس میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے شمار علماءِ حق اور بے شمار اولیاء اللہ ان بزرگوں کے نام کے ساتھ سلام استعمال کرتے چلے آئے ہیں اور عہد صحابہ سے اس کا سلسلہ چلا ہے اور آج بھی لاکھوں مسلمانوں کا اس پر عمل ہے ۔ لہٰذا اس کے جائز ہونے میں کسی کلام کی گنجائش ہی نہیں ۔

اصحابِ کِسا پر سلام کا استعمال راہِ حق و صواب ہے نیز اس کا جواز متقدمین کے نزدیک مسلم ہے

جب ان بزرگوں پر سلام نص قرآنی
سلامٌ علیٰ آلِ یاسِیْن ہ
کا مقتضا ہے اور متعدد
صحابہ نے ان کے لئے لفظ علیہ السلام استعمال فرمایا ہے تو یقیناً یہ راہ ہدایت ہے ۔ حدیث میں ہے :

اصحابی کالنجوم بایھم
اقتدیتم اھتدیتم ۔

میرے صحابہ تاروں کے مثل ہیں ان میں سے
جس کی بھی اقتدا کروگے ہدایت پر رہوگے ۔

اسی لئے متقدمین میں عام طور پر اس کا استعمال تھا ۔ گذر چکا ہے کہ امام الہند حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ اشعۃ اللمعات جلد اول صفحہ ۴۰۵ میں لکھتے ہیں ۔

متعارف در متقدمین تسلیم بود بر اہلِ
بیت رسول از ذریت وازواج
مطہرہ ۔

اہل بیت رسول یعنی آپ کی ذریت اور ازواج
مطہرہ کے لئے سلام استعمال کرنا متقدمین میں
متعارف تھا (یعنی عام طور پر مستعمل تھا)

یہ بلا نکیر استعمال عام ایک سند ہے کہ قدما کے نزدیک اصحاب کسا کے لئے سلام کا استعمال مُسلّم اور بالکل درست ہے اسی لئے کسی امام نے اسے ناجائز نہیں کہا ہے، پھر آج ناجائز کہنے کی گنجائش کہاں سے نکل سکتی ہے؟ کیا متعدد صحابۂ کرام کے فعل کو جو نص قرآنی کا مقتضا ہے نیز بے شمار علماء اور اولیا کے عمل کو ناجائز کہنے کی جسارت کی جا سکتی ہے؟

البتہ غیر انبیاء پر مستقل طور سے لفظ صلوٰۃ استعمال کرنے کو ائمۂ فقہ نے منع فرمایا ہے عالمگیری جلد ۴ صفحہ ۹۰ مطبع رحیمیہ میں ہے۔

ویکرہ ان یصلی علی غیر النبی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وحدہ فیقول: اللّٰھم صلی علی فلان ولو جمع فی الصلوٰۃ بین النبی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ وبین غیرہ فیقول: اللّٰھم صل علی محمد وعلی آلہ واصحابہ جاز کذا فی فتاوی قاضی خان

یہ مکروہ ہے کہ غیر نبی پر تنہا صلوٰۃ بھیجی جائے، اور یہ کہا جائے اللّٰھم صل علی فلان اور اگر نبی صلی اللہ علیہ وآلہ واصحابہ کے ساتھ کسی اور کو بھی شامل کر لیا جائے۔ چنانچہ اس طرح کہا جائے اللّٰھم صل علی محمد وآلہ واصحابہ تو یہ صورت جائز ہے، جیسا کہ فتاوی قاضی خاں میں ہے۔

ملا علی قاری شرح الفقہ الاکبر صفحہ ۱۵۲ (مطبوعہ دار الکتب العربیۃ الکبری مصر) میں لکھتے ہیں کہ خلاصہ میں ہے کہ اجناس میں امام ابو حنیفہ سے مروی ہے۔

لا یصلی علی غیر الانبیاء والملائکۃ ومن صلی علی غیرھم لا علی وجہ التبعیۃ فھو غال من الشیعۃ التی نسمیھا الروافض، ومفھومہ ان حکم السلام لیس کذلک

وہ انبیاء اور ملائکہ کے علاوہ کسی پر صلوٰۃ نہ بھیجی جائے، جو شخص ان کے علاوہ کسی پر بطور تابع صلوٰۃ بھیجے تو خیر، اور اگر مستقل طور پر بھیجے تو وہ غالی شیعہ لوگوں میں ہے جن کو ہم لوگ روافض کہتے ہیں یہاں اب

ولعل وجهه ان السلام تحيه اهل السلام، ولا فرق بين السلام عليه وعليه السلامُ	ملّا علی قاری کہتے ہیں) اس کلام کا مفہوم یہ ہے کہ سلام کا معاملہ ایسا نہیں ہے (یعنی اسمیں کوئی حرج نہیں) شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ سلام تو مسلمانوں کی دعائے تحیۃ ہے اور السلام علیہ ہو یا علیہ السلام دونوں میں کوئی فرق نہیں

اس سے ظاہر ہے کہ حضرت امام ابوحنیفہ کے نزدیک غیر نبی کے لئے سلام کا استعمال کرنا جائز ہے

ملّا علی قاری مذکورہ بالا عبارت لکھنے کے بعد رقم طراز ہیں۔

الا ان قول علی علیه السلام من شعار اهل البدعة	لیکن علی علیہ السلام کہنا اہل بدعت کا شعار ہے۔

یہ ملّا صاحب کی عبارت ہے اور قابل غور ہے، ملّا صاحب ایک طرف تو یہ بتاتے ہیں کہ امام ابوحنیفہ کے کلام کا مفہوم یہ ہے کہ غیر انبیا کے لئے سلام کا استعمال کرنا مذموم نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی لکھتے ہیں کہ علی علیہ السلام کہنا اہل بدعت کا شعار ہے، یعنی شیعہ کا شعار ہے۔

سوال یہ ہے کہ جب متعدد صحابۂ کرام نے حضرت علی کے نام کے ساتھ سلام کا استعمال فرمایا ہے جیسا کہ اوپر مفصل مذکور ہے تو اس کو اہل بدعت کا شعار کہہ کر مذموم بنانے کا پہلو نکالنا کہاں تک صحیح ہے۔؟

اگر ملّا صاحب کی عبارت کا یہی سرسری مطلب لیا جائے تو ان کی بات حضرت امام ابوحنیفہ کے کلام کے اس مفہوم کے خلاف ہے جو خود ملّا صاحب بیان کر رہے ہیں۔ اور اس سے متعدد صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی پیروی کو اہل بدعت کا شعار کہنے کا جرم بھی لازم آتا ہے۔ اس سے ملّا صاحب کی پوری برائت کی صحیح صورت یہی ہے کہ اگر ان کے کلام کا کوئی ایسا مطلب نکل سکتا ہو جس کی بنا پر یہ جرم لازم نہ آئے تو اسی کو لیا جائے۔ راقم السطور کے نزدیک ایک ایسا بے غبار مطلب نکلتا ہے اور یہ مطلب خود ان کے لفظ "شعار اہل بدعت" میں مضمر ہے۔ لہٰذا پہلے یہ دیکھنا چاہیئے کہ اس باب میں جماعت

شیعہ کا شعار کیا ہے ؟ کیا شیعہ کا شعار یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی علی علیہ السلام کہتے ہیں، کبھی علی رضی اللہ عنہ اور کبھی علی کرم اللہ وجہہ ؟ سب کو معلوم ہے کہ یہ ان کا طریقہ اور شعار نہیں ہے بلکہ ان کا شعار یہ ہے کہ وہ ہمیشہ علی علیہ السلام کہتے ہیں لہٰذا ہمیشہ علی علیہ السلام کہنا شعار شیعہ ہے ۔ اور اگر کبھی علی علیہ السلام کہا اور کبھی علی رضی اللہ عنہ یا علی کرم اللہ وجہہ کہا تو یہ شیعہ کا شعار قطعاً نہیں ۔ اس بنا پر ملا علی قاری نے جو یہ لکھا ہے کہ " علی علیہ السلام کہنا اہل بدعت (یعنی شیعہ) کا شعار ہے " اس کا بے غبار مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ علی علیہ السلام کہنا شیعہ کا شعار ہے ۔ اور یہ مطلب حسب واقعہ ہے اور اس میں صداقت ہے ۔ یہ ہے ان کے کلام کا بے غبار مطلب اور یہی ہے اِس کا وہ مفہوم جو نہ حضرت امام ابُوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام اور مفہوم کے خلاف ہے، اور نہ تاریخی صداقت کے خلاف ہے، اور نہ اس سے متعدد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کی پیروی کو اہل بدعت کا شعار کہنے کا جرم لازم آتا ہے، اس کو چھوڑ کر ملا صاحب کے کلام کا کوئی اور مطلب اور مفہوم لینا تاریخی صداقت کے بھی خلاف ہے ۔ اور اس میں بڑی شدید مذہبی قباحت بھی ہے کہ صحابہ کے عمل کی پیروی کو اہلِ بدعت کا شعار کہنے کا جرم عائد ہوتا ہے ۔

لہٰذا راقم السطور نے جو مطلب بیان کیا ہے وہی صحیح ہے کہ حسب واقعہ ہے، تاریخی صداقت کا ہم نوا ہے اور قباحت سے مبرّا ہے ۔

خلاصۂ کلام

آل لیس پر سلام کی بحث و تحقیق کا ماحصل یہ ہے :

۱ ۔ حضرت علی، حضرت فاطمہ، امام حسن اور امام حسین کے نام کے ساتھ لفظ سلام ام المومنین حضرت عائشہ، ام المومنین حضرت ام سلمہ اور حضرت سعد بن ابی وقاص وغیرہ رضی اللہ عنہم نے استعمال فرمایا ہے ۔

۲ ۔ تابعین نے بھی اس پر عمل کیا ہے ۔

۳ - متقدمین نے اس پر اس کثرت سے عمل کیا ہے کہ ان کے دور میں ان بزرگوں کو علیہ السلام کہنا متعارف تھا (جیسا کہ اشعۃ اللمعات نے تصریح کی ہے)۔

۴ - صحیح بخاری، سنن ابی داؤد، مشکل الآثار، امام طحاوی اور متعدد کتب حدیث و تفسیر و فقہ میں ان قدسیوں کے نام کے ساتھ علیہ السلام مذکور ہے۔

۵ - ان کو علیہ السلام کہنے کا سلسلہ عہد صحابہ سے چلا ہے۔ اور آج تک جاری ہے۔ حتّٰی کہ لاکھوں علمائے حق و اولیاء اللہ اور کروڑوں صالحین کا اس پر عمل ہے۔

۶ - بڑی بات یہ ہے کہ نص قرآنی سَلٰمٌ عَلٰٓی اِلْ یَاسِیْنَ ۝ کا مقتضا ہے کہ ان کو علیہ السلام کہا جائے۔

۷ - یہ سب ایسے وجوہ جن کی بناء پر ان کو علیہ السلام کہنے میں کسی اعتراض کی گنجائش ہی نہیں، کتنا صحیح فرمایا ہے شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی نے کہ: "یہ بلا شبہ جائز ہے"۔

۸ - اکابر ائمہ دین کے قول و عمل سے بھی اس کا جواز ثابت ہے، اور حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کا مفہوم بھی یہی ہے۔ (شرح فقہ اکبر، ص ۱۵۲)

۹ - ان کو علیہ السلام کہنا راہ ہدایت پر چلنا ہے، کیونکہ متعدد صحابۂ کرام کی پیروی ہے، حدیث میں ہے جو ان کی راہ پر چلے گا، وہ راہ ہدایت پر گامزن ہے۔

۱۰ - جب ان کو علیہ السلام کہنا راہِ ہدایت پر چلنا ہے تو اس میں بلاشبہ ثواب ہے اور محبت خاص کا تقاضا بھی یہی ہے۔

تقاضا ہے محبت کا، ترانہ ہے محبت کا
سلام با ادب یٰسین پر اور آلِ یٰسین پر

والحمد للہ اولاً و آخراً، والصلوٰۃ والسلام علیٰ سیدنا و شفیعنا محمد و آلہ و اصحابہ وجمیع الصالحین۔

محتاج رحمت

عزیز الحق کوثر ندوی، نظامی بنارسی

کتابیات

اس کتاب میں قرآن مجید کے بعد مندرجہ ذیل ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) کتابوں کی عبارتیں مع حوالہ صفحہ پیش کی گئی ہیں۔

کتب حدیث

۱۔ صحیح بخاری
۲۔ صحیح مسلم
۳۔ سنن ابی داؤد
۴۔ سنن ترمذی
۵۔ سنن نسائی
۶۔ سنن ابن ماجہ
۷۔ مشکل الآثار امام طحاوی
۸۔ المعتصر خلاصہ مشکل الآثار
۹۔ الجامع الصغیر امام سیوطی
۱۰۔ کنز العمال
۱۱۔ مشکوٰۃ
۱۲۔ مسند امام حمیدی
۱۳۔ جمع الفوائد
۱۴۔ نصب الرایہ امام زیلعی
۱۵۔ الدرایہ حافظ ابن حجر
۱۶۔ بلوغ المرام ″
۱۷۔ منتقی الاخبار مجد ابن تیمیہ
۱۸۔ نیل الاوطار علامہ شوکانی
۱۹۔ کنوز الحقائق امام مناوی
۲۰۔ تخریج احیاء العلوم
۲۱۔ التاج الجامع للاصول
۲۲۔ الترغیب والترہیب امام منذری
۲۳۔ اتحاف اہل الاسلام ابن حجر مکی
۲۴۔ الاذکار امام نووی
۲۵۔ الحصن الحصین امام ابن الجزری
۲۶۔ عدۃ الحصین ″

شروح حدیث

۲۷۔ فتح الباری ابن حجر
۲۸۔ عمدۃ القاری عینی
۲۹۔ ارشاد الساری قسطلانی
۳۰۔ شرح مسلم نووی
۳۱۔ مرقاۃ شرح مشکوٰۃ
۳۲۔ اشعۃ اللمعات
۳۳۔ ہدی الساری ابن حجر

کتب تفسیر

۳۴۔ تفسیر ابن جریر
۳۵۔ احکام القرآن امام جصاص
۳۶۔ تفسیر کشاف زمخشری
۳۷۔ معالم التنزیل امام بغوی
۳۸۔ تفسیر کبیر امام رازی
۳۹۔ تفسیر ابن کثیر
۴۰۔ الدر المنثور امام سیوطی
۴۱۔ تفسیر بیضاوی
۴۲۔ تفسیر جلالین
۴۳۔ الفتوحات الالٰہیہ
۴۴۔ تفسیر مدارک امام نسفی
۴۵۔ اکلیل حضرت شیخ الدلائل
۴۶۔ تفسیر خازن
۴۷۔ تفسیر مظہری
۴۸۔ فتح القدیر علامہ شوکانی
۴۹۔ روح المعانی علامہ آلوسی

۵۰۔ (علوم قرآن) اتقان

کتب اصول حدیث

۵۱۔ مقدمہ ابن الصلاح
۵۲۔ تقریب النواوی
۵۳۔ تدریب الراوی
۵۴۔ شروط الائمۃ الخمسۃ

کتب فقہ

۵۵۔ مبسوط امام سرخسی
۵۶۔ ہدایہ
۵۷۔ فتح القدیر
۵۸۔ اللباب
۵۹۔ شرح اللباب ملا علی قاری
۶۰۔ عالمگیری
۶۱۔ غنیۃ المستملی
۶۲۔ الدر المختار
۶۳۔ ردّ المحتار شامی

کتب اصول فقہ

۶۴۔ اصول السرخسی
۶۵۔ حسامی
۶۶۔ تحقیق شرح الحسامی
۶۷۔ منار
۶۸۔ نور الانوار
۶۹۔ فتح الرحموت شرح مسلم الثبوت
۷۰۔ جمع الجوامع تاج سبکی

کتب سلوک واحسان واسرار

۷۱۔ فتوح الغیب شریف از غوث الثقلین رضی اللہ عنہ
۷۲۔ عوارف المعارف امام سہروردی
۷۳۔ سہ صدی مکتوبات از حضرت مخدوم بہاری قدس سرہٗ
۷۴۔ الیواقیت والجواہر از امام شعرانی
۷۵۔ حجۃ اللہ البالغہ شاہ ولی اللہ
۷۶۔ القول الجمیل ؍؍
۷۷۔ التفہیمات الالٰہیہ ؍؍

کتب عقائد

۷۸۔ المواقف علامہ ایجی
۷۹۔ شرح المواقف علامہ جرجانی
۸۰۔ شرح الفقہ الاکبر ملا علی قاری
۸۱۔ تکمیل الایمان امام عبد الحق محدث

کتب لغات

۸۲۔ مفردات امام راغب
۸۳۔ الفائق علامہ زمخشری
۸۴۔ نہایہ امام ابن اثیر
۸۵۔ مجمع بحار الانوار علامہ طاہر
۸۶۔ مختار الصحاح علامہ محمد رازی

کتب علم الرجال

۸۷۔ الجرح والتعدیل امام ابن ابی حاتم
۸۸۔ تہذیب التہذیب حافظ ابن حجر
۸۹۔ تقریب حافظ ابن حجر

کتب سیرت وسوانح

۹۰۔ شفائے قاضی عیاض
۹۱۔ الخصائص الکبریٰ سیوطی
۹۲۔ الصراط المستقیم امام عبد الحق محدث دہلوی
۹۳۔ سیرت النبی علامہ شبلی
۹۴۔ صفۃ الصفوہ ابن جوزی

٩٥- الفاروق علامہ شبلی
٩٦- سیرۃ النعمان ,,
٩٧- مناقب امام اعظم کردری
٩٨- مناقب امام اعظم موفق مکی
٩٩- نور الابصار

کتب تاریخ

١٠٠- تاریخ طبری (بواسطہ الحسین)
١٠١- کامل ابن اثیر
١٠٢- انساب الاشراف بلاذری
١٠٣- البدایہ والنہایہ ابن کثیر
١٠٤- تاریخ الخلفاء امام سیوطی
١٠٥- التاج المکلل
١٠٦- الفوائد البہیہ
١٠٧- شذرات الذہب

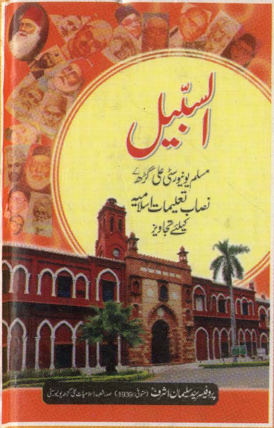
کتب مباحث شتیٰ

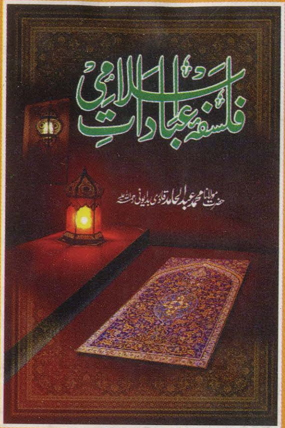
١٠٨- الجوہر المنظم علامہ ابن حجر مکی
١٠٩- مقدمہ شرح الوقایہ
١١٠- النافع الکبیر لمن یطالع الجامع الصغیر علامہ عبد الحی فرنگی محلی
١١١- تحفۃ الابرار فی احیاء سنۃ سید الابرار علامہ مذکور

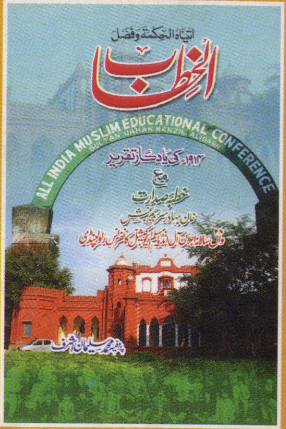
بعض ناظرین کے اطمینان قلب کے لئے کتب ذیل کی عبارتیں بھی پیش کی گئی ہیں، ورنہ وہ اصل مأخذ نہیں ہیں۔

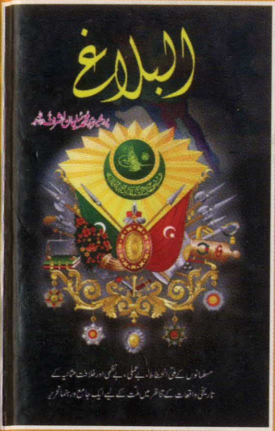
١١٢- فتح الملہم از فاضل شبیر احمد عثمانی
١١٣- الکوکب الدری۔ تقریر ترمذی از شیخ گنگوہی
١١٤- فتاویٰ رضویہ از فاضل بریلوی
١١٥- فتاویٰ امدادیہ از فاضل تھانوی
١١٦- انوار الباری از فاضل احمد رضا بجنوری
١١٧- اتمام حجت کے لئے مولوی عبد الشکور لکھنوی کی کتاب کشف الغطاء کی عبارت بھی نقل کی گئی ہے ورنہ یہ کتاب مأخذ نہیں ہے۔

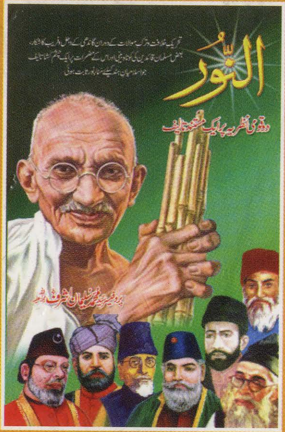
١١٨- عصر حاضر کے علمائے مصر میں سے صرف علامہ الجلال الحسینی کی مشہور کتاب الحسین سے استفادہ کیا گیا ہے، کہ یہ کتاب محققانہ ہے اور مؤلف منصف مزاج ہیں۔

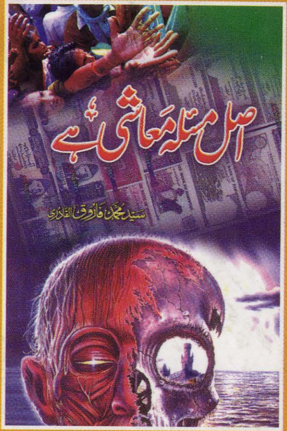


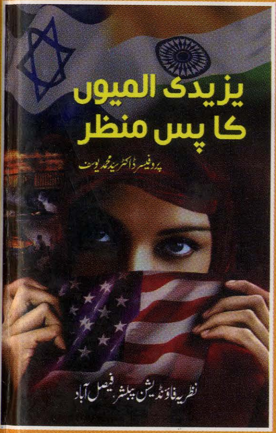


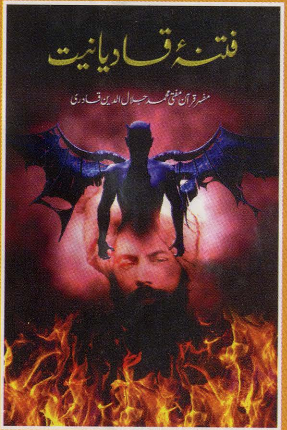


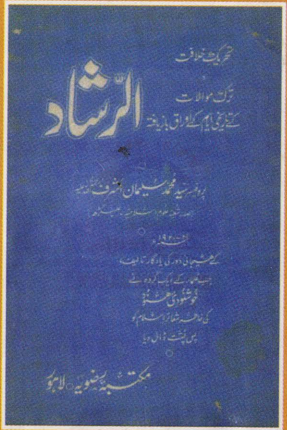












ادارہ پاکستان شناسی لاہور

2/24 سوڈھیوال کالونی ملتان روڈ لاہور۔ 54500 فون: 0322-4005952